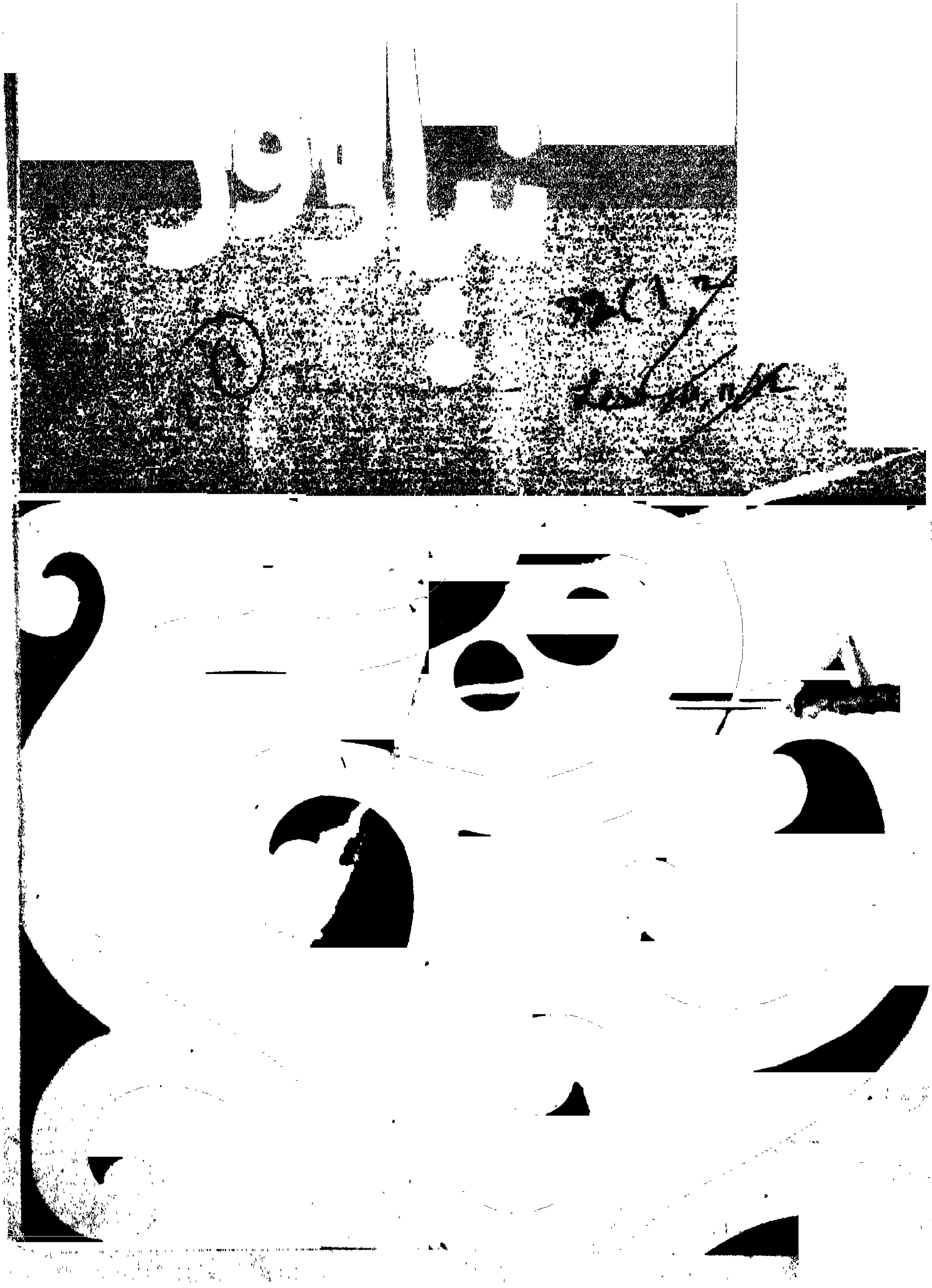


جلد ۳۲ نمبر ۱

اپریل سنہ ۱۹۷۶ء

ایڈیٹر: خورشید احمد

جوائنٹ ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی

★

پبلشر: روی موہن سیٹھی
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات اتر پردیش

پرنٹر: اشوک در
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ واسٹیشنری، یوپی
مطبوعہ نیو گورنمنٹ پریس، عیش باغ، لکھنؤ
شائع کردہ محکمۂ اطلاعات، اتر پردیش

قیمت فی شمارہ: پچاس پیسے
زر سالانہ: پانچ روپے

ترسیل زر کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ پرکاشن پربھاگ، انفارمیشن ڈپارٹمنٹ یو. پی لکھنؤ
خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶ - لکھنؤ
بذریعہ رجسٹری: ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن ڈپارٹمنٹ یوپی لکھنؤ

عنوانات

اپنی بات

وزیر اعلا اتر پردیش شری نرائن دت تیواری نے جو وزیر مالیات بھی ہیں ۲۶ مارچ کو ریاستی مجالس قانون ساز میں ۷۷-۱۹۷۶ء کا سالانہ بجٹ پیش کیا جس میں ۱۶ کروڑ ۵۱ لاکھ روپے کا خسارہ دکھایا گیا ہے۔ بجٹ تجاویز کے بموجب سال میں کل آمدنی کے کل اخراجات سے ۸ کروڑ ۴۶ لاکھ روپے کے بقدر زیادہ ہونے کا تخمینہ ہے جس کے نتیجے میں ابتدائی میزان ۸ کروڑ ۴۱ لاکھ روپے سے گھٹ کر سال کے آخر میں ۷ کروڑ ۶۰ لاکھ روپے رہ جائے گی اور یہی سال رواں کے اختتام پر خسارہ ہوگا۔ لیکن اسے گھٹا کر کم کرنے کے لیے مختلف اقدامات تجویز کیے گئے ہیں جس سے بجٹ اندازہ کے مطابق یہ خسارہ صرف ۲ کروڑ ۵۱ لاکھ روپے رہ جاتا ہے۔ وزیر اعلا نے اپنی بجٹ تقریر میں ایک نئی ترقیاتی حکمت عملی کا خاکہ پیش کیا ہے جس کے مطابق ریاست کی ترقیاتی رفتار کو تیز تر کرنے کے لیے زرعی میدان میں سائنسی، تکنیکی اور جدید طریق کار کے استعمال نیز چھوٹے پیمانے کی صنعتوں، دست کاریوں اور ہینڈ لوم صنعت پر خصوصی توجہ دینے پر زور دیا جائے گا۔ وزیر اعظم کے اعلان کردہ ۲۰ نکاتی معاشی پروگرام پر عمل درآمد کی رفتار کو تیز کرنے کے لیے اس سال ۳ ارب ۱۱ کروڑ روپے کی رقم مختص کی گئی ہے۔ غیر پیداواری اور غیر ضروری مدوں کے اخراجات میں تخفیف کر کے سرکاری مصارف میں کمی کی جائے گی، سرکاری واجبات کی وصولی کے لیے زیادہ موثر اقدامات کیے جائیں گے اور مال گزاری کو معقول سطح پر لایا جائے گا۔ اسی کے ساتھ سیلس ٹیکس کی شرحوں پر نظر ثانی کر کے اور انھیں معقول بنا کر ٹیکس ماری کو روکنے اور ٹیکس کی زیادہ سے زیادہ وصولی کے بندوبست کو یقینی بنانے کے لیے نظم و نسق کو چست بنا کر صنعتی الکوحل پر لیوی خریداری ٹیکس عائد کر کے، مختلف محکمہ جاتی فیسوں اور کورٹ فیس و رجسٹری فیس کی شرحوں پر نظر ثانی، شہری علاقوں میں خالی پڑی ہوئی زمین پر لیوی ٹیکس نیز ہاٹ بازار اور مویشی میلوں وغیرہ میں جانوروں اور مویشیوں وغیرہ کی خریداری پر لیوی ٹیکس عائد کر کے ریاست کے محاصل میں اضافہ کرنے کی تجویز ہے۔ دوسری طرف ریٹائرڈ سرکاری ملازمین کی پنشن، بڑھاپے کی پنشن اور ریاستی ملازمین کے مہنگائی بھتے میں اضافہ کیا گیا ہے۔ بجٹ میں اردو کی ترویج و اشاعت کے لیے بھی مزید مراعات دی گئی ہیں۔ چنانچہ اردو اکاڈمی کو ملنے والی ۵ لاکھ دس ہزار روپے کی متواتر مالی امداد بڑھا کر ۸ لاکھ ۵ ہزار کر دینے کی تجویز ہے۔ اس کے علاوہ یادگار انیس کمیٹی لکھنؤ نے میر انیس کے مکان کی از سر نو تعمیر نیز ان کے کلام کا دوسری زبانوں میں ترجمہ کرنے کا جو پروگرام بنایا ہے اس کے لیے ایک لاکھ روپے کی غیر متواتر اور ۵ ہزار روپے کی متواتر مالی امداد دینے کی تجویز ہے۔ اردو ادب اور بلند پایہ اردو کتابوں کی اشاعت کے لیے مزید رقم کا بندوبست کیا گیا ہے۔ فی الحال اردو میں استعداد حاصل کرنے پر سرٹی فیکٹ صرف گزیٹڈ افسران کو دیئے جاتے ہیں۔ لیکن اب اس قسم کی سہولت اور نقد انعام نان گزیٹڈ ملازمین کو بھی دیے جائیں گے جس کے لیے بجٹ میں ۵ ہزار روپے کا بندوبست کیا گیا ہے۔ ان جونیر ہائی اسکولوں کو جو اردو کے ذریعے تعلیم دینے کے خواہش مند ہوں گے تسلیم کرنے کے سوال پر بھی غور کیا جائے گا جبکہ دوسرے جونیر ہائی اسکولوں کو اس وقت عام طور سے یہ رعایت نہیں مل رہی ہے۔ اردو پڑھانے کے خواہش مند ٹیچروں کو جولائی ۱۹۷۶ء سے ایل۔ ٹی اور بی۔ ٹی میں سہولتیں فراہم کی جائیں گی۔ اس مقصد سے جامعہ ملیہ دہلی اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے تعاون سے ضروری انتظامات کیے جا رہے ہیں۔ مولانا ابو الکلام آزاد اکاڈمی کو اس سال اور آئندہ سال گرانٹ دینے کا بھی فیصلہ کیا گیا ہے۔ اس بجٹ کا ہر مکتبہ خیال کے لوگوں نے خیر مقدم کیا ہے اور توقع ظاہر کی ہے کہ اس سے نہ صرف سماج کے کمزور طبقوں کی حالت بہتر ہوگی بلکہ ۲۰ نکاتی معاشی پروگرام پر عمل درآمد کی رفتار اور بھی تیز ہو جائے گی۔

ریاستی بجٹ جس وقت مجالس قانون ساز میں پیش کیا گیا نیا دور کا اپریل کا شمارہ تیار ہو چکا تھا۔ اس لیے بجٹ کی خاص خاص باتیں اور بجٹ تخمینے نیز ترقیاتی پروگراموں سے متعلق حکومت کے مجوزہ اقدامات آئندہ شمارے میں دیے جائیں گے۔

وفیات

ڈاکٹر عبد العلیم

ترقی اردو بورڈ کے چیرمین اور مرکزی حکومت کے اردو مشیر ڈاکٹر عبد العلیم کا گزشتہ ۱۸ فروری کو دل کا دورہ پڑنے کے بعد انتقال ہو گیا۔ وہ ایک ماہر تعلیم ہی نہیں بلکہ ایک بڑے محب وطن اور قوم پرست بھی تھے۔ طالب علمی ہی کے زمانے سے وہ آزادی کی تحریک میں شامل ہو گئے تھے۔ جرمنی سے ڈاکٹریٹ کر کے ۱۹۲۵ء میں ہندستان واپسی کے بعد ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کی دعوت پر جامعہ ملیہ سے منسلک ہو گئے۔ اس کے بعد لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبہ عربی سے وابستہ ہوئے۔ لکھنؤ کے دوران قیام میں وہ ترقی پسند ادبی تحریک کے ایک بڑے رہنما کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آئے۔ علیم صاحب مرحوم خداداد ذہانت اور صلاحیت کے مالک اور بہت ہی بااصول اور مستقل مزاج انسان تھے۔ اردو اور عربی کے لیے ان کی خدمات ہمیشہ یادگار رہیں گی۔ علی گڑھ یونیورسٹی میں یکے بعد دیگرے صدر شعبۂ عربی، رجسٹرار اور وائس چانسلر کے عہدوں پر فائز رہے۔ ڈاکٹر علیم صاحب نے ایک پوری نسل کی ذہنی تربیت کی، ان کے شاگردوں کی فہرست طویل ہے۔ خدا مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

جگر بریلوی

اردو کے مشہور اور بزرگ شاعر و ادیب جناب شیام موہن لال جگر بریلوی گزشتہ ۵ مارچ کو اس دار فانی سے کوچ فرما گئے۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ۸۶ سال کی تھی۔ انھوں نے اردو ادب اور شاعری کی بڑی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں۔ جگر صاحب کا شمار ہمارے اساتذۂ فن میں ہوتا ہے۔ نثر اور نظم پر ان کو یکساں قدرت حاصل تھی۔ آخر عمر تک وہ اپنی نثری اور شعری تخلیقات سے اردو زبان کے خزانے کو مالا مال کرتے رہے۔ ایسے متعدد شاعروں اور ادیبوں اور ان کے کارناموں کو منظر عام پر لانے میں ان کی خدمات ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی جو گوشۂ گمنامی میں پڑے ہوئے تھے۔ ان کی یادداشت بہت تیز تھی۔ بہت سے معاصرین کے اچھے اچھے اشعار ان کو ازبر تھے۔ اردو کو اپنی تخلیقات سے تقریباً آخر وقت تک نوازتے رہے۔ ایسے بے لوث خادم اردو کا سانحۂ ارتحال یقیناً ایک عظیم حادثہ ہے! ادارہ نیا دور ان کے پسماندگان سے دلی تعزیت کرتا ہے۔

سالک لکھنوی

اردو کے ایک ممتاز اور کہنہ مشق غزل گو اور لکھنؤ دبستان شاعری کے نمائندہ شاعر سید محمد حسن سالک لکھنوی ۱۱ مارچ کی شب میں انتقال فرما گئے۔ مرحوم عرصے سے علیل تھے لیکن یہ خیال نہیں تھا کہ وہ اس قدر جلد ہم سے جدا ہو جائیں گے۔ سالک لکھنؤ کے ایک علمی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد بزرگوار مولانا سید

(باقی صفحہ ۴۳ پر)

نازش پرتاپگڈھی

تین نظمیں

ناتمامی

یوں تو اب تک روزِ ازل سے
میں نے گائے
تو نے چھیڑے
پھر جانے کیوں ہیں انجانے
روح کے گانے
دل کے ترانے

مروّت

زندگی کو اداس کون کرے
اپنے دامن کے چاک سیتا ہوں
زہر پیتا ہوں اور جیتا ہوں
اس گھڑی کو اداس کون کرے
لاکھ اشکوں کی جھلملاہٹ ہو
پھر بھی ہونٹوں پہ مسکراہٹ ہو
چاندنی کو اداس کون کرے
چشم دل ہے کہ رو رہی ہے خوں
اور میں ہوں کہ گنگناتا ہوں
روشنی کو اداس کون کرے
زندگی کو اداس کون کرے

احساس

روح کا چھالا کسک رہا ہے
ٹپک رہا ہے
کھٹک رہا ہے
اب مرا دامن کون سیے گا
کون سیے گا؟
کون جیئے گا؟

مُشتعر علی صدّیقی

ظہیر دہلوی کے ایک شاگرد

نجم الدین احمد ثاقب بدایونی

ظہیر دہلوی کے متعدد شاگردوں میں دو نام نمایاں نظر آتے ہیں۔ ایک صاحبزادہ احمد سعید خاں صاحب عاشق ٹونکی اور دوسرا نام نجم الدین احمد ثاقب بدایونی۔ بدایوں کے متعدد شاعر جیسے قمر بدایونی نولا بدایونی، فانی بدایونی، علی حاتم اور ثاقب بدایونی جن کا انتقال ۱۹۴۰ء سے قبل ہوا تھا۔ ایسے ہیں جن کو مشاعروں میں اپنا کلام پڑھتے ہوئے میں نے سنا ہے اور جن سے بالمشافہ گفتگو کرنے کا بھی مجھے فخر حاصل ہے۔ حالانکہ میرا وہ طالب علمی کا یا ابتدائی ملازمت کا زمانہ تھا، لیکن شعر و ادب کا شوق کشاں کشاں مجھے ان کے دولت کدہ تک لے جاتا تھا۔ ان کی شاعرانہ عظمت اور ان کے کلام پڑھنے کا انداز اب بھی جب ماضی کے جھروکوں سے جھانکتا ہے تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ بدایوں ان دنوں اردو شعر و ادب کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔ بچے بچے کی زبان پر ان شعرا کے شعر ہوتے تھے اور محفل شعر و سخن تو ہر ہفتہ پابندی کے ساتھ منعقد ہوتی تھی۔ تلفظ، املا اور فنی خوبیوں کی طرف خاص طور پر توجہ دی جاتی تھی۔ مشاعروں میں داد دینے کا ایک مخصوص انداز تھا اور تہذیب کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوٹتا تھا۔

ثاقب بدایونی حیدرآباد دکن میں ملازم تھے۔ اکثر بدایوں آتے رہتے تھے اور ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد ان کا قیام اپنے نجی مکان واقع محلہ سوتھہ، بدایوں میں میرے مکان سے چند قدم کے فاصلہ پر تھا۔ اب ان کو اور قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ شیخو پور (بدایوں سے دو تین میل کے فاصلہ پر شرفا، کا ایک قصبہ) تک پیدل چلے جاتے تھے، حالانکہ پیر میں کچھ تکلیف رہتی تھی۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ لنگ تھی۔ چنانچہ ایک مسخرے نے شعر موزوں کر دیا ـــــ

غلط بالکل غلط، ثاقب کو لنگڑا کون کہتا ہے
جو شیخو پور تک دوڑے وہ لنگڑا ہو نہیں سکتا

ثاقب نے نظم کی بیشتر اصناف میں طبع آزمائی کی لیکن قصیدہ اور غزل میں کمال حاصل کیا فارسی میں غزل کہتے تھے۔ نعت شریف کی طرف فطری رجحان تھا، مرثیہ گوئی میں بھی دلچسپی تھی۔ چنانچہ دبیر و انیس کے کلام سے متاثر ہو کر یہ رباعیات لکھی تھیں[1]

خورشید سرِ شام کہاں جاتا ہے　　روشن ہے دبیر پر جہاں جاتا ہے
مغرب بھی کی سمت ہے مزار حیدر　　یہ شمع جلانے کو وہاں جاتا ہے
(مرزا دبیر)

جو روضہ پہ باریاب ہو جاتا ہے　　وہ اوج میں لاجواب ہو جاتا ہے
جلتا ہے جو شب کو قبر حیدر پہ چراغ　　وہ صبح کو آفتاب ہو جاتا ہے
(میر انیس)

جو ذرہ بو تراب ہو جاتا ہے　　بندہ وہ فلک جناب ہو جاتا ہے
اعجاز چراغ قبر حیدر دیکھو　　گل ہوتے ہی آفتاب ہو جاتا ہے
(دلہ)

تنہا نہ عزا ہے مرتضیٰ کے گھر میں　　اک حشر بپا ہے مصطفیٰ کے گھر میں
ثاقب یہ سیہ پوشی کعبہ سے کھلا　　ہے ماتم شبیر خدا کے گھر میں

محسن کاکوروی کے مشہور نعتیہ قصیدے۔

"سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل"

نے بڑے بڑے شاعروں کو چراغ پا کر دیا تھا۔ خاص طور پر اس کی تشبیب نے۔ لیکن ثاقب چراغ پا نہیں ہوئے۔ بلکہ اس کے جواب میں اسی بحر میں ایک نعتیہ قصیدہ "چراغ مدعا" لکھا۔ اشعار کی تعداد بھی محسن کے قصیدے سے کچھ زائد ہے۔ قصیدہ "چراغ مدعا" اور ایک دوسرا قصیدہ "ریاض شاداب" ۱۳۱۹ھ مطابق ۱۹۰۱ء میں وکٹوریہ پریس بدایوں سے کتابی شکل میں شائع ہوئے تھے۔ اس کا ایک کرم خوردہ نسخہ میرے کتب خانہ میں محفوظ ہے۔ تقریظ صاحبزادہ احمد سعید خاں صاحب

---

[1] رسالہ "المنصور" بدایوں۔ مارچ ۱۹۳۸ء۔ صفحہ ۱۳۔

عاشق ٹونکی نے لکھی ہے۔ وہ لکھتے ہیں "سنیے سنیے ۱۵ یا ۱۶ اگست سنہ ۱۹۰۶ء کو سید حمید الدین صاحب رعنا محسن کاکوروی کے اس مشہور قصیدہ پر تضمین کرکے استاد ظہیر کی خدمت میں اصلاح کو لائے (سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل)[1] اس وقت میں اور مولوی نجم الدین احمد صاحب ثاقب بدایونی بھی اتفاق سے استاد ظہیر کی خدمت میں موجود تھے لیکن ثاقب بخار و درد سر وغیرہ امراض متعدد میں مبتلا تھے، حضرت رعنا مخمس سنا کر اصلاح حاصل کرنے میں مشغول ہوئے اور جا بجا محسن کی تعریف بڑے بڑے الفاظ میں کرتے جاتے تھے . . . ثاقب مبتلائے ہونے کی وجہ سے کم متوجہ تھے۔ اس پر حضرت رعنا نے بار بار دوستانہ چٹکیاں لیں کہ مولانا صاحب کو محسن کا قصیدہ ناپسند ہے جو آپ داد میں کم کوش ہیں۔ ثاقب نے جو کہ ایک نوجوان اور مغرور الطبع اور پھر اس پر طرہ یہ کہ بیماری سے اور بھی چڑچڑے ہو رہے تھے، جل کر یہ جواب دیا کہ ہاں اچھا ہے، مگر کچھ آیت نہیں، حدیث نہیں ایسا بے مثل کلام نہیں جس کو ہمہ تن گوش ہو کر سنا ہی جائے میرے نزدیک تو آپ نے مصرعے خوب لگائے ہیں۔ حضرت رعنا نے شوخی طبعی سے ایک اور کوڑا لگایا کہ جی ہاں پھر تو معلوم ہوا۔ اس کے سنتے ہی اس بے چین طبیعت والے کو صبر و ضبط کہاں تھا۔ اسی حالت میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور کہا کہ "بہت اچھا کل آکر سن لینا۔" آگے چل کر لکھتے ہیں "حاصل کلام استاد نے میرے نام رقعہ تحریر فرمایا کہ ہم نے قصیدہ کے صلہ میں ثاقب کو پہلوان سخن کا خطاب دیا ہے۔ یہاں آکر وہ قصیدہ سن لو۔ یہ رقعہ دیکھتے ہی میرے دل میں آتش رشک کا ایک شعلہ بھڑک اٹھا اور یہی ارادہ کیا کہ تم بھی قصیدہ لکھو۔ اور خطاب چھین لو، کیونکہ تم ثاقب سے کم مشاق نہیں مگر جب استاد کے مکان پر آیا اور قصیدہ سنا تو وہ امنگ خود بخود مٹ گئی اور اپنے خیالات پر نفرین کرتا ہوا اٹھ آیا اور یہ رباعی لکھی :

ملتا نہیں ڈھونڈے سے جو تجھ سا ثاقب
پھر خاک ہو کوئی تجھ سے اچھا ثاقب
رکھا جو سخن کا پہلوان نام ترا
بیشک تجھے یہ نام ہے زیبا ثاقب

اس قصیدہ کے چند اشعار یہاں پیش کیے جاتے ہیں لیکن مکمل قصیدہ پڑھے بغیر اس کی اہمیت واضح طور پر نمایاں نہیں ہوتی۔

جائے حوران بہشتی ہیں زنان متھرا
نخل طوبیٰ کی جگہ سرو قدان گوکل
وسعت گنگا کے ہیں انہار بہشتی کی جگہ
رو برو طیبہ و بطحا کے ہیں بن گوکل

گوپیوں کی کبھی چھل بل کبھی کشتی رہن
کہیں اندھکا اکھاڑا کہیں بوڑھا منگل
کبھی قلزم میں کبھی نیل میں ڈوبے اچھلے
کبھی گھاگرا میں کبھی یترے کبھی پہنچے چنبل

جلوۂ تخت رواں، تخت سلیماں کی جگہ
بدلے اجماع امم کے ہے فرنگی کونسل
سحر بنگال کا افسانہ بجائے اعجاز
[illegible]

بے تکی گاتے ہیں ایسی نہیں جس کا سر پیر
مبتدا ہے نہ خبر اور نہ آخر اوّل
شاہد گل کے اٹھا ڈالے ہزاروں ڈولے
واہ رے شانۂ نازک نہ ہوا پھر بھی شل

آج کعبہ سے اٹھاتا ہے مصلےٰ بادل
سجدے کرنے کو سوئے طیبہ ہے جاتا بادل
ہاتھ سے لے کے مرے دے انھیں رضوان جنم
حوریں آنکھوں سے قصیدہ کو لگائیں اوّل

جھوم کر شوق میں پھر گانے لگیں مل جل کر
کبھی مطلع کبھی مقطع تو کبھی پوری غزل

ظہیر دہلوی اکثر ٹونک جاتے تھے صاحبزادہ احمد خاں صاحب عاشق کے استاد ہونے کی وجہ سے دربار میں ان کی باریابی ہوئی اور ثاقب نے شروع میں اصلاح داغ دہلوی سے ضرور لی تھی۔ لیکن

[1] قصیدہ چراغ دماغ صفحہ ۱-۲

بعد میں ظہیر دہلوی کے چہیتے شاگردوں میں ان کا شمار ہونے لگا۔ چنانچہ یہ بھی ٹونک گئے اور ریاست کے کئی مقامات پر اپنا نعتیہ قصیدہ سنایا اور خوب داد حاصل کی۔

روایتی غزل میں معنی آفرینی اور خیال آفرینی کے ساتھ جدت آفرینی پیدا کرنا مشکل کام ہے۔ ثاقب کا زمانہ حسرت، اصغر، فانی یگانہ اور جگر کا زمانہ تھا۔ غزل گوئی میں انہی شعرا کا طوطی بول رہا تھا۔ ثاقب اس میں کوئی اضافہ نہ کر سکے لیکن پھر بھی ان کی غزلیات میں زبان و محاورہ کی چاشنی ملتی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں[1]:

حقیقت میں خموشی میری فریادِ تمنّا ہے
مرا رنگِ پریدہ صاف روداد تمنّا ہے

تمنّا کیا ہے بنیادِ وجود و بودِ عالم ہے
وجود و بودِ عالم کیا ہے بنیادِ تمنّا ہے

کھلا اس آئینہ سے حسن کا شوقِ خود آرائی
طلسمِ عالمِ ایجاد ایجادِ تمنّا ہے

ازل سے حسرت و ارماں ہیں آباد اس خرابہ میں
بنا معمورۂ ہستی کی بنیادِ تمنّا ہے

ملیں دنیا کو منہ مانگیں مرادیں شاد کے در سے
فقط اک ثاقبِ ناکام، ناشادِ تمنّا ہے

چراغِ زیست گل ہوگا تو ارماں دل سے نکلے گا
بجھے گی شمعِ محفل جب دھواں محفل سے نکلے گا

وہ روئی شمع، وہ دشمن ہنسے، وہ آگیا درباں
کوئی ناکام ارماں کیا تری محفل سے نکلے گا

سزا کیسی، جزا کیسی، نہ مجبوری نہ مختاری
بتا دیں گے قدم جب حشر کی منزل سے نکلے گا

ستارہ بے کسوں کا کبھی چمکے گا اے ثاقب
کبھی داغِ سیہ بختی مہِ کامل سے نکلے گا

مدت سے میرے خانۂ دل میں ہے میہماں
پیکانِ غم کہ خون کا پیاسا کہیں جسے

سنتا ہوں بام پر کوئی آتا ہے بے نقاب
وہ روز آج ہی نہ ہو فردا کہیں جسے

ایک دن آبِ بقا کو بھی فنا لازم ہے
خضر مرتے ہیں عبث زندگیٔ فانی پر

ہو کہیں عذرِ گنہ بھی نہ گنہ سے بدتر
ان کو رحم آنے لگا میری پشیمانی پر

ہاتھ سے کاتبِ قسمت کے قلم چھوٹ گیا
لکھتے ہی کُن میرے مکتوب کی پیشانی پر

ایک نعتیہ فارسی غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

معراجِ تست معنیٔ وصل از خدائے تو
معراجِ ماست سجدۂ نعلینِ پائے تو

والشمس یک شعاعِ رخِ پرضیائے تو
واللیل سینہ عقدۂ زلفِ دوتائے تو

تو آبروئے ہر دو جہانی دریں جہاں
خاکش بسر کہ سرکشد از خاکِ پائے تو

"ایک مرثیہ ناتمام کا پہلا چہرہ" کا پہلا بند ملاحظہ ہو[2]۔

اے طبع رسا سحر کرے آرائے قیامت
ہو آج یہاں قصۂ فردائے قیامت
برپا سرِ محفل ہو یہ غوغائے قیامت
پہلے ہی قیامت سے چلی آئے قیامت
ہاں آنکھ سے محشر کا نمونہ نظر آئے
زہرا کا بھرا گھر ابھی سونا نظر آئے

آپ کے کلام کا ایک مختصر مجموعہ "کلامِ ثاقب" کے نام سے ۱۹۳۸ء میں شائع ہوا تھا۔ اب وہ بھی مشکل سے ملتا ہے۔ بہرکیف بدایوں کے ادباء و شعراء کی تاریخ میں آپ کا نام کسی طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

---

[1] یمین السلطنت سر مہاراجہ کشن پرشاد بہادر
[2] رسالہ المنصور بدایوں۔ مارچ ۱۹۳۸ء ص ۴

★

سید ابراہیم خلیل

کشمیر

میرے ذہن و تصور میں کشمیر کی دل نشیں، دل ربا ایک تصویر ہے
شاعروں کے تصور کا فردوس ہے، اور خوابوں کی اک ان کہی تعبیر ہے

اک توجہ کا مرکز ہیں سیّاح کی، خوبصورت سی جھیلیں، حسیں وادیاں
اک نئی زندگی کی حرارت سے اور حوصلوں سے ہیں معمور آبادیاں

دیکھ کر کیوں نہ حیراں ہو گر دیدۂ حسنِ فطرت سحر کا تبسم کوئی
سن کے اکثر یہاں جھوم اٹھے نہ کیوں آبشاروں کا رنگیں ترنم کوئی

سارا ماحول رنگینیوں میں ہے گم، کچھ نہیں ہے خیال وجود و عدم
حسنِ فطرت سے بڑھتی ہے وابستگی، حسنِ فطرت سے نزدیک ہوتے ہیں ہم

اس کے رنگین و پرکیف ماحول میں، مجھ پہ طاری ہے اک عالمِ بیخودی
پا رہا ہوں گلستانِ کشمیر میں فکر و قلب و نظر کی اک آسودگی

اے حسیں وادیوں کی حسیں سرزمیں تو ہے دنیا میں تصویرِ خلدِ بریں
رشک کرتے ہیں سب تجھ پہ اہلِ زمیں، ناز کرتا ہے خود تجھ پہ عرشِ بریں

آج کشمیریوں کے ہے ہر فرد میں اک نئی زندگی کا نیا ولولہ
سرد و گرم زمانہ میں پایا ہے ہم نے خلیل ان کو اکثر بلند حوصلہ

ڈاکٹر ولی الحق انصاری

غزل

دہشتِ زیست سے ہیں سوختہ جاں بھی کچھ لوگ
سازِ پر سوز پہ ہیں رقص کناں بھی کچھ لوگ

گیت لکھتا ہے قلم، آتا ہے لیکن جب وقت
لیتے ہیں خامہ ہی سے کارِ سناں بھی کچھ لوگ

سوچ مت یہ کہ سبھی کام و دہن تھے سیراب
بزم سے تیری گئے تشنہ دہاں بھی کچھ لوگ

خامشی باعثِ اخفائے غمِ دل ہے مگر
اس سے لیتے ہیں کبھی کارِ زباں بھی کچھ لوگ

صرف ابلیس ہی جنت میں نہ تھا بانیِ شر
ہر زمانے میں ملے ایسے یہاں بھی کچھ لوگ

حق پسندوں کو دیا کرتے ہیں خود دارِ صلیب
اور پھر کرتے ہیں فریاد و فغاں بھی کچھ لوگ

غیر ممکن ہے کہ ہنگامہ نہ برپا کر دیں
جمع ہو جائیں زمانے میں جہاں بھی کچھ لوگ

ہوگا جنت میں بھی پھر اپنا خدا ہی حافظ
مل گئے تم سے اگر ہم کو وہاں بھی کچھ لوگ

بارہا یہ بھی سنا فصلِ بہاراں کو ولی
کہتے ہیں پیشِ رَدِ دَورِ خزاں بھی کچھ لوگ

رفیعہ منظور الامین



انسانی جسم میں سر کو جو اہمیت حاصل ہے اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ سر جو معبود کے آگے جھکتا ہے، سر جو غرور سے اٹھتا ہے اسی سر میں جنگوں اور نفرت کے طوفان اٹھتے ہیں اور اسی سر میں امن اور محبت کے پیغام بھی جنم لیتے ہیں۔ اور یہی سر کبھی راہ حق میں قلم بھی ہو جاتا ہے۔ لیکن بحث یہاں سر سے نہیں سر کے بالوں سے ہے۔

غالب کا شعر ہے۔ ؎

وہاں آرائش سوجھی ہیں ان کو زلف پیچاں کی
یہاں حالت بگڑتی جاتی ہے بیمار ہجراں کی

لیکن غالب کو بھی شاید یہ معلوم نہ ہو کہ زلف پیچاں کی آرائشوں کی گنہگار انھیں کی محبوبہ نہیں بلکہ ہزاروں برس سے یہ ہوتا چلا آیا ہے اور عورت مرد دونوں کا یہ شیوہ مشترک رہا ہے۔

درحقیقت بالوں کو سجانے اور بنانے کی تاریخ انسانی تاریخ سے بھی زیادہ پرانی ہے۔ اس کا سلسلہ پانچویں صدی قبل مسیح سے ملتا ہے۔ دنیا بھر کی مختلف قوموں میں بالوں کو سجانے کا شوق اسی زمانے سے پایا جاتا تھا۔ اس وقت بھی بالوں کو لمبا گھنا اور کالا بنانے کے لیے مختلف جڑی بوٹیوں اور تیلوں کا استعمال ہوتا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جمالیاتی ذوق صرف آج کل کی ترقی یافتہ قوموں کا ہی حصہ نہیں بلکہ ہزاروں سال پہلے کے کلچر کا بھی ایک حصہ تھا۔ نہ صرف عورتیں بلکہ مرد بھی بال بنانے کے شوقین تھے۔ عورتوں میں چار سو سال قبل مسیح بالوں کو رنگنے کا رواج اور نقلی بالوں کا استعمال بھی عام تھا۔ لڑکوں کے جوان ہونے پر ان کے بال اکثر کاٹ کر دیوتا کو ارپن کیے جاتے حتیٰ کہ مرد بھی سر منڈوا ڈالتے تھے لیکن خاص خاص موقعوں پر نقلی بالوں کی ٹوپی پہن لیا کرتے تھے۔

رومن عورتوں میں پہلے پہلے بالوں کو کپڑے سے ڈھانکے رکھنے کا رواج تھا مگر رفتہ رفتہ انھوں نے کپڑا چھوڑ کر بالوں سجاوٹ شروع کی۔ بالوں کو موتیوں اور سنہری پٹیوں سے سجایا جاتا وہ زمانہ تھا جب کنگھیوں اور ہیر پنوں اور لوہے کے (CURLERS) (چھلّے بنانے والے) شروع ہوئے۔

رفتہ رفتہ بالوں کی سجاوٹ کی اہمیت اتنی بڑھی کہ جب مجسمے تراشے جاتے تو پتھر ہی میں ان کے سر کے مطابق مختلف اسٹائلوں میں بالوں کی ٹوپیاں تراشی جاتیں جو وقتاً فوقتاً بدلی جا سکتی تھیں۔

رومن مردوں میں چھوٹے بالوں کا رواج عام تھا لیکن قرون وسطیٰ میں جب بربریوں نے انھیں فتح کر لیا تو یہی چھوٹے بال غلامی کی نشانی سمجھے جانے لگے۔ اسی زمانے سے عورتوں میں بھی چوٹیوں کا رواج شروع ہوا۔ چودھویں صدی تک سر کپڑے سے ڈھانکا جاتا تھا۔ البتہ لمبی چوٹیاں پیٹھ پر لہرائی جاتیں۔ لیکن پندرھویں صدی سے سر کا کپڑا چھوڑ کر چوٹیوں کے ساتھ بالوں کی مختلف طرزوں میں سجاوٹ بھی ہونے لگی۔ اور تب ہی سے مردوں نے بھی اپنے بال دوبارہ کاٹنے شروع کر دیئے۔ کیونکہ تب تک لوہے کے جنگی لباس رائج ہو چکے تھے اور بالوں کی وجہ سے ان کے پہننے

میں دشواری ہوتی تھی۔

سترھویں صدی سے عورتوں نے بالوں کی سجاوٹ میں زیادہ آزادی دکھانی شروع کی۔ یہ ملکہ ایلزبتھ کا زمانہ تھا۔ بالوں میں مانگ نکالنے کا فیشن، اسی زمانے سے شروع ہوا اور ہیراسٹائل میں ایک اہم چیز یعنی پلیسیڈو (PALISA DOE) کا استعمال بھی تب ہی شروع ہوا (پلیسیڈو سر کی مطابقت سے مڑا ہوا ایک تار ہوتا ہے) مانگ نکال کر یا بغیر مانگ کے، بالوں کو پیچھے کی طرف اس تار پر لپیٹ لیا جاتا تھا اور پیچھے پن یا فیتہ سے (COIFFURE) ج کی شکل میں باندھ دیا جاتا تھا (یہی PALISADOE آج کے SWITCH کا کام دیتا تھا) کبھی کبھی بالوں کو اونچا کرنے کے لیے سینگوں کا استعمال تک کیا جاتا۔ نقلی بالوں کا استعمال بھی ہونے لگا جن سے WIGS بھی بنائی جاتیں۔ یہ جنون اس حد تک بڑھا کہ لوگ بچّوں کو بہکا کر لے جاتے اور ان کے بال کاٹ لیتے۔ مردوں نے سوچا کہ چلو ہم کیوں پیچھے رہیں انھوں نے بھی بال بڑھانے شروع کیے۔ بالوں کے گچھے سے CURL کر کے پیچھے گردن کے اوپر چھوٹی چھوٹی چوٹیاں بنانے لگے۔ ایسے مردوں کو کیویلیر (CAVALIER) کہا جاتا تھا۔ مردوں میں چھوٹے بال پارلیمنٹیرین ہونے کی نشانی تھی۔ اور انھیں گول سر (ROUND HEAD) کہا جاتا تھا۔

اس کے بعد کے زمانے میں بھی بس یہی کچھ ہوتا رہا کہ کبھی بال اونچے کر دیئے تو کبھی چپکا لیے، کبھی ان پر پوڈر چھڑک دیا تو کبھی لیس والی ٹوپی سے چھپا دیا گیا۔

لیکن بالوں میں مستقل لہریا (PERMANENT WAVE) اور گھونگھر (CURLS) بیسویں صدی میں چارلس نیسلر (CHARLES NESS-LER) کی دین ہیں۔ بالوں کو لہردار بنانے کے اس طریقے میں مختلف لوشنوں اور بجلی کا استعمال کیا جاتا ہے اور یہ لہریں نئے بالوں کے بڑھنے تک باقی رہتی ہیں۔

مغرب کے ہیراسٹائل کی یہ مختصر تاریخ دیکھنے کے بعد ہم مشرق کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو اس کا سلسلہ چوتھی صدی قبل مسیح سے ملتا ہے۔

بیگرام کے ہاتھی دانت کے مرقع قدیم ہندستان میں مختلف ہیر اسٹائلوں کی شہادت دیتے ہیں۔ بعض مورخوں کے بیانوں سے پتہ چلتا ہے کہ بالوں کی خاص طور پر بل دی ہوئی لٹیں اور بن BUN کے علاوہ عورتوں میں بھی خاص قسم کی پگڑی کا رواج اس زمانے میں عام تھا اور ان میں سے ایک لوح پر بنی عورت کی شبیہ کا جو ہیراسٹائل ہے بعینہٖ وہی اسٹائل اجنتا کے غار نمبر ۲ میں موجود ہے۔

قدیم ہندستان کے ہیراسٹائلوں کے بارے میں جینی آبوئیر (JEANNINE AUBOYER) لکھتے ہیں کہ بن یا کیباس کے کئی اسٹائل تھے۔ اس میں بال اکٹھے کر کے بن کی شکل میں ماتھے سے اوپر یا پھر سر کے پیچھے جمائے جاتے لیکن پیچھے لینے کی صورت میں انھیں مخروطی شکل دی جاتی جس پر کبھی کبھی موتیوں کے گچھے سجائے جاتے۔ زیادہ تر اسٹائل، دائروی یا بیضاوی شکل میں ہوتے۔ اور اکثر جواہرات سے مزین بھی۔ اس طرح کے اسٹائل متھرا کے علاوہ امراوتی کے مرقعوں میں بھی نظر آتے ہیں۔



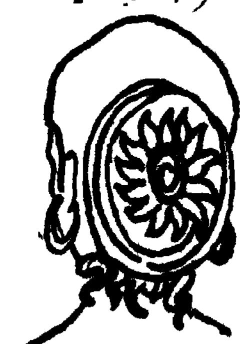
ڈاکٹر اے۔ ایل۔ باشم (A.L. BASHAM) جو کینبرا کی آسٹریلین نیشنل یونیورسٹی میں ایشائی تہذیب کے پروفیسر ہیں انھوں نے قدیم ہندستان میں آرائش گیسو پر بہت کچھ لکھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں: مرد عام طور پر سر پہ پگڑی پہنا کرتے تھے۔ جس میں بڑا تنوع ہوتا۔ اداکل میں خاص موقعوں پر عورتیں بڑے اور آرائشی کمٹ پہنا کرتیں جو آجکل بالکل عنقا ہیں لیکن گپتا عہد میں یہ کمٹ سادہ تر ہو گئے۔ بلکہ کئی مرقعوں میں عورتیں بغیر کمٹ کے بھی نظر آتی ہیں۔ سب سے زیادہ پسندیدہ اسٹائل گردن پر ایک بڑا بن باندھنے کا تھا جسے موتیوں اور مختلف زیورات سے سجایا جاتا۔ چوٹی جو آجکل بہت عام ہے اور جس کا

ذکر ہڑپا کلچر میں بلکہ پرانے لٹریچر میں بھی جگہ جگہ آتا ہے، اس وقت موجود نہیں تھی۔"

حقیقت یہ ہے کہ مشرقی اقوام نے نہ صرف بالوں کو طرح طرح سے سجایا سنوارا ہے بلکہ انھیں لمبے گھنے اور ملائم بنانے کے لیے مفید اور کارآمد تجربے بھی کیے ہیں۔ اس کا بہترین ثبوت ہمیں کھجراہو، کونارک اور اجنتا، ایلورہ میں ملتا ہے۔ اجنتا چونکہ اس آرٹ کی مکمل ترین تصویر پیش کرتا ہے۔ لہٰذا یہاں ہم اسی کو معرضِ بحث میں لائیں گے۔

اجنتا مکمل طور پر بدھ مت کے پیروؤں کا تخلیق کردہ شاہکار ہے جو صرف مصوری کا اعلیٰ ترین نمونہ ہی نہیں بلکہ اس میں مذہب اور حسنِ فطرت دونوں ہی سمٹے ہوئے ہیں۔ اجنتا کی نقاشی اور ایلورہ کی سنگ تراشی دیکھ کر یہ سمجھنا مشکل نہیں ہوتا کہ مذہب اور دنیاداری ساتھ ساتھ چل سکتے ہیں۔ اجنتا کی ان تصویروں میں ان گنت عورتیں بھی موجود ہیں اور متعدد ہیر اسٹائل بھی۔ ان سب کو دیکھنے کے بعد یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ہزاروں سال پہلے کے ان اسٹائلوں نے آج کی دنیا کو بھی بہت کچھ سکھایا ہے۔

ان اجنتا نژاد عورتوں کو بال بناتے وقت موقع اور محل کا بڑا خیال رہتا تھا۔ مثلاً کھلے ہوئے بالوں کو رنج و الم کی نشانی سمجھا جاتا۔ اس کے بعد جب عام طور پر یہ بال باندھے جاتے تو سمیٹ کر ہمیشہ ہی سر کے داہنی جانب ذرا سا آگے کو کھسکا کر جوڑا باندھ دیا جاتا اور پھر اس پر پھول لپیٹ دیئے جاتے۔ سر اور بالوں پر زیور کا استعمال بہت عام تھا اور بیچ و بیچ موتی اس طرح لپیٹے جاتے جیسے بالوں کے ساتھ ہی گوندھے گئے ہوں۔

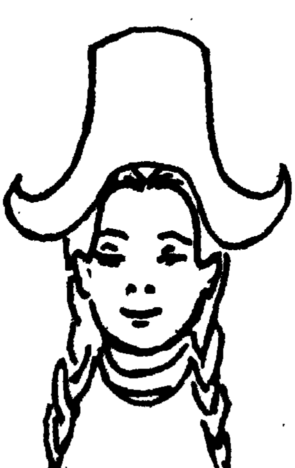


دوسرے اسٹائل میں بالوں کا یہ جوڑا سر کے پچھلے اوپری حصے پر بھی باندھا جاتا اور گردن پر بھی۔ لیکن سامنے والے بالوں کو چھوٹی چھوٹی لچھیوں میں رول کرکے پیشانی پر جما دیا جاتا ہے۔ یہ جوڑا اتنا اکہرا نہیں ہوتا بلکہ بالوں کو تین حصوں میں کرکے باندھا جاتا۔ اس طرح سے یہ بال زیادہ بھی نظر آتے اور جوڑے میں خوبصورتی آجاتی تھی۔

جوڑوں میں ڈونٹ یعنی (DOUGH NUT) کا استعمال بھی اس وقت عام تھا۔ اجنتا کے نقوش صرف تفریح طبع کے لیے ہی نہیں بلکہ کسی خاص مقصد کے تحت بنائے گئے ہیں۔ یعنی اس میں موجود ہر چیز کسی نہ کسی طرح بنانے والے کے مذہب کی عکاسی کرتی ہے۔



سورج کی پوجا ہوا کرتی تھی۔ لہٰذا بالوں میں استعمال ہونے والی ڈونٹ کی شکل بھی کرنوں والے سورج کی طرح ہی ہوتی تھی۔ جوڑا بندھ جانے کے بعد پچھلی لمبی لٹوں کو رول کرکے کچھ شانوں اور کچھ پیٹھ پر بکھیر دیا جاتا۔



بالوں کی لمبی لمبی چوٹیاں گوندھنے کا رواج اس وقت بالکل نہیں تھا۔ لیکن اپنے بالوں کو کالا اور گھنا رکھنے کی فکر شاید انھیں بھی اتنی ہی کھائے جاتی تھی جتنی آج کی عورت کو۔ اس مقصد کے لیے مختلف جڑی بوٹیاں استعمال ہوتیں۔

اس زمانے میں بعض مرتبہ (HOOD) ہُڈ اور مکٹ بھی استعمال کئے جاتے تھے۔ سارے بالوں کو اکٹھا کرکے سر کے اوپر جما لیا جاتا۔ اور پھر اس پر سے تاج کی طرح مکٹ پہن لیا جاتا۔

بھارت کے ان پرانے اسٹائلوں میں چینی اور جاپانی جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔ ان اسٹائلوں میں بالوں کو رول کرکے بوفائیں بنائی جاتی ہیں اور پھر ان کو مختلف حصوں میں پنوں کی مدد سے جما لیا جاتا ہے لیکن جاپانی اسٹائل میں کان ڈھانپ لیے جاتے ہیں، جبکہ بھارتی اسٹائل میں ہمیشہ بال کانوں کے پیچھے کر لیے جاتے ہیں۔

جوڑے نہ تو اتنے بڑے بنائے جاتے کہ ان کے آگے چہرہ بہت چھوٹا لگے اور نہ ان پر غیر ضروری زیور گہنے بھرے جاتے۔ سر کی سجاوٹ کے لیے موتی زیادہ استعمال ہوتے۔

روکھے اور خشک بالوں کی مثال کہیں نہیں ملتی۔ کیونکہ تیل اور پھول جوانی کے ضامن سمجھے جاتے تھے۔ غسل کے بعد گھنٹوں بالوں میں خوشبو لبا کر تیل لگایا جاتا۔

بعض بعض موقعوں پر بالوں میں درمیانی مانگ بھی نکالی جاتی لیکن مانگ نکالنے پر جوڑے زیادہ اونچے نہیں باندھے جاتے اور نہ سنتھالی جوڑوں کی طرح وہ مخروطی شکل میں پیچھے کو نکلے ہوتے۔ بلکہ انھیں پھیلا کر بنایا جاتا اور بعض مرتبہ دوہرے جوڑے باندھے جاتے۔ وینی درمیان میں دے کر سر سے بالکل لگا ہوا، ایک جوڑا باندھا جاتا اور اس کے اوپر ہی قدرے چھوٹی وینی کے ساتھ دوسرا جوڑا ہوتا۔ دونوں وینیوں کے درمیان آگ کے شعلوں نمایاں سورج کی شکل کا زیور لگا دیا جاتا۔ چھوٹی وینی کے جوڑے کے درمیان گول شکل کا بروچ ہوتا جس پر عام طور سے کسی نہ کسی دیوتا کا نقش بنا ہوتا۔ ان بچے ہوئے بالوں کو لچھوں میں رول کرکے کسی ایک شانے پر ڈال دیا جاتا۔ بالوں کے زیور اور جسم کے دوسرے زیورں میں یکسانیت کا خیال رکھا جاتا۔

اجنتا کی بعض عورتوں کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے جیسے ہم کسی انتہائی "ماڈرن" عورت کو دیکھ رہے ہیں۔ ہزاروں سال گزرنے کے بعد بھی ان ہی اسٹائلوں کا پرتو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ہم عورتیں فطری طور پر دقیانوسی ہوتی ہیں شاید اسی میں عورت پن کا راز چھپا ہو۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دقیانوسیت عورت پن ہے۔ بلکہ بعض ثقافتی قدروں میں اتنی اپنائیت اور مانوسیت ہوتی ہے



کہ صدیوں تک مروج ہونے کی وجہ سے وہ ہماری ثانوی فطرت بن جاتی ہے۔ قدیم ہندستان کے ہیر اسٹائلوں کے اس سرسری جائزے کے بعد ہم جدید ہندستان پر آتے ہیں۔

عظیم بھارت کے شمال سے جنوب تک ہم پہنچیں تو ہر جگہ نیچر کا نیا روپ رنگ، کلچر کی گوناگونی زبان کا اختلاف پہناوے کی تبدیلی رہن سہن، کھانا پینا، غرض ہر بات بدلتی جاتی ہے۔ بھارت کے شمال اور جنوب کا یہ متقابل جائزہ دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔ لیکن ہمیں بحث یہاں ہیر اسٹائل سے ہے۔

انسان کے رہن سہن اور پہناوے پر موسم کا براہ راست اثر پڑتا ہے۔ یہی حال ہیر اسٹائل کا بھی ہے۔ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ لداخ اور لیہ میں بڑی برفباری ہوتی ہوگی کیونکہ یہ جگہ ہمالیہ کے دامن میں بہت بلندی پر واقع ہے لیکن پرلطف بات یہ ہے کہ یہاں وادی کشمیر اور شملہ کی طرح برفباری نہیں ہوتی۔ البتہ یہاں سردی ناقابل برداشت ہوتی ہے۔ وہاں کے رہنے والے اس سردی کے شروع سے عادی ہوتے ہیں اس لیے اس سے نپٹتے رہتے ہیں۔ مردوں اور عورتوں کا روائتی ہیر اسٹائل ایک جیسا ہوتا ہے۔ یعنی مرد بھی چوٹیاں گوندھتے ہیں اور دونوں خاص چینی پگوڈا (PAGODA) اسٹائل کی ٹوپیاں پہنتے ہیں۔ دراصل یہاں زندگی کی کشمکش اتنی ہے کہ یہ لوگ اس طرف زیادہ دھیان نہیں دے پاتے۔

لداخ اور لیہ سے اتر کر کارگل KARGIL پر آیئے تو یہاں ہزاروں سنی ننھی چوٹیوں کا بریڈ (BRAID) اسٹائل ملتا ہے۔



ایک شاعر زندہ صاحب سال میں ایک بار محبوبہ اپنے محبوب کے گھٹنے پر ٹھوڑی رکھ کر بیٹھ جاتیں اور ان کا محبوب ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے، پیار بھرے انداز میں ان کی پیشانی پر ننھی ننھی چوٹیاں گوندھ کر سجا دیا کرتا تھا۔

یہی رواج کارگل سے اتر کر جہاں ایک زمانے میں مٹھی بھر نمک یا صابن کی ایک ٹکیہ کے بدلے لوگ بیش بہا چیزیں دینے کو تیار ہو جاتے تھے حسینوں کی وادی یعنی وادیٔ لولاب میں آیا اور کشمیر کی وادی میں پہنچ گیا۔

کشمیر میں میں نے کسی کے بال لمبے نہیں دیکھے۔ عام طور پر یہاں عورتیں دو چوٹیاں گوندھ کر سیدھی مانگ نکالتی ہیں لیکن سر کو پوری طرح سے ایک کپڑے سے چھپا لیتی ہیں جسے کسابہ کہا جاتا ہے اور اس پر سے کوئی رنگین رومال ڈال کر پیچھے گرہ لگا دی جاتی ہے۔ اس کسابہ اور رومال کے دو مقصد ہوتے ہیں۔ ایک تو سخت سردی سے بچاؤ اور دوسرا مقصد دنیا کی حریص نظروں سے بچاؤ ہوتا ہے۔ بال چونکہ حسن کی آرایش مانے جاتے ہیں، اس لیے ان کو مکمل طور پر چھپا لیا جائے تو دنیا کی نظریں حسن پر کم اٹھتی ہیں لیکن عورت کی فطرت میں جو نمائش ہے۔ وہ کسی طرح روکی نہیں جا سکتی۔ اگر بالوں کو چھپا لیا تو پیشانی سے کچھ اوپر اس قدر زیور پہن لیے جاتے ہیں کہ ساری کسر پوری ہو جائے۔

کشمیر کے بعد بنگال کو چھوڑ کر، جہاں کی زلفوں کا جادو شہرۂ آفاق ہے، اور کہیں ہیئر اسٹائل کے طبع زاد اسٹائل نہیں ملتے۔ مدھیہ پردیش میں قبائلی عورتیں اپنا رواج تھوڑا بہت نبھا رہی ہیں۔ جہاں بال ایک سادے سے جوڑے کی شکل میں کس کر گردن سے کافی اوپر باندھ لیے جاتے ہیں۔

جنوبی ہند میں بالوں کی سجاوٹ کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کیونکہ یہ اجنتا کی سرزمین ہے۔ بنگلوری کی ٹوڈا عورتیں عام طور پر اپنے گھونگھریالے بالوں میں بیچ کی مانگ نکال کر بال کھلے رکھنا پسند کرتی ہیں۔ جبکہ کیرالا میں جہاں بال گھنے اور کالے اور لمبے ہوتے ہوتے ہیں، ایک سادہ سا جوڑا ڈھیلے بالوں میں باندھ لیا جاتا ہے۔ آندھرا کی لمباڑی عورتیں بھی بڑے جتن سے اپنے بال بناتی ہیں۔ اور کانوں کے بجائے بالوں کی لچھوں میں وزنی جھمکے ڈالتی ہیں۔ ان کا اسٹائل تقریباً کارگل اور کشمیر کا اسٹائل ہوتا ہے۔

بعض ماہرین کا خیال ہے کہ عورت جتنا زیادہ وقت اپنے بناؤ سنگار میں لگائے اس میں اتنا ہی زیادہ عورت پن ہوتا ہے۔ اور اس کے سنگار میں زیادہ تر حصہ بالوں کی سجاوٹ کا ہوتا ہے۔ لیکن غالباً یہ اس زمانے کی بات ہے جبکہ عورت کو دنیا کی آبادی بڑھانے اور کھانے پکانے کے سوائے اور کام نہ ہوتا تھا۔

آج کی عورت کی ذمہ داریاں بہت بڑھ گئی ہیں۔ اوپر بتائے ہوئے کاموں کے علاوہ اسے ہر دم بدلتی ہوئی دنیا سے قدم ملائے چلنا پڑتا ہے اور آج کا مرد بھی عورت کو محض ایک آرائشی چیز نہیں سمجھتا بلکہ اس سے اور بھی کئی طرح کے اشتراک و تعاون مانگتا ہے۔ اور سب سے زیادہ آج کی عورت بڑھتی ہوئی گرانی اور ناکافی بجٹ کی جھنجھٹوں کو سوچ سوچ کر یوں ہی اپنے بال کھو بیٹھتی ہے۔ اس بیچاری کے پاس اتنا وقت کہاں کہ گھنٹوں وہ اپنی زلفیں سنوارتی رہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ سنگار اور سجاوٹ جو عورت کا پیدائشی حق ہے ختم ہو گیا ہے۔ ہاں اب اس کا ڈھنگ ضرور بدل گیا ہے۔

وگ کو تو موجودہ دور کی ایجاد تو نہیں کہا جا سکتا کیونکہ اس کی تاریخ نہ صرف کلیوپیٹرہ بلکہ اس سے پہلے بھی ملتی ہے۔ لیکن اس وقت وگ جانوروں کے بالوں کی بنائی جاتی تھی اور وگ کے بالوں میں ہیرے جواہرات تک پرو دیے جاتے تھے۔ لیکن فرعون کے زمانے میں ایک وہم چل نکلا کہ جو عورت جس جانور کے بالوں کی وگ پہنتی ہے اگلے جنم میں وہ اس جانور کے روپ میں پیدا ہو گی۔ لہٰذا عورتوں نے وگ کا استعمال ترک کر دیا۔

★

خالد شفائی

تخلیقِ سحر

(ایمرجنسی کے تابناک کارناموں کی نذر)

ساز بجتے ہیں فضاؤں میں "نظامِ نو" کے
ہر طرف گونجتے ہیں عیش و طرب کے نغمات
کتنی ہی اُجڑی ہوئی راہوں کو گلزار کیے
وادیٔ غم سے گزرتی ہے بہاروں کی برات

وہ اندھیرے کہ جو ہر سمت نحوست پھیلائے
ان اندھیروں کی جگہ اب ہیں اجالے آباد
آخرش ختم ہوا "طولِ شبِ عہدِ ستم"
صبح کے ہاتھ میں ہے "مشعلِ خورشیدِ جہاد"

ایک قانونی و دستوری عمل کے ہاتھوں
رہ گیا جھک کے "بدعنوانی" کا خونی پرچم
دیکھتے دیکھتے پسپا ہوئے "کالے سائے"
کھل گیا "تنگ پرستاروں" کا منحوس بھرم

وہ "لیڈرے" جو تھے "تخریبِ وطن کے دیلے"
کس لیے اپنے "بھرام" پہ ہیں گھبرائے ہوئے؟
جن کا مسلک تھا زراندوزی، ہوس، استحصال
اپنے کرتوت پہ ہیں کس لیے شرمائے ہوئے؟

آگئی جھومتی گاتی ہوئی خوشیوں کی گھڑی
ہر طرف امن و سکوں کی ہے گلابی چھائی
کتنا پرکیف ہے "خوشحالیٔ فردا" کا خیال!
زندگی لینے لگی شوخ و جواں انگڑائی

"محنت و جہدِ مسلسل" کی حسیں چھاؤں تلے
اک نئے عزم سے ہوتی ہے سحر کی تخلیق
ذوقِ تعمیر کے ہاتھوں، نئی اُتساہ کے ساتھ
نئی دنیا، نئے خورشید و قمر کی تخلیق

کشت و گلزار ہیں مستی نمو سے سرشار
کارخانوں میں مشینوں کا فسوں جاگا ہے
دفتروں اور ملوں میں ہے بہاروں کا سماں
ملک اور قوم کی خدمت کا جنوں جاگا ہے

احسان غازیپوری

غزل

شعلۂ زخمِ تمنا کو ہوا دی جائے
درد کی شدّتِ احساس بڑھا دی جائے

رہ گزر تیری شگوفوں سے سجا دی جائے
روشِ جنّتِ کشمیر بنا دی جائے

زندگی کو روشِ گل جو سمجھتے ہیں انھیں
گاہے گاہے رہِ پُرخار دکھا دی جائے

کون ہے آج جو دنیا میں خطاکار نہیں
محتسب کون بنے کس کو سزا دی جائے

خون تھوڑا سا رگِ لالہ و گل سے لے کر
اپنے حالات کی تصویر بنا دی جائے

دل میں معصوم محبت کے سوا کچھ بھی نہیں
یہ بھی اک جرم اگر ہے تو سزا دی جائے

عشق خاموش ہے لیکن تجھے بھولا تو نہیں
حُسنِ معصوم کو یہ بات بتا دی جائے

ساتھ جس موڑ پہ چھوٹا تھا اچانک ان کا
آج پھر ان کو اسی در سے صدا دی جائے

آؤ ارمان خیالات کی رنگینی سے
فکر و احساس کی یہ بزم سجا دی جائے

فیروز احمد

احسان اللہ عباسی

۱۸۵۷ء کے غدر کا جس کو ہم ہندستان کی پہلی جنگ آزادی کے نام سے یاد کرتے ہیں، منفی پہلو جیسا بھی ہو، یہ حقیقت ہے کہ اس کا ایک زبردست افادی پہلو بھی ہے، جس کے بارے میں کارل مارکس نے کہا تھا کہ "غیر شعوری طور پر اس غدر نے ہندستان میں ایک تاریخی کارنامہ انجام دیا ہے۔" یہ بات کس قدر درست ہے اور اس کی تشریح ایک غیر ضروری بات معلوم ہوتی ہے۔ اس ایک جملے میں جہاں صدیوں کی روایت سے بغاوت کا رجحان پوشیدہ ہے وہیں مادیت، عقلیت اور تشکیک جیسی قدروں سے رغبت بھی نمایاں ہے۔ غدر کے اس ہنگامے کے بعد ہی ہندوستان میں جدید خیالات و رجحانات کو واضح طور پر پھیلنے اور ابھرنے کا موقع ملا اور نئے نئے میلانات رونما ہوئے۔ سرسید (۱۸۱۷-۱۸۹۸ء) کی تحریک اپنے وسیع معنوں میں دراصل اسی مادیت، عقلیت اور تشکیک جیسی قدروں کا دوسرا نام ہے۔

یہ تحریک دراصل کچھ بیدار اذہان کی بیدار تحریک تھی جو وقت اور زمانہ کی نبض کو پہچانتے تھے۔ اس تحریک نے ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی پر بڑے گہرے اثرات مرتب کیے۔ اس تحریک کے مبلغین کا واحد مقصد کار اصلاحی و تعمیری تھا۔ مسلم نوجوانوں کو جدید علوم کی طرف راغب کرنا، ان میں سیاسی و سماجی شعور پیدا کرنا، معاشرے کی بدحالی و پست حالی کو ختم کر کے ایک خوشحال سماج کی تعمیر و تشکیل کرنا، شرک، بدعت اور اوہام پرستی کے قعر مذلت میں پڑے ہوئے مسلمانوں کو قدامت پسندی کے خول سے نکال کر ترقی پسندی کی راہ پر گامزن کرنا، تنگ نظری و خود غرضی کو ختم کر کے وسیع النظری، بلند خیالی اور خود اعتمادی کا احساس دلانا اس تحریک کے کچھ اہم اور بنیادی مقاصد تھے۔ ان مقاصد کی بر آری کے لیے عورتوں کی تعلیم و تربیت اور اس کی اہمیت کو معاشرے کی فلاح و بہبود کے لیے ضروری سمجھا گیا اس طرح ان اصلاح پسندوں نے ایک روشن خیال اور ترقی پسند سماج کی بنیاد رکھی جس کے بنیادی مقاصد خیالات و نظریات میں تنگ نظری کے بجائے وسیع النظری پیدا کرنا اور ماضی پر فخر کرنے کے بجائے حال کو روشن اور تابناک بنانا تھا۔

علی گڑھ تحریک کے ان بنیادی خیالات کی تبلیغ و اشاعت اس دور کے ہر اصلاح پسند نے اپنے اپنے طور پر کی ہے۔ نذیر احمد کے ناول، شبلی کی تاریخی کتابیں اور حالی کے سوانح و تنقیدی کتب اصلاح معاشرت ہی کی غرض سے تصنیف ہوئیں۔ ان میں ایک بیدار ذہن ہی نہیں بلکہ وقت اور زمانہ کی قدر و قیمت کا احساس بھی پوشیدہ ہے۔ احسان اللہ عباسی سرسید اور ان کے رفقاء اسی دور سے متعلق ہیں۔ ان کی شخصیت اور کارناموں پر سرسید اور ان کی تحریک کے بڑے گہرے اثرات مرتب ہیں۔ ان کی تصنیفات کے سرسری مطالعہ ہی سے پتہ چلتا ہے کہ اس عہد میں مسلمانوں کی فلاح و بہبود اور ان کی تعلیمی و سماجی، معاشی اور تہذیبی ترقی کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہو سکتی تھی وہ سب ان کی تحریروں، تقریروں اور علمی کاموں میں موجود ہیں۔

احسان اللہ عباسی مخدوم زادہ محمد اسمٰعیل المعروف بہ یوسف حسن کی چودھویں پشت میں ہیں[1] جن کا سلسلۂ نسب ۴۴ ویں پشت میں حضرت عباس

[1] تاریخ الاسلام از احسان اللہ عباسی (طبع چہارم ۱۹۳۱ء) ص ۵۴۴

سے ملتا ہے۔ مخدوم زادہ محمد اسمٰعیل عدن کے سلطان اعزالدین کے بیٹے تھے۔ نکودار خاں کے جبر و ستم سے تنگ آکر انھوں نے ہندوستان کا رخ کیا اور محمد تغلق کے عہد میں دہلی آئے۔ بادشاہ نے ان کو "مخدوم زادہ" کا خطاب عطا کیا اور ان کے معتزلی خیالات و نظریات کی وجہ سے ان کی بڑی عزت کی۔

محمد تغلق کے انتقال کے بعد جب محمد شاہ ابن فیروز شاہ تخت نشین ہوا تو ایک "شرعی معاملہ" میں اس کو اور مخدوم زادہ سے ان بن ہو گئی[1] جس کی وجہ سے مخدوم زادہ کو دہلی چھوڑ دینا پڑی۔ اور شمس الدین ابراہیم شاہ شرقی کے دورِ حکومت (۱۴۰۱-۴۰) میں جون پور چلے آئے۔ شمس الدین ابراہیم شاہ شرقی نے مخدوم زادہ کو بطور معافی پرگنہ چڑیا کوٹ عطا کیا۔ چنانچہ مخدوم زادہ اور ان کے دوسرے ساتھی جون پور چھوڑ کر چڑیا کوٹ آکر آباد ہو گئے۔ یہ وہی چڑیا کوٹ ہے جسے بعض عربی کتابوں میں "صریاکوط" لکھا گیا ہے۔ حیات شبلی کے مصنف اس چڑیا کوٹ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"...... اعظم گڑھ کے کھلے ہوئے دو حصے ہیں۔ ایک حصہ میں اکثر راج پوتوں یا دوسرے نومسلموں کی آبادی ہے جن کے آبا و اسلاف دوسرے اسلامی ملکوں یا شہروں سے ہجرت کرکے آئے یا آباد ہوئے .... انھیں اطراف میں اعظم گڑھ کا دوسرا مشہور قصبہ چڑیا کوٹ ہے۔ قدیم آبادی ہے۔ ابوالفضل نے آئین اکبری میں اس کا نام لیا ہے ...... غازی پور اور اعظم گڑھ کے بیچ میں واقع ہے۔ عباسی شیوخ جن کو قضا کی خدمت سپرد تھی یہاں آباد تھے۔ اسی خاندان سے مولوی قاضی علی اکبر اور ان کے دو صاحبزادے مولوی عنایت رسول اور مولانا فاروق تھے۔"[2]

احسان اللہ عباسی چڑیا کوٹ کے اسی نامور خانوادے میں ۱۲۸۲ھ (مطابق ۱۸۶۵ء) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام عزیزالدین تھا۔ بچپن ہی میں شفیق باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ مہربان چچا نصیرالدین نے سرپرستی کی اور انھیں تحصیل علم کے لیے ان کے "چچا" مولوی فاروق صاحب کے سپرد کر دیا جن سے انھوں نے مشرقی علوم کی تحصیل کی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ سرسید غازی پور میں صدرالصدور تھے اور مسلمانوں میں انگریزی تعلیم رائج کرنے کے لیے مسلسل جد و جہد کر رہے تھے۔ ان کی کوششوں اور کاوشوں سے علی گڑھ میں مدرسۃ العلوم (۱۸۷۵ء) کا قیام عمل میں آچکا تھا۔ چنانچہ غازی پور میں جب سرسید نے مولوی عنایت رسول سے طالب علموں کی فراہمی میں مدد چاہی تو انھوں نے فوراً احسان اللہ عباسی کو پیش کر دیا۔ اس طرح احسان اللہ عباسی مشرقی یوپی کے ان چند طلبہ میں پہلے طالب علم ہوئے جن کو سرسید اپنے ساتھ علی گڑھ لے گئے تھے۔[3] یہاں انھوں نے تقریباً ۵ سال تک بہ سلسلۂ تعلیم قیام کیا۔ علی گڑھ سے مڈل کا امتحان پاس کرکے یہ گورکھ پور چلے آئے جہاں ان کی شادی ۱۶ یا ۱۷ برس کی عمر میں شیخ گدا حسین کی صاحب زادی قمرالنساء سے کر دی گئی۔ شادی کے بعد ان کا قیام مستقل طور پر گورکھپور ہی میں ہو گیا۔ یہاں سے انھوں نے وکالت کا امتحان پاس کیا اور پہلے بانس گاؤں بعد ازاں گورکھ پور سول کورٹ میں وکالت کرنے لگے اور عمر کے آخری ایام تک بحیثیت ایک کامیاب وکیل زندگی بسر کی۔ ۷ رمارچ ۱۹۲۸ء مطابق ۱۴ رمضان المبارک ۱۳۴۶ھ کو گورکھ پور میں انتقال کیا۔ سید ضیاءالحسن صاحب بھوپالی نے قطعہ تاریخ وفات کہا ؎

چوں احسان اللہ عباسی نکونام ... بسیر باغ رضواں گشت راہی
ضیا بنوشت سال رخصت او ... نشیمن قصر جنت باد الٰہی

۱۳۴۶ھ

احسان اللہ عباسی کی شخصیت ایک نیک دل اور پاک سیرت انسان کی شخصیت تھی۔ ان کے قول و فعل میں بالکل تضاد نہ تھا۔

---

[1] تاریخ الاسلام از احسان اللہ عباسی (طبع چہارم ۱۹۱۲ء) ص ۳۴ [2] حیات شبلی از سید سلیمان ندوی ص ۵۰، ۵۶

[3] شمیم عشرت از اسد اللہ عباسی، مطبع رفاہ عام گورکھپور ۱۹۴۱ء

[4] نشتر سخن (۱۹۱۱ء) از احسان اللہ عباسی ص ۱۶

وقت کی بڑی قدر و قیمت کرتے تھے۔ ملک و قوم کی فلاح و بہبود کے لیے ہمہ وقت کوشاں رہتے، اور قومی عزت و قومی افتخار کے لیے عورتوں کی تعلیم و تربیت اور ان کی اہمیت پر ہمیشہ زور دیتے تھے۔ انگریزی وضع قطع کا لباس پہنتے اور انگریزوں کے طرزِ عمل اور طرزِ فکر کو اپنانے کے لیے دوسروں کو ترغیب دیتے تھے۔ کیونکہ ان کے خیال میں "انگریز قرآن کو نہیں مانتے لیکن ان کا عمل زیادہ تر قرآن کے موافق ہے۔"[1]

سرسید اور ان کے دوسرے رفقا کی طرح وہ بھی بیک وقت دینی اور دنیاوی ترقی کے خواہاں تھے۔ ان کا قول تھا کہ "آخرت درست نہیں ہو سکتی جب تک کہ دنیا درست نہ ہو۔"[2]

احسان اللہ عباسی کو سیاست میں بھی دخل تھا۔ اگرچہ انھوں نے کبھی عملی طور پر سیاست میں حصہ نہیں لیا تھا تاہم قومی معاملات سے اپنی دلچسپی کا اظہار اکثر اخباروں میں مضامین اور مراسلے لکھ کر کیا کرتے تھے۔ سنہ ۱۹۲۰ء کے اخبار مشرق میں "ہند کے قومی، ملکی، اخلاقی اور قانونی ضروریات" کے عنوان سے ان کا ایک طویل مراسلہ متواتر کئی قسطوں میں شائع ہوا تھا جس میں قومی، ملکی، اخلاقی اور قانونی ضروریات و مسائل کی نشان دہی کر کے ان کو دور کرنے کے لیے ضروری مشورے دیے گیے تھے۔ اس مضمون سے یہ بات بھی منکشف ہوتی ہے کہ انڈین نیشنل کانگریس کے قیام کے بعد ہی سے وہ اس کے سخت مخالف تھے[3] ان کی مخالفت کی وجہیں بالکل وہی تھیں جو سرسید احمد خاں کے سلسلے میں بیان کی جاتی ہیں لیکن سنہ ۱۹۲۰ء تک چونکہ ملک کی سیاسی، سماجی، اقتصادی اور تعلیمی صورتِ حال میں بڑی حد تک تبدیلی آچکی تھی۔ اس لیے بہ اقتضائے وقت انھوں نے ضروری سمجھا کہ کانگریس کی مخالفت ترک کی جائے اور مسلمان بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ دیں۔ یہی نہیں بلکہ انڈین نیشنل کانگریس میں شریک ہو کر کانگریس کے عظیم مقاصد کی برآوری میں

ممد و معاون ثابت ہوں۔ ان کی انگریزی کتب انڈیا اینڈ برٹش گورنمنٹ (INDIA & BRITISH GOVERNMENT) اور دی فیوچر آف انڈیا (THE FUTURE OF INDIA) میں انھیں خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔

احسان اللہ عباسی جس عہد میں سانس لے رہے تھے وہ اپنی کیفیت و کمیت کے لحاظ سے عبوری دور تھا۔ اس دور میں مسلمانوں کی حالت میں جو کچھ تبدیلی رونما ہو رہی تھی اس کا ذمہ دار وہ سرسید مرحوم کو قرار دیتے تھے۔ علی گڑھ تحریک کے اثرات سے مسلمانوں میں جو بیدار ذہن پیدا ہو رہا تھا اس سے وہ بڑے خوش تھے۔ اسد اللہ عباسی نے لکھا ہے کہ:

"سرسید احمد خاں مرحوم سے والد ماجد کو خاص عقیدت تھی۔"

سرسید سے اس خاص عقیدت کی وجوہ ظاہر ہیں۔ سرسید کی شخصیت چونکہ ایک عظیم مصلحِ قوم کی شخصیت تھی اور سنہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ غدر کے بعد مسلمانوں کے مستقبل کو سنوارنے اور انھیں زندگی کا ایک واضح اور بلند مرتبہ نصب العین دینے میں ان کی کوششوں اور کاوشوں کو بڑا دخل تھا اس لیے جس قدر احسان اللہ عباسی کی شخصیت اور ان کے ادبی اصلاحی کارناموں پر سرسید کے خیالات و نظریات کے اثرات ہیں اتنے اس عہد کے کسی دوسرے ادیب کے نہیں ہیں۔ یہ بات اس لیے درست قرار دی جا سکتی ہے کہ سرسید کے نامور رفقا نے زیادہ تر انھیں خیالات و نظریات کی تبلیغ کی ہے جو سرسید کے پیش کردہ ہیں۔ سرسید اور ان کے نامور رفقا کے یہی خیالات علی گڑھ تحریک کے نام سے موسوم کیے جاتے ہیں۔ اس تحریک میں احسان اللہ عباسی نے بھی عملی طور پر حصہ لیا اور اس کے بنیادی خیالات و نظریات کی تبلیغ و اشاعت ہی نہیں بلکہ اسے مزید رنگ و آہنگ دینے اور ملک گیر کرنے میں نمایاں کارنامے انجام دیے۔

---

[1] المجاہد (سنہ ۱۸۹۰ء) از احسان اللہ عباسی ص ۱۱۲ [2] المجاہد (سنہ ۱۹۱۰ء) از احسان اللہ عباسی ص ۸۳
[3] اخبار مشرق (حکیم برہم) نمبر ۱۱، جلد ۱۴، ۱۱ر مارچ سنہ ۱۹۲۰ء

احسان اللہ عباسی کی تصنیفی و تالیفی زندگی کا آغاز علی گڑھ کے علمی و ادبی ماحول کے زیر اثر بچپن ہی میں ہوا۔ اپنی طالب علمی ہی کے زمانہ میں یہ ترجمہ و تصنیف کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ لیمبس ٹیلس (LAMBS TALES) کا اردو ترجمہ "فسانہ دلپذیر" اسی دور کی یادگار ہے۔ اس ترجمہ پر جب منشی نول کشور کی نظر پڑی تو انھوں نے احسان اللہ عباسی سے حق تالیف خرید کر اسے شائع کر دیا۔ اس کی اشاعت کے وقت انھوں نے اس کے مترجم کو 'علامہ الدہر' کا خطاب بھی دیا تھا۔ چنانچہ احسان اللہ عباسی کے نام سے پہلے جو 'علامہ' لفظ لگا ہوا ہے وہ منشی نول کشور ہی کا عطا کردہ ہے۔ اسی زمانہ میں انھوں نے علم ریاضی کے موضوع پر اور بھی چند چھوٹے چھوٹے رسالے ترتیب دیے تھے جو زمانہ کی دستبرد سے محفوظ نہ رہ سکے۔

علی گڑھ میں رہ کر احسان اللہ عباسی کی فطرت میں قدرت نے جو جواہر ودیعت کیے تھے ان کی نشو و نما کے بھرپور مواقع فراہم ہوئے اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ انھوں نے سرسید کی بلند شخصیت کا کس قدر اثر قبول کیا اس کا اندازہ ان کی کثیر تصانیف اور علمی اصلاحی کاموں سے کیا جا سکتا ہے۔

احسان اللہ عباسی ایک وکیل تھے۔ ایک وکیل کی بے حد مصروف زندگی میں انھوں نے مختلف موضوعات پر متعدد کتابیں تصنیف کیں ان تصانیف کی مجموعی تعداد اٹھارہ ہے۔ وہ بیک وقت مورخ، ناول نگار، ماہر قانون اور سیاست داں (اگرچہ انھوں نے کبھی عملی طور پر سیاست میں قدم نہیں رکھا) کے علاوہ قرآن کے مترجم اور حضرت مجدد الف ثانی کے سوانح نگار کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں۔ بحیثیت مجموعی وہ اصلاح قوم کے شیدائی تھے۔ ان کی ہر کتاب میں (بہ استثنائے چند) اصلاح معاشرت کی روح جلوہ گر ہے جس کی بنیاد مذہب پر ہے۔ مذہب اور اصلاح معاشرت یہ دونوں لفظاً اپنے پیش رووں کی طرح احسان اللہ عباسی کے یہاں بھی گھلے ملے ہوئے ہیں۔ مذہب کو ساتھ لیے بغیر وہ ایک قدم بھی آگے بڑھنا نہیں چاہتے۔ اسے دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ وہ مذہب کے بغیر ایک لقمہ بھی نہیں توڑ سکتے۔

ترجمۂ قرآن (۱۹۱۴ء)، تاریخ الاسلام[۱] (۱۸۹۹ء) اور الاسلام[۲] (۱۹۵۲ء) ان کی خالص مذہبی کتابیں ہیں۔ یہ کتابیں ان کے مذہبی خیالات کو سمجھنے میں بڑی معاون ثابت ہوتی ہیں۔ ان کی تصنیف و ترجمہ کا واحد مقصد کار اصلاحی و تعمیری ہے۔ مزید برآں تاریخ الاسلام اور الاسلام کی موجودگی ترجمہ قرآن کو تفسیر قرآن کے زمرے میں شامل کر دیتی ہے کیونکہ یہ دونوں کتابیں اس کے مصنف کی قرآن فہمی اور اسلامی تاریخ سے کماحقہٗ واقفیت کا نتیجہ ہیں۔ ان کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ احسان اللہ عباسی سرسید اور ان کے دیگر رفقاء کی طرح مذہب کی ظاہری صورتوں کے قائل نہ تھے بلکہ مذہب کی اصل روح کو مسلمانوں کے سامنے پیش کرنا چاہتے تھے۔ غالباً یہی خیالات سرسید اور نذیر احمد وغیرہ کے بھی تھے جن کے پیش نظر ان بزرگوں نے تفسیر القرآن خطبات احمدیہ اور تفسیر القرآن کی تصنیف کی۔

اصلاح معاشرت اور قوم میں پھیلی ہوئی شرک، بدعت اور اوہام پرستی کے لعنتوں کے علاوہ مختلف تعلیمی، سماجی اور تہذیبی خامیوں کو دور کرنے کی غرض سے آپ نے زاہدہ[۳] (۱۸۹۶ء) اور المجاہد[۴] (۱۸۹۷ء) دو اصلاحی ناول تصنیف کیں۔ ان دونوں ناولوں میں نذیر احمد کے ابتدائی ناولوں کا عکس صاف نظر آتا ہے۔ نذیر احمد کے ابتدائی قصوں کی طرح یہ ناول بھی پلاٹ، ترتیب اور کرداروں کی شخصیت ان کی گفتگو اور عمل میں یکسانیت کے لحاظ سے خام نظر آتے ہیں۔ لیکن ہمیں ان ناولوں میں فنی پختگی کے بجائے ناول نگار کے مقصد کو سامنے رکھنا چاہیے۔ کیونکہ یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ ناول نگار نے اصلاح معاشرت کے بعض پہلوؤں کو سامنے رکھ کر ان کی تصنیف

۱؎ ۱۹۷۲ء تک اس کے چار اڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ ۲؎ الاسلام کا تیسرا اڈیشن اکتوبر ۱۹۶۲ء میں علوی بک ڈپو بمبئی سے شائع ہوا ہے۔

۳؎ زاہدہ میں مذہب اسلام کے تمام اہم اصولوں کی تشریح ناول کے پیرایہ میں کی گئی ہے۔ ۴؎ المجاہد کا موضوع جائداد پدری میں لڑکیوں کے حقوق کو جائز قرار دینا ہے

کی ہے۔ اس لیے مقصدیت کا حامل ہونا ایک ناگزیر امر ہے۔

احسان اللہ عباسی نے ہندستانی خواتین کے مسئلوں کو نہ صرف نزاہتہ اور النجابہ بلکہ محنت الابراہیم[1] (سنہ ۱۸۹۵ء) میں قوم کے سامنے پیش کیا اور انہیں دور کرنے کی ضرورتوں پر زور دیا بلکہ قوم کی معاشی اور اقتصادی حالت کو بہتر بنانے اور ملک کے نوجوانوں میں صنعت و حرفت اور تجارت کا شوق پیدا کرنے کی غرض سے "بنے فکر دنیا" کی تصنیف کی۔ اس طرح علی گڑھ کے بنیادی خیالات کو احسان اللہ عباسی نے اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ قوم کے سامنے پیش کر کے ایک خوش حال اور ترقی پسند خیالات پر مبنی سماج کی تعمیر و تشکیل کا تصور پیش کیا۔

احسان اللہ عباسی کے یہاں صرف موضوع اور فکر ہی پر علی گڑھ تحریک کے اثرات نہیں ہیں بلکہ ان کے اسلوب پر بھی اس تحریک کے نمائندہ اسلوب کی گہری چھاپ ہے جس کا تجزیہ کیے بغیر اردو ادب میں احسان اللہ عباسی کے مرتبے کا تعین نہیں کیا جا سکتا۔

علی گڑھ تحریک سے وابستہ ادیبوں کے پیش نظر شروع ہی سے یہ بات رہی ہے کہ کام کی بات کام کی زبان میں کرنی چاہیے تاکہ طلسمی اثرات مرتب ہوں۔ سرسید نے اسی مقصد کے پیش نظر سب پہلے زبان و ادب میں اصلاح کی ضرورت پر زور دیا۔ ان کا نظریہ تھا کہ خیالات کی ادائیگی کا صاف اور سیدھی عبارات اختیار کرنا چاہیے جس سے جو بات اپنے دل میں ہو وہی دوسرے کے دل میں اتر جائے۔ رنگین اور مقفیٰ و مسجع عبارت سے احتراز دراصل انہی خیالات کا ایک اہم جزو تھا۔

سرسید کے ان خیالات کے واضح اثرات ہم کو سب سے زیادہ حالی کے یہاں نظر آتے ہیں۔ احسان اللہ عباسی اپنے اسلوب کے سلسلے میں سب سے زیادہ سرسید اور حالی سے متاثر ہیں اور ان کا اسلوب انہی دونوں بزرگوں کے اسلوب کے قریب ہے۔ متانت اور سنجیدگی احسان اللہ عباسی کی نثر کا طرۂ امتیاز ہے۔ اس میں سادگی، خلوص اور مافی الضمیر کو مختصر الفاظ میں ادا کر دینے کی صلاحیت موجود ہے۔ الفاظ سادہ، سلیس اور رواں ہیں۔ انگریزی الفاظ کا برمحل اور برجستہ استعمال سرسید اور حالی کی نثر کی یاد دلاتا ہے۔ یہاں وہ شوخی اور نفاست نہیں ہے جس کی وجہ سے مہدی افادی صاحب طرز انشا پرداز کہلائے۔ اکثر تشبیہات و استعارات کا بھی استعمال ہے مگر اس سے خیالات کی ادائیگی میں کوئی رکاوٹ نہیں پڑی۔ نثر کی ان خصوصیات کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کی نثر ان کے اصلاحی خیالات کا مکمل آئینہ ہے۔

ان تمام شواہد کی بنا پر یہ بات حتمی طور پر کہی جا سکتی ہے کہ احسان اللہ عباسی نے اپنے عہد کی مکمل پیداوار تھے۔ ان کے اصلاحی خیالات و نظریات کی بنا پر ان کو اپنے عہد میں مقبولیت حاصل ہوئی۔ وہ مصلح قوم تھے اور اپنی قوم کو "آسمان کی مانند بلند" اور "مہذب قوموں کے شانہ بشانہ ترقی کی راہ پر گامزن" دیکھنا چاہتے تھے اسی لیے انھوں نے قرآن کا ترجمہ کیا، اصلاحی ناول لکھے اور مورخ بن کر اسلام کی تاریخ کو از سر نو پیش کیا۔ علی گڑھ اور دلی سے دور افتادہ مقام (گورکھپور) پر رہ کر مشرقی اضلاع میں سرسید کے خیالات اور ان کی تحریک کو مزید رنگ و آہنگ دینے اور اسے ملک گیر کرنے کی جتنی کوشش اور جدوجہد احسان اللہ عباسی نے کی، اتنی اس دیار کے کسی دوسرے ادیب نے نہیں کی۔ احسان اللہ عباسی کے یہی ادبی کارنامے ہیں جو ان کو اپنے عہد کے گورکھپور کے دوسرے ادیبوں سے ممتاز کرتے ہیں اور ان کو اس صف میں لا کر کھڑا کر دیتے ہیں جس کا براہ راست تعلق علی گڑھ تحریک سے ہے۔ اس لحاظ سے اگر ہم ان کو مشرقی اضلاع کا سرسید کہیں تو مبالغہ نہ ہوگا۔

---

[1] محنت الابراہیم عقد بیوگان کے موضوع پر ایک کتابچہ ہے۔

✱

وزیر اعظم اندرا گاندھی کا بھارتی ماں بہنوں سے خطاب

حکیم جوہر شاہ وارثی

میری ماں بہنوں ہے تم سے عزت و شان وطن
کوئی ہے روح وطن تم میں کوئی جان وطن

ارض بھارت میں ہو نکہت بیز ہر جا مثل گل
تم ہو بیشک زینت صحن گلستان وطن

تم کو حاصل ہے مساوی حق مقابل مرد کے
صدر محفل وہ ہیں تم شمع شبستان وطن

تم میں جذبہ ملک کی خدمات کا بے لوث ہے
تم اگر چاہو تو جا سکتی نہیں آن وطن

سب سے زیادہ تم منظم ہو تمھیں ہو باشعور
روشنی تم سے ہے تم ہو ماہ تابان وطن

اپنے اپنے گھر کی تم سب ہو نگہباں جس طرح
تم اسی طرح سے بن جاؤ نگہبان وطن

اپنے بچوں کو بتا دو تم وفاداری کی بات
انتشار و ظلم سے گھٹ جاتی ہے شان وطن

تم اگر سمجھا دو ٹالیں گے نہ ہرگز ماں کی بات
یہ تمہاری گود کے پالے جوانان وطن

عقل باپو کی زباں نہرو کی سنے بانی نے
یہ کبھی جانے نہ دیں گے جیتے جی آن وطن

تم بھی ہو ضامن سماجی عدل اور انصاف کی
ڈھونڈھتی ہے اب تمہیں کو چشم حیران وطن

تم سماجی اور معاشی نظم کی ہو ذمہ دار
اس میں نقص آیا اگر مٹ جائے گی شان وطن

شرط ہے یہ پائے استقلال میں لغزش نہ آئے
پھر نہ دھوکا دے سکیں گے تم کو نادان وطن

متحد ہوں ہو کے ملک و قوم کی خدمت کرو
دیکھ کر شرمائیں تم کو جاں نثاران وطن

قوم کا کر دو بلند اس طرح معیار حیات
یہ نہ کوئی کہہ سکے یہ ہیں غلامان وطن

امن و آزادی تعاون دوستی کردار قوم
ان پہ حرف آنے نہیں دیتے محبان وطن

آبیاری مل کے ہم تم رات دن ایسی کریں
اب نہ ہو نذر خزاں صبح بہاران وطن

تم منافع خوری اور ہڑتالیں ہونے ہی نہ دو
تم جو چاہو ہو نہیں سکتا ہے نقصان وطن

جب بڑھے فرقہ پرستی ملک میں تم روک دو
اس سے تو ہل جاتی ہے بنیاد ایوان وطن

زحمتوں اور دقتوں کو دور کر سکتی ہو تم
تم تباہی سے بچا سکتی ہو سامان وطن

تم بھی ہو جاؤ ترقی والے کاموں میں شریک
تم سے ہے طالب تعاون کا گلستان وطن

ہو گا مستحکم جب ہی قومی معیشت کا نظام
ساتھ میں جب ہو گی تم ہمراہ خاصان وطن

تم اٹھا کر دیکھ لو اسلاف کی تاریخ کو
تم نے بنوایا انھیں شیر نیستان وطن

دونوں سے روشن ہے بھارت کے روز و شب سدا
تم مہ تاباں تھیں وہ مہر درخشان وطن

ہمت افزائی و دلجوئی کرو ہر ایک کی
چاہے ہندو ہو کوئی چاہے مسلمان وطن

میرا مقصد ہے کہ ایسی ملک کی خدمت کرو
تم صف اول میں ہو جاؤ نگہبان وطن

تم نے دیکھا اس وطن کو اور وطن والوں کو بھی
لے گئے تھے قرب آتش فتنہ سامان وطن

فرقہ بندی افترا قانون شکنی خلفشار
مثل بازیچہ تھے اشغال طفلان وطن

کارفرما صرف اغراض سیاسی تھے ادھر
کہہ کے ہڑتالیں مٹا دیتے تھے جو آن وطن

ظاہرا جمہوریت کی بس دہائی دیتے تھے
بھول کر تعمیر کو تخریب کاران وطن

ہم کو رخ دستور کی حد میں بدلنا ہی پڑا
جب نہیں دیکھا گیا حال پریشان وطن

تم کو جوہر کی طرح ہم سے محبت ہے اگر
تم ہماری ہم تمہارے یہ ہے اعلان وطن

اوم پرکاش بجاج

بھول بھلیاں

(افسانہ)

اپنے حسن و جمال کی جادوگری سے پربھا اپنے شوہر رمیش پر اس طرح چھا گئی کہ اس نے رمیش کی شخصیت کو اپنی شخصیت میں جذب کر لیا تھا۔ وہ جو چاہتی رمیش وہی کرتا، جس چیز کی فرمائش کرتی رمیش فوراً اس کو پوری کر دیتا۔ وہ ایک بہت بڑے گھر کی لڑکی تھی، رمیش نے بھی اسے ویسا ہی بڑا گھر دیا تھا۔ اس گھر میں سب کچھ تھا۔ عمدہ فرنیچر تھا۔ قیمتی قالین ریشمی پردے تھے۔ غرضیکہ آرائش اور تفریح طبع کی سبھی چیزیں مہیا تھیں۔

اپنے والدین کے گھر کی طرح پربھا کو اپنے پتی کے گھر بھی کوئی کام نہ تھا۔ سارا دن وہ آرام کرتی یا آرائش جمال میں مشغول رہتی۔ بچپن سے ہی اسے بے دریغ خرچ کرنے کی لت تھی۔ یہ عادت شادی کے بعد بھی اس نے برقرار رکھی۔ جب بھی وہ بازار جاتی، ضرورت نہ ہونے پر بھی ساریاں، زیبائش کا سامان، سینڈل، پرس اور دوسری آرائش کی چیزیں خرید لاتی۔ اسے خریدنے کی لت تھی اور اس لت کے تحت وہ اندھا دھند روپیہ خرچ کرتی رہتی تھی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ رمیش نے اپنا جدی مکان بیچ دیا۔ بینک میں جو رقم تھی وہ بھی دھیرے دھیرے سب نکلوا کر صرف کر دی۔ دو ایک چٹ فنڈ کمپنیوں سے بھی بھاری سود پر روپیہ ادھار لیا۔ کچھ عرصہ کے بعد تو اس کا جاننے والا کوئی ایسا نہ تھا جس سے اس نے روپیہ ادھار نہ لیا ہو۔ اس کے سر پر ہر دوکاندار کا قرض تھا۔ دودھ والے کے اس نے پچھلے چھ مہینے سے پیسے نہ دیئے تھے۔ نوکر پچھلے چار مہینوں سے اپنی تنخواہ کا بدستور تقاضہ کر رہا تھا۔ سبزی، ڈبل روٹی، مکھن والے اپنے پچھلے بلوں کی عدم ادائیگی کی وجہ سے تلملا اٹھے تھے۔

لیکن رمیش پربھا سے سب کچھ چھپاتا رہا۔ اس نے نوکر کو ہدایت کر دی تھی کہ وہ پربھا سے کبھی مالی مشکلات کا ذکر نہ کرے۔ پربھا سے شادی کرنے کے لیے اس نے اپنی امارت کا یونہی ڈھونگ رچا رکھا تھا۔ اپنی تنخواہ کے بارے میں جھوٹ بولا تھا۔ یہی جھوٹ رمیش کے لیے وبال جان بن گیا تھا۔ وہ اب ایسے جال میں پھنس گیا تھا کہ اس سے باہر نکلنا محال ہو گیا تھا۔ دن بہ دن قرض بڑھتا جا رہا تھا اور رمیش کی ذہنی پریشانی میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ دفتر میں اس سے کام نہ ہوتا۔ گھر میں اسے نیند نہ آتی۔ اس کا دماغ چکرانے لگا تھا۔ رمیش جھوٹ کا قیدی بن گیا تھا۔ وہ پربھا پر حقیقت ظاہر کرنے کی ہمت نہ رکھتا تھا۔ جھوٹ اور فریب نے اس کو اس طرح گھیر لیا تھا کہ وہ بے بس اور نڈھال ہو گیا تھا۔ فریب کے جال سے نکلنا اسے ایک امر محال دکھائی دیتا۔ ادھر پربھا اس کی اس مصیبت میں مدد کرنے کے بجائے اخراجات اور ادھار کے بوجھ سے اسے لادے جا رہی تھی۔ عیش و عشرت میں زندگی گزارنے کا چلن، زندگی کو طربیہ سے المیہ میں تبدیل کرتا جا رہا تھا۔

مالی مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لیے رمیش نے ایک جگہ پارٹ ٹائم کام بھی شروع کر دیا تھا۔ اس نے تہیہ کیا تھا کہ وہ گھر کے اخراجات کو قابو میں لے آئے گا۔ وہ پربھا پر اپنا جھوٹ ظاہر کیے بغیر اپنی زندگی کا طلسم بنائے رکھنے کے لیے جدوجہد کرنے لگا مگر اب بہت دیر ہو گئی تھی۔ پانی سر سے اونچا ہو گیا تھا۔ رمیش کو پارٹ ٹائم نوکری کرتے ہوئے ابھی دو مہینے ہی ہوئے تھے کہ اچانک ایک دن کورٹ کا قرق امین قرقی کا حکم لے کر اس کے ڈرائنگ روم میں آ کھڑا ہوا۔ اس کو قرض دینے والوں نے اس کے گھر کی ایک ایک چیز کی قرقی کا حکم حاصل کر لیا تھا۔ رمیش کو دنیا گھومتی ہوئی تاریک ہوتی ہوئی نگلتی ہوئی معلوم ہوئی۔ اس کی بیوی پربھا سکتہ میں آ گئی۔ اگر ان کے پڑوسی ورما صاحب نہ آ جاتے اور پوری رقم اسی وقت نہ چکا دیتے تو ان کے گھر کی ایک ایک چیز قرق ہو جاتی ان کا سارے محلے میں منہ کالا ہو جاتا۔ زندگی ان کے لیے ایک شرمناک مذاق بن کر رہ جاتی۔

اب پربھا نے رمیش سے کچھ سیدھے سوال کیے:

"یہ سب کیا ہے؟ تمھاری ایک ہزار کی آمدنی کو کیا ہوا؟"

"میری آمدنی ہزار نہیں، چار سو ہے" رمیش نے دبک کر کہا۔ آج رمیش نے پہلی مرتبہ اپنی زندگی کے راز سے پربھا کو آگاہ کیا۔

"تو تم نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا کہ تمھاری آمدنی ہزار سے اوپر ہے مجھے دھوکا دیا؟"

"ہاں" رمیش نے زمین کی طرف دیکھتے ہوے کہا۔

"میں نے تمھیں اور تمھارے والد کو دھوکا دیا تھا لیکن اس لیے نہیں کہ میں ایک بڑے گھر کا داماد بننا چاہتا تھا یا ان کی دولت چاہتا تھا۔ بلکہ جس وقت سے تمھیں دیکھا تھا، تمھیں اپنا بنانے کی دھن میرے من میں سما گئی تھی۔ اور جھوٹ ہی اک ایسا راستہ تھا جو مجھے تم تک پہنچا سکتا تھا۔"

لیکن شادی کے بعد تو تم مجھے حقیقت بتا سکتے تھے۔ پربھا نے اپنی جھنجھلاہٹ پر قابو پانے کی بھرپور کوشش کرتے ہوئے کہا۔ میں ایک بڑے گھر کی بگڑی ہوئی لڑکی ضرور تھی لیکن میں اس آدمی کی زندگی تو تباہ کرنا نہ چاہتی تھی جو مجھے دل و جان سے چاہتا تھا۔ جسے میں خود پسند کرتی تھی۔ جس نے میری خوشنودی کے لیے اپنے آپ کو تباہ کر ڈالا۔ کیا تم سچ نہیں بول سکتے تھے!"

"بول سکتا تھا۔ کئی بار میں نے ہمت بھی کی لیکن میں اپنے جھوٹ کا قیدی بن چکا تھا۔ ہر دن جو گزرتا تھا میرے جھوٹ کی دیواروں کو مضبوط کرتا چلا جاتا تھا اور میں اپنے آپ کو ہر وقت کمزور، بے زبان اور بے بس پاتا تھا۔ میری جرأت بزدلی میں تبدیل ہو جاتی تھی، خون دو اس کا ایک گہرہ جذبہ جنم لے کر میرے سر پر سوار ہو جاتا تھا۔"

"مگر تم نے تو کبھی بالواسطہ بھی ذکر نہ کیا۔ میں ان مہتا صاحب کو کنجوس کہا کرتی تھی، بچت کرنے کی مخالفت کیا کرتی تھی اور تم ہمیشہ میری ہاں میں ہاں ملایا کرتے تھے۔ تم نے مجھے کبھی ٹوکا کیوں نہیں؟"

"میں تمھیں ناراض کرنا نہیں چاہتا تھا پربھا۔ یہ حسن، یہ رنگ روپ یہ ناز و انداز میری زندگی سے روٹھ کر چلے جائیں، یہ میں برداشت نہ کر سکتا تھا۔ میں اپنے آپ کو فنا کر سکتا تھا مگر کسی بات پر تمھارا دل نہیں توڑ

نیا دور کے قلمی معاونین سے

۱۔ نیا دور کو اشاعت کی غرض سے بھیجی جانے والی تخلیقات کاغذ کے صرف ایک جانب حاشیہ چھوڑ کر اور بین السطور دے کر خوشخط اور صاف تحریر میں ہونا چاہیے۔

۲۔ ادارہ نیا دور کو جو تخلیقات موصول ہو جاتی ہیں ان کی حفاظت کا پورا پورا خیال رکھا جاتا ہے تاہم ڈاک میں ان کے ضائع ہو جانے کا امکان بھی رہتا ہے اس لیے قلمی معاونین سے استدعا ہے کہ نیا دور کو بھیجی جانے والی ہر تخلیق کی نقل اپنے پاس ضرور محفوظ رکھیں۔

۳۔ نیا دور کو اتنی کثیر تعداد میں تخلیقات خاص طور سے غزلیں موصول ہوتی ہیں کہ ہر ایک کی علاحدہ علاحدہ رسید بھیجنا ممکن نہیں ہے اس لیے رسید یا جواب کے لیے جوابی پوسٹ کارڈ یا لفافہ آنا ضروری ہے۔

۴۔ اگر کوئی تخلیق موصول ہونے کے چھ ماہ کے اندر شائع نہ ہو تو ایسی صورت میں وہ اشاعت کے لیے کسی دوسری جگہ بھیجی جا سکتی ہے۔

۵۔ اشاعت کی غرض سے بھیجی جانے والی ہر تخلیق غیر مطبوعہ اور غیر نشر شدہ ہونا چاہیے۔ ترجموں کے سلسلے میں ادارہ کو یہ بھی مطلع کرنا ضروری ہے کہ اس کے ترجمہ کی اجازت مصنف یا پبلشر سے حاصل کر لی گئی ہے۔

۶۔ کسی تخلیق کی اشاعت کے بعد متعلقہ شمارے کی ایک اعزازی کاپی اور نذرانہ قلمی معاونین کو بھیجا جاتا ہے۔ اس لیے اس سلسلے میں خط و کتابت کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔

۷۔ تخلیقات کی واپسی کے لیے ٹکٹ چسپاں اور پتہ لکھا ہوا لفافہ آنا ضروری ہے ورنہ ادارہ پر ان کی واپسی کی ذمہ داری نہ ہوگی۔

۸۔ ایک وقت میں صرف ایک ہی تخلیق بھیجنا چاہیے۔

۹۔ زندہ شخصیتوں اور جدید مطبوعہ کتابوں پر مضامین شائع نہیں کیے جاتے۔

سکتا تھا۔"

"تم نے بہت میرا دل رکھا ہے، پربھا طنزیہ لہجہ میں بولی۔ تم نے وہ ڈال ہی کاٹ ڈالی جس پر میں بسیرا کر رہی تھی۔"

"مہتا صاحب، اب پربھا مہتا صاحب کی طرف مخاطب ہوئی۔

"میں چھپاؤں گی نہیں؟ میں آپ کو بہت گھٹیا آدمی سمجھتی تھی۔ کیونکہ آپ خود اخبار میگزین نہ خرید کر ہمارے میگزین اور اخبار پڑھتے تھے۔ دو دو پیسوں کے لیے دکانداروں سے لڑتے جھگڑتے تھے۔ سائیکل گھسیٹ کر دفتر جاتے تھے۔ گھر کا سارا سامان خود خریدتے تھے۔ میں رمیش جی سے کہا کرتی تھی کہ مہتا صاحب مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتے۔ لیکن آج اگر میں زندگی سے گھبرا کر دور بھاگ نہیں رہی ہوں تو محض آپ کی وجہ سے۔"

"میری وجہ سے، مہتا صاحب نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ہاں، پربھا نے جواب دیا۔ آپ تین سو میں گزر کرتے ہیں۔ آپ تنگی سہتے ہیں لیکن کسی کے قرض کے تلے نہیں دبے۔ آپ کو دیکھ کر ہی میں نے آج یہ جانا ہے کہ انسان کم پیسہ میں بھی گزر کر سکتا ہے، جی سکتا ہے اور اپنی عزت محفوظ رکھ سکتا ہے۔ آپ مجھے معاف کر کے مجھ پر ایک احسان اور کیجیے۔"

"یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔ مسز رمیش" مہتا صاحب تقریباً بوکھلا کر بولے۔

"مجھے اپنے جیسا ایک چھوٹا سا مکان دلوا دیجیے۔"

"کیا" رمیش نے چونک کر پوچھا۔ یہ مکان چھوڑ دو گی؟ ایک کمرہ میں رہ لوگی۔؟"

"ہاں" پربھا نے جواب دیا۔ میں نہ صرف یہ مکان چھوڑ دوں گی بلکہ قیمتی کپڑے زیور اور زیبائش اور عیش و آرام کی دوسری چیزوں کو بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دوں گی۔ ہمیں ٹیلی ویژن کی ضرورت نہیں، کپڑے دھونے کی مشین کی ضرورت نہیں، میں یہ سب بیچ دوں گی۔ یہ اتنا فرنیچر ہمیں کیا کرنا ہے اس بناوٹی عزت کے لیے ہم دلدل میں پھنسے رہیں۔ یہ ہرگز ہرگز نہیں ہوگا۔ میں نوکری بھی کروں گی۔

"نہیں نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ رمیش نے اپنی زندگی کے جھوٹے اور کھوکھلے بھرم کو سنبھالنے کی ناکام کوشش کی۔ مگر پربھا فیصلہ کر چکی تھی۔ اس نے دھڑتے سے کہا کہ اب وہ رمیش کی بات نہیں سنے گی۔ انجانے میں جو کھویا ہے وہ اسے دوبارہ حاصل کر کے چین لے گی۔ وہ اس بھول بھلیاں سے نکل کر ٹھنڈی ہوا کھائے گی۔ میری زندگی تمہاری زندگی کے لیے لعنت نہیں بنے گی بلکہ موجب راحت بنے گی جو تمھیں اور مجھے ذہنی پریشانی اور ظاہرداری کے خول سے نکال کر اس سطح پر لے آئے جہاں عام انسان اپنی بساط کے اندر رہ کر جینا اور خوش رہنا سیکھتے ہیں۔ ہم دلدل میں پھنس کر تباہ نہیں ہوں گے بلکہ اس سے باہر نکلیں گے۔ یہ جو بھول بھلیاں میں پھنس گئے ہیں اس سے نکلنے کا راستہ ڈھونڈھ نکالیں گے۔

زندگی میں رمیش نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ وہ بند گپھا سے اب باہر نکلے گا جہاں ٹھنڈی ہوا کے ساتھ زندگی کی روشنی بھی ہوگی آشاؤں کے پھول بھی ہوں گے اور ذہن میں تازگی بھی ہوگی۔"

★

غزل

طاہرہ نسیم

اللہ اللہ رے دشمنی — آدمی سے کرے آد
دے رہی ہے تپش عشق کی — اب مجھے میری وارفت
دوسروں سے وفا آپ کی — اور مجھ سے یہ بیگا
ذکر محبوب سے ان دنوں — کتنی تابندہ ہے زند
دل پریشان ہے آج کل — دیکھ کر آپ کی بے ر
درد میں ان کے پوشیدہ ہے — ایک سامان دل بستہ
ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے مرحبا — مل گئی دولتِ آگہ
اے نسیم آپ کچھ بھی کہیں — بندگی ان کی ہے زند

★

غزلیں

منور بستوی

بے وفا دہر میں پابندِ وفا ہے کوئی
عشق کی راہ کرے میری طرح طے کوئی

آپ کے حسن کی تمثیل کہاں سے لاؤں
آپ کے عشق کے مانند نہیں شے کوئی

اپنے مستوں کو جو لاتی ہے سوئے منزلِ ہوش
ڈھالتا ہے مرے ساغر میں وہی مے کوئی

لے بہ لے دل کے دھڑکنے کی صدا اٹھی لیکن
اس میں پایا کوئی نغمہ، نہ ملی لے کوئی

شوق سے آپ چھڑا لیجئے دامن اپنا
وادیِ درد میں پھرتا رہے تا کے کوئی

بیخودی پر بھی جہاں تہمتِ ہشیاری ہے
گم ہے اس انجمنِ ناز میں ہے ہے کوئی

اس جگہ پر نہ ہو مسرت کا تصوّر کیوں کر
ہو منتوحِ جہاں غم دینے کے درپے کوئی

بسنت کمار بسنت

سنبل و یاسمن کی بات کرو
حسن کے بانکپن کی بات کرو

پھر اسی ماہ وش کی یاد آئی
پھر اسی گلبدن کی بات کرو

دو سبھی کو پیام یک جہتی
اتفاقِ چمن کی بات کرو

جو مٹا دے جمودِ تیرہ شبی
صبح کی اس کرن کی بات کرو

جس کا وعدہ کبھی وفا نہ ہوا
اسی پیماں شکن کی بات کرو

رہنے دو ذکرِ وامق و عذرا
دوستو اہلِ فن کی بات کرو

شامِ غم کا کرو نہ ذکر بسنت
نورِ صبحِ چمن کی بات کرو

اتر پردیش کی نئی حکومت

وزرا کے درمیان قلمدانوں کی تقسیم

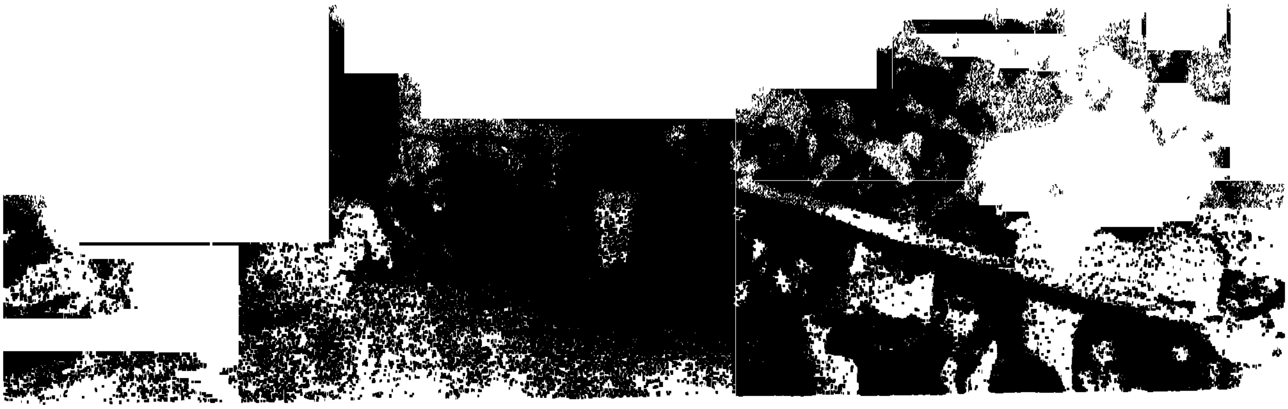
اتر پردیش کی نئی وزارت نے ۲۱ جنوری ۱۹۷۶ء کو راج بھون کے دربار ہال میں حلف اٹھایا۔ گورنر ڈاکٹر ایم چنا ریڈی نے وزیر اعلا شری نرائن دت تیواری کے صلاح و مشورے سے وزرا کے درمیان قلمدانوں کی جو تقسیم کی ہے وہ درج ذیل ہے:

"شری نرائن دت تیواری، وزیر اعلا: عام نظم و نسق، تقرریاں، کانفی ڈنشیل، نگراں ادارہ، قومی ایکتا، الکشن، داخلہ، ہوم گارڈ، شہری دفاع، سیاسی پنشن، اطلاعات، سیلس ٹیکس، رجسٹریشن، اسٹامپ اور کورٹ فیس، تفریحی ٹیکس، مالیات، منصوبہ بندی، معاشیات اور اعداد و شمار، پہاڑی ترقی، بدری ناتھ مندر، بھاری صنعت اور شکر صنعت، جیل (پیرول اور قبل از وقت رہائی کے معاملوں کو چھوڑ کر) ماحولیات اور مسلم اوقاف۔"

کابینی وزراء

• شری اجیت پرتاپ سنگھ۔ جنگلات، نگہداشت مویشیان، ڈیری فارم، مچھلی پالن اور زوالوجیکل گارڈن • شری عمار رضوی۔ تعلیم، تکنیکی تعلیم اور پارلیمانی امور • شری پربھو نرائن سنگھ۔ انصاف اور صحت، جیل (صرف پرول اور قبل از وقت رہائی سے متعلق معاملات) خاندانی منصوبہ بندی، پبلک ہیلتھ • ڈاکٹر چرن سنگھ۔ ہریجن اور سماجی بہبود • شری بلدیو سنگھ آریہ۔ تعمیرات عامہ، غذا اور رسول سپلائی، شہری عمارات (کرایہ کنٹرول) • بیگم محسنہ قدوائی۔ چھوٹی صنعتیں، ہینڈلوم اور ہینڈی کرافٹ • شریمتی راجندر کماری باجپئی۔ محنت، بجلی، لوکل سلف گورنمنٹ، نگرپالیکا، ہاؤسنگ اور امداد بحالی • ڈاکٹر رام جی لال سہائک۔ دیہی ترقی، پنچایت راج، پرادیشک وکاس دل اور چھوٹی آبپاشی (ریاستی ٹیوب ویلوں کو چھوڑ کر) شری لوک پتی ترپاٹھی۔ آبپاشی، ریاستی ٹیوب ویل، اسپورٹس اور نوجوانوں کی بہبود • شری ویریندر ورما۔ زراعت، زرعی تعلیم اور زرعی تحقیق، باغبانی اور پھلوں کا منفعت بخش استعمال • شری شانتی پرپن شرما۔ امداد باہمی، گنا ترقی، ثقافتی پروگرام اور سائنسی تحقیق • شری شیو پرشاد سنگھ۔ ٹرانسپورٹ۔ سیاحت اور سرکاری املاک • شری سوامی پرشاد سنگھ، مال، قلت، آبکاری اور نشہ بندی

وزرائے ریاست • شری عزیز الرحمان۔ مالیات، بھاری صنعت، مسلم اوقاف، • شریمتی اندر موہنی۔ بجلی اور لوکل سلف گورنمنٹ • سردار کلتار گھ غذا، سول سپلائی اور سیاسی پنشن، • شری چیت رام گنگوار۔ زراعت، نگہداشت مویشیان اور ڈیری فارم، • شری جگن ناتھ چودھری۔ آبپاشی • شری دھرم ویر۔ داخلہ، • شری نریندر سنگھ بھنڈاری۔ مالیات، پہاڑی ترقی اور سیاحت، • شری ممتاز محمد خاں۔ آبپاشی اور گنا ترقی • شری یشپال سنگھ۔ تعمیرات عامہ، • شری ریندر ورما۔ بجلی، محنت اور اطلاعات، • شری راجندر پرشاد گپتا۔ ٹرانسپورٹ، • شری رامائن رائے۔ صحت اور تعلیم، • شری وجے کمار ترپاٹھی۔ امداد باہمی، • شری ویر بہادر سنگھ۔ مال اور آبکاری، • شری کرشن گوئل۔ لوکل سلف گورنمنٹ اور جیل، • شری حبیب الرحمان نعمانی۔ دیہی ترقی۔

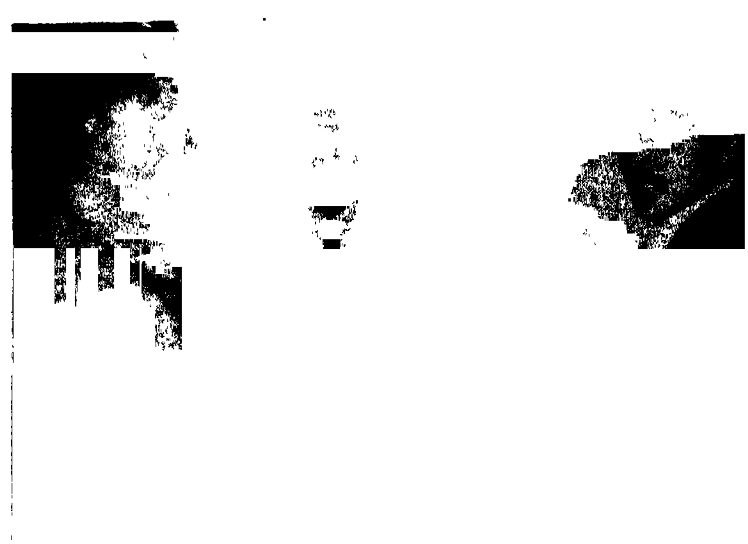


صدر جمہوریہ شری فخرالدین علی احمد، ۲ر فروری ۱۹۷۶ء کو وارانسی میں آریہ سماج کی
صدسالہ تقریبات کا افتتاح کرتے ہوئے



نائب صدر جمہوریہ شری وی. ڈی جتی ۱۱ر فروری ۱۹۷۶ء کو ہرچند پور ضلع رائے بریلی میں آیورویدک اسپتال کی عمارت کا افتتاح کر رہے ہیں.

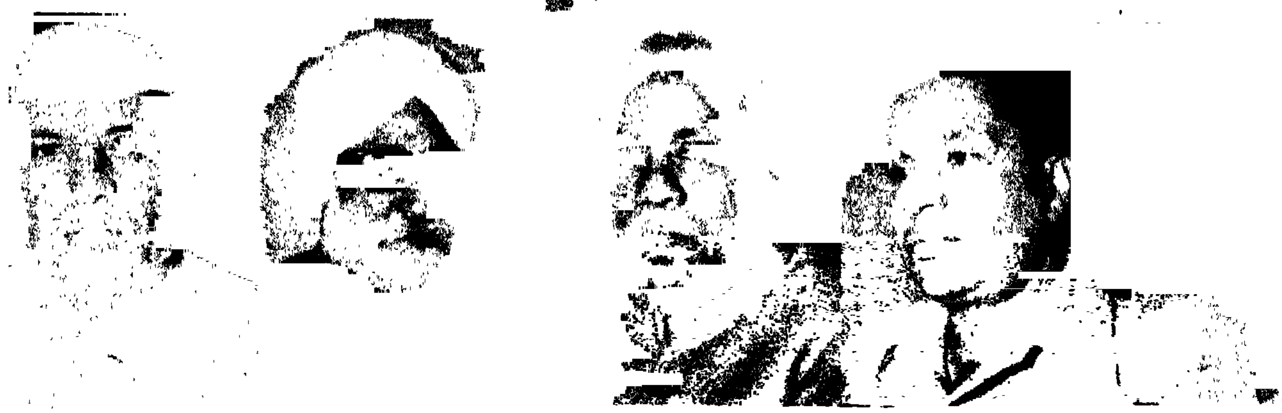
گورنر اترپردیش ڈاکٹر چنا ریڈی ۲۹ر فروری ۱۹۷۶ء کو لکھنؤ
میں لکشمن انعام کی تقسیم سے متعلق منعقدہ تقریب میں شری
سید علی کو ۱۹۷۵ء کا بہترین ہاکی کھلاڑی منتخب کیے جانے
پر انھیں ایک خصوصی ٹرافی دے رہے ہیں



اترپردیش کی نئی حکومت



وزیر اعلیٰ شری نرائن دت تیواری



اجیت پرتاپ سنگھ — شری عمار رضوی — شری پربھو نرائن سنگھ — ڈاکٹر چرن سنگھ — شری بلدیو سنگھ آریہ

کابینی وزرا

ہم محسنہ قدوائی — شریمتی راجندر کماری باجپئی — ڈاکٹر رام جی لال سہائک — شری لوک پتی ترپاٹھی — شری ویریندر ورما



شری شانتی پرپن شرما — شری شیو پرشاد سنگھ — شری سوامی پرشاد سنگھ








شری عزیز الرحمٰن | شریمتی اندرموہنی | سردار کرتار سنگھ | شری جیت رام گنگوار



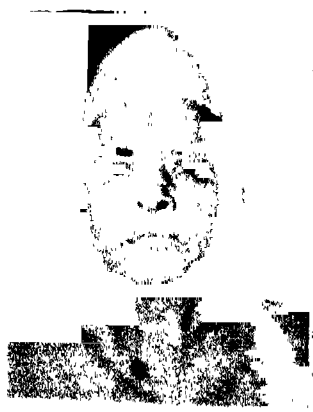



شری جگن ناتھ چودھری | شری دھرم ویر | شری نریندر سنگھ بھنڈاری | شری ممتاز محمد خاں

وزرائے ریاست

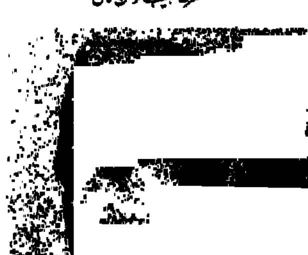
شری یشپال سنگھ | شری بینا ورما | شری راجندر پرشاد گپتا | شری راماں رلے

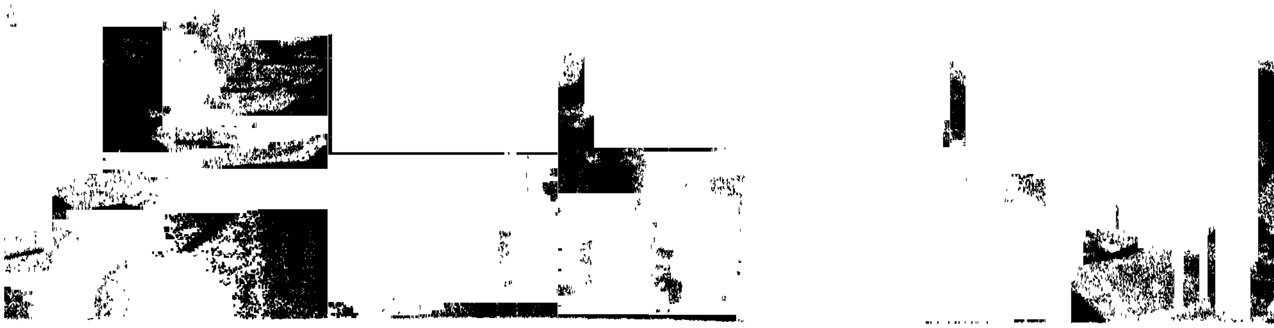


شری وجے کمار ترپاٹھی | شری ویر بہادر سنگھ | شری کرشن گوئل | شری حبیب الرحمن نعمانی

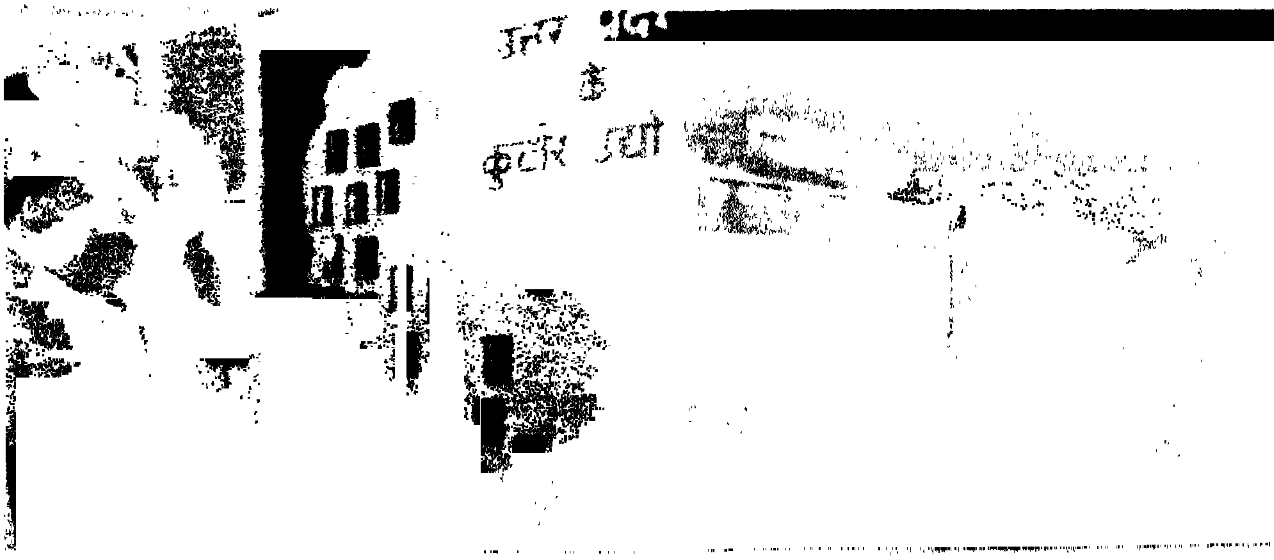




وزیر اعلا شری نرائن دت تیواری یکم مارچ ۱۹۷۶ء کو ودھان بھون میں ۲۰ نکاتی معاشی پروگرام سے متعلق
ریاستی سطح کی عملدرآمد کمیٹی کے جلسے کو خطاب کر رہے ہیں

وزیر ریاست شری جیندر ورما ۱۲ فروری ۱۹۷۶ء کو ضلع پریشد للت پور کے زیر اہتمام منعقد کی جانے والی
ترقیاتی نمائش کو دیکھ رہے ہیں۔ دائیں جانب نمائش کا ایک منظر



سید اختر الاسلام

مسدّس اور جواب مسدّس

سرسیّد کی ۸۱ سالہ زندگی کا بیش تر حصہ بہت ہی تہلکہ خیز حالات سے دوچار رہا۔ مگر اس مردِ مجاہد نے مسلمانوں کی تیرہ بختی کو خوش بختی میں بدلنے کے لیے پہلے ہی مرحلے میں اس راز کو پالیا تھا کہ تعلیمی پستی ہی اُن کا سب سے بڑا مرض ہے۔ چنانچہ اس مرض کو دور کرنے کے لیے انھوں نے ایک باقاعدہ تحریک کا آغاز کیا جس میں مولوی ذکاء اللہ، مولوی چراغ علی، مولانا محمد حسین آزاد، ڈاکٹر نذیر احمد، نواب محسن الملک سیّد مہدی علی، علّامہ شبلی نعمانی اور مولانا الطاف حسین حاؔلی پیش پیش رہے۔ جلد ہی ان کی کوششیں بار آور ہوئیں اور بقول ڈاکٹر عبدالحق: "ایک نئی تہذیب کا دور دورہ شروع ہوا جس نے مسلمانوں کی دماغی زندگی میں ایک نئی روح پھونکی اور مغربی تعلیم نے خیالات میں ہل چل مچادی۔ لوگ پُرانی چیزوں اور روایتوں کو مشتبہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ خیالات نے نئی راہیں سُجھائیں۔ ذوق و ادب کے اصول کچھ سے کچھ ہو گئے۔ جدید سائنس نے ذہنی و باطنی طور پر محسوسات کی طرف متوجہ کیا۔ نمائشی لفظی بندشوں اور بے معنی تکلف و تصنع کی جگہ نیچرل (فطری) اور سادہ طرزِ بیان آگیا۔"

مگر موخر الذکر دو شعرا کا ــــــ علامہ شبلؔی اور مولانا حالی میں نسبتاً قوم کا درد زیادہ تھا اس لیے انھوں نے اپنے غم کا اظہار شعری کارناموں (مسدسوں) کے ذریعہ کیا اور دونوں عرفِ عام میں شاعرِ قوم کہلائے۔

شبلؔی اور حاؔلی کی جدید شاعری اسی تحریک کا نتیجہ تھی جس میں وہ سانس لے رہے تھے۔ دونوں نے اپنے رہنما (سرسید) کی تعلیم کو اپنا منشور بنایا جس کے متعلق انھوں نے کہا تھا کہ: "آپ جس شاعری کے دھندے میں پڑے ہوئے ہیں وہاں واہ واہ کے سوا کچھ نہیں۔ حقیقی شاعری کا لطف اسی وقت ہے جب آپ اپنے کلام سے اپنی قوم کو اس آواز سے جگانے کی کوشش کریں تاکہ وہ اپنی پستی کو محسوس کر کے انگڑائی لے۔"

حاؔلی نے جب میدانِ شاعری میں قدم رکھا تو اس وقت شاعری بلکہ تمام ادب ایک مضحکہ خیز نقالی ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ ایک بے جان اور بے مزہ چیز تھی جسے تقلید کی جکڑ بندیوں نے لفظوں کا کھیل بنا دیا تھا۔ حاؔلی نے تاریخ کی ورق گردانی کی اور ۱۸۹۷ء میں مدوجزرِ اسلام یعنی مسدّسِ قومی پیش کیا۔ اس وقت یہ ایک مرثیہ تھا لیکن اس میں موجود ضبط نے اسے سیلِ رواں بنا دیا۔ وہ تعمیری قوتوں کا حامل تھا۔ اس میں داخلی فضائیت اور پرسکون چاندنی مخفی تھی۔ یہ سب ان کے مزاج اور کردار کے سبب ممکن ہو سکا کیونکہ وہ بوڑھے پیدا ہوئے تھے اور انھوں نے کبھی زندگی میں جوانی کی تمنا نہ کی تھی اس لیے اُن کی طبیعت میں متانت، سنجیدگی اور حیا بدرجہ اتم تھی جس نے اثر آفرینی کا عنصر پیدا کیا۔

اپنے مسدس میں حاؔلی نے زوال یافتہ قوم کی موثر انداز میں داستان سنائی ہے۔ ڈاکٹر خورشید الاسلام نے ٹھیک ہی کہا ہے: "مسدس حاؔلی صاحب کی زندگی کی سب سے بڑی نیکی ہے۔ اگر وہ مسدس نہ لکھتے تو اپنے نفس کو فریب دیتے اور اس کے علاوہ کچھ نہ لکھ پاتے۔"

مسدس بہت مقبول ہوئی اور سرسید کو کہنا پڑا: "جب خدا پوچھے گا کہ تو کیا لایا تو میں کہوں گا ــــــ میں حاؔلی سے مسدس لکھوا کر لایا ہوں۔" اس حیرت انگیز مقبولیت کو دیکھ کر علامہ شبلی نے بھی اپنے

اندر حرارت محسوس کی اور انھوں نے ۱۸۹۴ء میں اپنا ایک مسدس موسوم بہ تماشائے عبرت لکھا جو علی گڑھ کی اصلاحی نمائش میں پڑھا گیا۔ یہ مسدس شبلی نے اپنی عادت سے مجبور ہو کر لکھا کیوں کہ وہ اپنے نام کے ساتھ "غم زدہ" لکھا کرتے تھے۔ اپنے اس مسدس میں انھوں نے بھی مسلمانوں کی قومی حمیت [illegible] دلانے کی کوشش کی لیکن طرزِ ادا میں انھوں نے ذرا تلخی سے کام لیا۔ شروع کے دو بند ملاحظہ ہوں:

آج کی رات یہ کیوں جمع ہیں احباب ہم — بھیڑ کیا ہے نظر آتا ہے یہ کیسا عالم
نوجوانانِ ہنر پرور و ارباب ہمم — جوق کے جوق چلے آتے ہیں کیسے باہم
کچھ سمجھ میں نہیں آتا جو یہ سب سمجھے ہیں
شاید اس بزم کو یہ بزمِ طرب سمجھے ہیں

ہائے کیا سین ہے یہ بھی کہ گروہِ شرفا — صاحبِ افسر و اورنگ تھے جن کے آبا
قوم کے عقدۂ مشکل کے جو ہیں عقدہ کشا — ایکٹر بن کے وہ اسٹیج پہ ہیں جلوہ نما
قوم کے خوابِ پریشاں کی یہ تعبیریں ہیں
ایکٹر یہ نہیں عبرت کی یہ تصویریں ہیں

شبلی کے غم کی یہ تلخی اتنی زیادہ رہی کہ ان کے مسدس میں گھلتی گئی جس کا اثر یہ ہوا کہ وہ اس کے صرف چودہ بند ہی لکھ پائے جب کہ حالی نے اپنے مسدس کے ۵۹۴ بند لکھے۔

اس کمی و بیشی نے دونوں حضرات میں فرق از خود پیدا کر دیا۔ دونوں مسدس اپنی جگہ منفرد اور لاجواب ہیں۔ جہاں تک ادبیت کا تعلق ہے حالی کا مسدس اردو ادب کا بہت قیمتی سرمایہ ہے مگر شعریت کے لحاظ سے شبلی کا مسدس اس پر فوقیت لے گیا ہے۔ حالی کے مسدس میں ایک طرح کی بے رنگی و بے کیفی کی فضا ملتی ہے کیوں کہ اُن کے ذہن پر عرب شعرا کا کلام چھایا ہوا تھا اور وہ اُن کی شاعرانہ ہمت و جرأت کے داد خواں تھے۔ اس سے اُن میں کچھ احساس کمتری پیدا ہو گیا ہے۔

اس کے برعکس شبلی کی تمام تر توجہ مسلمانوں کو ایک نئی راہ پر لگانے میں مرکوز رہی۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان ہندستان کے بدلتے ہوئے رجحانات اور آزادی کے نئے جذبات سے ہم آہنگ ہو جائیں۔ بقول ڈاکٹر سلام سندیلوی "اُن کے خیالات کا یہ اثر پڑا کہ مولانا محمد علی جوہر، ابوالکلام آزاد، سر محمد اقبال اور مولانا ظفر علی خاں شبلی کے خیالات کی پرچھائیاں ہیں۔"

ڈاکٹر سلام سندیلوی نے دونوں مسدسوں کے ایک ایک بند کا تقابلی موازنہ بھی کیا جن میں یہ شعرا مسلمانوں کی قدیم عظمت کی یاد دلانے کی کوشش کرتے ہیں:

شبلی	حالی
کون ہے جس نے کیا فارس و یوناں تاراج	ہویدا ہے غرناطہ سے شوکت ان کی
کس کی آمد میں فدا کر دیا جے پال نے راج	عیاں ہے ثمنیہ سے قدرت ان کی
کس کو کسریٰ نے دیا تخت و زر و افسر و تاج	بطلیوس کو یاد ہے عظمت ان کی
کس کے دربار میں تاتار سے آتا تھا خراج	ٹپکتی ہے قادس سے حسرت ان کی
تجھ پہ اے قوم اثر کرتا ہے افسوں جن کا	نصیب ان کا اشبیلیہ میں ہے سوتا
یہ وہی تھے کہ ترے لوگوں میں ہے خوں جن کا	شب و روز ہے قرطبہ ان کو روتا

اس فرق کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ حالی واقعیت پسند تھے اور اس واقعیت پسندی کے سبب ان میں دردمندی عود کر آئی تھی۔ اس کے برخلاف شبلی حسن پرست تھے جس کا سبب یہ ہوا کہ ان کے درد میں گداز کی کیفیت کا فقدان رہا۔ لیکن پھر بھی حالی کا مسدس مقبول خاص و عام رہا۔ اکثر صوبائی زبانوں میں اس کے تراجم ہوئے۔ ہندی کے مشہور شاعر میتھلی شرن گپت نے اپنی عظیم شعری تخلیق "بھارت بھارتی" کی رچنا میں ان ہی کی تکنیک اپنائی۔

اکثر شعرا نے حالی کے مسدس کے طرز پر اپنے اپنے طریقوں سے روشنی ڈالی اور یہ بھی حالی کی مقبولیت کی ایک معراج ہی ہے۔ بقول رام بابو سکسینہ (تاریخ ادب اردو) میرٹھ کے مشہور و معروف شاعر بیاں یزدانی نے بھی مسدس حالی کے جواب میں اپنا شعری کارنامہ پیش کیا۔ مگر درحقیقت ایسا صرف ایک غلط فہمی کی بنا پر ہو سکا۔ بیاں صاحب کا وہ شعری کارنامہ مسدس نہیں بلکہ مخمس ہے جو مسدس سے قطعاً الگ ہے۔ مثلاً:

ہر حال میں ہر وقت میں تابع ہیں جو تیرے
آوارہ و سرگشتہ پھریں خاک اڑاتے
محروم نہ رکھ ان کو شہا لطف و کرم سے
برتاؤ ترے جب کہ یہ اعدا سے تھے اپنے
اعدا سے غلاموں کو کچھ امید سوا ہے
حق یہ ہے کہ ناحق نہ ہو مظلوم کے حق میں

کچھ داد رسی چاہیئے محروم کے حق میں
آزردہ و رنجیدہ و مغموم کے حق میں
کر حق سے دعا امت مرحوم کے حق میں

خطروں میں بہت جس کا جہاز آکے پڑا ہے
سب جاہل و کاہل ہیں نہ سب زاہد و مومن
ہے نور کہیں نار کہیں رات کہیں دن
ہو جائیں سبھی ایک سے ایسا نہیں ممکن
امت میں تری نیک بھی ہیں بد بھی ہیں لیکن
دل دادہ ترا ایک سے یاں ایک سوا ہے

جواب مسدس میں لکھنے والے ابو البیان مولوی محمد سلیم الدین احمد تسلیم نارنولی (ف ۱۸۸۴ء) خاص طور پر قابل ذکر ہیں جنھوں نے اپنے مسدس کے ۲۷۹ بند لکھے۔ ان کا یہ مسدس پہلی بار اخبار تیرھویں صدی آگرہ میں ۱۸۸۰ء میں چھپا تھا۔ اس مسدس کے دو بند یہ ہیں:

خدا سے رسول خدا نے دعا کی   کہ دنیا میں یا رب عذاب خدائی
نہ ہو میری امت کو کچھ دردناکی   دعا کر چکے یہ تو یوں التجا کی
کہ ان پر مسلط نہ ہو کوئی ایسا
کہ بدلے کسی طور سے دین ان کا

اجابت کو پہنچیں یہ دونوں دعائیں   ہوئیں گرچہ اور ہو رہی ہیں خطائیں
بلائیں نہ امت پہ آئیں نہ آئیں   نہ بدلیں زمانے کی شرعی بنائیں
قیامت کے ڈھب ہیں غضب کے فسوں ہیں
مگر اہل ہمت وہی جوں کے توں ہیں

اس تمہید کے بعد تسلیم صاحب نے مسلمانوں کے اندر پیدا ہونے والے خیالات و باطل نظریات نیز برائیوں اور خرابیوں پر نظر ڈالی ہے اور آخر میں سرسید مرحوم کی تحریرات اور ان کے عقائد پر بھی چوٹیں کی ہیں:

یہ اسلام کا نام لیتے ہیں دیکھو   یہ اسلام کا کام کرتے ہیں دیکھو
یہ احکام کا رنج احکام دیکھو   یہ ہیں خیر خواہان اسلام دیکھو
خدا سے نبی سے کھلے لڑ رہے ہیں
نرے یا ملحد و الحاد پر اڑ رہے ہیں

مذاہب کے دانائے اسرار یہ ہیں   حقائق کے بینائے انوار یہ ہیں
مورخ محقق ہیں نشّار یہ ہیں   حرم گاہ نیچر کے مختار یہ ہیں
خیالات ان کے بڑے شور کے ہیں
خیالات ان کے بڑے زور کے ہیں

سخن میں نیا ڈھنگ ہے خوب ڈھب ہے   طبیعت میں ایجاد طرز عجب ہے
کلام آپ کا جو ہے سو منتخب ہے   مد و جزر اسلام لیکن غضب ہے
مد و جزر اسلام یعنی مسدس
مسدس کہو یا کتاب مقدس

بڑے ناز سے اس کے اشعار پڑھ کر   سنا ہے کہ فرماتے ہیں پیر نیچر
کہ گر مجھ سے پوچھا گیا روز محشر   عمل کون سا لائے ہو سب سے بہتر
تو حاضر کروں گا یہی نظم حالی
یہی ہدیۂ حضرت لایزالی

ذرا آپ سے کوئی پوچھے کہ حضرت   قیامت کے ہونے پہ تو اہل فطرت
نہیں مانتے کوئی دعوۂ نبوت   بھلا آپ کو کیا ہے محشر سے نسبت
کہ یہ اعتقاد اہل اسلام کا ہے
نہ قانون نیچر کے احکام کا ہے

اس طرح تجزیہ کرنے پر بخوبی علم ہو جاتا ہے کہ جواب مسدس لکھنے میں لوگوں نے حالی کو تو محض ایک وسیلہ بنایا۔ ان کی اصل چشمک اور چپقلش تو سرسید سے تھی جن کی زبردست مخالفت کی گئی۔

حالی نے جو کچھ لکھا تعلیم یافتہ طبقہ نے اس پر لبیک کہا اور یہی وجہ ہے کہ حالی کا مسدس ہر زمانے میں لوگوں کے دلوں کو گرماتا رہا اور وہ آج بھی ترقی کی راہ پر چلنے اور نیا عزم پیدا کرنے کے لیے ایک روشن مینارہ بنا ہوا ہے۔

✱

دلیر عثمانی

خاتون مشرق

قربان تجھ پہ الفت تجھ پر نثار الفت
بیتاب دل کو تیری ہر اک نظر ہو راحت
تو پاس ہو تو کیسا پھر خوفِ دشتِ غربت
ملتی ہے تو اسی کو جس پر ہو حق کی رحمت
تو زیبِ انجمن ہے تو ہے جہاں کی زینت

کیا یاد ہے یہ تجھ کو اک وقت وہ بڑا تھا
تیرا پدر ہی تجھ پر خنجر بکف کھڑا تھا
بیٹی نہ جس کے گھر ہو سب میں وہی بڑا تھا
ایسا بھی تھا زمانہ وقتِ جاہلیت
تو زیبِ انجمن ہے تو ہے جہاں کی زینت

ماں باپ کی پھر اپنے محبوب ہو گئی تو
طالب تھا اک زمانہ مطلوب ہو گئی تو
شرم و حیا سے کیسی محجوب ہو گئی تو
جانِ پدر بنی تو یہ تیری قابلیت
تو زیبِ انجمن ہے تو ہے جہاں کی زینت

پل کر جواں ہوئی جب شوہر کو تو نے پایا
قربان اس پہ ہو کر ہر کام کر دکھایا
اور طرزِ نو سے گھر کو رشکِ چمن بنایا
تو آبرو تھی جس کی اس کی بڑھائی عزت
تو زیبِ انجمن ہے تو ہے جہاں کی زینت

جب ماں بنی تو تو نے یہ کام کر دکھایا
الفت کا اک جہاں میں پھر نام کر دکھایا
اولاد کے دلوں کو کیا رام کر دکھایا
اللہ رے تیری عظمت اللہ رے تیری خدمت
تو زیبِ انجمن ہے تو ہے جہاں کی زینت

رو دے اگر تو آنسو موتی کی مثل نکلیں
خوش ہو کے مسکرا دے تو پھول تجھ پہ برسیں
سوئے اگر تو حوریں اندازِ ناز دیکھیں
ملتی کہاں ہے لیکن ایسی دلیر عورت
تو زیبِ انجمن ہے تو ہے جہاں کی زینت

ڈاکٹر افتخار احمد فخر

غزل

ہر ایک گل کو رسولِ بہار ہونے دو
مسرتوں سے چمن ہم کنار ہونے دو
گلوں کے ساتھ ہی سرسبز خار ہونے دو
کچھ اس طرح بھی نظامِ بہار ہونے دو

جنونِ آبلہ پائی کا لطف آئے گا
قدم قدم پہ جو رہے خار زار ہونے دو
چمن پہ آنچ نہ آئے، غمِ نشیمن کیا؟
اگر ہے یورشِ برق و شرار ہونے دو
مے نشاط سے خالی ہیں دل کے پیمانے
ہوائے گل کو ذرا کیف بار ہونے دو
خزاں نصیب نہ رہ جائے کوئی گلشن میں
جنوں نواز ہوائے بہار ہونے دو
رسائی ہو نہ سکے تاکہ دستِ گلچیں کی
ہر ایک پھول کے پہلو میں خار ہونے دو
ہمیشہ خونِ جگر سے اب اس کو تم سینچو
سدا بہار، چمن کا نکھار ہونے دو
ہو لالہ زار جو خونِ جگر سے سینۂ گل
رخِ حیات کا آئینہ دار ہونے دو
بچائے رکھو نہ دامانِ دل کو طوفاں سے
حریفِ گردشِ لیل و نہار ہونے دو
لگا ہی لیں گے کسی روز منزلوں کے سراغ
نظر سے دور حجابِ غبار ہونے دو
وطن کے نام کو اپنے کلامِ نازش سے
اے فخرؔ! باعثِ صد افتخار ہونے دو

محمد شمیم الاسلام

مسٹر انداز

(مزاحیہ)

ہمارے پڑوس میں ایک صاحب رہتے ہیں۔ ان کا نام فرقان احمد ہے لیکن میرے خیال میں ان کو مسٹر انداز کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ یوں تو وہ بہت ہی بھلے آدمی ہیں کسی کو تنگ کرنے یا ضرر پہنچانے کی ان کی قطعی نیت نہیں ہوتی لیکن ان کو ہمیشہ دوسروں کے بارے میں کچھ نہ کچھ اندازہ کر لینے کی عادت پڑ گئی ہے۔ اس اندازہ کی وجہ سے وہ ہم پر سوالات کی بوچھار کر دیتے ہیں۔ درحقیقت ان کا یہ طرز عمل ہم کو بہت کھلتا ہے۔ بس مروت اور اخلاق کی وجہ سے کچھ کہہ نہیں پاتا۔ لیکن وہ کبھی یہ سوچنے کی زحمت نہیں کرتے کہ مجھے ان کی یہ سب باتیں قطعی پسند نہیں۔

میں ایک انشورنس کمپنی میں ملازم ہوں۔ صبح نو بجے جاتا ہوں اور شام کو چھ بجے واپس ہوتا ہوں۔ صرف اپنے کام سے کام رکھتا ہوں، کبھی دوسروں کے کام میں دخل نہیں دیتا۔ نہ اپنے کام میں کسی دوسرے کا دخل دینا ہی مجھے پسند ہے۔

لیکن مسٹر انداز کو دیکھیے۔ نو بجے ہیں۔ میں تیز قدم اٹھاتا ہوا دفتر جا رہا ہوں تاکہ سوا نو بجے کی بس مل جائے کہ پیچھے سے آواز سنائی دی۔ "ارے بھئی ذرا ٹھہر جایئے۔" میں نے گھوم کر دیکھا بڑی مہری کا پائجامہ، ڈھیلی ڈھالی اچکن جس کے بٹن کھلے ہوئے، منھ میں پان ہاتھ میں چھڑی، گورا گٹھیلا بدن، چندیا صاف، عمر کوئی ساٹھ سال کے پیٹے میں ہوگی ــــ یہ تھے مسٹر انداز۔

میں نے کہا، معاف کیجیے گا بھائی صاحب میں دفتر جا رہا ہوں۔ دیر ہو جائے گی۔"

"ہاں۔ ہاں دفتر تو جانا ہی ہے۔ کون روکتا ہے؟ دفتر کون اتنی دور ہے؟ اس قریب کے چھاپہ خانہ میں تو آپ کام کرتے ہیں نا؟"

میں چونک پڑا۔ "چھاپہ خانہ سے میرا کیا سروکار؟ میں ایک انشورنس کمپنی میں ملازم ہوں" میں نے جواب دیا۔

"اچھا۔ میں سمجھا تھا کہ آپ چھاپہ خانہ میں کام کرتے ہیں۔"

"آپ نے ایسا کیوں سمجھا؟" میں نے دریافت کیا۔

"کل شام کو میں نے آپ کو چھاپے خانے کے قریب سے ہو کر آتے دیکھا تھا اس لیے میں سمجھا کہ آپ وہیں کام کرتے ہوں گے۔"

"اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں وہیں کام کرتا ہوں۔ اچھا اب دیر ہو رہی ہے۔ معاف کیجیے گا۔" میں کہتے ہوئے لمبے لمبے قدم بڑھانے لگا۔

"ارے حضرت دفتر جانا ہے تو ایک منٹ بات چیت کرنے سے کون دیر ہو جائے گی۔ ہم نے بھی تو دفتر میں کام کیا ہے۔ کئی دفتر دیکھ چکا ہوں۔" مسٹر انداز نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔

میں آگے بڑھا لیکن دیر ہو چکی تھی۔ بس اسٹینڈ پر پہنچتے پہنچتے سوا نو بجے کی بس چھوٹ چکی تھی۔ دوسری بس سے میں دفتر کچھ تاخیر سے پہنچا جس کی وجہ سے انچارج کی گھڑکیاں سننا پڑیں۔

شام کو میں دفتر سے لوٹ رہا تھا کہ مسٹر انداز سے پھر ملاقات ہو گئی۔ میں نے ان کی آنکھ بچا کر نکل جانے کی کوشش کی لیکن وہ بھلا کب چھوڑنے والے تھے۔ سامنے آ کر کھڑے ہو گئے اور مسکراتے ہوئے بولے "ارے حضرت! سویرے تو ہم سے دو باتیں کیے

کے لیے فرصت نہ تھی اب تو ذرا ٹھہر جائیے۔"

میں انکار کیسے کر سکتا تھا۔ اخلاق و مروت کے ناطے مجھے رکنا ہی پڑا۔ رکنے کو تو میں رک گیا لیکن گھر پر بھی کئی کام تھے۔ اس لیے بڑی انکساری اور سماجت کے لہجے میں بولا "کیا کروں اتنا مشغول آدمی ہوں کہ ایک منٹ کے لیے بھی فرصت نہیں ملتی۔ اب بھی گھر پر کئی کام ہیں۔"

"ارے کام! کام!! جانے بھی دیجیے۔ کیا ہم نے کام نہیں کیا ہے؟ دن میں چوبیس چوبیس گھنٹے کام کیا ہے۔ پھر بھی کبھی ایسا نہ ہوا کہ بات چیت کے لیے کم سے کم ایک گھنٹہ کی فرصت نہ نکالی ہو۔"

میں انھیں دو ٹوک جواب دے سکتا تھا مگر یہ سوچ کر کہ وہ پھر کچھ بات چھیڑ دیں گے میں خاموش ہو رہا۔ لیکن مسٹر انداز کب خاموش رہنے والے تھے۔ بولے۔ "خیر آپ کا دفتر تو بہت دور ہے نا؟ آپ کو بس سے جانا چاہیے۔ پیدل چلنا مناسب نہیں ہوگا۔ پیدل چلتے ہیں نا آپ؟ اتنی دور چلنا اور پھر دن بھر کام کرنا یہ تندرستی کے اصول کے خلاف ہے۔"

جہاں پر ہم کھڑے ہو کر بات کر رہے تھے وہاں سے ہر طرف کی بسیں جاتی ہیں۔ ایک گاڑی مجھ سے بالکل چھوتی ہوئی چلی گئی۔ میں نے سوچا ایک طرف کھڑے ہو جائیں، جان کو خطرے میں ڈالنے سے کیا فائدہ۔ لہٰذا دوسری جگہ کھڑے ہوتے ہوئے میں نے کہا۔ "میں تو روز بس ہی سے جاتا ہوں۔ آپ کو کس نے بتایا کہ میں پیدل جاتا ہوں؟"

"یونہی۔ میں نے اندازہ لگایا ہے کہ آپ پیدل ہی جاتے ہوں گے۔ آپ ایسے نوجوان اکثر دفتر پیدل ہی جاتے ہیں۔ دوسرے آپ کا جوتا بہت گھسا ہوا ہے جس سے عام طور پر یہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔۔۔ اچھا یہ میگزین آپ کہاں سے لائے ہیں؟ یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ آپ کو میگزینوں سے دلچسپی ہے، رسالوں اور میگزین وغیرہ پڑھنے کی اچھی عادت ہے۔ اس سے معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ ٹھیک ہے نا؟"

میرے ہاتھ میں دراصل ایک ریلوے گائڈ تھی جس کی طرف ان کا اشارہ تھا۔

میں نے افسوس ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ رسالہ نہیں ریلوے گائڈ ہے۔ سنتے ہی بولے۔

"اچھا؟ کیا ابھی خرید کر لا رہے ہیں آپ؟"

"جی نہیں۔ اپنے بھائی کے گھر سے لا رہا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

مسٹر انداز نے اپنا سر اس زور سے اور اس انداز سے ہلایا جیسے سب کچھ سمجھ گئے ہوں۔

بولے۔ "او ہو۔ تو کہیں جانے کا ارادہ ہے؟"

"نہیں تو۔" میں نے جل کر کہا۔

"پھر یہ گائڈ کیوں؟"

"ایک دوست نے مانگی تھی اس لیے لیے جا رہا ہوں۔"

"وہ کہاں جا رہے ہیں؟ شاید چھٹی پر جا رہے ہیں۔ سرکاری آفس میں چھٹی کے دن ہیں نا؟"

"میرے دوست سرکاری ملازم نہیں ہیں" میں نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ "یہ تو مجھے بھی علم نہیں کہ وہ کہاں جا رہے ہیں۔ انھوں نے گائڈ مانگی اور میں گائڈ لیے جا رہا ہوں۔ گائڈ تو یوں بھی معلومات میں اضافہ کرنے کے لیے دیکھا جا سکتا ہے۔"

"جی ہاں۔ بالکل ٹھیک ہے" مسٹر انداز نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "لیکن اپنا خیال ہے کہ آپ کے دوست ضرور کہیں جا رہے ہیں۔ آج کل ریل گاڑیوں کے حادثے بہت ہو رہے ہیں۔ انجن الٹ جاتے ہیں اور جانیں چلی جاتی ہیں۔ ان کو مشورہ دیجیے کہ انجن کے پاس ڈبہ میں کبھی نہ بیٹھیں۔ پچھلے ڈبہ میں جہاں تک ممکن ہو بیٹھیں۔ اس صورت میں اگر گاڑی الٹ بھی جائے تو ان کا کچھ نہ بگڑے گا۔؟"

مجھ سے اب نہ رہا گیا۔ میں نے کہا۔ "اچھا اب اجازت دیجیے۔ پھر ملیں گے۔" اور میں آگے بڑھ گیا۔

یہ صاحب بھی عجیب آدمی ہیں۔ میرے کام میں ہمیشہ دخل دیتے رہتے ہیں۔ غیر ضروری سوالات کی بوچھار، ان کی عادت

میں شامل ہے۔ ویسے تو میں خود کو بہت سمجھدار آدمی سمجھتا ہوں لیکن اخلاق و مروت کی وجہ سے ان سے یہ نہیں کہا جاتا کہ مجھے آپ کا یہ برتاؤ پسند نہیں ہے۔ اس کا سبب ایک اور ہے۔ وہ ہمیشہ مسکراتے ہوئے گفتگو فرماتے ہیں۔ میں کتنا ہی جھنجلاؤں، اس کا ان پر کچھ بھی اثر نہ ہوگا۔ اس لیے مجھ سے بے مروتی نہیں ہو پاتی۔

ڈاکیہ خط لایا۔ میں خط لے کر گھر میں داخل ہی ہو رہا تھا کہ مسٹر اندازنے دور سے مجھے دیکھ لیا۔ دوڑتے ہوئے میرے پاس آئے۔ میں لفافہ کھول ہی رہا تھا کہ پوچھنے لگے۔

"کہاں سے آیا ہے؟ والد صاحب نے بھیجا ہوگا۔"

"جی نہیں، میرے والد ماجد کا تو کب کا انتقال ہو چکا ہے۔"

"تو پھر کس نے بھیجا ہے۔ والدہ صاحبہ نے لکھا ہوگا؟"

"یہی تو میں جاننا چاہتا ہوں ۔۔"

"پھر بھی تو کچھ تحریر سے تو معلوم ہو سکتا ہے؟"

"کیوں؟ کسی دوسرے سے بھی تو پتہ لکھوایا جا سکتا ہے" میں نے کہا۔

"خیر کس نے لکھا ہے۔ اب تو آپ دیکھ چکے لفافہ؟"

"بہن نے" میں نے جواب دیا۔

"پتہ کی تحریر بھی انھیں کی ہے نا؟" مسٹر اندازنے پوچھا۔

"جی نہیں، کسی اور کی ہے" ۔۔۔ میں نے کہا جس سے وہ مایوس ہو گئے لیکن ظاہر نہیں ہونے دیا اور بولے "کیا لکھا ہے آپ کی بہن نے؟"

"ابھی پڑھ رہا ہوں۔"

"آپ تو بہت دھیرے دھیرے پڑھتے ہیں۔ میں تو ایک نگاہ ڈال کر پورے خط کا مطلب نکال لیتا ہوں" وہ بولے۔ طالب علمی کے زمانے میں اگرچہ تیز پڑھ لینے پر مجھے انعام ملا تھا پھر بھی میں نے اس کا ذکر نہ کیا اس ڈر سے کہ کہیں منہ سے نکل گیا تو ہزاروں سوال کر ڈالیں گے۔ میں نے جان بوجھ کر کہا۔ "بہن کے لڑکا پیدا ہوا ہے۔"

"اچھا۔ میں نے بھی یہی اندازہ لگایا تھا۔"

"جی۔ معاف کیجیے گا۔ میں نے جلدی میں غلطی کی حقیقت میں بہن کے یہاں لڑکی ہوئی ہے۔"

"جی۔ کیا یہ پہلی لڑکی ہے؟" مسٹر اندازنے سوال کیا۔

"یہ تیسری لڑکی ہے۔" میرے منہ سے نکلا۔ اگر کچھ اور کہتا تو توسوالات کا تانتا بندھ جاتا۔ "حضرت اس خط کا مجھے ابھی فوری جواب دینا ہے اس لیے اس وقت اجازت دیں۔ پھر بات چیت ہوگی۔" آخر میں نے تنگ آکر کہا۔

"ٹھیک فرماتے ہیں آپ۔ خط کا جواب تو فوراً دینا چاہیے یہ اچھی عادت ہے۔ میں بھی ایسا ہی کرتا ہوں لیکن میرے یہاں رہنے سے کیا نقصان ہو رہا ہے۔" مسٹر اندازنے پوچھا۔

انھیں شاید اس کا احساس نہیں تھا کہ ان کی موجودگی میں مسلسل سوالات کا جواب دیتے ہوئے خط لکھنا آسان نہ تھا میں نے کسی صورت سے پیچھا چھڑا کر انھیں باہر کیا اور خط لکھنے بیٹھ گیا لیکن دیر ہونے کی وجہ سے خط اس روز ہوائی ڈاک سے نہ بھیج سکا۔

اس طرح متعدد بار اسی قسم کے تجربے پیش آئے۔ مسٹر انداز کے اندازوں کی کوئی حد نہیں۔ کبھی وہ پوچھتے ہیں کہ فلاں پکچر کیسی ہے؟ جب میں کہتا ہوں کہ میں نے اسے نہیں دیکھا کہ اپنی رائے دے سکوں تو انھیں یقین ہی نہیں آتا کیونکہ گزشتہ روز مجھے سینما گھر کے سامنے دیکھ چکے تھے۔ اس لیے انھیں یہ اندازہ لگانے کا موقع مل گیا۔

ایک روز میرا لڑکا بیمار تھا۔ مئی جون کی چلچلاتی دھوپ میں ڈاکٹر کو بلانے جا رہا تھا کہ وہ مل گئے۔ "کیا کرکٹ میچ دیکھنے جا رہے ہیں۔ اس وقت اور کہاں جا سکتے ہیں؟" انھوں نے فوراً پوچھ لیا۔ میں نے خاموشی سے انھیں بتایا اور آگے بڑھ گیا۔

آخر کار میں نے ان سے نجات پانے کی ایک صورت ڈھونڈھ نکالی۔ میں ان سے سوال وغیرہ کرتا ہی نہ تھا۔ سوچا کہ کیوں نہ ان کا امتحان لیا جائے؟ دوسرے روز جب صبح کو ملاقات

ہوئی تو میں نے ہی پہلے حملہ کر دیا۔ پوچھ بیٹھا۔

"حضرت۔ آپ ترکاری خریدنے بازار کیوں جاتے ہیں۔ قریب ہی میں تو دوکان ہے"

"ارے بھائی میں قریب ہی والی دوکان کی طرف جا رہا ہوں۔ بازار کی طرف نہیں" جواب ملا۔

"اچھا۔ آپ کے ہاتھ میں تھیلا دیکھ کر میں سمجھا کہ آپ بازار جا رہے ہیں ــــ آپ ہمیشہ بینگن ہی کیوں خریدتے ہیں۔ کبھی کبھی بھنڈی بھی کھا یا کیجیے" میں نے پھر پوچھا۔

"واہ۔ میں تو ہمیشہ بھنڈی ہی خریدتا ہوں۔ آپ کو کس نے اطلاع دی کہ میں بینگن خریدنے والا ہوں" مسٹر اندازنے جواب دیا۔

"ایسے ہی۔ میں نے آپ کے چہرے سے اندازہ لگایا تھا خیر آپ رام لعل کی دوکان سے ہرگز نہ خریدا کریں۔ وہ بہت پاجی ہے۔ کم تولتا ہے۔ کشوری لعل کے یہاں سے لیا کیجیے۔ اس کی تول اچھی ہے اور ترکاریاں بھی تازی رکھتا ہے"

اب مسٹر انداز کے دل میں کچھ شبہ پیدا ہوا کہ کہیں میں ان کا مذاق تو نہیں اڑا رہا ہوں۔ وہ کچھ بگڑ کے بولے۔ "ارے بھئی میں کشوری لعل کے یہاں سے ہی لیتا ہوں رام لعل کی طرف تو جھانکتا بھی نہیں"

"میں نے کل آپ کو رام لعل کے چچا زاد بھائی سے بات چیت کرتے دیکھا تھا اس لیے میں نے اندازہ لگایا کہ آپ رام لعل کے یہاں سے ہی خریدتے ہیں" میں نے کہا۔ اب وہ سمجھ گئے۔ ان کی تیوری چڑھ گئی اور وہاں سے کھسک گئے۔

دوسرے روز ایک تار آیا۔ جب میں تار لے رہا تھا تب انھوں نے دیکھ لیا اور میرے پاس چلے آئے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ تار کے متعلق دریافت کریں گے۔ جواب کے لیے میں دل ہی دل میں تیاری کر رہا تھا۔ لیکن میں انگشت بدنداں رہ گیا۔ وہ آئے مسکرائے اور اپنی راہ چل دیے۔ واقعی وہ کہیں جا رہے تھے۔ اور بالکل تیار ہو چکے تھے۔ اس لیے ان کے بارے میں میرا اس بار کا اندازہ غلط ثابت ہوا۔ امید ہے مجھے معاف کریں گے۔

★

محمد مشتاق شارق میرٹھی

غزل

یوں سامنا ہم نے غمِ دوراں کا کیا ہے
جب وقت پڑا کوئی ترا نام لیا ہے

اے تلخیِ حالات یہ کیا ظلم کیا ہے
مجھ سے مرے خوابوں کا فسوں چھین لیا ہے

فرزانوں سے کہہ دے کوئی اب ہوں نہ پریشاں
دیوانوں نے طوفان کا رُخ موڑ دیا ہے

اللہ رے احساسِ وفا کی یہ نزاکت
غنچہ بھی اگر چٹکا تو دل تھام لیا ہے

مے خانے میں ساقی کی عنایت کوئی دیکھے
اک جام عطا کر کے گنہگار کیا ہے

کچھ اور بڑھانے کے لیے درد کی لذت
کانٹوں سے ہر اک زخمِ تمنا کو سیا ہے

اب چاہے کسی بھیس میں آ چھپ نہیں سکتی
اے گردشِ دوراں تجھے پہچان لیا ہے

اس جبرِ اسیری کے لیے دوں کسے الزام
خود اپنے ہی خوابوں نے مجھے قید کیا ہے

وہ تیرگیِ شب سے بھی شارق نہ ملا تھا
جو زخمِ نظر ہم کو اجالوں نے دیا ہے

محبوب جام

رباعیات

ساقی تری وارفتہ نگاہی کا اثر
میخانے میں ہے پیش نظر مد نظر
رندانِ بلا نوش ہیں بیگانۂ ہوش
ملتی ہی نہیں آج کسی کی بھی خبر

تاثیر کی حد میں نہ دعائیں پہنچیں
آگے ہی وفاؤں سے جفائیں پہنچیں
سیاروں کی گردش یہ پتہ دیتی ہے
بزم مہ و انجم میں ادائیں پہنچیں

رہبر کے لبادے میں چھپا ہے رہزن
کہتے ہیں جسے دوست وہی ہے دشمن
جب برسر پیکار رہے اپنا سایہ
آپ اپنے سے ہو جائے نہ کس دن ان بن

سنتا ہی نہیں کوئی کراہیں اپنی
اٹھیں بھی تو کیا اٹھیں نگاہیں اپنی
اب تشنۂ تاثیر رہیں گی آہیں
کام آ نہیں سکتیں کبھی چاہیں اپنی

غزل

ساجد امیٹھوی

وہ مسافر ہوں کہ سرگرم سفر ہونے تک
خود ہی کھو جاؤں گا منزل پہ گزر ہونے تک

کتنے ہنگامے اٹھیں گے مرے دل سے اے دوست
میری جانب تری دزدیدہ نظر ہونے تک

میرے حالات نے رکھا نہ کہیں کا مجھ کو
کھل گیا سارا بھرم ان کو خبر ہونے تک

یہ مہ و مہر و شب و روز بدل جائیں گے
میرے دل پر غم دوراں کا اثر ہونے تک

ساغر مے میں تلاطم ہے مری مستی سے
نشۂ بادۂ ہستی کے مگر ہونے تک

جب سر شام ہی ہے یہ خلشِ دردِ فراق
جانے کیا حال مرا ہوگا سحر ہونے تک

راہبر دکھائیں گے کیا کیا نہ فریب منزل
اک نئے موڑ نئی سمت کے سر ہونے تک

زندگی وقت کی باہوں میں کچھ ایسی سمٹی
رہ گئی شام و سحر، شام و سحر ہونے تک

ظلمت شب ہی سے قائم ہے مرا نقش وجود
میں کہ ٹھہرا ہوا منظر ہوں سحر ہونے تک

جانے کیا بے کسیِ شوق کا عالم ہوگا
شہر میں تیرے مری رات بسر ہونے تک

کچھ کہے کوئی محبت میں مگر اے ساجد
زندگی عشق کی ہے آنکھ کے تر ہونے تک

عبدالرحیم قدوائی

ایٹمی طاقت کا پُرامن استعمال

لفظ ایٹم کا تصور ذہن میں آتے ہی ہیروشیما اور ناگاساکی کے وہ ہولناک اور روح فرسا مناظر یاد آجاتے ہیں جس کے نتیجہ میں آنے والی کئی نسلیں معذور و مفلوج پیدا ہوئیں لیکن یہ واقعات بدقسمتی سے تصویر کا ایک ہی رخ اور وہ بھی تاریک رُخ پیش کرتے ہیں اگر ہم تصویر کا دوسرا رخ سامنے رکھیں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ایٹم کے پُرامن استعمال سے بنی نوع انسان کی فلاح ہو سکتی ہے اگر ایٹم کو پرامن مقاصد کے لیے استعمال کیا جائے تو ساری دنیا کو غذائی محاذ پر خود کفیل بنایا جا سکتا ہے، لاعلاج امراض کا علاج ممکن ہو سکتا ہے، نقل و حمل کے وسائل آسان اور انتہائی کم خرچ پر مہیا ہو سکتے ہیں، ایندھن با آسانی اور با افراط حاصل ہو سکتا ہے۔ غرضیکہ اس ننھے سے ایٹم میں ناقابل تصور ترقی کے امکانات مضمر ہیں۔

ہندستان میں ۱۹۴۸ء میں اٹامک ازجی کمیشن قائم ہوا اور آہستہ آہستہ ہمارا ملک اس منزل تک پہنچا کہ راجستھان میں تجرباتی ایٹمی دھماکہ کیا گیا، اسی ترقی کی ایک اور اہم کڑی "آریہ بھٹ" یعنی مصنوعی سیارے کے داغے جانے کی شکل میں نمودار ہوئی۔ ہندستانی حکومت کی پالیسی کے مطابق ہمارے سائنسداں اس امر کی پوری کوشش کر رہے ہیں کہ ایٹم سے حاصل ہونے والی بے پناہ طاقت تعمیری پروگراموں اور ترقیاتی کاموں میں استعمال کرکے ہندستان کو جنت نشان ملک بنا دیا جائے۔

اس ننھے سے ذرہ ایٹم میں جس کے تین اہم اجزا الیکٹرون (ELECTRON) پروٹون (PROTON) اور نیوٹرون (NEUT-RON) ہیں، بے پناہ طاقت پوشیدہ ہے۔ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ اس طاقت کو ایٹم بم اور دوسرے تباہ کن ہتھیاروں کے لیے استعمال کرنے کے بجائے اسے تعمیری مقاصد کے لیے استعمال کیا جائے۔

ایک جائزہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اگر ایٹمی طاقت کو زرعی میدان میں استعمال کیا جائے تو وہ دن زیادہ دور نہیں ہے گا جب دنیا کا ہر ملک خود کفیل ہو جائے گا اور رفتہ رفتہ قحط و بھکمری کا نام بھی لوگ بھول جائیں گے۔ آج نہ صرف ہمارا ملک بلکہ دنیا کے بہت سے ممالک غذائی بحران کے دور سے گزر رہے ہیں اس بحران سے نجات کا واحد حل یہی ہے کہ فصل بھرپور پیدا کی جائے اور یہ صرف ایٹمی طاقت کے پرامن استعمال ہی سے ممکن ہے۔ ریڈیو ایکٹیو ٹریکرس اور فرٹیلائزرس کی مدد سے غلہ کی مقدار ہزاروں ٹن سے بڑھا کر لاکھوں ٹن تک پہنچائی جا سکتی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ بہترین فصل کا انحصار بہترین بیج پر ہوتا ہے یا بہتر بیج بہتر فصل کا ضامن ہے تابکاری (RADIATION) کے ذریعہ بیجوں کو زیادہ سے زیادہ کارآمد اور مفید بنایا جا سکتا ہے غرضکہ زرعی میدان میں ایٹمی طاقت کا پرامن استعمال خوش آیند مستقبل کی نشاندہی کرتا ہے۔

غذائی مسئلے کے بعد اس وقت ساری دنیا کے سامنے ایک سنگین مسئلہ ایندھن کی فراہمی کا ہے۔ کوئلے اور پٹرولیم کے روز بروز گھٹتے ہوئے ذخیرے ساری دنیا کے سائنسدانوں کے سامنے ایک پریشان کن سوالیہ نشان بن گئے ہیں۔ ایٹمی طاقت اس سنگین مسئلہ کا طمینان

بخش حل پیش کرتی ہے۔ ایمی طاقت ایندھن کا نہ ختم ہونے والا ذخیرہ ہے، خاص طور سے ہمارے ملک کے لیے تو یہ ایک بیش بہا نعمت ہے کیونکہ کوئلے کے ذخیرے روز بروز کم ہوتے جا رہے ہیں اور پیٹرولیم غیر ملکی زرمبادلہ کا بہت بڑا حصہ ختم کر دیتا ہے۔ اس ایٹم میں اس قدر طاقت پنہاں ہے کہ اس سے حاصل شدہ طاقت کو صنعتوں کے فروغ بجلی کی فراہمی اور مشینری کے کام کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اگر اس طاقت کو پرامن طور پر استعمال کیا جائے تو بجلی باآسانی اور کثیر مقدار میں حاصل ہو سکتی ہے، مختلف صنعتوں کا فروغ ہو سکتا ہے اور پیداوار میں معتدبہ اضافہ بھی اس ایندھن ہی کی بدولت ممکن ہے۔

موذی اور لاعلاج امراض ہمیشہ ہی سے بنی نوع انسان کے لیے ایک پریشان کن مسئلہ بنے رہے ہیں۔ ناقابل یقین حد تک ایمی توانائی کا پرامن استعمال انسان کو موذی امراض سے نجات اور لاعلاج امراض کا علاج پیش کر سکتا ہے۔ کینسر آج کا لاعلاج مرض تصور کیا جاتا ہے جب کہ تازہ ترین تحقیقات کے مطابق ایمی تابکاری کے ذریعہ ہی اس کا علاج ممکن ہے اور وہ دن بھی دور نہیں ہے جب کینسر کا تیر بہدف علاج ایمی توانائی کے ذریعہ دریافت کر لیا جائے گا۔ دماغ کے ٹیومر کا علاج آیوڈین (IODINE) کے ریڈیو آئسوٹوپ (RADIOISOTPE) کی مدد سے کیا جا سکتا ہے۔ ذیابطیس، ٹیومر (DYOPAH) وغیرہ کا علاج بھی اسی سے ممکن ہے۔ اس طرح متعدد موذی امراض کا علاج ایمی توانائی کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔ اس کے علاوہ طبی دنیا کی روز افزوں ترقی میں بھی یہ ایمی توانائی بہت معاون و مددگار ثابت ہوگی

آج کی تیز رفتار دنیا میں سستے اور تیز گام نقل و حمل کے ذرائع کی بھی اشد ضرورت ہے۔ ایمی طاقت اس مسئلہ کا بھی موثر حل پیش کرتی ہے۔ ایٹم کی بے پناہ طاقت کو باآسانی اس مقصد کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس طاقت کو روزمرہ کے کاموں جیسے لانڈری، کھانا پکانے وغیرہ میں استعمال کر کے ان کاموں کو آسان، سہل اور ارزاں بنایا جا سکتا ہے۔ مختصراً اس سارے جائزے سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس ننھے سے ذرہ میں بے پناہ طاقت موجود ہے اور اس طاقت کو تعمیری مقاصد کے لیے استعمال کر کے بنی نوع انسان کو زیادہ سے زیادہ راحت پہنچائی جا سکتی ہے۔

ہم کو یہ بھی امید کرنا چاہیئے کہ حالیہ ایمی تجربات جو ہمارے ملک میں ہوئے ہیں ان کی روشنی میں ایمی طاقت کو تعمیری اور ترقیاتی پروگراموں میں استعمال کر کے متعدد مسائل کا حل تلاش کیا جا سکتا ہے اور ہندستان کو باآسانی دنیا کا ایک ترقی یافتہ اور ہر میدان میں ایک خود کفیل ملک بنایا جا سکتا ہے۔

★

وزیر اعظم کا انقلابی پروگرام

آیئے اسے کامیاب بنائیں

۲۰ نکاتی معاشی پروگرام

عملدرآمد کی منزل میں اتر پردیش کے تیز قدم

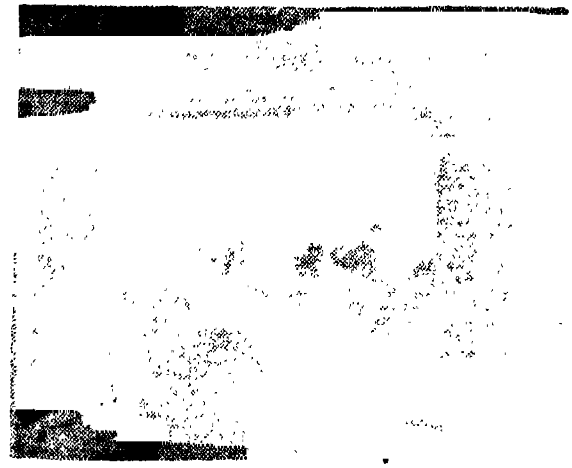
یکم جولائی ۱۹۷۵ء ہمیشہ ایک تاریخی دن کی حیثیت سے یاد رکھا جائے گا۔ اسی روز وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے اپنے نشریے میں چیلنجوں سے بھرے ایک معاشی اور سماجی پروگرام کی خاص خاص باتوں کا ذکر کیا تھا۔ ایک ایسا پروگرام جسے ایک معینہ مدت میں پورا ہو جانا ہے، جس میں زور کارگزاریوں اور کامیابیوں پر دیا گیا ہے اور جو خاص طور سے سماج کے کمزور طبقوں کو راحت، اور مشکلوں سے نجات دلانے کے لیے مرتب کیا گیا ہے۔ اس نازک موقع پر یہ ضروری ہو گیا تھا کہ تعمیری طاقتوں کی نو تشکیل کی جائے اور ملک کے عوام میں ایک بار پھر یہ اعتماد پیدا کر دیا جائے کہ قوم میں اب بھی حوصلہ ہے، اس میں آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔

ریاست اتر پردیش نے اس عظیم مہم کے پروگراموں پر عملدرآمد کرنے میں شروع ہی سے مستعدی برتی ہے اور ۲۰ نکاتی پروگرام میں شامل اسکیموں کو مکمل کرنے کے لیے اہتمام وسائل بروئے کار لائے گئے ہیں۔ پروگرام پر عملدرآمد کے لیے ایک جامع اسکیم وضع کی گئی جس میں حکومت اور اس کے مختلف محکموں، ریاست کے عوام اور ان کے نمائندوں، مالیاتی اور امداد باہمی اداروں وغیرہ کو پوری مستعدی سے سرگرم عمل کر دیا گیا۔ اس پروگرام کو مقررہ مدت کے اندر ہی عملی جامہ پہنانے کی پوری پوری کوشش کی گئی ہے۔ ہر سطح پر کام کی رفتار کی نگرانی کی جا رہی ہے اور ۲۰ نکاتی پروگرام کے تحت ہونے والے تمام کاموں کا موقع پر جا کر جائزہ لیا جا رہا ہے۔ نیز موثر قانون وضع کر کے انھیں عوام کے تعاون سے زندگی کے سبھی شعبوں میں سختی سے نافذ کرنے کی حتی الامکان کوشش کی جا رہی ہے۔ اس پروگرام سے ہر طرف حوصلہ اور امنگ کی لہر دوڑ گئی ہے۔ عوام نے اس کا پرجوش خیر مقدم کیا ہے۔ اس سلسلے میں اب تک کافی کام کیا جا چکا ہے اور ۲۰ نکاتی معاشی پروگرام کے مقررہ نشانہ کو پورا کرنے کے لیے ریاست تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ حکومت نے ہر سطح پر مختلف شعبوں کو مستحکم کر دیا ہے اور پروگرام کو تیز رفتاری سے آگے بڑھانے کے لیے اسے کئی حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ اس پروگرام کو آگے بڑھانے اور اس پر عملدرآمد کی نگرانی کے واسطے حکومت کی سطح پر چیف سکریٹری برانچ میں ایک مخصوص شعبہ قائم کر دیا گیا ہے اور اس اہم کام کو عملی جامہ پہنانے کا کام ایک کل وقتی کمشنر نے سنبھال لیا ہے۔ ریاستی سطح کی ایک عملدرآمد کمیٹی کی تشکیل کی گئی ہے جس کی ایک میٹنگ بھی ہو چکی ہے جس میں پروگرام سے متعلق اب تک کی رفتار ترقی کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ہر شعبہ میں کامیابیوں کی اب تک کی تفصیل درج ذیل ہے:

مد نمبر۔۱

ضروری اشیاء کی قیمتیں کم کرنے، پیداوار بڑھانے، وصولی اور تقسیم کے نظام کو بہتر بنانے کے اقدامات

غذائی اجناس اور روزمرہ استعمال کی دیگر چیزوں کی قیمتیں کم کرنے کے سلسلے میں بڑے پیمانے پر قانونی اور انتظامی اقدامات کیے گئے ہیں جس کے نتیجہ میں ان کی قیمتوں میں نمایاں کمی، ان کی مناسب فراہمی، باقاعدہ تقسیم، بدعنوانیوں کی روک تھام اور گیہوں اور چاول کی غیر معمولی وصولیابی ہوئی۔



حیدر گڈھ میں ایک مزید جنتا کلاتھ اسٹور کا قیام

۱۔ چھاپوں کی تعداد ۴۵۷

۲۔ ضروری اشیا (قانون) کے احکام کی خلاف ورزیوں اور درج کی جانے والی ابتدائی رپورٹوں کی تعداد ۲۷۲

۳۔ مختلف احکام کی خلاف ورزیوں کے سلسلے میں گرفتار کیے جانے والے افراد کی تعداد ۱۳۶۷
(ڈی۔ آئی۔ ایس۔ آئی۔ آر ۔ ۴۵۰، میسا ۱۹، مختلف کنٹرول آرڈر ۸۹۸)

۴۔ ضبط شدہ املاک کی مالیت (روپیوں میں) ۴۱۰۲۴۷۳

۵۔ (الف) سستے غلہ کی دکانیں جو منسوخ کی گئیں ۵۷۵
(ب) شکر کی دکانیں جو منسوخ کی گئیں ۳۸۳

۶۔ (الف) سستے غلہ کی دکانیں جو معطل کی گئیں ۳۳۶
(ب) شکر کی دکانیں جو معطل کی گئیں ۔ ۱۳۶

۷۔ جعلی راشن یونٹیں جو منسوخ کی گئیں ۱۰۷۱۲۸۲
(۱۵۳۰۱۸ راشن کارڈوں سے متعلق تھے)

۸۔ ضروری اشیا کی تقسیم کی مثالی اسکیم ۷ر اکتوبر ۱۹۷۵ء کو نینی تال ضلع میں شروع کی گئی۔

۹۔ سستے غلہ کی دکانیں :

(الف) کل دکانیں ۱۶۱۳۱
(۵۵۵۸ شہری اور ۱۰۵۷۳ دیہی علاقوں میں)

(ب) امداد باہمی زمرے میں دکانوں کی تعداد ۱۸۳۷

(ج) مجموعی دکانوں سے امداد باہمی زمرے کی دکانوں کا تناسب ۱۱٫۲۵ فیصد

۱۰۔ لکھنؤ شہر میں دودھ، مکھن، ڈبل روٹی اور انڈوں کی فروخت کے لیے دودھ بوتھوں کی تعداد ۳۰

۱۱۔ تجربہ کی بنیاد پر محلہ کمیٹیوں کی تشکیل تو
شہر کے ہر ہاؤسنگ علاقہ میں اور دیہی علاقہ کے ہر ترقیاتی بلاک میں نگراں کمیٹیوں کی تشکیل کی گئی ہے۔ لکھنؤ کے شہری علاقہ میں تجربہ کے طور پر ہر وارڈ میں نگراں کمیٹیاں کام کر رہی ہیں۔

۱۲۔ (الف) ضروری اشیا کی دستیابی اور قیمتوں کے رجحان پر نظر رکھنے کے لیے محکمۂ غذا کا مانیٹرنگ سیل
۱۹۰ منڈیاں اس کے دائرہ کار میں آتی ہیں
(ب) مذکورہ بالا مقصد کے لیے محکمۂ معاشیات اور اعداد و شمار کا مانیٹرنگ سیل
اس کے دائرہ کار میں ۱۴ بازار اور ۴۴ ضروری اشیا آتی ہیں۔

۱۳۔ وصولی : (الف) گیہوں لیوی کا نشانہ (ٹنوں میں) ۶۰۳۰۷۰
(ب) وصولی (ٹنوں میں) ۷۸۸۰۶۰
(ج) چاول کی لیوی کا نشانہ (ٹنوں میں) ۶۰۰۰۰۰
(د) وصولی (ٹنوں میں) ۶۷۵۰۰۰

ضمیمہ نمبر ۔ ۲

جوت حد بندی پر عمل درآمد اور فاضل زمین کی سریع تقسیم

اتر پردیش ملک کی وہ ریاست ہے جس نے اصلاحات آراضی کی ایک ترقی پذیر پالیسی اپنائی ہے اور خاتمہ زمینداری و اصلاحات آراضی ایکٹ ۱۹۵۰ء، یوپی جوت حد بندی ایکٹ ۱۹۶۰ء اور جوت چک بندی ایکٹ ۱۹۵۳ء وضع کیے۔ ان قوانین میں وقتاً فوقتاً اس نظریے سے ترمیمیں کی گئیں کہ ان میں اور قومی رہبر اصولوں میں مطابقت رہے۔ بے زمین مزدوروں اور اقوام و قبائل مندرجہ فہرست میں زمین کی تقسیم کا کام دو



ترائی علاقے نینی تال میں بے زمین افراد کو آراضی کی تقسیم

شور سے جاری ہے۔ زمین کے نئے پٹہ داروں کو مالی امداد دینے کا بندوبست کیا گیا ہے تاکہ انھیں جو زمین الاٹ کی گئی ہے اس کا وہ پورا پورا فائدہ اٹھا سکیں۔ ان لوگوں سے تین سال تک لگان وصول نہیں کیا جائے گا۔

(الف) حد بندی کے نتیجے میں فاضل آراضی حد بندی قانون ترمیم شدہ یوپی۔ ایکٹ نمبر ۱۸، ۱۹۷۵ء (جس کا نفاذ ۸ رجون ۱۹۷۳ء سے ہوا)

۱۔ دائر کیے گئے مقدمات	۴۷۵۳۶
فیصل ہوئے	۲۷۴۵۳
زیر سماعت	۲۰۰۸۳
۲۔ دفعہ ۱۴ (۱) کے تحت فاضل قرار دیا گیا رقبہ (ایکڑمیں)	۱۲۰۰۴۴
قبضہ میں کی گئی آراضی (ایکڑمیں)	۸۵۰۱۱
تقسیم کی گئی (ایکڑمیں)	۷۶۰۱۰

(ب) گاؤں سبھا کی زمین

۱۔ ناجائز قبضے ہٹائے گئے (ایکڑمیں)	۳۴۰۷۶۱
۲۔ الاٹمنٹ	
(۱) ناجائز قبضے ہٹائے جانے کے بعد (ایکڑمیں)	۱۷۲۹۴۸
(۲) گاؤں سبھا کی دیگر آراضی (ایکڑمیں)	۱۲۰۹۳۳۳

(ج) گاؤں سبھا اور حد بندی کی فاضل آراضی سے مستفید ہونے والے افراد کی تعداد

۱۔ اقوام و قبائل مندرجہ فہرست سے تعلق رکھنے والے زرعی مزدور۔	۸۹۵۷۶۶
۲۔ دیگر بے زمین زرعی مزدور	۳۵۶۹۷۳
۳۔ دیگر زمرے	۱۷۳۳۲۵
میزان	۱۵۲۵۰۶۴

مد نمبر ۳
بے زمینوں اور کمزور طبقوں کے لیے رہائشی پلاٹ

دیہی علاقوں کے ایسے بے زمین مزدوروں اور دیگر کمزور طبقوں کے خاندانوں کی تشخیص کرکے جنھیں مکان کی ضرورت تھی پوری مستعدی اور تیزی کے ساتھ ان کو رہائشی پلاٹ الاٹ کرنے کی کارروائی کی جا رہی ہے۔ ان پلاٹوں کے جائے وقوع کو رہائش کے قابل بھی بنایا جا رہا ہے اور جن لوگوں کو یہ پلاٹ الاٹ کیے گیے ہیں انھیں مالی امداد دینے کے اقدامات بھی کیے جا رہے ہیں تاکہ یہ لوگ جس قدر جلد ممکن ہو مکانات تعمیر کر سکیں۔

۱۔ رہائشی پلاٹوں کے حق دار خاندانوں کی مجموعی تعداد	۱۱۶۹۷۵۱۴
۲۔ خاندانوں کی تعداد جنھیں ۳۰ رجون ۱۹۷۵ء تک رہائشی پلاٹ الاٹ کیے گئے۔	۹۹۷۷۸۹
۳۔ خاندانوں کی تعداد جنھیں یکم جولائی ۱۹۷۵ء سے ۳۱ رجنوری ۱۹۷۶ء تک رہائشی پلاٹ الاٹ کیے گئے۔	۱۴۹۳۰۲
(۲) اور (۳) کی میزان (اس میں اقوام و قبائل مندرجہ فہرست کے ۹۴۰۶۱۵۔ افراد شامل ہیں۔)	۱۱۴۷۰۹۱
۴۔ مستحق خاندانوں کے مقابلے میں رہائشی پلاٹ پانے والے کیتوں کا فی صد۔	۹۸
۵۔ ۳۱ رجنوری ۱۹۷۶ء تک قبضہ پانے والے خاندانوں کی تعداد۔	۱۱۳۹۰۱۸

مد نمبر ۴

پابند مزدوری کا خاتمہ

پابند مزدوری کا رواج کن کن جگہوں پر ہے، اس کا پتہ لگانے کے لیے ریاست بھر کا سروے کیا گیا۔ اس رواج کو ہمیشہ ہمیشہ ختم کرنے کے لیے قانونی اور انتظامی کارروائی مکمل کی جا چکی ہے۔ پابند مزدوری سے نجات



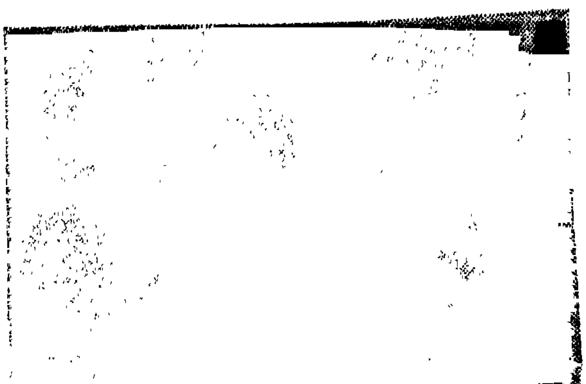
مشرقی اترپردیش کا ایک کسان پابند مزدوری سے چھٹکارہ پانے کے بعد خوش و خرم نظر آرہا ہے

پانے والوں کی بحالی کے لیے اقدامات کیے جا رہے ہیں۔ دہرہ دون میں کوٹلا ذات کے ...۱۹ مزدوروں کو پابند مزدوری سے نجات مل گئی ہے۔

مد نمبر ۵

دیہی قرضوں سے چھٹکارہ

ایسے بے زمین زرعی مزدوروں کو جن کے پاس یا تو کوئی زمین نہیں تھی یا بھومی دھر، سیردار، اسامی یا سرکاری پٹے دار کی حیثیت سے ایک ایکڑ سے کم زمین تھی، انھیں، اترپردیش زرعی مزدور قرضہ چھٹکارہ ایکٹ ۱۹۷۵ء کے ذریعہ قرض کے بندھنوں سے آزاد کر دیا گیا ہے۔ اترپردیش کے دیہی کمزور طبقہ سے متعلق (قرضہ وصولی التوا ایکٹ) ۱۹۷۵ء کے تحت بے زمین زرعی مزدوروں، چھوٹے اور مارجنل کسانوں نیز دیہی دستکاروں سے ایک سال تک قرضہ کی وصولی روک دی گئی ہے۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لیے امداد باہمی قرضہ انجمنوں کے نئے ممبر بنا کر ان تنظیموں کو مستحکم کیا جا رہا ہے۔ ابھی تک ۲۲،۴۹ لاکھ ممبر بنائے جا چکے ہیں اور ۸۰،۵ کروڑ روپیہ کی رقم درمیانی قرضہ کے طور پر ان کے لیے منظور کی جا چکی ہے۔ اس اسکیم کے تحت امداد باہمی قرضہ انجمنوں کے ممبر بننے والے ہریجنوں کی فلاح و بہبود کی جانب خصوصی توجہ دی جا رہی ہے۔ دیہی علاقوں میں بینک قائم کرنے کی بھی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ اس قسم کے بینک گورکھپور، دیوریا اور مرادآباد میں قائم کیے جا چکے ہیں اور ان تین اضلاع میں سے ہر ایک میں کسانوں کی ۲۰ خدمات انجمنیں اور ۲۰ بڑی امداد باہمی انجمنوں کی تشکیل کی جا چکی ہے۔



حیدر گڑھ بلاک (ضلع بارہ بنکی) میں امداد باہمی صنعتی پیشوں میں تربیت دی جا رہی ہے

مد نمبر ۶

زرعی مزدوروں کی کم سے کم اجرت کے قانون پر نظر ثانی

ریاستی حکومت نے ۲۳ اکتوبر ۱۹۷۵ء سے زرعی مزدوروں کی کم سے کم اجرتوں کی شرح پر نظر ثانی کی ہے۔ مزدوری کی نئی شرحیں درج ذیل ہیں:

علاقہ	ماہانہ شرح (روپیوں میں)	یومیہ شرح (روپیوں میں)
مشرقی	۱۳۰	۵

مغربی	۱۶۹	۶٫۵۰
مرکزی	۱۴۲	۵
پہاڑی	۱۵۶	۶

اجرتوں کے نفاذ کا عملہ بڑھا دیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں مجموعی طور پر ۲۸۹۴ معاملات رجسٹر کیے گئے جن میں سے ۱۰۸۴ معاملات کا فیصلہ ہوگیا۔

مد نمبر ۷

آبپاشی کی صلاحیت میں مزید توسیع

آبپاشی کی صلاحیت میں اضافہ پروگرام کا ایک اہم جز ہے چنانچہ گرجا پوری میں ایک بیراج اور پانی کو موڑنے کے لیے کی گئی تعمیرات کے ذریعہ دریائے گھاگرا کے پانی کو شاردا سہایک پراجکٹ کی ایک معاون نہر میں پہنچایا گیا جس سے شاردا نہر کی دریاباد اور بارہ بنکی شاخوں میں مزید ۳۵۰۰ کیوسکس پانی فراہم ہوگیا۔ اس پانی سے فاضل زرعی پیداوار کی شکل میں بدیہی فوائد حاصل ہونا شروع ہوگئے ہیں۔ جنوری ۱۹۷۶ء سے ڈلؤ پمپ نہر اسکیم کے دوسرے مرحلہ کے دو پمپوں کے چالو ہوجانے سے رائے بریلی اور پرتاپ گڑھ اضلاع میں مزید ۴۰۰۰ ہیکٹر آراضی کے لیے آبپاشی کی سہولت فراہم ہوگئی ہے۔ جولائی ۱۹۷۵ء کے بعد گنڈک پراجکٹ، کوسی سینچائی اسکیم، ہری پور ذخیرہ آب اسکیم، کوسی گھاٹی اور رام گنگا گھاٹی اسکیموں کے تحت مالی سال رواں میں یکم جولائی کے بعد تقریباً ۳۸۰۰۰ ہیکٹر رقبہ کے لیے آبپاشی کی سہولت فراہم کی گئی۔ جون ۱۹۷۶ء تک مزید ایک لاکھ ہیکٹر آراضی کی سینچائی کی سہولت فراہم کرنے کے لیے ایک تیز رفتار پروگرام شروع کیا گیا ہے جس کے لیے پلان میں عام طور سے فراہم کی جانے والی رقم کے علاوہ ۱۲٫۰۵ کروڑ روپے کی ایک خصوصی رقم کا بندوبست کیا گیا ہے۔ اس بات پر بھی زور دیا جارہا ہے کہ آبپاشی کے موجودہ وسائل سے زیادہ سے زیادہ رقبے کو سینچائی کی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔ اس سال ربیع کی فصل میں ۳۰ لاکھ ہیکٹر رقبے کی آبپاشی کی گئی جو گزشتہ ربیع کی فصل میں سینچے گئے رقبے کے مقابلے میں ۵ لاکھ ہیکٹر زیادہ ہے۔

شاردا سہایک، رام گنگا اور گنڈک پراجکٹوں کے کمانڈ علاقوں کے لیے مربوط ترقیاتی پروگرام وضع کیا جارہا ہے۔ موجودہ نہروں اور ان نہروں سے جن کی جدید کاری کی جارہی ہے یا جو از سر نو تعمیر ہو رہی ہیں نالیوں اور گولوں کا ایک جال سا بچھایا جارہا ہے تاکہ دور دراز مقامات پر واقع کھیت بھی ان سے سیراب ہوسکیں۔



اعظم گڈھ ضلع میں چھوٹے آبپاشی اسکیموں کے تحت زمین دوز پانی کا استعمال

مد نمبر ۸

بجلی کی ترقی

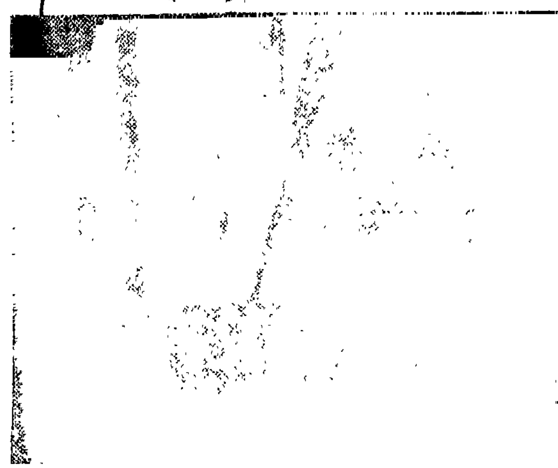
جنوری ۱۹۷۶ء کے اختتام تک بجلی کی پیداواری صلاحیت میں ۲۴۶ میگاواٹ کا اضافہ ہوا، ۳۵۹۱ مواضعات اور ۴۴۵ ہریجن بستیوں میں بجلی کی روشنی پہنچائی گئی۔ اس کے علاوہ ۳۵۰ سرکاری ٹیوب ویلوں، ۲۵۴۲۵ نجی ٹیوب ویلوں اور پمپ سیٹوں کو بجلی دی گئی۔ بجلی کے متعدد زیر تعمیر پراجکٹوں کے کام میں تیزی لاکر جون ۱۹۷۶ء تک مزید ۱۶۵ میگاواٹ بجلی مہیا کی جائے گی۔ موجودہ ربیع کی آبپاشی کے دوران میں دیہی علاقوں میں رات دن بجلی مہیا کی گئی۔ اسی طرح ان صنعتوں کو بھی جن میں مسلسل کام ہوتا ہے ۲۴ گھنٹہ بجلی کی سپلائی جاری رکھی گئی۔ مجموعی طور پر تقریباً ۸۰۰۰ جلے ہوئے اور چوری ہوجانے والے ٹرانسفارمروں کی جگہ پر نئے ٹرانسفارمر لگائے گئے۔ اس کے علاوہ بجلی کی تقسیم و ترسیل کی لائنوں کی از سر نو مرمت کی گئی۔ ریاست کے صنعتی علاقوں میں ۱۳۲ کیلوواٹ اور ۲۲۰ کیلوواٹ کے متعدد بڑے ذیلی اسٹیشن بھی زیر تعمیر ہیں۔ ریاست میں اب بجلی کی قلت دور ہوتی جارہی ہے اس لیے بجلی کے

نئے کنکشن بھی منظور کیے جا رہے ہیں اور گرڈوں کو نئے لوڈ سے مربوط کرنے کے لیے اقدامات بھی کیے جا رہے ہیں۔ صنعتی ضرورتوں کے لیے بڑی تعداد میں بجلی کے واسطے درخواستیں رجسٹر کرنے اور کنکشن دینے کے لیے منظور کی جا چکی ہیں۔ دیہی بجلی کاری کے پروگرام میں تیزی لانے کے لیے بھی اقدامات کیے جا رہے ہیں۔

مد نمبر ۹

ہینڈلوم زمرے کی ترقی

ہینڈلوم صنعت کو ترقی دینے کے لیے جامع اسکیمیں وضع کی گئی ہیں جو کار برآری کے مختلف مرحلوں میں ہیں۔ ان اسکیموں میں سوت کی سپلائی، کرگھوں میں سدھار، بہتر ڈیزائنوں کی تیاری، بنکروں کی امداد باہمی انجمنوں کی تشکیل، مربوط ترقیاتی واحدوں کا قیام،



ہینڈلوم صنعت کی ترقی ——— وارانسی کا ایک بنکر

پروسیسنگ کی سہولتوں میں سدھار اور ریاست میں ان کی فروخت اور برآمد کو ترقی دینا شامل ہے۔ اس صنعت کی ترقی ذیل کے اعداد و شمار سے واضح ہو جائے گی:

۱۔ بکری ڈپوں کی تعداد ۱۰ (ان میں سے ایک ریاست کے باہر ہے)
۲۔ نمائشوں کی تعداد جو لگائی گئیں ۱۴
۳۔ بکری ڈپو اور نمائشوں کے ذریعہ فروخت کیے گئے کپڑے کی مالیت نجی ذرائع سے } ۱۴۰ کروڑ روپیہ
۴۔ نئی انجمنوں کی تعداد جو رجسٹر کی گئیں ۔ ۳۴ (ان میں تانا بانا سازی کی بھی شامل ہیں)

۵۔ امداد باہمی زمرہ میں شامل بنکروں کی تعداد ۱۷۹۹
۶۔ امداد باہمی زمرہ میں شامل بنکروں کو ملنے والی ریزرو بینک آف انڈیا کی گارنٹی } ۱۹۵۱ لاکھ روپیہ
۷۔ ڈیزائن سنٹروں کی تعداد ۵
۸۔ بنکر امدادی فنڈ ۱

مد نمبر ۱۰

معیاری کپڑے کی سپلائی

کنٹرول کے کپڑے کی تھوک اور پھٹکر تقسیم کا انتظام کے انصرام یو۔ پی امداد باہمی فیڈریشن کر رہی ہے۔ چنانچہ کپڑے کی فروخت کے لیے بڑے پیمانے پر پھٹکر مرکزوں کا بندوبست کیا گیا ہے۔ ان مرکزوں کی مجموعی تعداد دیہی علاقوں میں ۴۷۵۵ اور شہری علاقوں میں ۱۳۸۹ ہے۔ ان مرکزوں سے جون ۱۹۷۵ء سے جنوری ۱۹۷۶ء تک ۱۴۵۸ء۱۴ کروڑ روپے مالیت کا ۴۵ء۸ کروڑ میٹر کپڑا صارفین کو فروخت کیا گیا۔ کنٹرول کپڑے کی تقسیم پر مقدار، آمدنی اور جوت سے متعلق عائد پابندیاں ہٹائی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ ان علاقوں میں جہاں امداد باہمی فروخت مرکز نہیں ہیں، سستے غلہ کی دوکانوں اور شکر کے پھٹکر دوکانداروں کو کنٹرول کا کپڑا فروخت کرنے کا بھی مجاز کر دیا گیا ہے۔ دیہی علاقوں کی ہر نیائے پنچایت میں کم سے کم ایک پھٹکر فروخت مرکز کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔ شہر میں پھٹکر بکری کی دوکانیں قائم کرنے کے سلسلے میں اس امر کو خاص طور سے ملحوظ رکھا گیا ہے کہ یہ دوکانیں ایسے علاقوں میں کھولی جائیں جہاں مزدور پیشہ لوگوں ہریجنوں اور سماج کے دوسرے کمزور طبقوں کی غالب آبادی ہو۔ ریاستی غذا اور ضروری اشیاء سے متعلق کارپوریشن نے نیشنل ٹیکسٹائل کارپوریشن سے ملنے والے کنٹرول اور اوسط درجے کے کپڑے کی تقسیم کا بھی بندوبست کیا ہے۔ اس مقصد سے کارپوریشن نے ریاست میں ۵۰ پھٹکر دوکانیں قائم کر دی ہیں۔

مد نمبر ۱۱

شہری آراضی (حد بندی و انضباطی) قانون ۱۹۷۶ء پر عمل درآمد اور شہری آراضی کو سماجی ملکیت بنانے کے اقدامات

شہری آراضی (حد بندی اور انضباط) ایکٹ ۱۹۷۶ء کے عمل درآمد کے سلسلے میں ابتدائی کارروائی کی جا چکی ہے اور شہری آراضی کو قومی رہبر اصولوں کی بنیاد پر قومی ملکیت میں لینے کے لیے مزید اقدامات کیے جائیں گے۔

مد نمبر ۱۲

شاندار عمارتوں کی مالیت آنکنے اور ٹیکس چوری کی روک تھام کے لیے خصوصی دستے اقتصادی مجرموں کے مقدمات کی سرسری سماعت اور عبرت ناک سزائیں۔

ذخیرہ اندوزی اور چور بازاری کرنے والوں، اسمگلروں اور سماج دشمن عناصر کے خلاف جون ۱۹۷۵ء سے جنوری ۱۹۷۶ء تک کی مدت میں جو بھرپور مہم چلائی گئی اور جس سختی کے ساتھ کارروائی کی گئی وہ ذیل کے اعداد و شمار سے واضح ہوگی۔



علیگڑھ میں ذخیرہ اندوزی کے خلاف چھاپہ

۱۔ چھاپوں کی تعداد	۴۴۷
۲۔ ابتدائی رپورٹوں کی تعداد	۲۵۲
۳۔ گرفتار کیے جانے والوں کی تعداد	
(۱) ڈی۔ آئی۔ ایس۔ آئی۔ آر/ ضروری اشیاء قانون کے تحت۔	
اقتصادی مجرمین	۲۱۹۱
سماج دشمن عناصر	۲۲۴۹
(۲) میسا کے تحت	
اقتصادی مجرمین	۲۷
سماج دشمن عناصر	۳۳۱
متفرق	۷۷۸
۴۔ پکڑی گئی گاڑیوں کی تعداد	۵۸۱۹

مد نمبر ۱۳

سرمایہ کاری کے طریقہ کار میں نرمی اور درآمدی لائسنسوں کے ناجائز استعمال کے خلاف کارروائی

ریاست کے مختلف مالیاتی اور صنعتی کارپوریشنوں سے ملنے والے صنعتی قرضوں کی منظوری کے طریقہ کار کو آسان بنایا جا رہا ہے تاکہ قرضوں کی درخواستوں پر رکاوٹ کے بغیر تیزی سے کارروائی کی جا سکے۔ طریقہ کار کو آسان بنانے کی غرض یہ ہے کہ قرض کے لیے درخواستیں موصول ہونے کے ۹۰ دن کے اندر اندر ان پر قطعی فیصلہ کر لیا جائے۔ اس مقصد کے لیے مختلف مراحل سے گزرنے کی مدت مقرر کی جا رہی ہے۔ درآمدی لائسنسوں کے ناجائز استعمال کے سلسلے میں ۱۰۵ واحدوں کے خلاف کارروائی کی گئی۔

مد نمبر ۱۵

صنعتوں میں مزدوروں کی ساجھے داری

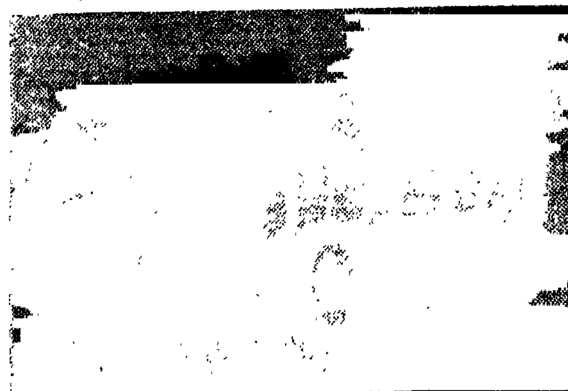
صنعتوں میں مزدوروں کی ساجھے داری سے متعلق حکومت ہند سے موصول ہونے والی اسکیم کا اطلاق ان سبھی سرکاری امداد باہمی اور نجی زمرے کے کارخانوں پر کیا جا رہا ہے جن میں ۵۰۰ سے زیادہ مزدور کام کرتے ہیں۔ چنانچہ اس وقت تک اس اسکیم کا نفاذ سرکاری اور امداد باہمی زمرے کی ال ۲۵، اور نجی زمرے کی ال ۸۸ صنعتوں پر کیا جا چکا ہے جہاں ۵۰۰ سے زیادہ مزدور کام کر رہے ہیں۔ بقیہ اداروں

میں بھی ایک مقررہ مدت کے اندر ہی اس اسکیم کو نافذ کردینے کے اقدامات کیے جارہے ہیں۔

مد نمبر ۱۶

سڑکوں کے ذریعہ نقل وحمل کے لیے قومی پرمٹ اسکیم

قومی پرمٹ اسکیم پر عمل درآمد کے لیے جملہ ضروری قانونی کارروائی کی جاچکی ہے۔ اتر پردیش کو قومی پرمٹ تعداد



مودی نگر میں نقل وحمل کے لیے قومی پرمٹ اسکیم پر عمل درآمد

۲۵۰، الاٹ کیے گئے ہیں جن کے لیے مقررہ تاریخ تک ۱۲۸۷ درخواستیں موصول ہوئی ہیں۔ ان درخواستوں کی جانچ کی جارہی ہے اور مارچ ۱۹۷۶ء کے ختم ہونے سے پہلے پہلے پرمٹ جاری کردیے جائیں گے۔

مد نمبر ۱۸

ہوسٹل میں رہنے والے طلباء کے لیے کنٹرول قیمت پر ضروری اشیاء کی فراہمی۔

ریاست کے ۱۲ بڑے شہروں میں اناج اور دوسری ضروری اشیاء تھوک بھاؤ پہ ڈگری کالجوں اور یونی ورسٹیوں کے ہاسٹلوں اور تسلیم شدہ لاجوں کو فراہم کی جارہی ہیں بقیہ شہروں میں ادارہ جاتی کارڈ دیے گئے ہیں جن پہ ہوسٹلوں اور تسلیم شدہ لاجوں میں مقیم طلبہ کو گیہوں، چاول، میدہ، سوجی، شکر، مٹی کا تیل اور کوئلہ حاصل کرتے ہیں۔ رڑکی اور پنت نگر۔ یونی ورسٹیوں کے طلبہ کے ہوسٹلوں کو بھی ایندھن کی لکڑی اور میدہ سپلائی کیا جاتا ہے۔ دیہی علاقوں کے تعلیمی اداروں کے سربراہوں کو طالب علموں میں براہ راست تقسیم کے لیے وافر مقدار میں اکٹھا مٹی کا تیل سپلائی کیا جارہا ہے۔ ضلع امداد باہمی صارفین اسٹوروں نے اپنی ۳۲ شاخیں قائم کی ہیں۔ مذکورہ بالا سہولتوں سے مستفید ہونے والے طالب علموں کی مجموعی تعداد ۳۰۶۲۴۳ ہے۔ ان سہولتوں میں مزید توسیع کے لیے اقدامات کیے جارہے ہیں۔

مد نمبر ۱۹

کنٹرول قیمت پر کتابوں اور کاپیوں کی سپلائی اور کتب بینکوں کا قیام

تقریباً ۱۵۰۰ درسی کتابوں کی قیمت فروخت میں ۲۰ سے ۳۰ فی صد تک کی تخفیف کرکے ان کی قیمتیں مقرر کردی گئی ہیں۔ درجہ ۱ سے ۸ تک کی درسی کتابوں کو قومیا لیا گیا ہے۔ اسی طرح درجہ ۱۱ سے ۱۲ تک کی ہندی کی نصابی کتابوں کو بھی قومیا لیا گیا ہے۔ درجہ ۹، اور ۱۰ کی انگریزی درسی کتابوں کو آئندہ تعلیمی سال سے قومیانے کی کارروائی کی جارہی ہے۔ درجہ ۱ سے ۸ تک کی قومیائی گئی کتابوں کی قیمتوں میں مزید تخفیف کرنے کے لیے ان کے سرورق کے رنگوں میں کمی، متن کے ہر صفحہ کی سطور کی تعداد میں اضافہ اور ایک جلد میں ایک سے زیادہ کتابوں کو ایک ہی سرورق کے ساتھ شائع کرنے کا بندوبست کیا جارہا ہے۔ حکومت ہند کے الاٹ کردہ تقریباً ۹۰۰۰ ٹن رعایتی قیمت کے کاغذ سے کاپیاں تیار کرکے پردیش بھر میں طالب علموں کو فراہم کی گئیں۔ یہ سستی کاپیاں بازار میں بہ کثرت دستیاب ہیں۔ اسکولوں کے امتحانوں میں استعمال کی جانے والی کاپیوں کے لیے بھی اسی قسم کا بندوبست کیا جارہا ہے۔ یونی ورسٹی گرانٹس کمیشن کی مدد سے تمام مجاز ڈگری کالجوں میں کتب بینکوں کے قیام کے لیے تیزی سے کارروائی کی جارہی ہے۔ ان ۲۶۰ ڈگری کالجوں میں سے جن کا الحاق یونی ورسٹیوں سے مستقل ہے ۱۹۵ کالجوں

نئے کتب بینک قائم کردیے ہیں اور کوشش کی جارہی ہے کہ بقیہ کالجوں میں بھی آئندہ تعلیمی سال سے قبل ہی کتب بینک یقینی طور پر قائم ہوجائیں۔ اس اسکیم کا نفاذ ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کالجوں میں بھی کیا جائے گا۔

مد نمبر ۲۰

اپرنٹس شپ اسکیم

اپرنٹس شپ اسکیم پر بڑی تیزی کے ساتھ عمل درآمد کیا جارہا ہے جیسا کہ درج ذیل اعداد و شمار سے واضح ہوگا۔

۱۔ ٹریڈ اپرنٹسز:۔

(۱) نوٹی فائڈ پیشوں کی تعداد ۱۴

(۲) صنعتوں کی تعداد جن میں یہ اسکیم نافذ کی گئی۔ ۲۱۵

(۳) صنعتی اداروں کی تعداد ۴۲۷۳

(۴) مختص کی گئی اسامیوں کی تعداد ۱۰۲۳۱

(۵) پُر کی گئی اسامیوں کی تعداد ۹۶۴۳،

(ان میں اقوام مندرجہ فہرست کے ۶۳۴ قبائل مندرجہ فہرست کے ۶۲، جسمانی طور پر معذور [illegible] اقلیتی اور کمزور طبقوں کے ۲۹۵، اور ۱۵ خواتین اپرنٹس شامل ہیں)

(۶) آجرین جن کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی گئی ۱۸۹

(۷) سزایاب، ۴ ۵ بری کردیے گئے، ۵۷ کے خلاف مقدمات زیر سماعت)

۲۔ گریجویٹ انجینئر اور ٹکنی شین اپرنٹس:۔

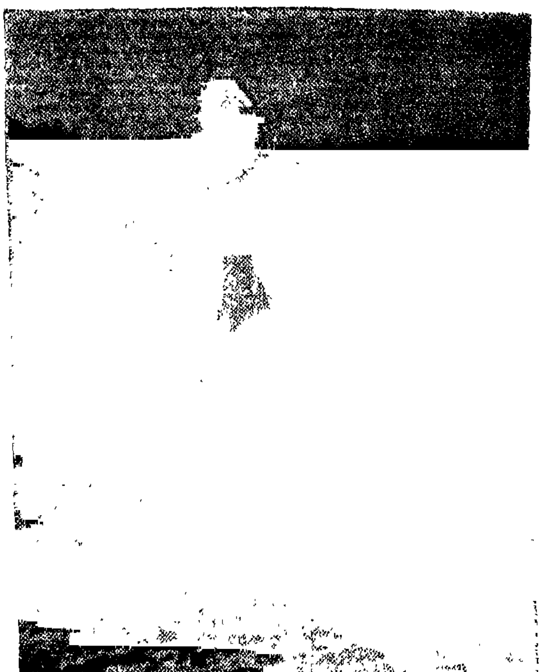
(۱) مضامین اور پیشوں کی تعداد ۲۴

(۲) ریاست میں قائم اداروں سے پاس شدہ گریجویٹوں کی تعداد ۱۷۱۲

(۳) تربیت یافتہ ٹکنی شینوں کی تعداد ۲۹۷۸

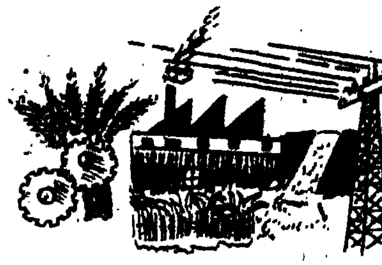
(۴) مختص کی گئی اسامیوں کی تعداد ۲۷۳۸

(۵) پُر کی گئی اسامیوں کی تعداد ۱۴۴۲



حکومت کی الاٹ کردہ زمین پر

ـــــ لکھیم پور کھیری



اتر پردیش شاہراہ ترقی پر

معاشی پروگرام پر تیز رفتار عملدرآمد کے لئے وزیر اعلیٰ کی اپیل ••• پسماندہ اضلاع میں صنعتی ترقی ••• قانونی امدادی کمیٹی کی تشکیل ••• اتر پردیش میں مکانات کے لئے زمین کا الاٹمنٹ ••• رکشا چلانے والوں کو قرضے

وزیر اعلیٰ شری نرائن دت تیواری نے دورپور ضلع نینی تال میں اعلان کیا کہ حکومت ایسے تمام افراد سے سختی سے نپٹے گی جو وزیر اعظم کے معاشی پروگرام میں رکاوٹ ڈالیں گے۔ انھوں نے سرکاری افسران اور ملازمین کو متنبہ کیا کہ اگر وہ پروگرام پر عمل درآمد کے سلسلہ میں تساہلی برتیں گے یا رکاوٹ ڈالیں گے تو ان کے خلاف سخت کارروائی کی جائے گی۔

وزیر اعلیٰ نے ددرپور، گدرپور، کیلاکھیڑہ اور سلطان پٹی میں عام جلسوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ وزیر اعظم کا پروگرام عوامی پروگرام ہے اور تمام طبقوں کو اس پر تیزی سے عملدرآمد کرنے کے سلسلہ میں حکومت کی کوششوں میں حصہ لینا چاہیے تاکہ غریبی اور اتر پردیش کی پسماندگی کو دور کیا جاسکے۔

وزیر اعلیٰ نے انکشاف کیا کہ لال کنواں میں مجوزہ کانفرنس کے لیے ایک مہینہ کے اندر مرکز کی منظوری متوقع ہے اور پنت نگر کے قریب ایک چقندر مل کے قیام کے امکانات کا جائزہ لیا جا رہا ہے۔ انھوں نے محکمہ لوکل سیلف گورنمنٹ کو ریاست بھر میں تین ماہ کے اندر جھگی جھونپڑی کے مسئلہ کو حل کرنے کی ہدایت کی۔

شری تیواری نے کہا کہ ایمرجنسی میں امن اور ضبط و نظم کی پابندی کا جو ماحول پیدا ہوا ہے اس کا اثر زندگی کے ہر شعبہ پر پڑنا چاہیے۔

انھوں نے کہا کہ غنڈوں اور ایسے لوگوں پر کوئی رحم نہیں کیا جائے گا جو قوانین کو توڑتے ہیں یا امن و امان کو درہم برہم کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ نظم و نسق کو بدعنوانی سے پاک کرنے کے لیے ریاست میں سادہ وردی کے ملازمین کی تعداد میں اضافہ کیا جائے گا۔

وزیر اعلیٰ نے انتباہ دیا کہ اگر عوام رضاکارانہ طور پر اپنے خاندانوں کو محدود رکھنے میں ناکام رہیں گے تو حکومت اس کے لیے سخت قانونی اقدامات کرنے کے لیے مجبور ہو جائے گی۔ انھوں نے عوام سے کہا کہ وہ چھوٹی بچت میں رقم لگائیں تاکہ مزید ٹیکس عائد کرنے کی ضرورت نہ پیش آئے۔ انھوں نے انکشاف کیا کہ وہ جلد ہی قیمتوں میں کمی کے رجحان کو برقرار رکھنے کے لیے طریقے اور ذرائع دریافت کرنے کے سلسلہ میں حکومت ہند سے گفت و شنید کریں گے۔ انھوں نے کہا کہ اگرچہ قیمتوں میں کمی ایک خوشگوار علامت ہے تاہم اس کا کسانوں پر خراب اثر نہیں پڑنا چاہیے جنھیں معقول قیمتوں پر زرعی ساز و سامان دستیاب ہونا چاہیے۔

نظامت صنعت نے ایک نئی اسکیم شروع کی ہے جس کے تحت دس پسماندہ اضلاع کی بھرپور صنعتی ترقی کے لئے نظامت کے بیشتر افسران مساوی تعداد میں ان اضلاع کے لیے مخصوص کر دیئے

گئے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت ہر افسر اپنے ضلع میں ۲۰ سے ۲۵ تک چھوٹے صنعتی واحدے قائم کرنے کے سلسلے میں مدد دے گا۔

اس سلسلے میں سال رواں کے دوران جو اضلاع منتخب کیے گئے ہیں ان میں الموڑہ، بستی، جھانسی، گونڈہ، سلطان پور، فیض آباد، پرتاپ گڈھ، بلند شہر، فتح پور اور بلیا شامل ہیں۔ دوسرے مرحلہ میں ان افسروں کو مزید دس اضلاع الاٹ کیے جائیں گے۔

ان اضلاع میں طے شدہ چھوٹے صنعتی پراجکٹ شروع کرنے کے لیے سبھی منتخب صنعت کاروں کو قومیائے گئے بینکوں کی طرف سے قرضوں کی صورت میں مالی امداد فراہم کی جائے گی۔ اس کے علاوہ صنعتوں کے خدمتی ادارہ کے تعاون سے صنعتی تربیت کا بندوبست بھی کر دیا گیا ہے۔

٭ ٭ ٭

اقوام و قبائل مندرجہ فہرست اور سابق جرائم پیشہ قبائل کے قرضداروں کو مفت قانونی مشورہ مہیا کرنے کی غرض سے ضلع کی سطح پر ججوں، چیف جوڈیشیل مجسٹریٹوں اور بار ایسوسی ایشنوں کے صدروں پر مشتمل قانونی امدادی کمیٹیاں قائم کی گئی ہیں۔ مفت قانونی مشورہ دینے کے سلسلے میں ہونے والے اخراجات کو پورا کرنے کے لیے مالیاتی سال رواں کے دوران دو لاکھ روپیہ کی رقم کا بندوبست کیا گیا ہے اور اس مقصد کے لیے مختلف اضلاع کو رقم مخصوص کی جا چکی ہے۔

ریاستی سطح پر بھی ایک قانونی امدادی مشاورتی کمیٹی قائم کی جائے گی جس کے چیرمین وزیر قانون ہوں گے۔

ضلع ججوں کو متعلقہ اضلاع میں پینل وکیلوں کی تقرری کرنے کا اختیار دیدیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں ریاست کے آٹھ ضلعوں میں پہلے تقرریاں کی جا چکی ہیں۔ پینل وکیلوں کی تقرری میں اقوام مندرجہ فہرست کے افراد کو ترجیح دی جا رہی ہے۔

یہ امر قابل ذکر ہے کہ اترپردیش بے زمین زرعی مزدور قرضہ راحت قانون، ۱۹۷۵ء اترپردیش دیہی نبکر طبقہ (قرضوں کی وصولی کے التوا) قانون، ۱۹۷۵ء اترپردیش کے پابند مزدوری کے امتناعی قانون، ۱۹۷۵ء جہیز امتناعی قانون، ۱۹۶۱ء چھوت چھات (جرائم) قانون، ۱۹۵۵ء کے تحت آنے والے مقدمات نیز ان افراد کو مکانات کی تعمیر اور دیگر مقاصد کے لیے الاٹ کی گئی زمین سے متعلق مقدمات کے سلسلے میں مفت قانونی مشورہ دینے کی سہولت کا بندوبست کیا گیا ہے۔

منصف مجسٹریٹوں کی عدالتوں کو تحصیل کے صدر مقام پر منتقل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے تاکہ سماج کے کمزور طبقے اس اسکیم سے زیادہ سے زیادہ مستفید ہو سکیں۔

٭ ٭ ٭

ریاست میں مکانات کی تعمیر کے لیے زمین کے الاٹمنٹ کا ۹۸ فیصد نشانہ پورا ہو گیا ہے۔ ایک سروے کے بموجب ریاست میں ۱۱۶۹۷۵۴ خاندان مکانات کے لیے زمین کے الاٹمنٹ کے مستحق تھے۔

اترپردیش میں جنوری ۱۹۷۶ء تک سماج کے کمزور طبقوں کے ۱۱۴۳۷۰۹۱ خاندانوں کو جن میں بے زمین مزدور اور اقوام و قبائل مندرجہ فہرست کے خاندان بھی شامل ہیں۔ مکانات کے لیے زمین الاٹ کی گئی۔

ریاست میں مکانات کے لیے زمین الاٹ کرنے کا کام بلند شہر، علی گڑھ، مین پوری، ایٹہ، بریلی، مرادآباد، شاہجہانپور، پیلی بھیت، رامپور، فرخ آباد، کانپور، فتح پور، جالون، باندہ، للت پور، جونپور، اعظم گڑھ، دہرہ دون، گڑھوال، ٹہری گڑھوال، چمولی، اترکاشی، لکھنؤ، اناؤ، رائے بریلی، سیتاپور، ہردوئی، کھیری، گونڈہ، بہرائچ، سلطان پور، پرتاپ گڑھ، بارہ بنکی، نینی تال، الموڑہ اور پتھورا گڑھ میں پورا ہو گیا ہے۔

٭ ٭ ٭

دینا بینک نے حال ہی میں مرادآباد میں ۲۲ رکشہ چلانے والوں کو سائیکل رکشوں کی خریداری کے لیے ۲۵۳۰۰ روپیہ کی رقم تقسیم کی ہے۔

ہر رکشہ چلانے والے کو ۱۱۰۰ روپیہ کے قرضہ دیا گیا ہے جو ایک رکشہ کی خریداری کے لیے کافی ہوگا۔ اس قرضہ پر چار فیصد سالانہ کی رعایتی شرح سے سود لیا جائے گا اور یہ قرضہ آسان قسطوں میں واجب الادا ہوگا۔ ایسے کاروباری بینک بھی جن کے اترپردیش میں لمیٹڈ بینک نہیں ہیں۔ ۲۰ نکاتی پروگرام کو بروئے کار لانے کے سلسلہ میں اترپردیش میں سماج کے کمزور طبقوں کی مدد کے لیے آگے آ رہے ہیں۔

★

نقد و تبصرہ

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا لازمی ہیں)

لکھنؤ کے چند نامور شعراء (جلد اوّل) ڈاکٹر سید سلیمان حسین مطبوعہ سرفراز قومی پریس لکھنؤ۔ دسمبر ۳، ۱۹۷۶ء جسامت ۲۰×۳۰/۱۶ انچ ضخامت ۳۲۸ صفحات۔

قیمت ۔ بارہ روپے۔

کتاب ملنے کے پتے :۔ (۱) اردو پبلشرز ۳ تلک مارگ، لکھنؤ (۲) کتاب نگر دین دیال روڈ، لکھنؤ ۔ ۳۔

اتر پردیش اردو اکاڈمی کے مالی اشتراک سے شائع ہونے والی زیر تبصرہ کتاب کاغذ، کتابت، طباعت اور گیٹ اپ کے اعتبار سے تسلی بخش ہے کتاب میں ڈاکٹر سلیمان حسین کے نو عدد تنقیدی اور تحقیقی مضامین شامل ہیں جن کے عنوانات ہیں : (۱) مرزا محمد تقی خاں ہوس (۲) دیوانِ آصف الدولہ بہادر (نسخہ لندن) (۳) میر مستحسن خلیق (۴) مرزا محمد رضا برق (۵) میر علی اوسط رشک (۶) نواب سید محمد خاں رند (۷) سید مظفر علی اسیر (۸) سید ضامن علی جلال اور (۹) منشی امیر اللہ تسلیم۔

کتاب کے "پیش گفتار" میں ڈاکٹر سلیمان حسین رقمطراز ہیں : "میں نے پہلی بار شعرائے لکھنؤ کے کلام کا کسی قدر تفصیلی جائزہ لیا ہے اور اس میں داخلیت پسندی کی تلاش خصوصیت سے کی ہے"۔ موصوف کا یہ بیان محلِ نظر معلوم ہوتا ہے۔ زیرِ تبصرہ کتاب سے قبل ایسی متعدد کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں انھیں موضوعات پر بحث موجود ہے جو زیرِ تبصرہ کتاب میں شامل ہیں۔ اس سلسلے میں لکھنؤ کا دبستانِ شاعری۔ از ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی، اسلاف میر انیس۔ از پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب، اردو مرثیے کا ارتقاء، از ڈاکٹر سید مسیح الزماں اور اردو مرثیے کی روایت از ڈاکٹر مسیح الزماں بطور مثال پیش کی جا سکتی ہیں۔ لکھنوی شعراء کے کلام میں داخلیت کی نشان دہی بھی متعدد صاحبانِ قلم کرتے رہے ہیں۔ سید علی جواد زیدی کی کتاب دو ادبی اسکول اور بعض دوسرے مطبوعات میں اسی موضوع پر اچھا خاصا مواد پہلے ہی سے موجود ہے۔

کتاب اگر بعض فروگذاشتوں سے پاک ہوتی تو بہتر تھا مثلاً صفحہ ۱۲ پر یہ جملہ محلِ نظر ہے کہ :"... ان کی شاعری میں میر تقی میر، میر حسن، سوز اور

مصحفی کا لطف و مزا آتا ہے"۔ "مزا" دراصل عربی لفظ "مزہ" کی ہندی شکل ہے اس ہندی لفظ کو واو عطف کی مدد سے "لطف" کے ساتھ جوڑنا بیان کو بے لطف بناتا ہے۔ صفحہ ۳۰۸ پر استفادہ کرتے تھے کے بجائے "استفادہ حاصل کرتے تھے" لکھنا بھی قابلِ غور ہے۔ کتاب میں بعض ضروری مقامات پر ماخذ درج نہیں ملتے کہیں کہیں حوالہ جات کے سلسلے میں فٹ نوٹ نمبر اور صفحہ نمبر درج ہے۔ مگر کتاب کا نام ندارد ہے اور یہ بے قاعدگی کسی ایک مقام تک محدود نہیں بلکہ اس کے نمونے کتاب کے صفحات ۱۸، ۱۹، ۷۷، ۹۶، ۱۲۵، ۱۲۸، ۱۵۳، ۱۷۵، ۱۸۰، ۱۹۳، ۱۹۵، اور ۱۹۶ پر جگہ جگہ بکھرے نظر آتے ہیں۔ کتاب کے آخر میں ماخذوں کی فہرست میں اگر ناشروں یا پریس کے نام اور کتابوں کے سنہ اشاعت بھی درج کر دیے جاتے تو زیادہ مناسب ہوتا۔ کتاب کے آخر میں اشاریہ بھی شامل ہے۔ مگر وہ بھی اغلاط سے بری نہیں۔ اشاریہ میں صفحہ ۳۱۸ کی آخری سطر ہے : " دبیر مرزا سلامت علی (صفحہ ۹) "۔ لیکن جب ہم کتاب کا صفحہ ۹، دیکھتے ہیں تو وہاں دبیر کا ذکر سرے سے غیر حاضر ہے۔ کتاب میں ایسے متعدد مقامات موجود ہیں جہاں فاضل مصنف کامیاب نظر آتے ہیں۔ ہوس کی اولاد، ہوس کا انتقال، ہوس کی ایک مثنوی کے بعض اشعار کا میر حسن کی مثنوی سحر البیان سے موازنہ۔ چند وہ موضوعات ہیں جن پر ڈاکٹر سلیمان حسین نے کامیابی سے بحث فرمائی ہے اور موصوف اس کے لیے مبارکباد کے مستحق ہیں۔ ہوس پر ۴۲ صفحات کا مفصل مضمون یقیناً اہم شے ہے۔

"دیوان نواب آصف الدولہ بہادر نسخہ لندن" بھی کتاب کا ایک مفید مضمون ہے۔ نسخہ لندن کے خصوصیات پر بحث کر کے بعض اہم نتائج نکالے گئے ہیں۔ دیوان آصف کے دوسرے نسخوں میں الحاقی کلام کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ صاحبانِ تحقیق کے لیے قابلِ توجہ امر ہے۔ مضمون میں انتخاب کلام آصف بھی توجہ کا مستحق ہے۔

"مرزا محمد رضا برق" کے عنوان سے جو مضمون کتاب میں شامل ہے اس میں برق کے دوسرے تخلص "رضا" کے لیے بھی مفید بحث کی گئی ہے۔ برق کا شہر آشوب خاصے کی شے ہے۔ اس میں شاہانِ اودھ کے عہد کا لکھنؤ پوری آب و تاب سے جلوہ گر نظر آتا ہے۔ لکھنؤ کے زوال کے بعد شباب لکھنؤ کی یادوں کے بیان میں برق نے جس کامیاب فن کاری سے کام لیا ہے وہ بھی قاری کے ذہن پر بھرپور تاثر کے نقوش ثبت کرتی ہے۔

رند سے متعلق مضمون میں رند کی وفات کا تعین کرنے میں مصنف نے جس سلیقے کا ثبوت دیا ہے وہ بھی قابلِ تعریف ہے۔ اسی طرح رشک، خلیق، اسیر، جلال اور تسلیم سے متعلق مضامین میں بھی تحقیق و تنقید کے بعض اچھے نمونے ملتے ہیں۔

ان تمام امور کے باعث کتاب کو ادبی اور تحقیقی حلقوں میں مقبولیت حاصل ہو سکتی ہے۔ اگر یہ مفید کتاب ان بعض فروگذاشتوں سے پاک ہوتی

جن کا ذکر کیا جا چکا ہے تو اس کی افادیت اور دلچسپی میں اور بھی اضافہ ہو جاتا۔ امید ہے کہ زیرِ تبصرہ کتاب کی آئندہ اشاعت میں ان امور کو ملحوظ رکھا جائے گا۔

کاظم علی خاں

صہبائے غزل۔ شاعر۔ سچدانند سہاؔ۔

صفحات۔ ۲۵۶۔ سائز $\frac{18 \times 22}{8}$

قیمت۔ آٹھ روپے۔

پتہ۔ سی۔ ۵۔ دلکشا کالونی۔ لکھنؤ۔

زیرِ نظر کتاب سچدانند سہاؔ صاحب کی ۲۵۱ غزلوں کا مجموعہ ہے سہاؔ صاحب کی شخصیت محتاجِ تعارف نہیں ہے۔ وہ ہمارے ایک ممتاز غزل گو شاعر ہیں۔ کتاب میں تعارف پروفیسر آل احمد سرور صاحب کا ہے جس وہ تحریر فرماتے ہیں۔ "سہاؔ کی غزلوں میں پہلی چیز جو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے ان کی شگفتگی اور ہمواری ہے۔ بات دل سے نکلتی ہے اور دل پر اثر کرتی ہے۔ مضمون ہر جگہ نیا نہیں ہے مگر اندازِ بیان جا بجا اپنے بھرپور اور بلیغ اظہار کی وجہ سے اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے۔۔۔ سہاؔ کا کلام ایک جلوۂ صد رنگ ہے۔ اہلِ نظر کو قدم قدم پر یہاں ایک نیا جلوہ مل جائے گا۔ یہ معمولی بات نہیں ہے اس کے لیے بڑا ریاض کرنا پڑتا ہے۔"

سہاؔ صاحب لکھنؤ میں اسسٹنٹ ڈائرکٹر امپلائمنٹ ایکسچینج ہیں۔ شعر و شاعری کا ذوق بچپن سے ہے اور مشقِ سخن کو بھی ان کے بیان کے مطابق ۳۵۔۴۰ سال ہو گئے ان کے مزاج اور کلام کا رنگ قدیم روایتی غزل کا ہے۔ مگر زبان، لب و لہجہ اور فکر جدید انداز سے متاثر نظر آتے ہیں مجموعی حیثیت سے ان کی غزلوں کا یہ مجموعہ غزلیہ شاعری کے عاشقوں کے لیے لطف کی چیز ہے جس میں آج کل کے عام شعری مجموعوں کے مقابلے میں بہت سی باتیں بہتر نظر آئیں گی۔ کتاب کی کتابت اور طباعت اچھی ہے۔

چند منتخب اشعار ملاحظہ فرمایئے۔

پھر اسی چشمِ عنایت کی ضرورت ہوگی — تیرا دیوانہ یہ سنتے ہیں کہ اب ہوش میں ہے
جانے کیا مست نگاہوں کا اشارہ تھا کہ آج — زاہدِ خشک بھی زندانِ طاؤس میں ہے
فسانے جب سنے چشمِ کرم کے — بہت یاد آئی تیری کم نگاہی
طلسم ہائے دو جہاں کھلیں تو کس طرح کھلیں — ہر ایک ذرہ جہاں خود اک جہانِ راز ہے
نہ جانے کب سے تمنا تھی آشیانے کی — بنا تو اس پہ نگاہیں ہیں اک زمانے کی

اشارۂ منصور :۔ مصنف :۔ سید نذرالحسن قادری۔

صفحات۔ ۱۱۲ سائز $\frac{20 \times 30}{16}$۔

قیمت۔ دس روپے

پتہ :۔ مکتبۂ قادری، گوئیا تالاب۔ رام پور۔

یہ کتاب سید منصور علی منصورؔ رامپوری کے مختصر حالات اور ان کے دستیاب شدہ کلام پر مشتمل ہے منصورؔ رامپوری ایک صوفی مجذوب صفت بزرگ تھے جن کا وصال ۱۸۸۹ء میں ہوا تھا۔ بہت زود گو شاعر تھے تاریخ گوئی پر ان کو غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔ اردو اور فارسی دونوں میں شاعری کرتے تھے۔ بہت کہا مگر فقیرانہ طبیعت کی وجہ سے محفوظ نہیں رہ سکا۔ مولفِ کتاب نے بڑی محنت سے کچھ حالات اور کچھ کلام فراہم کیا۔ جو اس کتاب میں ہے اور پڑھنے کی چیز ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمایئے

ملیں گو ایسا منا کہ تو نہ رہے — پھر یہ ہم میں تو کی گفتگو نہ رہے
سیر تجھ کو دکھائے نیرنگی — رنگ کی جب کہ تجھ میں بو نہ رہے
گفتگو ہو تو اس کی باتیں ہوں — اور باتوں کی گفتگو نہ رہے

—— ذکی کاکوروی

اپنی بات : صفحہ ۲ کا بقیہ

سبط حسن صاحب ایک ذی علم بزرگ بہت بڑے خطیب اور شعر و شاعری کے دلدادہ تھے انھیں اپنے والد بزرگوار ہی سے تلمذ حاصل تھا۔ سالکؔ صاحب نہایت ہی خوش اخلاق، خوددار، نیک طبیعت اور منکسر المزاج تھے۔ وہ صحیح معنوں میں انسان تھے۔ شہرت اور نام و نمود سے ہمیشہ دور بھاگتے تھے۔ لکھنؤ کے اساتذہ شعرا میں سراجؔ، قدیرؔ، منظرؔ اور اثرؔ کے بعد سالکؔ صاحب کا دم بہت غنیمت تھا۔ ان کے انتقال سے ایک ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے جس کا پُر ہونا فی الحال ممکن نظر نہیں آتا ہے۔ خصوصیت سے لکھنؤ کے مشاعروں، محفلوں اور شعری نشستوں میں ان کی کمی عرصے تک محسوس کی جاتی رہے گی اور زبان شعر میں جام و پیمانے کی بات جب بھی چلے گی ان کا یہ شعر ہمیشہ یاد کیا جائے گا۔

کھنک جاتے ہیں جب ساغر تو پہروں کان بجتے ہیں ٭ ارے توبہ بڑی توبہ شکن آواز ہوتی ہے۔

نیا دور سے مرحوم کو دلی لگاؤ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اسے اپنے صفحات کو ان کے کلام سے مزین کرنے کا موقع اکثر و بیشتر ملتا رہا۔ ادارہ نیا دور مرحوم کے بھائی جناب ماہرؔ لکھنوی اور دیگر متعلقین سے اظہار تعزیت کرتا ہے۔

٭

جلد ۳۴ نمبر ۲
مئی سنہ ۱۹۷۶ء

ایڈیٹر: خورشید احمد
جوائنٹ ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی

پبلشر: روی موہن سیٹھی
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات اتر پردیش

پرنٹر: اشوک در
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری یو پی
مطبوعہ نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ
شائع کردہ محکمۂ اطلاعات اتر پردیش

ترتیب: قیصر سرمست

قیمت فی شمارہ: پچاس پیسے
زر سالانہ: پانچ روپے
ترسیل زر کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ پبلیکیشن برانچ، انفارمیشن ڈپارٹمنٹ، یو پی لکھنؤ
خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور، پوسٹ بکس نمبر ۱۴۶، لکھنؤ
مدیر مسئول: ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن ڈپارٹمنٹ یو پی لکھنؤ

عنوانات

اپنی بات

وزیر اعلا اتر پردیش شری نرائن دت تیواری کی قیادت میں پردیش کی نئی وزارت نے ۲۱ رجنوری ۱۹۷۶ء کو حکومت کی باگ ڈور سنبھالی تھی اسی طرح ۲۹ راپریل کو نئی وزارت کے ۱۰۰ دن پورے ہو گئے۔ اس مدت میں ریاست کی ترقیاتی اسکیموں خاص طور سے ملک کی محبوب وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کے ۲۰ نکاتی معاشی پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے متعدد اہم اور دوررس اقدامات کیے گئے۔ شری نرائن دت تیواری نے وزارت اعلا کا عہدہ سنبھالنے کے فوراً بعد ہی یہ اعلان کیا کہ ان کی حکومت کا خاص مقصد بیس نکاتی معاشی پروگرام اور ریاست کی ترقیاتی اسکیموں پر تیز رفتار عمل درآمد کرنا اور ان کو اس طرح سے بروئے کار لانا ہے جس سے سماج کے ان بھی کمزور طبقوں کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچے جن کے لیے یہ پروگرام اور اسکیمیں شروع کی گئی ہیں۔ یہ اعلان بھی کیا گیا کہ ریاستی حکومت نے آئندہ جون تک بیس نکاتی معاشی پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کا مستحکم ارادہ کر لیا ہے۔ اسی لیے سرکاری مشینری کو چاق و چوبند اور مستعد بنانے کے لیے سخت احکامات جاری کیے گئے اور متنبہ کیا گیا کہ جو بھی افسران یا ملازمین ان اسکیموں پر عمل درآمد میں کسی قسم کی بے قاعدگی یا تساہلی برتیں گے ان کو کسی طرح معاف نہیں کیا جائے گا۔ ترقیاتی اسکیموں کے لیے سرمایہ کی سب سے زیادہ اہمیت ہوتی ہے۔ وزیر اعلیٰ نے اتر پردیش کے سالانہ منصوبے کے لیے ۵۴ کروڑ روپیہ کی رقم فراہم کرنے کے لیے مرکزی حکومت کو رضامند کر لیا ہے۔ ترقیاتی کاموں کو بحسن و خوبی انجام دینے کے لیے عوام کے اشتراک کی اشد ضرورت ہوتی ہے چنانچہ اس مقصد کے پیش نظر وزیر اعلا نے عوام اور ان کے نمائندوں سے تعاون کی اپیل کی اور اس سلسلے میں ان کو بھرپور تعاون بھی ملا ہے۔

بیس نکاتی معاشی پروگرام کو بروئے کار لانے میں ایک کے بعد ایک متعدد قدم اٹھائے گئے۔ نئی وزارت کی تشکیل ہوتے ہی سب سے پہلا جو اہم فیصلہ کیے گئے ان میں سے ایک فیصلہ یہ بھی تھا کہ ہریجنوں اور اقلیتوں کی بہبود کی اسکیموں کو اولیت دی جائے گی اسی مقصد کے پیش نظر ہی ملازمتوں میں بھی اقوام و قبائل مندرجہ فہرست کے لیے جگہیں محفوظ کی گئیں۔ اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی کے لیے اتر پردیش اردو اکاڈمی کو ملنے والی مالی امداد ۵ لاکھ ۱ ہزار سے بڑھا کر ۸ ½ لاکھ روپیہ کر دی گئی۔ ضروری اشیا کی قیمتوں پر کنٹرول رکھنے کے لیے تحصیل اور بلاک سطح پر نگراں کمیٹیوں کا قیام عمل میں لایا گیا۔ کسانوں کی ہر ممکن طریقے سے ہمت افزائی کی گئی۔ زراعت، آبپاشی اور بجلی کی ترقی کے لیے ایک کثیر رقم کا بندوبست کیا گیا۔ تعلیم کے میدان میں انقلابی تبدیلیاں کی گئیں۔ ریاست کے پسماندہ علاقوں میں عوام کی معاشی حالت بہتر بنانے کے لیے صنعتوں کے قیام کے لیے مخصوص سہولتیں فراہم کی گئیں۔ مزدوروں کے لیے بھی کئی فلاحی اسکیمیں شروع کی گئیں۔ جہیز جیسی سماجی لعنت کو ختم کرنے کے لیے ایک آرڈی ننس کا مسودہ منظور کیا گیا۔ ان تمام مروجہ قوانین میں تبدیلی کی گئی جو بیس نکاتی معاشی پروگرام کے عمل درآمد میں مخل ہو رہے تھے۔ یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ جن بے زمین افراد کو زمینیں الاٹ کی گئی ہیں ان کو نہ صرف تین سال تک مال گزاری کی ادائیگی سے مستثنیٰ کر دیا جائے گا بلکہ ان میں سے ہر ایک کو زرعی آلات، کھاد اور بیج کی خریداری کے لیے ۲۵۰ روپیہ بطور قرض دیا جائے گا۔ ہر بے زمین شخص کو کم سے کم ایک ایکڑ زمین الاٹ کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ یہی نہیں بلکہ ان افراد کو الاٹ کی جانے والی زمین پر قبضہ دلانے کے لیے بھی خصوصی انتظامات کیے گئے۔ محکمۂ مال کے ۲ ہزار ملازمین کو صرف اس کام پر تعینات کیا گیا کہ وہ دیکھیں کہ ان بے زمین افراد کو زمین پر واقعی قبضہ مل گیا ہے۔ حکومت نے ۱۰ فروری کو یہ بھی فیصلہ کیا کہ شہری زمین کی حد بندی سے متعلق مرکزی قانون کو ریاست کے ۲۲ بڑے شہروں میں نافذ کیا جائے اور بعد میں رفتہ رفتہ اس کا دوسرے شہروں میں نفاذ کیا جائے۔ پابند مزدوری سے نجات پانے والے غریب اور نادار لوگوں کی بحالی کے لیے ایک مخصوص اسکیم وضع کی گئی۔ حکومت کو عوام کے نزدیک لانے اور مقامی مسائل کا موقع پر ہی حل تلاش کرنے کے لیے یہ فیصلہ کیا گیا کہ کابینہ کا جلسہ صدر مقام لکھنؤ کے علاوہ ریاست کے دوسرے مقامات پر بھی کیا جائے۔ چنانچہ رائے بریلی اور بلند شہر میں کابینہ کے جلسے منعقد بھی ہو چکے ہیں۔ سرکاری ملازمین کی فلاح و بہبود کے لیے بھی کئی اہم فیصلے کیے جا چکے ہیں۔ سب سے پہلے تو پے ڈسپیرٹی کمیٹی (تنخواہ سے متعلق بے قاعدگیوں کی کمیٹی) کی رپورٹ منظور کی گئی جس سے تقریباً ایک لاکھ ملازمین مستفید ہوئے۔ اس کے علاوہ ان کو اضافی مہنگائی بھتہ کی ایک مزید قسط دینے اور پنشن کی رقم میں ۱۰ روپیہ سے ۲۰ روپیہ تک اضافہ کرنے کا اعلان کیا گیا۔ سب سے بڑا انقلابی فیصلہ یہ کیا گیا کہ یکم مارچ سے تمام سرکاری ملازمین کے لیے ۱۲۰۰۰ روپیہ کی شرح سے مجموعی بیمہ اسکیم شروع کی جائے۔ بڑھاپا پنشن کی شرح ۳۰ روپیہ ماہوار سے بڑھا کر ۴۰ روپیہ ماہوار کر دی گئی۔

مذکورہ بالا اقدامات کے نتیجے میں ان ۱۰۰ دنوں کی قلیل مدت میں ریاست کی ہمہ جہت ترقی کی رفتار میں نمایاں پیش رفت ہوئی ہے۔ ضروری اشیا کی قیمتوں پر بھی پوری طرح سے قابو حاصل کر لیا گیا ہے اور خاص بات تو یہ کہ سماج کے کمزور اور دبے کچلے طبقے میں خود اعتمادی اور بیداری کی ایک نئی لہر دوڑ گئی ہے۔

—— ایڈیٹر

سیّد نواب افسر

غزل

ہم نے حیاتِ عشق کے سب غم بُھلا دیئے
لیکن وہ غم جو اس نے بہ نامِ وفا دیئے

صرف اس لیے کہ آئے نہ کوئی ہمارے ساتھ
ہم نے خود اپنی راہ میں کانٹے بچھا دیئے

تجھ کو خبر بھی ہے ترے دَر پہ ترے گدا
آئے بھی اور چلے بھی گئے بے صدا دیئے

اب یہ ادا نکالی ہے دیتے نہیں جواب
جب ہم نے کوئی بات کہی مُسکرا دیئے

اک جائزہ لیا چمنِ آرزو کا آج
جو خشک ہوگئے تھے وہ پتّے بھلا دیئے

وہ شوق وہ فریبِ کرم وہ مآلِ کار
ایک اشکِ غم نے کتنے فسانے سُنا دیئے

ساقی کے اعتماد کا جب آگیا سوال
رندانِ تشنہ کام نے بھی ہاتھ اُٹھا دیئے

افسرؔ جنوں نوازئ فطرت تو دیکھیے
تارِ نفس بھی تارِ گریباں بنا دیئے

شمس تبریز خاں

شاؔد عارفی

شاؔد عارفی جتنے اچھے فن کار تھے اتنی ہی ان کی زندگی تلخیوں میں گزری۔ وہ ہمارے سماج کے مظلوم فن کار کی ایک سچی تصویر تھے میں سمجھتا ہوں کہ ان کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ انھوں نے ایسے مشکل حالات اور حوصلہ شکن ماحول میں اپنے فن کی انفرادیت برقرار رکھی۔ وہ زہر پی کر معاشرے کے لیے امرت برساتے رہے اور حوصلہ شکن حوادث سے ان کے حوصلے کو مہمیز ملتی رہی۔ وہ چونکہ لڑنے کے عادی تھے، اپنے گرد و پیش سے بھی لڑتے رہے اور ہندستانی سماج کے کمزور پہلوؤں سے بھی نبرد آزما رہے۔ اس کشمکش اور تصادم و پیکار نے ان کے مزاج میں وہ تلخی اور تیزی پیدا کر دی تھی جس سے حقیقی طنز کی آبیاری ہوتی ہے ناخوشگوار تجربوں نے ان کے اندر کلبیت (CYNICISM) کو پروان چڑھایا تھا جس سے انھوں نے کسی نفسیاتی الجھن میں مبتلا ہونے کے بجائے اسے ادبی رنگ اور فنی پیرایۂ اظہار دے دیا۔ ان کے فن کے پیچھے ان کی زندگی ایک حقیقی پس منظر اور ان کے آئینۂ کلام کے لیے زنگار کا کام دیتی تھی۔ حالات کے تقاضوں اور ان کے لازمی نتائج کے برخلاف شاؔد نے اپنے کلام میں بڑے فنی ضبط اور ہنرمندانہ تحمل سے کام لیا ہے۔ انھوں نے طنز نگاری (SATIRE) کو ایک نیا آب و رنگ اور طرز و آہنگ دیا ہے۔ وہ ایک فن کارانہ مزاج اور تخلیقی ذہن رکھتے تھے، روزمرہ کے حالات و حوادث کی حقیقی نفسیات کو ان کا ذہن بڑی آسانی اور چابک دستی کے ساتھ اپنی گرفت میں لے لیتا تھا، ان کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے اپنے طنز و تعریض کو منفی پہلو اور تخریب و لذت کوشی کے لیے نہیں بلکہ تعمیر و اصلاح کے لیے استعمال کیا وہ سماج میں پھیلی ہوئی خرابیوں سے لطف اندوز ہونے کے بجائے ان سے نفرت کرتے اور معاشرہ کو ان کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ ان کی ذہنیت مریض نہیں بلکہ تشخیص مرض کی عادی ہے اور اپنی صحت مندی کے بھروسے سماجی برائیوں کو چھیڑتی اور ان کے مدمقابل ہوتی ہے اور اس سلسلے میں کسی لاگ اور لگاؤ کے بغیر اپنا فیصلہ صادر کرتی اور ان کا بھانڈا پھوڑتی ہے۔

صالحِ فکر، متوازن رائے اور صحت مند و تعمیری نقطۂ نظر آج کے ادب میں جنس نایاب بن گئی ہیں۔ اس لیے یہ چیزیں قدردانی اور ستائش کی مستحق ہیں، شاؔد نے کہیں بھی جنسی چٹخارہ سے قاری کی دلچسپی حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی ہے اباحت پسندی (PERMISSIVENESS) کے خلاف اپنا سارا زور لگا دیا ہے اور موجودہ دور کی تقریباً تمام کمزوریوں پر گرفت کی ہے اور اپنے اصلاحی نشتر سے معاشرے کے سرطانوں کو چیرا ہے۔

پروفیسر آل احمد سرؔور نے شاؔد کی فن کاری کا بڑا اچھا تجزیہ کیا ہے وہ لکھتے ہیں :

> شاؔد عارفی بڑے البیلے شاعر تھے، نہایت غیرت مند خوددار بڑے پکے محب وطن، آزادی و جمہوریت کے دلدادہ، ترقی پسند خیالات رکھنے والے، بول چال کی زبان کے امکانات کو اور واضح کرنے والے، سماج کے فاسد مادہ پر نشتر زنی کرنے والے اپنے رنگ کے منفرد اور اپنے طرز کے انوکھے، جدید اردو شاعری کو کئی غیر فانی نظمیں بخشنے والے[1]"

انھوں نے دوسری جگہ لکھا ہے :

---

[1] ایک تھا شاعر: مرتبہ مظفر حنفی ص۲

"شاد کے یہاں صرف سماج کی خرابیوں پر طنز ہی نہیں ہے، محبت و نفسیات انسانی کی سچی تصویریں بھی ہیں اور انھیں ایک ایسے تیور اور بانکپن سے پیش کیا گیا ہے کہ فوراً ذہن پر نقش ہو جاتی ہیں۔ جو لوگ شاعری اور بول چال کی زبان کو ایک دوسرے سے الگ کر کے دیکھتے ہیں، انھیں شاد کے کلام کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ شاد نے بول چال کی زبان کی طاقت اور شعریت کو جس طرح اجاگر کیا اور جس طرح بقول ایزرا پاؤنڈ "حقیقی نفسیات" کو زبان دی ہے اسے جدید اردو شاعری ہمیشہ یاد رکھے گی۔"[1]

انھوں نے غزلیں بھی بہت لکھی ہیں جن کی تعداد نظموں کے برابر ہے لیکن دراصل وہ نظم کے شاعر ہیں۔ انھوں نے غزل کو بھی ایک نیا انداز دینے کی کوشش کی ہے اس میں۔ روزمرہ کے تجربات و واقعات اور بول چال داخل کی ہے۔ اسے واقعیت سے قریب لائے ہیں اور تیکھا انداز اور نوکیلا (POINTED) طرز بھی دیا ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ غزل سے ان کو مزاجاً مناسبت نہیں۔ غزل گوئی کے آداب برتنے کے بجائے انھوں نے غزل کو اپنے مخصوص انداز و آہنگ کے مطابق کرنا چاہا جس سے غزلیں نظموں کے مقابلے میں بے لطف سی ہو گئی ہیں۔ جو لوگ غزل میں اصلاح اور روائتی طرز سے الگ اسلوب کے جویا ہیں انھیں شاد کی غزلیں ضرور دیکھنی چاہئیں ان میں بڑی جدت طرازی اور تازگی ہے۔ روایتی انداز میں تو ان کے یہاں چند ہی شعر نکلیں گے۔ زبان و بیان پر انھیں اساتذہ کی سی قدرت حاصل ہے۔ فنی کمزوریاں ان کے یہاں نہ ہونے کے برابر ہیں، قادرالکلامی ان کا خاص طرۂ امتیاز ہے۔ ان کے یہاں عجز کلام کا کہیں سے اظہار نہیں ہوتا لیکن حد سے زیادہ جدت پسندی کے سبب وہ غزل کی روایت اور اس کی دلکشی کو برقرار نہیں رکھ پائے ہیں۔ ان کی غزلوں میں بھی زیادہ تر طنزیہ مضامین آئے ہیں اور روایتی مضامین سے انھوں نے صرف نظر کیا ہے لیکن غزل کا خوددار مزاج ان سے کہاں تک صلح کرتا، وہاں تو بادہ و ساغر کے بغیر کوئی بات بنتی ہی نہیں۔ اپنے ذاتی انتخاب سے ان کی غزلوں کے یہ چند شعر حاضر ہیں جن میں ان کے ذاتی واردات بھی آ گئے ہیں:

بے رونقی شمع تمنا دو پوچھیے   جیسے کوئی چراغ کسی قبر پر جلے

پھولوں کی طرح آپ ہیں کانٹوں کی طرح ہم
کس پر اثر گردش دوراں نہیں ہوتا

غلط بیانیوں کے عہد نو میں شاد عارفی
مرا کمال فن یہ ہے کہ صرف ماجرا ہوا

کبھی کوئی کرم کوئی عنایت ہو بھی جاتی ہے
کبھی بیتابیٔ دل عین راحت ہو بھی جاتی ہے

کبھی کوئی گھٹا ایسی بھی اٹھتی ہے کہ سب چلیے
کبھی جام و سبو کی ہم سے خدمت ہو بھی جاتی ہے

نہ کہنا خرمن پندار پر بجلی نہیں گرتی
نہ رہنا اس بھروسے میں، محبت ہو بھی جاتی ہے

مری غزل میں مرے تلخ تجربے کے ساتھ
دل شکستہ و محروم کی صدا بھی ہے

جاپ سن کر جو ہشیاری تھی اٹھالا ساقی!
شیخ صاحب ہیں، میں سمجھا تھا مسلماں کوئی

شاد ضعیف العمر ہے لیکن شعر تو اسکے جوانی کے ہیں
ایسے لوگ کہاں ہوتے تھے ایسے لوگ کہاں ہوتے ہیں

نظم نگاری شاد کا مخصوص فن ہے جس میں ان کے جوہر کھلتے ہیں اور ان کی انفرادیت ہر شخص کو متاثر کرتی ہے۔ جدید شاعری میں طنز نگاری کے وہ بانی کہے جا سکتے ہیں، اور جدید نظم کے پیشروؤں میں ان کا بھی شمار کیا جانا چاہیے انھوں نے نظموں میں سپاٹ اور سیدھا سادا انداز اختیار کرنے کے بجائے ڈرامائی عناصر اور تمثیلی رنگ کی آمیزش بھی کی اور غزلوں کی طرح نظموں میں بھی بات چیت کا انداز برقرار رکھا بلکہ ایجاز نگاری کا کمال یہ ہے کہ ایک ہی مصرع میں دو تین شخصوں کی گفتگو بھی نقل کر دیتے ہیں جس سے نظم کے دروبست میں ایک دل آویز چستی آجاتی ہے اور نظم، کسی موضوع کی حکایت کے بجائے تصویر بن جاتی

---

[1] کلیات شاد عارفی ص ع

ہے جسے ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے اور محسوس کر سکتے ہیں، ان کا ایک خاص وصف یہ بھی ہے کہ شمالی ہند بلکہ رام پور کے ماحول کی عکاسی انھوں نے ایسی فن کارانہ چابکدستی سے کی ہے کہ اس میں مقامی رنگ اور محدودیت ہونے کے بجائے لامحدودیت اور ان کے طنز میں عمومیت اور آفاقیت پیدا ہو گیا ہے جو طنز کی جان ہے۔

انھوں نے ہر طرح کی نظمیں لکھی ہیں جن میں بیانیہ رنگ اور منظر نگاری اور تصویر کشی کے لیے ان کی نظمیں گوالن، گاؤں، شہر سے دور، مالن، بسنت، برسات کی شروعات، ممتاز ہیں، وہ بڑے محب وطن تھے، جس کی گواہ ان کی متعدد نظمیں ہیں لیکن دوسری خرابیوں کے خلاف ان کا قلم چوکا نہیں ہے۔ تعمیری و اصلاحی نظموں میں "رسمی قید خانے" یہ عبادت یہ رسوم" جہیز" خاص اہمیت کی حامل ہیں۔

معاشرتی نظموں میں جنسی بے راہ روی اور اباحت پسندی، مغرب زدگی، اور دوسری بدعنوانیوں کے خلاف ان کا قلم تیر و نشتر بن گیا ہے ایسے مواقع پر ان کے لہجہ کی آبداری اور ان کے لفظوں کی کاٹ دیکھنے کے لائق ہوتی ہے۔ خاص طور پر "ملازمہ" "شوفر" ان کے اونچے اونچے محلوں میں "میرے پڑوس میں کچی شراب بکتی ہے" "میرے محلے کے دو گھرانوں سے ہے گناہوں کا فیض جاری" اور "آپ کی تعریف" بھرپور طنز کی بہترین مثالیں کہی جا سکتی ہیں، آخری نظم میں انھوں نے معاشرہ کے ہر طبقے پر طنز کے بھرپور وار کیے ہیں اور زندگی کے ہر کمزور پہلو کو بے نقاب کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

"آپ کی تعریف" کا ایک بند ملاحظہ ہو:

نثر ہے ان کو کسی چڑیا کا نام   شعر جیسے آشیانے زیر دام
دعویٰ علم ہجا کیا کیا غلط   سر بسر انشا غلط، املا غلط
چھاپتے ہیں اپنا اشعار استادوں کے نام   تاکہ بن جائے ان پر نام ساز
مشتہر ہیں، شہرۂ آفاق ہیں
یہ مدیران سیہ اوراق ہیں

نظم "ادبار آتا ہے" میں قوموں کے زوال کے اسباب بتلاتے ہیں:

ظلق کے عروج جب ہو جائے لفظ ارتقا   جب دماغوں میں چلے جہل مرکب کی ہوا
علم جب اخلاق کے معنی بتانا چھوڑ دے   جب وضعداری مروت کا ٹھکانا چھوڑ دے
زعم خود بینی اٹھا دے جب تمیز نیک و بد   جا ملے حیوان کی سرحد سے جب انساں کی حد

"حریت" میں آزادہ روی اور آزادی پسندی کی بڑی اچھی تلقین ملتی ہے۔

صدر ہو، نیتا ہو یا سرمایہ دار   جو کچھے تجھ سے اسے ٹھوکر پہ مار
ہے بہت انمول انسانی وقار   لقمۂ تر کا نہیں کچھ اعتبار
جو کی روٹی کھا مگر آزاد رہ!
بزدلی ہے "جی بجا" یا "جی حضور"   توڑ دے نخوت شعاروں کا غرور
رہ فریب آرزو سے دور دور   لقمۂ تر زندگی کو کیا ضرور
جو کی روٹی کھا، مگر آزاد رہ!

شاد صاحب کے یہاں ایک بات یہ کھٹکتی ہے کہ عالمی موضوعات اور دوسرے ہمہ گیر تصورات پر بہت کم نظمیں ملتی ہیں، اس قسم کی چیزوں میں "عالمی امن" کے موضوع پر "چاند کی نوآبادی" کے عنوان سے ایک نظم ملتی ہے جس میں وہ کہتے ہیں:

سوال یہ ہے کہ یہ مزائل، یہ جوہری بم بنیں گے کب تک
جواب یہ ہے کہ فیصلہ کن لڑی نہ جائے گی جنگ جب تک
وہاں بھی کیا سام و جان مل جل کر ریچھ کی کھمبیا کریں گے
نہیں، مگر دوسروں سے وعدے لپٹ لپٹ کر ہم ہڑ کریں گے

آخر میں ہم ان کے ہم وطن فاضل محقق کی رائے درج کرتے ہیں جو بہت صائب ہے مولانا امتیاز علی خاں صاحب عرشی لکھتے ہیں:

"تیکھا طنز، لہجے کی تیزی اور نوکیلا پن ان کا مزاج بن گیا تھا، ان کی آواز میں رامپور کا مردانہ لہجہ، اور ٹھینولی کا بانکپن الگ پہچانے جاتے ہیں وہ اردو شاعری میں رامپور اسکول کی جانب سے قابل فخر اضافہ ہیں۔"[1]

★

---

[1] ایک تھا شاعر ص

غزل

ایس۔ ایف۔ سنہا

ہمیں تو جب بھی کوئی چشمِ تر نظر آئی
وہ دل ملا ہے کہ اپنی بھی آنکھ بھر آئی

بہ یادِ ساقیِ مہوش بہ فیضِ بادہ و جام
جو شام آئی بہ تابانیِ سحر آئی

ہمیں نے اشک بہائے ہوں ایسی بات نہیں
یہ واقعہ ہے کہ اُن کی بھی آنکھ بھر آئی

جہاں میں کس کو قرار و ثبات حاصل ہے
حیاتِ عشق ہی کچھ معتبر نظر آئی

نگاہِ شوق گئی تھی نگاہِ ناز کی سمت
شرابِ شعر کی موجوں میں ڈوب کر آئی

اسی کے دم سے تھی دنیائے آرزو شاداب
وہ ایک یاد جو رہ رہ کے عمر بھر آئی

قدم قدم پہ تمنا کے پھول کھلتے ہیں
نظر کے سامنے یہ کس کی رہگزر آئی

دل اک سرائے ہے بوسیدہ سی کہ جس میں کبھی
امید آئی تو آمادۂ سفر آئی

بیاں کر نہ سکیں نام دے سکیں نہ جسے
نگاہِ ناز میں وہ کیفیت نظر آئی

نظر کی بات ہے تاریکیوں کے پردے میں
ہمیں تو روشنی ہی روشنی نظر آئی

سکونِ دل کی تمنا میں زندگی سنہاؔ
اس انجمن سے نکل کر نہ راہ پر آئی

ڈاکٹر سلام سندیلوی

گورکھپور کا پہلا اردو شاعر

حضرت سید احمد علی شاہ

اب تک گورکھپور کی شاعری کے سلسلے میں جو کچھ سراغ مل سکا ہے اس کی روشنی میں میرے نقطۂ نظر سے اس شہر کے پہلے اردو شاعر سید احمد علی شاہ صاحب ہیں جو امام باڑہ اسٹیٹ گورکھپور کے دوسرے جانشین تھے۔

امام باڑہ اسٹیٹ گورکھپور کے پہلے جانشین حضرت روشن علی شاہ گزرے ہیں جو سید غلام اشرف کے صاحبزادے تھے۔ حضرت روشن علی شاہ تعلیم یافتہ نہیں تھے۔ امام باڑہ اسٹیٹ کے ریکارڈ میں صرف ایک جگہ ان کے دستخط ہندی میں موجود ہیں۔ مگر وہ ایک خدارسیدہ بزرگ تھے اور ان کی نظر میں ہندو مسلم برابر تھے۔ اس لیے ان کی شہرت گورکھپور کے گرد و نواح میں پھیلی ہوئی تھی۔ ان کے زہد و تقویٰ اور ان کی عبادت و ریاضت سے متاثر ہو کر رودرپور کے راجا پہلوان سنگھ نے ان کو ۱۷۹۳ء میں موضع کسمی مع جنگل بخش دیا تھا۔

جب نواب آصف الدولہ (۱۷۷۵ء–۱۷۹۷ء) سیر و شکار کے سلسلے میں گورکھپور کے علاقہ میں پہونچے تو انھوں نے حضرت روشن علی شاہ کی بزرگی کی تعریف سنی اور وہ ان کی خدمت میں مع مصاحبین حاضر ہوئے۔ نواب آصف الدولہ نے حضرت روشن علی شاہ پر کچھ کرامات کرنے کی خواہش ظاہر کی مگر انھوں نے انکار کر دیا۔ اس کے باوجود نواب صاحب نے بخشش کے لیے اصرار کیا۔ تب حضرت روشن علی شاہ نے فرمایا کہ اگر آپ مجھ پر کچھ مہربانی ہی فرمانا چاہتے ہیں تو عزاداری حسینؑ کے لیے آپ ایک امام باڑہ بنوا دیجئے اور اس کے اخراجات کے لیے کچھ زمین وقف کر دیجئے۔ نواب آصف الدولہ ان کی اس تجویز سے خوش ہوئے اور انھوں نے حضرت روشن علی شاہ کو ۱۶ علاقے بخش دیئے۔ امام باڑہ اسٹیٹ کے ریکارڈ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ علاقے حضرت روشن علی شاہ کو ۱۷۹۵ء میں بخشش میں ملے تھے۔

علاقے ملنے کے بعد حضرت روشن علی شاہ نے امام باڑہ کی تعمیر کرائی۔ آج جہاں امام باڑہ موجود ہے پہلے یہاں جنگل تھا اور یہ علاقہ داؤد چک کہلاتا تھا۔ مگر امام باڑہ کی تعمیر کے بعد عزاداری کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اور عبادت و ریاضت میں ساری زندگی گزار دی۔ بالآخر ۱۸۰۵ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔

حضرت روشن علی شاہ کے چھوٹے بھائی کا نام فولاد علی تھا۔ فولاد علی نے اپنے بیٹے سید احمد علی کو امام باڑہ کے لیے وقف کر دیا۔ امام باڑہ اسٹیٹ کے ریکارڈ میں ایک جگہ سید احمد علی کے سلسلے میں مندرجہ ذیل عبارت درج ہے:

"در امام باڑہ بخدمت شاہ صاحب قبلہ خداوند نعمت شاہ روشن علی صاحب دام اقبالہٗ ہبہ نمودم و بخشیدم۔ مالک و مختار طفل مسطور شاہ موصوف ہستند۔ من بعد مرا و وارثان را ہیچ دعویٰ از طفل مذکور نیست و نماند۔ اگر کسے از وارثان و متعلقان و لواحقان من دعویٰ نماید در شرع شریعت باطل و کاذب باشد۔ بنا بر ان ایں چند کلمہ بطریق نیاز نامہ و ہبہ نامہ نوشتہ داریم کہ تا فی الحال سند باشد۔"

تحریر بتاریخ یازدہم شہر رجب المرجب ۱۲۱۳ فصلی مطابق سنہ [illegible]

اس ہبہ نامہ کے بموجب حضرت روشن علی شاہ کی وفات کے بعد سید احمد علی شاہ امام باڑہ اسٹیٹ کے جانشین ہوگئے اور وہ یہاں عام طور سے میاں صاحب کے نام سے موسوم ہوئے۔ سید احمد علی شاہ ۱۸۰۰ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸۰۵ء میں امام باڑہ اسٹیٹ کیلئے ہبہ کیے گئے۔ جب وہ اسٹیٹ کے جانشین ہوئے تو انھوں نے امام باڑہ کے پورب پھاٹک پر ایک بازار لگوایا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ وہ اپنے حجرے سے باہر نہیں نکلتے تھے۔ اس لیے انھوں نے اپنی ضروریات زندگی کی تکمیل کے لیے ایک ذاتی بازار کی بنیاد ڈالی۔ اس بازار کے لگنے کے بعد اس محلے کا نام امام گنج کے بجائے میاں بازار ہوگیا اور یہ محلہ آج بھی اسی نام سے موسوم ہے۔

حضرت روشن علی شاہ اور جناب فولاد علی نے سید احمد علی شاہ کی تعلیم اور تربیت پر مکمل طور سے توجہ کی چنانچہ چند برسوں میں ان کو عربی فارسی اور اردو پر عبور حاصل ہوگیا۔ ان کے اردو کلام میں عربی اور فارسی کے ٹکڑے جابجا نظر آتے ہیں۔ سید احمد علی شاہ نے اردو شاعری کی طرف تقریباً سترہ سال کی عمر میں توجہ کی یعنی انھوں نے تقریباً ۱۸۱۷ء میں اردو شاعری کا آغاز کیا۔ اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرسکتے ہیں کہ سید احمد علی شاہ اور مرزا غالب ہم عصر تھے۔ اور گورکھپور میں غالب کے عہد میں اردو شاعری کا آغاز ہوچکا تھا۔

سید احمد علی شاہ کی شعر و شاعری کی تین مطبوعات کتب امام باڑہ اسٹیٹ کی لائبریری میں موجود ہیں جن کے نام یہ ہیں:

(۱) کشف البغاوت۔ مطبوعہ ۱۸۶۰ء۔ ارفن اسکول پریس مرزاپور، بہ اہتمام پادری ایم۔ اے۔ شیرنگ صاحب۔

(۲) ذوحقیقت۔ مطبوعہ ۱۸۶۱ء۔ مطبع حیدری آگرہ۔ بہ اہتمام مرزا علی حسین۔

(۳) محبوب التواریخ۔ مطبوعہ ۱۸۶۳ء۔ مطبع حیدری آگرہ۔ بہ اہتمام مرزا علی حسین۔

اس مضمون میں ان تینوں کتب پر مختصر تبصرہ پیش کیا جارہا ہے۔

کشف البغاوت۔ کا تعلق غدر ۱۸۵۷ء سے ہے۔ سید احمد علی شاہ نے "کشف البغاوت" میں شعر و شاعری کی قدیم روش کو برقرار رکھا ہے۔ انھوں نے سب سے پہلے حمد نظم کی ہے۔ اس کے چند اشعار درج ذیل ہیں۔

کروں پہلے توحید رب جلیل — کیا جس نے پیدا کثیر و قلیل
خداوند ماہ و نجوم و سپہر — خداوند عرش و خداوند مہر
وہ حاجت روا اور ہے بے نیاز — وہی اپنے بندوں کا ہے کارساز
کریم اور رحیم اور رزاق ہے
دو عالم کا لاریب خلاق ہے

اس کے بعد شاہ صاحب نے نعت رسول پیش کی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

کروں بعد اس کے ثنائے رسولؐ
جو ہیں دُرِ یکتائے بحر قبول

پھر انھوں نے زمانے کے حالات پر روشنی ڈالی ہے اور اس کی بے مہری کی شکایت ان اشعار میں کی ہے:

ہمیشہ سے دنیا کا یہ حال ہے — عجائب طلسموں کا جنجال ہے
ذری اس میں بوئے وفا کچھ نہیں — بجز اسم سے ہیچ آسمان و زمیں
مٹھائی میں ظاہر ہے پوشیدہ سم
سیہ رو قلم ہے بہ وقت رقم

یہ اشعار سید احمد علی شاہ کے حسب حال ہیں۔ انھوں نے بھی دنیا میں بوئے وفا نہیں محسوس کی کیونکہ جب غدر ہوا تو ان کو کافی مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ انھوں نے "کشف البغاوت" میں بہت تفصیل کے ساتھ غدر کے حالات نظم کیے ہیں۔ ان کا قول ہے کہ غدر کا آغاز میرٹھ سے مئی، ۱۸۵۷ء میں ہوا۔ اس بات کو انھوں نے مندرجہ ذیل اشعار میں نظم کیا ہے: سہ

گر پہلے میرٹھ نے آغاز ہے — عیاں ہم پر اخبار سے راز ہے
مئی کا مہینہ تھا اے ہوشیار — اور تاریخ دسویں رہے آشکار
تھے اعداد بارہ صد و شصت و چار — اسی فصلی سن میں ہوا خوفشار
سن ہجری بارہ سو ہفتاد و سہ — ہوئے متفق دونوں سن ہے یہ یہ
مناسب ہے اب عیسوی سن لکھوں — تھا اٹھارہ سو پر ستاون فزوں
مہینہ تھا وہ سن کا گرمی کی فصل — ہوا شہر میرٹھ سے آغاز جدل

یکا یک یہ پلٹن سے باغی ہوئی
سب افواج دہلی کو راہی ہوئی

اس موقع پر اس امر کا اظہار ضروری ہے کہ سید احمد علی شاہ انگریزوں کی موافقت کر رہے تھے اور وہ ہندستانیوں کے خلاف تھے اسی لیے انھوں نے بغاوت کا الزام اہل ہند پر رکھا ہے اور انگریزوں کی مختلف مقامات پر تعریف کی ہے۔

سید احمد علی شاہ کا قول ہے کہ اس کے بعد اعظم گڈھ میں بغاوت ہوئی۔ وہ اعظم گڈھ کی بغاوت کا حال یوں پیش کرتے ہیں :

اعظم گڈھ کا احوال آگے سنو　　ذرا باغیوں پر تاسف کرو
مخالف یہاں کا بھی لشکر ہوا　　مثال شتر وہ بھی ولی چلا
ضلع اور قریہ کو تاراج کر　　ہوے باغیوں میں وہ سب مشتہر
نہیں ان کا اب آدمی میں حساب
کہ دھوبی کے کتے سے اب ہیں خراب

شاہ صاحب نے گورکھپور کی بغاوت کا بھی ذکر کیا ہے۔

وہ فرماتے ہیں :

گورکھپور کا آگے احوال ہے　　یہاں کی حقیقت میں یہ قال ہے
یہاں کی بھی افواج باغی ہوئی　　شرارت سے اپنی و داغی ہوئی
یہاں پر جو دو کمپنی فوج تھی　　بہت بیڑے سے موج در موج تھی
اعظم گڈھ کا احوال اس نے سنا　　کہ حاکم سے سب نے بغاوت کیا
لٹا مال و اسباب حکام کا　　بغاوت کی دل میں سمائی ہوا
خزانے کے لینے پہ تیار ہو
ہوے مستعد وہ کہ پیکار ہو

سید احمد علی شاہ کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ گورکھپور کے رسا انگریزوں کے موافق تھے۔ ان کا قول ہے :

کیا گرچہ افواج نے انحراف
رو سا مگر یہاں کے تھے پاک صاف
معاون تھے حکام کے اس قدر
نہ آنے دیا ان پہ ہرگز ضرر

خود سید احمد علی شاہ نے انگریزوں کی مدد کی۔ وہ فرماتے ہیں :

ہوے یہاں جو حکام رونق فروز　　شب تیرہ میری ہوئی مثل روز
جب حکام نے آکے مسکن کیا　　عزاخانہ ما داد ملجا بنا
سبھی آل و اطفال تھے صاحباں　　رہے خوش و خورّم بہت مہرباں
دعا گوے حکام ہوں میں فقیر
بھلا مجھ سے راضی نہ کیوں ہوں امیر

اس کے بعد سید احمد علی شاہ نے گورکھپور کے انگریز افسروں کی مداح سرائی کی ہے۔

یہاں کے کلکٹر بہت ہیں دلیر　　دلیری بسالت میں ہیں مثل شیر
سشن جج جو ہیں یہاں کے عالی تبار　　گورنر کے نزدیک ہیں با وقار
اور کپتان رسّل شامل رہے　　ارسطو منش وہ بھی عاقل رہے
ترسن مجسٹر بہادر رہے
ہمارے بشر کے وہ داور رہے

جب انگریز حکام نے گورکھپور میں سکون دیکھا تو وہ دوسرے مقامات کی بغاوت فرو کرنے کے لیے چلے گئے۔ ایسے موقع پر باغیوں نے امام باڑہ پر حملہ کر دیا۔ غدر ہی کے دوران میں محرم کا مہینہ پڑا۔ امام باڑہ کے انتظام کے لیے شاہ صاحب نے برڈ جنٹ صاحب سے کچھ سپاہی مانگے۔ برڈ صاحب نے تمن دار کو حکم دیا کہ کچھ سپاہی لے کر امام باڑہ چلے جاؤ اور اس کی حفاظت کرو، مگر تمن دار نے سپاہی نہیں روانہ کیے۔ یہی نہیں بلکہ محمد حسن کے حکم سے باغی امام باڑہ میں داخل ہو گیے۔ اس وقت مشرف، عالی حسن، فیض بخش، فضل علی اور خود تمن دار نے امام باڑہ کے سامان کو لوٹنا شروع کر دیا۔ اور ان کے مکان پر پہرہ بٹھا دیا۔ باغیوں نے سید احمد علی شاہ کے مال و اسباب پر قبضہ کر لیا۔ اس کے علاوہ انگریزوں کا جو سامان امام باڑہ میں تھا اس کو ضبط کر لیا۔ ایک کوٹھری میں سونے اور چاندی کا سامان رکھا تھا۔ وہ نکال لائے۔ ان واقعات کا ذکر سید احمد علی شاہ یوں کرتے ہیں : ؎

کروں اس کی تفصیل گر میں رقم　　تو یک جز سے ہرگز نہ ہوئے گا کم
جو تھا مال میرا و حکام کا　　جہاں تک بنا خوب غارت کیا
جو چیزیں کہ حکام نے مجھ کو دیں　　بطرز امانت وہ سب تھیں رکھیں

ہر اک کوٹھری سے وہ لائے نکال   رکھا تھا جہاں سونے چاندی کا مال
سوا میرے اسباب کے اور بھی   عزاخانہ کی اس میں سب چیز تھی
وہ سب تخشی نواب آصف کی تھی   پئے زینت کربلا بھی رکھی
مہیا کیا تھا بزرگوں نے سب
محافظ تھا میں اس کا واقف ہے رب

جب غدر فرد ہو گیا تو انگریزوں نے سید احمد علی شاہ پر نوازشات کیں اور ان کو تسلی دی۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں:

خبر میری حکام لیتے رہے   مرے حال پر حیف کرتے رہے
کلکٹر، کمشنر، سشن جج یہاں   کیا ہم کو ممتاز یہ صاحباں
ہوئی عید دیکھا جو حکام کو   ملاقات کی ہم سے خوشنود ہو
تشفی کیا میری حکام نے
کہا کچھ نہ اب رنج دل میں رہے

آخر میں سید احمد علی شاہ انگریزوں کو دعا دیتے ہیں:

رہے جب تلک پر ضیا آسماں   منور رہے نور سے یہ زمین و زماں
رہے ملک قبضہ میں سرکار کے   رعیت کو آرام ان سے ملے
سردار پر خصم ہو سرفراز
یہ ہے خواہش احمد پاک باز

غرضیکہ کشف البغاوت میں سید احمد علی شاہ نے غدر کے حالات بہت تفصیل کے ساتھ نظم کئے ہیں۔ مگر انھوں نے ہندستانیوں کی مذمت کی ہے اور انگریزوں کی تعریف کی ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہندوستانیوں نے اما باڑہ لوٹا اور انگریزوں نے ان کی مدد کی۔

سید احمد شاہ کی دوسری تصنیف "نور حقیقت" ہے۔ شاہ صاحب نے اس کتاب میں بھی قدیم روایت کو برقرار رکھا ہے۔ انھوں نے سب سے پہلے حمد نظم کی ہے۔ اس کے بعد نعت رسول کہی ہے۔ اسی سلسلے میں انھوں نے اپنے مرشد کو بھی خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

وہ مرشد مرے شاہ روشن علی
جو تھے رازدار خفی و جلی
عیاں ہو گئے ان سے اسرار حق
وہ تھے مطلع نور انوار حق

اس کے بعد شاہ صاحب نے مدح ملکہ معظمہ کی ہے۔

سر سرفرازان عالی تبار   وہ بلقیس دوراں سلیمان وقار
عقیل و اولو العزم و گیتی پناہ   ملک داربان و فلک بارگاہ
دم گیر اگر ہے تو کشورستاں
دم داد ہے تاج بخش جہاں

ان روایتی بیانات کے بعد سید احمد علی شاہ نے سبب تالیف کتاب ظاہر کیا ہے۔ ان کا قول ہے کہ ایک بار شب قدر کو وہ سو رہے تھے کہ ہاتف نے ان کو صدا دی کہ تو محو خواب کیوں ہے؟ جو سوتا ہے وہ کھوتا ہے۔ اس وقت ان کو القا ہوا اور انھوں نے محسوس کیا کہ کوئی ان سے کہہ رہا ہے کہ تو ایسی مثنوی نظم کر جس سے تیرا نام قیامت تک باقی رہے۔ چنانچہ انھوں نے ایک مثنوی کہی اور اس کا نام نور حقیقت رکھا۔

نور حقیقت میں سید احمد علی شاہ نے مذہبی موضوعات نظم کئے ہیں مثلاً "کوائف حالات زمانہ" عنوان کے تحت انھوں نے وصال رسول اکرم کا بیان پیش کیا ہے۔ اس کے بعد "کوائف علمائے سلف صفت آنہا" عنوان قائم کیا ہے۔ اس حصے میں انھوں نے پرانے عالموں کے اصولوں پر روشنی ڈالی ہے۔ ایک جگہ شاہ صاحب نے یہ ثابت کیا ہے کہ زمین و آسمان پر ہر سو مخلوق خدا کی عبادت کرتی ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

زمیں سے نظر کیجئے تا فلک   پری آدمی دیو و حور و ملک
کیا حق نے جس جس کو یہاں آشکار   ہیں سب اس کے تسبیح خواں بار بار
عبادت سے غافل نہیں کوئی شے   ہر اک شغل میں اپنے مصروف ہے

جانگنگ میں خار و خس و برگ و بار زمیں آسمان اور لیل و نہار
عبادت میں مشغول ہیں یک قلم
اسی کی عبادت کا بھرتے ہیں دم

شاہ صاحب نے یہ اشعار بہت صاف ستھرے کہے ہیں۔ اس قسم کے اشعار ان کی کتاب کشف البغادت میں مشکل سے ملیں گے۔

سید احمد علی شاہ نے ایک عنوان "در بیان محفل حال و قال" قائم کیا ہے اور اس میں سماع کو جائز قرار دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

یہ محفل جو ہوتی ہے ہر اک برس
وہاں جمع ہوتے ہیں بسیار کس
یہ مجلس فقیروں کی ہے اے حبیب
سب آتے ہیں اس میں امیر و غریب
جہاں ہوتی ہے مجلس حال و قال
خدا کا بھی ہوتا ہے واں قیل و قال
خدا کی جو گاتے ہیں واں معرفت
عجب لطف ہے اس میں کچھ پوچھو مت
نہ رکھا اسے عالموں نے روا
یہ فتویٰ ہے کیسا جو سب کو دیا
نہ سن شاہ احمد تو ان کے کلام تو صوفی ہے کیا کچھ کو جھگڑے سے کام

سید احمد شاہ نے نور حقیقت مثنوی میں اسی قسم کے مختلف عنوانات قائم کئے ہیں۔ اور ان کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس مثنوی میں "بیان جہاد" "حکایت داہی" "بیان آیات توریت" "حکایت شداد" "بیان باہر آنے ابراہیم خلیل کا" "بیان مارے جانے نمرود کا" "در بیان قربانی حضرت اسمٰعیل" "در رسیدن موسیٰ علیہ السلام بہ در رسالت" اور "بیان تولد شدن حضرت عیسیٰ علیہ السلام" وغیرہ عنوانات ملتے ہیں۔

حضرت احمد علی شاہ کی تیسری شاعری کی کتاب "محبوب التاریخ" ہے۔ اس کتاب کا تعلق گورکھ پور کی تاریخ سے ہے۔ مگر شاہ صاحب نے گورکھپور کی تاریخ سے قبل دنیا اور ہندوستان کی تاریخ پیش کی ہے اور اس کی آبادی کا ذکر کیا ہے۔ چنانچہ انھوں نے یورپ، ایشیا، امریکا، اور افریقہ کی آبادی کو بیان کیا ہے۔ اس کے بعد ہندستان کی آبادی اس کے محصول اور اس کے لشکر پر روشنی ڈالی ہے۔ مگر اس موضوع پر شاہ صاحب کے سارے اشعار بے لطف اور بے کیف ہیں۔ مثلاً وہ فرماتے ہیں:

ہے محصول اس ملک کا دو کرور
پہ ہے الف پنجہ سپہ کا بھی جوڑ
رعایا ہے برہما میں بتیس لک
نہ اس میں غلط ہے نہ اس میں ہے شک
ہے لشکر بھی یک لکھ و پنجہ ہزار
نہیں اس میں کچھ جائے شک زینہار

احمد علی شاہ نے ہندستان کی تاریخ کو بھی نظم کیا ہے چنانچہ پہلے انھوں نے بدھ شٹر کی حکومت کا ذکر کیا ہے۔ پھر شہاب الدین اور تیمور لنگ کے حملوں کا بیان ہے۔ اس کے ساتھ ہی مغلیہ حکومت کی تفصیلات بھی موجود ہیں۔ آخر میں بہادر شاہ کی حکومت کا بیان ہے۔ مگر محبوب التاریخ میں بہت سے تاریخی واقعات ترتیب سے نہیں ہیں۔ سید احمد علی شاہ نے ۱۸۵۷ء میں بہادر شاہ ظفر کی قید کے بعد بنگال کے نوابوں کا ذکر چھیڑ دیا ہے اور نواب سراج الدولہ اور انگریزوں کے تعلقات پر روشنی ڈالی ہے۔ سراج الدولہ بنگال کا نواب ۱۷۵۶ء میں ہوا ہے یعنی شاہ صاحب تقریباً سو سال پیچھے پلٹ گئے۔ اسی سلسلے میں شاہ صاحب نے جنگ بکسر کا نقشہ کھینچا ہے۔ جو ۱۷۶۴ء میں میر قاسم نواب بنگال اور انگریزوں کے درمیان ہوئی تھی۔

گورکھ پور کی اصل تاریخ وہاں سے شروع ہوتی ہے جہاں انھوں نے "حکایت بنائے شہر گورکھ پور" عنوان قائم کیا ہے۔ شاہ صاحب کا قول ہے کہ گورکھپور پہلے ایک صحرا تھا۔ چنانچہ فرماتے ہیں

کہ یہ شہر صحرا و ویران تھا
سواد چراگاہ حیوان تھا
کسی کو نہ اس شہر سے کام تھا
فقط شہر کا نام ہی نام تھا

شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ گورکھ پور مغلوں کی حکومت میں شامل تھا اور شاہجہاں بادشاہ اس کے مالک تھے۔ شاہ جہاں کے انتقال کے بعد گورکھپور اورنگ زیب کی حکومت میں شامل ہوگیا جب اورنگ زیب کی وفات ہوگئی تو گورکھپور اس کے بیٹے معظم کے قبضہ میں آگیا۔

سید احمد علی شاہ نے یہ بھی بتایا ہے کہ اس شہر کا نام گورکھپور کیوں پڑا۔ ان کا قول ہے کہ یہاں ایک درویش گورکھنا تھ رہتا تھا اس نے اس شہر کو آباد کیا اور اسی کے نام پر اس شہر کا نام گورکھ پور پڑا۔ بقول شاہ صاحب ایک روایت یہ بھی ہے کہ پہلے یہ علاقہ جنگل تھا جس میں گور دیعنی جانور چرا کرتے تھے۔ گور د لفظ کی مناسبت سے اس شہر کا نام گورکھ پور پڑا۔ شاہ صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس شہر کا نام معظم آباد کیوں پڑا۔ ان کا قول ہے کہ شہزادہ معظم اپنے باپ سے ناراض ہوکر گورکھ پور کی طرف آگیا۔ اس نے اس شہر کو ویران پایا۔ اس لئے اس نے اس کو آباد کرنا شروع کیا۔ اور اس کا نام معظم آباد رکھا۔

وہ فرماتے ہیں :

کہ جو تھا معظم شہ کامراں
وہ آیا تھا ناخوش پدر سے یہاں
جو آیا تو یہ شہر ویران دیکھ
بیابان و صحرا و میدان دیکھ
حکومت سے اپنی بسایا اسے
غرض شہر پورا بنایا اسے

اس شہر کا نام شہزادے نے معظم آباد ۱۰۷۰ھ میں رکھا جیسا کہ سید احمد علی شاہ فرماتے ہیں :

ز ہجری کہ سنے الف و ہفتاد بود
کہ آباد ایں شہر را شہ نمود

۱۰۷۰ھ مطابق ۱۶۵۹ء کے ہے۔ اس زمانے میں معظم شاہزادہ ہی تھا۔ اس لیے یہ بات قرین قیاس ہے کہ شاہزادہ معظم نے

(باقی صفحہ ۳۶ پر)

غزل

صلاح الدین نیر

فریاد بن کے جانا ہے کس کس کے گھر مجھے
تم نے نہیں تو کس نے کیا دربدر مجھے

میری نگاہ، جلوہ طلب ہے تو کیا کروں
تم نے ہی خود کیا ہے شریکِ نظر مجھے

تیرے بغیر شہر تمنّا، اُداس ہے
اب اجنبی سا لگتا ہے خود اپنا گھر مجھے

میں بھی دیارِ شوق کا زندہ مزار ہوں
اے زندگی! تو دیکھ تو لے اک نظر مجھے

حالانکہ چھن گئی مری آنکھوں سے روشنی
دنیا سمجھ رہی ہے ابھی دیدہ ور مجھے

نیّرؔ! یہ شخص لگتا ہے مجھ سے بھی معتبر
رسوائی لے کے آئی بھی تو کس کے گھر مجھے

غزلیں

کرشن بہاری نور

جس کا کوئی بھی نہیں اس کا خدا ہے یارو
میں نہیں کہتا کتابوں میں لکھا ہے یارو

مڑ کے دیکھوں تو کدھر اور صدا دوں تو کسے
میرے ماضی نے مجھے چھوڑ دیا ہے یارو

اس سزا سے تو طبیعت ہی نہیں بھرتی ہے
زندگی کیسے گناہوں کی سزا ہے یارو

شب ہے اس وقت کوئی گھر نہ کھلا پاؤ گے
آؤ میخانے کا دروازہ کھلا ہے یارو

کوئی کرتا ہے دعائیں تو یہ جل جاتا ہے
میرا جیون کسی مندر کا دیا ہے یارو

میں اندھیرے میں ہوں یا میں اجالے میں ہوں
ایسا لگتا ہے کوئی دیکھ رہا ہے یارو

حال کا زخم تو ماضی سے بہت گہرا ہے
آج زخمی مرا سایہ بھی ہوا ہے یارو

انتظار آج کے دن کا تھا بڑی مدت سے
آج اس نے مجھے دیوانہ کہا ہے یارو

چندر پرکاش جوہر بجنوری

تم دور رہو، یا پاس رہو، ہر شب کی سحر ہو جاتی ہے
اک روز کا کٹنا کیا معنی، اک عمر بسر ہو جاتی ہے

کہتے ہیں کہ خونِ اہلِ وفا، لاتا ہے یقیناً رنگ آخر
سنتا ہوں کہ میرے ذکر پہ اب وہ آنکھ بھی تر ہو جاتی ہے

اس حسنِ نظارہ کے صدقے، اس رخ سے نقاب اٹھے نہ اٹھے
تکمیلِ طلب ہو جاتی ہے تسکینِ نظر ہو جاتی ہے

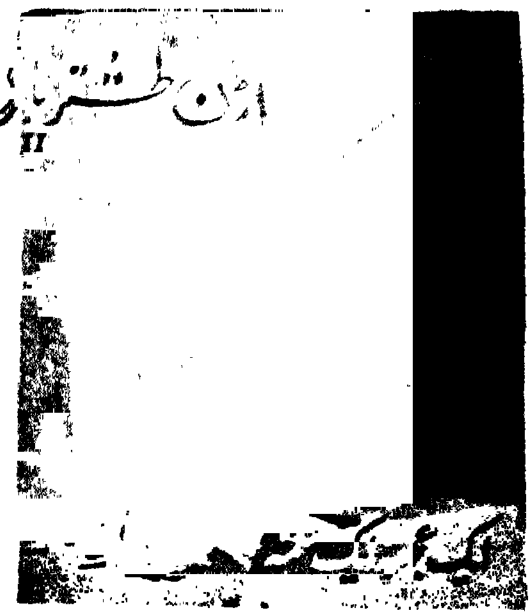
آتا ہے شبستانِ گل میں اک وقتِ طرب ایسا بھی کہ جب
ہلکی سی صدائے غنچہ بھی پیغامِ سحر ہو جاتی ہے

جب ذوقِ جنوں کی منزل میں سب دوست جدا ہو جاتے ہیں
خود گردِ سفر ہی اٹھ اٹھ کر دمسازِ سفر ہو جاتی ہے

رندی بھی اسی کی ہے رندی مستی بھی اسی کی ہے مستی
میخانے میں جس کی لغزش پر ساقی کی نظر ہو جاتی ہے

آغازِ محبت میں جوہر دیکھا ہے یہی میں نے اکثر
جو کوئی تصادم ہوتا ہے دنیا کو خبر ہو جاتی ہے

بدیع الزماں اعظمی



ہر ملک کے اخبارات میں اس قسم کی خبریں شائع ہوتی رہتی ہیں کہ دنیا کے فلاں فلاں خطے میں بہت ہی روشن اشیاء خلاء میں برق رفتاری کے ساتھ اڑتی ہوئی دیکھی گئیں۔ ان کے متعلق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ توے کی طرح گول ہوتی ہیں یا سگار کی طرح لانبی۔ انھیں عرف عام میں اڑن طشتریاں کہا جاتا ہے۔ آج ہی نہیں بلکہ تقریباً ایک چوتھائی صدی سے ان کے دیکھے جانے کی خبریں برابر آ رہی ہیں۔

۲۴ جون ۱۹۴۷ء کی بات ہے کہ امریکہ کے شہر اڈاہو (IDAHO) کا ایک تاجر مسمی کینتھ آرنلڈ ایک پرائیویٹ طیارہ پر ملک کے شمالی مغربی پہاڑی خطہ میں ماؤنٹ رینیئر (MT. RAINIER) کے قریب پرواز کر رہا تھا۔ اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے اسی خوشنما پہاڑی کا طواف کرتے ہوئے عجیب الخلقت طیاروں کو پرواز کرتے ہوئے دیکھا۔ یہ پربت اپنے دل فریب مناظر کے لیے مشہور ہے۔ اس کا بیان ہے کہ یہ طیارے پہاڑی چوٹیوں کا چکر کاٹ رہے تھے اور دیکھنے میں معلوم پڑتا تھا کہ وہ ایک دوسرے سے منسلک تھے۔ ان کی قطار غالباً پانچ میل لمبی رہی ہوگی۔ وہ سب کے سب توے کی طرح گول اور چپٹے تھے اور مثل آئینہ سورج کی شعاعوں کو منعکس کر رہے تھے۔

جب آرنلڈ نے اپنے مشاہدہ کی رپورٹ پریس کو دی تو ایک زبردست سنسنی پھیل گئی۔ یہ گول گول اڑن طشتریاں عوام میں موضوع گفتگو بن گئیں۔ چند دنوں کے بعد ملک کے دوسرے حصوں سے بھی ان کے دیکھے جانے کی رپورٹیں آئیں۔ ان میں کچھ تو ہوائی جہازوں سے دیکھی گئیں، کچھ زمین پر ہی سے مشاہدہ کی گئیں اور کچھ راڈر اسکرین پر دیکھی گئیں۔ جن جن لوگوں نے ان اڑن طشتریوں کو دیکھا ان میں بعض تجربہ کار ماہر فلکیات تھے، بعض راڈر آپریٹر تھے، بعض ہوائی جہازوں کے پائلٹ تھے، بعض ہوائی اڈوں کے کنٹرولر تھے اور بعض ماہر موسمیات تھے۔

اڑن طشتریاں ریاست ہائے متحدہ کے مختلف حصوں بالخصوص جنوبی مغربی حصہ کے ریگستانی علاقہ میں دیکھی گئیں۔ ان کے مشاہدہ کی خبریں مختلف اوقات میں میکسیکو، کینڈا، یورپ، افریقہ، بھارت، جنوبی مشرقی ایشیا کے بعض ممالک، اسٹریلیا، جزائر ہوائی، جنوبی امریکہ، گرین لینڈ اور انٹارکٹیکا براعظم سے بھی آئیں۔ جنوبی امریکہ سے جو خبر آئی وہ افسانوی رنگ کی بہت ہی سنسنی خیز تھی۔ یہ خبر ملک برازیل کی راج دھانی ریو ڈی جنیرو کے اخبار (COR REIO DA MANA) میں جلی سرنامہ کے ساتھ شائع ہوئی جس سے وہاں کے لوگوں میں سراسیمگی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ واقعہ یوں تحریر تھا کہ ۱۹ اگست ۱۹۶۳ء کے موسم سرما کی ایک رات کو ایک شخص مع اپنے تین چھوٹے چھوٹے بچوں کے برازیل کے ایک شہر میں اپنے چھوٹے سے مکان میں سو رہا تھا۔ تینوں بچوں کا باپ مسمی ریوالینو (RIVALINO) ہیرے کی تلاش میں کان کنی کرتا تھا۔ ایک سال قبل اس کی رفیقۂ حیات اسے داغ مفارقت دے چکی تھی۔ تینوں بچوں کی پرورش اور نگہداشت کا بار اسی کے سر تھا۔ سب سے بڑا

بیٹا ریمنڈو (RAIMUNDO) صرف بارہ سال کا تھا۔ رات کے سناٹے میں اُس نے مکان کے اندر دوڑتے ہوئے قدموں کی چاپ سنی۔ وہ اُٹھ بیٹھا۔ اُس نے بیڈ سوئچ آن کی اور چاروں طرف متجسانہ نگاہ ڈالی۔ ہوش رُبا منظر اُس کی نظروں کے سامنے تھا۔ چند عجیب الخلقت مخلوق جن پر نہ تو انسان ہونے کا اطلاق ہو سکتا تھا نہ حیوان کا پرچھائیوں کے مانند کمرہ میں پھُدک رہی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی شے یا کسی شخص کو تلاش کر رہی تھیں۔ وہ چند لمحات تک بچوں کے اوپر منڈلاتی رہیں اور پھر ریوالینو کے بستر کے قریب آئیں اور اُسے گھور گھور کر دیکھنے لگیں۔

ریوالینو نے خطرہ کی سنگینی کو محسوس کرتے ہوئے منت سماجت شروع کر دی۔ خیریت یہ ہوئی کہ وہ جملہ مخلوق چند ساعت بعد روپوش ہو گئیں۔ اس واقعہ کے چند دنوں قبل اس نے ویسی ہی دو عدد مخلوق کو اپنے مکان کے قریب بل کھودتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ قد میں مشکل سے تین فٹ کی ہوں گی۔ جب ریوالینو اُن کی طرف بڑھا تو وہ بھاگ کر ایک جھاڑی میں چھپ گئیں۔ چند منٹ بعد اس نے دیکھا کہ جھاڑی سے ایک عجیب غریب شے تیزی سے اُڑتی ہوئی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ وہ شے ہیٹ کی شکل کی تھی جس کا حاشیہ دہکتے ہوئے انگاروں کی طرح سُرخ اور روشن تھا۔ ریوالینو نے یہ واقعہ اپنے دونوں کان کنوں سے بیان کر کے انھیں بھی متحیر بنا دیا تھا۔

دوسرے دن صبح کو سب سے پہلے بڑا بیٹا ریمنڈو مکان سے باہر آیا۔ اُس کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اُس نے دو بڑی بڑی گول اور چمکدار اشیاء زمین سے چند فٹ کی اونچائی پر تیرتی ہوئی دیکھیں۔ ان سے عجیب و غریب قسم کی آواز بھی نکل رہی تھی اور جگمگاتی ہوئی تیز روشنی بھی۔ ایک غیر معمولی شے دیکھ کر وہ فرطِ مسرت سے چلّا اٹھا۔ اُس کی آواز پر جب ریوالینو مکان سے باہر آیا تو دونوں تیرتی ہوئی اشیاء ٹوٹ کر ایک دوسرے میں مدغم ہو گئیں اور ان سے گندھکی رنگ کا گرم اور گہرا دھواں نکلنے لگا۔ دھوئیں کے بادل نے ریوالینو کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ جب دھواں فضا میں غائب ہو گیا تو ریوالینو کے وجود کا نشان تک باقی نہ رہا۔ بے چارہ ریمنڈو اِس طور پر اپنے باپ کے اغوا کیے جانے پر بھونچکا ہو کر رہ گیا۔ یہ سب کچھ اُس کے نزدیک یا تو کالا جادو تھا یا سائنسی شعبدہ۔ اس نے اپنے ڈیڈی کو تلاش کرنے میں ایک ایک جھاڑی کو چھان مارا مگر کہیں اس کا پتہ نہ تھا۔ بالآخر مایوس ہو کر وہ کان کنوں کو ساتھ لے کر پولیس میں رپورٹ درج کرانے چلا گیا۔ لفٹننٹ لیسوبا (LISBOA-T.) کو اگرچہ ریمنڈو کی ہوش ربا کہانی پر یقین نہ آیا مگر اس نے اس واقعہ کی تفصیلی جانچ کرنے کا حکم دے ہی دیا۔

پولیس نے سب سے پہلے کان کنوں سے پوچھ گچھ کی۔ ریوالینو کی نجی زندگی کے بارے میں پوری جانکاری حاصل کرنے کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچی کہ ریوالینو کی موت یا قتل یا اغوا کا باعث نجی عداوت نہیں ہو سکتی اور یہ بات بھی خارج از امکان تھی کہ بارہ سالہ ریمنڈو اپنی جان سے زیادہ عزیز باپ کی جان لے لیتا۔ دونوں کان کنوں نے بھی چند دن قبل والا واقعہ بیان کر کے قتل کا اشتباہ بھی دور کر دیا۔ اب سوائے اس کے کوئی اور چارہ نہ تھا کہ ریمنڈو کے بیان پر مہر تصدیق ثبت کی جائے۔

اخبار میں اس خبر کے شائع ہوتے ہی عوام میں ایک ہیجانی کیفیت پیدا ہو گئی۔ ہر ایک کو ایک فکر دامن گیر ہو گئی کہ کہیں اس کا بھی حشر ریوالینو جیسا نہ ہو۔ ساتھ ہی ساتھ پچھلے دنوں کی یاد ابھر کر ہر ایک کے سامنے آ گئی جب سب نے کوئی گول گول اور روشن شے فضا میں تیزی سے بھاگتے ہوئے دیکھی تھی۔ بہر حال وہ اُڑن طشتریاں پھر نہ دیکھی گئیں اور نہ بد قسمت ریوالینو کا کوئی سراغ مل سکا۔

اس عجیب غریب حیرت انگیز واقعہ کے ضمن میں اگر معقولات کا کوئی دخل نہیں مگر پھر بھی یہ حقیقت ہے کہ نہ

میں اُڑنے والی برق رفتار اشیاء خواہ وہ طشتری کی طرح گول ہوں یا سگار کی طرح لانبی ہوں یا ایک کُرہ کی شکل کی ہوں دنیا کے مختلف خطوں اور مختلف اوقات میں دیکھی گئی ہیں۔ انھیں عرف عام میں اڑن طشتریاں کہا جاتا ہے جن کا سائنسی نام (U.F.O) ہے مگر ان میں سے کسی ایک کے ساتھ ایسی کوئی افتاد منسوب نہیں جیسا کہ ریوالینو کے ساتھ پیش آئی۔ ہاں! ایک ہوائی جہاز کے گرنے کا حادثہ ان اُڑن طشتریوں کی ٹکّر سے ضرور منسوب کیا جاتا ہے۔

ان اڑن طشتریوں کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی فضائیہ نے تحقیقات کی کئی مہمیں چلائیں۔ اس سلسلے میں فضائیہ نے ایک ایسا سوال نامہ تشکیل دیا تھا کہ جس کی روشنی میں نظر آنے والی اڑن طشتریوں کے بارے میں اگر صحیح صحیح جوابات دیے جاتے تو کسی نتیجہ پر پہنچنے میں کوئی دقت نہ ہوتی مگر کسی نے بھی جواب دینے کی زحمت نہ اٹھائی یا کسی سے کوئی جواب ہی نہ بن پڑا چنانچہ فضائیہ کے سکریٹری مسٹر تھامس فِن لیٹر نے ۴ جون ۱۹۵۳ء کو ایک بیان دیا کہ اگرچہ اڑن طشتریوں کے نظر آنے کی کئی ایک رپورٹیں موصول ہو چکی ہیں مگر فضائیہ اب تک کسی خاص نتیجہ پر پہنچنے میں ناکام رہی ہے۔ اسی سال حکومت کینیڈا کی رائل ایر فورس نے بھی ملک کینیڈا میں دیکھی جانے والی اڑن طشتریوں کا راز معلوم کرنے کا ایک منصوبہ بنایا مگر وہ بھی لاحاصل رہا۔

اڑن طشتریوں کے بارے میں یہی بیان کیا جاتا ہے کہ یہ مختلف قسم کی ہوتی ہیں۔ یہ چھوٹی اور بڑی دونوں سائزوں میں دیکھی گئی ہیں۔ ان کا اوسط قطر لگ بھگ سو فٹ ہوتا ہے۔ یہ حیرت ناک طریق پر چکر کاٹتی ہیں۔ یہ فضا میں منڈلاتی ہوئی کبھی کبھی ساکت ہو جاتی ہیں اور پھر ایک راکٹ کی تیزی کے ساتھ آسمان کا رخ کرتی ہیں اور پھر یک دم پلٹ پڑتی ہیں۔ ان کی رفتار کا اندازہ ہزاروں میل فی سکنڈ لگایا گیا ہے۔ کچھ لوگوں نے یہ بھی دعویٰ کیا ہے کہ انھوں نے اڑن طشتریوں کے خلابازوں کو بھی دیکھا ہے مگر یہ نہ بتایا کہ عالم بیداری میں یا عالم خواب میں! ایک کتاب 'BEHIND THE FLYING SAUCERS' جسے ہنری ہولٹ اینڈ کمپنی (HENRY HOLT & CO.) نے ۱۹۵۰ء میں شائع کی تھی جس میں مسٹر فرینک اسکلی نے اس امر کی نشان دہی کی ہے کہ سیارہ زہرہ کے خلابازوں کے ڈھانچے نیو میکسیکو اور کولوریڈو کے ریگستانی علاقے میں دیکھے گئے۔ گمان غالب ہے کہ اُن کا خلائی راکٹ (اڑن طشتری) کسی حادثہ سے پھٹ کر زمین پر گر پڑا ہوگا۔ موصوف کا کہنا یہ ہے کہ سیارہ زہرہ کی یہ مخلوق قد میں مشکل سے ۳۸ سے ۴۴ انچ کی رہی ہوگی۔ آگے چل کر وہ رقم طراز ہیں کہ ایک بار سائنس دانوں کی ایک ٹولی نے زہرہ کی مخلوق کو دیکھ کر انھیں پکڑنے کی لاحاصل کوشش بھی کی تھی۔ اس امر کا اشتباہ ہے کہ وہ مخلوق ابھی تک اریزونا (امریکہ) کے بے آب و گیاہ ویران اور سنسان ریگستانی علاقہ کی چھان بین کر رہی ہے۔

فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پُر اسرار طریق پر پرواز کرنے والی اڑن طشتریوں کے وجود کو ہم کیسے ثابت کر سکتے ہیں۔ کیا یہ واقعی خلائی راکٹ ہیں جو ہمارے خلائی راکٹوں کے مقابلہ میں زیادہ ترقی یافتہ ہیں؟

شروع میں کچھ لوگوں کا یقین تھا کہ اڑن طشتریاں دراصل روسی خلائی راکٹ تھے اور کچھ لوگ اس خیال کے تھے کہ اڑن طشتریاں خود امریکی راکٹوں کی ترقی یافتہ شکلیں ہیں مگر امریکہ کی فضائیہ کے سربراہ اور خود آنجہانی صدر ٹرومین نے اس خیال کی پُر زور الفاظ میں تردید کر دی اور یہ بات بھی بعید از قیاس قرار پائی کہ روسیوں نے ایسے برق رفتار غیر معمولی صلاحیت کے راکٹ بنا لیے ہیں۔ پھر تو یہ خیال راسخ ہو گیا کہ یہ پُر اسرار اڑن طشتریاں یقیناً سیارہ مریخ یا سیارہ

تہہ ہو یا کسی دوسرے نظام شمسی کے سیارگان میں سے کسی سیارہ کے خلائی راکٹ ہی ہو سکتے ہیں چنانچہ خلائی راکٹ سازی سے ربط رکھنے والے سائنس داں کافی غور و خوض کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ آج جب کہ ہم چاند یا دوسرے سیاروں پر پہنچنے کے لیے خلائی راکٹ بنانے میں مصروف ہیں تو کیا یہ ممکن نہیں کہ دوسرے سیاروں کی مخلوق جو ہمارے مقابلہ میں سائنس اور ٹکنالوجی میں بہت آگے ہو دوسرے سیاروں پر اترنے کے لیے خلائی راکٹ بنانے میں ہم سے سبقت لے گئی ہو۔ اس قسم کے بہت سارے خیالات پیش کیے گئے جن کی ایک فہرست اڑن طشتریوں کے بہت بڑے حامی میجر ڈونلڈ۔ ای۔ کیہی MAJOR DONALD KEYHEE نے نمبروار قلم بند کیا ہے۔ ان میں سے چند مندرجہ ذیل ہیں:۔

۱۔ اس امر کا قوی امکان ہے کہ خلائی مخلوق کو ہمارے ایٹمی تجربوں اور خلائی راکٹوں کی مشقوں سے یہ اندیشہ پیدا ہو کہ جب ہم خلاء میں پرواز کرنے کے قابل ہو جائیں گے تو ہم نیوکلیائی اسلحوں سے اُن پر حملہ آور ہوں گے۔ اس لیے اُنھوں نے ہمارے منصوبوں کی جانکاری کے لیے اُڑن طشتریاں بھیجی ہوں۔

۲۔ خلائی مخلوق کو اس بات کا بھی اندیشہ ہوگا کہ اگر خدانخواستہ کرۂ ارض اپنے جوہری اسلحوں کے استعمال سے خود فنا ہو جائے تو اُن کے مضر اثرات اُن کے کرہ پر بھی پڑنا لازمی ہوں گے۔

۳۔ خلائی مخلوق ہم سے دوستانہ تعلقات بھی قائم کرنا چاہے گی بہ شرطیکہ انھیں یقین ہو جائے کہ ہماری خلائی دوڑ دھوپ سے انھیں کوئی خطرہ لاحق نہ ہوگا۔

۴۔ خلائی مخلوق کرۂ ارض یا دوسرے سیاروں پر اپنا پرچم نصب کرنا چاہتی ہوگی۔

۵۔ اس کا بھی امکان ہے کہ خود اُن کا سیارہ ایسے دور سے گذر رہا ہو جب کہ زبردست آب و ہوائی تبدیلی متوقع ہو جس کی وجہ سے اُن کی چند نسلوں بعد وہاں بود و باش کرنا ممکن نہ ہو سکے۔ اس لیے وہ ہمارے کرۂ باد کا مطالعہ کر رہی ہیں کہ اگر حالات اُن کے سازگار ہوں تو پھر یہیں منتقل ہو جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ آبادکاری کے لیے وہ خصوصیت کے ساتھ دنیا کے غیر آباد علاقوں کا جائزہ لے رہی ہیں۔

اس قسم کے خیالات تو مفروضات ہی کی حیثیت رکھتے ہیں مگر یہ قیاس کہ اُڑن طشتریاں دوسرے سیاروں سے آتی رہتی ہیں اپنی جگہ پر ہمارے لیے یقیناً بے حد تشویش ناک ہیں۔ خوش قسمتی سے اس نظریہ کو حق بہ جانب قرار دینے کے لیے ہمارے پاس کوئی معقول جواز نہیں۔ ہارورڈ یونیورسٹی (امریکہ) کے مشہور سائنس داں مسٹر ڈونلڈ۔ ایچ۔ مینزل (DONALD H. MENZIL) کا یہ نظریہ ہے کہ اڑن طشتریوں کا وجود کرۂ باد میں بکھرے ہوئے برف کے معلق ٹکڑوں پر آفتاب یا ماہتاب کی شعاعوں کے انعکاس سے ہوتا ہے۔ جب ایسے بلوریں ٹکڑے سُرعت کے ساتھ زمین کی طرف آتے ہیں یا کرۂ باد میں منڈلاتے رہتے ہیں تو آفتاب یا ماہتاب کی کرنیں ان سے منعکس ہو کر عجیب و غریب منظر پیش کرتی رہتی ہیں جسے سائنس مدتوں سے مشاہدہ بھی کرتے آ رہے ہیں۔ یہ منعکس کرنیں بسا اوقات آفتاب یا ماہتاب کے گرد حلقہ ہائے نور بناتی رہتی ہیں۔ بعض وقت اس حلقۂ نور کا کچھ حصہ اتنا روشن ہو جاتا ہے جتنا کہ خود آفتاب۔ اسے ہم آفتاب کاذب کا لقب دیتے ہیں۔ چاند کے ہالہ میں پیدا ہونے والے ایسے روشن حصہ کو ہم ماہتاب کاذب کہتے ہیں۔ آفتاب کاذب یا ماہتاب کاذب کی تشکیل جو منعکس برق رفتار شعاعوں کی بدولت ہوتی رہتی ہے انھیں کو ہم اپنی لاعلمی کی بنا پر خلائی راکٹ یا اڑن طشتری کے نام سے پکارتے ہیں۔ اس لیے اڑن طشتریاں دراصل ہماری نظر کا فریب ہی ہو سکتی ہیں۔

جس طرح آسمان پر بکھرے ہوئے تارے ہمیں دیکھنے میں روشنی کے نقطے سے نظر آتے ہیں مگر ان کی اہمیت

(باقی صفحہ پر)

شاغل ادیب

۲۷ مئی ۱۹۷۶ء — نہرو جی کی بارھویں برسی پر

(منظوم فیچر)

(مدھم مدھم ماتمی سنگیت)

زنانی آواز:—

آج کے روز بارہ سال ہوئے
اک قیامت سی ہم پہ ٹوٹی تھی
یک بیک ہم سے چھٹ گیا تھا کوئی
یا کہ تقدیر ہند پھوٹی تھی

آج کے روز بارہ سال ہوئے
چل بسا تھا عظیم راہ نما
موت پر ہند کے جواہر کی
ساری دنیا تھی سر بسر نوحہ

(سنگیت کا شور)

مردانی آواز:—

عظیم ہند کے اے رہبر عظیم سلام
لبوں پہ اب بھی ہے رقصاں جہان کے تیرا نام
تمام اہل جہاں سے تجھے محبت تھی
تمام قوموں کی دل میں ترے عقیدت تھی
تو ہند ہی کا نہیں تھا تمام دیسوں کا
تمام دہر کا تو شہری مہذب تھا
ترا وہ امن جہاں کا پیام زندہ باد
وہ پنچ شیل کا اونچا مقام زندہ باد
دراصل تھا تو سیاست کا ایک زریں باب
کھلے ہیں اب بھی جہاں میں ترے ہنر کے گلاب

(سنگیت کا شور)

زنانی آواز:—

وطن میں اب بھی تری قدر کا ہے قد اونچا
ترے لیے ہے جھکا اب بھی سر ہمالہ کا

مردانی آواز:—

لبوں پہ گنگ و جمن کے ہیں اب بھی نغمے گیت
اک ایک نقش ابھرتا ہے اب بھی تیرا میت

زنانی آواز:—

جمال صبح بنارس ہے اب بھی تجھ پہ نثار
اودھ کی شام سہانی میں ہے اب بھی تیرا پیار

مردانی آواز:—

وقارِ عظمتِ ہندوستاں ہے تو نہرو
ہمارے اعلیٰ تمدن کی آبرو ہے تو

(سنگیت کا شور)

کورس:—

ہے جے جے تری ہے ترا نام زندہ
وطن میں ہے نہرو ترا کام زندہ
بھلائیں گے کس طرح ہم تیرے احساں
بنایا ہے تو نے ہمیں ایک انساں
غلامی کی زنجیر پگھلائی تو نے
اصولوں کی ہر راہ چمکائی تو نے
نظریاتِ آزادی تیکر نرالے
کہ آزادیاں ساری ہر کوئی پالے
غریبوں کی ننگوں کی حالت ہو بہتر
پہنچ جائیں برتر کے درجے پہ کمتر
ہو آزادی ہر اک معاشی، سماجی
ملے ہر ترقی شعوری، سیاسی
رہے اب نہ تفریق و تقسیم فرقہ
رہے اب نہ جھگڑا کوئی مذہبوں کا
کیا نفس کو پاک تو نے ہمارے
بتائی نئی راہ جینے کی تو نے
ہر اک ذہن چمکا ترے فلسفوں سے
عمل سے ملا ارتقا ہم کو تیکر
بہت رنگ لائی تری خاک نہرو
نہیں ہم میں پھر بھی، ہر اک سمت ہے تو

(سنگیت کا شور)

زنانی آواز:—

تجھ کو اٹھے جہاں سے، بیتے ہیں سال بارہ
لیکن ہے اب بھی مشرق، مغرب میں سوگ تیرا
تاریخ ہند کا تو، زریں باب نہرو
انساں کی عظمتوں کا رنگین باب نہرو
نہرو تو جگمگاتا سورج تمدنوں کا
انسان دوستی کا تو اک حسین سویرا

اقوام کی بقا کا تھا ایک تو مسیحا
امن جہاں کا نہرو دراصل تو خضر تھا

مردانی آواز:—

بے باک مرد تھا تو، تھا عزم سر بسر تو
جمہور کا مجاہد، تھا زیست کی سحر تو
تو نے مخالفت کی ہر بے بدی کی بڑھ کر
نہرو بلند نظری تو نے دکھائی اکثر
تو ذہن و فکر و فن کا معمار تھا نرالا
اتہاس تھا عظیم اک فنکار تھا نرالا
نہرو تو اک مثالی انسان تھا جہاں کا
ہندوستاں میں پیدا تجھ سا کوئی نہ ہوگا

(سنگیت کا شور)

مردانی آواز: سلام ہند کے مرد جواں، سلام سلام
زنانی آواز: سلام ہند کے اہل جہاں، سلام سلام
مردانی آواز: سلام تجھ پہ تو تھا ہند کا بڑا سیاس
زنانی آواز: سلام تو تھا تجھے سارے جہاں کا احساس
مردانی آواز: سلام تجھ پہ دکھی ہند کے دلوں کی پکار
زنانی آواز: سلام عظمت عالم کے قافلہ سالار
مردانی آواز: سلام تجھ پہ روایات کے حسیں پیکر
زنانی آواز: سلام، تو تو تھا تہذیب نو کا پیغمبر
مردانی آواز: سلام، مشرقی آدرش کے عظیم انسان
زنانی آواز: سلام مغربی کردار کے بلند نشان
مردانی آواز: سلام، دشمن قید غلامی تجھ پہ سلام
زنانی آواز: زمانے بھر میں کیا تو نے شانتی کو عام

(سنگیت کا شور)

(مردانی اور زنانی آوازیں)

گو تجھ کو اٹھے جہاں سے بیتے برس بارہ
ہر ایک ذہن میں لیکن ہے آج بھی زندہ

عظیم ہند کے رہبر سدا امر ہے تو
بھلا سکے گی نہ دنیا تجھے کبھی نہرو

عتیق الرحمٰن قاسمی

باغ و بہار اور فسانۂ عجائب کا تقابلی مطالعہ

داستان گوئی کا فن ایک ایسے غیر مہذب لیکن معصوم دور کی یاد دلاتا ہے جب انسان کا شعور اتنا شائستہ، اس قدر مہذب، بالیدہ اور تراشیدہ نہیں تھا جتنا اب ہے۔ تہذیب انسانی کا تیز گام قافلہ جیسے جیسے منزل بہ منزل آگے بڑھتا رہا، اس کے ادب، موسیقی، مصوری، ہتھیار سازی اور معماری کے فن میں بھی نکھار آتا گیا اور وہ کارواں جو 'داستان' سے چلا تھا اب مختصر افسانہ تک آ پہنچا ہے۔

عصری معاشرت جتنی کھل کر داستان اور مثنوی میں ہمارے سامنے آئی ہے اتنی بے حجاب ہو کر کسی اور صنف سخن میں نہیں آئی۔ رانی کیتکی، داستان امیر حمزہ، طلسم ہوشربا، فسانۂ عجائب، باغ و بہار، اور دوسری داستانیں پڑھ جائیے، نہ صرف عشق و معاشقہ کی داستان اور جن و پری کے وجود سے آراستہ کہانی ملے گی بلکہ اپنے دور کے معاشرے کی سچی تصویر بھی چلتی پھرتی نظر آئے گی۔ پروفیسر کلیم الدین لکھتے ہیں:

"ابتدائی قدیم قصے جو عموماً کسی قوم میں متداول نظر آتے ہیں وہ مختلف دلچسپیوں کے حامل ہوتے ہیں۔ یہ قصے خلا میں سانس نہیں لیتے اور نہ خلا میں پیدا ہوتے ہیں۔ ان کی اس قوم کے تخیل سے آبیاری ہوتی ہے۔ ان میں اس قوم کے تخیل کی ابتدائی زرخیز قوت پرواز کا عکس نظر آتا ہے۔ ان میں اس قوم کے شعور کی پہلی معصوم تتلاہٹ سنائی دیتی ہے۔"

ہمارے ادب بالخصوص نثری ادب کی ابتدا انہیں داستانوں سے ہوئی لیکن افسوس ہے کہ نثری ادب کا چراغ شعری ادب کے سامنے جھلملا کر رہ گیا، یہ شکوہ اور تاسف بجا ہے کہ نثر کے ساتھ سوتیلی اولاد جیسا سلوک کیا گیا تاہم نثری ادب کا سرمایہ کتنا ہی کم کیوں نہ ہو داستان گوئی کی اولیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ فن اتنا ہی قدیم ہے جتنی انسان کی تہذیب۔

"داستان" کا مقصد تنشیط طبع ہے، جس سے کسل، اضمحلال اور تکان دور ہو جاتی ہے اور تھکا ماندہ انسان قصہ سننے کے بعد ایک نشاط، سرور، انبساط اور کیف محسوس کرتا ہے اور ساتھ ہی ایک عزم، حوصلہ، ہمت، استقلال اور حصولِ مقصد کے لیے انتھک جد و جہد کر کے کسی ماورائی طاقت کے ذریعہ منزل مقصود تک پہنچ جانے کا جذبہ بھی اپنے اندر پیدا کر لیتا ہے۔

ایک وقت تھا جب "داستان" نیم تیرہ شبی میں بڑی بوڑھیوں کے پوپلے منہ سے بچوں اور بڑوں سب ہی کو لطف اندوزی کا سامان فراہم کرتی تھی، اور گاؤں والے بھی برسات کی تاریک راتوں میں خوب جھوم جھوم کر پڑھا اور سنا کرتے تھے۔ وقت کے ساتھ جہاں سماج کی دوسری قدریں بدلیں، سامان تفریح بھی بدل گئے۔ اور اب تنشیط طبع کے لیے ناول، فلم اور دوسرے بہت سے ادارے وجود میں آ گئے۔

غالب نے میر مجروح کے نام ایک خط میں لکھا ہے:

"ہر چند خردمند بیدار مغز تواریخ کی طرف بالطبع مائل ہوں گے لیکن قصہ کہانی کی ذوق بخشی و نشاط انگیزی کے بھی دل سے قائل

ہوں گے۔"

آگے چل کر مزید لکھا ہے:

"داستان طرازی من جملہ فنون سخن ہے۔ سچ یہ ہے کہ دل بہلانے کے لیے اچھا فن ہے۔"

ممتاز حسین داستانوں سے بڑھتی ہوئی لگن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

"داستانوں سے لطف اندوز ہونے کی ہماری صلاحیت کم نہیں ہوئی بلکہ اس کے برعکس کچھ اور بڑھی ہے کیونکہ اب ہم داستانوں کی داخلی اور جذباتی گرفت سے آزاد ہو گئے۔ آج ہم ان کا تجزیہ خارجی انداز سے کرنے پر قادر ہیں۔"

داستانوں پر سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ اس میں مافوق الفطرت اشیاء کا ذکر ہوتا ہے۔ اگر اس سے پیشتر یہ ذہن نشین کر لیا جائے کہ ادب اپنے سماج سے ہٹ کر کچھ نہیں ہوتا تو یہ اعتراض خود بخود رفع ہو جائے گا۔ ڈاکٹر خورشید الاسلام نے ایک سیمینار میں کہا تھا کہ تنقید کرتے وقت شاعر یا ادیب کے دور کا بغائر مطالعہ کرنا ہوگا اور اس پر تنقید اس کے دور کے حالات کو سامنے رکھ کر کرنی ہوگی۔ اگر یہ اصول مان لیا جائے تو اعتراض کی لغویت خود ہی واضح ہو جائے گی کیونکہ ابتدائی عہد میں انسان فطرت کا شیدائی تھا اور اس کی یہ وارفتگی اس حد تک بڑھ چکی تھی کہ جس چیز سے فائدہ یا نقصان پہنچتا اسی کو دیوتا سمجھنے لگتا تھا۔ توہمات کے بے شمار بتوں سے اس کا صنم کدہ آباد تھا لیکن تہذیب کی رفتار کے ساتھ یہ زنجیریں بھی ٹوٹ گریں۔

یہ تو درحقیقت داستان کی ایک خصوصیت ہے کہ اس میں سسپنس (SUSPENSE) ہوتا ہے اور تشنگی کا احساس بھی، ہر موڑ پر یہی جستجو رہتی ہے اب کیا ہوگا؟ بادشاہ زادی کی شرط پوری بھی ہو سکے گی یا نہیں، وہاں تو بھوت پریت رہتے ہیں اجنات کا پہرہ ہے پھر کیونکر ممکن ہو سکتا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے یا تو الہ دین کا چراغ مل جاتا ہے یا انگشتری سلیمانی یا اور کوئی ماورائی تدبیر نکل آتی ہے۔

آج کل کی فلموں میں تو سسپنس ہی سب کچھ بن گیا ہے ناولوں میں یہی دلچسپی کا سبب بن جاتا ہے اور مختصر افسانہ میں افسانہ نگار اسی کے سہارے ارتقاء کے مختلف مدارج طے کرتا ہے۔

بہرحال ابتک کی تحقیق کے مطابق "بوستان خیال" ہی کو پہلی داستان مانا گیا ہے جو "وقار عظیم" کے بقول محمد شاہ رنگیلے کے دور میں لکھی گئی اس کا مصنف محمد تقی خیال (م ۱۷۷۲ء) ہے جو گجرات سے منتقل ہو کر دہلی آکر مقیم ہوا۔ اس کی جائے اقامت کے قریب ہی ایک قہوہ خانہ تھا جس میں داستان گوئی ہوا کرتی تھی اور داستان گو دوسروں کے قصوں کو اپنی طرف منسوب کر کے بڑے فخر سے سنایا کرتے تھے۔ خیال نے قہوہ خانہ کی گفتگو کا مفصل حال لکھا ہے، ایک روز خیال نے بھی دوستوں کے اصرار پر ایک قصہ کی تمہید لکھ کر اس محفل میں سنائی جس کے سننے والوں نے خاطر خواہ داد دی اور ہر طرف اس کی داستان گوئی کا چرچا ہو نکلا۔ اس نے نواب رشید الدین خان بہادر کی فرمائش پر "بوستان خیال" باقاعدہ لکھنا شروع کر دیا۔

اردو کی بیشتر داستانیں انیسویں صدی میں لکھی گئی ہیں نثر میں سب سے پہلے داستان تحسین کی "نوطرز مرصع" کو بھی بتایا جاتا ہے جو ۱۷۷۵ء اور ۱۷۸۱ء کے درمیان لکھی گئی۔ اس کے بعد پھر ان قصوں کا دور آتا ہے جو "فورٹ ولیم کالج" کے زیر اثر لکھے گئے جن میں "باغ و بہار"، "آرائش محفل"، طوطا کہانی، اشک کی داستان امیر حمزہ اور سنگھاسن بتیسی وغیرہ ہیں۔

۱۸۲۴ء میں سرور کی فسانۂ عجائب لکھی گئی پھر گلزار سرور، شگوفۂ محبت اور "شرر عشق" لکھی گئیں۔

باغ و بہار اور فسانۂ عجائب دو مختلف مکاتب فکر کا نظریاتی اور لسانیاتی تصادم ہے جس کے پس منظر میں لکھنؤ اور دہلی کی دو تہذیبوں کی جھنکار صاف سنائی دیتی ہے۔ اول الذکر کتاب میر امن دہلوی کی معرکۃ الآرا تصنیف ہے جو ۱۸۰۱ء کے آس پاس میں تالیف ہوئی۔ یہ طبع زاد نہیں ہے بلکہ خود مولف کے بیان کے مطابق میر خسرو کی کسی کتاب کا ترجمہ ہے لیکن مولوی عبدالحق نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے اور وہ اس میں کافی حد تک کامیاب بھی

ہیں کہ تحسین کی "نوطرز مرصع" کو سامنے رکھ کر لکھی گئی جیسا کہ کئی جگہ کی عبارت میں مماثلت سے ظاہر ہوتا ہے۔

"فسانۂ عجائب" کو "باغ و بہار" کے خلاف ایک ردعمل سمجھنا چاہیے جس سے دل کا غبار نکالنے کی کوشش کی گئی ہے اور باغ و بہار سے تقریباً چوبیس برس بعد میں لکھی گئی ہے اس کو طبع زاد بتایا جاتا ہے۔

ان دونوں اہم کتابوں کے مابین وجہ نزاع صرف یہ بتائی جاتی ہے کہ میرامن نے باغ و بہار میں دلی کے کام سے کر دلی کی زبان کو کیوں ترجیح دی۔ حالانکہ بہ نظر انصاف اگر دیکھا جائے تو یہ عبارت اتنی معتوب نہیں جتنی سرور اور ان کے احباب نے سمجھ لی ہے:

"سچ ہے بادشاہت کے اقبال سے شہر کی رونق تھی۔ ایک بارگی تباہی پڑی۔ رئیس وہاں کے میں کہیں اور تم کہیں ہو کر جہاں جس کے سینگ سمائے وہاں نکل گئے، جس ملک میں پہنچے وہاں کے آدمیوں کی ساتھ سنگت سے بات چیت میں فرق آیا اور بہت ایسے ہیں کہ دس پانچ برس کسو سبب سے دلی میں گئے، اور رہے۔ وہ بھی کہاں تک بول سکیں گے کہیں نہ کہیں چوک ہی جائیں گے اور جو شخص سب آفتیں سہ کر دلی کا روڑا ہو کر رہا اور دس پانچ پشتیں اسی شہر میں گزریں اور اس نے دربار امراؤں کے اور میلے ٹھیلے، عرس چھڑیاں، سیر تماشا اور کوچہ گردی اس شہر کی مدت تک کی ہوگی اور وہاں سے نکلنے کے بعد اپنی زبان کو لحاظ میں رکھا ہوگا اس کا بولنا البتہ ٹھیک ہے یہ عاجز بھی اس شہر کی سیر کرتا اور تماشہ دیکھتا یہاں تک پہنچا ہے۔"

یہ ہے وہ عبارت جس پر سرور اور اس کے ہم نوا چراغ پا ہو گئے اور ردعمل کے طور پر فسانۂ عجائب لکھ ڈالی، اور پھر اعتراض اور جواب اعتراض کا سلسلہ ہو گیا۔ میرامن کے عقیدت مندوں نے "سرورِ سلطانی" سے فسانۂ عجائب کا جواب دیا تو اس کا جواب "طلسم حیرت" سے دیا گیا۔

باغ و بہار اور فسانۂ عجائب میں بنیادی فرق یہ ہے کہ باغ و بہار کی تالیف کا مقصد جتنا اہم اور اعلیٰ ہے اتنا فسانۂ عجائب کا نہیں۔ میرامن نے اس لیے یہ کتاب لکھی کہ اردو کو فروغ ہو اور اسے آسان سمجھ کر لوگ زیادہ فیض یاب ہوں گے اور کم پڑھے لکھے لوگوں کے لیے بھی یہ مفید ہوگی چنانچہ خود لکھا ہے:

"اب خداوند نعمت صاحب مروت نجیبوں کے قدردان جان گلگرسٹ صاحب نے (کہ ہمیشہ اقبال ان کا زیادہ رہے جب تک گنگا جمنا بہے) لطف سے فرمایا کہ اس قصہ کو ٹھیٹھ ہندوستانی گفتگو میں جو اردو کے لوگ ہندو مسلمان، عورت مرد، لڑکے بالے، خاص و عام آپس میں بولتے ہیں ترجمہ کرو موافق حکم حضور کے میں نے بھی اسی محاورے سے لکھنا شروع کیا جیسے کوئی باتیں کرتا ہے۔"

اب ذرا فسانۂ عجائب کا مقصد تصنیف بھی ملاحظہ فرمائیے لکھتے ہیں:

"آخر الامر بمقتضائے عادت تلاش معاش کے حیلے میں فلک تفرقہ پرداز گردوں عربدہ ساز نے صورت مفارقت کی دکھائی، مہاجرت استقبال کو آئی۔"

آگے چل کر اصل مقصد کا بیان ان الفاظ میں ہوا ہے:

"اگرچہ اس ہیچ میرز کو یہ یارا نہیں کہ دعویٰ اردو زبان پر لائے یا اس فسانہ کو بہ نظر ثانی کسی کو سنائے۔ اگر شاہجہاں آباد کہ مسکن اہل زبان بیت السلطنت ہندوستان کبھی تھا، وہاں چند بود و باش کرتا اور فصیحوں کو تلاش تو فصاحت کا دم بھرتا جیسا میرامن صاحب نے چار درویش کے قصے میں بکھیڑا کیا ہے کہ ہم لوگوں کے دہن کے حصہ میں یہ زبان آئی۔ دلی کے روڑے ہیں، پر محاوروں کے ہاتھ پاؤں توڑے ہیں۔ پتھر پڑیں ایسی عقل پر، بہ خیال انسان کا خام ہوتا ہے۔ مفت میں نیک بدنام ہوتا ہے۔ بشر کو دعویٰ کب سزاوار ہے، کاملوں کو بے ہودہ گوئی سے انکار بلکہ ننگ و عار ہے، مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید۔ وہ کہاوت ہے جو سنتے ہیں آئی کہ اپنے منہ سے دھنا بائی۔"

اس پورے اقتباس کو پڑھنے سے جو تاثر پیدا ہوتا ہے وہ اس فسانہ کا مقصد سمجھنے کے لیے کافی ہے۔ مگر افسوس یہ ہے کہ

بسیار کوشش کے بعد بھی قبولیت عوام کا جو اعزاز باغ و بہار کو حاصل تھا اسے نہ ہو سکا بلکہ تصنیف سے پہلے سرور کے احباب نے جس خدشہ کا اظہار کیا تھا وہ بھی پورا ہو گیا:

"فقط ہماری خوشی مدنظر رکھو جیسا طلب ویسا بس کہے گا ہمیں پسند آئے گا بشرطیکہ جو روزمرہ اور گفتگو ہماری تمہاری ہے یہی ہو ایسا نہ ہو کہ آپ رنگینی عبارت کے واسطے دقت طلبی اور نکتہ چینی کریں۔ ہم ہر فقرے کے معنی فرنگی محل کی گلیوں میں پوچھتے پھریں۔"
اگرچہ سرور اپنے متعلق خود یہ لکھتے ہیں:

"نیازمند کو اس تحریر سے نمود نظم و نثر جودتِ طبع کا خیال نہ تھا۔ شاعری کا احتمال نہ تھا بلکہ نظر ثانی میں جو لفظ دقت طلب غیر مستعمل عربی، فارسی کا مشکل تھا اپنے نزدیک اُسے دور کیا اور جو کلمہ سہل ممتنع محاورے کا تھا رہنے دیا۔"

ان کی اس کتر بیونت کے بعد بھی مشکل الفاظ کی اتنی بھرمار ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قاری پر اپنی قابلیت کا سکہ بٹھانا چاہتے ہیں اسی لیے غالب کو کہنا پڑا "وہ تو بھٹیار خانہ ہے۔" اور پروفیسر رشید احمد صدیقی نے لکھا ہے کہ "سرور آدمیوں کا حال نہیں لکھتے صرف چیزوں کا مرقع کھینچتے ہیں۔" ساری کتاب میں بقول بالائی اور بقال، حلوائی ہی آپ کو نظر آئیں گے جب کسی جگہ کا ذکر ہو رہا ہو تو اس کی صفات کے بیان کرنے میں اتنے محو ہو جاتے ہیں کہ اصل مسئلہ کا بہت دیر میں جا کے خیال آتا ہے۔ غیر ضروری الفاظ کی ٹھونسا ٹھانس ہر جگہ ملے گی۔ بھرتی کے الفاظ صرف تک بندی کے لیے لائے گئے ہیں۔ سرزمین ختن کا ذکر یوں کرتے ہیں:

"سرزمین ختن میں ایک شہر تھا۔ مینو سواد، بہشت نژاد، پسند خاطر محبوبانِ جہاں، قابل بود و باش خوبان زماں، شمیم صفت، اس کی معطر کن دماغ جاں، مسکن التہاب قلب واقع خفقان زمین اس کا رشک چرخ بریں، رفعت دشان چشمک زن بلندی، فلک ہفتمیں، گل کو یہ خجلت دہ گلشن آبادی گلزار، بساط تختۂ چمن بازار ہر ایک بے آزار مصفا ہموار۔"
اس کا مطلب صرف اتنا ہے کہ وہ ایک خوبصورت شہر تھا۔

ایسی ہی ایک جگہ باغ و بہار کی عبارت یہ ہے: "آگے روم کے ملک میں کوئی بادشاہ تھا کہ نوشیرواں کی سی عدالت اور حاتم کی سی سخاوت اس کی ذات میں تھی۔" کتنی سادی زبان اور مختصر الفاظ میں وہ بات کہہ دی جو سرور چار پانچ سطور میں کہہ پاسے۔ اسی لیے پروفیسر کلیم الدین جیسے نقاد کو بھی اعتراف کرنا پڑا۔ "باغ و بہار کی سادگی سپاٹ نہیں اس میں ناگوار بے رنگی نہیں اور یہاں سادگی و پرکاری بیک وقت جمع ہیں میر امن کی عبارت میں ایک خاص آہنگ ہے اور اس کے جملوں میں ساخت، ترتیب اور حرکت کی باریکی تناسب اور جاذبیت ہے۔" اسی لیے پڑھنے والا تھکتا نہیں بلکہ یہ ہلکی پھلکی عبارت اس کے لیے شراب دوآتشہ بن جاتی ہے، اس کے برعکس فسانۂ عجائب میں قدم قدم پر تھکاوٹ کا احساس ہوتا ہے اور قاری جلد ہی اس کی بوجھل عبارت سے اُوب جاتا ہے۔ وقار عظیم نے لکھا ہے:

"میر امن کی سادگی کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ پڑھنے والے کے ذہن پر کسی جگہ اکتاہٹ یا تھکاوٹ کا بوجھ نہیں ڈالتی۔ میر امن کو زبان و بیان پر جو قدرت ہے اور ان کے تصرف میں الفاظ کا جو سرمایہ ہے وہ بات میں تکرار نہیں پیدا ہونے دیتا اور نہ اُسے خشک اور بے مزا بناتا ہے۔"
میر امن کی سادگی کا کمال اور عمومیت کا کرشمہ یہ ہے کہ ایک توازن برقرار رکھتے ہیں اور تہذیبی سطح سے ذرا بھی نیچے نہیں اترتے اور اپنی سادہ عبارت میں ابتذال کی بو تک بھی نہیں آنے دیتے۔ ان کے قصہ کو کہیں سے بھی پڑھ لیجیے عبارت یکساں نظر آئے گی۔
فسانۂ عجائب اس کے بالکل برعکس ہے۔ اس میں وہ یکسانیت نہیں۔ کہیں تو زبان طرازی کی ایسی حد کر دی کہ حافظ، ردتی اور جامی کو بھی پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔ لیکن یہ زور زیادہ دیر تک قائم نہیں رہتا جب الفاظ کا ترکش خالی ہو جاتا ہے تو پھر جاسوسی ناول سے بھی زیادہ خشکی آجاتی ہے ایک طرف تو یہ غلغلہ:
"گلکشا یاں سلسلۂ سخن و تازہ کنندگان فسانۂ کہن یعنی محرران رنگین تحریر و مورخان جادو تقریر نے اشہب جہندۂ قلم کو

میدانِ وسیع بیان میں بکرشمۂ سحر ساز ولطیفہائے حیرت پرداز گرم عنان وجولان یوں کیا ہے۔"

یہ طمطراق ہر جگہ نہیں ہے ایک جگہ اتنی سطحیت آگئی ہے:

"اب روز چڑیمار کی ترقی ہونے لگی تھوڑے دنوں میں گھربار کپڑا لتا گنا پاتا سب درست ہوگیا قضارا کوئی بڑا تاجر سرا میں اس ہشیاری کے گھر میں اترا جس کی دیوار تلے چڑیمار رہتا ہے۔"

پوری باغ وبہار میں ایک موقع بھی ایسا نہیں آیا جہاں میرامن کو تشبیہ واستعارہ میں کوئی دقت اٹھانی پڑی ہو۔ جو کچھ ذہن میں آیا لکھ دیا۔

"ایک روز طاق میں ایک جلد کتاب نظر آئی اتار کر دیکھا تو سارے علم دین و دنیا کے اس میں جمع کیے تھے گویا دریا کو کوزے میں بھر دیا تھا۔" اس تشبیہ کے باندھنے میں میرامن کو کوئی تکلف نہ ہوا ہوگا۔ برخلاف اس کے فسانۂ عجائب میں جابجا تشبیہات ملتی ہیں اور ایسی تشبیہات لائی گئی ہیں کہ ذوقِ سلیم پر بار گزرتی ہیں۔

یہ حقیقت ہو کہ میرامن نے جملوں کی ترتیب اور ساخت میں نحوی وصرفی قواعد کو ملحوظ نہیں رکھا پھر بھی ایک حسن ہے۔

"سب موجود تھا لیکن فرزند کہ زندگانی کا پھل ہے۔ اس کی قسمت کے باغ میں نہ تھا۔"

اگر قواعد کا خیال رکھا جائے تو یوں ہونا چاہیے کہ اس قسمت کے باغ میں فرزند جو کہ زندگانی کا پھل ہوتا ہے نہ تھا۔

لیکن قواعد کے عدم لحاظ سے جو خوب صورتی پیدا ہوگئی ہے اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا اور پھر "کہ" کے لفظ نے کئی لفظوں کو حذف کرکے مطلب واضح کر دیا اور اختصار کا فائدہ بھی ہوگیا۔ وقار عظیم نے لکھا ہے "میرامن معمولی باتوں سے غیر معمولی نتائج پیدا کر دیتے ہیں" الفاظ کا برمحل استعمال بھی باغ وبہار کی ایسی خوبی ہے جو فسانۂ عجائب میں نہیں ہے۔ میرامن لکھتے ہیں:

"جس طرح اس نے مجھ پہ ہاتھ چھوڑا اور گھائل کیا میں بھی دونوں کے پرزے پرزے کر دوں۔ تب میرا کلیجہ ٹھنڈا ہو نہیں تو اس غصہ کی آگ میں پھنک رہی ہوں آخر جل کر بھوبھل ہو جاؤں گی۔"

پھنک اور بھوبھل دونوں لفظ صرف اہل زبان ہی استعمال کرسکتا ہے اور بھوبھل کا استعمال کتنا موزوں ہے۔

باغ وبہار میں ہندی الفاظ کو بھی مناسب مواقع پر استعمال کرلیا گیا ہے جیسے "پرچار" "سندر" وغیرہ جبکہ فسانۂ عجائب میں عربی اور فارسی کے بھاری بھرکم الفاظ لانے کی کاوش کی گئی ہے اسی طرح میرامن نے بالکل گفتگو کا سا انداز اختیار کیا ہے۔" جورچکا" اور ڈھونڈ ڈھانڈ وغیرہ قسم کے مہملات جو دن رات گفتگو میں آتے ہیں لاکر طرز تحریر میں حسن پیدا کر دیا ہے۔ البتہ کہیں متروکات بھی آگئے ہیں لیکن اس دور میں مروج تھے۔ اگر "کسو" "یاتلک" وغیرہ چند الفاظ کو نکال دیا جائے تو باغ وبہار اسی دور کی تصنیف معلوم ہوگی۔

سرور نے وہی پرانا طریقہ اپنایا ہے جو اس زمانہ میں بھی معیوب تھا اور پرشکوہ الفاظ کا سہارا لیا جس سے وہ عوام سے دور ہوگئے واقعہ یہ ہے کہ "داستان" کا تعلق پڑھنے سے زیادہ سننے سے ہوتا ہے اور سننے والا اتنی غیر ضروری طوالت کو گوارہ نہیں کرسکتا۔

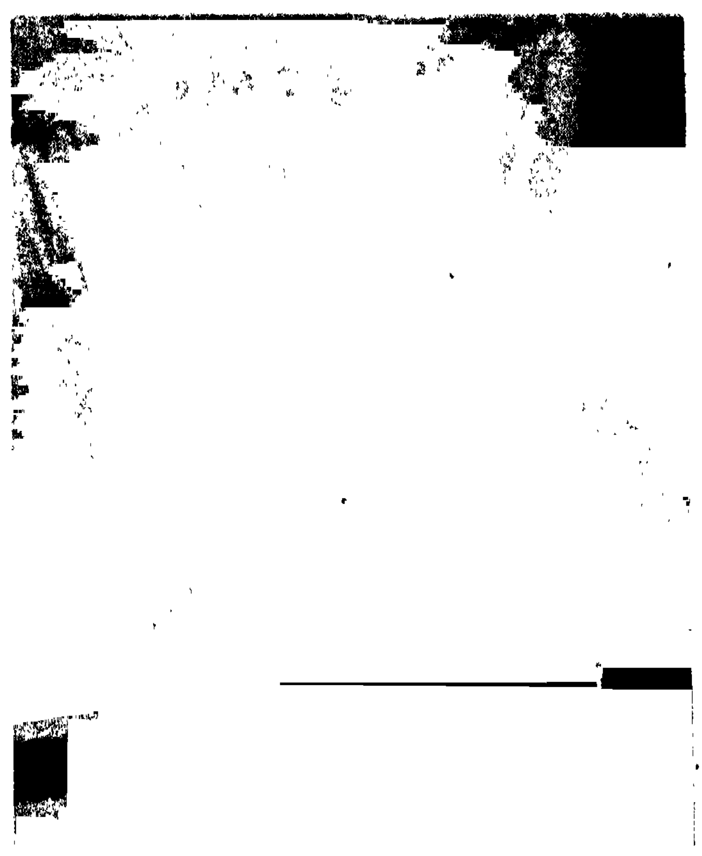
تعجب ہے کہ عزیز احمد کو اس میں ناول کے خدوخال کیسے نظر آگئے؟ کیا ناول میں اتنی ادق زبان استعمال کی جاتی ہے۔ داستان گو کو جن خصوصیات کا حامل ہونا چاہیے سرور میں وہ مفقود ہیں۔ نرمی، توازن اور ٹھہراؤ، البتہ باغ وبہار میں یہ خوبیاں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ فسانۂ عجائب میں اگر کوئی خوبی ہے تو صرف یہ کہ اس میں معاشرتی فضا پوری طرح جلوہ گر ہے:

"برات کا جلوس سنو، دیوان خاص سے دلہن کا مکان پانچ کوس تھا دونوں طرف بلور کا جھاڑ آدمی کے قد سے دوچند، سو سو تہ پانچ چھ گز کے فاصلہ سے روشن اور دس گز جدا، نقرئی طلائی لگن جلتا ان سے کچھ دور، ہزاروں مزدور تھا ٹھروں پر روشنی کرتے جھاڑ رشک سروخانہ جا بجا ترپولئے اور نوبت خانے بنے، کتھک اتھک اس پر ناچتے، نوبت بجتی مغرق شامیانے تنے، اس کے قریب آتش بازی گڑی، روشنی یہ روشن تھی کہ جیونٹی سوار کو بہ بیت



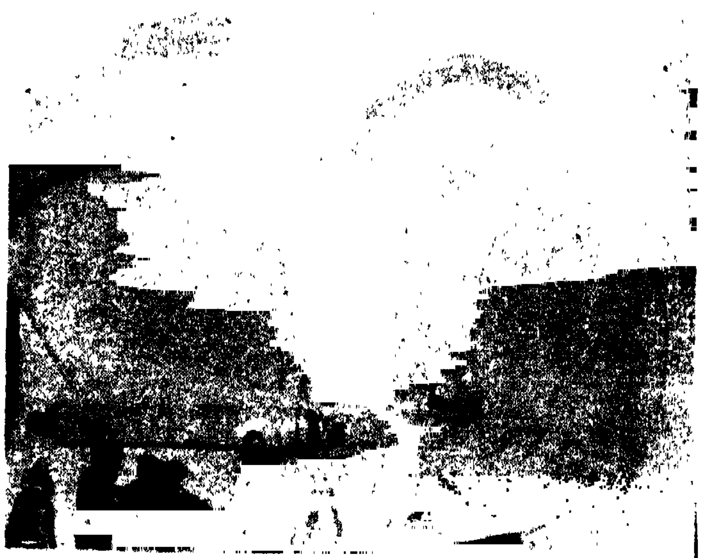
صدر جمہوریہ شری فخرالدین علی احمد ۱۳ مارچ ۱۹۷۶ء کو علیگڈھ مسلم یونیورسٹی کے
جلسہ تقسیم اسناد کے موقعہ پر خطاب کرتے ہوئے

وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی ۱۳ مارچ ۱۹۷۶ء کو بھدوہی (وارانسی) میں اونی قالین
کے لیے دھاگے کی کتائی مل کا سنگ بنیاد رکھ رہی ہیں





گورنر اتر پردیش شری ایم. چنا ریڈی ۲۹ مارچ ۱۹۷۶ء کو ۳۷ء۴۴ لاکھ روپیہ کی لاگت سے تعمیر ہونے والی لکھنؤ کچہری کی نئی عمارت (پہلی منزل) کا افتتاح کرتے ہوئے



وزیر اعلا شری نرائن دت تیواری کو ۲ مارچ ۱۹۷۶ء کو بریلی نگر پالیکا کی جانب سے سپاسنامہ پیش کیا گیا۔ تصویر میں وزیر اعلا نگر پالیکا کے چیرمین سے سپاسنامہ قبول کر رہے ہیں

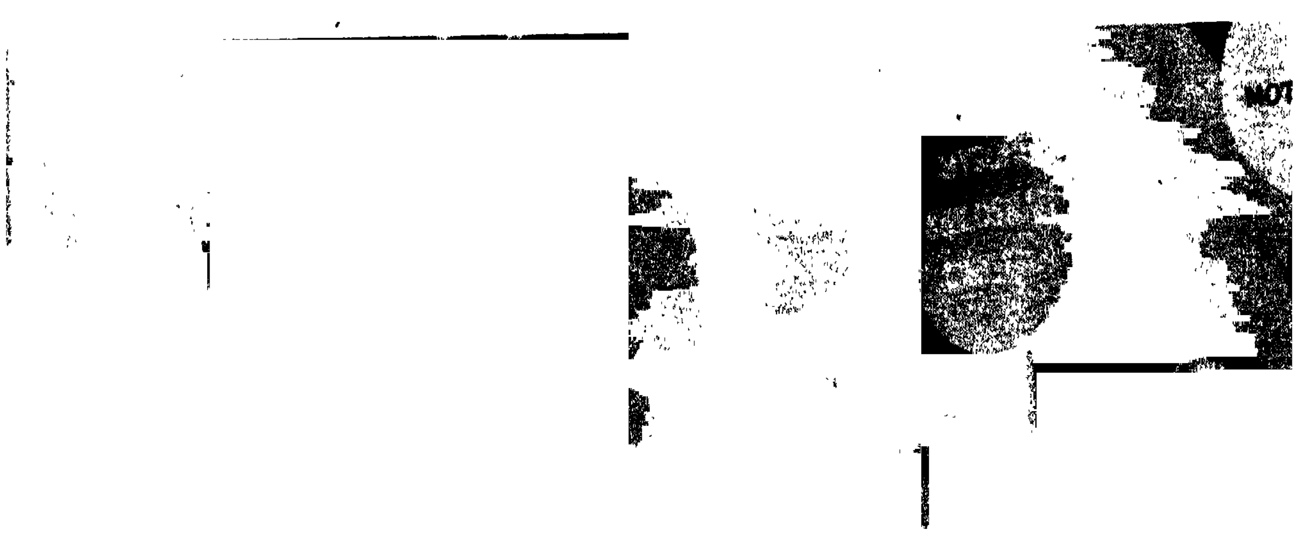


وزیر اعلا اتر پردیش ۱۰ مارچ ۱۹۷۶ء کو اپنی جائے رہائش پر زندگی بیمہ کارپوریشن کے سینیر ڈویژنل منیجر شری ایم. کلیان رمن سے ۵ لاکھ روپیہ کا چیک قبول کر رہے ہیں۔ کارپوریشن نے یہ رقم خصوصی سیلاب امدادی قرض کی شکل میں ریاستی حکومت کو دی ہے



ودھان سبھا کے اسپیکر شری واسدیو سنگھ ۲۵ مارچ ۱۹۷۶ء کو تلک ہال ودھان بھون میں
سچیوالیہ ہندی پریشد کے زیر اہتمام منعقدہ ہولی ملن کی تقریب میں تقریر کر رہے ہیں

چھوٹی صنعتوں کی وزیر بیگم محسنہ قدوائی ۲۳ مارچ ۱۹۷۶ء کو جم خانہ کلب
قیصر باغ لکھنؤ میں کرلو سکر نمائش کا افتتاح کرتے ہوئے





یوتھ لیڈر شری سنجے گاندھی سئی ندی پر نوتعمیر پل کا افتتاح کر رہے ہیں

وزیر تعمیرات عامہ شری بلدیو سنگھ آریہ نے ۲۰ مارچ ۱۹۷۶ء کو تلسی پور (ضلع گونڈہ) میں
۱۱۶ کیلومیٹر لمبے بھابھر پل کا افتتاح کیا۔ یہ تصویر اسی موقع کی ہے



مفصل معلوم ہوتی تھی۔"

اسی بات کو میر امن کی زبان سے سنئے:

" دروازے پر دھوم دھام ہو رہی تھی، گلیارے میں جھاڑ دے کر چھڑکاؤ کیا ہے، یساول عصابردار کھڑے ہیں، دیکھا تو تمام حویلی میں فرش مکلف لائق ہر مکان کے جا بجا بچھا ہے اور مسندیں لگی ہیں، پان دان، گلاب دان، عطردان، پیک دان، نرگس دان قرینے سے لگی ہیں، طاقوں میں رنگترے، کنولے، نارنگیاں، اور گلابیاں رنگ برنگ چنی ہیں۔"

باغ و بہار کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ اس میں کرداروں کی مصوری میں جس چیز سے سب سے زیادہ مدد لی گئی ہے وہ زبان ہے ہر کردار کے موافق حال تصویر کشی کی گئی ہے:

"الٰہی تیری نتھ چوڑی سہاگ کی سلامت رہے اور کماؤ کی پگڑ قائم رہے، میں غریب رنڈیا فقیرنی ہوں ایک بیٹی میری ہے کہ وہ دو جی سے پورے دنوں درد زہ میں مرتی ہے اور مجھ کو اتنی وسعت نہیں کہ ادھی کا تیل جلاؤں، کھانے پینے کو کہاں سے لاؤں، اگر مر گئی تو گور، کفن کیوں کر کروں گی اور جنے تو دائی جنائی کو کیا دوں گی۔"

میر امن نے جو کردار پیش کیا اس کے الفاظ سے خیالات، احساسات اور مزاج صاف جھلکتا ہے۔ باغ و بہار میں اشعار بھی فسانۂ عجائب کے مقابلہ میں کم ہی استعمال کیے گئے ہیں، لیکن جو ہیں وہ برمحل ہیں۔ کہتے ہیں " سچ ہے اگر آدمی میں رحم نہیں تو وہ انسان نہیں اور جس کے جی میں درد نہیں وہ قصائی ہے" اس کے بعد ایک شعر ہے۔

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

فسانۂ عجائب کے اشعار اتنے موزوں اور جان دار نہیں ہیں اشعار سے زیادہ زور خود ان جملوں میں ہے جن کی تائید اور رنگ آرائی کے لیے اشعار لائے گئے۔ ان اشعار کو بڑھ چڑھ کر ایک تاثر یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ سرور کو اپنے اشعار سنانے کا زیادہ شوق ہے۔ جب جانِ عالم مہر نگار سے رخصت ہو کر انجمن آرا کی تلاش میں جاتا ہے تو ملکہ بحر عزم میں ڈوب جاتی ہے وہاں پر سرور کے ایک شعر کے بعد اپنے دو شعر دے مارے ہیں۔ پروفیسر کلیم الدین نے فسانۂ عجائب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

" مصنف نے روح کو نہیں جسم کو اہم سمجھا ہے اور گویا کسی حسین لیکن بے جان مجسمہ کو زرق برق لباس اور رنگین چمکیلے اور قیمتی زیورات سے سجایا ہے' فسانۂ عجائب کی عبارت نہایت مرصع اور پر تکلف ہے۔ داستانِ امیر حمزہ' میں بھی جا بجا اس قسم کی عبارتیں ملتی ہیں لیکن جس انہماک سے اس مصنوعی طرز کو فسانۂ عجائب میں شروع سے آخر تک برتا گیا ہے اس کی مثال اردو میں بہت کم ملے گی۔"

جہاں تک مقامی رنگ کا تعلق ہے وہ دونوں کتابوں میں ہے۔ دونوں نے ہندستان ہی کی فضا میں یہ کتابیں لکھیں اور کامیاب رہے۔ باغ و بہار میں اگرچہ قصہ روم کا ہے لیکن فضا ہندستانی ہے۔ مولوی عبدالحق نے باغ و بہار کے بارے میں لکھا ہے:

"اپنے وقت کی نہایت فصیح وسلیس زبان میں لکھی گئی ہے اور اردو کی پرانی کتابوں میں کوئی کتاب زبان کی فصاحت اور سلاست کے لحاظ سے اس سے لگا نہیں کھاتی۔"

درحقیقت یہی وہ کتاب ہے جس نے اس بات کی نشاندہی کی کہ آئندہ اردو کو کیا ہونا ہے۔ جو راہ باغ و بہار نے دکھائی سرسید اور حالی نے اس کو ہموار کیا اور آج یہی شاہراہ عوام و خواص بنی ہوئی ہے لیکن: فسانۂ عجائب کا دامن باغ و بہار کے دامن کے ساتھ کچھ اس طرح بندھا ہوا ہے کہ باغ و بہار کا نام ذہن میں آتے ہی فسانۂ عجائب کا تصور خود بخود سامنے آجاتا ہے۔" یہ دونوں کتابیں بہت اہم ہیں اگر ایک نے اردو کو عام فہم بنایا تو دوسری نے نئی تشبیہات اور الفاظ سے مالا مال کیا۔

★

مدن پرتاپگڈھی

معجزہ

رگِ حیات میں فاسد لہو کے بہنے سے
شعور و فکر کی سب قوتیں ہوئیں مفلوج
ہر آن ملنے لگا پھر، مذاقِ شر کو عروج

کچھ اس طرح سے چلیں مفسدوں کی تحریکیں
رگوں میں زیست کی پھیلا تمام زہر ہی زہر
ہر ایک سمت تھا تقریب حادثات کا قہر

تھے انحطاط پذیر اس طرح سے جاہل ذہن
کہ آفتاب کو مٹھی میں بند کرنے چلے
شکستہ جام میں آبِ حیات بھرنے چلے

شبِ سیہ کے پرستار، ظلمتوں کے امام
رُخِ حیات پہ پھیلا رہے تھے موت کا رنگ
مگر خود ان کی ہی قسمت پہ لگ رہا تھا زنگ

دیا ردانش و حکمت کچھ اس ادا سے کھلا
کہ سوچ بھی نہ سکے جس کو ظلمتوں کے نقیب
انھیں ڈبو گئی، ان کے ہی ذہن کی تخریب

وطن فروشوں کی سازش نہ کامیاب ہوئی
امینِ عظمتِ بھارت ہیں اندرا گاندھی
کہ ان کا دستِ حنائی ہے دستِ فولادی

غزل

ڈاکٹر منشاء الرحمٰن خان منشاؔ

زخم کے پھول بصد ناز کھلائے رکھیے
رشکِ گلشن یونہی سینے کو بنائے رکھیے

کیا خبر خانۂ دل میں کوئی کب آجائے
اس کو ہر وقت سلیقے سے سجائے رکھیے

آتی جاتی ہوئی سانسوں کو بڑے چاؤ کے ساتھ
یادِ محبوب کی خوشبو سے بسائے رکھیے

گھپ اندھیرا سا ہے چھایا ہوا جیون پتھ پر
دیکھیے پیار کی قندیل جلائے رکھیے

لگ نہ جائے اسے بد دزمانے کی نظر
خوشنما غم جو ملے اس کو چھپائے رکھیے

لطفِ ہستی کی حقیقت میں تمنا ہے تو پھر
روح کو غم کی صلیبوں پہ چڑھائے رکھیے

بزمِ ساقی کے بھی آداب ہوا کرتے ہیں
جام خالی سہی ہونٹوں سے لگائے رکھیے

لب ہلانے سے دعاؤں کا بھرم کھلتا ہے
مانگنا ہے تو فقط ہاتھ اٹھائے رکھیے

آندھیاں لاکھ چلیں راہِ طلب میں منشاؔ
عزمِ محکم سے قدم اپنے جمائے رکھیے



مزاحیہ

استادِ محترم

عزیز مراد آبادی

سائنس کا یہ اصول ہے کہ جتنے زیادہ ٹکڑوں میں منقسم کیا جائے ان کی قوت اتنی ہی زیادہ بڑھتی جاتی ہے۔ اسی زریں اصول کے تحت ایٹم بم کی ولادت سعید ہوئی جس نے اپنی طاقت کا تاریخی مظاہرہ ہیروشیما اور ناگاساکی کے حسین طول و عرض میں کیا تھا۔ اب تو اس سائنسی اصول کی صداقت کے ثبوت کے لیے ہائیڈروجن بم بھی پیش کیا جا سکتا ہے ــــ شاید اسی اصول کی نقل کر کے اردو ادب نے بھی ادبی اصول وضع کر لیا ہے۔ اردو جیسے مہتاب و آفتاب نما ذرہ کو روز بروز ٹکڑوں میں منقسم کر کے اردو شاعری کی طاقت کو مزید تقویت پہنچائی جا رہی ہے۔ نتیجہ کے طور پر ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم کی طرح شعرائے کرام بھی عالمِ وجود میں آ رہے ہیں۔ یہ اصولی عمل پچھلی ربع صدی سے انتہائی لگن اور خلوص کے ساتھ جاری و ساری ہے ــ سائنسی اور ادبی اصول میں فرق صرف اتنا سا ہے کہ ایٹم بموں کی تعداد کے مقابلے میں شاعر کئی صد گنا پروڈیوس ہو رہے ہیں۔ شاعروں کے ایک سیلاب میں ہم بھی اوندھے منہ گر کر ایک بار بڑی آن بان کے ساتھ بہہ نکلے تھے۔

اگر ہمیں ایک استاد نما شاعر سہارا نہ دیتے تو بہت ممکن تھا اس تنکے کے سہارے کی عدم موجودگی میں ہم غرقابِ شاعری ہو کر اپنا ادبی تشخص ہمیشہ کے لیے ڈبو بیٹھتے اور شاعری کا بھوت ہمارے سر پر منڈلاتا۔ مگر جب گیدڑ کی شامت آتی ہے تو اس کے بھاگنے پر کوئی پابندی کیوں عائد کرے! ؟ ہمارے استاد نے ہمیں اشارہ کیا اور ہم ان کی طرف دوڑ پڑے۔ انھوں نے ہماری چند ابتدائی غزلوں پر حقِ اصلاح جتا کر وہ غزلیں اپنی تحویل میں لے لیں اور جلد ہی اصلاح کے بعد سپردِ خاک کر دیں۔ ہم نے ان کی ہدایات کے مطابق ان مسخ شدہ غزلوں کو کئی کئی بار ترنم کے ساتھ پڑھا، یہاں تک کہ وہ ہمیں ازبر ہو گئیں۔ اس طرح ہم چند گھنٹوں کے خون پسینے کے بعد مستند شاعر بن بیٹھے۔ استاد نے جب اپنے شاگردِ رشید میں بے پناہ صلاحیتوں کا طوفان امنڈتا دیکھا تو ان سے رہا نہ گیا اور ہمارے اعزاز میں ایک عدد خصوصی نشست کا اہتمام اپنے ہی دولت کدہ پر فرمایا جس کا سارا بار از روئے اردو قانون، ہماری خمیدہ کمر پر لاد دیا گیا تھا۔ ہم بھی اس بھاری بھرکم بوجھ سے "چیں" اس لیے نہیں بولے تھے کہ نئے ذوق اور نئی بیوی کے حضور جان تک قربان کر دینے کا ولولہ دل میں موجزن رہتا ہے ــــ لیکن نشست کے اختتام پر، سامعین و شعراء ایں جناب کو بحیثیت شاعر جانتے ہوں یا نہ جانتے ہوں البتہ ہمارے استادِ محترم کو بحیثیت استاد ضرور جان گئے تھے۔ استاد کو ہماری پبلسٹی کرنے سے اس قدر فائدہ تو ضرور پہنچا تھا کہ کئی ایرے غیرے کاسۂ شاگردی لے کر ان کی خدمت میں جلد ہی حاضر ہو گئے تھے، جس سے ان کا مرتبہ استاد الشعراء تک اوپر اٹھ گیا تھا اور ان کی اہمیت و حیثیت گلی کوچوں میں شہرت کے کاندھوں پر سوار ہو کر گشت کرنے لگی تھی۔ اس خشتی اہمیت کے حامل استاد نے ہمیں پہلے پہل سے کا جاہل خیال کر کے فنِ شاعری کے ایسے ایسے نکات و رموز سے آگاہ کیا کہ ہم اپنی عقل کے سارے گھوڑے کھولنے کے باوجود بھی انھیں ہضم نہ کر سکے اور نتیجتاً ایک سوالِ معمہ کا روپ دھار کر ہمارے اور

استاد کے درمیان دیوارِ چین بن کر کھڑا ہو گیا تھا۔

سوال یہ تھا کہ استادِ محترم شاعری کے خود ساختہ اصولوں پر اڑے ہوئے تھے یا فنِ شاعری سے ہماری ہی طرح کورے تھے؟ اور معمہ یہ تھا کہ ہم استاد کی نظر میں کہیں ناقص العقل اور گاؤدی قسم کے شاعر تو نہیں تھے؟ — یہ مکروہ دیوار اس وقت زیرِ تعمیر آئی تھی جب ہم نے کئی بار استاد سے شاعری کی باریک باتوں کا تسلی بخش جواب پانے کا مطالبہ کیا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ ہم بھی نرے جاہل تو تھے نہیں کہ ان کی اوٹ پٹانگ علمی و فنی معلومات کو بھی ہاضمے کا چورن سمجھ کر چاٹتے رہتے۔ ہمیں جس گھڑی جس جگہ کوئی الجھن محسوس ہوتی تو ہم سرگرمِ شعرگوئی ذہن کو تسکین بہم پہنچانے کی درخواست کرتے اور ہمارے استادِ محترم دو چار اِدھر اُدھر کی غیر ضروری باتیں کر کے ہائیں ہائیں کرنے لگتے — اس غیر یقینی صورتِ حال سے ہمیں سخت مایوسی ہوئی اور ہماری نئی نویلی شاعری کو عظیم دھکا لگا۔ کامیابی و کامرانی بحرِ شعر کے ساحل پہ کھڑے ہو کر ہمیں منہ چڑھانے لگی۔ اس نازک صورتِ حال کے باوجود بھی ہم نے ازروئے احترامِ استاد سے نگاہ نہ پھیری اور خالی مولی استاد شاگردی کا چکر چلنے دیا۔ لیکن ہمارے استاد تاڑنے کے معاملے میں قیامت کی نظر رکھتے تھے۔ ہماری نالائقی کو فوراً سونگھ لیا اور اپنی خصوصی توجہ ہماری بے سروپا شاعری سے ہٹا کر اپنا اعزا کی شاعری پر مرکوز کر دی اور ہمیں ایسا محسوس ہوا جیسے منوں بوجھ ہمارے ذہن پر سے ہٹا دیا گیا ہو۔ اس حادثہ کے بعد ہماری طبیعت کا رجحان پھر سے نثر نگاری کی طرف ہو گیا تھا جو فطری طور پر ہمارا مزاج تھا اور ہم پھر سے میدانِ نثر میں قلمی گھوڑے دوڑانے لگے تھے۔ ہمارے استاد جب بھی ہماری کوئی نثری تخلیق کسی رسالے میں دیکھتے تو نفرت سے یوں منہ پھیر لیتے جیسے کسی پاگل اور گندی لڑکی کو برہنہ دیکھ لیا ہو! بقول معتبر راوی انھوں نے بارہا ہماری نثری تخلیقات کو "واہیات" کے ٹائیٹل سے بھی نوازا تھا۔ مختصر یہ کہ ہم نا اہل شاعر اور نا قدرے شاگرد ہونے کی وجہ سے استادِ محترم کے تیزابی غصے سے کہاں تک بچتے!؟ پھر بھی ان کی بھلمنساہت، بردباری، انکساری، استقلال اور خوش مزاجی کا یہ عالم تھا کہ ہم سے ہمیشہ بحیثیت رفیق و شفیق استاد کے ہی ملا کرتے تھے اور استادانہ عظمت کا احساس دلانے کے لیے کبھی کبھار ہم سے پوچھ بھی لیا کرتے تھے "کہو بھئی! کوئی نئی چیز نکالی کہ نہیں؟" ہم جواباً سفید براق جھوٹ اگل دیتے "جی ہاں! ایک تازہ غزل عجلت میں نکل آئی تھی جو نکلتے ہی سیدھی ایک رسالے کے دفتر میں پہنچ گئی ہے۔"

"ماشاء اللہ، ماشاء اللہ! ذرا سناؤ تو کچھ شعر؟" وہ خندہ پیشانی کے ساتھ فرماتے۔

"لفظ بہ لفظ، بحر بہ بحر اور ردیف بہ ردیف تو پورے یقین کے ساتھ یاد نہیں رہے ہیں البتہ اس وقت کچھ دھندلا سا عکس ذہن کے گوشے میں محفوظ ہے۔ اگر آپ فرمائیں تو عرض کروں؟" ہم بے جا کسرِ نفسی سے شرما کر پھر جھوٹ کا بول بالا اور سچ کا منہ کالا کرتے۔

"ارے بھائی! چاول کا ایک دانہ دیکھ کر پکنے نہ پکنے یا گلنے نہ گلنے کا اندازہ کر لیا جاتا ہے۔ یہ تو پتہ چل ہی جائے گا کہ کس قدر فکر کی بلندی کو چھو کر اشعار نکالے گئے ہیں!" وہ استادانہ وقار اور ٹھسے کے ساتھ فرماتے۔

"تو عرض ہے۔ ملاحظہ فرمائیے ....." کہہ کر ہم کہیں کا اینٹ کہیں کا روڑا جوڑ کر ان کی خدمتِ اقدس میں پیش کر دیتے۔ ہماری اس نازیبا حرکت کی وجہ سے وہ مکمل شعر پر تو نہیں البتہ شعر میں شامل ایک دو الفاظ پر ضرور بھڑک اٹھتے تھے۔ اس انداز دلیرانہ سے بھڑک اٹھنے کی وجہ بھی ظاہر ہے، نہایت ہی معقول تھی۔ بھڑکنے کے بعد جب ذرا پرسکون ہوتے متانت کا غازہ چہرۂ پرنور پر مل کر ارشاد فرماتے —

"اصلاح کے بغیر غزل کسی رسالے کو بھیجنا اچھی بات نہیں ہے۔ اپنی ساکھ خراب کرنا ہے۔ ذرا سی غلطی سارے کیے دھرے پر جھاڑو پھیر دیتی ہے۔"

"استاد! میں نے عرض کیا کہ غزل عجلت میں وارد ہوئی تھی۔ اگر اطمینان و یکسوئی کے عالم میں عالمِ وجود میں لائی جاتی تو یقیناً آپ کی خدمت میں پیش کی جاتی۔ مجبوری کے آگے تو رستم کی بھی نہ چلی تھی جس نے اپنے بیٹے سہراب کو اپنے ہی ہاتھوں سے تہہ تیغ کر ڈالا تھا:" ہم اپنی فطرت سے مجبور ہو کر ہلکا سا مذاق فرماتے تو وہ جیبیں

بہ جبیں ہو کر صرف اتنا کہتے اور خاموش ہو جاتے: "ارے! ہمارا کام تو تمھاری رہنمائی کرنا ہے۔ سیدھی راہ چلو یا نہ چلو یہ تمھارے اختیار میں ہے۔ ہاں، اتنا دھیان رکھنا کہ شاگرد کی بدنامی کے ساتھ استاد کی پگڑی نہ اُچھلنے پائے!"

ایک دن اچانک خلاف توقع استاد محترم کا نوکر ہماری خدمت میں نازل ہوا اور بجانب استاد مذکور ڈنر (DINNER) پر مدعو کیا گیا۔ اس طرح کی غیر ضروری دعوت کا ہمارے لیے یہ پہلا موقع تھا۔ ہم نے کان بہت کھڑے کیے۔ دعوت کی اہمیت و ضرورت کو ہر پہلو سے دیکھا، غور کیا۔ آخر کار اس کہنہ نتیجہ پر پہنچے کہ استاد نے کوئی معرکتہ الآرا غزل وغیرہ کہہ ڈالی ہوگی جسے سننے کے لیے کوئی معقول یا نامعقول سامع میسر نہ آیا ہوگا — جی میں تو ہمارے آیا تھا کہ سمع خراشی سے بچنے کے لیے گول کر جائیں دعوت کو! لیکن معاملہ دعوت کا تھا یعنی مرغن غذاؤں سے پیٹ بھرنے کا! اور ظاہر ہے پیٹ بھرنے کے لیے سارا کارخانۂ حیات سرگرم عمل ہے۔ پیٹ کا مسئلہ نہ رہے تو دنیا کی ساری رونقیں ایک دم بجھ کر رہ جائیں گی۔ اس عالمگیر حقیقت کے رعب میں آ کر ہم نے دعوت اُڑانے کا قطعی فیصلہ کر لیا اور یوں بھی استاد کی دعوت شاگرد اڑائے۔ بلّی کے بھاگوں آج کل چھینکے بھی شاذ و نادر ہی ٹوٹتے ہیں۔

اپنی خاطر تواضع کرانے کے بعد ہم نے کھانے کے لذیذ آئیٹم کی بلا امتیاز، ضرورت سے کچھ ہی زیادہ تعریف کی ورنہ کھانا جیسا تھا اسے ہماری قوتِ ذائقہ خوب جانتی ہے — ! تعریف و توصیف کے بعد جواباً استاد نے ہمارا شکریہ رسماً مخصوص انداز میں اس طرح ادا کیا جیسے ہم نے ان کی غزل کو سراہا ہو! بعد از رسم و رواج کام کی باتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔

"بھئی! ماشاء اللہ خوب لکھ رہے ہیں آج کل تو! ایک ہفتہ قبل تمھاری غزل بھی کسی پرچے میں نظر سے گزری تھی جس میں کلام کی پختگی، فکر کی بلندی اور اسلوب کی شستگی پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر تھی۔ نثر نگاری میں تو لگتا ہے برسوں ثانی نہ پیدا ہو سکے گا تمھارا! مجھے بڑی خوشی ہے کہ میرا کوئی تو شاگرد ہے جو ترقی کی بلندیوں پر بے تکان چڑھتا چلا جا رہا ہے . . . . . !" لیکن حقیقت یہ تھی کہ چند نثری تخلیقات کے علاوہ ہماری ایک بھی معیاری یا غیر معیاری غزل مہینوں سے شائع ہی نہیں ہوئی تھی۔ ہم نے دل ہی دل میں قہقہہ لگاتے ہوئے منکسر المزاجی کے ساتھ عرض کیا۔

"قبلہ! یہ سب آپ کے فیض کی برکات ہیں ورنہ خاکسار کو تو شعر پڑھنا تک نہیں آتا۔ رہا نثر نگاری کا معاملہ تو اس میدان میں میں نے قدرت کے آگے زانوے ادب تہہ کیے ہیں — میں نے بھی حال ہی میں آپ کے کلام کے نادر نمونے دیکھے ہیں جو سبھی لاجواب و لافانی ہیں . . . !" ہم نے بھی کورا جھوٹ ارشاد کیا — ترکی بہ ترکی جھوٹ بولنے میں مضائقہ بھی کیا تھا!

"اور سناؤ! ادبی مشغولیات کا کیا حال ہے؟ اب تو بہت سے رسالوں سے راہ و رسم ہو گئی ہوگی!" انھوں نے یونہی پوچھ لیا تھا کہ کچھ نہ کچھ تو بات چیت کو آگے بڑھانے کے لیے چاہیے تھا۔

"آپ کی دعا سے اچھی خاصی جان پہچان سی ہو گئی ہے!" ہم نے سچ بولنے کی ذرا سی کوشش کی، اور ایسے سچ کو آنچ ہی کب آتی ہے جس میں متکلم کی شان بڑھتی ہو!

"خوب، بہت خوب! میں نے حال ہی میں مختصر طور پر اپنی سوانح حیات اور خصوصیات کلام کو لے کر ایک مقالہ سپرد قلم کیا ہے۔ چاہتا ہوں تمھارے نام سے شائع ہو جائے۔ اس طرح تمھاری شہرت و اہمیت کو چار چاند لگ جائیں گے۔ لوگ تمھیں مقالہ نگار کی حیثیت سے بھی جان لیں گے۔ کیا رکھا ہے بھلا افسانہ نویسی اور مزاح نگاری میں!؟ ارے، مقالہ نگار بنو تا کہ کسی بھی شخصیت پر بے جھجک قلم اٹھا سکو اور نام کما سکو . . . !" استاد محترم نے دعوت کی غرض و غایت پر بھرپور روشنی ڈالی تو ہمارے ذہن میں شعلے سے لپک اٹھے۔ دل چاہا کہ اپنے حلق میں انگلی ڈال کر سارا کھایا پیا اگل دیں، لیکن ہماری سعادت مندی کے جذبے نے ہمیں اس کارروائی سے باز رکھا۔ لہٰذا ہم نے احتراماً "ہاں" کہہ دی۔ سنتے آئے ہیں کہ استاد کا درجہ قطب مینار سے بھی بلند ہے۔ اس

(باقی صفحہ ۳۴ پر)

مخمور سعیدی

غزل

بیتے موسم جو ساتھ لاتی ہیں
وہ ہوائیں کدھر سے آتی ہیں

سُن رہا ہوں یہ آہٹیں کیسی
جو اُبھرتے ہی ڈوب جاتی ہیں

گھر سے کیا سیر کے لیے نکلیں
رونقیں اب تو دل دُکھاتی ہیں

دور تر تجھ سے ہو گئے تو کھُلا
قربتیں فاصلہ بڑھاتی ہیں

جو امیدیں تھیں روشنی دل کی
غم کی آندھی میں بجھتی جاتی ہیں

دن نکلتا نظر نہیں آتا
اور راتیں گزرتی جاتی ہیں

آ رہی ہے گھڑی زوال کی پھر
خواہشیں دل میں سر اٹھاتی ہیں

روشنی میں بھٹکنے والوں کو
ظلمتیں راستہ دکھاتی ہیں

میری شوریدگی کا افسانہ
اس کی خاموشیاں سناتی ہیں

دل کے مرقد پہ اب بھی کچھ یادیں
حسرتوں کے دیے جلاتی ہیں

جو بھلا دیں سبھی نے اے مخمورؔ
مجھ کو باتیں وہ یاد آتی ہیں

عروج سلولوی

قدم مِلا کے چلو

وطن کو آج ضرورت ہے کیا بتا کے چلو   پکار وقت کی جمہور کو سُنا کے چلو
دلوں سے جذبۂ تفریق کو مٹا کے چلو   چلو تو مشعلِ راہِ وفا جلا کے چلو
قدم قدم پہ قدم سے قدم ملا کے چلو

زباں پہ امن و مساوات کا فسانہ ہو   وطن کی دل میں لگن قوم کا ترانہ ہو
غرض ہر ایک سے برتاؤ دوستانہ ہو   جو ہیں غریب انھیں بھی گلے لگا کے چلو
قدم قدم پہ قدم سے قدم ملا کے چلو

اب اونچ نیچ کے جھگڑے نہ باقی آ نہ سکیں   جو زور دار ہیں کمزور کو دبا نہ سکیں
چراغ زیست غریبوں کے جھلملا نہ سکیں   ذرا خلوص و محبت کی لو بڑھا کے چلو
قدم قدم پہ قدم سے قدم ملا کے چلو

کہاں ہے اب وہ زمیندار کی زمینداری   مجال کیا جو کوئی لے کسی سے بیگاری
سب اپنے ظلم و تشدد سے ہو گئے عاری   یہ ہم نہ کہتے تھے قصرِ غرور ڈھا کے چلو
قدم قدم پہ قدم سے قدم ملا کے چلو

اب اپنے دیش میں قانون بن گیا ایسا   طلسم ٹوٹ گیا بے زمیں کی کھیتی کا
بس ایک ضرب نے غربت کی جڑ کو کاٹ دیا   ہر اک کو باغِ ترقی کا پھل چکھا کے چلو
قدم قدم پہ قدم سے قدم ملا کے چلو

کسان بن کے تمہیں کامیاب ہونا ہے   طرح طرح کی ترقی کا بیج بونا ہے
تمھارے دیش کی مٹی نہیں ہے سونا ہے   جفاکشی کی کسوٹی پہ آزما کے چلو
قدم قدم پہ قدم سے قدم ملا کے چلو

یہاں بہار بھی ساقی بھی اور جام بھی ہے   نظر نواز نظارہ کا اہتمام بھی ہے
بہارِ صبحِ بنارس اودھ کی شام بھی ہے   وقارِ دیش کا شانِ وطن بڑھا کے چلو
قدم قدم پہ قدم سے قدم ملا کے چلو

پیام درسِ عمل تھا خیال باپو کا   عروجؔ لعل و جواہر ہے قول نہرو کا
قدم ملا کے چلو میں اثر ہے جادو کا   تمھیں بھی چاہیے نعرہ یہی لگا کے چلو
قدم قدم پہ قدم سے قدم ملا کے چلو

احمد ابراہیم علوی

انگلستان میں اردو

آج ہندستان میں اردو کے حق میں ایسے حالات ہیں کہ بڑے بڑے یاس پسند بھی کہنے لگے ہیں کہ اب اردو کے اچھے دن آ گئے ہیں اور یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت بھی ہے۔ واقعی آج اردو کے سلسلے میں حالات جتنے سازگار ہیں اتنے گذشتہ ۲۷ برسوں میں کبھی نہیں رہے۔ لیکن اس صورتِ حال کے علاوہ ایک حقیقت یہ بھی نمایاں ہوتی ہے کہ اب اردو صرف ہندستان اور پاکستان میں ہی نہیں بولی اور سمجھی جاتی بلکہ اس نے اپنی جڑیں برطانیہ، امریکا، کینڈا اور روس تک پھیلا دی ہیں اور اب ہر جگہ اس کے شیدائی موجود ہیں۔

برطانیہ میں کچھ اس طرح اردو فروغ پا رہی ہے کہ ہندستان میں رہنے بسنے والے افراد کے لیے اس کے بارے میں کچھ سن کر یقین کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے ظاہر ہے کہ کوئی بھی یہ آسانی سے قبول کرنے کو تیار نہیں ہوگا کہ برطانیہ میں جگہ جگہ اردو کے سائن بورڈ نظر آتے ہیں اور ان پر جلی حروف میں "حلال گوشت" یا "مرغِ مسلم" یا "مغل کری" لکھا ہوا ہوتا ہے اکثر و بیشتر چیزوں کے پیکٹوں پر صرف اردو ہی میں چھپا ہوا ہوتا ہے ٹریفک ہدایات کا کتابچہ اردو میں بھی ہوتا ہے۔

راقم الحروف نے عام طور سے گھروں میں استعمال کیے جانے والے گھی کے ڈبے کو ہمیشہ بڑی دلچسپی اور توجہ سے دیکھا جس پر سب کچھ اردو ہی میں چھپا ہوتا ہے حتیٰ کہ اس کا نام بھی اردو میں ہوتا ہے۔ اردو میں چھپے کلنڈر اور ڈائریاں بھی توجہ کا مرکز بنتی ہیں۔

سات سمندر پار لندن، بریڈ فورڈ، شفیلڈ، برمنگھم، نیو پورٹ، کارڈف، اور برسٹل جیسے بڑے بڑے شہروں میں اردو کے جاننے اور سمجھنے والے اتنی کثیر تعداد میں موجود ہیں کہ اردو ایک طرح سے رابطے کی زبان بن گئی ہے۔ اگر لندن میں آپ کسی سے اردو میں مخاطب ہوں تو کوئی عجب نہیں کہ آپ سے ہمکلام ہونے والا خالص انگریز آپ کو آپ سے بہتر اردو اور لہجے میں جواب دے۔ شہر کے بڑے بڑے بازاروں میں آپ کو جابجا اردو کے سائن بورڈ نظر آئیں گے اور اکثر لوگ "اردو" ہی بولتے ملیں گے۔ ساؤتھ ہال تھیمز وائی نیوپورٹ کے پشت کے علاقے کے علاوہ ویسٹ منسٹر برج، پیکیڈلی یا ٹرا فلگر اسکوائر پر آپ کو خصوصیت سے اردو سمجھنے والے دستیاب ہو سکتے ہیں اور یہ صرف ہندستانی یا پاکستانی تارکینِ وطن نہیں ہوں گے بلکہ مقامی باشندے بھی ہوں گے۔ یہاں اردو بولنا کسرِ شان نہیں ہوتا کیونکہ یہاں کے لوگ یہ جانتے ہیں کہ اردو ایک تہذیبی زبان ہے اور دنیا میں اس کے بولنے والوں کی ایک بڑی تعداد ہے۔

لندن یونی ورسٹی میں باقاعدہ ایک اردو شعبہ ہے جس کے صدر مسٹر رالف رسل ہیں جو ہندستان کے اردو داں طبقے کے لیے ایک جانی پہچانی شخصیت ہیں کیونکہ انھوں نے

صدر شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ڈاکٹر خورشید الاسلام کے ساتھ مل کر اردو میں تحقیقی اور تنقیدی نوعیت کا خاصا کام کیا ہے وہ ہندوپاک کی سیاحت کر چکے ہیں اور دونوں ممالک کے ممتاز اردو ادیبوں اور شاعروں سے ان کے گہرے تعلقات بھی ہیں۔ عرصہ ہوا کہ میں ان سے ملا تھا اور میں نے ان سے پوچھا تھا کہ آخر لندن میں لوگ کیوں اردو پڑھتے ہیں انھوں نے جواب دیا تھا کہ اس کے کئی اسباب ہیں۔ پہلا تو یہ کہ دوسری زبانوں کی طرح اردو سے بھی لوگوں کو دلچسپی ہے اور وہ اس کو اپنی معلومات میں اضافے کے لیے پڑھتے ہیں دوسرے یہ کہ وہ ہندستان یا پاکستان کی سیاحت کرنا چاہتے ہیں اور وہ وہاں گونگے بہرے بن کر نہیں رہنا چاہتے تیسرے یہ کہ لڑکیاں اس لیے بھی اردو پڑھتی ہیں کہ وہ ہندستانی یا پاکستانی مردوں سے شادی کرنے میں دلچسپی رکھتی ہیں۔

برطانیہ میں لندن کے علاوہ دوسری یونیورسٹیوں میں بھی اردو تعلیم کا معقول انتظام ہے اور جہاں بھی لوگ اس کی تعلیم میں دلچسپی دکھاتے ہیں اس کا ضروری بندوبست کر دیا جاتا ہے۔

ایسے قابل ذکر اردو ادیبوں اور شاعروں کی بھی برطانیہ میں معقول تعداد ہے جن کو ہندستان کے رسائل میں نمایاں جگہ ملتی ہے۔ یہ لوگ لندن، بریڈ فورڈ، برمنگھم اور نیوپورٹ جیسے شہروں میں رہتے ہیں۔ ان میں زیادہ تر تارکین وطن ہیں بعض بعض تو ہندستان اور دوسرے ملکوں سے ہی شہرت ساتھ لے کر آئے تھے اور بعض نے یہیں آ کر ابتدا کی اور اب مقبول اور مشہور ہو گئے ہیں۔ ان کے مضامین، افسانوں اور کلام کے مجموعے یہیں سے بہت ہی خوب صورت اور نفیس مجلد زیب شائع ہوتے ہیں جو بہ آسانی فروخت ہوتے ہیں۔

بی بی سی ٹیلی ویژن پر ہفتے میں دو بار ایشیائی تارکین وطن کے لیے آدھ گھنٹے کا پروگرام ہوتا ہے جسے بہت دلچسپی سے دیکھا جاتا ہے۔ اس کی زبان صاف اور شستہ اردو ہوتی ہے کبھی کبھی مشاعرہ بھی ہوتا ہے۔ ہندوپاک سے آنے والے شاعروں اور ادیبوں سے انٹرویو بھی لیا جاتا ہے اور قابل ذکر کتب کا تعارف کرایا جاتا ہے یا ان پر تبصرہ ہوتا ہے۔

برطانیہ سے اردو میں روزنامے، ہفت روزہ اور ماہنامے بھی بڑی تعداد میں شائع ہوتے ہیں جو سب کے سب فوٹو آفسیٹ کے ذریعے طبع ہوتے ہیں اور ان کا حلقۂ اثر کافی وسیع ہوتا ہے۔ ان میں روزنامہ جنگ ہفت روزہ اخبار وطن، ہفت روزہ ملاپ ماہنامہ پیغام وغیرہ قابل ذکر ہیں جو لندن میں اور بڑے بڑے شہروں میں کتب فروشوں سے بہ آسانی مل جاتے ہیں۔ یہاں صرف چند نام دیے گئے ہیں ورنہ اس سے کہیں زیادہ اخبار و رسائل شائع ہوتے ہیں۔

برطانیہ میں بسنے والے تارکین وطن اپنے اپنے طور سے اپنے بچوں کو اردو پڑھاتے ہیں اور عموماً ان کے گھروں کا وہی ماحول ہے جو کہ دلّی یا لکھنؤ کا ہوتا ہے۔ ایک بات خصوصیت سے ہندستان میں ان لوگوں کو بتانے کی ہے جو کہ بات بات پر سوال کرتے ہیں کہ وہ اپنے بچوں کو اردو کیوں پڑھائیں، وہ اردو پڑھ کر کیا کریں گے، کیا پائیں گے؟ یعنی دوسرے الفاظ میں ان کے خیال میں اردو تعلیم حاصل کرنا ان کے بچوں کے لیے بے سود ہے کیونکہ ان کو اس سے کوئی مالی منفعت نہیں۔ برطانیہ میں جہاں ظاہر ہے ہر شعبۂ حیات میں انگریزی چھائی ہوئی ہے اردو والے اپنے بچوں کو اردو پڑھاتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ کہتے ہیں ہمارا بچہ لاکھ انگریزی سیکھ جائے فرانسیسی بولنے لگے لیکن جب تک وہ اپنی زبان اردو نہیں سیکھے گا کسی بھی شعبۂ حیات میں کامیاب نہ ہو سکے گا۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کا بچہ اسی وقت ان کا بچہ ہوگا جب کہ ان کی زبان سمجھتا ہو۔ وہ زندگی میں اگر کچھ بھی حاصل کر سکتا ہے تو اردو پڑھ کر ہی حاصل کر سکتا ہے اور ایسا اس لیے ہے کہ اس کی مادری زبان اردو ہے اور بغیر مادری زبان سیکھے ظاہر ہے کوئی بچہ

کتنا ہی ذہین کیوں نہ ہو زندگی میں اتنی کامیابی نہیں حاصل کر سکتا جتنی کہ مادری زبان سیکھنے والا۔ یہ تمام ماہرین تعلیم کا متفقہ فیصلہ ہے اور اسی کو مدنظر رکھ کر برطانیہ میں مقیم غیر ملکی لوگ جن میں ہندستانی بھی شامل ہیں اپنے بچوں کو وقت نکال کر اور کافی بڑی بڑی رقمیں خرچ کرکے اردو سکھاتے ہیں جن کا یہ کارآمد نتیجہ برآمد ہوا ہے کہ اب وہاں باقاعدہ اردو معاشرہ وجود میں آگیا ہے اور اب انگریز بھی اردو کو ایک زندہ اور عوامی زبان تسلیم کرکے اس کو سیکھ رہے ہیں۔ جہاں جہاں تارکین وطن بڑی تعداد میں رہتے ہیں وہاں پر تعینات پولس، پوسٹ مین اور دوسری لازمی خدمات کے تحت آنے والے ملازمین کے لیے اردو کا علم ہونا لازمی شرط ہے۔ اس طرح اردو کی تعلیم ملازمت کے حصول کا ذریعہ بن گئی ہے اور خوب پھل پھول رہی ہے۔

یہ بات ہندستان میں رہنے والے بیشتر افراد کے لیے ناقابل یقین ہوگی کہ برطانیہ میں اٹھارہ اٹھارہ برس سے رہنے والے ایسے ہندستانی بھی موجود ہیں جن کو معمولی سی بھی انگریزی نہیں آتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کو کبھی اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں پڑی کیونکہ ان کا سارا کام کاج بس اردو ہی کے ذریعہ چل جاتا ہے۔

انجمن ترقی اردو برطانیہ اسی طرح اردو کی بہی خواہ انجمن ہے جس طرح انجمن ترقی اردو ہند۔ یہ بڑی مستعدی سے اردو کی ترقی اور ترویج کے لیے کوشاں ہے۔ اس کے زیر اہتمام ادبی نشستیں اور مشاعرے وغیرہ منعقد ہوتے رہتے ہیں۔ ان میں ایشیائی تارکین وطن کے علاوہ مقامی انگریز باشندے بھی بڑے ذوق و شوق سے شرکت کرتے ہیں۔ مشاعرہ جو اردو کی دل فریبی کا باعث ہے یہاں بھی دلوں کو موہ لینے میں کامیاب ہو۔

ہندستانی فلموں اور خصوصیت سے ان فلموں سے جن کی زبان شستہ اردو ہوتی ہے برطانیہ میں بڑی دل چسپی لی جاتی ہے۔ مرزا غالب، مغل اعظم، اور پاکیزہ فلمیں تو شاید ہی کوئی ایسا ہو جس نے نہ دیکھی ہوں اور مشکل سے کوئی ایسا ایشیائی گھر ملے گا جہاں پاکیزہ کے گانے ٹیپ نہ ہوں۔ یہ سب اس لیے ہے کہ لوگ اس کے ذریعے ہندستان کی ترقیوں اور کامیابیوں کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اس کے دیکھنے سے ان کو ہندستانی تہذیب و زندگی کو اچھی طرح سمجھنے کا موقع ملتا ہے۔

صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ برطانیہ میں لوگوں نے محض انفرادی طور سے اپنے بچوں کو اردو سکھانے کا بندوبست کیا ہو بلکہ یہاں جگہ جگہ مکاتب اور مدارس کا ایک جال سا بچھا ہوا ہے۔ ساوتھ ویلز میں نیوپورٹ ایک شہر ہے جس میں ایشیائی باشندوں کی مجموعی تعداد تین ہزار کے قریب ہے وہاں ایک عمارت میں ایک باقاعدہ مدرسہ ہے جس میں اردو تعلیم کا بڑا معقول انتظام ہے۔ وہاں اردو سیکھنے والے بچوں کی تعداد فی الحال ستاسی ہے اور یہ وہ بچے ہیں جو اسکول میں باقاعدہ تعلیم حاصل کرتے ہیں اور شام کو تحصیل کا وقت کم کرکے اردو پڑھتے ہیں ان کے علاوہ اور بھی بہت سے بچے اسکول کے بعد اردو پڑھنا چاہتے ہیں مگر چونکہ برطانیہ میں ایسا ممکن نہیں ہے کہ کم جگہ پر زیادہ طلباء بھر لیے جائیں اس لیے ابھی اردو پڑھنے والے بچوں کی تعداد خود منتظمین نہیں بڑھا رہے ہیں ان کے پاس ایک بڑا ہال ہے جس میں ۸۷ بچے ہی بیٹھ سکتے ہیں۔ منتظمین کسی اور مناسب اور بڑی جگہ کی تلاش میں ہیں جب جگہ مل جائے گی تو وہاں مزید طلباء کو داخلہ مل سکے گا۔

قابل ذکر امر یہ ہے کہ یہ مدرسہ یا اسکول محبان اردو کی انفرادی کوششوں سے چلتا ہے اور اس کے اخراجات بھی وہ بڑی فراخ دلی اور خوشی سے برداشت کرتے ہیں یعنی مدرسین کی تنخواہ وغیرہ۔ اور لطف یہ ہے کہ کسی قسم کا کوئی مسئلہ نہیں پیدا ہوتا۔ ایک مدرس کو ۷۵ پونڈ فی ماہ ملتا ہے (ایک پونڈ تقریباً اٹھارہ ہندستانی روپیوں کے برابر ہوتا ہے)

بچے بڑی خوشی اور دل چسپی سے اردو پڑھتے ہیں اس مدرسے کے علاوہ برسٹل میں بھی ایسا ہی خوش اسلوبی سے چلنے والا مدرسہ ہے اور دو مدارس میں اردو سیکھنے والے بچوں کی خاصی تعداد ہے

لندن، برمنگھم، بریڈفورڈ، شفیلڈ جہاں جہاں بھی اردو کے پرستار ہیں وہاں وہاں انفرادی اور اجتماعی طور سے اردو کی تعلیم کا انتظام ہے۔

ہندستان میں محبانِ اردو کا یہ طریقہ کار ہے کہ انھوں نے اپنا کام بھی حکومت کے لیے چھوڑ رکھا ہے وہ اپنے طور سے اپنے گھر میں اپنے بچوں کو اردو سکھا سکتے ہیں اور اردو کتب، رسائل و اخبارات سے دلچسپی پیدا کرا سکتے ہیں مگر وہ ایسا کبھی نہیں کرتے بلکہ یہی کہتے نہیں تھکتے کہ اردو ختم ہو رہی ہے، اس کے پڑھنے سے نوکری نہیں ملتی، پیسہ نہیں ملتا۔ اس کے برعکس برطانیہ میں لوگ انفرادی اور اجتماعی دونوں صورتوں میں اردو کی ترویج و اشاعت میں لگے ہوئے ہیں۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ سب کوششیں بے لوث ہیں۔ نوکری ملنے، شہرت پانے یا کسی اور لالچ کے لیے نہیں بلکہ اس لیے کہ اس کے ذریعے ان کے رشتے ان کے ملک اور ان کی قوم سے مضبوطی سے وابستہ رہیں گے اور ان کے بچے اپنے عظیم تہذیبی، ثقافتی اور قومی ورثے سے محروم نہ ہو سکیں گے دراصل یہی جذبہ ہے جو زبانوں اور قوموں کو زندہ رکھتا ہے اور یہ جذبہ برطانیہ کے ہندستانیوں میں موجود ہے تو پھر خود ہندستان میں یہ جذبہ کیوں نہیں پیدا ہو سکتا کیونکہ اردو ہندستان کی زبان ہے، اس کو ہندستان میں جنم لینے اور پروان چڑھنے پر فخر حاصل ہے۔ حکومت تو جو کچھ کر سکتی ہے کر رہی ہے مگر ہمیں بھی تو کچھ کرنا چاہیے۔

★

اُستادِ محترم ۔ (صفحہ ۲۹ کا بقیہ)

۔۔۔بلندی کی ہیئت ہمارے تخریبی ارادوں پر دیمک کی طرح چٹ گئی۔

"بس تو یہ لو مسودہ! نظر ڈال لو، جو بات سمجھ میں نہ آئے مجھ سے پوچھ لو اور کسی اچھے سے پرچے کو بھیج دو۔" انھوں نے ایک بوسیدہ اور گرد آلود میز کی دراز سے مڑے تڑے کاغذ کے چند چیتھڑے نکال کر ہماری طرف بڑھا دیے۔ ہم نے ان ردّی کاغذات کو چند ثانیے تک تو پاگلوں کی طرح بہ نظرِ غایت گھورا اور مواد کو پڑھنے کی جد و جہد میں جٹ گئے۔ مگر خدا کی پناہ ــ خط (تحریر)، خطِ شکستہ کے بھی ٹیڑھے میڑھے چہرے پر بھرپور طمانچہ تھا۔ ہم پورے وثوق کے ساتھ چیلنج کر سکتے ہیں کہ اس دور کا کوئی ماہرِ فن منشی یا مقرر بھی اس منفرد تحریر کو جھٹکے لے کر پڑھے گا بلکہ بہت سے الفاظ سے تو الجھ کر قلابازیاں بھی کھا جائے تو بعید از قیاس نہیں ــــ مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق ہم نے یوں توں کر کے اس مسودہ کو سمجھا، عبارات کو ٹٹولا تو پتہ چلا کہ ہم نے اقبال یا غالب کی سوانح عمری کا سیر حاصل مطالعہ کیا ہو بالخصوص کلام اتنا معیاری لگا کہ آج تک اس پایہ کا قادر الکلام شاعر ابھی پیدا ہی نہیں ہوا ہے ۔۔۔۔۔ ! اس انکشاف کے بعد ہمارا غصہ کئی سو ڈگری ہائی (۱۹۸۸) ہوا، لیکن ہم نے شانِ بے نیازی سے غصہ کو شربت انار سمجھ کر پی لیا اور ان کاغذات کو تہہ کر کے اندر کی جیب میں ٹھونس لیا ــــ مضمون گرانمایہ کو چھپوانے کے لیے استادِ محترم اور ہمارے درمیان عاشق و معشوق کی طرح عہد و پیمان ہوئے۔ پھر ہم انھیں بحالتِ مجبوری جھوٹی تسلیوں کے کھلونوں سے بہلا کر اپنے غریب خانے کو کسی امیر و کبیر کی طرح لوٹ آئے تھے۔

ہم اب تک سوچ رہے ہیں کہ مذکورہ مقالہ کو کسی رسالے میں اشاعت کے لیے بھیجنے سے پہلے ہمیں خود کو کسی اتفاقیہ امراض کے اسپیشلسٹ کی خدمت میں حاضر کرنا پڑے گا ــــ ایک طرف تو اپنے فاطر العقل قرار دیے جانے کا ڈر اور دوسری طرف استادِ محترم کے پے در پے شکایت آمیز تقاضوں نے ہماری زندگی کے سکون کو درہم برہم کر کے رکھ دیا ہے۔ اس لیے ہم ہر اس مدیر کرام سے دست بستہ درخواست کرتے ہیں جو اس مضمون کو پڑھنے کی غلطی سے دوچار ہو رہا ہو کہ بھائی اگر آپ کو ہماری ذات سے اُردو پر سفیدی کے برابر بھی ہمدردی ہو تو ہمیں فوراً لکھیں تاکہ ہم وہ مسوّدہ اوریجنل فارم (ORIGINAL — FORM) میں برائے اشاعت، خود ہی بہ نفسِ نفیس لے کر خدمت میں حاضر کر سکیں!

★

تابشؔ پرتاپگڈھی

پیغام

دَور باقی نہیں اب رات کی عیاری کا
خاتمہ ہو چکا تخریب کی مکاری کا
ساتھیو جاگو کہ اب وقت پکارے ہے تمھیں
فرض ہے تم پہ گلستاں کی نگہداری کا

وقت کے ساتھ قدم تم کو ملانا ہوگا
رہِ تعمیر سے روڑوں کو ہٹانا ہوگا
اک نئی صبح نے گلشن میں قدم رکھا ہے
خواب خرگوش سے لوگوں کو جگانا ہوگا

تم کو دنیا کو دکھا دینی ہے اپنی جرأت
کھولنا ہے کچھ اس انداز سے باب حکمت
شر پسندوں کو سرافرازی میسر بھی نہ ہو
یوں دکھانی ہے تمھیں فہم بشر کی طاقت

ہر سفینے کو کنارے سے لگاتے جاؤ
گر گیا ہو جو بشر اس کو اٹھاتے جاؤ
قومی یکجہتی سے ممکن ہے چمن کی تشکیل
نفرت و بغض کی دیوار گراتے جاؤ

کل کا سورج نئی سوغات لیے آئے گا
نور ہی نور ہر اک سمت بکھر جائے گا
روشنی امن کی پھیلے گی زمانے بھر میں
ہر نفس دہر میں پیغام سکوں لائے گا

آفتاب نقوی سہسوانی

آج کل

یہ اندرا کے دور کا احساں ہے آج کل
ہندوستاں پہ رحمتِ یزداں ہے آج کل
پھر وہ نگاہِ ناز مہرباں ہے آج کل
دنیائے عشق گویا غزل خواں ہے آج کل

چہروں پہ اب اُداسی کا کوئی نشاں نہیں
ہر فرد اپنے حال میں شاداں ہے آج کل
کلیوں پہ آب و رنگ تو غنچوں پہ ہے نکھار
گلشن میں ایک جوشِ بہاراں ہے آج کل

بادِ خزاں کا خوف نہ برقِ ستم کا ڈر
محفوظ ہر بلا سے گلستاں ہے آج کل
شورش نہیں فساد نہیں کوئی ڈر نہیں
زنداں میں بند فتنۂ دوراں ہے آج کل

تمیزِ خاص و عام نہیں میکدے میں اب
بادہ گسار کوئی ہو یکساں ہے آج کل
مزدور ہو کسان ہو کوئی غریب ہو
ہر اہلِ دل کے درد کا درماں ہے آج کل

اللہ رے آفتابؔ یہ فیضِ نظام نو
پابندِ نظم و ضبط ہر انساں ہے آج کل

وَلی تنویر

آنسو بہار کے

(افسانہ)

ثمینہ برسوں بعد آج پھر میرے سامنے خاموش اور سنجیدہ بنی بیٹھی تھی۔ اس کی خوبصورت آنکھوں کے کنارے نم ہو رہے تھے۔!

زندگی خاموش تھی، وقت ٹھہر گیا تھا، آسمان پہ چمکنے والے ستارے ٹوٹ ٹوٹ کر خلاء میں کہیں گم ہو رہے تھے، چاند زرد ہو کر بجھنے لگا تھا۔ نرم خرام ہوا اب کہیں گم ہو چکی تھی۔ کوئی آواز نہیں، کوئی حرکت نہیں، کوئی آہٹ نہیں، رنگ و نور کے سارے رشتے ختم ہو چکے تھے۔ الفت، محبت اور تہذیب کے سارے اصول مٹ گئے تھے۔ دل کسی شے کا نام نہیں اور اگر کسی شے کا نام دل تھا بھی تو اب اس کا کام دھڑکنا نہیں رہا۔ دل جو کبھی سینے میں دھڑکتا تھا، جس میں الفت محبت اور تہذیب کے اصول پلتے اور پلتے تھے رنگ و نور کے رشتے آباد ہوا کرتے تھے خوشبو جنم لیا کرتی تھی۔ دل کی اپنی بھی کوئی آواز ہوا کرتی تھی سب سے الگ سب سے منفرد۔ اور وہی آواز دنیا کا محور ہوا کرتی تھی۔ اب دل وہ دل نہیں رہا تھا۔ ساری راہیں مسدود ہو چکی تھیں بکھریں شادی گئیں تھیں۔ انسانیت اب کسی بڑے دھوکے کا تبدیل شدہ نام تھی۔ محبت اور الفت، فریب کی بدلی ہوئی شکل تھی۔!

زندگی کیا ہے۔؟" میں سوچتا!"

محض ذرات کی حرکت کا نام تو زندگی نہیں ہو سکتا۔! اگر ایسا ہے تو پھر زندگی بے کار ہے۔ کوئی فائدہ نہیں۔ کوئی مقصد نہیں یہ زندگی کہاں سے شروع ہوتی ہے۔ اور کہاں جا کر ختم ہو جاتی ہے کسی کو نہیں معلوم۔!

ثمینہ کی خوبصورت آنکھوں کے کناروں پر چمکتے ہوئے آنسوؤں کو دیکھتا ہوں تو ان آنسوؤں کے ایک ایک قطرے میں زندگی کے آثار نظر آتے ہیں۔ مگر ایسی زندگی کس کام کی جس کا کوئی مقصد نہ ہو جس کی کوئی اخلاقی قدر و قیمت نہیں۔

"پھول کے باطن میں داخل ہونے کی کوشش نہ کرو، وہاں خلاء کے سوا کچھ نہ ملے گا۔" یہ اصول اپنی جگہ درست معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ثمینہ اس وقت میرے سامنے بیٹھی تھی۔ اس تجوری کی مانند جس میں اب کچھ بھی باقی نہ رہ گیا ہو۔!

میں جانتا ہوں یہ سب کچھ اس کی نادانی کی وجہ سے ہوا وہ ایک حسین و معصوم لڑکی۔!

اس کے بھولے پن کا زمانے نے خوب فائدہ اٹھایا اور اسے چوسے ہوئے گنے کی طرح پھر انہی راہوں پر ڈال دیا جہاں وہ مجھے اسی راہ میں مل گئی۔ تاہم وہ میری نظروں میں ویسی ہی باوقار تھی۔ محبت کیے جانے کے قابل جیسی کہ پہلے۔!

زمانے کی تیز روشنی کو دیکھ کر اس نے مجھے بہت پیچھے چھوڑ دیا تھا اور روشنی کے ایک پُرفریب دریا میں بہتی ہوئی دور بہت دور نکل گئی تھی۔ اس کو کیا پتہ کہ روشنی تو روشنی ہوتی ہے جو کبھی ہاتھ نہیں آ سکتی دیکھی اور محسوس کی جا سکتی ہے اس کو اپنی گرفت میں نہیں لایا جا سکتا!

ثمینہ۔! معصوم و نادان۔! اس کو کیا معلوم کہ زمانے نے ترقی ضرور کی ہے لیکن انداز ستم بھی ساتھ ہی بدل گئے ہیں۔

نیم تاریک کمرے میں کرب ناک خاموشی تھی۔ کھڑکی کے راستے آخری شب کے زرد چاند کی مدھم سی روشنی کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ ماحول بڑا ہی بوجھل اور اداس ہو رہا تھا۔

"ثمینہ۔!" میرے دل کے گوشے نے آواز دی۔ میرے ہونٹ خاموش تھے افسردہ و شرمندہ وہ بیٹھی تھی۔ دل کی آواز سے اس کے کان آشنا نہیں ہو پائے تھے۔ اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اور وہ اپنے دائیں پیر کے انگوٹھے سے فرش کو ہولے ہولے کرید رہی تھی۔

زندگی خاموش تھی۔ وقت ٹھہر گیا تھا۔!! باہر وسیع میدانوں میں زرد چاندنی کے ساتھ اداسی بدستور بڑھتی جا رہی تھی۔ ہوا کے نرم خرام جھونکے ہنوز گم تھے!

"تم نے غلط سمجھا تھا ثمینہ"! دل نے کہا۔ لب بدستور خاموش رہے۔ تم نے میری محبت پر دنیا کی مصنوعی چمک دمک کو ترجیح دی۔ میرے مقابل میں تم نے نعیم کی شخصیت کو قابل بھروسہ سمجھا۔ جس دن میں نے نعیم سے تمھارا تعارف کروایا تھا بس اسی دن سے میں نے محسوس کیا کہ تمھارے رویے میں عجیب سی تبدیلی آ رہی ہے۔ مجھے نعیم پر بھی اتنا ہی اعتماد تھا جتنا کہ خود تم پر۔ تم بے حد سنجیدہ اور کم سخن اور نعیم بزلہ سنج اور فضول گو۔ بھرے بھرے جسم والا خوبرو نعیم تمھارے توجہ کا مرکز بن گیا۔ اس کی زبان پر ہمیشہ فلمی دنیا کی رنگینیوں کا ذکر رہتا۔ وہ فلمی دنیا کی ظاہری چمک دمک سے متاثر تھا اور تم بھی اس کی باتوں میں آ گئیں۔ مجھے تمھاری سنجیدہ اور باوقار شخصیت سے ہرگز ایسی امید نہیں تھی کہ نعیم کی باتوں میں آ کر مجھ سے بے وفائی کرو گی۔ حالانکہ میں نے تمھیں اپنی زندگی کا حاصل قرار دیا تھا۔ تمھیں میری محبت و آرزو کا ذرا بھی پاس نہ رہا اور ایک دن تم مجھے تنہا چھوڑ کر نعیم کے ہمراہ چلی گئیں۔ میں تمھیں کیا بتاؤں کہ تمھاری جدائی نے مجھے کس قدر دکھ پہنچایا۔

اب کیا رہ گیا تھا اس شہر میں میرے لیے۔ تشنہ کام اور نا آسودہ روح لیے میں بھٹکتا رہا، کہیں چین نصیب نہ ہوا۔ دل میں سوز اور تمھارا تصور لیے ایک جنتِ گم گشتہ کی تلاش میں پھرتا رہا۔

ثمینہ! حسن مجبور سہی، عشق تو مجبور نہیں ہوتا۔ محبت میں وفا کا بھرم قائم رکھنے میں ایک عرصہ تک تمھارا انتظار کرتا رہا۔ مجھے نہ جانے کیوں یقین تھا کہ تم ضرور ایک نہ ایک دن دنیا کی چمک دمک سے بیزار ہو کر واپس آ جاؤ گی۔

مجھے نہایت معتبر ذرائع سے معلوم ہوا کہ تم شہر سے نعیم کے ہمراہ سیدھے بمبئی پہنچیں۔ تمھارے حسن کی خوشبو سے بمبئی کی فلمی دنیا معطر ہوتی رہی۔ پھر تمھیں کسی فلم کی ہیروئن منتخب کر لیا گیا۔ اس اثناء میں نعیم کا اچانک بے دردانہ قتل ہو گیا۔ مجھے یہ نہ معلوم ہو سکا کہ نعیم کا قاتل کون تھا اور کس لیے اس کو قتل کیا گیا۔ لیکن اتنا ضرور پتہ ہے کہ تم نے نعیم کی موت کا ذرہ برابر بھی غم و ملال کیے بغیر اپنی فلم کے ہیرو سے شادی رچا ڈالی تھی۔ کچھ ہی دنوں میں تمھاری اس ازدواجی زندگی میں پھوٹ پڑ گئی اور تمھاری زیرِ تکمیل فلم ادھوری رہ گئی۔ اس کے بعد تم نے کپڑا بننے والی کسی فرم کے مالک سے دوستی پیدا کی۔

پھر اچانک تم بمبئی سے غائب ہو گئیں۔ اس کے بعد تمھارے بارے مجھے کوئی خبر نہ ملی۔ میرے دل میں جہاں تمھاری جدائی کا احساس بسا تھا وہیں نعیم کی غیر متوقع موت کا بے حد ملال بھی تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس دنیا میں میرے اپنے صرف تم دونوں ہی تھے۔ ایک دوست کی حیثیت سے نعیم اور دوسری تم۔۔۔!!

اور کوئی نہیں۔! لوگوں کے ہجوم میں ہوتے ہوئے بھی تنہائی کا احساس تھا مجھے۔ میری زندگی برسات کی کسی تاریک اور کڑکڑاتی ہوئی سرد بھیانک رات کی مانند گزر رہی تھی۔ زندگی میں چین اور سکون کو تلاش کرنا گویا اندھیری رات میں سورج کی کرن تلاش کرنے کے برابر تھا۔ کوئی ہمنوا تھا نہ کوئی غمگسار۔ اب تو دماغ میں سوجھ بوجھ کی بھی صلاحیت نہ رہی۔ دل میں کوئی امنگ باقی نہ تھی۔ میرے خشک ہونٹ ایک مدت سے مسکراہٹ کے لیے ترس کر رہ گئے تھے۔ دل کی حالت اس دریا کی طرح تھی جو بظاہر خاموش بہتا چلا جاتا ہے لیکن اپنے دامن میں بے شمار طوفان اور ولولے چھپائے ہوتا ہے۔

ایسے میں فرحانہ میرے خزاں بار چمن میں بہار بن کر آئی جس سے زیادہ اس کا محبت بھرا دل میرے درد کا درماں ثابت ہوا۔ فرحانہ کو پا کر مجھے نئی زندگی حاصل ہوئی۔ مجھے زندگی کا کھویا ہوا اعتماد دوبارہ حاصل ہوا۔ اب وہ میرے دو بچوں کی ماں ہے۔!! اس کو میں حد سے زیادہ چاہتا ہوں۔ اس نے بھی مجھے اٹوٹ پیار دیا ہے۔ میرے بغیر زندگی کے تصور تک کو وہ اپنے تئیں گناہ سمجھتی ہے۔ دن رات میری اور بچوں کی خدمت میں مصروف ہے۔ اب میرے گھر میں ہر وقت آرام چین سکون اور محبت و الفت کی بارش ہوا کرتی ہے۔

لیکن اس کے باوجود مجھے جب بھی تمھاری یاد آتی ہے دل کی

کچھ عجیب کیفیت ہو جاتی ہے۔ جانے کیوں آج بھی تمہارے متعلق میرے دل میں وہی محبت اور خلوص باقی ہے۔ میں نے تمہیں پھول کی طرح چاہا ہے۔

عورت کو میں خدا کی طرف سے دیا ہوا ایک مقدس تحفہ تصور کرتا ہوں۔ عورت ماں ہے، بہن ہے، بیٹی اور بیوی بھی۔ اگر تم میری شریک حیات نہ بن سکیں تو کیا ہوا تم عورت تو ہو۔ تمہیں کسی اور رشتہ سے بھی چاہا جا سکتا ہے۔!! ــــ!!

"ثمینہ ــ!" اب میں نے خیالوں کی دنیا سے باہر آ کر کہا میری زبان کی آواز پر اس نے اپنی بوجھل پلکیں اٹھا کر نیم آلود نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ اس کی زبان جیسے گنگ ہو کر رہ گئی تھی۔

"چلو ثمینہ اب اندر جا کر سو جاؤ۔ رات بہت بیت چکی ہے۔ صبح اٹھ کر مجھے فرحانہ کو لینے اسٹیشن جانا ہے۔ کل صبح وہ اپنے میکے سے لوٹ رہی ہے۔"

میرے کہنے پر ثمینہ اٹھ کر بھاری اور بوجھل قدموں سے آہستہ آہستہ اندر والے کمرے میں چلی گئی اور میں باہر برآمدے میں پلنگ پر لیٹ گیا۔ نیند کا کوسوں پتہ نہیں۔ کل تک میرے دل میں ثمینہ سے ملنے کی حسرت تھی آج وہ میرے گھر آئی تو بے چینی اور بھی بڑھ گئی کہ صبح فرحانہ سے کیسے سامنا کر سکوں گا۔

فرحانہ لاکھ ترقی پسند خیالات اور کھلے ذہن کی سہی پھر بھی وہ ایک عورت ہے۔ ثمینہ کا اس سے میں کیسے تعارف کراؤں گا۔ اب کیا کیا جائے۔؟ دیر تک میں اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کرتا رہا۔ کوئی صورت نظر نہ آئی تھی۔ رات جیسے جیسے صبح کی طرف قدم بڑھا رہی تھی ویسے ویسے ڈر اور خوف بھی بڑھتا جاتا تھا۔!

دوسری صبح میں فرحانہ کو لینے اسٹیشن پہنچا۔ ثمینہ بھی میرے ساتھ آئی۔ اس کی حسین آنکھوں کے پپوٹے سوج گئے تھے۔ جیسے وہ بھی رات بھر سوئی نہ تھی۔ نیلی آنکھوں میں سرخ سرخ ڈورے ابھر آئے تھے۔ ادھر میرے دل میں ہلکا ہلکا سا خوف انگڑائیاں لے رہا تھا کہ ابھی کچھ دیر بعد ثمینہ کو کس طرح فرحانہ سے ملاؤں گا۔

تھوڑی دیر بعد ٹرین آ گئی۔ مجھے دیکھتے ہی فرحانہ کھل اٹھی بچے تو مارے خوشی کے میرے پیروں میں جھول گئے۔ بڑا ہی عجیب سماں تھا۔ میں نے دل تھام کر ثمینہ کا تعارف کرایا۔

"فرحانہ...! ان سے ملو.... یہ ثمینہ ہیں ـ!"

"ثمینہ ـ؟" فرحانہ نے تعجب سے پوچھا۔

"بھول گئیں۔ ارے وہی ثمینہ جس کے متعلق تم میری ڈائری میں پڑھ چکی ہو۔"

"او ہو ثمینہ ـ! آئی ہی ـ! سمجھی ـ! بڑی خوشی ہوئی ثمینہ تم سے مل کر اتنے دن کہاں رہیں ـ؟"

فرحانہ کے لہجے میں بے پناہ پیار و محبت اور خلوص دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ ثمینہ کا دل غم سے بھر آیا، اس کی آنکھوں کے کنارے بھیگ رہے تھے۔ فرحانہ سے ملنے کے لیے وہ آگے بڑھی اور .... اور پھر اس سے چمٹ کر بے اختیار رونے لگی ـ! جیسے کوئی بہن برسوں بعد اپنی بہن سے مل کر روتی ہے۔

"بھابی ـ!" میں بہت گناہ گار ہوں"۔ ثمینہ نے سسکیوں کے درمیان کہا۔ "شاید خدا بھی مجھے معاف نہ کرے ـ!" ـــ! اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب سا امنڈ رہا تھا۔

"ثمینہ ...! نہیں ثمینہ اس طرح رنج نہیں کیا کرتے"۔ فرحانہ نے ثمینہ کو اپنے سینے سے لگا کر بڑے اعتماد اور اپنائیت سے کہا۔ "اب بھی کچھ نہیں ہوا۔ انسان اپنا سب کچھ کھو دینے کے بعد بھی بہت کچھ بن سکتا ہے۔ اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کا اعتراف کر کے ندامت کے آنسو بہانا اور پھر غلط راستے کا رخ نہ کرنے کا عہد کر لینا بہت بڑی بات ہے۔ اب تم ایک نئی زندگی کا راستہ اختیار کرو۔ تم بھی عظیم بن سکتی ہو۔"

فرحانہ کے لہجے میں خلوص تھا۔

میرا دل موم کی طرح پگھلنے لگا۔ آنکھیں بھیگنے لگیں، اور میری ان نمناک آنکھوں میں ایک معصوم بے گناہ بھولی بھالی اور پاکیزہ سی ثمینہ کا ہیولا سا ابھر آیا۔ یوں محسوس ہونے لگا جیسے ان آنسوؤں میں ثمینہ کی پچھلی زندگی کے سارے گناہ بہہ گئے ہوں۔ میں سوچنے لگا ثمینہ کے ان آنسوؤں کو کیا نام دوں ـــ؟

★

خلیق الزماں سحر

یک جہتی

چلے کچھ ایسی خدایا ہوائے یک جہتی
ہو سازگار ہمیشہ فضائے یک جہتی
خزانے امن و سکوں کے لٹائے یک جہتی
تعصبات کی دیوار ڈھائے یک جہتی
ادا ہے ارضِ وطن کی ادائے یک جہتی
صلائے عام ہے یارو! صلائے یک جہتی

دلوں سے بغض و عداوت کا میل دھونا ہے
خلوص و مہر و محبت کے بیج بونا ہے
مٹا کے جھگڑے من و تو کے درمیاں سے ہمیں
ہزار جسم ہوں پر ایک جان ہونا ہے
کرشمہ اپنا کچھ ایسا دکھائے یک جہتی
صلائے عام ہے یارو! صلائے یک جہتی

یہیں پہ تلسی و غالب کبیر و میر ہوئے
یہیں نسیم اور آتش ہوئے نظیر ہوئے
یہیں پہ فانی و چکبست اور امیر ہوئے
فراق و جوش یہیں ہیں یہیں اسیر ہوئے
خزانے امن و سکوں کے لٹائے یک جہتی
صلائے عام ہے یارو! صلائے یک جہتی

کریں یہ عہد قسم کھائیں آج مل کے سبھی
ہماری آج سے یہ طرزِ زندگی ہو گی
نہ آنچ آئے گی اب عصمتوں کے دامن پر
فساد و شر کی نہ چنگاریاں اٹھیں گی کبھی
بیان کردو سحر رازہائے یک جہتی
صلائے عام ہے یارو! صلائے یک جہتی

نثار الماس

زندگی کا قافلہ

قدم قدم رواں دواں ہے زندگی کا قافلہ
گہر طراز و گل فشاں ہے زندگی کا قافلہ
حسین خواب سرگراں ہے زندگی کا قافلہ

کبھی نہاں کبھی عیاں ہے زندگی کا قافلہ

ہر ایک سمت مرحلوں کا سلسلہ ہے دور تک
کئی کلیم ہمسفر ہیں جلوہ گاہِ طور تک
کئی مقام ہیں جنوں کی منزلِ شعور تک

ہزار ہم پہ مہرباں ہے زندگی کا قافلہ

کہیں بہارِ رنگ و بو کہیں غبارِ زرد ہے
کہیں تبسموں کی ضو کہیں حصارِ درد ہے
کہیں ہے نالۂ جرس کہیں یہ [illegible] نورد ہے

کہیں خوشی، کہیں فغاں ہے زندگی کا قافلہ

اسی کا نغمۂ طرب ہے سازِ آبشار میں
اسی کی آب و تاب ہے جمالِ جلوہ یار میں
لطافتیں اسی کی ہیں تجلیٔ بہار میں

ہر ایک شے کا ترجماں ہے زندگی کا قافلہ

ہزار اس کے روپ ہیں ہزار اس کے زاویے
ازل سے تا ابد ہیں اس کے تگ و دو کے سلسلے
نثار اس کے بھید بھاؤ آج تک نہ کھل سکے

عجیب طرفہ داستاں ہے زندگی کا قافلہ

اداریہ

اتر پردیش بجٹ ۷۷-۱۹۷۶ء

بجٹ تخمینے بابتہ ۷۷-۱۹۷۶ء

مزید وسائل کی فراہمی کی مختلف تجاویز کو ملحوظ رکھتے ہوئے ۷۷-۱۹۷۶ء کے آخر میں ۱۶٫۱۵ کروڑ روپیہ کا خسارہ رہ جائے گا۔ محاصل سے آمدنی کا تخمینہ ۹۵۰٫۳۲ کروڑ روپیہ اور سرمایے کے محاصل کا تخمینہ ۳۱۲٫۹۴ کروڑ روپیہ ہے۔

کے اخراجات ۹۰۱٫۵۳ کروڑ روپیہ اور سرمایے کے اخراجات ۴۰۸٫۱۲ کروڑ روپیہ ہونے کا تخمینہ ہے۔ اس طرح سال میں کل آمدنی کل اخراجات سے ۶۴٫۷ کروڑ روپیہ کے بقدر زیادہ ہونے کا تخمینہ ہے جس کے نتیجہ میں سال کے آخر میں ابتدائی میزان (-) ۸۱٫۳۱

بجٹ ایک نظر میں

آمدنی اور سرمایہ کا گوشوارہ (کروڑ روپیہ میں)

محاصل		مصارف	
ابتدائی میزان (-)	۸۱٫۳۱	آمدنی کے اخراجات	۹۰۱٫۵۳
محاصل سے آمدنی	۹۵۰٫۳۲		
سرمایہ کے محاصل	۳۱۲٫۰۴		
پبلک اکاؤنٹ (خالص)	۵۵٫۳۴	سرمایہ کے اخراجات	۴۰۸٫۶۲
	۱۳۱۷٫۷۹		۱۳۱۰٫۱۵
		اختتامی میزان	۷۰٫۶۷
کل میزان	۱۲۳۹٫۴۸		۱۲۳۹٫۴۸

پبلک اکاؤنٹس کے تحت ۵۵٫۳۴ کروڑ روپیہ کی خالص آمدنی ہونے کا اندازہ ہے۔ دوسری طرف سال بھر میں آمدنی

کروڑ روپیہ سے گھٹ کر (-) ۷۰٫۶۷ کروڑ روپیہ رہ جائے گی مندرجہ ذیل گوشوارہ سے صورت حال واضح ہو جائے گی۔

بجٹ تخمینوں کے ۷ کروڑ، ۶ لاکھ روپیہ کے متوقع خسارہ کو مندرجہ ذیل طریقے سے پورا کرنے کی تجویز ہے :-

(۱) سیلس ٹیکس کی شرحوں پر نظر ثانی کرنے اور انھیں معقول بنانے کی تجویز ہے۔ اگرچہ کچھ معاملوں میں سیلس ٹیکس کی شرح میں اضافہ کیا جائے گا تاہم بعض صورتوں میں کچھ رعایتیں بھی دی جائیں گی۔ تاکہ اس طرح نکاسی اور پیداوار میں اضافہ کرنے کے لیے لوگوں کی حوصلہ افزائی ہو سکے۔ ٹیکس ماری کو روکنے اور ٹیکس کی زیادہ سے زیادہ وصولی کے بندوبست کو یقینی بنانے کے لیے نظم و نسق کی مشینری کو مستحکم کیا جائے گا۔ ان اقدامات کے نتیجہ میں بجٹ سال کے دوران ۶ کروڑ ۴۰ لاکھ روپیہ کی مزید آمدنی متوقع ہے۔

(۲) صنعتی الکوہل پر لیوی خریداری ٹیکس عائد کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ ٹیکس ماری اسمگلنگ اور شراب کی ناجائز کشیدگی کو روک تھام کی غرض سے محکمہ آبکاری کی انتظامی مشینری کو مستحکم بنایا جائے گا۔ ولایتی شراب کی دوکانوں کی نیلامی کے سابقہ نیصلہ پر عمل درآمد کرنے کی تجویز ہے۔ ان اقدامات سے نہ صرف ریاست میں نشہ بندی پالیسی کو بروئے کار لانے میں مدد ملے گی بلکہ ۵ کروڑ ۹۰ لاکھ روپیہ کی مزید آمدنی متوقع ہے۔

(۳) مختلف محکمہ جاتی فیسوں کی شرحیں بہت پہلے مقرر کی گئی تھیں اور اس وقت سے اب تک سروسوں کی لاگت میں اضافہ ہو گیا ہے۔ اس لیے ان شرحوں پر نظر ثانی کی تجویز ہے۔ اس اقدام کے نتیجہ میں پانچ کروڑ ۵۰ لاکھ روپیہ کی مزید آمدنی متوقع ہے۔

(۴) کورٹ فیس اور رجسٹری کی فیس کی شرحوں پر بھی نظر ثانی کی تجویز ہے جس کے نتیجہ میں امید ہے کہ ۲ کروڑ ۵۰ لاکھ روپیہ کی مزید آمدنی ہوگی۔

(۵) شہری علاقوں میں خالی پڑی ہوئی زمین پر لیوی ٹیکس عائد کرنے کی تجویز ہے۔ اس اقدام سے تخمیناً دو کروڑ روپیہ کی آمدنی ہوگی۔

(۶) ہاٹ بازار اور مویشی میلوں وغیرہ میں جانوروں اور مویشیوں وغیرہ کی خریداری پر لیوی ٹیکس عائد کر دینے کی تجویز ہے جس کے نتیجہ میں ایک کروڑ ۸۵ لاکھ روپیہ کی مزید آمدنی متوقع ہے۔

اس طرح مذکورہ بالا اقدامات سے ۲۴ کروڑ ۸۵ لاکھ روپیہ کی آمدنی متوقع ہے۔ غیر پیداواری اور غیر ضروری مدوں کے اخراجات میں تخفیف کر کے سرکاری مصارف میں کفایت شعاری کی جائے گی۔ سرکاری واجبات کی وصولی اور زیادہ موثر طریقے سے کی جائے گی۔ مالگذاری کو معقول سطح پر لانے کی بھی تجویز ہے تاکہ اس کے دائرہ اثر کو معقول بنایا جا سکے اور زمین کے مالک ادارہ جاتی سرمایہ کا زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکیں۔ اس اقدام کے نتیجہ میں چار کروڑ روپیہ یا اس سے زیادہ کی آمدنی کی توقع ہے۔ بجٹ سال کے دوران مزید وسائل پیدا کرنے کے سلسلے میں بعض دیگر تجاویز پر بھی غور و خوض کیا جا سکتا ہے۔

اتر پردیش بجٹ ۷۷-۱۹۷۶ء کی خاص خاص باتیں

ترقیاتی بجٹ کی حکمت عملی

وزیر اعلیٰ شری نرائن دت تیواری نے ۲۶ مارچ ۱۹۷۶ء کو اتر پردیش ودھان سبھا میں اپنی بجٹ تقریر میں ایک نئی ترقیاتی حکمت عملی کا خاکہ پیش کیا۔ اس حکمت عملی میں خاص زور سائنسی تکنیکی اور جدید طریق کار کا زرعی میدان میں زیادہ سے زیادہ استعمال کر کے ترقی کے عمل کی رفتار کو بڑھانے اور چھوٹے پیمانے کی صنعتوں دستکاریوں اور ہینڈ لوم کے واحدوں پر خاطر خواہ توجہ اور ان کو مزید امداد دینے پر ہوگا۔ مقصد یہ ہے کہ ان ترقیاتی کاموں کے معاشی فوائد دیہی عوام، کاریگروں اور سماج کے کمزور طبقوں تک مسلسل پہنچتے رہیں۔

(۱) ان مختلف اسکیموں اور پراجکٹوں کے نتیجہ میں آبپاشی کی اضافہ شدہ صلاحیت سے کھیتوں کو سینچائی کی زیادہ سے زیادہ سہولت بہم پہنچائی جائے گی۔ اس مقصد کے پیش نظر گولوں اور کھیت کی نالیوں کی تعمیر کے کام کو اولیت دی جائے گی۔ بیراجوں اور باندھوں کی تعمیر سے لے کر کھیت کی گولوں تک تعمیر کے کاموں میں تال میل پیدا کیا جائے گا تاکہ جیسے ہی آبپاشی کے مزید وسائل مہیا ہوں

ان سے ضرورت مند کسانوں کو فائدہ پہنچنے لگے۔ پانی کے رسنے کی وجہ سے ضائع ہونے کے امکانات کو کم کرنے کے لیے بعض دوسری ریاستوں کی طرح اتر پردیش میں بھی درمیانی نہروں کو پختہ بنایا جائے گا (۲) کاشتکاروں کو امداد باہمی تحریک کے دائرۂ عمل میں لایا جائے گا تاکہ کیمیاوی کھاد اور بیج وغیرہ کے سلسلے میں ان کی ضرورتوں کو خاطر خواہ طریقے پر پورا کیا جا سکے۔

کاشتکاروں کو امداد باہمی انجمنوں کا ممبر بنانے کے لیے خصوصی اقدامات کیے جائیں گے اور امداد باہمی ڈھانچے کو مستحکم بنانے نیز ان کو فنڈ مہیا کرنے کے لیے بھی بڑے پیمانہ پر کوششیں کی جائیں گی۔

(۳) ریاستی فارموں میں سدھار کر کے انھیں اس قابل بنایا جائے گا کہ ایسے بیج پیدا کر کے کسانوں کو سپلائی کیے جا سکیں گے جو ان بیجوں سے کسی طرح کم تر درجہ کے نہ ہوں۔ جو قومی بیج کارپوریشن اور ترائی بیج کارپوریشن سپلائی کرتے ہیں۔ مٹی کی جانچ کی سہولتیں بھی مہیا کی جائیں گی تاکہ کسان باری باری سے فصلوں کی بوائی کا طریقہ اپنا سکیں جس میں پیداوار بہت بڑھ جاتی ہے۔ ان سہولتوں میں مرحلہ وار توسیع کی جائے گی تاکہ تمام ضلعوں کو یہ سہولتیں مہیا ہو جائیں۔

(۴) زراعت کے پیکیج پروگرام پر تیز رفتار سے عملدرآمد کرنے کے لیے بجلی، آبپاشی، زراعت اور امداد باہمی محکموں میں قریبی رابطہ قائم کیا جائے گا۔

(۵) اس امر کی بھی کوشش کی جائے گی کہ کاشتکاروں کو نہ صرف زرعی آلات مناسب قیمتوں پر اور بغیر کسی پریشانی کے مہیا ہو سکیں بلکہ ان کی پیداوار کے مناسب دام بھی ان کو ملنے لگیں۔

۲۔ ۷۷-۱۹۷۶ء کا سالانہ منصوبہ ۵۴۰ کروڑ رکھا گیا ہے جو کہ گزشتہ سال کے اصل منصوبے کے مصارف سے ۳۵ فی صد زائد ہے۔ ۷۷-۱۹۷۶ء کا سالانہ منصوبے کے لیے ۵۴۰ کروڑ کی مجوزہ رقم میں ۲۳۷ کروڑ آبپاشی اور بجلی پر، ۶۷ء۹۰ کروڑ زراعت اور معاون سروسوں پر ۱۶ء۳۹ کروڑ صنعت اور کان کنی پر، ۸۰ء۲۹ کروڑ نقل و حمل اور مواصلات پر ۹۰ء۶۳ کروڑ، سماجی اور اجتماعی ترقیات پر، اور ۹۰ء۲ کروڑ روپیہ دوسری مدوں پر خرچ کرنے کی تجویز ہے۔

۲۰۔ نکاتی پروگرام پر عمل درآمد

اس ریاست نے معاشی تعمیر نو سماج کے کمزور طبقوں کی ترقی کے لیے وزیر اعظم کے اعلان کردہ ۲۰ نکاتی پروگرام پر عمل درآمد کے سلسلے میں شروع سے ہی زبردست کوششیں کی ہیں۔ اگلے سال ۲۰ نکاتی پروگرام کے عمل درآمد کے لیے ۴۰ء۱۳۷ کروڑ روپیہ کے مصارف کی تجویز ہے۔ جہاں ضروری سمجھا گیا قانون اور قواعد میں ترمیم بھی کی گئی اور ۲۰ نکاتی پروگرام کے موثر عمل درآمد کے لیے نئے قوانین بھی وضع کیے گئے ہیں

زرعی، صنعتی، دیہی اور شہری صارفین کی قیمتوں میں کافی گراوٹ آئی ہے۔ ریاست بھر میں ضروری اشیاء وافر مقدار میں مناسب شرحوں پر دستیاب ہیں گاؤں سبھا کی آراضی اور جوت حدبندی قانون کے نفاذ کے نتیجے میں فاضل قرار دی گئی زمین کے الاٹمنٹ میں مندرجہ فہرست اقوام و قبائل کے بے زمین مزدوروں کو ترجیح دی گئی ہے۔ اور اس کے لیے قوانین میں ضروری ترمیم کی گئی ہے۔ فروری ۱۹۷۶ء کے آخر تک ۱۶ لاکھ ایکڑ سے زیادہ زمین بے زمین اور چھوٹے کسانوں میں تقسیم اور ۱۲ لاکھ خاندانوں کو مکانات کی تعمیر کے لیے زمینیں الاٹ کی جا چکی ہیں۔ اس طرح ۹۸ فی صد مستحق خاندانوں کو مکان کی تعمیر کے لیے قطعات آراضی الاٹ کیے جا چکے ہیں۔ اس مقصد کے لیے ۷۷-۱۹۷۶ء کے بجٹ میں ایک کروڑ روپیہ کی رقم مہیا کرنے کی تجویز ہے۔

پابند مزدوری کو ختم کرنے کے لیے قانون وضع کیا گیا ہے۔ دیہی علاقوں کے بے زمین اور چھوٹے کاشتکاروں کو قرضہ سے نجات دلانے کے لیے بھی قوانین وضع کیے گئے ہیں۔

کھیت مزدوروں کی کم سے کم اجرتوں پر نظر ثانی کی گئی ہے۔

ادارہ جاتی اقدامات

مربوط دیہی ترقیاتی اسکیم پر عمل درآمد کی نگرانی کی غرض سے ریاستی منصوبہ بندی ادارہ کے تحت ریاستی سطح کی ایک رابطہ کمیٹی قائم کی گئی ہے۔ ترقیاتی منصوبوں کی موثر نگرانی اور مقررہ مدت کے

اور انھیں پورا کرنے کے لیے ہر ڈویژن میں وزیر اعلیٰ کی صدارت میں وزرا کی قائمہ کمیٹیاں قائم کی جائیں گی۔ ڈویژنل کمشنر قائمہ کمیٹی کے سکریٹری کی حیثیت سے کام کریں گے۔ ڈویژن کی سطح پر ایک منطقائی ترقیاتی کارپوریشن بھی قائم کیا جائے گا۔ مربوط دیہی ترقیاتی اسکیم کے تحت تحقیقاتی و توسیعی مراکز قائم کیے جائیں گے۔ اس مقصد کے لیے بجٹ میں ۱۰ لاکھ روپیہ کا بندوبست کیا گیا ہے۔

نظم و نسق کی اصلاحات اور علم جاتی محکمہ نیز انٹر پرائزز بیورو کو مستحکم بنایا جائے گا۔ اس بیورو کے تحت پراجیکٹ تیار کرنے اور اس کی نگرانی سے متعلق ایک ڈویژن قائم کیا جائے گا۔ زیادہ سے زیادہ افسروں کو مالیاتی انتظامیہ، منصوبہ بندی، کاسٹ اکاؤنٹنسی اور دیگر اہم امور کی تربیت دینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ مختلف محکموں کے اخراجات سے متعلق اعداد و شمار کو تیز تر رفتار کے ساتھ جمع کرنے اور موثر نگرانی کے بندوبست کو یقینی بنانے کی غرض سے محکمہ مالیات میں اعداد و شمار کے الکٹرانک پروسسنگ کا ایک سنٹر قائم کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ایک کمپیوٹر مرکز قائم کرنے کا بھی فیصلہ کیا گیا ہے

کارکردگی کا جائزہ بجٹ کا طریقہ سن ۷۱-۱۹۷۰ء میں شروع کیا گیا تھا۔ یہ بجٹ خاندانی منصوبہ بندی، تعمیرات عامہ، آبپاشی، صنعت زراعت، امداد باہمی، گنا، اجتماعی ترقی، نگہداشت مویشیان، مچھلی پالن، تعلیم، تکنیکی تعلیم اور جنگلات کے محکموں کے لیے تیار کیا جا رہا ہے۔ علاج صحت عامہ کے محکمے سن ۷۷-۱۹۷۶ء کے لیے یہ بجٹ تیار کریں گے۔

حکومت ہند نے اکاؤنٹس اور آڈٹ کو علاحدہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ریاستی حکومت اس سلسلے میں اس اقدام کے مضمرات کا جائزہ لے رہی ہے اور اکاؤنٹنٹ جنرل اتر پردیش سے صلاح و مشورہ کر رہی ہے،

اردو زبان کی ترقی

اردو اکادمی کو ملنے والی ۱۰٫۵ لاکھ روپیہ کی مالی امداد کو بڑھا کر ۱۸٫۵۰ لاکھ روپیہ سالانہ کر دینے کی تجویز ہے۔ انیس اسمارک ندھی دیا دگار انیس کمیٹی لکھنؤ نے اردو کے عظیم شاعر میر انیس کی رہائش گاہ کی از سر نو تعمیر نیز ان کے کلام کا دوسری زبانوں میں ترجمہ کرنے کا پروگرام تیار کیا ہے۔ اس مقصد کے لیے ایک لاکھ روپے کی غیر متواتر اور پانچ ہزار روپیہ کی متواتر رقم بطور مالی امداد دینے کی تجویز ہے۔ اردو ادب اور بلند پایہ اردو کتابوں کی اشاعت کے لیے مزید رقم کے بندوبست کی تجویز ہے۔

بجلی کی پیداوار

بجلی کی پیداواری صلاحیت جو سر دست ۲۲۰۳ میگاواٹ ہے مارچ سن ۷۷ء تک بڑھا کر ۲۸۶۳ میگاواٹ کرنے کی تجویز ہے جب پنکی (میگاواٹ) رام گنگا کی دوسری اور تیسری مشین (۱۳۲ میگاواٹ) ہردوا گنج مرحلہ۔ ۵ (۱۱۰ میگاواٹ) اور اوبرا تھرمل توسیعی پروجکٹ (۲۰۰ میگاواٹ) کے ذریعہ پیداوار شروع ہو جائے گی۔

آبپاشی کی سہولیتیں

اتر پردیش میں سال رواں کے دوران تین لاکھ ۴۸ ہزار ہیکٹر رقبہ کی مزید آب پاشی کی صلاحیت پیدا کرنے کی غرض سے مختلف بڑے اور متوسط آبپاشی پراجکٹوں کے لیے بجٹ میں بندوبست پیدا کیا گیا ہے۔ اس سال شروع کیے گئے ایک تیز رفتار پروگرام کے تحت جون سن ۱۹۷۶ء تک مزید ایک لاکھ ہیکٹر رقبہ میں آبپاشی کی سہولیتیں مہیا کی جائیں گی جس کے لیے سال رواں میں تین کروڑ روپیے اور اگلے سال کے لیے ۹ کروڑ روپے مہیا کیے گئے ہیں۔ اس مقصد کے لیے ۴۰۰۰ کیلومیٹر لمبی گولوں اور ۸۰۰۰ کیلومیٹر لمبی نئی چھوٹی نہروں کی تعمیر نیز سینچائی نہروں کی جدید کاری کا کام شروع کیا گیا ہے۔ ریاستی حکومت کو ٹہری کے کثیر مقصدی پراجکٹ پر کام شروع کرنے کی اجازت منصوبہ بندی کمیشن سے مل گئی ہے۔ اس پراجکٹ کی تخمینی لاگت ۲۰۰٫۵ کروڑ روپیہ ہے۔ آبپاشی کی کچھ دوسری بڑی اسکیموں میں جن پر اگلے سال کام شروع ہوگا یہ ہیں سجنام باندھ (للت پور)، بیونی سیتوا (باندھ)، سوہیلی (کھیری) اور بالائی شاردا نہر اور آگرہ نہر وغیرہ کی جدید کاری۔

آبپاشی کی مزید صلاحیت پیدا کرنے کے لیے ایک ٹیوب ویل و چھوٹی سینچائی کارپوریشن قائم کرنے کی تجویز ہے۔ ریاست میں سن ۷۷-۱۹۷۶ء کے دوران چھوٹی سینچائی اسکیموں کے ذریعہ ۶ لاکھ ۹۴ ہزار رقبہ کو سینچائی کی سہولیتیں مہیا کی جائیں گی۔ سال کے

دوران ۔۔۔ ۴۰ نجی ٹیوب ویلوں کو بجلی فراہم کرنے کی تجویز ہے۔

محنت کی عظمت کو سمجھنے کا موقع فراہم کرنے کے لیے آبپاشی کے بعض اہم پراجکٹوں پر یوم مرکز قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

بندیلکھنڈ منطقہ میں آبپاشی کی سہولتیں بڑھانے کی مخصوص اسکیموں پر عملدرآمد کرنے کی تجویز ہے۔ ان اسکیموں پر ۵۰ء۲۱ کروڑ روپیہ کی لاگت آئے گی۔ مین پوری، ایٹہ، بستی، گونڈہ، بہرائچ، فتح پور، ہردوئی اور بدایوں میں سینچائی کی مزید سہولتیں فراہم کرنے کے لیے بھی خصوصی اسکیمیں وضع کی جا رہی ہیں۔ ان اسکیموں پر بھی ۵۰ء۲ کروڑ روپیہ کی لاگت آئے گی۔ ان پراجکٹوں کو اولیت کی بنیاد پر بروئے کار لانے کی تجویز ہے۔

صنعتی ترقی۔ اودکھلا میں ایک صنعتی بستی کی تجویز ہے۔ توقع ہے کہ تقریباً دس ہزار صنعتی واحدے قائم ہوں گے جن میں ۵۰۰۰ افراد کو روزگار مل سکے گا۔ اس اسکیم کے لیے ایک ترقیاتی اتھارٹی قائم کی جا رہی ہے۔ اس مقصد کے لیے ایک کروڑ روپیہ کی رقم رکھی گئی ہے۔

ریاست کے بعض مقامات مثلاً مرادآباد، سہارن پور، آگرہ وغیرہ اپنی مخصوص صنعتوں کے لیے مشہور ہیں۔ ان مقامات پر صنعتی کمپلکس قائم کرنے کی تجویز ہے تاکہ صنعتی واحدوں کو خام مال بینکوں سے مالی امداد اور خرید و فروخت کی سہولتیں وغیرہ حاصل ہو سکیں۔

سوتی دھاگے کی سپلائی کو بہتر بنانے کے لیے دس دھاگا ملیں قائم کی جا رہی ہیں۔ ان میں دو ملیں امداد باہمی زمرہ میں ہوں گی۔ بنکروں کو ڈیزائن کی تیاری اور بنائی کی تربیت دینے کی غرض سے ایٹہ اور گورکھپور میں دو ڈیزائن مرکز قائم کرنے کی تجویز ہے۔ امداد باہمی خرید و فروخت کی سہولتیں بھی فراہم کی جائیں گی۔ ریڈی میڈ کپڑوں کا ایک کمپلکس شاہجہاں پور میں قائم کیا جا رہا ہے۔

آئندہ تین سال کے دوران میں قالین کی برآمد کے نشانہ کو ۴۰ کروڑ روپیہ سالانہ سے بڑھا کر ۱۰۰ کروڑ روپیہ کرنے کی تجویز ہے۔ بنکروں کو ٹریننگ دینے کی غرض سے ۱۰۰ مرکز قائم کیے جائیں گے جس کے نتیجہ میں ان بنکروں کی تعداد ۴۰۰۰۰ سے بڑھ کر دو لاکھ ہو جائے گی۔

پردیش کے پسماندہ ضلعوں میں صنعتی ترقی مرکز قائم کیے جائیں گے۔ ان مرکزوں میں نئے صنعت کاروں کو رعایتی شرح پر زمین فراہم کی جائے گی۔ اس اسکیم کی مالی ضرورتوں کے لیے ۲ لاکھ روپیہ کی رقم فراہم کی جا رہی ہے۔

تعلیم یافتہ بے روزگار افراد کے لیے ایک اسکیم تیار کی گئی ہے تاکہ وہ نئے واحدے قائم کر سکیں۔ ان لوگوں کو درکار مجموعی سرمایہ کی ۱۰ فیصد رقم رعایتی شرح سود پر بطور قرض دی جائے گی۔

بھدوہی میں ایک اونی دھاگا کی کتائی مل قائم کی جائے گی۔

تعلیم۔ ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کے درجات کی درسی کتابوں کو قومیانے کے لیے کامیاب اقدامات کیے گئے۔ اردو اکاڈمی کی مدد سے پہلے سے آٹھویں درجوں کی قومیائی ہوئی کتابوں کے نظرثانی شدہ اردو ایڈیشن شائع کرنے کی تجویز ہے۔ طالب علموں کو کنٹرول قیمت پر کاپیاں فراہم کی جا رہی ہیں۔

طالب علموں کی سہولت کے لیے تعلیمی اداروں میں کتب بینک قائم کیے جا رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں سنہ ۷۷-۱۹۷۶ء کے دوران ایک کروڑ روپیہ کے بندوبست کی تجویز ہے۔

علاج و صحت۔ لکھنؤ میں میڈیکل سائنسوں کا ایک پوسٹ گریجویٹ انسٹی ٹیوٹ قائم کیا جا رہا ہے جس کے لیے سال رواں کے دوران ۵۰ لاکھ روپے مہیا کیے گئے ہیں۔ سرکاری اسپتالوں میں دواؤں کی فراہمی میں اضافہ کرنے کے لیے بجٹ میں ایک کروڑ روپیہ کا اضافہ کیا جا رہا ہے۔

ریاست میں سہ مرحلہ طبی خدمت کے تصور کو اصولی طور پر مرحلہ وار بروئے کار لانے کا فیصلہ کیا گیا ہے جس سے ابتدائی صحت مرکزوں پر عوام کے لیے صحت سے متعلق زیادہ سے زیادہ

سہولت، تحصیل اور ضلع کی سطح کے اسپتالوں میں طبی مشورہ سروس اور اہم اسپتالوں اور اداروں میں ماہرین کی طبی خدمت کا بندوبست ہو جائے گا۔ اس سلسلہ میں ابتدائی اقدام کے طور پر میڈیکل کالجوں اور ضلع اسپتالوں کے ماہرین پر مشتمل گشتی ٹیمیں قائم کی جائیں گی جو اپنی پیشہ ورانہ مہارت سے عوام کو فائدہ پہنچانے کے لیے دیہی علاقوں کا دورہ کریں گی۔

ریاست کے تمام میڈیکل کالجوں میں رضاکارانہ طور پر خون کا عطیہ دینے کی اسکیم کی توسیع کی جائے گی۔ ضلع اسپتالوں میں قائم بلڈ بینکوں کو سرگرم بنانے کا بھی فیصلہ کیا گیا۔

کوڑھ کے مسئلہ سے نپٹنے کے لیے ایک مہم کے جزء کے طور پر ۱۵۰ کوڑھ کنٹرول یونٹ، ۲۰۰ جائزہ و تعلیمی و علاج و معالجہ مراکز، ۱۶ شہری کوڑھ کنٹرول یونٹ اور ایک ری کانسٹرکٹو مرکز قائم کیا جائے گا۔ جائزہ و تعلیمی و علاج و معالجہ مرکزوں کے دائرۂ عمل میں شہر بھی آئیں گے۔ جہاں بڑی تعداد میں یاتری آتے رہتے ہیں۔

ہریجنوں کی بہبود و ترقی۔ ہریجنوں کی بہبود و ترقی کے لیے ایک ہریجن مالیاتی و ترقیاتی کارپوریشن قائم کیا گیا ہے۔ اسی طرح میدانی علاقہ کو ترائی منطقہ میں رہنے والے مندرجہ فہرست قبائل کی فلاح و بہبود کے لیے بھی ایک کارپوریشن قائم کیا گیا ہے۔ ہریجنوں اور کمزور طبقوں سے متعلق ایک ہاؤسنگ بورڈ قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ جو ادارہ جاتی وسائل کے ذریعہ سرمایہ فراہم کرے گا اور اقوام و قبائل مندرجہ فہرست کے لیے مکانات تعمیر کرے گا۔

اقوام و قبائل مندرجہ فہرست کے لیے سرکاری محکموں، سرکاری زمرہ کے اداروں اور لوکل باڈیز کی ملازمتوں میں پہلے سے ہی نشستیں محفوظ ہیں۔ اب یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ مناسب قانون وضع کر کے مذکورہ بالا زمرے کے لوگوں کے لیے نجی زمرہ میں بھی نشستیں محفوظ کرنے کا بندوبست کیا جائے۔

مزدوروں کی بہبود۔ بے زمین کھیت مزدوروں کو زمین الاٹ کی جا رہی ہے۔ ان لوگوں کی جانب سے سرمایہ حصص فراہم کرنے کے بھی انتظامات کیے جا رہے ہیں تاکہ وہ امداد باہمی انجمنوں کے ممبر بن سکیں اور زرعی سامان کی خریداری کے لیے ضروری قرضے حاصل کر سکیں

بڑھاپے کی پنشن اسکیم کے تحت پنشن کی شرح بھی ۳۰ روپیہ ماہانہ سے بڑھا کر ۴۰ روپیہ ماہانہ کی جا رہی ہیں۔

کھیت مزدوروں کی کم سے کم اجرتیں جو تین روپیہ ۲۰ پیسے اور چار روپیہ ۵ پیسے کے درمیان تھیں بڑھا دی گئی ہیں جو اب ساڑھے چار روپیہ اور ساڑھے چھ روپیہ کے درمیان ہوں گی۔

اسپورٹس۔ کھلاڑیوں کی بہبود سے متعلق ایک ٹرسٹ قائم کیا گیا ہے تاکہ معمر کھلاڑیوں اور ایسے کھلاڑیوں کو جو مالی دشواریوں سے دوچار رہیں، مالی امداد دی جا سکے۔

ماحول کے سدھار کے لیے اقدام۔ قدرتی وسائل کے استعمال اور مناسب ماحول برقرار رکھنے کے سلسلہ میں ایک پالیسی وضع کرنے کے لیے ماحول اور معیشت کا ایک نیا محکمہ قائم کرنے کا بھی فیصلہ کیا گیا۔

ملازمین کی فلاح و بہبود۔ ریاستی ملازمین کو یکم مارچ ۱۹۷۶ء سے مزید مہنگائی بھتے کی ایک قسط منظور کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے جس کے سبب سرکاری خزانہ پر ۱۳ کروڑ روپیہ کا بار پڑے گا۔

ریاستی سرکاری ملازمین کی گروپ انشورنس اسکیم پر عمل درآمد کرنے کا بھی فیصلہ کیا گیا ہے۔

حکومت اور اس کے نان گزیٹیڈ ملازمین کے درمیان خیر سگالی کو برقرار رکھنے کے پیش نظر ایک مشترکہ مشاورتی مشنری کے قیام کی تجویز ہے۔

وہ عارضی ملازمین بھی پنشن کے مستحق قرار دیے جائیں گے جو دوران ملازمت نابینا یا معذور ہو جائیں گے۔

پنشن پانے والوں کو بھی ان کی پنشن کی شرحوں میں اضافہ کر کے راحت دی جائے گی۔ اضافہ کی یہ رقم سو روپیہ تک ماہانہ

پنشن والوں کے معاملے میں دس روپیہ ماہوار، سو روپیہ اور ۲۰۰ روپیہ کے درمیان پنشن پانے والوں کے معاملے میں ۱۵ روپیہ ماہوار اور ۲۰۰ روپیہ سے زائد پنشن پانے والوں کے معاملے میں ۲۰ روپیہ ماہوار ہوگی۔

شجر کاری۔ تجویز یہ ہے کہ ۱۱ سال سے اوپر کی عمر کے ہر طالب علم کو کم سے کم ایک درخت لگانا ہوگا۔ یہ بڑے پیمانہ کی شجر کاری اسکیم کا ایک جز ہے جس کے تحت تعلیمی اداروں میں ٹیچروں اور طالب علموں کو جنگلات اور باغبانی کے محکموں کے کام سے وابستہ کیا جائے گا۔

ادارہ جاتی مالیات۔ فروری ۱۹۷۵ء اور ۳۱ جنوری ۱۹۷۶ء کے درمیان ۳۲۸ نئی اسکیمیں جن کی لاگت ۴۵، ۴۴ کروڑ روپیہ ہوتی تھی ادارہ جاتی مالیات کے لیے پیش کی گئیں جن میں سے ۵۰۰۸، ۴ کروڑ روپیہ دستیاب ہو سکا۔ ریاست کے تمام اضلاع کو ایکو شینیل رہن کی سہولت بہم پہنچانے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

اتر پردیش کا مغربی منطقہ ریاست میں اناج کی کھیتی تصور کیا جاتا ہے، تاہم زرعی زمرہ میں مزید پیداوار کی گنجائش نکل سکتی ہے بشرطیکہ زرعی آلات آبپاشی کی سہولتیں اور بجلی سپلائی تمام سطحوں پر مہیا ہوں۔ اس کے علاوہ مٹی کی جانچ کی سہولت نیز تحقیقاتی اور تکنیکی رہنمائی فراہم کرنے کی بھی ضرورت ہے تاکہ جدید زرعی طریقوں کو اپنایا جا سکے۔ ان مقاصد کے لیے ۳ کروڑ روپیہ کی رقم کا بندوبست کیا جا رہا ہے۔

★

اڑن طشتریاں — (صفحہ ۱۹ کا بقیہ)

کچھ اور ہے اسی طرح اڑن طشتریاں بھی دیکھنے میں اگرچہ خلائی راکٹ معلوم ہوتی ہیں مگر ان کی حقیقت انعکاس شعاع کے علاوہ کچھ اور نہیں۔ اس لیے مندرجہ ذیل شعر کا اطلاق اڑن طشتریوں پر بھی ہو سکتا ہے:۔

ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا

یہ بات قرین قیاس ہے کہ خلائی ٹکنالوجی کے بڑھتے ہوئے علم کی بدولت مسٹر ڈونلڈ۔ ایچ۔ منیزل کا نظریہ کہ اڑن طشتریاں محض منعکس برق رفتار کرنیں ہیں مستقبل قریب میں ایک حقیقت بن کر ہمارے سامنے آجائے مگر اس وقت تو اڑن طشتریاں خواہ ان کا وجود ہو یا نہ ہو ہمارے لیے ایک عجوبہ اور ایک معمہ بنی ہوئی ہیں۔

★

سید احمد علی شاہ (صفحہ ۱۳ کا بقیہ)

اس شہر کا نام معظم آباد رکھا۔

محبوب التاریخ کے آخر میں سید احمد علی شاہ نے گورکھپور کے مختلف محلوں، میلوں اور رئیسوں کا ذکر کیا ہے۔

سید احمد علی شاہ کی تصانیف کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان میں شعر گوئی کی صلاحیت موجود تھی۔ لیکن وہ ایک کہنہ مشق شاعر نہیں تھے۔ غالباً اس کا سبب یہ ہے کہ انھوں نے کسی استاد فن کی شاگردی اختیار نہیں کی اور نہ کسی سے اصلاح لی۔ اس لیے ان کے کلام میں بہت سی خامیاں فنی موجود

★

نقد و تبصرہ

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا لازمی ہیں)

دفتر والی سڑک (افسانوی مجموعہ) مصنف۔ ضیا حسنی

ملنے کا پتہ :۔ مکتبۂ دین و ادب۔ ۱۰۔ لاٹوش روڈ۔ لکھنؤ۔ ۲۔ سید افقر ضیا حسنی۔ چھوٹی بازار فتح پور (یوپی) قیمت: ۶ روپیہ۔ ضخامت ۱۸۱ صفحات

"دفتر والی سڑک" ضیا حسنی کے انیس مختصر افسانوں کا مجموعہ ہے، زیر بحث کتاب کا مطالعہ کرتے وقت جس چیز نے سب سے پہلے مجھے متوجہ کیا وہ ضیا صاحب کا "اظہارِ ذات" ہے یعنی وہ بیشتر افسانوں میں صیغہ واحد متکلم استعمال کرتے ہیں بقول مولانا آزاد مرحوم یہ محض "انا" کی ہیچ نہیں ہے بلکہ ایک "ادبی داؤ" بھی ہے۔ اس (شعوری یا غیر شعوری طور پر) مصنف کی "خودنوشت" بھی مرتب ہو جاتی ہے اور یہ بھی خدشہ نہیں رہتا کہ کوئی اپنی ہتک پر ازالۂ حیثیت عرفی کا مقدمہ دائر کرے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ضیا حسنی کی "میں" صرف فائدہ نمبر ۲ کے لیے ہے۔ فائدہ نمبر ایک ہم ایسے طالب علمان ادب یعنی تحقیق کے دلدادہ خود اٹھا لیں گے مثال کے طور پر اس مجموعے کے پہلے ہی افسانہ کا جائزہ لیجیے تو افسانہ کی ابتدا ان جملوں سے ہوتی ہے۔

"میں روزانہ اپنی الجھی شخصیت پر بیٹری لین کی گبَرڈین کا اسٹریٹ اور ٹینٹ کا خول چڑھا کر اسے سلجھا لیتا ہوں اور نو بجے گھر سے چل پڑتا ہوں" (دفتر والی سڑک صفحہ ۷)

اسی افسانے کا ایک جملہ یہ بھی ہے۔

"میری عجیب کیفیت ہے جسے دنیا ٹھکراتی ہے اسے میں دوڑ کر سینے سے لگا لیتا ہوں" (دفتر والی سڑک صفحہ ۹)

دوسری خصوصیت جو اس کتاب کے مطالعہ کے دوران قاری کے دامن دل کو اپنی طرف کھینچتی ہے یہ ہے کہ ضیا حسنی ہر وقت صرف اظہارِ ذات میں مشغول نہیں رہتے بلکہ وہ دوسروں کے دکھ درد میں بھی شرکت کرتے ہیں ان کا سماجی شعور کافی پختہ اور بالغ ہے مثلاً ان کے خیر سگالی کے یہ جذبات:۔

"شام اور میں، سوچو تو کتنا فرق ہے دونوں میں، ہزاروں میل دور بستیاں ایک قوم، ایک ملک تو کہلائی جا سکتی ہیں لیکن وہ ہم خیال ایک ہی جگہ بسنے والے مل نہیں سکتے اس لیے کہ وہ الگ خانوں میں بٹ چکے ہیں لیکن نہیں، نہیں، دنیا میں اب بھی انسان بستے ہیں کرۂ زمین کبھی انسانوں سے خالی نہ ہوگا۔ جن لوگوں کے دلوں میں درد ہے، بھائی چارے کا جذبہ ہے، وہ آہنی حدود کو توڑ کر بھی برابر ملتے رہیں گے"

ضیا حسنی کے یہاں اکثر لطیف طنز کے بڑے اچھے نمونے ملتے ہیں۔ ایک مثال ملاحظہ ہو

"شاہد! ہم لوگوں نے عمر کی اس منزل کو چھو لیا ہے کہ اب ان بیگمات کی شان میں قصیدے کہنے ہی میں عافیت ہے" (محبت کا پل صفحہ ۱۵۲)

بعض مقامات پر ضیا حسنی کا قلم بجائے افسانہ نگاری کے شاعری کرنے لگتا ہے وہاں یہ فیصلہ دشوار ہو جاتا ہے کہ وہ افسانہ نگار ہیں یا شاعر؟

غرض "دفتر والی سڑک" ہمیں ایک ایسے ضیا حسنی سے ملواتی ہے جو تعلیم یافتہ، نفیس مزاج اور گوناگوں خصوصیات کا حامل ہے۔ وہ ایک ایسا باشعور ادیب ہے جو بھرپور اور سرگرم زندگی گزارتا ہے۔ جو اچھی کتابیں پڑھتا ہے، اچھے دوستوں کی صحبت میں رہنا چاہتا ہے، بیوی بچوں سے پیار کرتا ہے دفتر بھی جاتا ہے، افسانہ نگاری بھی کرتا ہے، شعر بھی کہتا ہے، بیمار بھی ہوتا ہے، حسین و جمیل لڑکیوں سے رومان بھی کرتا ہے۔ گاؤں کا عاشق اور شہری زندگی کا قصیدہ خواں بھی ہے۔

اس کتاب کے مشمولہ افسانے ہماری موجودہ زندگی کے بہت سے گوشوں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ان میں انسانی نفسیات کی باریکیاں بھی ہیں، سیاسی نظریات بھی، قومی یک جہتی کا شعور بھی ہے۔ عورت مرد کے جذبات کا اتار چڑھاؤ بھی۔ عبارت آرائی بھی ہے، بذلہ سنجی، لطیفہ گوئی اور طنز بھی، مختلف مناظر کی تصویر کشی بھی ہے اور روزمرہ کے مسائل کی طرف واضح اشارہ بھی۔

مجھے یقین ہے کہ دفتر والی سڑک ضیا حسنی کو تخلیقی فن اور بقائے دوام کی اس منزل کی طرف لے جائے گی جو ارفع و اعلیٰ اور روشن و منور ہے۔

—— ڈاکٹر سید مجاہد حسین حسینی

"جدید ہندی شاعری" سمت و رفتار

مصنف: ڈاکٹر فضل امام۔ قیمت: سات روپے پچاس پیسے ضخامت ۸۰ صفحات ملنے کا پتہ: کتاب نگر دین دیال روڈ۔ لکھنؤ

اردو میں اپنی نوعیت کی غالباً یہ منفرد تصنیف ہے۔ جس میں پہلی بار "جدید ہندی شاعری" کی سمت و رفتار کا آج تک کا جائزہ لیا گیا ہے۔

ڈاکٹر فضل امام کسی تعارف کے محتاج نہیں، اس سے قبل ان کی تصنیفات و تالیفات اردو اور ہندی میں شائع ہو چکی ہیں۔ جن میں "بھوجپوری ادب کا تعارف"، "امیر اللہ تسلیم۔ حیات اور شاعری" "مثنوی شجرِ عشق" اور "اردو ساہتیہ: ایک جھلک" گراں قدر ہیں بہار اردو اکاڈمی پٹنہ اور اتر پردیش اکاڈمی، لکھنؤ نے ان کو اپنے گراں قدر انعامات سے نوازا بھی ہے۔ زیر تبصرہ کتاب کا آغاز "معیار تنقید" سے ہوتا ہے اور "نئی کویتا" پر اختتام ہوتا ہے۔ اس میں ہندی کے مختلف

شعری رجحانات مثلاً "دویدی جہد" "چھایا واد" "واد" "پرگتی واد" "پریوگ واد" "پرپدیہ واد" "نئی کویتا" پر مختصر بحث کی گئی ہے۔ چند نمایندہ شعرا پر بھی تنقید و تبصرے سے کام لیا گیا ہے جس سے ہر رجحان کی صحیح شکل اور رفتار واضح ہو گئی ہے۔ آخر میں جدید شعری رجحانات کا مختصر انتخاب بھی شامل ہے۔ جس سے ڈاکٹر فضل امام کی تنقیدی اور تحقیقی نگاہ کے ساتھ وسعت مطالعہ کا بھی قائل ہونا پڑتا ہے۔ لیکن اگر ڈاکٹر صاحب نے حواشی کے طور پر مشکل ہندی الفاظ کے معنی اور چند نمایندہ نظموں کا تجزیہ پیش کر دیا ہوتا تو یہ کتاب اور بھی وقیع ہو جاتی۔ پھر یہ تصنیف ان طلبا کے لیے بھی مفید ہے جو ایم۔ اے اردو میں کر رہے ہیں اور ساتھ ہی ان تمام لوگوں کے لیے بھی مفید ہے جو ہندی زبان و ادب کے سرمایے سے واقف ہونا چاہتے ہیں۔

— امیر احمد صدیقی

فخرالدین علی احمد مولفہ۔ مہ لقا اعجاز۔ صفحات ۸۰ قیمت پانچ روپے۔ پتہ: اسلامیہ بکڈپو۔ طلاق محل کانپور۔

اس کتاب میں مہ لقا اعجاز صاحبہ نے صدر جمہوریہ ہند جناب فخرالدین علی احمد صاحب اور ان کے خاندان اور متعلقین کے بارے میں معلومات فراہم کی ہیں۔ کتاب کا پہلا باب فخرالدین علی احمد صاحب کے صدارتی الیکشن کے سلسلے میں ہندوستان کے مختلف حلقوں کے تاثرات کے بارے میں ہے۔ دوسرے باب میں احمد صاحب کے حالات زندگی ہیں۔ تیسرا باب اسلاف اور غالب سے تعلق ہے۔ اس کے بعد صدر صاحب کے بھائی بہن جس میں خصوصی طور پر حمیدہ سلطانہ صاحبہ کا ذکر ہے۔ اس کے بعد خاتون اول صدر کی بیگم عابدہ احمد صاحبہ اور ان کے والد صاحب کا تذکرہ ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ کتاب مہ لقا اعجاز صاحبہ کی صدر صاحب کے بارے میں ایک عقیدت مندانہ کاوش قلم ہے جو قومی اعتبار سے قابل تعریف ضرور کہی جا سکتی ہے۔

شہیدانِ آزادی ہند مصنف۔ ایم۔ اے۔ رؤف۔ صفحات ۱۶۰ قیمت: آٹھ روپے۔ پتہ: اڈیٹر گلزار، یاقوت پورہ۔ حیدرآباد۔ ۲۳

اس کتاب میں ۲۹ شخصیتوں پر مختصر مضامین لکھے گئے ہیں جن کے مصنف شہیدان آزادی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ان میں کئی شخصیتوں کی موت قدرتی طور پر واقع ہوئی، ایسی صورت میں میرے خیال میں ان کو مجاہدین آزادی کے لقب سے یاد کرنا زیادہ مناسب ہوگا۔ اسی طرح کتاب کے مختلف مضامین بھی سطحی، غیر تحقیقی مبتدیانہ کوشش معلوم ہوتے ہیں جن کی زبان بھی معمولی اور ناقص ہے۔ شہیدان آزادی اور مجاہدین آزادی کے بارے میں کافی لکھا جا چکا ہے اور لکھا جا رہا ہے۔ رؤف صاحب ایک نظر ان تحریروں پر ڈال لیتے تو بہت اچھا ہوتا۔

ذکی کاکوروی

آئینہ: مجموعہ کلام۔ تاج پیامی ناشر: حلقۂ احباب۔ آرا بہار قیمت:۔ ۳ روپے ۵۰ پیسے۔ صفحات: ۴۳۰

جیسا کہ درج بالا تفصیلات سے واضح ہے کہ آئینہ تاج پیامی صاحب کے شعری مجموعہ کا نام ہے۔ جسے حلقۂ احباب آرا نے نہایت اہتمام سے شائع کیا ہے اور اردو اکیڈمی بہار نے اس کو انعام سے سرفراز فرمایا ہے۔ تاج صاحب جواں سال شاعر ہیں مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے قدیم شعرا اور اردو کی روایتی شاعری کے اثرات بہت زیادہ قبول کیے ہیں۔ دو نئی نسل سے تعلق رکھنے کے باوجود قدیم روایتی رنگ سخن کے غزل گو معلوم ہوتے ہیں چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

مرے اقرار گنہ پر مجھ کو جنت مل گئی
اے فرشتو اب کہو حشر اپنی تم تحریر کا

واعظ ذرا انھیں بھی نصیحت کے چند گھونٹ
جن کو خبر نہیں ہے کہ عاشق کا دل ہے کیا

زاہد بھی میکدے میں نظر آ رہا ہے آج
کیا اس کو ڈر نہیں ہے حساب و کتاب کا

بندھے ہیں سبحہ و زنار کے رشتے میں جب دونوں
نہ جانے کیوں ہے اَن بن اس قدر شیخ و برہمن میں

مندرجہ بالا اشعار تاج پیامی صاحب کے مزاج و مذاق کو سمجھنے کے لیے کافی ہیں۔ مجھے امید ہے کہ وہ اپنے تخلیقی سفر کو جاری رکھیں گے اور خوب سے خوب تر کی جستجو ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کو جلا بخشتی رہے گی۔

—— ساغر مہدی

جلد ۳۴ نمبر ۳

جون سنہ ۱۹۷۶ء

ایڈیٹر: خورشید احمد

جوائنٹ ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی

★

روی موہن سیٹھی

ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات اترپردیش

پرنٹر: اشوک در

سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ واسٹیشنری یوپی
مطبوعہ نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ
شائع کردہ محکمۂ اطلاعات اترپردیش

قیمت فی شمارہ: پچاس پیسے
زرسالانہ پانچ روپے

ترسیل زر کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ پرکاشن پربھاگ، انفارمیشن ڈپارٹمنٹ یو۔پی لکھنؤ
خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶۔ لکھنؤ
بذریعہ رجسٹری: ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن ڈپارٹمنٹ یو پی لکھنؤ

عنوانات

نیا دور کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ حکومت اترپردیش ان سے بہر حال متفق ہو

اپنی بات

حال ہی میں ملک کی محبوب رہنما وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے دو اہم تاریخی فیصلے کیے ہیں جو ان کی سوجھ بوجھ، دور اندیشی، صلح جوئی اور امن دوستی کا بیّن ثبوت ہیں۔ ایک تو چین سے سفارتی تعلقات کے درجہ کو بلند کرنا اور دوسرے ہندستان اور پاکستان کے درمیان تمام منقطع رشتوں کی بحالی۔ ان دونوں ملکوں کے درمیان سفارتی تعلقات دسمبر ۱۹۷۱ء میں پاکستان نے منقطع کر لیے تھے۔ لیکن دونوں ممالک کے باہمی مفاد کا یہ تقاضا تھا کہ دونوں پڑوسی ممالک کے درمیان سفارتی تعلقات اور سفر کی سہولتیں جلد از جلد بحال ہو جائیں۔ چنانچہ وزیر خارجہ ہندستان نے گزشتہ ۱۸ مئی کو جب پارلیمنٹ میں یہ اعلان کیا کہ ہندستان اور پاکستان کے درمیان سفارتی تعلقات، فضا، ریل اور سڑک کے ذریعے آمد و رفت کے منقطع رشتے ۱۰ جولائی سے ۲۴ جولائی کے درمیان بحال ہو جائیں گے تو ہر طرف سے نعرہ ہائے تحسین بلند ہوئے۔ اس سلسلے میں ہندستان اور پاکستان میں سکریٹریوں کی سطح پر تین روزہ گفتگو ۱۲ مئی سے ۱۴ مئی تک اسلام آباد میں ہوئی تھی۔ اس گفتگو کی کامیابی کے لیے ہر طرح سے ماحول سازگار تھا کیونکہ دونوں ممالک نے تعاون اور مفاہمت کی ضرورت کو محسوس کر لیا تھا۔ اس سمجھوتے سے دونوں ممالک کے درمیان پائی جانے والی بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی اور مفاہمت کا ایک نیا ماحول پیدا ہوگا۔ اگر برصغیر میں مفاہمت اور باہمی اعتماد قائم رہے گا تو دونوں ممالک اپنی اپنی صلاحیتوں اور وسائل کا پورا پورا فائدہ اٹھا سکیں گے۔ وزیر خارجہ شری چوان نے اس موقع پر پارلیمنٹ کو مطلع کیا کہ جولائی ۱۹۷۲ء میں شملہ سمجھوتے پر دستخط ہونے کے وقت سے ہندستان کی پالیسی برابر یہی رہی کہ ہندستان اور پاکستان کے منقطع رشتے نہ صرف بحال ہوں بلکہ دونوں ملکوں کے رشتے اس شملہ سمجھوتے کی روشنی میں استوار بھی کیے جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس درمیان میں کئی مسائل حل کر لیے گئے۔ دونوں کے درمیان ڈاک سروسیں اور ٹیلی مواصلات پھر قائم ہوئے اور سفر کی سہولتیں فراہم کرنے کے لیے ویزا سمجھوتہ پر دستخط ہوئے۔ گزشتہ سال جنوری میں جہاز رانی اور تجارت کے بارے میں بھی سمجھوتہ ہوا۔ لیکن شملہ سمجھوتے کی بعض دیگر مدیں جن میں خاص فضائی اور زمینی راستوں سے آمد و رفت اور سفارتی تعلقات کی بحالی بھی، طے نہیں ہو پائی تھیں۔ اب وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کی خصوصی دلچسپی اور کوششوں سے یہ مسائل بھی طے ہو گئے ہیں جس کا عام طور سے خیر مقدم کیا گیا ہے۔

ریاست اترپردیش ۲۰ نکاتی معاشی پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے پوری طرح سرگرم عمل ہے۔ وزیر اعلیٰ شری نرائن دت تیواری نے حال ہی میں یہ اعلان کیا کہ حکومت ایسے تمام افراد سے سختی سے پیش آئے گی جو وزیر اعظم کے معاشی پروگرام میں رکاوٹ ڈالیں گے۔ انھوں نے سرکاری افسر اور ملازمین کو بھی متنبہ کیا کہ اگر وہ پروگرام پر عمل در آمد کے سلسلے میں کسی قسم کی تساہلی برتیں گے یا دشواریاں پیدا کریں گے تو ان کے خلاف سخت کارروائی کی جائے گی۔ ہماری ریاست نے ۲۰ نکاتی معاشی پروگرام پر عمل در آمد کرنے میں ابتدا ہی سے بڑی مستعدی دکھائی ہے۔ اس پروگرام کو بروئے کار لانے کے لیے ایک جامع اسکیم وضع کی گئی جس میں حکومت کے مختلف محکموں، ریاست کے عوام اور ان کے نمائندوں، مالیاتی اور امداد باہمی اداروں وغیرہ کو پوری طرح سے مستعد اور سرگرم عمل بنانے کے اقدامات کیے گئے۔ ہر سطح پر کام کی رفتار کا جائزہ لیا جا رہا ہے۔ اس پروگرام سے ہر شعبۂ زندگی میں جوش اور امنگ کی لہر دوڑ گئی ہے، اس سلسلے میں اب تک کافی کام ہو چکا ہے اور ۲۰ نکاتی معاشی پروگرام کے مقررہ نشانہ کو پورا کرنے کے لیے ریاست تیزی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ اس پروگرام کو آگے بڑھانے اور اس پر عمل در آمد کی نگرانی کے واسطے حکومت کی سطح پر چیف سکریٹری برانچ میں ایک کمشنر کی نگرانی میں مخصوص شعبہ قائم کر دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ریاستی سطح پر ایک عمل در آمد کمیٹی کی بھی تشکیل کی جا چکی ہے۔ اب ہم سب کا یہ فرض ہے کہ اس عظیم مہم کو کامیاب بنانے کے لیے حکومت کو اپنا پورا پورا تعاون دیں۔

آئندہ ۲۶ جون کو ملک میں ایمرجنسی کے نفاذ کا ایک سال پورا ہو جائے گا۔ ہم سب اس بات سے بخوبی واقف ہیں کہ ملک میں بعض سیاسی جماعتوں اور سماج دشمن عناصر نے ایسے حالات پیدا کر دیے تھے کہ اگر صدر جمہوریہ ہند نے ایمرجنسی کا اعلان بر وقت نہ کر دیا ہوتا تو ہماری آزادی ہی خطرے میں پڑ گئی تھی۔ اب یہ حقیقت واضح ہو کر سامنے آگئی ہے کہ ایمرجنسی کے نفاذ کے بعد ملک میں ہر طرف ضبط و نظم، امن و قانون اور تحفظ کی نہ صرف ایک فضا قائم ہو گئی ہے بلکہ ہر شعبۂ زندگی اور ہر پیداواری زمرے میں ترقی دکھائی دے رہی ہے۔ ایمرجنسی کی عطا کردہ نعمتوں اور اس دوران میں جو کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں نیز ۲۰ نکاتی معاشی پروگرام پر عمل در آمد کے سلسلے میں جو سرگرم کوششیں جاری ہیں ان سے لوگوں کو واقف کرانے کے لیے نیا دور کا ایک خصوصی نمبر "ایمرجنسی کا ایک سال" شائع کیا جا رہا ہے۔ ہمارا یہ خصوصی نمبر ۲۱ جون ۱۹۷۶ء کو شائع ہوگا جو جولائی کا شمارہ تصور کیا جائے گا۔ اس نمبر کی اشاعت کے بعد ہمارا اگست کا نمبر شائع ہوگا۔ قارئین نیا دور نوٹ فرمالیں۔

——— ایڈیٹر

اے ہم سفرو!

نازش پرتاپ گڈھی

عجب مقام پہ آیا تھا کاروانِ وطن
جہاں زمیں پہ لہو تھا تو آسمان پہ آگ
ہر ایک سمت اندھیرا تھا تنگ ذہنی کا
ہر ایک موڑ پہ فرقہ پرستیوں کے تھے ناگ

وہ زہر پھیل چکا ہے جو ہر رگ و پے میں
اسے مفاد پرستوں ہی نے اچھالا تھا
جو شاہراہوں پہ بیٹھا تھا پھن اٹھائے ہوئے
ہمارے دوست نما دشمنوں نے پالا تھا

بھلا وہ دیتے ہمیں کس طرح کوئی تریاق
جو لوگ زہر کو ڈرتے تھے زہر کہتے ہوئے
وہ کیوں تلاش ہی کرتے حیات کا سورج
جو کانپتے تھے اندھیروں کو قہر کہتے ہوئے

عمل کا نام تو تھا ہر زبان پر لیکن
جو بار ور ہو وہ کوشش کبھی نہ ہوتی تھی
پیامِ امن تو ملتا تھا سب کے ہونٹوں پر
قیامِ امن کی خواہش کبھی نہ ہوتی تھی

وہ قتل و خون وہ غارت گری وہ بربادی
انھیں کی ذات سے تھی جن کے روپ دہرے تھے
وہ طرح طرح کی سینائیں، فوجی تنظیمیں
کھلاڑی اور کوئی تھا وہ صرف مہرے تھے

ہزار شکر کہ پھیلے ہوئے اندھیروں میں
چراغِ فکر و نظر روبکار آ ہی گیا
نگاہِ شوق کو مل ہی گئے مناظرِ حسن
دلِ غریب کو آخر قرار آ ہی گیا

تباہیوں کا سبب تھا خود اپنی کمزوری
بجا نہ ہوگا جو الزام دوسروں پہ دھریں
یہ دور وہ ہے کہ جس میں کوئی کسی کا نہیں
یہ دور وہ ہے کہ اپنی مدد خود آپ کریں

بجا کہ راہبر دور بیں ملا ہے مگر
تم اپنے ذوقِ سفر کو بھی ہوشیار کرو
نہیں ہے اب کوئی کانٹا تمھارے رستے میں
قدم کو تیز، نظر کو بھی ہوشیار کرو

بجا، پیامِ عمل مل گیا تمھیں لیکن
تم اپنی قوتِ عزم و عمل بھی پہچانو
حیات چھین لو وقتِ رواں کے ہاتھوں سے
حیات بھیک میں ملتی نہیں ہے دیوانو

مرزا جعفر حسین

رئیسوں کے دسترخوان

گذشتہ لکھنؤ کی ایک جھلک

ہمارا شہر لکھنؤ نفاست، نزاکت اور تنوع کے لیے مشہور تھا۔ یہاں کے پرانے باشندے اپنی اپنی حسب استطاعت اِن خصوصیات کا ہر موقع اور ہر محل پر خیال رکھتے تھے اس طرح اُن کی جبلت میں یہ اوصاف داخل ہو گئے تھے لہٰذا رہن سہن ہو یا لباس و طعام، زندگی کی ہر ضرورت کی فراہمی میں آرٹ کو دخل تھا۔ رؤسا کے محلوں اور محل سراؤں میں ایجادات و اختراعات ہوتے رہتے تھے اور اُن کے مقربین و مصاحبین کی وساطت سے یہ فنکاریاں عوام تک پہنچ جاتی تھیں اور وہ اپنی حیثیت کے تحت اُن میں ردوبدل کرکے اُن کو اپنا لیتے تھے۔ اس عمل ردوبدل کا لازمی نتیجہ تھا کہ ہر ہر چیز میں رنگ آمیزیاں اور گل کاریاں بڑھتی ہی رہتی تھیں یہی طریقہ کار غذاؤں کے سلسلہ میں بھی تھا۔ چنانچہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہمارے بزرگوں نے کھانا پکانے، کھانا کھانے اور کھانا کھلانے کو فن کے درجہ تک پہنچا دیا تھا جس کے نتیجہ میں اس شہر نے بہتر سے بہتر باورچی پیدا کیے اور طرح طرح کے لذیذ، خوش گوار، خوش رنگ و خوش ذائقہ غذائیں معرض وجود میں آ گئیں۔ اُنیسویں صدی کے آخر تک دسترخوانوں کا دور دورہ تھا اور ہر رئیس کے دسترخوان کی کوئی نہ کوئی نعمت ممتاز حیثیت کی مالک تھی۔ ان میں سے اکثر و بیشتر غذائیں تو درکنار ان کے نام تک مفقود ہو گئے اور جو نام یاد بھی ہیں تو ان ناموں کی بعض غذائیں اپنی اصل شکل و صورت اور ذائقہ میں عنقا ہیں۔ مثلاً میرے نانا مرحوم کے دسترخوان کے کباب "کوفتۂ معلائے عجمی" کا نام بھی شاید اب کسی کو یاد ہو یا جد امجد خان علامہ کے دسترخوان کی اکثر و بیشتر غذاؤں میں "سلطانی دال" اور "بادشاہ پسند دال" کے صرف نام باقی رہ گئے ہیں۔

غذاؤں کی طرح کھانا کھانے میں بھی التزام رہتا تھا۔ رئیسوں کا دسترخوان اُن کی مرضی سے بچھتا تھا کہنے کو وقت مقرر تھا مگر دورِ جدید کے اسلوب کی طرح وقت کی پابندی نہیں تھی۔ لیکن دو بجے دن کے اندر اندر ہر دسترخوان برخاست ہو جاتا تھا۔ بعض رئیس دونوں وقت محل کے باہر ہی "خاصہ نوش فرماتے تھے" لیکن قریب ہر رئیس کا ایک وقت دسترخوان اُس کی بیرونی نشست گاہ میں ضرور بچھتا تھا اور اس وقت جتنے بھی عزیز و اقارب دوست احباب اور متعلقین و مصاحبین موجود ہوتے سب کا شریک طعام ہونا ضروری تھا۔ انکار کرنا رئیس کی اہانت کے برابر ہوتا تھا۔ تواضع رئیسوں کی خمیر میں داخل تھی اور بعض محل سراؤں میں تواضع کا چلن اجنبی آنے والوں کے لیے تکلیف کا باعث ہوتا تھا۔ شہزادہ نواب باقر علی خاں کے یہاں ہر ملاقاتی کو کھانا کھانا فرض تھا۔ عذر خواہی شہزادہ موصوف کی شدید ترین غضبناکی کا باعث ہوتی تھی۔ ان کا باورچی خانہ صبح سویرے سے گیارہ بجے رات تک گرم رہتا تھا اور ہر آنے والے کو بہترین اور لذیذ غذاؤں کے علاوہ گرم گرم تازہ چپاتیاں پیش کرنا ضروری تھا۔ وہ خود علیحدہ اور انتہائی نرم اور ہلکی غذائیں کھاتے تھے لیکن دوسروں کو بہترین خوش ذائقہ

کھانے کھلا کے لطف حاصل کرتے تھے۔ شہزادہ موصوف نے لکھنؤ میں دو نئے چلن رائج کر دیے تھے۔ وہ پہلے شخص تھے جن کے یہاں مشاعرہ دن کو منعقد ہوا اور وہ پہلے رئیس تھے جس نے کرسی میز پر کھانا کھایا اور کھلایا۔ اُن کے علاوہ ہر رئیس کے یہاں دستر خوان بچھتا اور دستر خوان پر کھانا کھانا آدابِ تہذیب میں داخل تھا۔

دستر خوان بچھنے کا حکم صادر ہونے اور دستر خوان پر کھانا شروع ہونے میں اچھا خاصا وقت صرف ہو جاتا تھا اور اگر رئیس نے اپنی نشست گاہ ہی میں دستر خوان آ جانے کا فیصلہ کر لیا تو اس وقفہ میں اور زیادہ طوالت ہو جاتی تھی کیونکہ ملازمین کی تعداد زیادہ ہوتے ہوئے بھی انھیں پہلے ہاتھ دُھلانے کے لیے لوٹے اور سلفچیاں لانا پڑتی تھیں، کھانے پر پانی پلانے کا بھی ضروری بند و بست کرنا پڑتا تھا۔ ان انتظامات کے مکمل ہو جانے کے بعد دستر خوان بچھتا اور بسرعت تمام ملازمین باورچی خانے سے کھانے لاتے تھے۔ ان ملازمین کی حیثیت قلیوں کی سی ہوتی تھی جو کھانے خوانوں میں اپنے سروں پر لاتے تھے۔ ان کو رئیس کی حضوری میں حاضر ہونے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ ان خوانوں سے طشتریوں، پلیٹوں اور پیالیوں میں لگے ہوئے کھانے خدمت گار نکال نکال کے دستر خوان پر لگاتے تھے۔ اُس زمانہ میں ڈشوں اور ڈونگوں میں کھانے پیش کرنے کا دستور نہیں تھا۔ کھانے والے کے سامنے ہر چیز علیحدہ علیحدہ برتنوں میں لگائی جاتی تھی۔ البتہ گرم گرم پلاؤ، مزعفر، متنجن یا اور دوسری مخصوص میٹھی غذائیں بڑی بڑی قابوں میں دستر خوان پر لگا دی جاتی تھیں۔ رئیس کے لیے مخصوص طور پر کم سے کم دو اور کبھی کبھی اس سے زائد اس کی پسندیدہ اور مرغوب غذائیں تیار کی جاتی تھیں انھیں غذاؤں کے نام سے اُس کا دستر خوان مشہور ہوتا تھا۔ یہ غذائیں رئیس خود نوش کرتا اور اپنی حسبِ مرضی دوسروں کو پیش کر دیتا لیکن وضعداری میں داخل تھا کہ شریکِ طعام ہونے والے کو وہ غذائیں پہلے پیش کی جائیں اور مصاحبین میں باری باری ہر ایک کو وہ کھانے بھی ضرور میسر آ جائیں۔

رئیسوں کی دوسرے رئیس کے یہاں ضیافت یا اتفاقیہ طور پر دستر خوان میں شرکت کبھی کبھی مقابلوں کا باعث بن جاتی تھی۔ ایک دوسرے کو مدعو کرتا اور ضیافت میں تنوع یا ذائقہ و رائحہ میں سبقت لے جانے کی کوشش کرتا تھا۔ اس مقابلہ بازی نے باورچیوں کی ہنرمندیوں میں بھی چار چاند لگا دیے تھے۔ ایسی داستانیں، قصے اور واقعے بکثرت مشہور تھے اور راقم الحروف کے بھی علم و یقین میں آئے جب غذاؤں کے مقابلے میں رئیسوں نے مغالطے کھائے تھے لیکن اس سلسلہ میں صرف وہ تاریخی واقعہ پیش کر دینا کافی ہے جو بادشاہ واجد علی شاہ اور مرزا آسمان قدر بہادر کے دستر خوان پر ظہور پذیر ہوا تھا۔ بادشاہ کے یہاں شہزادہ شریکِ طعام تھے بادشاہ کے دستر خوان پر منجملہ دوسری چیزوں کے ایک ایسی غذا بھی موجود تھی جو دیکھنے میں نہایت نفیس اور جاذبِ نظر مربّہ معلوم ہوتی تھی لیکن شہزادہ مرحوم نے نوش کیا تو حیران رہ گئے کیونکہ وہ حقیقتاً گوشت کا نمکین قورمہ تھا۔ پکانے والے نے اپنی ہنرمندی سے مربّہ کی شکل اور صورت بنا دی تھی۔ کچھ دنوں کے بعد مرزا آسمان قدر نے واجد علی شاہ کی دعوت کی۔ بادشاہ یہ سمجھ کر گئے تھے کہ ان کو دھوکا دیا جائے گا مگر پھر بھی دھوکا کھا گئے۔ شہزادہ بہادر کے دستر خوان پر صدہا کھانے چنے ہوئے تھے۔ طرح طرح کے پلاؤ، مختلف طرز کے زردہ و مزعفر، متعدد قسم کی بریانی، طرز طرز کے کباب، طرح طرح کے قورمے، بے شمار ترکاریاں، پراٹھے، شیرمالیں، اچار چٹنیاں غرضکہ ہر نعمت موجود تھی لیکن ہر چیز شکر کی بنی ہوئی تھی، یہاں تک کہ تمام برتن، دستر خوان، سلفچی اور آفتابہ تک شکر کے بنے ہوئے تھے۔ بہت ممکن ہے کہ لوگ اس واقعہ کو افسانہ سمجھیں لیکن یہ واقعہ سرتاسر حقیقت ہے جو پرانی قلمی بیاضوں اور تاریخوں میں مندرج ہے۔ اس واقعہ کو میں نے اپنے بزرگوں کی زبانی سُنا تھا۔

مرزا آسمان قدر بہادر کے صاحب زادے مرزا ثریا قدر بہادر کے خویش کی زبانی بھی سنا تھا اور ایک قلمی نسخہ میں بھی پڑھا تھا۔

اسی سلسلہ میں ایک واقعہ اور یاد آتا ہے جو مستند ہے۔ نصیر الدین حیدر کے دور میں ایک معزز مہمان غالباً دلّی سے تشریف لائے تھے مہمان داری کے آداب ملحوظ رکھتے ہوئے اُن سے دریافت کیا گیا کہ اُن کو کون غذا مرغوب ہے۔ انھوں نے جواب دیا کہ میری رغبت کو جانے دیجیے میں لکھنؤ کی پکی ہوئی ماش کی دال کی کھچڑی چاہتا ہوں جس کی میں نے بہت تعریف سنی ہے۔ چنانچہ اس کھچڑی سے اُن کی ضیافت ہوئی۔ شاہی باورچی نے بادام کے سڈول اور صاف چاول اور پستہ کی دال تیار کرکے کھچڑی پکا دی تھی جو دیکھنے میں بجنسہ دھوئی ہوئی ماش کی کھچڑی نظر آتی تھی لیکن کھانے میں لذت ہی اور تھی بادشاہان اور رئیسوں کی قدردانی کی بدولت اس شہر کے باورچیوں نے کھانا پکانے کے فن کو معراج کمال تک پہنچا دیا تھا چنانچہ یہ واقعہ بھی مشہور ہے کہ محمد علی شاہ کے ایک صاحب زادے نے ایک شادی کے موقع پر اپنے سمدھی صاحب کی دعوت کی تھی تو اُن کے دسترخوان پر میٹھے اور نمکین سب شامل کرکے ستر قسم کے پلاؤ اور مزعفر تھے۔ یہ واقعات و حالات تو طاقِ نسیاں کی زینت بن چکے ہیں، ان کا ذکر صرف اس لیے کیا گیا کہ لکھنؤ کے حالات بگڑ جانے کے بعد بھی بیسویں صدی کے اوائل میں اتنے برقرار تھے کہ راقم الحروف کو بھی سات قسم کے پلاؤ کھانا مقدر میں لکھا تھا انھیں سات قسموں میں انار دانہ اور نورتن پلاؤ بھی تھے۔ انار دانہ پلاؤ میں چاول کا ہر دانہ آدھا یاقوت کی طرح سرخ اور آدھا سفید ہوتا تھا۔ نورتن پلاؤ میں نو رنگ کے چاول علیحدہ علیحدہ نظر آتے تھے اور اپنی چمک دمک سے دسترخوان کی زینت بن جاتے تھے۔

بادشاہوں اور شہزادوں کے دسترخوان تو اپنی آپ مثال تھے۔ اسی شہر میں کوئی ایسا رئیس نہیں تھا جس کا دسترخوان کسی نہ کسی نہج سے قابل تعریف نہ رہتا ہو۔ ہر دسترخوان پر ذائقہ، خوشبو اور خوش رنگی کا لحاظ برابر رکھا جاتا تھا اور ستول کے اعتبار سے غذاؤں میں تنوع ہوتا تھا۔ اس زمانہ میں تقریباً تمام ضروری اجزا پاک وصاف اور اعلیٰ قسم کے ملتے تھے۔ زیادہ تر کھانوں میں زعفران اور کیوڑہ برابر استعمال ہوتا تھا، خالص اور خوشبودار مسکا گھی میسر تھا اس لیے لذت اور خوشبو کے لیے کسی خاص اہتمام کی ضرورت نہیں تھی البتہ رنگ اور طرح طرح کے رنگ لانے میں صنعت گری اور فنکاری کا مظاہرہ ہوتا تھا۔ باورچیوں کا تذکرہ لاحاصل ہے، گھروں کے اندر کھانا پکانے والی مامائیں اور بیگمات بھی بہتر سے بہتر کھانا پکاتی تھیں اور فنکارانہ صلاحیت کی مالک تھیں۔ آخری دور کا ذکر کرتے ہوئے یہ یاد آتا ہے کہ برادر مرحوم جعفر علی خاں اثر کی اہلیہ بہترین شش رنگا تیار کرتی تھیں جو اثر مرحوم کے دسترخوان پر قریب قریب ہر روز رہنا ضروری تھا۔ شش رنگا اپنے رنگ، خوشبو اور ذائقہ کے اعتبار سے بے حد لذیذ اور مفرح میٹھی غذا ہے جو سیب، گاجر، اناناس اور سبز چنے سے تیار ہوتا تھا دیکھنے میں ایک ہی برتن میں چھ رنگ علیحدہ علیحدہ نظر آتے تھے جو مجموعی طور سے بے حد جاذبِ نظر ہوتے تھے اور کھانے میں ہر رنگ والے حصہ کا علیحدہ لطف اور علیحدہ مزا ہوتا تھا۔ شش رنگے کے علاوہ ایک میٹھی غذا بھی دسترخوانوں کی زینت ہوتی تھی اس کو یاقوتی کہتے تھے اور جو بے حد مقوی اور مفرح سمجھی جاتی تھی اس کا رنگ یاقوت کی طرح ہوتا تھا اور اس پر پستہ کی ہوائیاں چھڑک کر اور چاندی کا ورق لگا کے اس کی لطافت و زیبائی کو دوبالا کر دیا جاتا تھا۔ اس غذا کو ہمیشہ مٹی کے برتن میں پکا کر نکالا جاتا تھا تاکہ سوندھا پن بھی آجائے۔

ذائقہ رنگ اور خوشبو کے علاوہ رئیسوں کی اولوالعزم طبیعت کو تنوع کا بھی بہت شوق تھا اور یہ شوق لکھنؤ کے زوال تک برقرار رہا تھا۔ چنانچہ میرے ایک عزیز اور مخلص دوست مرزا بہادر مرزا محمد صادق علی خاں نے جن کا دسترخوان بھی ایک زمانہ میں بہت وسیع تھا، ایک مرتبہ ناسازیٔ مزاج میں باورچی سے متغصّص ہو کر یہ فرمادیا تھا کہ بتیس ۳۲ قسم کی چٹنیاں اور تینتیس ۳۳ قسم کی کھچڑیاں پکائی جائیں۔ میں نے کوشش کرکے اس دسترخوان پر شرکت کی تھی اور وہاں حقیقتاً اتنی ہی قسم کی چٹنیاں اور کھچڑیاں موجود تھیں لیکن اس تمام ذوق تنوع کے مقابل میں یہ بات بھی کہنے میں آتی ہے کہ ایک خوراک ہر رئیس کے دسترخوان پر دونوں وقت اور ہر روز ضرور رہتی تھی اور وہی اس کی مخصوص ترین غذا ہوتی تھی۔ اس غذا کو قورمہ کہتے تھے جو گوشت کا عموماً پکتا تھا لیکن موسم سرما میں بادام کا قورمہ بھی استعمال ہوتا تھا۔ اس غذا کی یہ تعریف تھی کہ بلاناغہ دونوں وقت کھانے کے بعد بھی دل نہیں بھرتا تھا اور اس کا شامل طعام ہونا بیحد ضروری تھا۔ اس کھانے کا اب تک نام باقی ہے۔ ہر سادہ پکا ہوا گوشت قورمہ کہلاتا تھا لیکن وہ چیز جسے قورمہ کہتے تھے اب کہیں نصیب نہیں ہوتی۔ راقم الحروف نے اپنا گھر تو درکنار کسی بڑے سے بڑے تعلقدار یا کسی بڑی سے بڑی ضیافت میں وہ قورمہ نہ دیکھا اور نہ چکھا جو بیسویں صدی کی تیسری دہائی تک ہمارے بہت سے خاندانوں میں ہر روز پکتا تھا۔ نہ اس کے لوازمات بازار میں ملتے ہیں اور نہ وہ پکانے والے باقی رہ گئے ہیں۔

دسترخوان پر تمام انواع و اقسام کے کھانے لگ جانے کے بعد رئیس معہ اپنے شرکائے طعام کے کھانا کھانے کے لیے صدر مقام پر بیٹھتا، اس کے دونوں جانب احباب، مہمان یا مخصوص مقربین بیٹھتے تھے اور سامنے کی قطاروں میں ملازمین اور مصاحبین کی جگہ ہوتی تھی۔ یہ دونوں صفیں دسترخوان کی لمبائی میں بیٹھتی تھیں اور چوڑائی میں عموماً دونوں طرف جگہیں خالی رہتی تھیں۔ کھانے کا سلسلہ دیر تک چلتا تھا اور اس تمام وقت میں جو جس طرح بیٹھتا بیٹھا رہتا تھا۔ شاعروں میں شعرا تمام رات ایک ہی طرح جیسے بیٹھ گئے بیٹھے رہتے تھے یہی آداب دسترخوان پر بھی ملحوظ رہتا تھا۔ پہلو بدلنا تہذیب سے بعید تھا۔ البتہ مختلف لوگوں کے بیٹھنے کا انداز مختلف ہوتا تھا کھانا بہت آہستہ آہستہ کھاتے تھے اور اس آہستگی میں طوالت کلام سے اور اضافہ ہو جاتا تھا۔ باتیں سنجیدہ نہیں ہوتی تھیں لیکن پُرلطف اور دلچسپ ہوا کرتی تھیں۔ مصاحبین اپنے رئیس کا دل خوش کرنے کے لیے کسی مخصوص غذا کا نام لے کر ضلع جگت میں ایک دوسرے سے مکالمہ کرتے، ادبا اور شعرا شریک طعام ہوتے تو وہ اپنے رنگ کی گفتگو کرتے لیکن دوران طعام کسی مابہ النزاع کا تذکرہ آجانا محال تھا بے تکلف دوست مزاح بھی کر لیتے تھے۔ چنانچہ ایک دسترخوان پر میرے حقیقی پھوپھا حکیم محمد باقر مرحوم نے باقوتی کو روغنی سکوری سے کسی قدر کھرچ کر کھایا تھا تو جناب میر علی محمد صاحب عارف[1] مرحوم نے جو شریک طعام تھے برجستہ فرمایا کہ "یہ کیا" انھوں نے جواب دیا کہ بہت سوندھی ہے۔ عارف صاحب مرحوم نے یہ فقرہ کہا کہ دسترخوان پر جو ٹکڑا اگر جائے اس کو اٹھا کر کھا لینا چاہیے۔ جنت میں حور ملے گی۔ مرحوم مولانا سید محمد رضا صاحب بھی تشریف فرما تھے انھوں نے متبسم ہو کر فرمایا کہ جو دسترخوان کی کھچی کھا جائے اس کو ستر حوریں ملنا چاہئیں۔ غرضکہ پڑھے لکھے شائستہ اور جلیل المرتبت لوگوں میں بھی دسترخوان پر مزاح ہو جایا کرتا تھا۔

وہ دور ختم ہو گیا، وہ رئیس مٹ گئے، ان کے دسترخوان اُٹھ گئے، اور کھانا کھانے والوں کے ساتھ کھانا پکانے والوں کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ اب ہم میز کرسی پر کھانا کھانے کے خوگر

---

[1] جناب عارف مشہور مرثیہ گو میر خورشید علی نفیس کے نواسے اور پوتے اور سید محمد حیدر جلیس کے بیٹے تھے، آپ کی ولادت ۱۸۶۰ء میں ہوئی، وفات ۱۳ ذی الحجہ ۱۳۳۴ھ۔ ۱۹۱۶ء کو اپنے ماموں اور شاگرد دولھا صاحب عروج کے یہاں جاتے ہوئے حرکت قلب بند ہو جانے سے ہوئی۔ انیس کے انتقال کے وقت عارف کی عمر ۱۴ سال کی تھی۔

ہیں، دوران طعام باتیں بھی کرتے ہیں لیکن ہماری "ٹیبل ٹاک" حالات کے تحت "بزنس ٹاک" ہوتی ہے اور کثرت کار کے باعث زیادہ وقت بھی میز پر خرچ نہیں کر سکتے یہ تغیر اس لیے ظہور پذیر ہوا کہ قدریں بدل گئیں، پرانے کلچر کی جگہ نئے کلچر نے حاصل کر لی ہے اور یہ نیا کلچر اتنی شدت کے ساتھ حاوی ہے، ہم پرانے زمانے کے طور طریقوں کی نکتہ چینی کرتے ہیں اور اُس دَور لکھنؤ کو تعیش اور اصراف کا عہد قرار دیتے ہیں موجودہ تغیر ناگزیر تھا مگر یہ عیب جوئی بڑی حد تک صحیح نہیں۔ ہے ممکن ہے کہ جو کچھ ہمارے لیے تعیش ہو وہ ہمارے اجداد کی ضرورت رہی ہو اور اصراف کا الزام تو یقیناً غلط ہے۔ ہمار باورچی خانے کے اخراجات فی زمانا پہلے کے مقابلہ میں بدرجہا زائد ہیں اور موجودہ اخراجات خود ہماری ہی کفالت کے لیے حسب مراد کافی نہیں ہیں چہ جائیکہ بے شمار دوسرے لوگوں کو بھی آسودہ کرنا جیسا کہ پہلے ہوا کرتا تھا۔ بہرحال ہم کو اپنے ہی زمانہ کی قدر کرنا ہے اور اسی زمانہ میں زندگی بسر کرنا ہے مگر افسوس اس کا ہے کہ لکھنؤ والوں نے کھانا پکانے، کھانا کھانے اور کھانا کھلانے کا جو فن اور ہنر ایک مدت مدید کی ریاضت کے بعد حاصل کیا تھا وہ ہم سے یک لخت جدا ہو گیا اور ان فنکاریوں کے عود کرنے کی اب کوئی توقع نہیں ہے۔

★

نیا دَور کے قلمی معاونین سے

۱۔ نیا دور کو اشاعت کی غرض سے بھیجی جانے والی تخلیقات کاغذ کے صرف ایک جانب حاشیہ چھوڑ کر اور بین السطور دے کر خوشخط اور صاف تحریر میں ہونا چاہیے۔

۲۔ ادارہ نیا دور کو جو تخلیقات موصول ہو جاتی ہیں ان کی حفاظت کا پورا پورا خیال رکھا جاتا ہے تاہم ڈاک میں ان کے ضائع ہو جانے کا امکان بھی رہتا ہے اس لیے قلمی معاونین سے استدعا ہے کہ نیا دور کو بھیجی جانے والی ہر تخلیق کی نقل اپنے پاس ضرور محفوظ رکھیں۔

۳۔ نیا دور کو اتنی کثیر تعداد میں تخلیقات خاص طور سے غزلیں موصول ہوتی ہیں کہ ہر ایک کی علاحدہ علاحدہ رسید بھیجنا ممکن نہیں ہے اس لیے رسید یا جواب کے لیے جوابی پوسٹ کارڈ یا لفافہ آنا ضروری ہے۔

۴۔ اگر کوئی تخلیق موصول ہونے کے چھ ماہ کے اندر شائع نہ ہو تو ایسی صورت میں وہ اشاعت کے لیے کسی دوسری جگہ بھیجی جا سکتی ہے۔

۵۔ اشاعت کی غرض سے بھیجی جانے والی ہر تخلیق غیر مطبوعہ اور غیر نشر شدہ ہونا چاہیے۔ ترجموں کے سلسلے میں ادارہ کو یہ بھی مطلع کرنا ضروری ہے کہ اس کے ترجمہ کی اجازت مصنف یا پبلشر سے حاصل کر لی گئی ہے۔

۶۔ کسی تخلیق کی اشاعت کے بعد متعلقہ شمارے کی ایک اعزازی کاپی اور نذرانہ قلمی معاونین کو بھیجا جاتا ہے۔ اس لیے اس سلسلے میں خط و کتابت کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔

۷۔ تخلیقات کی واپسی کے لیے ٹکٹ چسپاں اور پتہ لکھا ہوا لفافہ آنا ضروری ہے ورنہ ادارہ پر ان کی واپسی کی ذمہ داری نہ ہوگی۔

۸۔ ایک وقت میں صرف ایک ہی تخلیق بھیجنا چاہیے۔

۹۔ زندہ شخصیتوں اور جدید مطبوعہ کتابوں پر مضامین شائع نہیں کیے جاتے۔

غزل

اسلم لکھنوی

درد بھی دے گئے اشک بھی دے گئے
جملہ عنوانِ دل بستگی دے گئے

آنسوؤں کے بجائے ہنسی دے گئے
غم زدوں کو نئی زندگی دے گئے

آنے والے خوشی کے پیامی بنے
جانے والے غمِ زندگی دے گئے

جن کو سمجھے تھے اپنا رفیقِ سفر
وقت پر ہم کو دھوکا وہی دے گئے

مست نظروں سے کر کے اشارہ ہمیں
آج وہ اِذنِ بادہ کشی دے گئے

اب فسردہ نہیں ہیں مرے داغ دل
ان چراغوں کو وہ روشنی دے گئے

چھین کر مجھ سے سب میری ہوشیاریاں
مجھ کو سرمایۂ بے خودی دے گئے

کیوں ہے شکوہ اگر بے وفا کہہ دیا
یہ سبق تو ہمیں آپ ہی دے گئے

چشمِ حیرت سے ہم دیکھتے ہی رہے
آدمی کو فریب آدمی دے گئے

شکریہ ان کا جو آ کے اسلمؔ ہمیں
غنچہ و گل کی خندہ لبی دے گئے

مقبول احمد خاں

دبستانِ لکھنؤ کا ایک ممتاز غزل گو
حکیم محسن علی خاں جوشؔ بریلوی

حکیم محسن علی خاں جوشؔ سترھویں صدی میں بمقام بریلی پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد رسمی علوم کی طرف متوجہ ہوئے۔ صرف و نحو، ادب، منطق اور فلسفہ وغیرہ کی تحصیل کے بعد فن طب کی تکمیل کی۔ بچپن ہی سے ذہین اور طباع رہے۔ پیشہ طبابت کے علاوہ شعر و سخن کی جانب میلان ہوا۔

مقبول حسین خاں ڈپٹی کلکٹر نے (برادر زادہ علاقی) دیباچہ میں لکھا ہے کہ "جوشؔ کا خاندان محمود غزنوی کے عہد میں ہندوستان آیا۔ یہ لوگ شیوخ عرب سے نسبت رکھتے تھے، یہاں ان کی ایسی پذیرائی ہوئی کہ یہ خاندان ہندوستان ہی میں ٹھہر گیا۔ دربار میں عزت و احترام کی نظر رہی۔ صواب اندیش خاں اور خیر اندیش خاں مورث اعلیٰ لاہور اور بہار کی گورنری پر فائز ہوئے۔ دہلی اور لاہور میں اس خاندان کے مشہور افراد نے عالیشان اور خوبصورت عمارتیں بنوائیں۔

مبارک علی خاں نواب صواب اندیش خاں کے پوتے نے سنہ ۱۲۶۹ھ میں ایک رسالہ تحریر کیا۔ اس میں بیان کیا ہے کہ:

"شاہ جہاں کے زمانے میں ہمارے خاندان کا ستارہ عروج پر رہا۔ دیگر عنایات شاہی اور خدمات کے پیش نظر عہدہ صوبہ داری اولاد میں بھی جاری رہا۔ اگر کوئی پُر ہوس غنیم ملک پر حملہ آور ہوتا تو خاندان کے ممتاز افراد مدافعت وطن میں جانبازی اور دیش بھگتی کا ثبوت دیتے۔ نادر شاہ دُرانی کے قیامت خیز حملے میں یہ خاندان منتشر ہوا اور جس کا جدھر سینگ سمایا نکل گیا۔ بریلی میں ہماری کچھ جاگیر تھی۔ ہم بریلی پہنچے۔ حافظ رحمت خاں مرحوم سے ہمارے خاندانی تعلقات تھے۔ مرحوم نے جاگیر کے علاوہ، چند دیہات کا انتظام بھی سپرد کیا۔ حکومت بدلی تو سرکار انگریزی کے عہد میں۔ سرزمینی کے بدلے طالب علی خاں کا تازیست وظیفہ مقرر ہوگیا تھا۔ ہمارے خاندان میں اکثر و بیشتر افراد ذی علم تھے اور علوم متداولہ سے آراستہ بھی۔ یہی وجہ ہے کہ مابعد اولاد بھی زیور علم سے بہرہ یاب رہی۔ حکیم طالب علی خاں اور حکیم غالب علی خاں جو اس وقت ہمارے خاندان کے سربرآوردہ تھے۔ اسی نسبت سے ان کی اولاد بھی تعلیم یافتہ تھی۔ حکیم محسن علی خاں کے اساتذہ میں بیشتر ہمارے بزرگوار ہی تھے جنھوں نے تحصیل علم میں محسن علی خاں کی بھرپور امداد کی۔"

جوشؔ کا شاعری سے پیدائشی لگاؤ تھا۔ چنانچہ ابتدا ہی سے مشق سخن جاری رہی۔ اس فن میں مرحوم کے پہلے استاد خلیفہ امیر الدین آزاد رہے۔ لیکن کچھ مدت بعد مرحوم ناسخؔ کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہوگئے۔ اس وقت ناسخؔ جہان استاد تھے۔ اور جوشؔ بھی میدان شاعری کے پرجوش شہسوار۔ لہٰذا استاد کی پیروی میں کمال پیدا کیا۔ کلام میں مضامین قدیم اور روایات شاعرانہ کے تحت آمد ہے۔ الفاظ میں صفائی، تراکیب چست، محاورات میں اپنے استاد ناسخؔ کے ہمرکاب امثال و محاورات میں استعمال کا بڑا لحاظ ہے۔ زبان کے استعمال میں اور مضامین کی ندرت میں عام روش سے بچ کر نیا راستہ پیدا کرتے ہیں۔ بعض مرتبہ تو مومنؔ مرحوم کے تغزل سے جوشؔ کا رنگ ٹکراتا نظر آتا ہے مومنؔ مرحوم سے اثر پذیری بھی یقینی ہے۔ تغزل کی صداقت پرست

چاشنی نے کلام میں رنگینی پیدا کر دی ہے ۔ رموز و اشارات بھی خصوصیت کے حامل ضرور ہیں مگر کہیں کہیں طرز قدیم بھی غالب آجاتی ہے ۔ اور عشق مجازی آگے بڑھ جاتا ہے ۔ اور عریانیت ٹپک پڑتی ہے۔ مگر ایسا بہت کم ہے۔

علمی اور منطقی اصطلاحات بھی کلام میں موجود ہیں مگر عام بول چال کے لحاظ سے جس سے کہ کلام کا رنگ قائم رہتا ہے ۔ اور دلچسپی بڑھ جاتی ہے۔

مرحوم گوشہ نشین تھے، اور علائق دنیا سے آزاد، دیوان ہی ان کی معنوی یادگار ہے ۔ زندگی میں مرحوم کو دیوان کے مرتب کرنے کا خیال تک نہیں آیا ۔ یہ مختصر دیوان مرحوم کے برادر زادہ کے بقول "روایات اور اوراق منتشر سے حاصل ہوا" وہ کہتے ہیں کہ اگر ان کا دیوان زندگی میں جمع ہو جاتا تو بہت ہی ضخیم ہوتا ۔ فن طب میں حکیم جمال الدین کے شاگرد تھے ۔ حکیم موصوف خود اپنے عہد کے ایک نامور طبیب تھے۔ لہٰذا جوش بھی ایک حاذق طبیب ہوئے ۔

ادھر ادھر ایسی شہرت پھیلی کہ جوش مرجع خلائق بن گئے ۔ شعر گوئی اور طبابت صرف دو ہی کام تھے ۔ خدمت خلق، اور ذوق شاعرانہ ۔ بہر کیف جس قدر کلام ہے ان کے تخیلات کا آئینہ دار ہے۔ شاعری سے والہانہ وابستگی نے اس میں اثر پیدا کر دیا ۔ رنگ تغزل ہی ان کے کلام کی روح ہے ۔ اور اس پر ان کی طبع رواں کا رجحان ہے۔ قطعات و رباعیات کے علاوہ دیگر اصناف یعنی خمسے وغیرہ بھی ہیں اور ان میں بھی ایک خاص ڈھنگ ہے ۔

حمد و نعت کے بعد غزلیں شروع ہوتی ہیں ۔ غزلیات میں اس عہد کے مناسب مضامین ہیں ۔ عشق و محبت کے جذبات و واردات کا ذکر و بیان ایسا پر سوز ہے کہ جس سے پڑھنے والا بغیر متاثر ہوئے رہ نہیں سکتا ۔ خیالات کی بے تکان روانی اور ہجر و فراق کی تصویر نظر کے سامنے پھر جاتی ہے ۔ لیکن ان کی محبت میں ایک ایسا خلوص ہے جو ان کی شان کے شایاں ہے ۔ ابتذال سے گریز ہے اور اظہار محبت میں محتاط ہیں ۔ اپنے جذبات پر قابو ہے ۔ زبان بھی اس عہد کے مطابق ہے وہی ہے جیسا کہ طریقہ تھا اور لکھنوی شاعری کا تقاضہ یعنی لفظ و لوازم، محاورات و تلمیحات کی جانب زیادہ توجہ، وہی بات جوش میں پائی جاتی ہے ۔ اردو کی یہ خدمت بھی شعرا کا ہی خاص حصہ رہا ۔ بہر طور اپنے عصری مطالبات زبان پر بہت کچھ اثر ڈالتے ہیں اور ہر دور میں ایسا ہی ہوا ۔ دوست کے گیسوئے پیچاں اور زنجیر محبت کا نتیجہ ملاحظہ ہو ؎

جس نے وہ سلسلۂ گیسوئے پیچاں دیکھا پا بہ زنجیر ہوا خانۂ زنداں دیکھا

دنیا کی بے ثباتی کا اظہار ؎

کچھ عجب رنگ ترا گردش دوراں دیکھا کل جہاں باغ تھا واں آج بیاباں دیکھا

جنون محبت میں ایک خاص کیف ہے ؎

شاید اس راہ سے کوئی آبلہ پا گزرا ہے تر زباں آج ہر اک خار بیاباں دیکھا

درباں تو یار کے در پر ضرور ہی ہوتا ہوگا اور عاشق وارفتہ مزاج اسے اچھی طرح سمجھتے ہیں لیکن جوش نے تو اسے مالک دوزخ سے بھی آگے بڑھا دیا ہے ؎

شدتیں مالک دوزخ کی سنا کرتے تھے سخت اس سے بھی اے یار کے درباں دیکھا

درد سر کے واسطے صندل لگانا مفید ۔ جوش اپنے محبوب سے درد سر کا علاج اس طرح پیش کرتے ہیں ؎

صندلی دستہ کا خنجر ذبح کو لاتا ہے وہ شاد ہو اے دل علاج درد سر پیدا ہوا

دوست کی خواب سے بیداری فتنۂ محشر کے قیام سے کم نہیں کیونکہ محبوب تو خود خواب بیدار ہے ؎

جاگے گا ابھی فتنۂ خوابیدۂ محشر سوتے سے جو وہ غیرت بیدار اٹھے گا

محبوب رات کو محو خرام ہوا ۔ اسے سورج قرار دیا لیکن رات کو سورج اسی لیے تارے فرش راہ بن گئے اور رات دن ہو گئی استفہام قرار بصورت انکار ملاحظہ ہو ؎

کیا گیا اس راہ سے وہ آفتاب؟ ہے ستارہ ذرہ ذرہ راہ کا

ہجر میں جوش طول شب جانکاہ کہتے ہیں شب یلدا سے گریز ہے اس لیے کہ جانکاہی میں بات ہی اور ہے ؎

ہجر میں اس ماہ رو کے اے فلک تھا گلہ طول شب جانکاہ کا

محبوب دولت بیدار ہے ؎

کب آیا؟ خواب میں میری وہ دولت بیدار کہ مجھ کو طالع خوابیدہ نے جگا نہ دیا

لیکن خواب میں بھی دولت بیدار سے محروم رہے ۔

یہ شعر کس قدر پر لطف ہے ؎

مدہوش تری نرگس مخمور کا ساقی محشر میں بھی اٹھے گا تو سرشار اٹھے گا

عاشق کی آہ پر سوز کا اثر آسمان سے گزر کر اندرون آسمان پر بھی اثر انداز ہے یہی سچی محبت کا ثبوت ہے ؎

آسمان کے سمت ہے رخ آہ کا غل فلک پر ہے معاذ اللہ کا

محبوب کی مست نگاہی کا اثر محتسب پر انتہائی برا پڑ رہا ہے کہ پیرہن رہن ہو رہا ہے ؎

دور چشم مست ساقی ہے یہی تو دیکھنا
محتسب کا پیرہن رہن سبو ہو جائے گا

رقیبوں کی مدارات اور عاشق صادق کی زندگی کا مسئلہ ؎

بھر کے اپنے ہاتھ سے تو نے دیے غیروں کو جام
اب ہماری زیست کا پیمانہ اے جاں بھر گیا

تلوار کی دھار عاشق حسرت زدہ کے لیے آب حیات ہے ۔

پلا دے مجھ کو طالب ہوں حیات جاودانی کا
تری تلوار میں قاتل ہے پانی زندگانی کا

دوست سے ملاقات ہوئی تو رقیب (دشمن) نازل ہو گیا ؎

ہوئی خلوت نصیب اس سے تو ناگہ آ گیا دشمن
اسی کو کہتے ہیں آنا بلائے ناگہانی کا

دوست کا وعدہ فردا وعدۂ حشر ہے ؎

آپ کا وعدۂ فردا کبھی ایفا نہ ہوا
وعدۂ حشر ہوا وعدۂ فردا نہ ہوا

غنچۂ گلابی اور پھول کا پیمانہ ایک قدرتی تشبیہ کا ایک عمدہ نمونہ ؎

بادہ نوشی کو جو وہ میخوار آیا باغ میں
بن گیا غنچۂ گلابی پھول پیمانہ ہوا

زندگی کا فلسفہ گوتم بدھ سے ملتا ہوا ۔ علائق دنیا ہی ایک قسم کی قیود ہیں اور انسان ان سے آزاد ہو جائے تو حاصل زندگی سرو آزاد کا استعارہ آزادی کا ثبوت ہے ؎

بے تعلق جو رہا دہر میں ممتاز ہوا
سرو آزاد کو دیکھو کہ سرافراز ہوا

دوست کی بزم اور شاعر اس میں شرکت سے محروم اور مخالفین سب حاضر ؎

اس بزم میں کون اپنا پرایا نہیں جاتا
محروم ہوں اک میں کہ بلایا نہیں جاتا

عشق صادق میں انفرادیت ؎

معلوم نہیں وادی مجنوں میں مرے بعد
جاتا ہے کوئی بے سر و پا یا نہیں جاتا

سر تسلیم کہاں خم ہو گا محراب تیغ کے نیچے ؎

وہ تیغ کی محراب ہے جھکتے ہیں جہاں سر
ہر جا سر تسلیم جھکایا نہیں جاتا

تغزل کی گہری چاشنی ؎

گر کف پا اس پری کا دیکھ لے آفتاب
پھر نہ خجلت سے کسی کو منہ دکھائے آفتاب

کچھ اشعار خاص رنگ کے ملاحظہ کیجیے :

مجنوں ہوا خراب، رہا کوہ کن خراب اے جوش عاشقی کا سراپا ہے فن خراب

اے جان مضطرب ادب اتنا ضرور ہے قاتل کا ہو نہ ذبح کے دم پیرہن خراب

خط کا جواب پڑھ کے مرا دم نکل گیا قاصد ترا برا ہو۔ تو لایا بھلا جواب

ناصح کی جا بے جا نصیحت سے جوش سخت نالاں ہیں اور بات بھی ٹھیک ہے ورنہ چپکے سے جانے کی تلقین نہ ہوتی

میں خانماں خراب نہ آؤں گا راہ پر ناصح سے کہہ دو چپکے چلا جائے گھر کو اب

جس گھر میں بند دیت ہمارا تھا زیب شب تکتا ہوں چشم یاس سے میں اس کے در کو اب

یار کی شیریں زبانی پر نہ بھول اے تلخ کام زہر میٹھا ہے یہ ہوتا ہے کئی اقسام سم

آ گیا ہم کو جو زنداں میں تصور زلف کا ہو گئی زنجیر بیجاں کا کل پیچاں ہمیں

شیخ صاحب کی خاطر و مدارات کا حادثہ :

شیخ جی کیا کہیں رندوں کی طرف جا نکلے ثابت آج آپ کا کیوں جبہ و دستار نہیں

یاد جب اس گل کی آئی غنچۂ دل کھل گیا ہے نسیم صبح کی تاثیر اس کی یاد میں

دم بہ دم موت کی دیتے ہیں خبر آ آ کر سانس سینہ میں نہیں ہیں اک ہرکارے ہیں

وادی عشق ہے وہ وادی دشوار گزار قیس و فرہاد سے شاطر بھی جہاں تھکے ہیں

جوش کے حال سے کچھ آپ خبر رکھتے ہیں ‏ اب تو وہ بے خبری دو دو پہر رکھتے ہیں
کسی قدر طنز بھی ہے اور حقیقت بھی ؎

جب گرہ میں زر نہیں اور زور بازو میں نہیں
پھر شکایت کیا؟ اگر معشوق قابو میں نہیں

حمد و نعت

پس از حمد خدا خالق ہے جو نور محمد کا ‏ زمین و آسماں کل انس و جاں کا دام اور کا
سر دیواں میں لکھتا ہوں قصیدہ نعت احمد کا ‏ وسیلہ حشر کے دیواں میں ہے تحصیل مقصد کا
نہ ہوتا نقش اگر کرسی نشیں نور محمد کا ‏ قلم کا پھر نشاں ہوتا نہ اس لوح زبرجد کا

خمسہ بر غزل ناسخ کا ایک بند جوش کا زور قلم اور جوش۔

پھر بہار آئی ہوئی پھر وحشت پنہاں عیاں ‏ پھر طبیعت سے مٹا اندیشۂ سود و زیاں
پھر نظر آتا نہیں اب جیب و داماں کا نشاں ‏ شوق عریانی نے کیں پھر پیرہن کی دھجیاں
پھر اتروا یا جنوں نے بوجھ میرے دوش کا

بند از خمسہ بر غزل غلام حسین خاں:

آسماں پہ کہیں بھی نہ چمکتی تھی ذرا ‏ بادلوں کے بھی گرجنے کی نہ آتی تھی صدا
نہ ترشح سے زمیں تھی نہ چھائی تھی گھٹا ‏ سد راہ کون تھا راتوں میں تمہیں آنے کا
خشک نالے تھے کہیں نام کو برسات نہ تھی

بند خمسہ بر غزل میر

نہ خوش جس سے ہے جوش رب قدیر ‏ نہ راضی جناب بشیر و نذیر
ہراساں ہے اس غدغے سے ضمیر ‏ کہیں کیا جو پوچھے کوئی ہم سے میر
جہاں میں تم آئے تو کیا کر چلے

جوش مرحوم فارسی میں بھی کہتے تھے۔ فارسی پر قابو ہے اظہار خیالات میں روانی اور جوش صلالے پر خمسہ بر غزل حافظ علیہ الرحمۃ تحریر ہے۔ قرینہ بتاتا ہے کہ مراد حافظ شیرازی سے ہی ہے لیکن اتنا عرض ہے کہ تحقیق سے یہ غزل حافظ مرحوم کی قطعاً ثابت نہیں ہوتی اس عہد کے حافظ تخلص کسی بزرگ کی غزل ہو تو ہو۔ پہلا بند ملاحظہ ہو۔

گردش چرخ با نداز دگر می بینم ‏ منقلب عادت ہر فرد بشر می بینم
بد کس خیر نہ از خیر اثر می بینم ‏ ایں چہ شوریست کہ در دور قمر می بینم
ہمہ آفاق پر از فتنہ و شر می بینم

★

غلام مرتضیٰ راہی

غزل

سلسلہ نیند کا جب ٹوٹ گیا رات گئے
کھل کے برسی تری یادوں کی گھٹا رات گئے

آہٹیں غم کی دبی رہتی ہیں ہنگاموں میں
مجھ کو اس بات کا احساس ہوا رات گئے

خواب روشن نظر آیا مجھے سورج کی طرح
آنکھ ملتا ہوا بستر سے اٹھا رات گئے

صبح تک گونجتی رہتی ہے مرے کانوں میں
پردۂ غیب سے آتی ہے صدا رات گئے

چوٹ بن بن کے ابھر آئیں پرانی یادیں
دل کی بستی میں چلی ایسی ہوا رات گئے

ہو گئیں بند دھوئیں سے مری آنکھیں راہی
جب چراغوں میں اجالا نہ رہا رات گئے

ڈاکٹر اصفہ زمانی

اردو ڈرامہ پر ایک تنقیدی نظر

ڈرامہ کی ابتدا نقالی سے ہوئی ہے۔ افلاطون سب سے پہلا نقاد ہے جس نے شاعری کو "نقل" قرار دیا ہے۔ ارسطو نے افلاطون کے "نقل" کے تصور سے خوشہ چینی کی ہے۔ وہ "نقل" کو تو مانتا ہے لیکن "نقل" کی "نقل" کا قائل نہیں۔ ڈرامے کے موضوع پر قدیم ترین تصنیف ارسطو کی بوطیقا ہے[1]۔ اگرچہ اس میں فن شاعری پر بحث کی گئی ہے لیکن اسی ضمن میں اس نے ڈرامائی شاعری المیہ اور طربیہ کا بھی ذکر کیا ہے۔

ارسطو کے بعد مختلف ادوار میں ڈرامے کے سلسلہ میں جو نظریات منظر عام پر آتے رہے وہ اسی "نقالی کے نظریہ" پر مبنی ہیں۔ چنانچہ CICERO کی رائے ہے "زندگی کی نقل، رسم و رواج کا آئینہ اور سچائی کا عکس ہے"[2] یعنی ایک ڈرامہ نگار کا اصل مقصد ایسے حالات کی سچی تصویر کشی ہے جو حقیقتاً رونما ہو چکے ہوں یا وہ زندگی کی ہو بہو تصویر ہوں۔ HORACE نے بھی اسی قسم کے خیال کا اظہار کیا ہے وہ کہتا ہے "ڈرامہ ایک آئینہ ہے جس میں فطرت منعکس ہوتی ہے"[3]۔ اور کولرج کے الفاظ میں "ڈرامہ حقیقت کا اتار نہیں بلکہ فطرت کی نقالی ہے"[4]۔

ڈرامہ نگاری ایک فن ہے، ہر فن کی طرح اس کی بھی اپنی کچھ روایات ہیں تین وحدتوں کا شمار بھی ہوتا رہا ہے (۱) وحدتِ زمان (۲) وحدتِ عمل (۳) وحدتِ مکان۔ ارسطو نے وحدتِ عمل پر خصوصیت کے ساتھ زور دیا ہے۔ وہ وحدتِ زماں کے بارے میں صرف اس قدر کہتا ہے کہ المیہ کو "آفتاب کی ایک گردش یا اس سے کچھ زیادہ پر ختم ہونا چاہیے"۔ وحدتِ مکاں کے تصور نے بعد کو ترقی کی جو اطالوی نقادوں کے ذریعے سڈنی تک پہنچا اور جو بعد کو انگریزی میں منتقل ہوا۔ اقسام کے لحاظ سے ڈرامے کی دو بڑی قسمیں ہیں:

۱:- المیہ یا حزنیہ (چھٹی صدی ق۔م میں اس کا رواج ہوا) ارسطو نے المیہ پر بہت زور دیا ہے اس کا کہنا ہے کہ المیہ میں انسان کو بہتر دکھایا جاتا ہے۔ MINTURNO (۱۵۵۹ء) کے نظریہ کے مطابق المیہ اعلیٰ طبقے کے لوگوں کے اندوہناک حالات پر مشتمل ہوتا ہے۔

۲:- طربیہ (پانچویں صدی ق۔م میں اس قسم کے ڈراموں نے جنم لیا) سترھویں صدی سے پہلے تک لوگوں کا یہی خیال تھا کہ وہ ڈرامہ جس میں مسخرے اور ادنیٰ طبقے کے لوگ شامل ہوں ان کو طربیہ کہہ سکتے ہیں۔ سترھویں صدی میں اس

---

[1] ارسطو کا زمانۂ حیات ۳۸۴ ق۔م تا ۳۲۲ ق۔م بتلایا جاتا ہے۔ گمان غالب یہ ہے کہ اس کی اس تصنیف کا سن تقریباً ۳۳۰ ق۔م ہے۔

[2] [3] [4] دی تھیوری آف ڈرامہ از نکول ص ۲۴ ص ۲۸-۲۷۔

نظریہ سے اختلاف رونما ہونا شروع ہوا۔

ڈرامے کے دو پہلو ہیں (۱) تمثیلی (۲) ادبی۔

ڈرامہ کا تمثیلی پہلو بہت قدیم ہے، یہ ان جگہوں پر پروان چڑھا جہاں اصنام پرستی کا رواج تھا چنانچہ یونانی اور سنسکرت ادب میں تمثیلی ڈراموں کی کمی نہیں۔

دنیا میں قدیم ترین ڈرامے یونانی ادب میں ملتے ہیں ان ابتدا میں ان کی ادبی اہمیت کم اور مذہبی زیادہ تھی۔ انگلستان میں پہلا ڈرامہ جو سنہ ۱۱۱۰ء میں کھیلا گیا، مذہبی نوعیت کا تھا۔ ایران میں جو چیز "تعزیہ" کی شکل میں ملتی ہے اس کی نوعیت مذہبی تھی۔ شاہ عباس صفوی کے زمانے میں ایام عشرہ کے دوران واقعۂ کربلا کو ڈرامہ کے طور پر سامعین کے سامنے ایک کھلے میدان میں پیش کیا جاتا تھا، بعد کو روسیوں نے شہر تفلس میں سنہ ۱۸۵۰ء میں ایک تماشہ خانہ کی بنیاد ڈالی۔

ہندوستان میں سنسکرت ڈرامہ نگاری کا آغاز بھاس نے کیا (پانچویں صدی ق۔م) اس کے بعد کالی داس نے (ایک سو صدی ق۔م) ڈرامہ نگاری کو عروج یا جن کا ناٹک شکنتلا بہت مشہور ہوا۔ راماٸن اور مہابھارت کے عہد تک ڈرامہ نے مذہبی نوعیت کے ساتھ ساتھ ادبی صورت بھی اختیار کر لی۔

جہاں تک اردو ڈرامہ کا سوال ہے اردو ڈرامہ کی عمر مشکل سے سو سال ہے۔ اس سو سال میں ڈرامہ شروع بھی ہوا اور ختم بھی ہو گیا۔ ڈرامہ کے شباب کا زمانہ بیتاب، احسن، اور حشر کی ڈرامہ نگاری کا زمانہ کہا جاسکتا ہے، لیکن اس وقت بھی ڈرامہ عوام ہی کی چیز رہا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ خالص ادبی نقطۂ نظر سے بھی ڈرامے لکھے جاتے رہے۔

عموماً خیال یہ ہے کہ اردو ڈراموں پر انگریزی طرز کی چھاپ ہے۔ حالانکہ یہ نظریہ بالکلیہ قابل قبول نہیں۔ کیونکہ بہ نظر غور دیکھا جائے تو اردو ڈرامہ پر ہندو دیو مالا کا بہت اثر رہا ہے[1]۔ اردو ڈرامہ نگاروں پر ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا رہا ہے کہ انھوں نے غیر ملکی ڈراموں میں ردوبدل کر کے اسے اپنا لیا، حالانکہ یہ کوئی ایسا عیب نہیں جس پر انگشت نمائی کی جائے۔ ہمیشہ سے ہی روایات کو نئے قالب میں ڈھالا جاتا رہا ہے۔ کیا شیکسپیر کے ڈراموں کے مواد دوسری زبانوں کے ادبیات سے ماخوذ ہیں؟

اردو ڈرامے کے وجود میں آنے سے پہلے اردو میں ہمیں تین چیزیں ایسی نظر آتی ہیں جو بڑی حد تک ڈراموں سے قریب تر کہی جاسکتی ہیں (۱) قصہ خوانی یا داستان گوئی[2] (۲) بھانڈوں کی نقلیں (۳) بہروپیوں کے روپ اور سوانگ۔

ڈرامے کے ابتدائی آثار ہمیں نصیر الدین حیدر کے عہد میں نظر آتے ہیں[3]۔ واجد علی شاہ کے عہد میں "رہس" کی قسم کو ہم ڈرامہ کا ابھرتا روپ کہہ سکتے ہیں اور ان کی مثنوی افسانۂ عشق کو اردو ڈرامے کا نقش اول[4]۔ چنانچہ پہلے اردو ڈرامہ نگار واجد علی شاہ ہی قرار دیے جاسکتے ہیں[5]۔ سلیس اور فصیح اردو کے اعتبار سے سید امانت کے اندر سبھا کو اردو کا پہلا منظوم ڈرامہ قرار دیا جاسکتا ہے جو اپنے وقت ماحول اور معاشرے کے اعتبار سے اسی فضا سے متاثر ہے جہاں کی ہوا میں جام و صہبا کی مستی رچی بسی تھی، رقص و سرود کا نشہ تھا چونکہ معاشرے پر حرکت و عمل کے بجائے جمود و سکون کی

---

[1] اندر سبھا پر صاف ہندو دیو مالا کا اثر ہے۔ اس کے علاوہ سب سے پہلا اردو ترجمہ بھی کالی داس کے شکنتلا کا ہی کیا گیا جس کو نواز نے فرخ سیر کے زمانے میں اردو کا قالب عطا کیا۔ سنہ ۱۸۰۱ء میں فورٹ ولیم کالج کے زمانے میں جان گلکرائسٹ کی فرمائش پر مرزا کاظم علی جوان نے اس کا سلیس اردو میں ترجمہ کیا۔ [2] آخری باکمال داستان گو دہلی کے میر باقر علی مرحوم تھے۔
[3]، [4]، [5] لکھنؤ کا شاہی اسٹیج۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی مرحوم۔

کیفیت طاری تھی اس لیے امانت کا ڈرامہ بھی عمل سے محروم حسن وعشق کی طلسمی داستان کا منظر بن کر نمودار ہوا جس کو ۱۸۵۳ء میں ڈھاکہ میں پہلی بار اسٹیج کیا گیا۔

اردو ڈراموں کو اسٹیج تک لانے میں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کا ہاتھ رہا ہے۔ بنگال میں بنگلہ اسٹیج کے آغاز کی تاریخ ۲۷ فروری ۱۷۹۶ء بتائی جاتی ہے۔ بمبئی میں اٹھارھویں صدی عیسوی میں انگریزی تھیٹر کی تعمیر عمل میں آئی۔ جب ہم ۱۸۷۹ء کے قریب پہنچتے ہیں تو اس وقت بمبئی میں متعدد پارسی کمپنیاں نہایت شان وشوکت سے نئے نئے ڈرامے پیش کر رہی تھیں۔ اس وقت کے ڈرامہ نگاروں میں رونق بنارسی، حسینی، میاں ظریف، مرزا نظیر بیگ، طالب بنارسی، احسن لکھنوی، منشی غلام علی دیوانہ، آغا حشر کاشمیری، آغا حشر قزلباش دہلوی وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

بیسویں صدی کا ایک خمس گذرتے گذرتے تھیٹر انحطاط پذیر ہونا شروع ہو گیا۔ اور رفتہ رفتہ مائل بہ زوال ہو گیا۔ ادبی طبقے نے اسٹیج کی فرسودہ حالت سدھارنے کی کوشش کی اور کئی ادیبوں نے جدید طرز کے نئے ڈرامے لکھے ان میں سید امتیاز علی تاج کا انارکلی، منشی دوارکا پرشاد افق کا سوامی رام ناٹک، منشی جوالا پرشاد برق کا معشوقۂ فرنگ (رومیو جولیٹ کا ترجمہ) پنڈت سدرشن کا اندھے کی دنیا وغیرہ کافی مشہور رہیں۔

اردو ڈرامے کا ایک انداز جو اسٹیج اور تھیٹر سے بالکل الگ ہے خالص ادبی ہے، اس کے پیش رو محمد حسین آزاد کہے جا سکتے ہیں جنھوں نے ایک تاریخی ڈرامہ اکبر کی ابتدا[1] کی تھی لیکن اپنے مرض جنون کے باعث اختتام کو نہ پہنچا سکے۔ مولانا عبدالحلیم شرر نے بھی دو معاشرتی اصلاحی ڈرامے شہید وفا اور میوۂ تلخ لکھے۔ اگرچہ یہ ڈرامے کی فنی خوبیوں سے عاری ہیں لیکن موضوع کی افادیت اور ادبی شان کے حامل ہیں۔ منشی احمد علی شوق قدوائی نے بھی اصلاحی ڈراموں کی طرف خاص توجہ دی، ان کے منظوم ڈرامے میکفرن دلومی اور قاسم وزہرہ خاصے مشہور ہیں۔ لیکن ڈرامائی عنصر سے یکسر خالی ہیں۔ عبدالماجد دریابادی کا زود پشیماں اصلاحی انداز کا خالص معاشرتی ڈرامہ ہے۔ پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی کا مراری دادا اور راج دلاری زیادہ مشہور رہیں ان کا طرز تحریر کافی شوخ ہے۔ سجاد حیدر یلدرم نے اپنے مخصوص طرز میں ترکی ڈراموں کو اردو کا روپ دیا۔ ان کا ڈرامہ جلال الدین خوارزم شاہ بہت مشہور رہے۔ عظیم بیگ چغتائی کا مختصر ڈرامہ مرزا جنگی پردہ فسیہ سید عابد حسین کا پردۂ غفلت، مولانا نیاز فتح پوری کے دو طویل مشہور ڈرامے جھانسی کی رانی اور اصحاب کہف۔ فضل حق قریشی کے مولیئر کے ڈرامے کی تلخیص تعلیم زدہ بیوی اور پروفیسر محمد مجیب کی خانہ جنگی وغیرہ خالص ادبی شان کے حامل ہیں۔

دور جدید میں ریڈیائی ڈرامے نے بھی کافی ترقی کی، ان ڈراموں کی تکنیک قدرے مختلف ہوتی ہے۔ پہلی چیز جس کی طرف ڈرامہ نویس کو دھیان دینا ضروری ہے ڈرامہ کا ایجاز اختصار ہے۔ ڈرامے کے تسلسل کو قائم رکھنے کے لیے تھوڑا سا بھی وقفہ (GAP) سامعین کی توجہ کو ہٹا دیتا ہے، چنانچہ اس بات کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے کہ ایسا کوئی وقفہ نہ آنے پائے۔ غیر ضروری صوتی اثرات (SOUND EFFECT) کی بھرمار بھی سامعین کو ناگوار گذرنے لگتی ہے۔ اس کا بھی دھیان ضروری ہے، اس قسم کے لکھنے والوں میں رفیع پیرزادہ کا لیلیٰ، دلے بجنیر گزشت، ناموس، نقاب، شوکت تھانوی کا خدا حافظ (۱۹۳۸ء میں پہلا ڈرامہ لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن

---

[1] شیخ عبدالقادر مرحوم نے ۱۹۰۶ء میں اپنے رسالے مخزن میں اس ڈرامے سے کچھ حصے شائع کیے۔ اس کی تکمیل ان کے شاگرد رشید سید ناصر نذیر فراق دہلوی نے کی۔

کے لیے لکھا تھا) منشی جی، قاضی جی، کرشن چندر کا سرائے کے باہر، قاہرہ کی شام، سعادت حسین منٹو کا کروٹ، ماچس کی ڈبیہ، قلوپطرہ کی موت، احمد ندیم قاسمی کا دارا شکوہ، عصمت چغتائی کے مختلف ڈرامے راجندر سنگھ بیدی کا نشری ڈراموں کا مجموعہ سات کھیل جاوید اقبال (علامہ اقبال کے صاحبزادے) کا 'اتھیلو' 'قا' وغیرہ کافی مشہور رہے۔

اردو میں یوں تو بیشتر ڈرامے لکھے گئے[1]، لیکن اردو کے اکثر ڈرامے غیر معیاری ہیں۔ اس کا اصل سبب کیا ہے؟ اگر بہ نظر غور دیکھا جائے تو اس کی تہہ میں چند اہم وجوہات نظر آتے ہیں:

۱۔ چونکہ اسلامی نقطۂ نظر سے نقالی سخت ممنوع ہے، لہٰذا مذہبی نقطۂ نظر سے ڈرامہ نگاری یا اسٹیج وغیرہ کو بہت معیوب سمجھا گیا۔ عربی ادب میں ڈراموں کے فقدان کا اصل سبب یہی رہا ہے۔

۲۔ اسٹیج پر کام کرنے کو شرفا نے بھی اچھی نظر سے نہیں دیکھا۔

۳۔ چونکہ فارسی ادب نے ابتدا میں عربی ادب کی پیروی کی اس لیے فارسی کے دورِ قدیم میں ڈرامہ نگاری کا فقدان رہا۔

۴۔ فارسی داں حضرات، سنسکرت زبان سے ناواقفیت کی بنا پر بھی اس سے خاطر خواہ اکتساب نہ کر سکے۔

۵۔ اردو شاعری کی ابتدائی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو ہمیں اندازہ ہوگا کہ اس کی ابتدا صوفیائے کرام کے ہاتھوں ہوئی۔ ان صوفیائے کرام نے نقالی یا ڈرامے کی طرف کبھی توجہ نہ کی۔

۶۔ دہلی کے مغل شہنشاہ اور لکھنؤ کے نوابین ہمیشہ قصیدہ یا غزل کی داد دیتے رہے۔ عموماً ڈرامہ نگاری توجہ کا باعث نہیں رہی۔

۷۔ ڈراموں کا فروغ غیر ادبی علاقوں میں ہونے کے باعث بھی ادبی و معیاری ڈراموں کی کمی رہی یہ علاقے صرف اپنی بزنس کی خاطر "چلتا ہوا مال" پیش کرتے رہے بہت سے مالکان پارسی تھے اور اردو سے نابلد چنانچہ اس کے حسن و قبح کی پرکھ کرنے سے قطعی معذور تھے۔

ان چند وجوہ کی بنا پر اردو ڈرامہ کو وہ مرتبہ اور ادبی عروج نہ حاصل ہو سکا جو اردو شاعری کو نصیب ہوا۔ لیکن پھر بھی اردو ڈرامے کا مستقبل تاریک نہیں ہے۔ اگر اس کی طرف ان زاویوں سے نظر کی جائے:

۱۔ اردو رسائل کو ڈرامہ نگار اور نقاد پیدا کرنا چاہیے۔

۲۔ جہاں تک اسٹیج پر ڈرامہ پیش کرنے کا سوال ہے، فن سے واقف کار اس کو اپنے ہاتھ میں لیں۔

۳۔ ہماری یونیورسٹیوں میں ڈراموں کو نصاب میں داخل کیا جائے۔ اسی طرح فنِ ڈرامہ اور اصول تنقید سے نہ صرف واقفیت بڑھے گی بلکہ سنجیدہ اور ادبی مذاق بھی پیدا ہوگا۔

اگر ہماری کوششیں منظم، متحد اور یک جہتی کی صورت میں ہوں تو وہ دن دور نہیں جب اردو میں بھی کوئی شیکسپیر اور برنارڈ شاہ پیدا ہو جائے۔

★

---

[1] ڈاکٹر عبدالعلیم نامی سندیلوی پرنسپل اورینٹل کالج بمبئی نے بیلوگرافیا اردو ڈرامہ، جلد اول میں ۹۶۲ ڈرامہ نگاروں کے نام گنائے ہیں، جن کے پیش لکھے ہوئے تقریباً ۲۸۹۰ ڈراموں کی تعداد درج ہے۔

غزلیں

حیات لکھنوی

اس بار نامراد کو سر سے اتار دے
تیرے صلے میں مجھ کو زمانہ بھی پیار دے

کب تک رہے گا خواب و حقیقت کا سلسلہ
ٹوٹے نہ جو کسی سے مجھے وہ خمار دے

کیوں منتظر ہے آمدِ فصلِ بہار کا
اپنے لہو سے صحنِ گلستاں نکھار دے

منجدھار میں بھی دامنِ امید کو نہ چھوڑ
کس وقت تجھ کو وقت کا دھارا ابھار دے

میری وفا کی زد سے وہ بچ کر نہ جائے گا
ترکِ تعلقات کی دھمکی ہزار دے

باقی ہے تشنگی ابھی اس راہِ گرم سے
ان آبلوں کو اور بھی کچھ ریگ زار دے

کچھ واسطہ تو میرا عطا و کرم سے ہو
سمجھوں گلِ مراد جو مشتِ غبار دے

ایسا حیاتؔ کون ہے آسودۂ خیال
بکھرے ہوئے وجود کو بڑھ کر سنوار دے

تسنیم فاروقی

ڈوب کر ترے غم میں کب کوئی سنبھلتا ہے
دھوپ تو بڑی شے ہے چاندنی میں جلتا ہے

روشنی دکھاتے ہیں سایے کچھ سہاروں کے
غم میں آدمی اکثر خواب سے بہلتا ہے

ہم ہوں آپ ہوں وہ ہوں یا اسی طرح کوئی
دل کی بے قراری پر کس کا زور چلتا ہے

اس کا جسمِ رعنا ہو یا کوئی جواں پودا
جب بہار آتی ہے ہر درخت پھلتا ہے

اک لطیف رشتہ ہے نور کا سیاہی سے
ہر چراغ کی لَو سے کچھ دھواں نکلتا ہے

یاد کے دھندلکوں سے یوں گزر گیا کوئی
بادلوں کے پردے میں چاند جیسے چلتا ہے

راستے میں پیڑوں کی چھاؤں دیکھ کر گہری
لوگ سوتے رہتے ہیں وقت ہاتھ ملتا ہے

چھیڑنا اس سے اے تسنیمؔ سہل ہے مگر جیسے
اس کا ہاتھ چھونے سے میرا ہاتھ جلتا ہے

عدیل عباسی جامی چڑیاکوٹی

دھرتی کا چراغ

(افسانہ)

دیوالی کی رات' گھر گھر چراغوں کی برات' سارا شہر رنگین روشنیوں بقعۂ نور۔ دکانیں سہاگ رات کی دولہنوں کی طرح حسین دل کش، بچے پھلجھڑیاں اور پٹاخے چھوڑنے میں مشغول، سڑکوں ہناسے ہر موڑ پر مہالکشمی کی خوب صورت اور جاذب نظر مورتیاں ب چمکتے ہوئے کپڑوں میں ملبوس' جن کے اردگرد نیلے، پیلے ہرے چھوٹے چھوٹے برقی قمقمے فروزاں۔ رنگ برنگ کے بجلی کے ب اور راڈ روشن۔ ایسا لگتا جیسے سارا نگر روشنی کی گنگا میں ہا ہو۔ ہر طرف خوشی اور مسرت کی لہریں اٹکھیلیاں کرتی ہوئی جگہ مائکروفون سے پیار اور محبت کے جوان نغمے پھوٹتے ہوئے ی فضا پر ایک نشاط انگیز کیفیت' ایک وجدانی عالم طاری۔

لیکن رجنی ان ہنگامہ خیز رنگین خوشیوں اور مسرتوں کے ح پرور نورانی سیلاب سے بے نیاز گھر کے اندر تنہا سوچ میں ے خاموش بیٹھی ہوئی تھی ——— اس کی گھنیری سیاہ پلکوں نسوؤں کے انگنت دیپ روشن تھے۔ وہ زندگی کے بیتے ہوئے رسے لمحات کی حسین یادوں میں گم تھی۔ اس کے اس احساس کہ وہ پورنما ہو کہ دیوالی کی مسکراتی جگمگاتی رات' تنہائی کے ڈستے ے اندھیروں کو نہ تو دودھیا چاندنی اور نہ ہزاروں لاکھوں پاش دیے دور کر سکتے ہیں اُسے اور بھی غمگین اور اداس دیا تھا۔

کھٹ ..... کھٹ ...... کھٹ' باہری دروازے رنجیر بولی۔ رجنی نے جو اب تک حسین خوابوں کی وادیوں میں ئے ہوئی تھی چونک پڑی۔ بوجھل قدموں سے چل کر دروازہ کھولا۔

بچھڑے ہوئے جیون ساتھی کی انمول نشانی، اس کا سات سالہ معصوم منّا اپنے ماما کی انگلی پکڑے کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"تم بازار سے لوٹ آئے؟" رجنی نے غم آلود مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

"ہاں ماں!" دیکھو ماما جی نے میرے لیے کتنی بہت ساری مٹھائیاں اور کھلونے خریدے ہیں اور .... دیکھو نہ یہ کھلونا ——— مجھے بہت پسند ہے۔ ماما جی کہتے ہیں یہ مٹی یا چینی کا نہیں' یہ لوہے کا ہندوستانی سپاہی ہے۔ اس میں چابی لگی ہوئی ہے۔ جب بھر دی جاتی ہے تو سپاہی بندوق چلانے لگتا ہے جیسے دشمن پر گولیاں برسا رہا ہو ——— ماں! میرے پتا جی بھی تو سپاہی ہیں ——— وہ کب آئیں گے ——— وہ دشمنوں کو اپنی بندوق سے مارنے گئے ہیں ———" منّا نے نہایت بھولے پن سے رجنی سے کہا۔

"ہاں بیٹا! وہ جلد ہی آئیں گے۔ شاید ابھی کچھ دشمن باقی رہ گئے ہیں جنھیں وہ مارنے میں لگے ہیں" رجنی نے منّا کو تسلی دی۔

"یہ کس کے دشمن ہیں ماں! تمہارے یا پتا جی کے؟" منّا نے ایک اور معصوم سوال کیا۔

"یہ سب کے دشمن ہیں بیٹا! یہ ہمارے دیش کے دشمن ہیں۔ انھوں نے ہماری دھرتی پر دھوکے سے حملہ کر دیا ہے۔ تمھارے پتا انھیں کو ٹھکانے لگانے گئے ہیں ———" رجنی نے اپنے بیٹے کو سمجھایا۔

"ماں! میں بھی پتا کے پاس جاؤں گا۔ میں بھی پتا جی کے ساتھ مل کر دشمنوں کو ماروں گا ———" منّا کی زبان سے بھارت کی یادگار مٹی بول اٹھی۔ جیسے شکنتلا کا بھرت مچل گیا ہو۔

منا کی پیاری پیاری باتیں سن کر رجنی کا دل بھر آیا.....
.....اور.......اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی گنگا جمنا پھوٹ کر بہہ نکلی۔

منا کی نظر ماں کے بھیگے ہوئے گالوں پر پڑی وہ چونک پڑا۔

"ارے ماں! تم تو رو رہی ہو؟" منا نے دکھی ہو کر فکر مند لہجہ میں سوال کیا۔

"نہیں بیٹا! میں رو نہیں رہی ہوں ــــ میں تو تمھیں دیکھ کر خوش ہو رہی ہوں ــــ دیکھو! میری طرف دیکھو!! میں تو ہنس رہی ہوں۔ آؤ اندر چلو۔" رجنی نے جلدی سے اپنے آنچل سے رخساروں پر پڑی ہوئی آنسوؤں کی لکیروں کو مٹا دیا......اور اپنے منا کو تسلی دینے کی خاطر بناوٹی ہنسی ہنسنے لگی۔

رجنی کے ساتھ منا اور اس کے ماما رمیش گھر میں داخل ہوئے۔ منا کھلونوں میں بہل گیا۔

کھانا کھانے کے بعد منا اور رمیش جلد ہی سو گئے لیکن رجنی جاگتی رہی ــــ اس کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی ــ وہ ان چراغوں کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہی تھی۔ جنھیں منا نے اپنے نرم و نازک ہاتھوں سے آنگن کے طاقوں میں سجایا تھا۔ اب یہ سبھی چراغ تیل کی کمی کے باعث جھلملاتے ہوئے اپنی زندگی کی آخری گھڑیاں گننے لگے تھے۔ شاید ان کے جیون کی لَو سوکھ چکی تھی۔ رجنی کے دل میں یکایک ایک خیال گزرا۔ کیوں نہ ایسے سبھی چراغ بجھنے سے پہلے ہی گُل کر دیے جائیں جن کے جلتے رہنے سے دل کی تاریکی اور بڑھتی ہو۔ مگر فوراً ہی یہ سوچ کر اس نے ارادہ بدل دیا کہ ان دیپکوں کو تو اس کے منا نے اپنے نرم گلابی ہاتھوں سے روشن کیا ہے جو حقیقتاً میری آنکھوں کا نور اور دل کا سرور ہے ــ اور.... پھر رجنی اٹھی اور اس نے تمام بجھتے ہوئے دیوں میں تھوڑا تھوڑا تیل ڈال دیا۔ سسکتے ہوئے چراغوں میں زندگی لوٹ آئی اور وہ دوبارہ تیزی سے جلنے لگے جیسے سرد پانی کے چھینٹوں سے مرجھاتے ہوئے پھول کھل اٹھے ہوں۔

اب پھر رجنی چارپائی پر آ کر لیٹ گئی۔ نظریں اب بھی جلتے ہوئے ننھے ننھے چراغوں پر جمی ہوئی تھیں۔

تھوڑی دیر کے بعد اس کی نگاہ سوئے ہوئے اپنے معصوم منا کی دمکتے ہوئے چاند سے مکھڑے سے ٹکرائی ــــ وہ منا کے مستقبل کے بارے میں سوچنے لگی۔

"جیون کا اتنا لمبا سفر۔ سر پر منا کی تعلیم اور پرورش کا بھاری بوجھ ــ اے بھگوان! یہ سفر کیسے طے ہوگا ــــ اے بھگوان تو ہی منا کی حفاظت کرنا ــــ"

پھر یکایک رجنی کے پردۂ ذہن پر منا کے پتا راکیش کی یادوں کا عکس ابھرا۔ وہ راکیش کی یاد میں کھو گئی ـــ

"پچھلے سال یہی دیوالی کتنی حسین تھی۔ کتنی خوب صورت تھی۔ اندھیری رات کی سیاہ ناگنوں کے کلیجے مسکراتے ہوئے درخشاں چراغوں سے پھوٹتی ہوئی ننھی ننھی کرنوں نے چیر کر رکھ دیے تھے۔ اجالوں کا پرچم بلند تھا۔ ہر طرف زندگی جوانی کے نشہ میں مخمور رقص کرتی ہوئی دکھائی پڑتی تھی.......اور.......اس برس راکیش کے بنا یہی دیوالی کتنی سیاہ، کتنی کالی اور کس قدر بھیانک معلوم ہوتی ہے۔

چلتے وقت راکیش نے منا کو پیار کرتے ہوئے مجھ سے کہا تھا ــــ "رجنی! تم گھبرانا نہیں۔ منا کا خیال رکھنا ــــ میں تمھارا پتی اور منا کا پتا ہونے کے علاوہ اپنے دیش کا محافظ بھی ہوں۔ ہمارے وطن کی سرحدوں پر دشمن کے گھناونے قدموں کے نشان پھر دکھائی پڑنے لگے ہیں۔ ہمیں ایسے تمام نشانوں کو مٹانا ہے اور حریفوں کو ایسا مزہ چکھانا ہے کہ وہ پھر ہم پر حملہ کرنے کی جرأت نہ کر سکیں۔

میں جانتا ہوں رجنی! تمھیں میرے اس طرح چلے جانے کا کتنا دکھ ہوگا۔ ایک طرف منا کی ماں اور منا کی محبت بیڑیاں بن کر میرے پیروں کو جکڑ رہی ہیں۔ دوسری طرف مادرِ وطن کا فرض مجھے آواز دے رہا ہے، مجھے پکار رہا ہے ــ لیکن میں مادرِ وطن کے مقدس آنچل کو کسی قیمت پر جلنے نہ دوں گا ــــ میں ایسے تمام ہاتھوں کو تراش دوں گا جو میری دھرتی کے دامن کی طرف بُری نیت

سے بڑھنے کی کوشش کریں گے ـــــ آج ظلم اور تشدد کے جو پجاری ہماری مقدس زمین پر کھڑے ہیں ان کے سر قلم کر کے مادرِ وطن کے قدموں میں ڈال دوں گا ـــــ تم یقین رکھو رجنی! فتح ہمیں کو نصیب ہوگی کیوں کہ ہم حق پر ہیں ـــــ ہماری جنگ اصولوں کی جنگ ہے ـــــ ہم حملہ آور نہیں ہیں میں اگر جنگ میں شہید ہو جاؤں تو تم غم نہ کرنا ـــــ تم میرے لیے آنسو نہ بہانا کیوں کہ شہید کبھی مرتا نہیں۔ وہ تو امر ہوتا ہے۔ شہید کے خون کے قطرے ہمیشہ آسمان پر چاند تارے بن کر چمکتے ہیں میں ہارے ہوئے سپاہی کے روپ میں تمھارے پاس کبھی نہ آؤں گا ـــــ بھگوان پر بھروسہ رکھو رجنی! جیت ہماری ہوگی..... ہم میدان جنگ سے فاتح بن کر لوٹیں گے ـــــ"

تھپ..... تھپ..... تھپ

دروازے پر کسی نے زور سے دستک دی..... رجنی کے سارے سپنے ٹوٹ گئے۔ وہ آنکھیں ملتی ہوئی گھبرا کر اٹھ بیٹھی...... پو پھٹ چکی تھی۔ صبح کا نور دبے پاؤں رجنی کے کمرے میں داخل ہو رہا تھا ـــــ اُجالوں کا دیوتا نمودار ہونے والا تھا۔ رجنی کا دل کسی انجانے خوف سے لرز گیا ـــــ اس نے ڈرتے ڈرتے چل کر دروازہ کھولا۔ بڑی بڑی کٹورے کی مانند آنکھوں، بھرے بھرے بازوؤں، لمبے چھریرے بدن اور چوڑے چکلے سینے والا اُس کا اپنا فولادی راکیش فوجی وردی میں ملبوس فاتحانہ انداز میں کھڑا مسکرا رہا تھا ـــــ رجنی اپنے راکیش کو پاکر فرطِ مسرت سے ناچ اٹھی اور اس کی گھنیری سیاہ پلکوں پر مسرت آمیز آنسوؤں کے بے شمار دیپ مسکرانے لگے۔

★

سیّد نظر برنی

جامعہ ملیہ اسلامیہ

کیا پیارا گلستاں ہے جامعہ اسلامیہ
عظمتِ ہندوستاں ہے جامعہ اسلامیہ
اس میں ہے مختار داجمل اور جوہر کا وقار
ایک رنگین داستاں ہے جامعہ اسلامیہ
کچھ نئے انداز کی تدریس کا ہے اہتمام
وقت کی روح رواں ہے جامعہ اسلامیہ
ذکرِ ذاکر، فکرِ عابد کی ہے یہ قندیلِ شوق
کارواں در کارواں ہے جامعہ اسلامیہ
عشوہ و ناز و ادا میں ہے یقیناً یہ عجیب
رنگ و بو سے ضوفشاں ہے جامعہ اسلامیہ
علم و حکمت اور فراست کی ہے یہ روشن کتاب
بس ادب کا اک نشاں ہے جامعہ اسلامیہ
مخلصانِ قوم کے حُسنِ تدبر کا ہے عکس
داستاں در داستاں ہے جامعہ اسلامیہ
شانِ حکمت، فرحِ حرف اور نازِ حُسن بھی
ہر ادا میں مہرباں ہے جامعہ اسلامیہ
قومی یک جہتی کی جیتی جاگتی تصویرِ شوق
صاف اک آبِ رواں ہے جامعہ اسلامیہ
گاندھی و نہرو کا اس میں دیکھیے اک طمطراق
نازشِ عزمِ جواں ہے جامعہ اسلامیہ
اس میں مستقبل ہمارا صاف آتا ہے نظر
علم کی اک کہکشاں ہے جامعہ اسلامیہ

جوہر نظامی

شباب

زندگی کو خواب سے جس نے جگایا وہ شباب
انتہائے غم میں بھی جو مسکرایا وہ شباب
جو نویدِ شادمانی لے کے آیا وہ شباب
مسکرانا جس نے پھولوں کو سکھایا وہ شباب
زلزلوں میں جو سکونِ زندگی پاتا رہا
جو ازل سے بجلیوں کے ساز پر گاتا رہا
بیخودی کا درس پایا جس نے بزمِ ہوش میں
جو رہا محوِ تبسم یاس کی آغوش میں
جس نے کی ہیں زندگی کی انجمن آرائیاں
جس کی منت کش ہیں فصلِ عیش کی رعنائیاں

ہاں وہی میری جوانی ہاں وہی میرا شباب
مدتوں سے یاد میں تیری ہے نذرِ اضطراب

حسن کے معبود! ان کمزور شانوں پر یہ بار
آرزو کی نرم و نازک پنکھڑی اور نوکِ خار
زندگی مدت سے بے تقصیر ہے روٹھی ہوئی
کیا کروں مجھ سے مری تقدیر ہے روٹھی ہوئی
میری دنیائے سکوں ہے آشنائے پیچ و تاب
آنسوؤں کی لے میں چھڑتا ہے مرے دل کا رباب
جن دریچوں سے کبھی آتی تھی خوشبوئے بہار
جھانکتا ہے ان دریچوں سے غمِ ناخوشگوار
ہر نفس اک بے قراری، ہر قدم اک اضطراب
زندگی ہے موت کے سایہ میں گویا محوِ خواب
اے خدائے حسن اے پروردگارِ رنگ و بو
تا کجا محرومیاں کب تک یہ سوزِ جستجو؟

چاہتا ہوں اک اشارہ اک نگاہِ التفات
ورنہ اک دن ڈوب جائے گی مری نبضِ حیات

اشرف مالوی

طوطیٔ ہند خسرو

محبوبِ نظر خسرو، مطلوبِ نظر خسرو
دنیائے محبت میں اک آئنہ گر خسرو

روشن ہوئے چشم و دل تابانیوں سے جس کی
چمکا شبِ ظلمت میں وہ رشکِ قمر خسرو

سوزِ دلِ دیوانہ، سازِ لبِ مستانہ
بیمارِ وفا خسرو درمانِ بشر خسرو

صوتِ دلِ شاہی بھی محبوبِ الٰہی بھی
فرزانہ بھی خسرو ہے دیوانہ اگر خسرو

اللہ ری خوش باشی دل کعبۂ نظر کاشی
یوں رازِ دلِ فطرت وا ہو گئے بر خسرو

کچھ راگ بلا خاں کے ہر تار میں سو جاتے
آتے نہ جگانے کو دنیا کو اگر خسرو

ہیں جمع ادھر عرفی خاقانی و فردوسی
سلطانِ سخن گویاں، تنہا ہے ادھر خسرو

تسکینِ دل و جاں ہے صد رشکِ بہاراں ہے
اک مرکزِ عرفاں ہے اب بھی ترا در خسرو

نقشِ کفِ پا تیرے ہر راہ میں بکھرے ہیں
مرہونِ کرم تیری ہر راہ گزر خسرو

اب تک تری منزل کو پہنچا نہ کوئی رہرو
صدیوں سے تو جاری ہے ذہنوں کا سفر خسرو

چھ صدیوں کی دھول اشرف جس پر نہ جمی ہرگز
مینارِ تجلی ہے اب تک وہ امر خسرو

شمامہ قدوائی

میر کی دلّی

شمالی ہند میں اردو شاعری کے آغاز کا زمانہ بڑے خلفشار اور افراتفری کا زمانہ تھا۔ یہ خلفشار اور افراتفری اورنگ زیب کی وفات کے بعد سے شروع ہوئی۔ اورنگ زیب نے پچاس سال تک اس ملک کے بگڑتے ہوئے حالات کو سنبھالنے کی جد وجہد کی ۔ سلطنت بہت وسیع ہوگئی تھی ، اس کی زندگی کا بڑا حصہ میدان جنگ میں بسر ہوا لیکن فوجی قابلیت، سیاسی بصیرت اور انتظامی صلاحیت کی بنا پر اس نے انتشار کی قوتوں کو دبا دیا۔ اور جب اس دنیا سے رخصت ہوا تو اپنے جانشینوں کے لیے ایک عظیم الشان سلطنت چھوڑی۔ خانہ جنگی سے بچانے کے لیے اس نے ملک کو اپنے بیٹوں میں ایک وصیت کے ذریعہ تقسیم کر دیا۔ لیکن اس کے تنگ نظر اور کم ظرف جانشینوں نے وصیت کی طرف کوئی توجہ نہ کی نتیجہ یہ ہوا کہ وہ طاقت جو تین مرکزوں میں تقسیم ہو کر مخالف قوتوں کے دبانے میں صرف کی جا سکتی تھی آپس میں ہی لڑ کر ختم ہو گئی۔ اورنگ زیب سے پہلے اور اورنگ زیب کے بعد کی تاریخ میں جو نمایاں فرق نظر آتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس جاگیردارانہ طرز حکومت کے لیے سب سے پہلی اور بنیادی شرط مضبوط حکمراں کی موجودگی تھی۔ مغل دربار ہمیشہ امراء کی سازشوں کا مرکز رہا تھا لیکن عظیم مغل حکمرانوں کا رعب اور حکمت عملی کی وجہ سے وہ اس پر قابو پائے رہتے تھے۔ اورنگ زیب کے بعد بادشاہوں کے بجائے "بادشاہ گر" پیدا ہو چکے تھے۔

اس صورتِ حال کا نتیجہ یہ ہوا کہ زوال کی رفتار تیز تر ہونے لگی۔ مرکزی حکومت کا ڈھانچہ کمزور ہونے لگا اور حکومت کی اس کمزوری کی وجہ سے صوبے آزاد ہونے لگے۔ امراء سر اٹھانے لگے نیز جاگیرداروں نے بدنظمی کی ایک عام فضا پیدا کر دی جس نے اقتصادی زوال اور معاشی انحطاط کی رفتار کو اتنا تیز کر دیا کہ دہلی اور اس کا بادشاہ بقول شاہ ولی اللہؒ "کاسۂ گدائی در دست گرفتہ[1]" نظر آتا تھا۔ ان حالات میں یہی ہونا بھی چاہیئے تھا کہ ملک کے وہ تمام افراد جو تھوڑی سی بھی قوت جمع کر سکتے ہوں قسمت آزمائی کے لیے تیار ہو جائیں چنانچہ سکھ، مرہٹے، جاٹ سب نے اس ماحول میں ہنگامے پیدا کیے اور صورتِ حال روز بروز خراب تر ہونے لگی۔ سیاسی انتشار، معاشی بدحالی اور اقتصادی انحطاط کے زمانے میں ایک بیرونی طاقت نے اپنے قدم مستحکم کرنا شروع کر دیے۔

اورنگ زیب کا پہلا جانشین بہادر شاہ اول تھا جو بڑا فیاض اور رحم دل تھا مگر جسے "شاہ بے خبر" کہہ کر یاد کیا جاتا تھا۔ اس کے بعد جہاندار شاہ تخت نشین ہوا۔ وہ اس قدر رنگیلا اور عیش پرستی کا دلدادہ تھا کہ کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنی محبوبہ لال کنور پر ایک سال میں دو کروڑ روپیہ خرچ کر دیے۔ اس کے دربار میں مغنی، طرب

[1] شاہ ولی اللہ کے سیاسی مکتوبات (مکتوبات دوم ص ۱۱)

کی محفلیں گرم رہتی تھیں، اور بڑے پیانہ پر چراغاں کیے جاتے تھے۔ فرخ سیر تخت نشین ہوا تو ملک کی حالت اور بھی خراب ہوگئی۔ اس کو گھوڑوں سے بڑی دلچسپی تھی۔ ہزاروں کی تعداد میں گھوڑے اصطبل میں بیکار بندھے رہتے تھے۔ اس گرتے ہوئے مالی نظام پر نادر شاہ کے حملہ (۱۷۳۹ء) نے ضرب آخر کا کام کیا۔ اروِن کے خیال کے مطابق نادر شاہ ستر کروڑ سے زیادہ روپیہ ہندوستان سے باہر اپنے ملک لے گیا۔ اس کے بعد محلات اور شاہی خزانے خالی ہوگئے۔ احمد شاہ کے زمانے میں خزانے کی یہ حالت تھی کہ ملازمین کی تنخواہیں بھی بڑی مشکل سے ملتی تھیں۔ بادشاہ کی ساکھ اس قدر گر گئی تھی کہ مہاجن اور ساہوکار بھی قرض دینے کے لیے تیار نہ ہوتے تھے۔ فضول خرچی میں بادشاہ کے ساتھ امرا بھی مبتلا تھے۔ اندرونی اختلافات اس قدر اور اس حد تک بڑھ گئے تھے کہ درباری امرا اپنے ذاتی مفاد کے لیے ملک کو بیچ ڈالنے کے لیے تیار رہتے۔ جب نادر شاہ کی فوجیں منزل بہ منزل بڑھتی ہوئی دہلی کی طرف آرہی تھیں اور نظام الملک برابر بادشاہ کو مقابلہ کے لیے اکساتا تھا تو دوسرے امرا صرف اس خیال سے بادشاہ کو بہلا پھسلا کر روک رہے تھے کہ نظام الملک کی بات اونچی نہ ہونے پائے۔ آخرکار نادر شاہ کی فوجیں کرنال تک پہنچ گئیں تب شاہی لشکر مقابلہ کے لیے نکلا۔ اس قیامت خیز موقع پر بھی امرا اپنی ذاتی چشمکوں اور خود غرضیوں کے شکار رہے۔ ایسی صورت میں اس جنگ کا انجام معلوم تھا۔

نادر شاہ کے بعد احمد شاہ ابدالی نے دہلی پر حملہ کیا اور رہی سہی قوت کا بھی خاتمہ کر دیا۔ احمد شاہ کے حملے کئی بار ہوئے (پہلا حملہ ۱۷۴۷ء، دوسرا ۱۷۵۰ء، تیسرا ۱۷۵۱ء، چوتھا ۱۷۵۲ء، پانچواں ۱۷۵۵ء، چھٹا ۱۷۶۱ء، ساتواں ۱۷۶۲ء، آٹھواں ۱۷۶۷ء، نواں اور آخری ۱۷۶۹ء) ان پے در پے حملوں کے دوران ایسا بھی ہوا کہ مرہٹہ اور جاٹ چڑھ آئے اور ایک طوفان بپا کر دیا۔ پانی پت کے مقام پر احمد شاہ ابدالی نے مرہٹوں کو شکست دی لیکن جلد ہی وہ اس قابل ہوگئے کہ دہلی پر اپنا تسلط قائم کر سکیں۔ میر نے دہلی کی تباہی و بربادی کے چشم دید حالات اپنی خود نوشت سوانح عمری ذکرِ میر میں لکھے ہیں۔

شاہ عالم کے دور حکومت میں دو تین لڑائیاں ہوئیں جن میں بکسر (۱۷۶۴ء) کی جنگ بہت مشہور ہے۔ لگاتار جنگوں نے حکومت کو اور بھی کمزور کر دیا تھا۔ تمام صوبے آزاد ہو چکے تھے اب مغلیہ حکومت سے مراد صرف دہلی اور اس کے اطراف تھے۔ اور اس کے متعلق یہ مشہور تھا "بادشاہی شاہ عالم از دہلی تا پالم"

ادھر یہ انقلابات رونما ہو رہے تھے ادھر انگریز تاجر مشرقی ہندستان میں برابر اپنے قدم جما رہے تھے۔ بکسر کی لڑائی کے بعد وہ تمام صوبہ بنگال پر قابض ہو چکے تھے۔ اور شاہ عالم نے مشرقی اضلاع میں اپنے قیام کے دوران انھیں باقاعدہ بنگال کی دیوانی سپرد کر دی تھی۔ ۱۸۵۷ء تک یہی کمپنی عملاً ہندستان پر حکمرانی کرتی رہی۔ شاہی خاندان کے زوال کے بعد ہی سے جب کہ ہندستان کے مختلف نواب شکستہ سلطنت کے علاقوں کے لیے آپس میں لڑ رہے تھے اور ہر صوبہ ان چھوٹی چھوٹی خانہ جنگیوں سے نالاں تھا ایسٹ انڈیا کمپنی نے بحیثیت مملکت کے سیاسی ترقی اور اہمیت حاصل کرنا شروع کر دی۔ اگر سچ پوچھیے تو حقیقت بھی یہی ہے کہ ہندستان کے لوگ آپس کی خانہ جنگیوں سے اس قدر پریشان تھے کہ ان کو ایسی حکومت کے استقبال کرنے میں خوشی ہوئی جو اُن کے ساتھ مذہبی رواداری برتتی تھی اور ان کے جان و مال کی محافظ تھی۔ اسی طرح ۱۸۵۷ء میں اس پُر درد داستان کا خاتمہ ہوگیا۔

میر نے اپنے زمانے کے عروج و زوال کی پوری داستان صرف اس شعر میں سمو دی ہے۔

اب جہاں آفتاب میں ہم ہیں
یاں کبھی سَرو گل کے سائے تھے

سلطنت کی بدحالی کا اثر ہندستانی تہذیب و تمدن کے تمام شعبوں پر بھی پڑا۔ شاعر جو کہ سماج کا آئینہ دار ہوتا ہے ان حالات سے متاثر ہوئے بغیر کیسے رہ سکتا تھا۔ اس سیاسی، سماجی اور معاشی زبوں حالی نے نہ صرف اس کا وسیلۂ روزگار چھینا بلکہ اس کے قلب و ذہن کو بھی جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ دراصل میر کی زندگی



صدر جمہوریہ شری فخر الدین علی احمد کو دار العلوم دیوبند
سہارنپور میں ۲۴ اپریل ۱۹۷۶ء کو ایک سپاسنامہ پیش
کیا گیا۔ یہ تصویر اسی موقع کی ہے



صدر جمہوریہ شری فخر الدین علی احمد دار العلوم دیوبند کی لائبریری کا معائنہ فرما رہے ہیں۔ تصویر میں وزیر اعلیٰ شری نرائن دت تیواری
صدر جمہوریہ کے ہمراہ دائیں جانب دکھائی دے رہے ہیں

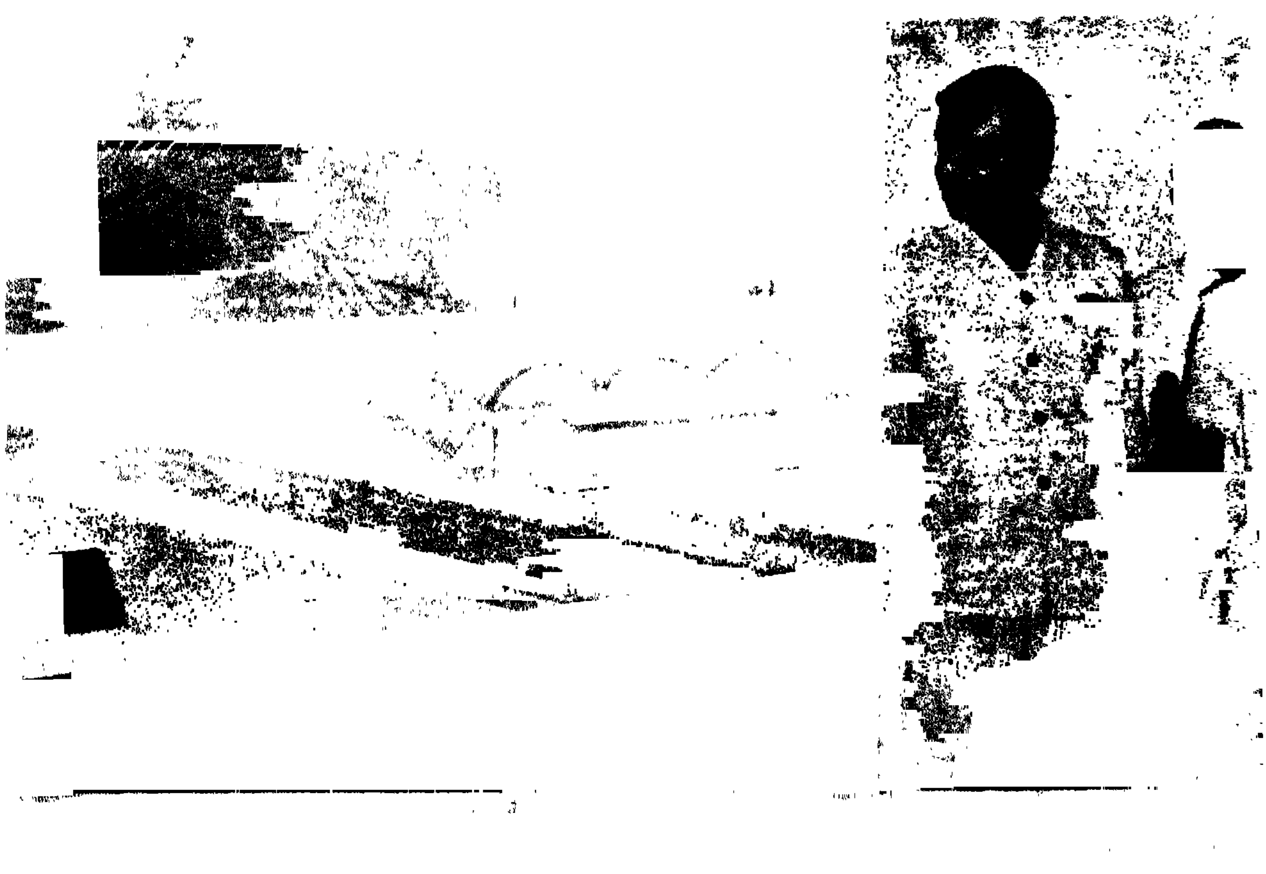




وزیر ریلوے پنڈت کملاپتی ترپاٹھی ۱۰ اپریل ۱۹۷۵ء کو مغربی
ریلوے اسٹیشن کا سنگ بنیاد رکھتے ہوئے۔ بائیں: نئے
ریلوے اسٹیشن کا ماڈل

وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی نے ۱۲/اپریل ۱۹۷۶ء کو رائے بریلی دریاباد - ڈلمئو ریلوے لائن پر جو عرصے سے بند پڑی تھی از سرِ نو ریلوں کی آمد و رفت شروع کیے جانے کی رسم ادا کی







گورنر ڈاکٹر ایم چنا ریڈی ۱۰ اپریل ۱۹۷۰ء کو راج بھون کے دربار ہال میں شری لچھو مہاراج کے ڈائرکشن میں پیش کیا گیا
ایک کلچرل پروگرام دیکھ رہے ہیں





وزیراعلیٰ شری تیواری ۱۰ اپریل ۱۹۷۰ء کو آگرہ میں پدیاترا کرتے ہوئے

وزیراعلیٰ شری تیواری ۱۴ اپریل ۱۹۷۰ء کو بابا صاحب
ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر کی ۷۹ ویں سالگرہ پر ان کے
مجسمہ کی گل پوشی کرتے ہوئے

کے واقعات اور ان کے کلام کا ایک بڑا حصہ اسی بدحالی کے اثرات کو پیش کرتا ہے۔ میر کی تمام شاعری اس دور کی دلی اور اس کی تہذیبی زندگی کے افسانہ کو دہراتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ ان کے یہاں دل اور شہر دلی کی تباہی کا ذکر بار بار آیا ہے۔

دیدنی ہے شکستگی دل کی کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے

دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

ایک اور جگہ پر انھوں نے کہا ہے:

دلی کے نہ تھے کوچے اوراقِ مصور تھے
جو شکل نظر آئی تصویر نظر آئی

دلی کے مقابلہ میں لکھنؤ کی فضا شاعروں کے لیے مالی اعتبار سے سازگار تھی۔ اگرچہ یہاں کے لوگ حقیقی سیاسی اقتدار سے محروم تھے لیکن دولت و ثروت کی کثرت تھی اس لیے شعراء کی سرپرستی میں بھی کوئی دقت نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ شجاع الدولہ کے عہد میں دہلی کے اکثر شعراء نے ادھر کا رخ کیا۔ انھیں کے عہد میں میر بھی لکھنؤ پہنچے اور یہیں پر بس گئے۔

دہلی میں ہر طرح کے مصائب برداشت کرنے کے بعد انھیں یہاں پرسکون فضا ملی تھی لیکن لکھنؤ کی پرتکلف فضا انھیں راس نہ آسکی۔ اور دہلی کو ہمیشہ لکھنؤ پر ترجیح دیتے رہے کیونکہ بقول پروفیسر خواجہ احمد فاروقی

"لکھنؤ میں انھیں جو قدریں ملی تھیں وہ سطحی تھیں یا معنوی۔ لکھنؤ کی تہذیب خوب صورت بھی تھی اور پر رونق بھی لیکن اس میں نہ گرمی تھی نہ گداز۔ اس کا حسن نظر کو تو فریب دے سکتا تھا لیکن دل کو نہیں ——— اس لیے وہ باوجود اہل لکھنؤ کی قدردانی کے دہلی کو لکھنؤ پر ترجیح دیتے رہے کیونکہ اجڑی ہوئی دلی ان کے مزاج سے زیادہ ہم آہنگ تھی۔" [1]

اُن کے اشعار کو ملاحظہ فرمائیے کس قدر حسرت ٹپک رہی ہے۔

خرابہ دلی کا دہ چند بہتر لکھنؤ سے تھا وہیں میں کاش مر جاتا سراسیمہ نہ آتا یاں

رہی نہ گفتہ مرے دل میں داستاں میری نہ اس دیار میں سمجھا کوئی زباں میری

ایک دن صبا کے ہاتھوں دلی والوں کو پیغام بھجواتے ہیں دیکھیے لہجہ کس قدر پرتاثیر اور درد انگیز ہے:

اے صبا گر شہر کے لوگوں میں ہو تیرا گزار
کہیو ہم صحرا نوردوں کا تمامی حالِ زار
خاکِ دہلی سے جدا ہم کو کیا یکبارگی
آسماں کو تھی کدورت سو نکالا یوں غبار
منصب بلبل غزل خوانی تھا سو تو ہے اسیر
شاعری زاغ و زغن کا کیوں نہ ہووے اب شعار

★

---

[1] میر تقی میر حیات اور شاعری ص ۲۵۶

احسن نشاط

قطعات (چند یادیں)

اجنبی دیس کے حسیں چہرو
مجھ سے نا آشنا ابھی تم بھی
تم سے کس طرح دل کی بات کہوں
اجنبی میں ہوں اجنبی تم بھی

چھوڑ کے اپنی حسرتوں کے جہاں
میں تمہارے وطن میں آیا ہوں
اپنی دنیا الگ بسانے کو
چند یادیں بھی ساتھ لایا ہوں

ایسی یادیں جو درد بن بن کر
ہر گھڑی سینے میں سلگتی ہیں
ایسی یادیں جو میری پلکوں سے
کبھی تنہائیوں میں ڈھلتی ہیں

یاد ہیں مجھ کو وہ نقوشِ جمیل
جن کو چھو کر صبا بھی آتی تھی
رات سوتی تھی ان کی زلفوں میں
صبح چہرے سے مسکراتی تھی

اب نہ وہ دن پلٹ کے آئیں گے
اور نہ راتیں مجھے بلائیں گی
وجہ تسکین دل جو ہوتی تھیں
اب وہ گھڑیاں کہاں سے آئیں گی

عادل لکھنوی

قطعات

(ترکِ تعلق)

سوچتا ہوں کہ ترے خط تجھے واپس کر دوں
تجھ سے کہہ دوں کہ مرے خواب مجھے لوٹا دے
تجھ سے ان خوابوں کی تعبیر نہیں بن سکتی
میری راتوں کے یہ مہتاب مجھے لوٹا دے

میں نے سوچا تھا مرے خوابوں کا آئینہ ہے
تیرے الطاف و عنایات کا اک اک پہلو
میں نے سمجھا تھا مرے ذہن میں بس جائے گی
تیری سانسوں کی مہک تیرے بدن کی خوشبو

یہ ترے خط یہ تری یادوں کے دھندلے سے نقوش
میرے زخموں کا مداوا تو نہیں بن سکتے
چند کاغذ کے حسیں ٹکڑوں پہ کل کے وعدے
یہ مرے غم کا ازالہ تو نہیں بن سکتے

تیری یادوں کے تقاضے ہیں گریزاں مجھ سے
تجھ کو خوابوں کا حسیں تاج محل کیسے کہوں
تیری باتوں میں ہیں بیگانہ وشی کے انداز
تو ہی کہہ دے کہ تجھے جانِ غزل کیسے کہوں

ڈاکٹر محمد یٰسین

شری رام

راجہ دشرتھ اجودھیا کے ایک بہت بڑے راجہ تھے۔ راجہ دشرتھ کے تین رانیاں تھیں۔ کوشلیا، کیکئی اور سمترا۔ کوشلیا سب سے بڑی رانی تھی۔ ان تینوں رانیوں میں کیکئی سب سے چھوٹی اور خوب صورت تھی۔ اس وجہ سے راجہ ان کو بہت پیار کرتے تھے اور عزیز رکھتے تھے۔ لیکن راجہ کے کوئی اولاد نہ تھی اس وجہ سے وہ بہت غمگین رہتے تھے۔ انھوں نے اپنے گرو کے مشورے سے ایک بہت بڑا یگیہ کیا تاکہ ان کے یہاں اولاد پیدا ہو۔ راجہ کی دعا قبول ہوئی اور تین رانیوں سے چار لڑکے پیدا ہوئے۔ کوشلیا سے شری رام، کیکئی سے شری بھرت اور سمترا سے شری لکشمن اور شترگھن۔ یہ دونوں جڑواں تھے۔

شری رام کی پیدائش چیت کے مہینہ میں رام نومی کے روز دوپہر کو ہوئی۔ ان کی پیدائش پر سارے اجودھیا میں خوب خوشیاں منائی گئیں۔ ہندو لوگ شری رام چندر جی کو وشنو بھگوان کا اوتار مانتے ہیں۔ یہ اوتار رشیوں کی رکشا کرنے، راکشسوں کو مارنے اور مریادا درست کرنے کے واسطے پیدا ہوا۔

شری رام سب سے بڑے لڑکے تھے۔ وہ بڑے قابل، فرماں بردار، انصاف پسند اور سنجیدہ طبیعت کے تھے۔ شری بھرت کی طبیعت بھی شری رام چندر جی کی طرح تھی۔ لکشمن اور شترگھن مزاج کے تیز تھے۔ ان چاروں بھائیوں میں رام اور لکشمن زیادہ قریب تھے۔ اسی طرح بھرت اور شترگھن زیادہ دوست تھے۔

شری رام ابھی لڑکے ہی تھے کہ ایک روز بزرگ رشی وشوامتر راجہ دشرتھ کے پاس آئے اور کہا کہ راکشس ان کو بہت تنگ کرتے ہیں اور پوجا پاٹ میں خلل انداز ہوتے ہیں۔ انھوں نے راجہ سے استدعا کی کہ وہ رام اور لکشمن کو ان کے ہمراہ بھیج دیں۔ والد کا حکم پاتے ہی یہ دونوں شہزادے وشوامتر کے ساتھ گھنے جنگلوں میں راکشسوں سے لڑنے کے لیے چلے گئے۔ انھوں نے راکشسوں کو شکست دی۔ رشی وشوامتر نے اس موقع پر رام اور لکشمن کو جنگی تربیت دی، کچھ معجز نما ہتھیار دیے اور اپنا آشیرواد اور دعائیں دیں۔

اس کے بعد شری رام اور لکشمن وشوامتر جی کے ساتھ متھلا دیش (بہار) کے راجہ جنک کے دربار میں گئے۔ وہاں پر راجہ جنک کی بیٹی سیتا جی کا سوئمبر ہو رہا تھا۔ سیتا جی بہت خوبصورت تھیں لہٰذا سوئمبر میں حصہ لینے کے لیے بہت دور دور سے شہزادے، راجے اور مہاراجے آئے تھے۔ سوئمبر میں لنکا کا مشہور اور بہت طاقت ور راجہ راون بھی شریک تھا۔ کہتے ہیں کہ راون اتنا طاقت ور تھا کہ ایک مرتبہ اس نے پورا ہمالیہ پہاڑ اٹھا لیا تھا۔

سوئمبر میں شرط یہ تھی کہ جو شخص شیو جی کی دھنش (کمان) کو اٹھا لے گا اسی سے سیتا جی کی شادی ہوگی۔ سب لوگوں نے قسمت آزمائی کی لیکن دھنش کا اٹھانا تو درکنار کوئی اسے اپنی جگہ سے ہلا بھی نہ سکا۔ یہ دیکھ کر راجہ جنک بہت ملول ہوئے کیونکہ شرط پوری نہ ہونے کی صورت میں سیتا جی بن بیاہی رہ جاتیں۔ انھوں نے بڑے دکھ سے مجمع کو خطاب کیا کہ کیا ساری دنیا میں اب کوئی بہادر آدمی رہ ہی نہیں گیا ہے۔

یہ دیکھ کر وشوامتر جی نے شری رام سے کہا کہ بیٹا اٹھو اور دھنش کو توڑ دو۔ حالانکہ راجہ دشرتھ کو دعوت نامہ نہیں بھیجا گیا تھا ور شری رام سوئمبر میں با قاعدہ مدعو نہیں تھے پھر بھی وشوامتر جی کا حکم پاتے ہی وہ اٹھے۔ انھوں نے نہ صرف دھنش کو اٹھایا ہی بلکہ اٹھا کر جھکا دیا اور اتنا جھکایا کہ دھنش دو ٹکڑے ہوگئی سارا دربار مبہوت تھا اور اس طرح شری رام کی شادی سیتا جی سے ہوگئی۔

کچھ سال بعد ایک روز راجہ دشرتھ آئینہ میں اپنا منھ دیکھ رہے تھے کہ یکایک ان کی نظر کچھ سفید بالوں پر پڑی۔ وہ چونکے مطلب یہ کہ بڑھاپا آگیا۔ راجہ دشرتھ نے اپنے وزیروں کے مشورے سے طے کیا کہ وہ تخت شری رام کو سونپ دیں گے اور خود سنیاس لے لیں گے۔

کہتے ہیں کہ راجہ دشرتھ چاہتے تھے کہ راج تلک خاموشی اور آسانی سے ہو جائے۔ اس لیے انھوں نے بھرت جی کو ان کے ننھیال بھیج دیا۔ اور راج تلک کی خبر رانی کیکئی کو بھی نہ دی۔ راج تلک سے ایک روز پہلے منتھرا جو رانی کیکئی کی خادمہ تھی اور ان کے ساتھ ان کے میکے سے آئی تھی، رانی کیکئی کے پاس آئی اور کہا کہ وہ محل سے باہر گئی تھی تو اس نے دیکھا کہ شہر میں بڑی چہل پہل ہے کیونکہ کل شری رام کا راج تلک ہے۔ راجہ دشرتھ نے طے کیا ہے کہ وہ رام چندر جی کو راج گدی سونپ کر خود سنیاس لے لیں گے۔ اس طرح بھرت جی یعنی رانی کیکئی کے لڑکے تخت سے محروم ہو جائیں گے۔ رانی کیکئی نے کہا کہ تو کیا ہوا۔ شری رام بھی ان کے لڑکے ہیں اور اپنی ماں سے زیادہ ان کی عزت کرتے ہیں۔ پھر منتھرا نے سمجھایا کہ وہ غلطی کر رہی ہیں۔ جب شری رام راجہ ہو جائیں گے تو کوشلیا راج ماتا ہوں گی اور لکشمن شری رام کے نائب ہوں گے۔ بھرت جی اور خود رانی کیکئی کی کوئی حیثیت نہ ہوگی منتھرا نے یاد دلایا کہ ایک مرتبہ جب راجہ دشرتھ دشمنوں سے لڑ رہے تھے اور رانی کیکئی رتھ میں ان کے ساتھ تھیں تو رانی نے دیکھا کہ رتھ کے ایک پہیئے کی کیل نکل کر گر گئی ہے اور وہ پہیہ رتھ سے الگ ہونے والا ہے تو رانی نے کیل کی جگہ اپنی انگلی لگا دی۔ جب لڑائی ختم ہوگئی اور راجہ دشرتھ نے رانی کیکئی کی یہ قربانی دیکھی تو انھوں نے خوش ہو کر رانی سے کہا تھا کہ تم کو دو وعدے دیتا ہوں۔ تم دو باتیں یا دو چیزیں جو چاہو مجھ سے مانگ لو میں اُسے ہر قیمت پر پورا کروں گا۔ رانی نے کہا اچھی بات ہے۔ پھر کبھی مانگوں گی۔ منتھرا نے کہا کہ یہی موقع ہے کہ تم راجہ سے کہو کہ وہ رام چندر جی کو ۱۴ سال کے لیے بن باس دے دیں اور بھرت جی کو اس عرصہ کے لیے راج گدی سونپ دیں۔ رانی کیکئی نے منتھرا کی بات مان لی۔

اسی دن رات کو جب راجہ دشرتھ رانی کیکئی کے محل میں آئے تو دیکھا کہ رانی منھ اوڑھے پلیٹے لیٹی ہوئی ہے اور بہت ناراض ہے۔ راجہ دشرتھ کانپ گئے۔ انھوں نے رانی سے ناراضگی کی وجہ پوچھی۔ رانی نے راجہ کو ان کا وعدہ یاد دلایا اور جیسا کہ منتھرا نے سکھلایا تھا اس نے شری رام کے لیے چودہ برس کا بن باس اور بھرت کے لیے چودہ سال تک راج گدی کی مانگ کی پہلے تو راجہ نے سمجھا کہ یہ مذاق ہے لیکن جب رانی اپنی ہٹ پر اڑی رہی اور کسی طرح اس نے اپنی بات واپس نہ لی تو راجہ کے ہوش اڑ گئے اور وہ گر پڑے۔ رات اسی کشمکش میں گزری۔ جب صبح ہوئی تو رانی کیکئی نے شری رام کو اپنے محل میں بلوایا۔ شری رام نے پوچھا بات کیا ہے۔ راجہ اتنے پریشان اور رنجیدہ کیوں ہیں۔ رانی نے پوری بات بتادی اور کہا کہ راجہ تذبذب میں ہیں کہ کیا کریں۔ شری رام کے چہرے پر کوئی بھی غم کی جھلک نہیں دکھائی دی۔ انھوں نے نہایت خندہ پیشانی سے کہا کہ باپ کا وعدہ ضرور پورا ہوگا ۔

رگھوکل ریت سدا چلی آئی
پران جائے پر وچن نہ جائی

شری رام وہاں سے اپنی ماں کوشلیا کے پاس آئے۔ ماں نے پوچھا کہ اتنا دن چڑھ آیا ہے اور وہ ابھی تک راج تلک کے لیے تیار نہیں ہوئے۔ شری رام نے مسکرا کر جواب دیا کہ انھیں ان کے والد

نے جنگل کا راج دیا ہے وہ وہاں جا رہے ہیں۔

اس خبر سے ایک تہلکہ مچ گیا۔ بہت سے لوگوں نے شری رام کو سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ اپنا ارادہ ترک کر دیں اور جنگل کو نہ جائیں لیکن انھوں نے کسی کی نہ مانی۔ یہ دیکھ کر لکشمن جی بھی ان کے ساتھ جانے کو تیار ہو گئے۔ سیتا جی نے بھی کہا کہ وہ بھی شری رام کے ساتھ ہی جائیں گی۔ ان پر بھی سمجھانے کا کوئی اثر نہ ہوا۔

ان تین آدمیوں کا قافلہ پورے اجودھیا کو روتا ہوا چھوڑ کر جنگل کی طرف روانہ ہوا۔ ادھر یہ لوگ چلے اور ادھر راجہ دشرتھ اس صدمہ کی تاب نہ لا کر جاں بحق ہو گئے۔

رانی کیکئی کے لڑکے بھرت جی جب اجودھیا پہنچے اور ان کو سارا حال معلوم ہوا تو وہ بہت ناراض اور غمگین ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ وہ ہرگز راج گدی پر نہیں بیٹھیں گے۔ بھرت جی نے اپنے پورے خاندان کے افراد کو ساتھ لیا اور شری رام کو واپس لانے کے لیے چترکوٹ روانہ ہو گئے۔

جب یہ لوگ چترکوٹ پہنچے تو شری رام سب سے پہلے رانی کیکئی سے ملے۔ وہ کسی طرح واپس آنے پر رضامند نہیں ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ وہ باپ کا وعدہ ضرور نبھائیں گے۔ جب بھرت جی نے دیکھا تو وہ شری رام کی کھڑاؤں لیتے آئے اور اسے راج سنگھاسن پر رکھ کر شری رام کے نائب کی حیثیت سے ان کی غیر موجودگی میں سلطنت کا کام انجام دیتے رہے۔

بھرت جی کی چترکوٹ سے واپسی کے بعد شری رام نے سوچا کہ ان کے خاندان کے لوگوں کو ان کی جائے رہائش کا پتہ چل گیا ہے وہ اکثر وہاں آئیں گے "بن باس" کے معنی صرف جگہ کی تبدیلی نہیں ہے لہٰذا انھوں نے چترکوٹ چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا۔ وہ وہاں سے دکھن کی جانب پنچ وٹی چلے گئے۔

پنچ وٹی میں لنکا کے مشہور اور طاقت ور راجہ راون کی بہن سروپ نکھا نے شری رام کو دیکھا۔ ان کو دیکھتے ہی وہ ان پر عاشق ہو گئی اور شری رام کا قرب حاصل کرنے کے لیے طرح طرح کی ترکیبیں کرنے لگی۔ شری رام نے اس کو باز رکھنے کی کوشش کی لیکن وہ نہ مانی۔ آخرکار شری رام کے اشارے پر لکشمن جی نے سروپ نکھا کی ناک اور کان کاٹ ڈالے۔

سروپ نکھا روتی ہوئی اپنے دو سگے دو بھائیوں کھر اور دوشن کے پاس گئی۔ کھر اور دوشن اپنے ساتھیوں کو لے کر شری رام سے لڑنے کے لیے آئے لیکن دونوں مارے گئے۔

سروپ نکھا یہ دیکھ کر اپنے سب سے بڑے بھائی راون کے پاس فریاد لے کر گئی۔ اپنی بہن کی بے عزتی کا بدلہ لینے کے لیے راون نے دھوکے سے سیتا جی کو ہر لیا اور لا کر لنکا میں قید کر دیا۔ شری رام نے بندروں کے راجہ سگریو اور ان کے سپاہی شری ہنومان کی مدد سے لنکا پر چڑھائی کی۔ راون کو شکست فاش ہوئی وہ لڑائی میں مارا گیا۔ سیتا جی کو قید سے رہائی ملی۔

چودہ ۱۴ سال کی مدت پوری ہونے کے بعد شری رام اجودھیا واپس لوٹے۔ بھرت جی نے شری رام چندر جی کا بڑا پرجوش استقبال کیا اور راج گدی شری رام کے حوالے کی۔ سارے بچھڑے ہوئے گلے مل گئے۔

شری رام کی زندگی کے حالات "رامائن" سب سے پہلے والمیکی نے سنسکرت میں لکھی۔ والمیکی نے شری رام کو ایک آئیڈیل انسان کے روپ میں پیش کیا ہے۔ شہنشاہ اکبر اعظم کے دور حکومت میں تلسی داس نے "رام چرتر مانس" فلسفیانہ انداز میں لکھی اور شری رام کو انسان سے زیادہ اوتار دکھلایا ہے تامل زبان میں کمبن نے رامائن بہت دل کش پیرایہ میں لکھی ہے۔

شری رام انسان کامل تھے۔ آدرش مجسم۔

★

قیام الدین مضطر

اندرا گاندھی سے تخاطب

اے پاسبانِ مملکتِ ہند، نیک خو
شاعر ہوں، تجھ سے ہوتا ہوں مصروفِ گفتگو

ہے تیرا کیا مقام، تو کیا ہے، خبر بھی ہے
میری نظر سے دیکھ، تو خود کو، کہ کیا ہے تو

خورشید و ماہتاب فلک پر ہیں جس طرح
روشن ہے تو زمیں پہ اسی طرح ہو بہو

تو کیا ہے، گلستانِ عمل کی ہے باغباں
ابرِ کرم ہے، رحمتِ پروردگار تو

تو نے زمینِ ہند کا رتبہ بڑھا دیا
تیرا ہی ذکر، تیرا ہی چرچا ہے چار سو

تو نے وطن کو ایٹمی طاقت بنا دیا
کیا خوب ہے یہ تیرا عمل، تیری جستجو

اس دیش کی غریبی مٹی ہے مٹے گی اور
بیماریِ وطن کی، تو ہی تو ہے چارہ جو

اسمگلروں سے تو نے وطن کو نجات دی
مدت سے پی رہے تھے یہ انسان کا لہو

رستے سے جو ہٹے تھے وہ رستے پہ آ گئے
اپنے کیے پہ سب ہی پشیماں ہیں حیلہ جو

واللہ تیرا بیس نکاتی پروگرام
مخفی ہے اس میں دیش کی تکمیلِ آرزو

وہ جن کو جاننا ہو کہ حبِ وطن ہے کیا
محفل میں تیری آئیں، مگر آئیں با وضو

مضطرؔ میں حق پرست ہوں بھارت کا ہوں ادیب
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی مجھ میں نہیں ہے خو

خان اختر

بیس شعاعیں

خورشید و مہ و انجم سب توڑ کے لانا ہے
اس دیش کی دھرتی کو آکاش بنانا ہے
صحرا کی زمینوں کو پھولوں سے سجانا ہے
اور صحنِ گلستاں کو فردوس بنانا ہے
اک ذہنِ منور سے پھوٹی ہیں شعاعیں جو
ان بیس شعاعوں کو سینے سے لگانا ہے
پائیں گے برابر سے اب اپنی زمینوں کو
بے کھیت کسانوں کی طاقت کو بڑھانا ہے
الفت سے محبت سے چمکائیں گے ہر چہرہ
ہر قرض کے دھبے کو دامن سے مٹانا ہے
زردار کی فطرت کو بدلیں گے بہر صورت
مزدور کی محنت کا پھل اس کو دلانا ہے
محنت سے مشقت سے اور اپنے ہی ہاتھوں سے
بیکار زمینوں کو زرخیز بنانا ہے
آشوبِ زمانہ کے ہاتھوں سے بچا کر اب
امید کی ہر کشتی ساحل سے لگانا ہے
سرکار کی امداد اور جنتا کے تعاون سے
ہر صنعت و حرفت کا معیار بڑھانا ہے
اخلاص کے نغموں سے الفت کے ترانوں سے
بغض اور تعصب کے شعلوں کو بجھانا ہے
مزدور ہوں تاجر ہوں صانع ہوں کہ مل مالک
ان سب کو فرائض کا آئینہ دکھانا ہے
جس بامِ ترقی پر کچھ اور ممالک ہیں
اس بامِ ترقی پر بھارت کو بھی لانا ہے
ان بیس شعاعوں کے اخترؔ جو اشارے ہیں
ان سب پہ عمل کر کے ہم سب کو دکھانا ہے

اختر حسین

ضمیر کی آواز

(افسانہ)

روڈویز کی بس مسافروں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ سیتا پور بس اسٹیشن پر وہ جوں ہی آکر رکی کچھ مسافر اپنا سامان ہاتھ میں لیے ہوئے بس میں چڑھنے لگے بس میں چڑھتے وقت تمام مسافر ہندستانی روایت کو برقرار رکھے ہوئے تھے یعنی ہر آدمی بس میں پہلے پہنچنے کی کوشش میں مصروف تھا لیکن وہ یہ بھول جاتا تھا کہ کتنے لوگ ایسے ہیں جو اس کی جلد بازی اور اپنی ضعیف العمری کی وجہ سے بس میں داخل نہیں ہو پا رہے تھے۔

اسی درمیان ایک دس سالہ لڑکا جاڑے کے موسم میں بھی ایک گندی سی بنیائن اور نیکر پہنے، ہاتھ میں باسکٹ ٹانگے ہوئے بس میں چڑھتا چلا آ رہا ہے وہ مجمع کو جلد سے جلد چیر کر اوپر آنا چاہتا تھا تاکہ اس کا سودا زیادہ سے زیادہ لوگ خرید سکیں "چار آنے کی پچاس گرام مونگ پھلی ہے حضور۔ یہ ہندستانی میوہ چار آنے میں پچاس گرام حضور"۔ وہ اسی طرح کی مسلسل آوازیں لگاتا رہا۔ ارشد نے اس کو اپنے نزدیک بلایا اور کہا "پچاس گرام موم پھلی دو بیٹا ــــــ" "ابھی دیا حضور"، یہ کہہ کر اس نے موم پھلی کا ایک پیکٹ بڑی پھرتی سے نکالا اور ارشد کو تھما دیا، پیسے لے کر وہ آواز لگاتا ہوا آگے بڑھ گیا اور جب تک بس وہاں کھڑی رہی وہ برابر یہی آواز لگاتا رہا ــ پھر بس کے ڈرائیور نے ہارن دیا اور کنڈکٹر نے سیٹی دے دی۔ اور بس اپنی طوفانی گھڑگھڑاہٹ کے ساتھ اسٹارٹ ہو کر آگے بڑھنے لگی اور انجن کے اس شور میں لڑکے کی آواز "چار آنے میں پچاس گرام موم پھلی ہے حضور" اس طرح ڈوبتی چلی گئی جس طرح رات کے آخری پہر تارے ڈوبتے چلے جاتے ہیں اور ارشد کھڑکی سے باہر مونگ پھلی کے چھلکے پھینکتا رہا یہ چھلکے ہوا میں ایسے اڑ رہے تھے جیسے آپس میں آنکھ مچولی کر رہے ہوں۔

ارشد ایک پرائیوٹ فرم میں کلرک تھا۔ ابھی اس کی عمر صرف بیس ہی سال تھی لیکن گھریلو پریشانیوں کے سبب وہ محض بی، اے تک تعلیم حاصل کر سکا اور پھر اسی کے بعد ہی تعلیمی زندگی کو خیرباد کہہ کر فکر معاش میں اسے دفتروں کے چکر لگانا پڑے لیکن واہ ری قسمت بی، اے کی فرسٹ ڈویژن بھی اس کو اچھی نوکری نہ دلا سکی۔ بڑی جد و جہد اور دوڑ دھوپ کے بعد اسے دو سو روپیہ ماہوار کی نوکری مل گئی لیکن نوکری دینے والے نے تنخواہ مقرر کرتے وقت یہ بھی محسوس نہ کیا کہ یہ دو سو روپے کی رقم اس کی تعلیمی زندگی میں پیدا شدہ مشکلات کے باعث اپنی ماں کے رہن رکھے ہوئے زیورات کو چھڑانے کے لیے بہت کم ہے جو کافی عرصہ قبل اس امید پر گروی رکھے گئے تھے کہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد اس گھر کے آنگن میں خوشیوں کے پھول کھلیں گے لیکن جن پھولوں کے کھلنے کی توقع کی جا رہی تھی وہ کھلنے سے پہلے ہی مرجھا گئے تھے۔ بدرجۂ مجبوری ارشد کو یہ نوکری کرنا پڑی جس کے لیے اُسے روز لکھیم پور کھیری سے سیتا پور آنا پڑتا تھا۔

روز مرہ کی زندگی کے تمام معمولات میں اس مونگ پھلی بیچنے والے بچے سے بھی ارشد کی ملاقات ضروری تھی اور ارشد اس سے روز ہی مونگ پھلی خرید لیا کرتا تھا۔ ہر روز وہ اس کی مخصوص آواز سنا کرتا تھا۔ دو سال کے بعد ایک روز وہ لڑکا اس بس میں نہیں دکھائی دیا تو ارشد کو تعجب سا ہوا اس نے کافی دیر تک انتظار کیا لیکن بس اپنے وقت کے مطابق اسٹیشن چھوڑ چکی تھی۔ دوسرے دن ارشد نے دیکھا کہ وہ بچہ اب بس اسٹیشن پر خوانچہ لگائے ہوئے لوگوں کو متلاشی نظروں سے دیکھ رہا ہے اور کبھی کبھی وہی پرانی آواز "چار آنے میں پچاس گرام ہے حجور" لگا دیا کرتا ہے۔ ارشد اس کے قریب آ گیا اور پوچھا کیوں بھائی یہ خوانچہ تم نے کب سے لگایا، لڑکے نے جواب دیا ابھی ایک دن ہوا ہے حجور ——— رسمی ملاقات اور مونگ پھلی کی خریداری کے بعد ارشد بس میں چڑھ گیا۔

زندگی کے دن گزرتے رہے وقت کا تیز دھارا زمانہ کو اپنے ساتھ بہاتا چلا گیا۔ ارشد کی انتھک محنت اور جانفشانی اس کے کام آئی اب اس کی معاشی حالت کافی اچھی ہو چکی تھی زندگی کی اس تبدیلی میں اس کے پارٹ "ٹائم" جاب نے بہت ساتھ دیا وہ اپنی زندگی کی راہوں میں کامیابی و ترقی کی بلندی کو چھونے کی کوشش کرتا رہا جس سے اس کو کافی محنت کا سہارا لینا پڑا، اس کی مستقل مزاجی نے اسے کلرک سے آفس سپرنٹنڈنٹ بنا دیا۔ ایک دن ارشد نے واپسی میں دیکھا کہ وہ لڑکا اب کافی تندرست اور صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے بس اسٹیشن کے اندر ہی ایک ہوٹل میں ملازمین کے ذریعے چائے تقسیم کروا رہا ہے۔ ارشد کو اس کی یہ تبدیلی دیکھ کر بہت خوشی ہوئی، وہ اس چھوٹے سے ہوٹل میں داخل ہوا تو لڑکے نے اسے بڑے ادب سے سلام کیا ارشد نے اسے مبارک باد دی اور اس تبدیلی کے بارے میں استفسار کیا تو لڑکے نے بتایا کہ حضور یہ سب میری بے پناہ محنت کا نتیجہ ہے۔ ارشد نے کہا ارے بھائی تم مجھ سے اپنا نام و تبدیلی بتاؤ ——— "حجور میرا نام رئیس ہے۔ میں اسی سیتاپور کی گندی بستی میں پیدا ہوا۔ میرے ماں باپ مجھے بچپن میں ہی بے سہارا چھوڑ کر اس دنیا سے چلے گئے"۔ یہ کہہ کر اس کی آنکھیں نم ہو گئیں، پھر میں حجور پیٹ پالنے کے لیے ادھر ادھر بھٹکتا رہا، اور کچھ ہی عرصے کے بعد مونگ پھلی بیچنے کا کام میں نے شروع کر دیا۔ میں اپنی روز کی آمدنی اپنے محلے کی ایک بہت ہی رحم دل اور خدا ترس بوڑھی عورت کے پاس رکھ دیا کرتا تھا اور اسی کے یہاں سوتا بھی تھا وہ مجھے اپنے بیٹے کی طرح پیار کرتی تھی، ایک ہی سال کے اندر جب میں نے ایک اچھی خاصی رقم اکٹھا کر لی تو میں نے یہ ہوٹل کر لیا اور پھر تھوڑے دنوں کے بعد میری دنیا کی سب سے بڑی قیمتی چیز میری بوڑھی ماں، میری سرپرست میری غمخوار مجھے داغِ مفارقت دے گئی" اب میں اکیلا اس ہوٹل کے لیے رہ گیا یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ارشد نے اسے بہت تسلی دی۔ کچھ دیر کے بعد جب اس کی سسکیاں بند ہوئیں تب ارشد نے پوچھا کہ تم اب کہاں رہتے ہو۔ اس نے بتایا کہ اب میں نے اسی جھونپڑے کو پختہ مکان میں تبدیل کر لیا ہے۔ کیونکہ میری بوڑھی ماں نے اپنی کل جائداد مجھ ہی کو دے دی تھی اور اب میں اسی مکان میں رہتا ہوں حجور ——— ارشد نے اس سے ذرا تیکھے انداز میں کہا کہ اب تم یہ حجور حجور نہ کہا کرو ——— رئیس نے جواب دیا کہ آپ سے میری ملاقات بچپن سے ہے اس لیے مجھے آپ کو حجور کہتے ہوئے شرم نہیں محسوس ہوتی۔ ارشد نے کہا وہ تو ٹھیک ہے لیکن جب تم بچپن میں حجور کہہ کر لوگوں کو مخاطب کرتے تھے تب بھی مجھے بہت ناگوار معلوم ہوتا تھا لیکن اس وقت دنیا والوں کی خوشنودی حاصل کرنے اور اپنا پیٹ پالنے کے لیے ضروری تھا کہ انھیں حجور کہہ کر مخاطب کرو، چیتھڑوں میں لپٹا ہوا گندہ جسم سفید پوش لوگوں کو حجور کہہ کر ہی مخاطب کرتا ہے لیکن کوئی کیا جانے کہ چیتھڑوں میں کتنی پاکیزگی ہے اور سفید کپڑوں میں کتنی غلاظت ہے۔ اب تم اپنی جد و جہد سے ایک ہوٹل کے مالک ہو گئے ہو اب تو حجور کہہ کر تم مجھے مخاطب نہ کیا کرو اور پھر

تھوڑی دیر کے بعد ارشد اسے کچھ صلاح مشورے دے کر رخصت ہو گیا۔ رئیس کے کانوں میں ارشد کی آواز گونجتی رہی کہ چیتھڑوں میں لپٹا ہوا گندہ جسم سفید پوش آدمیوں کو حضور کہہ کر ہی مخاطب کرتا ہے۔ ۔۔۔۔

زندگی کے صبح و شام اپنے معمول کے مطابق دنوں، مہینوں اور سالوں میں بدلتے رہے، رئیس کا ہوٹل سیتاپور کا بہترین ہوٹل شمار ہونے لگا۔ اب رئیس وہ رئیس نہیں تھا جو بچپن میں تھا لیکن ارشد کے سامنے وہ آج بھی بچپن والا رئیس تھا اور ان دونوں کے درمیان آج بھی وہ رشتہ قائم تھا۔ اب رئیس کا مکان ایک خوبصورت مکان میں تبدیل ہو چکا تھا لیکن وہ آج بھی اسی بستی میں رہتا تھا جہاں آج سے دس سال قبل وہ ایک جھونپڑا تھا۔ دولت کی زیادتی نے رئیس کے اندر کچھ تبدیلیاں پیدا کر دی تھیں لیکن ارشد کی نصیحتیں اکثر اس کے ضمیر کو جھنجوڑ دیتی تھی اور وہ اپنی کم عمری کے دور میں پہنچ جاتا تھا جہاں دوسرے اس کے لیے حضور تھے۔

ایک مرتبہ سیتاپور میں زبردست سیلاب آ گیا، بہت لوگ بے گھر ہو گئے اور خاص طور سے رئیس کے محلے والے اس آفت ناگہانی کا شکار بہت زیادہ ہوئے ان کی مفلسی اور فاقے انھیں مجبور کرتے تھے کہ وہ رئیس کے دروازے پر دستک دیں اسی امید سے وہ اس کے گھر کی سمت چلے آتے تھے۔ ایک دن رئیس اپنے ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک بڑھیا اپنے ساتھ ایک جوان لڑکی کو لیے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی بڑھیا فاقوں سے بہت ہی نڈھال تھی اور اس لڑکی کا بھوک سے پیٹ پچک گیا تھا جس کے باعث اس کی آنکھیں نمناک تھیں۔ بڑھیا نے بڑے دردناک لہجے میں التجا کی تھی، رئیس نے بڑھیا کی بات ان سنی کر دی۔ وہ تو صرف اس لڑکی کے چیتھڑوں میں لپٹے ہوئے جسم کو دیکھ رہا تھا جو چیتھڑوں میں لپٹا ہونے کے باوجود اپنے پورے شباب پر تھا رئیس نے بڑھیا کا مفہوم سمجھ کر اس کی امداد کر دی اور کہا کہ شام کو اپنی لڑکی کو بھیج دینا تو میں اور بھی زیادہ مدد کر دوں گا تمھارے آنے کی ضرورت نہیں کیونکہ تم بہت ضعیف ہو گئی ہو ——— اچھا بیٹا اس بڑھیا نے کہا اور ہدیہ تشکر سے اس لڑکی کی صرف پلکیں جھکیں اور پھر پلکوں کی چلمن اٹھ گئی بڑھیا اور وہ لڑکی رئیس کو دعائیں دیتی ہوئی واپس لوٹ آئیں ——— شام کو بڑھیا نے لڑکی کو رئیس کے گھر بھیج دیا رئیس شام سے پہلے ہی لڑکی کا انتظار کر رہا تھا، وہ لڑکی جیسے ہی مکان میں داخل ہوئی رئیس کی ہوس ناک نگاہوں نے اس کا استقبال کیا۔ رئیس نے اس کو اندر آنے کے لیے کہا اور پوچھا تمھارے ماں باپ نہیں ہیں؟ لڑکی نے کہا کہ میرے ماں باپ دونوں اس دنیا میں نہیں ہیں رئیس کو ایک ہلکا سا جھٹکا اپنے ذہن پر محسوس ہوا لیکن ہوس کی آگ میں جلتے ہوئے اس کے وجود نے اس ذہنی جھٹکے کا احساس بہت جلد ختم کر دیا رسمی گفتگو کے بعد رئیس نے اس کے جسم کی طرف ہاتھ بڑھایا تو وہ لڑکی پیچھے ہٹ گئی لیکن رئیس کی مضبوط باہوں نے بہت جلد اسے اپنے وجود میں سمیٹ لیا۔۔۔۔۔ لڑکی نے کہا کہ حضور میری بڑھیا ماں نے مجھے تمھارے پاس مدد کے واسطے بھیجا ہے لیکن حضور تم یہ میری مدد کر رہے ہو یا میری کسی مجبوری سے فائدہ اٹھا رہے ہو رئیس نے کہا تم مجھے حضور حضور مت کہو تب لڑکی نے بڑے طنز کے ساتھ جواب دیا کہ چیتھڑوں میں لپٹا ہوا گندہ جسم سفید پوش آدمیوں کو حضور کہہ کر ہی مخاطب کرتا ہے۔ اتنا سنتے ہی رئیس کے بازو ایک دم ڈھیلے پڑ گئے اور وہ دور بستر پہ جا گرا۔ ارشد کے الفاظ نے آج لڑکی کے اندر جنم لے کر رئیس کے سارے وجود کو ننگا کر دیا تھا، اس کا ضمیر جاگ اٹھا، وہ انتہائی پشیمان تھا اس کی نگاہوں کے سامنے اس کا بچپن بہت تیزی سے گھوم رہا تھا اور باہر گلی میں ایک بچہ زور زور سے چلا رہا تھا۔

"مونگ پھلی چار آنے میں پچاس گرام ہے حضور"

★

مومن خاں شوق

نیا دور، نئے عزم

کم کرو باتیں، عمل اپنا دکھاؤ دوستو
دیش کی خاطر سے تن من دھن لُٹاؤ دوستو

آے گی خوش حالی پیداوار کی افراط سے
اپنی پیداوار، محنت سے بڑھاؤ دوستو

دیش کے دشمن ہی پھیلاتے ہیں افواہیں یہاں
دیش بھگتو! منھ پہ افواہیں نہ لاؤ دوستو

آج مستعدی، ڈسپلن وقت کی للکار ہے
کام نپٹا کر، قدم آگے بڑھاؤ دوستو

محنت و کوشش، دیانت کا سبق لو شوق سے
دیش کو اس طرح دشمن سے بچاؤ دوستو

بیس نکاتی پروگرام

غلام مصطفیٰ انور سلطانپوری

ہم کو دعوت دے رہا ہے بیس نکتوں کا محاذ
متحد ہو کر کریں گے سر ترقی کا محاذ
سیٹھ یا ساہوکار کے سر اک نئی اُفتاد ہے
قرض کے چنگل سے ہر مزدور اب آزاد ہے
کام لے سکتا نہیں جبراً کوئی مزدور سے
سب کو آگاہی ملی ہے تیسرے منشور سے
اب مناسب طور پر مزدور کو اجرت ملے
جس قدر محنت کرے اتنی اُسے قیمت ملے
اور رہائش کے لیے ہر خانداں کو گھر ملے
اب نہ سڑکوں پر تنگا مزدور کا بستر ملے
آبپاشی کے طریقوں کا ہو اچھا انتظام
اور بجلی کے فوائد سے ہوں بہرہ ور عوام
طالب علموں کے لیے سستی کتابیں کاپیاں
ہوں حصول علم کی ممکن سبھی آسانیاں
علم میں سرکار کے آجاے شہری جائیداد
ٹیکس چوری کی دبا کا ہو مکمل انسداد
صنعتیں جتنی بھی ہوں بہتر ہو سب کا انتظام
دور ہو دے روزگاری اور ملے ہر اک کو کام
جتنی مزروعہ زمیں ہے اس کی پیمائش بھی ہو
بھوم ہینوں کو زمیں ملنے کی گنجائش بھی ہو
غلہ۔ صابن اور گھی کپڑے کی اب دقت نہ ہو
زندگی کی ہر ضروری شے کی پھر قلت نہ ہو
ہو ٹرافک کے لیے پرمٹ کا بہتر انتظام
ہو درآمد اور برآمد کا مکمل اہتمام
جو بھی اب سامان اسمگلنگ کا پکڑا جاے گا
اب کسی حالت میں وہ ہرگز نہ چھوڑا جاے گا
چور بازاری کا مٹ جاے گا اب نام و نشاں
گامزن ہے اب صداقت کی طرف ہندوستاں
رہبر ہندوستاں کا اب یہی اعلان ہے
دور حاضر کی صدا ہے وقت کا فرمان ہے
ملک کی اس میں ترقی ہے اسے اپنایئے
بیس نکتوں کو بہرصورت عمل میں لایئے
اب قدم راہ صداقت سے نہ ہٹنا چاہیے
ایکتا کی راہ پر مل جل کے چلنا چاہیے

شفیق احمد صدیقی

طلاق

(افسانہ)

"ہیلو سریتا!"

"ہیلو مسز گپتا...... آؤ آؤ...... آج دفتر بند ہے کیا؟"

"نہیں آج کچھ موڈ نہیں تھا دفتر جانے کا۔ سوچا تم ہی سے مل آؤں...... کیا بات ہے آج کچھ پریشان نظر آرہی ہو؟"

"ٹھیک اندازہ لگایا آپ نے۔ دراصل آج پھر ان سے جھڑپ ہو گئی۔"

"اُف! سریتا میں کہتی ہوں روز روز کی اس کشیدگی سے تو بہتر ہے کہ تم ہمیشہ کے لیے قانونی علیحدگی اختیار کر لو۔"

"مسز گپتا۔ آپ نے میرے دل کی بات کہہ دی۔ میں نے بھی یہی سوچا ہے۔"

"تو پھر دیر کس بات کی ہے۔ صاف صاف سنیل سے کہہ دو کہ میں تمھارے ساتھ رہ کر اپنی زندگی کو تباہ و برباد نہیں کر سکتی سچ پوچھو سریتا اب دنیا بہت آگے نکل گئی ہے۔ اب وہ دن گئے جب عورت گھر کی چہار دیواری کی زینت بن کر مطمئن رہتی تھی۔ میں حیران ہوں کہ تم ایک تعلیم یافتہ عورت ہو کر ہر وقت چولھے چکی کے علاوہ کچھ سوچتی ہی نہیں ہو۔ اس مہنگائی کے زمانے میں اگر تمھارا جرنلسٹ ہزبینڈ تمھیں اچھے کپڑے اور اچھا کھانا نہیں دے سکتا تو تم سروس کیوں نہیں کر لیتیں۔ اس بد دماغ کے ساتھ کب تک زندگی گذارو گی؟"

"بد دماغ! واقعی مسز گپتا سنیل بد دماغ ہے ـــــ بہت بد دماغ!"

"خیر تمھیں احساس تو ہوا کہ وہ بد دماغ ہے۔"

"بد دماغ نہیں تو اور کیا؟ میں کیا بننا چاہتی تھی لیکن اس کی بد دماغی نے مجھے کچھ بھی تو نہ بننے دیا"

"کیا بننا چاہتی تھیں تم؟"

"کالج کے ڈراموں میں ہمیشہ اوّل آتی تھی۔ میری سہیلیاں تو یہاں تک کہتی تھیں کہ اگر میں فلمی دنیا میں چلی جاؤں تو ٹاپ کی فلم اسٹار بن سکتی ہوں۔ فلمی دنیا میں ہوتی تو خوب گلیمر کے ساتھ رہتی۔ کشمیر اور دارجلنگ کے علاوہ یورپ اور امریکہ کی سیر کرتی لیکن سنیل کی بددماغی نے میرے ارمانوں کو کچل کر رکھ دیا۔"

"سریتا میری بات کا برا نہ مانو تو کہہ دوں کہ تمھارا ہزبینڈ احساس برتری میں مبتلا ہے۔ وہ انگریزی اخبار کا جرنلسٹ کیا بن گیا کہ اپنے آپ کو جارج برنارڈ شاہ ہی سمجھنے لگا ہے۔"

"واقعی آپ ٹھیک ہی کہتی ہیں۔ وہ اپنے آپ کو بہت عقلمند سمجھتا ہے۔"

"آج کل کے مردوں میں بس یہی تو ایک کمی ہے کہ اپنے آپ کو نہ جانے کیا سمجھتے ہیں۔ عورت کو کچھ سمجھتے ہی نہیں۔ یہ نہیں سوچتے کہ عورت بھی برابر کے حقوق رکھتی ہے۔ آج عورت گورنر بن سکتی ہے۔ ایمبیسیڈر بن سکتی ہے۔ آئی پی ایس اور آئی۔ اے۔ ایس کے مقابلے میں شریک ہو کر اعلیٰ عہدے پر پہنچ سکتی ہے۔

...... لیکن سریتا یہ تو بتاؤ کہ آج ہوا کیا تھا؟

"یہ تو میں آپ کو بتا ہی چکی ہوں کہ فلم اسٹار بننا چاہتی تھی لیکن سنیل نے مجھے فلمی دنیا میں نہ جانے دیا۔ خیر میں فلم اسٹار تو نہ بن سکی لیکن مجھے فلموں اور فلم اسٹاروں سے تو اب بھی دلچسپی ہے

یہ تو آپ کو معلوم ہی ہو گا کہ پچھلے ہفتے سے دھرمیندر، ہیما مالنی اور دوسرے کئی اسٹارس کسی فلم کی شوٹنگ کے سلسلے میں دہلی آئے ہوئے ہیں۔ کل پرانے جمنا برج پر شوٹنگ ہو رہی تھی۔ مسز عباس، مسز اگروال اور مسز ڈیسوزہ بھی اپنے ہزبینڈز کے ساتھ شوٹنگ دیکھنے جا رہی تھیں۔ میں نے سنیل سے کہا کہ وہ مجھے شوٹنگ دکھانے کے لیے لے چلے تو کہنے لگا کہ مسئلہ خوراک پر اشوکا ہوٹل کے کنونشن ہال میں ہونے والی بین الاقوامی کانفرنس کی خبریں لینے کے لیے جانا ہے۔ جب میں نے کہا کہ کیا میں مسز کپاڈیا کے ساتھ چلی جاؤں تو کہنے لگا نہیں۔"

"کیوں مسز کپاڈیا کے ساتھ بھیجنے میں کیا قباحت تھی اس کو؟"

"کہنے لگا آج تیسرے پہر میرے کچھ انگریز جرنلسٹ دوست گھر پر آئیں گے ان کے لیے چائے اور کافی کا انتظام رکھنا۔"

"جبھی تو میں کہتی ہوں سریتا کہ مرد لوگ اپنی وائف کو ملکہ میڈ سرونٹ سمجھتے ہیں۔ کیا انگریز جرنلسٹ دوستوں کے لیے کسی ہوٹل یا ریسٹورنٹ میں چائے اور کافی کا انتظام نہیں ہو سکتا تھا جو اس نے تمھاری فلم کی شوٹنگ دیکھنے کی خواہش کا گلا گھونٹ ڈالا۔"

"ایسا ایک بار نہیں مسز گپتا سیکڑوں بار ہوا ہے۔ میرے ارمانوں کا خون کر کے انھیں بڑا مزہ آتا ہے۔"

"خیر اب بھی کچھ نہیں بگڑا تمھارا۔ یہ تمھاری خوش قسمتی ہی ہے کہ تم دو بچوں کی ستائیس سالہ ماں ہونے کے باوجود بھی میک اپ کے سہارے بن سنور کر انیس سال کی کنواری لڑکی معلوم ہوتی ہو۔ اگر باہر نکل کر تم اپنے پرستاروں کو ڈھونڈنے نکلو تو ہزاروں کیا بلکہ لاکھوں رئیس زادے نوجوان عاشق تمھاری راہوں میں آنکھیں بچھائے تیار ملیں گے۔ ان ہی میں سے کسی ایک کا ہاتھ تھام لینا ورنہ اس گھر میں پنجرے کے پنچھی کی طرح کب تک زندگی گزارو گی۔ رہا بچوں کا سوال سنیل جتنا روپیہ تم پر خرچ کرتا اتنے روپیوں میں بچوں کے لیے ایک گورنس رکھ لے گا۔"

"لیکن اگر اس نے مجھے طلاق دینے سے انکار کر دیا تو؟"

"اس کے لیے تمھیں ذرا ہمت سے کام کرنا ہو گا۔"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی؟"

"مطلب یہ کہ تم سنیل سے مسٹر کپور کی ایکسپورٹ امپورٹ کی فرم میں نوکری کرنے کی خواہش ظاہر کرنا۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ بات سن کر وہ چڑھ جائے گا۔ تم اس کی پروا کیے بغیر ہی مسٹر کپور کی فرم میں نوکری کر لینا۔ میرے سفارشی خط سے وہ تمھیں کوئی جگہ خالی نہ ہونے پر بھی رکھ لے گا۔ مسٹر کپور آج کل لاکھوں میں کھیل رہا ہے۔ دیکھتی نہیں چانکیہ پوری میں کیا شاندار بنگلہ بنوایا ہے اس نے۔ ابھی امپورٹیڈ امپالہ خریدی ہے۔ جب سے اس نے اپنی جاہل بیوی کو طلاق دی ہے وہ ایک اچھی خوب صورت اور تعلیم یافتہ بیوی کی تلاش میں ہے۔ میں کہتی ہوں ایسا گولڈن چانس پھر کبھی ہاتھ نہیں آئے گا۔ زندگی بھر عیش کرو گی عیش۔"

"ہیلو سریتا!"

"ہیلو سنیل!"

"کیا بچے ابھی تک اسکول سے نہیں آئے؟"

"بس آتے ہی ہوں گے۔"

"کیا بات ہے کچھ پریشان نظر آ رہی ہو؟"

"پریشان نہ ہوں تو پھر اور کیا ہوں؟ تم ڈیوٹی پر چلے جاتے ہو۔ بچے اسکول چلے جاتے ہیں۔ اس گھر کی چہار دیواری میں بور ہونے کے لیے صرف میں ہی رہ جاتی ہوں۔ مسز خان، مسز عباس، مسز اگروال اور مسز ڈیسوزہ اپنے ہزبینڈز کی غیر موجودگی میں اپنا من بہلانے کے لیے کلب، تھیٹر، یا پکنک کو بھی چلی جاتی ہیں۔ بازار سے اپنی مرضی کے مطابق شاپنگ کر کے بھی آ جاتی ہیں۔ ایک تم ہو کہ اپنی بیوی کو کہیں جانے نہیں دیتے۔ پہلے تو بچے چھوٹے تھے گھر میں رہتے تو ان کے ساتھ کھیل کود کر دل بہلا رہتا تھا۔ جب سے تم نے پریوار نیوجن کے طریقوں کو اپنایا ہے بچے پیدا ہونے ہی بند ہو گئے۔ گھر میں اگر چھوٹا بچہ ہوتا تو کم از کم اس کے سہارے من تو بہلا رہتا۔"

"دیکھو سریتا اچھی بیوی وہ ہوتی ہے جو اپنے شوہر کے خیالات و نظریات میں اپنے آپ کو ڈھال لے۔ تم ان لوگوں کے طور و طریقے اپنانا

چاہتی ہو جن کی مالی حیثیت ہم سے بہت زیادہ ہے۔ ان کے معیارِ زندگی کو دیکھ کر تم دل ہی دل میں کڑھتی ہو اور میرے خلاف الزام تراشی کرتی رہتی ہو۔ میں نے تم سے کتنی بار کہا ہے کہ تم فرصت کے لمحات میں ادبی رسالوں کا مطالعہ کیا کرو۔ اس سے تمھاری قابلیت میں اضافہ بھی ہوگا اور تم خالی وقت میں مصروف بھی رہا کروگی۔ رہا بچوں کا سوال یہ تم جانتی ہو کہ میں زیادہ بچے نہیں چاہتا۔ بھگوان نے دو دیے ہیں بس یہی کافی ہیں۔"

"لیکن میں بچے چاہتی ہوں۔ تمھارے پریوار نیوجن کے طریقوں سے مجھے سخت نفرت ہے۔ تم اپنی خواہش پوری کرنے کے لیے میرے جذبات کا گلا گھونٹنے پر تلے ہوئے ہو۔"

"میں جو کچھ سوچتا ہوں، کرتا ہوں یا تم سے کرواتا ہوں اسی میں ہم دونوں کا فائدہ ہے۔"

"بھلا تمھارے پریوار نیوجن سے کیا فائدہ؟"

"یہی کہ ہمارا کنبہ اور نہ بڑھ سکے گا۔ میری تنخواہ زیادہ تو نہیں لیکن اتنی تو ضرور ہے کہ ہمارے گھر کے موجودہ اخراجات آسانی سے پورے ہو جاتے ہیں۔ کنبہ بڑھے گا تو ہماری اقتصادی حالت خراب ہو جائے گی۔ بچوں کو ٹھیک طرح کھانا پینا اور پہننا بھی میسر نہ ہوگا ایسی صورت میں بچوں کا مستقبل تاریک ہو جائے گا۔"

"اسی لیے تو کل میں نے تم سے کہا تھا کہ مجھے مسٹر کپور کی فرم میں ٹیلیفون ریسیپشنسٹ کی نوکری کرنے دو۔ آمدنی بڑھنے پر ہم اپنا کنبہ بھی بڑھا سکتے ہیں۔ دو آمدنیوں کے سہارے ہم خوب عیش و آرام کے ساتھ رہ سکتے ہیں۔ لیکن تم کب میری سنتے ہو۔ ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیتے ہو۔"

دیکھو سریتا۔ تم مجھے آٹھ سال میں بھی نہ سمجھ سکیں جب کہ میں تمھیں آٹھ گھنٹے ہی میں سمجھ گیا تھا۔ تمھیں میری ہر بات الٹی لگتی ہے تمھیں مجھ پر ناحق ہی غصہ آتا ہے۔ ہاں مجھے تمھاری کسی الٹی بات پر مجھے غصہ بھی آتا ہے تو تمھاری جاذبِ نظر معصوم صورت میرے غصے کو ٹھنڈا کر دیتی ہے۔ شاید یہی میری کمزوری رہی ہے جس کی وجہ سے تم روز بہ روز سر پر چڑھتی جا رہی ہو۔ روز میرے سامنے نئے نئے پرپوزل رکھتی ہو۔"

"میں پوچھتی ہوں کہ مسٹر کپور کی فرم میں ٹیلیفون ریسیپشنسٹ کی نوکری کر لینے میں تمھارا کیا نقصان ہے؟"

"میرے خود کفیل نہ ہونے پر اگر تم نوکری کی بات سوچتیں تو شاید میں اس کی اجازت دے دیتا۔ میں اپنے آپ کو خود کفیل سمجھتا ہوں۔ تمھارے جائز خرچے خوشی سے برداشت کرتا ہوں۔ لیکن میں یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ تم جھوٹی شان و شوکت کے لیے ٹیلیفون ریسیپشنسٹ کی نوکری کر کے میرے جذبات اور احساسات کو ٹھیس پہنچاؤ۔"

"جب تمھیں ہی میرے جذبات اور احساسات کی پرواہ نہیں تو میں پھر تمھارے جذبات اور احساسات کی پرواہ کیوں کروں؟"

"اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ جھوٹی شان و شوکت تمھیں اپنے شوہر سے زیادہ عزیز ہے۔"

"جسے تم جھوٹی شان و شوکت کہتے ہو وہ گلیمر ہے اور گلیمر ہی زندگی ہے۔"

"میں تمھاری یہ گلیمر لائف بالکل برداشت نہیں کر سکتا۔"

"تو میں بھی تمھاری زیادتیاں برداشت نہیں کر سکتی۔"

"جنھیں تم زیادتیاں کہتی ہو وہ زیادتیاں نہیں بلکہ اصولِ زندگی ہے۔"

"بھاڑ میں جائے تمھارا اصولِ زندگی۔"

"دیکھو سریتا تم حد سے زیادہ بڑھتی جا رہی ہو۔ مجھے یہ تو معلوم تھا کہ تم تیز مزاج ہو لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ اتنی بددماغ بھی ہو۔"

"بددماغ میں ہوں یا تم؟"

"تم"

"میں نہیں تم ــــــ جب تم میرے پورے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے۔ مجھے زندگی کی خوشیاں نہیں دے سکتے تو پھر۔۔۔۔"

"ہاں ہاں کہو رک کیوں گئیں؟"

"۔۔۔۔۔۔ تو پھر مجھے طلاق کیوں نہیں دے دیتے۔"

"۔۔۔۔۔۔۔۔"

"تمھاری ٹائپیکل زندگی سے چھٹکارہ پا کر میں خود مختار بن کر اپنی

، بسر کروں گی۔ نوکری کروں گی نہ بچہ، کلنک، کلب جایا کروں گی۔ رہ کپڑے پہنا کروں گی، عیش سے زندگی گزار کر خوش رہا کروں گی"

"سریتا! میں نے تمھیں اپنی جان سے زیادہ پیار کیا ہے۔ دنیا سب نعمتوں سے بڑھ کر تمھیں چاہا ہے۔ میں تمھیں کسی بھی حالت میں اس اور پریشان نہیں دیکھ سکتا۔ اگر واقعی مجھ سے طلاق لے کر تم خوش سکتی ہو تو میں تمھیں طلاق دینے کے لیے تیار ہوں؟"

"تو پھر دیر کس بات کی ہے۔ دے دیجیے طلاق ۔ ۔ ۔ ۔ آج ۔ ۔ ۔ اسی وقت۔"

"جلدی کا کام شیطان کا ہوتا ہے سریتا۔"

"تو پھر کب؟"

"بیس دن بعد"

"وہ کیوں؟"

امریکی فوجوں نے کمبوڈیا اور جنوبی ویت نام میں وہاں کے بے گناہ عوام کے ساتھ جو خون کی ہولی کھیلی ہے ظلم اور تشدد کی ان گنت وارداتیں کی ہیں۔ تباہی اور بربادی کے جو پچھلے سب ریکارڈ توڑ دیے ہیں ان سب باتوں کا جائزہ لینے کے لیے ہندوستانی جرنلسٹوں کا جو وفد اگلے ہفتہ کمبوڈیا اور جنوبی ویت نام جا رہا ہے اس میں مجھے بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ ان دونوں ملکوں کے دورے سے واپس آنے پر میں بچوں کے لیے ایک گورنس کا انتظام کروں گا اور پھر تمھیں طلاق دے دوں گا۔

"ہیلو سریتا دیوی!"

"ہیلو سر!"

"یہ سر ور کچھ نہیں چلے گا۔ مجھے صرف کپور کہو۔"

"لیکن آپ میرے باس ہیں سر۔"

"پھر وہی سر۔"

"او کے سر۔"

"اُف!"

"اچھا مسٹر کپور۔"

"ہاں یہ بات ہوئی نہ۔"

"کہیے آپ نے مجھے ڈیوٹی کے بعد کیوں رک جانے کے لیے کہا تھا؟"

"دراصل آج آفس میں بہت ضروری کام ہے۔ میں دیر تک یہاں رہوں گا اور ڈنر بھی یہیں کروں گا۔ اکیلے ڈنر کرنا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ سوچا آج تمھارے ساتھ ہی ڈنر کروں اور کچھ باتیں بھی"

". . . . . اور کچھ باتیں بھی —— کیا مطلب؟"

"باتیں دل کی باتیں!"

"تو پھر کیجیے باتیں —— اپنے دل کی باتیں۔"

"سریتا دیوی آپ کے ہاتھ بہت خوب صورت ہیں لیکن مجھے پسند نہیں۔ آپ کی صراحی دار گردن دوسروں کو بہت اچھی لگتی ہے لیکن مجھے نہیں۔"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔"

"اگر کسی خوب صورت چیز کو صحیح طرح مینٹین نہ کیا جائے تو وہ کم خوب صورت لگتی ہے لیکن بہت خوب صورت نہیں۔"

"میں اب بھی آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔"

"دراصل آپ کے خوب صورت گورے گورے ہاتھوں کی ملائم ملائم انگلیوں میں ایک بھی انگوٹھی نہ ہونے سے یہ انگلیاں خوب صورت تو لگ رہی ہیں لیکن بہت خوب صورت نہیں۔ آپ کی صراحی دار گردن میں قیمتی ہار نہ ہونے پر یہ اچھی ضرور لگ رہی ہے لیکن بہت اچھی نہیں۔"

"تو پھر . . . . . ؟"

"سریتا دیوی میں حسن کا قدردان ہوں حسن کی بے قدری مجھ سے بالکل نہیں دیکھی جاتی۔ میری طرف سے تحفہ سمجھ کر یہ انگوٹھی اس انگلی میں اور یہ ہار اپنے گلے میں پہن لیجیے۔"

"اتنی قیمتی انگوٹھی اور ہار مجھے دے کر آپ کتنے روپیہ ماہانہ میری تنخواہ میں سے کاٹا کریں گے؟"

"میں نے ابھی کہا نہ کہ یہ قیمتی انگوٹھی اور ہار میں آپ کو تحفہ کے طور پر دے رہا ہوں۔"

"تھینک یو مسٹر کپور تھینک یو! واقعی سچ مچ یہ انگوٹھی اور یہ ہار مجھے بہت اچھے لگ رہے ہیں۔"

"مسز تیا دیوی میں سوچ رہا تھا....."

"ہاں ہاں کہیے رک کیوں گئے؟"

"مسز تیا دیوی جب غیر ملکی سفر سے واپس آ کر آپ کے ہزبینڈ آپ کے پاس یہ انگوٹھی اور یہ ہار دیکھیں گے تو آپ کیا کہیں گی؟"

"کہہ دوں گی کہ مسٹر کپور نے تحفے کے طور پر دیے ہیں"

"کیا وہ اعتراض نہ کریں گے؟"

"کرنے دو۔ یہ تو کل میں نے آپ کو بتا ہی دیا تھا کہ ہم جلد از جلد علیحدہ ہونے والے ہیں۔ قانونی علیحدگی کے بعد میں بالکل آزاد ہوں گی۔"

"لیکن آپ نے ابھی تک یہ تو بتایا نہیں کہ سنیل کو چھوڑ کر آپ کس سے شادی کریں گی؟"

"ابھی میں شادی کے بارے میں نہیں سنیل سے طلاق کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔"

"مسز تیا دیوی آپ کو دیکھ کر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ آپ دو بچوں کی ماں ہو سکتی ہیں۔ میک اپ سے سنورے ہوئے آپ کے دلکش اور حسین چہرے کو دیکھ کر آپ پر کنوارے پن کا گمان ہوتا ہے۔"

"سچ مسٹر کپور!"

"ہاں بالکل سچ مسز تیا دیوی۔"

"مسٹر کپور آپ نے اپنی پہلی بیوی کو طلاق کیوں دی تھی؟"

"وہ ایک جاہل عورت تھی جس سے میری ماں نے کم عمر ہی میں میری شادی کر دی تھی۔ میں اُسے فلم دکھانے کے لیے کہتا تو کہتی کہ مجھے رامائن پڑھنی ہے۔ میں اسے کسی دعوت میں لے جانا چاہتا تو کہتی کہ آج میرا برت ہے۔ میں اسے کلب میں لے جانے کی خواہش ظاہر کرتا تو وہ مندر میں کیرتن سننے کی خواہش ظاہر کرتی۔ اب تم ہی بتاؤ اعلا سوسائٹی کے آداب سے ناواقف عورت کے ساتھ میں کیسے زندگی گزار سکتا تھا؟"

"اب آپ نے اپنی زندگی کے بارے میں کیا سوچا ہے؟"

"سوچا تو بہت ہے اگر آپ اجازت دیں تو....؟"

"ہاں ہاں کہیے رک کیوں گئے؟"

"اگر طلاق کے بعد آپ شادی کے بارے میں سوچیں تو آپ مجھے اپنا پہلا امیدوار سمجھئے گا۔ میں بہت ہی پیار اور محبت کرنے والا خاوند ہوں۔ جن خوبیوں والی خاتون کی مجھے ضرورت ہے وہ سب خوبیاں آپ میں موجود ہیں ——— مہذب، خلیق اور خوب صورت ——— گویا ہر اعتبار سے بھگوان نے آپ کو مکمل لیڈی بنایا ہے۔ آپ کے اندر وقار ہے۔ آپ کے حسین اور دلکش چہرے اور سڈول جسم میں بلا کی کشش ہے۔ آپ کا اٹھنا بیٹھنا چلنا پھرنا، بات کرنا، غرض کہ سب کچھ ایک خاص تہذیب کا آئینہ دار ہے۔ آپ جیسی لائق، سمجھ دار اور صاحب ذوق خاتون کے ہاتھ اپنی زندگی کو سونپ کر کوئی بھی شخص اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھ سکتا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ مسٹر سنیل آپ جیسی باصلاحیت خاتون کی عزت و قدر نہ کر سکے۔"

"........."

"کیا سوچ رہی ہیں آپ؟"

"......جی.... کچھ نہیں......"

"تو پھر وعدہ کیجیے کہ اگر آپ نے دوسری شادی کا فیصلہ کیا تو آپ مجھے اپنا پہلا امیدوار سمجھیں گی۔"

"ہاں.... اگر میں نے دوسری شادی کا ارادہ کیا تو...."

"کھٹ کھٹ کھٹ کھٹ......"

"ایسے ناوقت دفتر میں کون آ سکتا ہے۔ تم یہیں بیٹھو میں ابھی دیکھ کر آتا ہوں۔"

"کیا مسٹر کپور دفتر میں ہیں؟"

"لیکن اس وقت دفتر بند ہو چکا ہے۔ آپ صبح تشریف لائیے۔"

"اگر آپ ہی مسٹر کپور ہیں تو ہمیں آپ ہی سے کام ہے۔"

"آیئے تشریف لایئے۔ کہیئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں ——؟"

"میرا نام ایس۔ پی اگروال ہے۔ میں اس علاقے میں نیا سپرنٹنڈنٹ آف پولیس تعینات ہوا ہوں۔"

"اور یہ چار آدمی؟"

"یہ میرے ماتحت ہیں۔ ہمارے پاس آپ کی دفتر کی تلاشی

کا وارنٹ ہے۔"

"وارنٹ! ..... لیکن کس سلسلے میں؟"

"کنٹرا بینڈ چیزوں کی اسمگلنگ کے بارے میں۔"

"لیکن اس وقت تو دفتر میں کوئی نہیں ہے۔"

"اسی لیے تو ہم اس وقت یہاں آئے ہیں۔ ہمیں اسٹاف کی نہیں مالک کی ضرورت ہے..... اور آپ کی تعریف؟"

"میں سریتا ہوں ـــــ مسز سُنیل۔"

"کیا آپ اسی فرم میں کام کرتی ہیں؟"

"جی ہاں ـــــ کل ہی میرا اپوائنٹمنٹ ہوا ہے۔"

"او ـــــ مسٹر کپور تو کہہ رہے تھے کہ اسٹاف کا کوئی آدمی نہیں ہے۔"

"اچھا مسٹر کپور۔ اب میں چلتی ہوں۔"

"جی نہیں آپ یہاں سے نہیں جا سکتیں۔ جب تک ہم دفتر کی تلاشی لیں۔ آپ یہیں رہیں گی۔"

"وہ کیوں؟"

"میں نے خفیہ تحقیقات کر کے یہاں چھاپا مارا ہے۔ جب تک چھاپا ختم نہیں ہو جاتا آپ یہاں سے نہیں جا سکتیں۔"

"انسپکٹر صاحب آپ ان کو تو جانے ہی دیجیے۔"

"آپ خاموش رہیے اور اپنی سب الماریوں کی چابیاں عنایت فرمائیے۔"

"وہ میرے پاس نہیں میرے اکاؤنٹنٹ کے پاس ہیں۔"

"مسٹر دلجیت۔ باہر سے تالے تُڑوا کر سب الماریوں کے سامان کا جائزہ لو۔"

"اوکے سر....."

"........"

"سر! اس الماری میں سے سونے کی یہ اینٹیں برآمد ہوئی ہیں۔"

"سر! دوسری الماری میں سے یہ حشیش اور گانجہ ملا ہے۔"

"سر! تیسری الماری میں سے دیسی شراب ولایتی بوتلوں میں ہے ـــــ"

"تو مسٹر کپور، یہ ہے آپ کا دھندا ـــــ ایکسپورٹ امپورٹ کے بہانے کنٹرا بینڈ چیزوں کی اسمگلنگ ـــــ چلیے میرے ساتھ پولس اسٹیشن۔"

"انسپکٹر صاحب۔ مجھے جیل میں بند کروا کر آپ کو کیا ملے گا کچھ نہیں لیکن مجھے چھوڑ کر....."

"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

"یہی کہ یہ سب سونے کی اینٹیں آپ رکھ لیجیے۔ ایک ایک سونے کی اینٹ ان پولس کانسٹبلوں کو دے کر کیس کو دبا دیجیے۔"

"خبردار اگر آگے کچھ کہا۔ تم مجھے رشوت دے کر خریدنا چاہتے ہو ـــــ مسٹر دلجیت مسٹر کپور کو ہتھکڑی پہنا کر پیدل پولس اسٹیشن لے چلو۔"

"او کے سر!"

"اجی انسپکٹر صاحب ہتھکڑی پہنا کر پیدل پولس اسٹیشن لے جانے کی کیا ضرورت ہے۔ میں خود ہی اپنی کار میں آپ کے ساتھ پولس اسٹیشن چلنے کے لیے تیار ہوں۔"

"جی نہیں آپ کو ہتھکڑی پہنا کر پولس اسٹیشن پیدل لے جایا جائے گا۔ تاکہ دوسرے لوگوں کو عبرت حاصل ہو اور عوام کو معلوم ہو کہ آپ جیسے "امیر اور شریف" آدمی ہی سماج کے دامن پر بدنما داغ ہیں ـــــ اور مسز سریتا جی آپ بھی پولس اسٹیشن چلیے۔"

"لیکن میرا قصور؟ ـــــ میں تو اس فرم میں صرف ٹیلیفون ریسپشنسٹ ہوں۔"

"تھانے میں آپ سے بہت سی معلومات کی جائیں گی۔ آپ کے تحریری بیان لیے جائیں گے کہ یہ کنٹرا بینڈ چیزیں ہمیں آپ کی موجودگی میں مسٹر کپور کے دفتر کی الماریوں میں سے برآمد ہوئی ہیں۔ اگر ضروری سمجھا گیا تو آپ کو اندر بند کر دیا جائے گا اور ضروری نہ سمجھا گیا تو آپ کا تحریری بیان لے کر اور آپ کو پولس کا گواہ بنا کر چھوڑ دیا جائے گا۔"

"ہیلو مسز سنیل!"

"ہیلو ڈاکٹر! آیئے تشریف لایئے"
"کہیئے کیسی طبیعت ہے؟"
"طبیعت خراب ہے جسم میں کچھ کمزوری بھی محسوس ہو رہی ہے۔ امریکی فوجوں کے کمبوڈیا اور جنوبی ویٹ نام کے بے گناہ عوام پر ظلم اور تشدد اور وہاں کے سیاسی حالات کا جائزہ لینے کے لیے جرنلسٹوں کے ایک وفد میں دو ہفتہ کے لیے کمبوڈیا اور جنوبی ویٹ نام گیا تھا۔ دن بھر دورے پر رہنا پڑتا تھا۔ بس یہ سمجھ لو کہ وہاں ٹھیک طرح کھانا بھی میسر نہ ہو سکا۔ دو ہفتہ تک کچھ بھی آرام نہ مل سکا"
"سب ٹھیک ہو جائے گا —— لو یہ دوا پی لو۔ شام کو کمپاؤنڈر کے ہاتھ دوسری دوا بھیج دوں گا —— مسز سنیل آپ ان کے سر کو ہلکے ہلکے دباتی رہیئے۔ انھیں دواؤں سے زیادہ آپ کی پیار بھری خدمات کی زیادہ ضرورت ہے۔ اچھا مسٹر سنیل اب میں چلتا ہوں"
"اچھا ڈاکٹر....."
"لاؤ میں تمھارا سر دبا دوں۔؟"
"رہنے دو مجھے تمھاری خدمات کی ضرورت نہیں"
"وہ کیوں؟"
"کل تو میں تمھیں طلاق دے ہی دوں گا۔ پھر تو کیا سکھ میں مجھے اکیلا ہی رہنا ہے۔"
"لیکن اگر میں طلاق نہ لوں تو؟"
"تم ہی نے تو کہا تھا جب تم میرے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے۔ پیار اور سوجن کے طریقوں کو اپنا کر میرے جذبات کی تسکین نہیں کر سکتے۔ مجھے زندگی کی خوشیاں نہیں دے سکتے تو پھر طلاق کیوں نہیں دے دیتے؟"
"نہیں سنیل بھگوان کے لیے طلاق کا لفظ اپنی زبان پر نہ لاؤ۔ اب میرا ضمیر جاگ اٹھا ہے میں اپنے کیے پر بہت ہی شرمندہ ہوں۔ میرے ناتھ مجھ کو معاف کر دیجیئے"
"لیکن میں نے وکیل سے طلاق کے کاغذات منگوا لیے ہیں کچہری میں جا کر بس ان پر تمھارے دستخط ہونے باقی ہیں"
"دیکھوں کہاں ہیں وہ کاغذات؟"
"میرے ہینڈ بیگ میں"
"........"
"ارے ارے..... یہ کیا کر رہی ہو۔ پہلے خود ہی طلاق لیے کہا اور اب خود ہی طلاق کے کاغذات پھاڑ رہی ہو"

★

اسعد بدایونی

عورت

کبھی یہ شعلۂ جوالہ ہے کبھی شبنم
ندی پہ چاند کا پرتو ہے اس کا نقش قدم

کبھی ہے مریم و سیتا کبھی یہ درگا وتی
کبھی یہ جھانسی کی رانی اودھ کی شہزادی

یہ رخ ہواؤں کا چاہے تو موڑ سکتی ہے
رہ وفا پہ نشان قدم ہیں ثبت اس کے

ہوائے تند کبھی اور کبھی نسیم سحر
اسی کی ذات سے سرسبز ہیں وفا کے شجر

کسی مصور فطرت کا شاہکار ہے یہ
خزاں کا ذکر نہیں قصہ بہار ہے یہ

ظہیر الحق

مومن کا رنگِ تغزّل

ایک نقاد کے لیے اس سے مشکل کام کوئی اور نہیں ہو سکتا کہ اُسے تنقید و تبصرہ کے لیے کسی ایسے شاعر کا دیوان دے دیا جائے جس کی شاعری کی سب سے اہم صفت دقت پسندی ہو اور جس پر لکھنے کی بہت کم اصحاب نے جراٴت کی ہو۔ مومن کا شمار بھی ایسے ہی چند شعرا میں ہوتا ہے۔ اس کا کلام (میری مراد یہاں صرف غزلوں سے ہے) شروع سے آخر تک نکتہ سنجیوں، معنی آفرینیوں اور ابہام و ایجاز سے بھرپور ہے۔ مومن ایک عام پسند شاعر نہیں ہے۔ مومن پر ہی کیا موقوف ہے ہر بڑا شاعر کبھی بھی عام پسند نہیں ہوتا۔ اس کو سمجھنے میں جس قدر دقت ہو گی اسی قدر اس کی بڑائی میں اضافہ ہو گا۔ یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے لیکن اس کے مستثنیات بھی ہو سکتے ہیں۔

مومن خاں مومن حکیم تھے۔ حکمت کے علاوہ علم نجوم میں بھی انھوں نے زبردست مہارت حاصل کی تھی۔ ان کی تعلیم کچھ زیادہ نہ ہو سکی لیکن عربی و فارسی میں انھوں نے کافی عبور حاصل کیا۔ مومن فطرتاً شاعر تھے اور حسن پرور اور عشق جُو دل رکھتے تھے مصنف "آبِ حیات" مومن کے رنگ و روپ کو اس طرح پیش کرتے ہیں:

"رنگین طبع۔ رنگین مزاج۔ خوش وضع۔ خوش لباس کشیدہ قامت۔ سبزہ رنگ۔ سر پر لمبے لمبے گھونگر والے بال اور ہر وقت انگلیوں سے ان میں کنگھی کرتے رہتے تھے۔ ململ کا انگرکھا ڈھیلے ڈھالے پائنچے۔ اس میں لال نیفہ بھی ہوتا تھا۔"

اور یہی لالی اور یہ نرالی آن بان اُن کی طبیعت کے جمالیاتی ذوق کو ظاہر کرتی ہے جس کا اثر اُن کے کلام میں جگہ جگہ نمایاں نظر آتا ہے۔

مومن کی شاعری خالص عشقیہ شاعری ہے اور ان کی غزلیات میں رنگ تغزل دیگر ہم عصر شعرا کی بہ نسبت بہت زیادہ ہے۔

غزل جب صرف تغزل کی حد تک محدود ہو جاتی ہے تو فنی لحاظ سے اس کا مرتبہ کافی بلند ہو جاتا ہے۔ داخلی عناصر کی قیمتی آویزش اسکے رنگ کو نکھارتی اور چمکاتی ہے۔ اسی لیے محمد حسین آزاد نے غزل کو ادبی میناکاری سے تشبیہہ دی ہے۔ اختر اورینوی کے الفاظ میں غزل مختصر تصویروں کا ایک خوبصورت نگارخانہ ہے اور کامیاب اور صحیح غزل گوئی نہایت ہی جمیل و لطیف صناعی ہے کچھ کم نہیں اور یہی صناعی اپنی پوری آب و تاب لیے مومن کے ہر شعر میں نظر آتی ہے — زلف کی درازی جب گھٹا بن جاتی ہے۔ گالوں کی سرخی جب شفق کو جنم دیتی ہے اور لبوں کی نزاکت جب گلاب کی پنکھڑی کو شرماتی ہے تو اس وقت شاعر کے دل و دماغ میں کسی کا پیکر سیمیں اپنی بھرپور جوانی کے ساتھ انگڑائیاں لیتا نظر آتا ہے اور اس کی تمنائیں حریم دل کے گوشوں میں کانپتے ہوئے تاروں کی طرح جھلملاتی ہیں اور شاعر کا حساس دل جذبات کے بہتے ہوئے دھاروں کو الفاظ کی حدوں میں گھیر لیتا ہے۔ شاعری حقیقت میں جذبات دل کی صحیح عکاسی کا دوسرا نام ہے۔ مومن کے ہاں ایسے جذبات کی افراط ہے اس کی شاعری تجربوں کی صداقت سے مزین ہے اور یہ صداقت اشعار میں جان ڈال دیتی ہے۔

عشقیہ شاعری میں سب سے زیادہ اہمیت دراصل ان احساسات و جذبات کو حاصل ہے جو معشوق کے حسن کو دیکھ کر پیدا ہوتے ہیں اور جو الفاظ کے سانچوں میں ڈھلنے کے بعد بجائے خود ایک حسین شے بن جاتے ہیں اور جن کو پڑھتے ہوئے ہر شخص کو اپنے قلب کے خاموش گوشے میں کسی کے نازک قدموں کی نازک چاپ سنائی دیتی ہے۔ مومن کا ایک شعر ہے ؎

زہر ٹپکے ہے نگاہ یار سے
موت سوجھی نرگس بیمار سے
قتل ہو کر ہم نہ بچے آزار سے
عشر کے دل کٹ گئے تلوار سے

ان اشعار میں "نگاہ یار" کی زہر افشانی کو مومن نے ایک عجیب انداز سے امرت کی دھارا میں تبدیل کر لیا ہے اور ان کا یہی انداز ان کو دوسرے شعراء سے ممیّز کرتا ہے۔ اسی انداز کا ایک اور شعر ملاحظہ کیجیے ؎

ہے دوستی تو جانب دشمن نہ دیکھنا
جادو بھرا ہوا ہے تمھاری نگاہ میں

اس شعر میں حُسن کی تعریف ہے۔ عشق کی وارفتگی ہے اور رقیب کا ذکر بھی ہے لیکن نگاہوں کا جادو کچھ اس انداز سے نمایاں ہے کہ ہر پڑھنے والا چشم مخمور کی سحر کاری کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے۔

مومن کی شاعری میں تجربوں کی صداقت کے ساتھ ساتھ تخیل کی بلند پروازی بھی ہے۔ اس کے ہاں احساس کی شدت بہت زیادہ ہے اسی لیے اس کا تخیل اکثر و بیشتر مبالغہ کی حدوں کو چھو لیتا ہے۔ مومن کا یہ شعر اس کی بڑی عمدہ مثال ہے ؎

دیکھیں گے مومن یہ ہم ایمان بالغیب آپ کا
اس بت پردہ نشیں نے جلوہ گر دکھلا دیا

اس شعر میں وہ معشوق کے حُسن کی تعریف کرتے کرتے جذبات کے تیز رو دھاروں میں بہہ جاتے ہیں اور عقل و خرد کے دامن سے اپنا دامن بچا لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مومن کا خدا پر جو ایمان بالغیب ہے وہ اس وقت باقی نہ رہ سکے گا جب ان کا معشوق اپنے چہرے سے نقاب الٹ دے گا۔

مومن نے جہاں مشکل پسندی میں حسن پیدا کیا ہے وہیں انتہائی سادگی میں بھی وہ حسین خیال اور حسین انداز کی تخلیق کرتے ہیں اور اس سادگی میں ڈوبا ہوا ایک شعر ملاحظہ کیجیے ؎

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا

اس شعر کے دوسرے مصرعہ نے شعر میں جان ڈال دی ہے طرز اظہار میں کتنی سادگی ہے۔ لیکن ساتھ ہی کتنی نزاکت و لطافت ہے۔ "ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا" کے مصرعہ سے جس قدر یاس و غم ٹپک رہا ہے اس کا اندازہ بیان سے باہر ہے۔

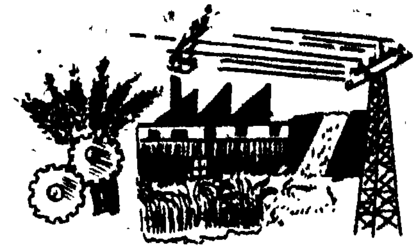
مومن کے اشعار میں جو چیز سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ ان کا خاص عاشقانہ انداز ہے جو تقریباً ہر شعر میں جھلکتا ہے۔ ان کے ہاں تصوف جیسی کوئی چیز نہیں ہے جو عشق کے مرتبہ کو حقیقت و معرفت کی طرف لے جاتی ہے۔ نیاز فتح پوری (مرحوم) تصوف کو "غیر تغزلانہ" چیز سمجھتے تھے اور ان کے نزدیک غزل کے اندر ایسی باتوں کا اظہار جو تغزل سے علیحدہ ہوں کوئی محمودبات نہیں ہے۔ مومن کا ایک مشہور شعر ملاحظہ کیجیے جس میں تصوف تو نہیں ہے لیکن تصور انتہائی عروج پر ہے اور بعض نقادوں نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ صرف یہی ایک شعر مومن کی قسمت کے فیصلے کے لیے بالکل کافی تھا۔ وہ مشہور شعر یہ ہے ؎

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

یہ وہی شعر ہے جسے سن کر غالب جیسا عظیم المرتبت شاعر اپنے سینہ پر ہاتھ رکھے رات بھر ٹہلتا رہا اور یہی کہتا رہا کہ "اے کاش خاں صاحب! اپنا یہ شعر مجھے دے دیں اور مجھ سے میرا دیوان لے لیں"۔ شاعر اس میں تصور کے اس بلند مقام پر ہے جہاں پہنچ کر طالب و مطلوب دونوں ایک ہو جاتے ہیں۔ "گویا" کے لفظ نے اس شعر کو آسمان کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔

بہر حال مختصراً یوں کہا جا سکتا ہے کہ جس شاعر کو خود غالب نے پسند کیا ہو اس کی عظمت کو بھلا کون جھٹلا سکتا ہے بلکہ چند خاص خصوصیات کو پیش نظر رکھتے ہوئے غالب سے زیادہ قریب اگر کوئی شاعر آ سکتا ہے تو وہ مومن ہی ہے۔ مومن کی شاعری دل کی نازک دھڑکنوں کا حسین عکس ہے۔ اس کے تخیلات میں کسی مست شباب کے انداز خرام کی سی نزاکت ہے۔ اس کے انداز بیان میں رس بھرے ہونٹوں کا خاموش تبسم پنہاں ہے اس کی تشبیہوں میں نشیلی آنکھوں کا خمار کروٹیں لیتا ہے اور اس کی زبان میں نازک لبوں کی سی مٹھاس ہے۔ اور یہی وہ خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے مومن آسمان ادب پر ایک تابندہ ستارے کی طرح دمک رہا ہے۔

★



اتر پردیش شاہراہ ترقی پر

بچّوں کی شخصیت کو پروان کے لیے بال بھون کا قیام ۔۔۔ ملک کو سائنس دانوں، انجینیروں اور تکنیکی ماہروں کی ضرورت ۔۔۔ بیس نکاتی پروگرام پر عملدر آمد کا جائزہ لینے کے لیے تحقیقی پراجکٹ ۔۔۔ شہری زمین حد و ضابطہ بندی قانون ۱۹۷۶ء ۔۔۔ اردو پڑھنے والے ۲۱۱ طالب علموں کو اتر پردیش اردو اکاڈمی کے وظائف ۔۔۔ ۱۹۷۵ء میں مطبوعہ اردو کتابوں اور ممتاز مصنفین کو ایک لاکھ روپے کے انعامات۔

گورنر ڈاکٹر ایم. چنا ریڈی نے عوام سے پرزور اپیل کی ہے کہ وہ ریاست میں بچّوں کے لیے ترقیاتی سرگرمیوں کی توسیع میں بھرپور تعاون دیں۔ انھوں نے کہا کہ سماج کی یہ اہم ذمہ داری ہے کہ وہ بچّوں کی طبعی صلاحیت کو اجاگر کرنے کے لیے مناسب ماحول پیدا کریں۔ تاکہ بچے آگے چل کر ذمہ دار شہری بن سکیں۔

ڈاکٹر ریڈی نے، جو ریاستی سی۔ بی خواتین تربیتی کالج کے قریب بال بھون کا افتتاح کر رہے تھے کہا کہ بچّوں کی شخصیت کی ہمہ گیر ترقی کے لیے صرف اسکول کی تعلیم کافی نہیں ہے اور ان کی ناکافی دیکھ بھال کی وجہ سے ان کی نشو و نما میں کافی رکاوٹ پیدا ہوتی ہے اور بعض اوقات انھیں مجرم تک بنا دیتی ہے۔ اس کے برخلاف مناسب ماحول میں بچوں کو اپنی طبعی ذہانت کے اظہار کا موقع ملتا ہے۔

ڈاکٹر ریڈی نے کہا کہ بچوں کے طبعی رجحانات کی جانچ اور انھیں ان کی پسندیدہ سرگرمیوں سے وابستہ کرنے کی بھی ضرورت ہے تاکہ وہ اپنی شخصیت کو فروغ دے سکیں۔ انھوں نے مشورہ دیا کہ بال بھون قسم کے ادارے دور افتادہ مواضعات میں بھی قائم کیے جائیں تاکہ ریاست کے سبھی بچے ان سے مستفید ہو سکیں۔

وزیر تعلیم شری عمار رضوی نے گورنر کا استقبال کرتے ہوئے بتایا کہ تعلیم کے میدان میں بال بھون کا قیام ایک نیا اور انقلابی قدم ہے۔ انھوں نے بتایا کہ اس ادارے کا قیام ایک اچھی شروعات ہے اور مستقبل قریب میں ایسے اداروں کی ترقی کے لیے مزید توجہ دی جائے گی۔ انھوں نے عوام کو یقین دلایا کہ حکومت بچوں کی شخصیت کو پروان چڑھانے سے متعلق سرگرمیوں میں ہر ممکن مدد کرے گی۔

اس بال بھون کا قیام کا مقصد ۵ سے ۱۵ سال تک کی عمر کے بچوں کی نشو و نما کی غرض سے انھیں مختلف سہولتیں مہیا کرنا ہے۔

وزیر اعلا شری نرائن دت تیواری نے کہا کہ مختلف ترقیاتی پروگراموں پر تیز رفتار عملدر آمد کے لیے ملک کو آج سائنس دانوں انجینیروں اور تکنیکی ماہروں کی ضرورت ہے۔

انھوں نے طلبا اور نوجوانوں کو مشورہ دیا کہ وہ زیادہ سے زیادہ تعداد میں سائنسی، انجینیرنگ اور تکنیکی نصاب لیں تاکہ وہ قومی نو تعمیر کے عظیم کام میں ایک اہم رول ادا کر سکیں۔

شری تیواری نے جو سلطان پور سے ۳۲ کیلو میٹر دور امیٹھی میں ایک تعلیمی کانفرنس کا افتتاح کر رہے تھے کہا کہ ایسا تعلیمی نظام ہماری موجودہ ضرورتوں سے ہم آہنگ نہیں جو صرف بابوؤں کی فوج تیار کرے۔ چنانچہ ملک کو درپیش چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے لیے اس نظام تعلیم میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔

اس کانفرنس میں وزیر اعلا نے کہا کہ ہمارے زرعی اداروں اور کالجوں کو زراعت کی ترقی کے لیے اور زیادہ موثر اور سرگرم رول ادا کرنا چاہیئے۔ کیونکہ اتر پردیش جدید زرعی طریقے اپنا کر

عت میں انقلاب لانا چاہتا ہے۔

انھوں نے کہا کہ شاردا سہائک پروجکٹ اترپردیش کا معاشی
نہ بدل دے گا جیسا کہ بھاکڑہ نے پنجاب اور ہریانہ کا نقشہ
ل دیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس پروجکٹ کو مقررہ مدت سے
سال قبل ہی مکمل کرنے کے لئے ۴۴ کروڑ روپیہ کی رقم کا بندوبست
کیا ہے تاکہ آبپاشی کے لئے کسانوں کے کھیتوں تک پانی بلا
پہونچ سکے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ حکومت ہر کسان کو مستحکم
مضبوط امداد باہمی تحریک کے دائرے عمل میں لانے کا تہیہ
ئی ہے۔

ریاستی ۲۰ نکاتی پروگرام سے متعلق عملدرآمد کمیٹی کے فیصلہ
جب وزیر اعظم کے ۲۰ نکاتی معاشی پروگرام پر عملدرآمد
رفتار ترقی اور اس سلسلہ میں درپیش دقتوں کا جائزہ
کے لیے ایک تحقیقی پراجکٹ شروع کیا گیا ہے۔ اس جائزہ
م ایک ٹیم کے سپرد کیا گیا ہے جس کے سربراہ ڈاکٹر پی۔ ایل
ت ہیں جو لکھنؤ یونیورسٹی کے ماہر معاشیات اور ریاستی ۲۰
پروگرام سے متعلق عملدرآمد کمیٹی کے ایک ممبر بھی ہیں۔ ٹیم کے
سروں میں حکومت اترپردیش کے مانیٹرنگ ڈویژن کے
ڈائرکٹر آئی۔ اے رستوگی، محکمۂ مال کے ایک ڈپٹی سکریٹری،
اتی پروگرام کی برانچ کے ایک انڈر سکریٹری اور جوائنٹ سکریٹری
ہر کمیشن یا متعلقہ منطقہ کے ڈپٹی ڈائرکٹر آف ایجوکیشن شامل ہیں
اس پراجکٹ کے تحت موقع پر مطالعہ کے آٹھ اضلاع
، ایٹہ، متھرا، میرٹھ، منظفر نگر، مرزاپور، وارانسی، الہ آباد اور
کا انتخاب کیا گیا ہے۔ ان اضلاع میں سے ہر ضلع میں ایک
، کا انتخاب بھرپور مطالعہ خاص طور پر یہ معلوم کرنے کے لیے
ئے گا کہ فاضل زمین اور مکانات کی تعمیر کے لیے
کی تقسیم کے معاملہ میں کوئی خامی تو نہیں رہ گئی ہے۔ اور
ینہ ہریجنوں اور دیہی علاقوں کے غریب باشندوں کے دیگر
زمروں کو واقعی قبضہ دے دیا گیا ہے یا نہیں۔

اس کے علاوہ یہ ٹیم منتخب اضلاع میں پابند مزدوری کے
مسئلہ اور ڈگری کالجوں میں کتب بنیکوں کے قیام کے معاملہ
پر بھی غور کرے گی۔

لوکل سلف، بجلی اور محنت کی وزیر ڈاکٹر شری متی راجندر
کماری باجپئی نے ودھان سبھا میں اعلان کیا کہ حکومت اترپردیش
کو ریاست کے ۱۲ شہروں میں نافذ شہری زمین (حدود ضابطہ
بندی) قانون، ۱۹۷۶ء کے تحت دستیاب کھلی ہوئی زمین کو
مفاد عامہ میں خریدنے کے سلسلہ میں پہلی ترجیح حاصل ہوگی۔ اس
معاملہ میں دیگر ایجنسیوں یعنی ہاؤسنگ بورڈ کی تعمیر مکانات
سے متعلق امداد باہمی انجمنوں اور شہری ترقیاتی حکام کو بھی ترجیح
دی جائے گی۔ یہ زمین خاص طور پر کم اور درمیانہ آمدنی والے
طبقوں نیز سماج کے کمزور طبقوں کو رہائشی سہولتیں مہیا کرنے کے
سلسلہ منصوبہ بند طریقہ سے استعمال کی جائے گی۔ اس مقصد کے لیے
شہروں میں مجاز افسروں کی تقرری کی گئی ہے

ڈاکٹر باجپئی نے مزید بتایا کہ شہری زمین قانون کی روشنی
میں عمارتوں کی تعمیر کے سلسلہ میں قواعد وضوابط اور ضمنی قوانین
پر غور کرنے اور مناسب ترمیمات کا مشورہ دینے اور انھیں
کارروائی کے لیے حکومت کو پیش کرنے کی غرض سے ریاستی
سطح پر ایک کمیٹی قائم کی گئی ہے۔

اترپردیش اردو اکادمی کی مجلس انتظامیہ
نے پروفیسر آل احمد سرور اور جناب اختر انصاری دو پانچ پانچ ہزار
روپلے کے خصوصی انعامات اردو زبان کے لیے ان کی مجموعی ادبی
خدمات کے اعتراف کے طور پر پیش کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس کے
علاوہ تین ہزار، دو ہزار، ڈیڑھ ہزار، ایک ہزار اور پانچ سو
روپیوں کے مختلف انعامات، جن کی مجموعی رقم چھیاسی ہزار پانچ
سو روپیے ہے، اٹھاسی اردو کتابوں پر جو ۱۹۷۵ء میں ملک
کے ہر حصے میں طبع ہوئی ہیں، ان کے مصنفین کو دینا منظور کیا

گیا ہے۔ تین خصوصی انعامات یو۔پی کے ان تین پبلشروں کو دیئے جا رہے ہیں، جن کی ۶۶-۱۹۶۵ء کی مطبوعات بہ لحاظ طباعت و دیدہ زیبی پر بہترین سمجھی گئی ہیں۔ اس طرح کل ملاکر ننانوے ہزار پانچ سو روپے (۹۹,۵۰۰) روپے ممتاز اردو مصنفین اور ان کی کتابوں پر انعام کے طور پر منظور کیے گئے ہیں۔

جن کتابوں کو انعام دینا منظور کیا گیا ہے وہ مختلف اصناف ادب مثلاً ادبی تنقید، شاعری، افسانوی ادب (مختصر افسانہ اور ناول) رپورتاژ، قومی یکجہتی، اردو صرف و نحو، بچوں کے ادب وغیرہ پر مشتمل ہیں۔ دوسری زبانوں کے تراجم پر بھی انعام دیا گیا ہے۔

چھ کتابوں پر تین تین ہزار روپے، سات کتابوں پر دو دو ہزار روپے، تیرہ کتابوں پر ڈیڑھ ڈیڑھ ہزار روپے، اٹھارہ کتابوں پر ایک ایک ہزار روپے اور چونتیس کتابوں پر پانچ پانچ سو روپے کے انعامات منظور کیے گئے ہیں۔

تین ہزار روپے کے انعامات پانے والی کتابوں اور ان کے مصنفین کے نام درج ذیل ہیں:

نام کتاب	نام مصنف	
۱۔ انقلاب	جناب خواجہ احمد عباس	(بمبئی)
۲۔ شاخ نہال غم	ڈاکٹر خورشید الاسلام	(علی گڑھ)
۳۔ بدلتے رنگ	جناب منظور الامین	(لکھنؤ)
۴۔ آج کا پاکستان	جناب احمد سعید ملیح آبادی	(کلکتہ)
۵۔ فکر و ریاض	جناب علی جواد زیدی	(اعظم گڑھ)
۶۔ اقبال اور مغربی مفکرین	جناب جگن ناتھ آزاد	(سری نگر)
۷۔ پریم چند کی ناولوں میں نسوانی کردار	ڈاکٹر شمیم نکہت	(لکھنؤ/دہلی)
۸۔ یادوں کے سائے	محترمہ ممتاز مرزا	(دہلی)
۹۔ اردو شاعری میں سانٹ	جناب حنیف کیفی	(پرانی دہلی)
۱۰۔ ہیروں کی آواز	جناب راج نرائن راز	(دہلی)
۱۱۔ مثنوی مولانائے روم	مولانا سجاد حسین	(دہلی)
۱۲۔ اردو شاعری میں قومی یکجہتی کے عناصر	ڈاکٹر مجاور حسین	(الہ آباد)
۱۳۔ تنکے کا سہارا	محترمہ شکیلہ اختر	(پٹنہ)

☆ ☆ ☆

اترپردیش اردو اکاڈمی کی مجلس انتظامیہ نے اترپردیش کے مختلف شہروں کے اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھنے والے ۱۱۲ طلبہ و طالبات کو جو چھٹے درجے سے ایم۔اے فائنل تک اردو کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور جن میں وہ ریسرچ اسکالر بھی شامل ہیں جو ریاست کی مختلف یونیورسٹیوں میں اردو میں تحقیقی کام کر رہے ہیں، تعلیمی سال (جولائی ۱۹۶۵ء سے جون ۱۹۶۶ء تک) کے لیے چھہتر ہزار روپے کی مجموعی رقم وظیفے کے طور پر دینا منظور کیا ہے۔ ان طلبہ میں وہ طالب علم بھی شامل ہیں جنھیں گزشتہ سال وظیفہ دیا گیا تھا اور اس سال اکاڈمی کے مقررہ قاعدے کے مطابق ان کے وظائف کی تجدید کی گئی ہے۔

اکاڈمی چھٹے اور ساتویں درجے میں دس روپے ماہانہ کا وظیفہ آٹھویں میں بارہ روپے ماہانہ، نویں اور دسویں میں پندرہ روپیہ ماہانہ، گیارہویں اور بارہویں میں بیس روپیہ ماہانہ، بی۔اے میں تیس روپیہ ماہانہ، ایم۔اے میں پچاس روپیہ ماہانہ وظیفہ دیتی ہے اور ریسرچ اسکالر کو دو برس کے لیے ڈیڑھ سو روپے ماہانہ۔

تعلیمی سال رواں میں ہر درجے میں جتنے طالب علموں کو وظائف دیئے گئے ہیں ان کی تعداد درج ذیل ہے۔

چھٹے درجے میں ۱۲ طالب علم، ساتویں درجے میں ۲۸ طالب علم، آٹھویں درجے میں ۲۷ طالب علم، نویں درجے میں ۱۷ طالب علم، دسویں درجے میں (تجدید) ۱۴ طالب علم، گیارہویں درجے میں ۲۴ طالب علم، بارہویں درجے میں (تجدید) ۱۲ طالب علم، بی۔اے سال اول میں ۲۳ طالب علم، بی۔اے سال دوم میں (تجدید) ۱۰ طالب علم، ایم۔اے سال اول میں ۱۰ طالب علم، ایم۔اے سال دوم میں (تجدید) ۹ طالب علم، ریسرچ اسکالر پہلا سال ۷ طالب علم، ریسرچ اسکالر دوسرا سال (تجدید) ۷ طالب علم۔

☆

نقد و تبصرہ

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا لازمی ہیں)

شہپر مجموعۂ کلام : سید حرمت الاکرام۔ ناشر پی کے پبلیکیشنز دریا گنج دہلی۔ اشاعت اگست ۱۹۷۲ء قیمت ۸ روپیہ
ضخامت ۲۴۰ صفحات۔

شاعری احساسات اور جذبات کی اس آواز کا نام ہے جو فکر و فن کی ان سرحدوں تک لے جاتی ہے جسے فن کی بلند ترین منزل کہا جاتا ہے۔ شاعر نہ تو مورخ ہوتا ہے اور نہ جغرافیہ کا ماہر۔ وہ نہ سائنسداں ہوتا ہے اور نہ فریب خوردۂ سیاست۔ وہ اپنے نفس کی تیشہ زنی سے کوہکن بھی بنتا ہے اور قیس عامری بھی۔ اس کی جنبش قلم ہیرے کی ایک ایسی کنی ہوتی ہے جو افکار و تصورات کو تراش کر حیات کے صحیح ادراک و آگہی کی سمت موڑ دیتی ہے۔ جناب سید حرمت الاکرام ہمارے ایسے ہی فنکاروں میں ہیں جن کا فن بیک وقت درد کی آگ بھی ہے اور پیچ و خم کی راہ بھی۔ جہاں یادوں کی پرچھائیاں کسی انجان لمحے کا انتظار نہ کرتے ہوئے بھی کسی کڑی دھوپ کی منتظر رہا کرتی ہیں۔ یاد رہے کہ فنکار کی "انا" ہی سخن شناسی کے اس وقت آڑے آتی ہے جب سوانحی خاکوں کی ترتیب ہمیں کسی نتیجے تک پہنچانے میں ناکام رہتی ہے۔ درحقیقت یہ انا خودشناسی ہوتی ہے خودنمائی نہیں۔ اور خودشناسی عیب نہیں ہے۔ اب یہ اور بات ہے کہ مانگے تانگے کے اجالوں سے اپنے فن کو پیش کرنے والے اسے خودنمائی پر محمول کیا کرتے ہیں۔ پیش نظر مجموعہ کلام میں نظمیں اور غزلیں دونوں شامل ہیں۔ کچھ نظمیں جدید شعری رجحانات کی حامل ہیں اور کچھ نظمیں ۱۸۶۲ء کے بعد پیدا ہونے والے تصورات کی آئینہ دار ہیں۔ لیکن اس سلسلے میں ادوار کا تعین کسی الجھاوے میں نہ ڈال کر سمت و رفتار کی نئی منزلوں کی تفہیم میں مدد دیتا ہے جسے تقویم فن کہہ کر آسانی سے ان نظموں میں منزلوں کو ڈھونڈا جا سکتا ہے۔ نظموں میں جہاں عالمی ادب کی سطح پر اردو شاعری میں احساسات کی دنیا کو پیش کیا گیا ہے وہیں ارضیت کو بھی گلے لگایا گیا ہے۔ "کجری مرجا پور سنام" ایسی ہی ایک نظم ہے۔

غزلیات میں حرمت الاکرام صاحب نے اپنا ایک نیا رنگ و آہنگ قائم کیا ہے جو ان کی انفرادیت کا ترجمان ہے۔ حرمت الاکرام کی غزلیں عصری آگہی اور حسیت کا ایک ایسا نمونہ ہیں جس پر جدیدیت کی چھاپ نہ لگا کر بھی ہم جدید کہنے پر مجبور ہیں۔ اگر فنکار کسی 'ازم' کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے تو اس کی سوچ و فن کا دائرہ بھی انتہائی محدود ہو جاتا ہے۔ فن ایک لامحدود ضمیر ہے۔ اسے کسی ازم کی میزان پر تولنے کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ اب اس کی وسعتیں سمٹ آئی ہیں۔ اس مجموعۂ کلام کی غزلیں شعریت کی شدت کا وافر سرمایہ فراہم کرتی ہیں۔

مجموعی طور پر اس مجموعۂ کلام کی نظمیں اور غزلیں بھی معیاری ہیں۔ پھر بھی غزل کی رفتار اور تاریخ کی روشنی میں ان غزلوں کو فن کے اس نگار خانہ میں نہیں رکھ سکتے جہاں آنچ نہ آسکے۔ اسکے قبل بھی حرمت الاکرام کے متعدد مجموعہ کلام چھوٹے بڑے قد کے شائع ہو چکے ہیں جن میں "اجالوں کے گیت"، "کلکتہ ایک رباب"، "کھیل کھلونے"، "ہمارے شاعر" وغیرہ اہمیت رکھتے ہیں۔ حرمت الاکرام انتہائی پرگو اور زود گو بسیں شاعر ہیں۔ اگر وہ فکر کو انتخابی شعور عطا کر دیں تو ان کا شعری سرمایہ اردو ادب کا گراں قدر سرمایہ ہوگا۔ بچوں کے ادب سے لے کر بڑوں کے ذوق تسکین تک ان کی تخلیقات پر چھوٹے بڑے رسالے میں بکھری ہوئی ہیں۔ جس سے ان کی مقبولیت ایک حقیقت بن چکی ہے۔

کتابت اور طباعت بہتر ہے۔ اردو اکیڈمی اتر پردیش کے ارباب حل و عقد قابل مبارکباد ہیں کہ اس مجموعۂ کلام کی بروقت اشاعت میں ان کے تعاون سے ایک اچھا مجموعۂ کلام منظر عام پر آگیا۔

ڈاکٹر فضل امام

پہچان کا دود مجموعۂ کلام : حمید الماس۔ ناشر شالیمار پبلیکیشنز حیدرآباد اشاعت اکتوبر ۱۹۷۲ء۔ قیمت ۱۲ روپیہ
ضخامت ۱۲۸ صفحات۔

فنون لطیفہ کو مختلف خانوں میں تقسیم کرنے کے بعد جب تقسیم کرنے والے نے ادب کے حصے کو دیکھا ہوگا تو غالباً اس کی دلکشی کائنات دل پر حاوی ہوگئی ہوگی۔ دیگر فنون لطیفہ کی قدر و قیمت اس وجہ سے کم ہے کہ ان کی نمو و مادیت کی مرہون منت ہے۔ لیکن ادب ایک ایسا فکری پیکر ہے جہاں فضاؤں کی پہنائیاں پھیل کر رہ جاتی ہیں۔ ادب میں بھی شاعری کی قدر و قیمت اس نظریۂ حیات کا نام ہے جہاں نظر شدید جذبات کی تپتی ہوئی ریت میں امید کا ایک ہلکا سا تصور پیدا کر کے مردہ دلوں کو زندگی کے آثار عطا کر دیتی ہے۔ حیات و کائنات کی محدود اور لامحدود بحث میں پڑنے سے پہلے اتنا کہہ دینا ضروری ہے کہ شاعری کی حیات کائنات کی حیات سے مختلف ہوا کرتی ہے۔ ادوار مٹتے ہیں اور بنتے ہیں۔ کائنات اجڑتی ہے اور بستی ہے لیکن دنیائے شاعری اس حیات ابدی کا نام ہے جو پیمانۂ عہد و سال سے نہیں ناپی جا سکتی۔ اس نقطۂ نظر کو ذہن میں رکھنے کے بعد زیر تبصرہ مجموعۂ کلام پہچان کا دود ہمیں شاعری کی اس روح کے قریب لے جانے میں مدد کرتا ہے جہاں آواز کی لیک۔ لہجہ کی نرمی۔ صداؤں کی بازگشت ایک حسن اختصار میں جلوہ گر ہو جاتی ہے۔ پہچان کا دود اردو شعر و ادب کا ایک تجرباتی مجموعۂ کلام ہے جو اردو شاعری کی زندگی کا ثبوت ہے۔ فن اور ادبی تجربے لازمی بھی ہیں۔ جس ادب میں تجربات کی قوت نہیں وہ موت کے گھاٹ آسانی سے اتر جاتا ہے۔ جدید تجربے اس بات کی دلیل ہیں کہ ہمارے ذہنوں کے دریچے بند نہیں ہیں۔ ہم نے اپنی فکر و نظر کے دروازوں کو کھولے رکھا ہے۔ لیکن خام تجربات کبھی بھی پختگی عطا نہیں کر سکتے۔ عام طور سے اردو شعر و ادب میں تقلیدی عناصر کی بہتات رہی ہے۔ مغرب سے اٹھنے والی تحریکیں ہندوستان تک پہنچتے پہنچتے بہت سی تو باسی ہو جاتی ہیں اور بہت سی راستے میں دم توڑ دیتی ہیں اس لیے مغرب کے شعری اور ادبی تجربات کی رو میں نہ بہہ کر ہمیں خود اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات سے کام لینا ضروری ہے۔ خوشی ہے کہ حمید الماس نے

تو تحریک زدہ ہیں اور نہ تہذیب زدہ۔ وہ فن زندگی کے قائل ضرور ہیں جس میں دلسوزی بھی ہے اور جگر کاوی بھی۔

انسانیت کا ترنم اردو شاعری کے مزاج میں رچا ہوا ہے جسے ہر عہد کے باشعور شعراء نے برتا ہے۔ لیکن حمید الماس شعور فن میں جب وفور جذبات کو سمو دیتے ہیں تو وہ اس انداز سے کہتے ہوئے نظر آتے ہیں ؎

چہرے جو ماہتاب سے اترے تھے خواب میں
نکلی سحر تو ڈوب گئے چاندنی کی طرح
باقی رہے نہ دست تصرف میں کوئی شے
جو کچھ مجھے دیا تھا وہ حصہ تھی چھین لے
یوں نہ محسوس ہوا افلاک نشیں ہے کوئی
اس قدر دور سے آواز سنایا نہ کرو
ہم سے کبھی کبھی تو ملو آدمی کی طرح
رہتے ہو کیوں وطن میں کسی اجنبی کی طرح
نفس بادِ صبا اتنا نہ آئے گا کبھی
گل کی اڑتی ہوئی خوشبو کا احاطہ نہ کرو
اس دور کا نصیب ہے تنہائیوں کا کرب
ہر شخص اپنی اپنی جگہ ہے بندھا ہوا
بھول جاتا ہوں میں اپنی پہچان کو
دیکھ کر نت نئے روپ انسان کے
وہ ایک چہرہ جو کب سے ہی نگاہوں میں تھا
وہ آپ اپنی شکستوں کی بارگاہ میں تھا

حمید الماس نے نظموں میں بھی اپنی بلند آہنگی اور فکری سرمایہ سے کام لیا ہے جس میں نہ تو فلک شگاف نعرے ہیں اور نہ زبردستی کا پروپیگنڈہ۔ ہر نظم پر تبصرہ کرنا آسان نہیں ہے نظموں کے مطالعہ کا جو مجموعی تاثر ہوتا ہے اسے یوں سمجھ لیجیے کہ ایک اچھے فن کار نے اسلوب اور انداز بیان کی دل کشی سے ایک ایسی فضا قائم کر دی ہے جس میں نقرئی قہقہے بھی ہیں اور دبی ہوئی چنگاریاں بھی۔

کتابت اور طباعت اچھی ہے لیکن قیمت نسبتاً کچھ زیادہ ہے۔ قوی امید ہے کہ ادبی حلقوں میں یہ مجموعہ تحسین کی نظروں سے دیکھا جائے گا۔

—— ڈاکٹر فضل امام

مطالعۂ خطوط غالب عبد القوی دسنوی۔ سن اشاعت: فروری ۱۹۷۵ء۔ ضخامت ۲۰ صفحات قیمت ۳ روپے۔
کتاب شعبۂ اردو، سیفیہ کالج، بھوپال نے شائع کی ہے اور وہیں سے طلب کی جا سکتی ہے۔

"غالبیات کے میدان میں عبد القوی دسنوی کا نام محتاج تعارف نہیں۔ غالب پر ان کی جو اہم کتابیں منظر عام پر آ کر ادبی حلقوں میں مقبول ہو چکی ہیں ان میں غالبیات نسخۂ بھوپال، نسخۂ بھوپال ثانی اور بھوپال اور غالب شامل ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب میں غالب کی اردو مکتوب نگاری کے بارے میں ایسا مواد موجود ہے جو اردو ادب کے پوسٹ گریجویٹ اور ڈگری درجات کے طلبہ کی نصابی ضروریات کے لیے کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔ کتاب میں جن موضوعات پر روشنی ڈالی گئی ہے ان میں سے بعض قابل ذکر امور ہیں: (۱) غالب کی اردو مکتوب نگاری کے آغاز و محرکات پر مفصل بحث (۲) غالب نے فارسی مکتوب نگاری کب تک جاری رکھی۔ (۳) مکاتیب سے غالب کی غیر معمولی دلچسپی (۴) خطوط غالب کی اشاعت کی اولین منزل۔ (۵) خطوط غالب کے وہ خصوصیات جن کے باعث ادب میں ان کی اہمیت مسلم ہے۔ اس موضوع پر مثالوں کے ساتھ مفصل بحث کر کے خطوط غالب کا موضوعات، اسلوب دونوں ہی اعتبار سے جائزہ لیا گیا ہے۔ (۶) کتاب کے آخر میں (صفحات ۵۰ تا ۲۰) ان مضامین و کتب کی فہرست پیش کی گئی ہے جو خطوط غالب کے مطالعے میں مفید ہیں۔ اس فہرست میں اگرچہ ابھی ترمیم و اضافہ دونوں ہی کی گنجائش ہے لیکن اس کے باوجود یہ خطوط غالب پر تحقیقی اور تنقیدی کام کرنے والوں کے لیے بہت مفید ثابت ہوگی۔ ملحوظ رہے کہ اسی قسم کی فہرستیں غالب سے متعلق اور بھی کئی کتابوں میں مل سکتی ہیں جن میں غالبیات از عبد القوی دسنوی اور غالب ببلیوگرافی از محمد انصار اللہ نظر بھی شامل ہیں۔

بہرحال عبد القوی دسنوی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے غالب کی اردو مکتوب نگاری کے بارے میں اس مختصر سی کتاب میں ایسا مواد پیش کر دیا ہے جو نہ صرف طالب علموں بلکہ محققین اور عام قارئین کے لیے بھی مفید و دلچسپ ثابت ہوگا۔ کاغذ، طباعت، کتابت اور قیمت کے اعتبار سے کتاب تسلی بخش ہے۔ امید ہے کہ ادبی اور تعلیمی حلقوں میں کتاب کا خاطر خواہ خیر مقدم کیا جائے گا۔

★

مراسلہ:

مکرمی تسلیم!

لکھنؤ کے چند نامور شعراء (جلد اول) از ڈاکٹر سید سلیمان حسین پر نیا دور (اپریل ۷۶ء ۱۹ء (ص ۴۷) میں شائع ہونے والے راقم الحروف کے تبصرے میں ایک مقام پر لفظ "مژہ" کو عربی لفظ قرار دیا گیا ہے جو سہو قلم ہے۔ "مژہ" دراصل فارسی لفظ ہے۔ براہ کرم یہ چند سطریں بطور وضاحت شائع فرما دیں۔ ممنون ہوں گا۔ زحمت کے لیے معذرت خواہ ہوں۔

نیازمند: کاظم علی خاں

عنوانات

نیا دور کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ حکومت اتر پردیش ان سے بہر حال متفق ہو

۲۶ رجون ۱۹۷۶ء کے اس شمارہ کو جولائی کا شمارہ تصور کیا جائے
اب اس کے بعد اگست کا شمارہ شائع ہوگا

جلد ۳۱ نمبر ۳

۲۶ جون سنہ ۱۹۷۶ء

ایڈیٹر: خورشید احمد

جوائنٹ ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی

★

پبلشر: روی موہن سیٹھی
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات، اتر پردیش

پرنٹر: اشوک در
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری، یوپی
مطبوعہ نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ
شائع کردہ محکمۂ اطلاعات۔ اتر پردیش

سرورق: بلی آرٹس

قیمت فی شمارہ: پچاس پیسے
زر سالانہ: پانچ روپے

ترسیل زر کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ پرکاشن بھاگ، انفارمیشن ڈپارٹمنٹ یوپی لکھنؤ
خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶۔ لکھنؤ
بذریعہ رجسٹری: ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن ڈپارٹمنٹ یوپی لکھنؤ

اپنی بات

ملک میں ہنگامی حالات کے اعلان کو ایک سال پورا ہو گیا۔ یہ دراصل ایمرجنسی کا نہیں بلکہ ملک کی ہمہ جہت ترقی اور ضبط و نظم کا ایک سال ہے جو پورا ہوا ہے۔ کچھ کوتاہ بین یہ محسوس کر رہے تھے کہ ایمرجنسی زیادہ دنوں چلنے والی نہیں اور اگر اسے زیادہ دنوں نافذ رکھا گیا تو ملک میں ایک ایسا طوفان آئے گا جس میں ہر خشک و تر بہہ جائے گا۔ یہ دو طرح کے لوگ تھے۔ ایک وہ جو سیاسیات میں کم سوجھ بوجھ اور معمولی درک رکھتے تھے۔ اپنی سیاسی بصیرت کی کمی اور ایمرجنسی سے ٹھیک پہلے کے زبردست مایوسی کے ماحول اور لاقانونیت کی فضا کے باعث یہ لوگ سمجھ رہے تھے کہ برسر اقتدار حکومت کے خلاف نفرت اور بغاوت کا لاوا اندر ہی اندر سلگ رہا ہے اور کسی دن بھی آتش فشاں بن کر پھٹ سکتا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ مخالف جماعتیں خاموشی کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتیں اور وہ اپنے اثرات اور حکمت عملی سے کام لے کر ایسے حالات پیدا کر دیں گی جن میں ایمرجنسی کو جلد ختم کر دینا ناگزیر ہو جائے گا۔ دوسرے خود بعض سیاسی تنظیمیں اور جماعتیں نیز فسطائی طاقتیں اپنے سیاسی اغراض اور اپنے ارکان کے ذاتی مفاد کی خاطر ایمرجنسی کے جلد خاتمہ کے لیے کوشاں تھیں اور عوام کو یہ تاثر دے رہی تھیں کہ ان کی کوششوں سے ایمرجنسی کے جلد خاتمہ کا وقت آگیا ہے۔ لیکن جلد ہی لوگوں کو یہ محسوس ہونے لگا کہ ایمرجنسی زحمت نہیں بلکہ نعمت بن کر آئی ہے۔ رفتہ رفتہ اس کے فائدوں کا احساس اتنا بڑھا کہ مختلف حلقوں سے ایمرجنسی کو باقی رکھنے کا مطالبہ کیا جانے لگا۔ ان سطور میں ایمرجنسی سے قبل کے چند برسوں میں ملک میں جو صورت حال پیدا کر دی گئی تھی اور ہماری بنیادی پالیسیوں، ہمارے بنیادی طریقوں اور ہمارے بنیادی مقصدوں کے خلاف جو کچھ ہو رہا تھا اس کے اعادے کی ضرورت نہیں۔ اب وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں رہ گئی ہے۔ البتہ ایمرجنسی کے نفاذ کے بعد وزیر اعظم کے ۲۰ نکاتی معاشی پروگرام کو بروئے کار لانے کے لیے پورے ملک نے جس طرح یک زباں ہو کر اس پروگرام کا خیر مقدم اور اس کی عمل آوری کا عزم کیا ہے وہ قابل ستائش اور لائق تحسین ہے۔ ایک سال کی مدت کوئی طویل مدت نہیں ہوتی لیکن اس قلیل مدت میں بھی ضبط و قانون، ڈسپلن، زرعی اور صنعتی پیداوار میں اضافے، فرائض کی انجام دہی کے احساس، تعلیمی اداروں میں تعلیم و تعلم، اشیاء کی حصولیابی اور ضروریات زندگی کی فراہمی میں جو سدھار اور قیمتوں میں جو کمی ہوئی ہے وہ اس ایمرجنسی اور ۲۰ نکاتی معاشی پروگرام کی دین ہے۔ ہماری ریاست اتر پردیش میں بھی ان کامیابیوں اور ان سہولتوں کی ٹھوس اور روشن مثالیں سامنے ہیں۔ ان عام سہولتوں کے علاوہ ہریجنوں اور کمزور طبقے کے لوگوں کی راحت کے لیے خاص طور سے جو اقدامات کیے گئے ہیں ان کے نتیجے میں سماج کے اس پس ماندہ اور صدیوں سے استحصال کے شکار طبقے کو جو فائدے پہنچے ہیں ان کی فہرست طویل ہے لیکن دیہی عوام کو قرض سے نجات دلانے، بندھوا مزدوری کے رواج کے خاتمے، زرعی آراضیات کی حد بندی کر کے فاضل آراضی کو بے زمینوں میں تقسیم کرنے، ہریجنوں اور بے زمین مزدوروں کو تعمیر مکان کے لیے زمین اور مالی امداد دینے، دیہی اور شہری آراضی کو سماجی مقاصد کے لیے استعمال کرنے، کھیت مزدوروں کی اجرت کی نئی شرحوں کا تعین اور آبپاشی، بجلی اور ہینڈلوم کی ترقی کے لیے کیے گئے اقدامات بھی قابل ذکر ہیں۔

ایمرجنسی کے ایک سال کے دوران جو کامیابیاں ہوئی ہیں، امن و امان نیز ڈسپلن کی جو فضا تیار ہوئی ہے اور ہر شعبۂ زندگی میں کارکردگی جس طرح بڑھی ہے اسے منعکس کرنے کے لیے نیا دور کا زیر نظر شمارہ خصوصی شمارہ کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔ اس شمارے سے یہ اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے کہ جس طرح حصول آزادی کی تحریکوں میں، ملک پر بیرونی جارحیت کے موقعوں پر اور دوسرے قومی مسائل سے نپٹنے کے سلسلے میں اردو کے ادیبوں، مصنفوں اور شاعروں نے جہاد بالسیف کیا اور قوم میں ایک نئی روح، ایک نئی بیداری اور ایک نیا عزم و ولولہ پیدا کرنے میں اہم رول ادا کیا، اسی طرح اس موقع پر بھی سماج دشمن عناصر اور فسطائی طاقتوں کی ریشہ دوانیوں کا پول کھولنے، ایمرجنسی کی ضرورت و افادیت کو واضح کرنے اور ۲۰ نکاتی معاشی پروگرام کو کامیاب بنانے میں عوام کو سرگرم تعاون دینے کے لیے آمادہ کرنے میں بھرپور حصہ لیا ہے۔

● قارئین کی اطلاع کے لیے یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ جون کے شمارے کے بعد زیر نظر خصوصی شمارہ معاشی ترقی کا ایک سال پورا ہونے کے موقع پر شائع کیا جا رہا ہے۔ اس خصوصی شمارے کو جولائی کا شمارہ تصور کیا جائے۔ اب اس کے بعد اگست کا شمارہ شائع ہوگا اس لیے قارئین اور خریدار حضرات جولائی کے شمارے کا انتظار نہ کریں۔

ـــــــ ایڈیٹر

۲۶ جون ۱۹۷۶ء

عشرت علی صدیقی

ایمرجنسی کا اعلان
اور
جمہوریت کا استحکام

جمہوریت سیکولرزم اور سوشلزم آزادی کی قومی تحریک کے تین بنیادی ستون تھے۔ اور انھی ستونوں کی وجہ سے اس تحریک نے عوام میں زبردست مقبولیت اور اتنی طاقت حاصل کر لی کہ عدم تشدد پر عقیدہ رکھنے والوں نے تشدد برتنے والی دنیا کے سب سے زیادہ طاقت ور سامراج کو شکست دے دی۔ یہ تینوں چیزیں ایک دوسرے سے قریبی تعلق رکھتی ہیں۔ معاشی جمہوریت کے بغیر سیاسی جمہوریت ادھوری رہ جاتی ہے اور معاشی جمہوریت ہی کا دوسرا نام سوشلزم ہے جس میں سماجی جمہوریت ایک بنیادی جز کی حیثیت رکھتی ہے۔ سماجی جمہوریت کو سیکولرزم کی ایک شکل کہا جا سکتا ہے۔ لیکن سیکولرزم ایک وسیع تر مفہوم بھی رکھتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حکومت کا اپنا کوئی مذہب نہیں ہوگا اور سب مذہبوں کے ماننے والوں کو مساوی حقوق حاصل ہوں گے۔ جو لوگ معاشی مساوات کے خلاف ہیں وہ سیاسی مساوات کے بھی مخالف ہیں اور سماجی مساوات کے تصور سے گھبراتے ہیں گاندھی جی نے ان تینوں چیزوں کو قومی مزاج کا جز بنا دیا تھا اور جواہر لال جی نے تحریر تقریر اور عمل کے ذریعے ان کو اتنی تقویت پہنچائی تھی کہ ان کے مخالفوں کو سامنے سے حملہ کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی لیکن وہ در پردہ کوششوں اور پس پردہ سازشوں میں مصروف تھے۔ ایمرجنسی کے اعلان کا اصل مقصد انھیں سازشوں کی کاٹ کرنا تھا۔

سازشیں

یہ اعلان ۲۶ جون ۷۵ء کو ہوا۔ لیکن درحقیقت ایمرجنسی کی کیفیت اس سے بہت پہلے پیدا ہو گئی تھی۔ ۱۹۶۹ء میں مسز اندرا گاندھی نے ان سازشوں کو بھانپ لیا تھا۔ انھیں قومی ضرورتوں کے علاوہ قومی مزاج کا بھی صحیح اندازہ ہو گیا تھا۔ اسی لیے انھوں نے پوری خود اعتمادی کے ساتھ ایک جراُت مندانہ اقدام کیا اور اس اقدام میں ان کی جماعت اور ان کے ملک کی زبردست اکثریت نے ان کا ساتھ دیا۔ اس اقدام میں گاندھی جی کی اصول پرستی جھلکتی تھی۔ گاندھی جی کی طرح اندرا جی بھی منزل بہ منزل آگے بڑھنا چاہتی تھیں اور ہر منزل میں عوام کو ساتھ رکھنا چاہتی تھیں۔ اس حکمت عملی سے جمہوریت کی جڑیں مستحکم ہو رہی تھیں اور ۱۹۷۱ء کے الکشن کے نتائج نے ان جڑوں کی مضبوطی کے علاوہ عوام کی امنگوں کو بھی اجاگر کر دیا۔ قوم کے مفاد اور قوم کی مرضی کا تقاضا تھا کہ ترقی کی رفتار تیز تر کر دی جائے۔ دوسری طرف بعض افراد اور طبقوں کی کوشش تھی کہ ملک کو سوشلزم کی سمت آگے نہ بڑھنے دیا جائے۔ سوشلزم کے سب سے زیادہ مخالف وہی لوگ تھے جو سیکولرزم کے سب سے زیادہ مخالف تھے مخالفوں کے بعض گروہ آپس میں بھی اختلاف رکھتے تھے وہ عوام کے سامنے الگ الگ بھیس میں آتے تھے اور الگ الگ اصول پیش کرتے تھے لیکن سوشلزم سے یہ سب ڈرتے تھے۔ جمہوری ذرائع سے اس کی مخالفت میں وہ بار بار ناکام ہو چکے تھے اور اس لیے انھوں نے جمہوریت کے آداب، دستور و قانون کے احترام اور اپنے اصولوں سے وابستگی کو بالائے طاق رکھ دیا۔ ایمرجنسی ایک نئی اور بھیانک شکل میں سامنے آ گئی۔

بہانے

خوب ڈھونڈنے والوں نے بہانے ڈھونڈ نکالے اور کئی بہانے گڑھ لیے۔ ایک الکشن مقدمے میں ایک ہائی کورٹ کے ایک فیصلے کے ایک جج کی آڑ لے کر ہڑبونگ مچائی گئی مگر دوسرے جج کو نظر انداز اور سپریم کورٹ کے فیصلے کا انتظار کرنے سے انکار کر دیا گیا۔ جمہوری طریقوں سے منتخب ہونے والی اسمبلیوں اور حکومتوں کو غیر جمہوری طریقوں سے توڑنے کی کوشش کی گئی، کسانوں سے کہا گیا کہ حکومت کے ہاتھ غلہ فروخت نہ کرو اور عوام سے کہا گیا کہ حکومت سے سستے داموں پر مزید غلہ طلب کرو۔ جب ملک کے بعض حصے قلت اور قحط سے دوچار رہتے تو غذائی اجناس کی نقل و حمل میں رکاوٹ ڈالنے کے لیے ریلوے ملازمین کو ہڑتال پر اکسایا گیا۔ بعض اخباروں نے کردارکشی کو اپنا شیوہ بنا لیا۔ فرقہ وارانہ منافرت کو ہوا دی گئی۔ طلبا کو پڑھائی چھوڑ دینے کی تلقین کی گئی اور فوج پولیس نیز دوسرے شعبوں میں کام کرنے والے سرکاری ملازمین کو حکم عدولی اور بغاوت پر آمادہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ عدم تشدد کا دم بھرنے والے تشدد سے نہ صرف چشم پوشی کرنے لگے بلکہ اسے حق بجانب بھی بتانے لگے۔ ان کی آڑ میں فرقہ پرست پروان چڑھتے رہے یہ بحران نہیں ہیجان تھا جس میں پورے ملک کو مبتلا کرنے کی کوشش ہو رہی تھی۔ سمستی پور میں ریلوے وزیر کا قتل اور نئی دہلی میں سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کی موٹر کو بم سے اڑا دینے کی کوشش اس سلسلے کی دو اور کڑیاں تھیں۔ ملک کو تاراج کے دروازے پر پہنچا دیا گیا تھا۔

آپریشن

ایمرجنسی کے اعلان کی حیثیت ایمرجنسی آپریشن کی تھی۔ یہ آپریشن اچانک اور ایسے وقت ہوتا ہے جب مریض کی جان بچانے کی کوئی دوسری صورت نظر نہیں آتی اس میں جان چلی جانے کا بھی خطرہ ہوتا ہے لیکن وزیر اعظم نے یہ خطرہ بدرجۂ مجبوری اور جان بوجھ کر مگر سوچ سمجھ کر مول لیا۔ اس اقدام کے محرکات میں جرأت کے ساتھ فراست بھی شامل تھی۔ ان کا اندازہ صحیح نکلا۔ تخریب پسندوں کے دعوے غلط ثابت ہو گئے۔ ہیجان پیدا کرنے والی باتوں ہنگامہ پرور نعروں اور بلوہ بازی والی حرکتوں کا طلسم چشم زدن میں ٹوٹ گیا۔ عوام نے ایمرجنسی کے اعلان کا خیر مقدم کیا اور تخریب پسندوں کا ساتھ چھوڑ دیا۔ بروقت کارروائی نے قطعیت کے حملے کا توڑ کر دیا اور جمہوریت کو فنا ہونے سے بچا لیا۔ ایک ایسی سازش ناکام ہو گئی جس کی جڑیں ملک کے باہر تک پھیلی ہوئی تھیں۔ ان طاقتوں کے منصوبے خاک میں مل گئے جو اپنے کارندوں کے ذریعے دوسرے ملکوں میں حکومتوں کا تختہ الٹوانے کی کوشش کرتی اور بعض اوقات اس کوشش میں کامیاب بھی ہوتی رہی ہیں۔ جس طرح کھسیانی بلی کھمبا نوچنے لگتی ہے اس طرح بعض غیر ملکی مدیروں اور مبصروں نے ہندستان پر لعن طعن شروع کر دی۔ مگر ہندستانیوں نے اس کی پروا نہیں کی اور یہاں حالات کے سدھار نے باہر والے مخالفوں کا منہ بند کر دیا۔ بہتوں نے اپنی رائے بدل دی اور باقی کی عصبیت بے نقاب ہو گئی۔

۲۶ جون ۱۹۷۵ء کے بعد ہی سے قیمتیں جس طرح گرنے لگیں، ریلیں جس طرح وقت پر چلنے لگیں، سرکاری دفتروں کی حاضری اور کارکردگی میں جو چوکسی آگئی، سڑکوں پر ہنگامہ آرائی جس طرح بند ہو گئی، اسکولوں اور کالجوں میں سنجیدگی کی جو فضا پیدا ہو گئی اور زندگی کے مختلف شعبوں میں ڈسپلن کی جو کیفیت دکھائی دینے لگی اس سے ثابت ہو گیا کہ ایمرجنسی کا اعلان ملک کو لاحق ہو جانے والے امراض کا تیر بہ ہدف علاج تھا۔ آپریشن کامیاب رہا نا امیدی کی جگہ امید پیدا ہو گئی اور لوگ تخریب کے بجائے تعمیر کی فکر کرنے لگے۔ کامیابی کی ایک مثال یہ ہے کہ افراطِ زر کی کیفیت پر جس نے دنیا کے بہت بڑے حصے کو جس میں بڑی طاقتیں بھی شامل ہیں پریشان کر رکھا ہے، یہاں مکمل قابو پا لیا گیا ہے۔ یہ کامیابی ایمرجنسی کے سلسلے میں کیے جانے والے اقدامات کے ایک مثبت پہلو کی نشاندہی کرتی ہے۔ اور اگرچہ ایمرجنسی کا اعلان شروع میں محض ایک انسدادی یا انتباہی اقدام معلوم ہوتا تھا مگر یکم جولائی کو وزیر اعظم نے ۲۰ نکاتی معاشی پروگرام کا اعلان کر کے ایمرجنسی کے اثباتی پہلو کو اجاگر کر دیا۔

اثباتی اقدام

اگر ایمرجنسی کی حیثیت ایک آپریشن کی تھی جو فاسد مادے کو نکالنے کے لیے ضروری ہو گیا تھا تو ۲۰ نکاتی پروگرام کی حیثیت ان دواؤں کی تھی جو ایسے مادے کے دوبارہ پیدا ہونے کو روکنے اور زخم کے

جلد مندمل ہونے اور مریض کو چلنے پھرنے کے لائق بنانے کے لیے استعمال کی جاتی ہیں۔ یہ دوائیں پہلے سے معلوم تھیں اور ان میں سے بیشتر استعمال بھی کی جا رہی تھیں۔ لیکن ایمرجنسی کے اعلان سے پہلے جو حالات ملک میں پیدا ہو گئے تھے اور جو بدنظمی ہنگامہ آرائی اور افراتفری بعض سماج دشمن عناصر پھیلا رہے تھے اس کی وجہ سے ان دواؤں کے استعمال میں رکاوٹ پڑ رہی تھی اور ان کا اثر پوری طرح سے نہیں ہو پا رہا تھا۔ قیمتیں گرانے، کھیتوں، کارخانوں کی پیداوار بڑھانے، دولت کے چند ہاتھوں میں جمع ہونے کو روکنے، کھیتہر مزدوروں کو زمین دلانے، مزدوروں کو کارخانوں کے انتظام میں شریک کرنے، چھوٹی اور گھریلو صنعتوں کو فروغ دینے، اسمگلنگ اور ٹیکس چوری کی روک تھام کرنے، مہاجنوں کی بے جا سود خوری کو ختم کرنے اور بندھوا مزدوروں کو آزاد کرانے کی باتیں براہِ راست اور بالواسطہ طور پر دستور میں درج پالیسی کے ہدایتی اصولوں میں شامل تھیں اور ان باتوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے مرکزی اور ریاستی حکومتیں کوشش بھی کر رہی تھیں مگر ان کوششوں کے نتیجے خاطر خواہ نہیں نکل رہے تھے۔

سماجی انصاف کے ان اقدامات سے سماج پر ناجائز طور سے حاوی ہو جانے والے افراد کے مفاد پر آنچ آتی تھی۔ اور اسی لیے یہ افراد مختلف طریقوں سے ان اقدامات کو ناکام بنانے کی کوشش کر رہے تھے، طرح طرح کے ہنگامے کھڑے کر کے حکومت اور عوام کی توجہ بنیادی مسائل کی طرف سے ہٹا رہے تھے، معاشی ترقی کے لیے یکجہتی اور یکسوئی کی ضرورت تھی مگر فرقہ وارانہ منافرت کے ذریعے انتشار پھیلایا جا رہا تھا اور تشدد آمیز تحریکوں نے امن و نظم کے قیام و استحکام کو سب سے بڑا مسئلہ بنا دیا تھا۔ اگر ایمرجنسی کا اعلان نہ کیا جاتا تو فاسد مادہ اندر ہی اندر بڑھتا، پکتا اور پھیلتا رہتا اور جمہوریت سیکولرزم اور سوشلزم کی جڑیں کمزور ہوتی رہتیں۔ اوپر اوپر کے لیپ اور سینک سے کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ طویل تجربے نے واضح کر دیا تھا اور ۲۶ جون ۱۹۷۵ء کے بعد ہونے والے انکشافات نے اس کا مزید ثبوت فراہم کر دیا ہے۔

پچھلے ایک سال میں قیمتیں جتنی گری ہیں اتنی پچھلے دس برسوں میں نہیں گری تھیں اور سیلنگ کے قانون سے دیہی سماج میں جو تبدیلی آئی ہے وہ زمینداری کے خاتمے کے ذریعے لائی جانے والی تبدیلی سے کسی طرح کم اہم نہیں ہے۔ ٹیکس کی وصولی اور اسمگلنگ کی روک تھام میں بھی ایسی ہی کامیابی ہوئی ہے اور کارخانوں کی پیداوار میں مشترکہ انتظامی کمیٹیاں بن گئی ہیں۔ قومی یا سرکاری ملکیت والے کارخانوں نے اس معاملے میں پہل کی ہے اور ایسے کارخانوں کے انتظامات میں بہتری اور پیداوار میں اضافے سے نجی زمرے پر قومی زمرے کی فوقیت ثابت ہو گئی ہے۔

فضا میں تبدیلی

یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ ایک طویل مدت میں رفتہ رفتہ اور پچھلے پانچ برسوں میں خاصی تیزی کے ساتھ جو آلائش جمع ہو گئی تھی وہ ایمرجنسی کے اعلان کے بعد ایک سال کے اندر پوری طرح سے صاف کر دی گئی ہے۔ سماجی ناانصافیاں اب بھی باقی ہیں اور ملک کی ترقی خوشحالی اور سالمیت کو اندر اور باہر کے جو خطرے لاحق ہیں ان کی طرف وزیر اعظم بھی بار بار توجہ دلاتی رہتی ہیں۔ پھر بھی یہ ایک حقیقت ہے کہ خطرے کو پہچان لیا گیا ہے، اس کی روک تھام کا طریقہ معلوم کر لیا گیا ہے، مایوسی خاصی بڑی حد تک دور ہو گئی ہے، خود اعتمادی پیدا ہو گئی ہے سماج دشمن عناصر ختم نہیں ہوئے تو سہم ضرور گئے ہیں۔ فضا میں تبدیلی آ گئی ہے اور ترقی کی طرف پیش رفت آسان ہو گئی ہے، دستور میں پچھلے ایک سال کے دوران جو ترمیمیں ہوئی ہیں ان کی بدولت ہی دولت مندوں کے لیے دستور کی آڑ لے کر لوٹ کھسوٹ جاری رکھنا دشوار ہو گیا ہے۔ یہ لوگ اور ان کے کارندے ایمرجنسی سے پہلے عوام میں جھوٹی امیدیں پیدا کر کے انھیں ورغلاتے، ترقی پسند اقدامات کا مذاق اڑاتے اور اس طرح اپنے ناجائز مفادات کے تحفظ کا بندوبست کرتے تھے۔ ایمرجنسی کے اعلان کے بعد عوام میں ترقی کی سچی امنگ پیدا ہو گئی ہے۔

یہ امنگ ایمرجنسی کی شاید سب سے بڑی دین ہے۔ ایمرجنسی سے جہاں ایک طرف حکومت کو غیر معمولی اختیارات حاصل ہو گئے ہیں۔ وہاں دوسری طرف وزیر اعظم کے اس اقدام سے حکومت اور

(باقی صفحہ ۳۸ پر)

جائزہ

نذیر بنارسی

نہ دیکھو پیچھے آگے بڑھنے والوں کا سماں دیکھو
غبارِ کارواں کیا دیکھتے ہو کارواں دیکھو

کسانوں اور مزدوروں کی اب تاب و تواں دیکھو
گزشتہ کل کو چھوڑو آج کا ہندوستاں دیکھو

ہے لطفِ داستاں لینا تو میرا مشورہ لے لو
ذرا عنوان پہلے دیکھ لو تب داستاں دیکھو

بچایا مادرِ ہندوستاں کو کس قرینے سے
وطن والو کمالِ دخترِ ہندوستاں دیکھو

جہاں ہمت شکن مایوسیاں چھائی تھیں انساں پر
وہاں انگڑائیاں لیتا ہوا عزمِ جواں دیکھو

وہ سڑکیں جن پہ کل خنجر بکف خطرے ٹہلتے تھے
انھیں سڑکوں پہ چل کر اب ہجومِ مہوشاں دیکھو

اسی رستے پہ ہم سب چل کے پہنچیں گے سرِ محفل
نظر آتا ہے وہ منزل کا دھندلا سا نشاں دیکھو

زمیں سے آسماں تک آج اپنی بھی رسائی ہے
فضاؤں میں خلاؤں میں جہاں چاہو وہاں دیکھو

ہماری سمت سے اب پھیر لو چشمِ کرم اپنی[1]
یہاں ہم دیکھ لیں گے تم جہاں کے ہو وہاں دیکھو

بُری نیت سے میری سرحدوں کو دیکھنے والو
تمھیں میرے جہاں سے کیا غرض اپنا جہاں دیکھو

یہ دونوں کام مل کر بانٹ لیں آپس میں ہم دونوں
زمیں کی ہم نگہبانی کریں تم آسماں دیکھو

نذیرؔ اپنا تعلق اتحادِ باہمی سے ہے
ہمیں کیا دیکھتے ہو تم ہمارا کارواں دیکھو

۱؎ دنیا کی سب سے بڑی طاقت کی طرف اشارہ ہے۔

عبدالمجیب سہالوی

بی ایمرجنسی

آخر یہ بی ایمرجنسی ہیں کون ؟ جسے دیکھو انہی کے نام کی رٹ لگائے ہوئے ہے

دادی اماں ! آپ نے بھی کمال کر دیا ان کا تو ملک بھر میں طوطی بول رہا ہے اور ان کے نام کے ڈنکے بج رہے ہیں اور آپ پوچھتی ہیں کہ بی ایمرجنسی ہیں کون ؟

ارے بیٹا ! میں بڈھی پھوس ۔ آنکھ سے دکھائی نہیں دیتا، کان سے سنائی نہیں دیتا تو پھر مجھ سے تم طوطی کی بولی اور ڈنکے کی آواز کی کیا بات کرتے ہو ۔

دادی اماں ! آپ بھیا کلیم کی باتوں میں نہ پڑیئے یہ یونہی واہی تباہی اڑایا کرتے ہیں ۔ آپ مجھ سے سنیے میں آپ کو بتاتی ہوں کہ بی ایمرجنسی کون ہیں ؟ آپ نے چاند بی بی اور رانی جھانسی کا تو نام سنا ہی ہوگا ۔ جیسے وہ اپنے دیس کو ظالم دشمنوں کے پنجوں سے نکالنے کے لیے تلوار کھینچ کر میدان میں نکل پڑی تھیں اسی طرح بی ایمرجنسی آستین کے سانپ دیس میں رہنے والے دیس کے دشمنوں سے بھارت کو نجات دلانے کے لیے قانون کی تیز تلوار میان سے نکال کر اس طرح میدان میں آگئیں کہ کالے دھن کے بڑے بڑے پہاڑ بید کی طرح کانپنے لگے اور مارے ڈر کے ان کی سٹی گم ہو گئی ۔ وہ سارا کالا دھن جو چور بازاری، رشوت خوری، ٹیکس ماری اور لوٹ کھسوٹ سے جمع کیا گیا تھا باہر آ گیا ۔

یہ سنتے ہی دادی اماں کی ڈوبی ہوئی آنکھوں میں ایک چمک سی پیدا ہو گئی اور چہرے پر خوشی کی لہر اس طرح دوڑ گئی کہ ساری جھریاں سمٹتی معلوم ہونے لگیں ۔ وہ بولیں بیٹی عقو ! یہ بات ہے تو میرا بے اختیار دل چاہتا ہے کہ بی ایمرجنسی کی پیشانی چوم کر گلے لگا لوں ۔

اس پر میاں کلیم فوراً بول اٹھے ۔ دادی اماں ! دیکھیے ایسا غضب نہ کیجیے گا بی ایمرجنسی چوما چاٹی کے بھی بہت خلاف ہیں اسی لیے غنڈہ گردی ان کا نام سنتے ہی سر پر پاؤں رکھ کر بھاگتی ہے ۔ آپ کو معلوم نہیں بی ایمرجنسی کے جلوہ افروز ہونے سے پہلے لڑکیوں کے اسکولوں اور کالجوں کے سامنے من چلے لڑکوں کی ایسی بھیڑ لگی رہتی تھی کہ بیچاری لڑکیوں کا آنا جانا دشوار ہو جاتا تھا مگر اب ان کا دور دور پتہ نہیں چلتا اور وہ ایسے غائب ہو گئے ہیں جیسے گدھے کے سر سے سینگ ۔

بیٹی عقو ! تم سچ سچ بتاؤ کہ میاں کلیم اڑا رہے ہیں ۔ یا ٹھیک کہہ رہے ہیں ۔

دادی اماں ! وہ گدھے غائب تو نہیں ہوئے ہیں لیکن ان کے سر سے سینگ ضرور غائب ہو گئے ہیں ۔ اب وہ بی ایمرجنسی کے ڈر سے سینگ مارنے کے بجائے کان دبائے بھیگی بلی بنے اس طرح گذر جاتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ سینگ مارنا جانتے ہی نہیں آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ اس مرتبہ نقلچیوں کی ایسی سٹی گم رہی کہ کتاب لے جانا تو بڑی بات ہے ۔ امتحان ہال میں پرچی لے جانا بھی ان کے لیے مشکل ہو گیا اور خدا کے فضل اور بی ایمرجنسی کی عنایت سے امتحان وقت سے اور سکون و اطمینان سے ہوئے ۔

نہ ہنگامہ، نہ ہلڑ، نہ نعرے بازی۔

دوّوا یہ عقو خود بھی ڈرپوک ہے اور اس کے ساتھ کی لڑکیاں بھی۔ یہ اگر بی ایمرجنسی کی لال پیلی آنکھیں دیکھ کر ڈر گئیں اور نقل نہ کی۔ تو کون سی تعجب کی بات ہے۔ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ وہ گھٹے دل نوجوان جن کا نعرہ تھا کہ جو ہم سے ٹکرائے گا وہ چور چور ہو جائے گا، ان کے بی ایمرجنسی کی ایک ڈانٹ سے ایسے اوسان خطا ہو گئے کہ نعرے لگانا تو بڑی بات ہے نقل کرنا تک بھول گئے ورنہ ایمرجنسی سے پہلے ان کا یہ حال تھا کہ وہ اپنے استادوں اور ساتھیوں سے تو خیر آئے دن ٹکراتے ہی رہتے تھے لیکن بعض وقت تو وہ مستی میں آ کر ٹرینوں اور بسوں سے بھی ٹکرانے لگتے تھے۔ جس کی وجہ سے ٹرینوں اور بسوں پر سفر کرنا بغیر آفت کے دشوار نہ رہ گیا تھا۔ ڈبوں میں زبردستی بلا ٹکٹ گھس جانا جہاں جا ہا بے دھڑک زنجیر کھینچ کر گاڑی روک دینا۔ سامان لادے گھبرائے ہوئے مسافروں کا مذاق اڑانا ٹکٹ چیکر کو پریشان کرنا خوانچے والوں کو دق کرنا ان کا روزمرہ کا وطیرہ ہو گیا تھا۔

اللہ جھوٹ نہ بلائے دادی جان! میں نے تو یہاں تک دیکھا ہے کہ بس تیزی میں جا رہی ہے۔ دس بارہ لڑکے بیچ سڑک پر برابر سے کھڑے ہو گئے۔ ڈرائیور کو بس روکنا پڑی۔ بس کے رکتے ہی لڑکے اچک اچک کر بس ڈرائیور کی کھڑکی سے دندناتے ہوئے گھس آئے۔ ٹکٹ لینے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر کسی کنڈکٹر نے ہمت کر کے ٹکٹ کے لیے یا بس سے اترنے کے لیے کہا تو سمجھیے اس کی شامت آ گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جنگل کا قانون جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ بیچ شہر میں جاری ہے مسافر مجبور، ڈرائیور اور کنڈکٹر بے بس۔ جو بولے وہ مار کھائے۔

یہ حال سن کر دادی اماں روا سی ہو کر بولیں یہ تو قرب قیامت کے آثار تھے۔

کلیم میاں فوراً بولے دادی اماں۔ اللہ جیتا رکھے بی ایمرجنسی کو اگر یہ بروقت قانون کی ننگی تلوار لے کر نکل نہ پڑتیں تو قیامت سر پر آ ہی گئی تھی۔

رجعت پسند سیاسی پارٹیوں کی سرپرستی میں منھ زور ہلڑ باز لڑکے اُدھم مچانے کے لیے تیار ہی تھے۔ دوسری طرف فرقہ پرست جماعتیں، پیسے والوں، رجواڑوں اور دیس کے دشمن ملکوں کے اشارے پر غریبی مٹاؤ اور پچھڑے ہوؤں کو برابر لاؤ کی جو مہم وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کی رہنمائی میں چلائی جا رہی تھی، اس میں روڑے اٹکانے اور حکومت کا تختہ دھڑ سے نیچے اُلٹنے کے لیے منصوبے تیار کر رہے تھے وہ تو کہیے کہ بڑی خیریت ہوئی کہ بی ایمرجنسی نے ہمیں اس وقت ان سب کا گلا گھونٹ دیا جب یہ سازش کے فلیتے میں آگ لگانے کے لیے ہاتھ بڑھا رہے تھے۔

دادی اماں نے کلیم کی لمبی چوڑی تقریر سے اکتا کر جمائی لیتے ہوئے کہا کہ بیٹا میری بوڑھی عقل میں یہ بات نہیں آتی۔ کہ آخر حکومت کا تختہ الٹنے اور ہلڑ مچانے سے ان کا کیا بھلا ہوتا۔

دادی اماں! وہ تختہ اس لیے الٹنا چاہتے تھے کہ غریبی ہٹاؤ اور سب کو برابر کا درجہ دلاؤ کے نعرے سے ان کے ٹھلوسے مانڈے، ان کی شان و شوکت ان کے اثر و رسوخ میں فرق آنے کا ڈر تھا اسی لیے وہ حالات کو جوں کا توں رکھنا چاہتے تھے اور سماج کے ڈھانچے میں کوئی تبدیلی پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ سیاسی آزادی کے بعد ملک میں ہونے والی ترقی سے جو خوش حالی آئی ہے اس کا بڑا حصہ بدستور انہی کے اپنے گنے گھرانوں میں محدود رہے اور محنت کش مزدور اور جفاکش کسان خون پسینہ ایک کر کے پیدا کرنے والی دولت سے پورا فائدہ نہ اٹھا سکیں۔ ان کے رہن سہن کا معیار بلند نہ ہو، ان کے بچے اعلا تعلیم اور اعلا عہدوں سے بدستور محروم رہیں۔ انھیں کچہریوں، دفتروں اور اسپتالوں میں وہ آسانیاں حاصل نہ ہوں جو امیر لوگوں کو اپنے پیسے اور اثر و رسوخ کے بل پر حاصل ہیں۔ سماج میں انہی کا طوطی بولے انھیں کی ناک اونچی رہے اور وہ جوں کے توں چودھری بنے رہیں اور غریبوں کی کوئی شنوائی نہ ہو۔ اسی لیے وہ ان لوگوں کے خلاف تھے جو تبدیلی لانا چاہتے ہیں اور غریب و امیر کا فرق مٹانا چاہتے ہیں۔

خزانوں پر بیٹھے ہوئے ان سانپوں کی ایک پوری برادری ہے جو ملک ہی میں نہیں ملک کے باہر تک پھیلی ہوئی ہے اور وہ اپنے مشترکہ مفاد کے لیے ایک دوسرے کی مدد کرتے رہتے ہیں۔ ان کا جال اتنا لمبا چوڑا ہے کہ ان کی سازش میں بڑے بڑے بدعنوان افسر تک شامل ہیں۔ یہ لوگ بھولی بھالی جنتا کو دھوکے میں رکھ کر اپنا حمایتی بنانے کے لیے طرح طرح کے روپ دھارتے ہیں۔ وہ مذہب کے نام پر تبدیلی لانے کے ہر اچھے قدم کی مخالفت کرتے ہیں، فرقہ واریت کا زہر پھیلا کر اور پیسے کا لالچ دے کر سیدھے سادھے عوام کو اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی مارنے پر آمادہ کرتے ہیں۔

آپ کو یاد ہوگا کہ جب غلہ بیوپاریوں نے ذخیرہ اندوزی کر کے گیہوں کی قیمتیں اچھی پیداوار کے باوجود آسمان پر پہنچا دیں تو سرکار نے گیہوں کی تجارت درمیانی لوگوں کے ہاتھوں سے نکال کر اپنے ہاتھوں میں لینے کی کوشش کی تاکہ گیہوں مناسب قیمت پر عام خریداروں کو اور معقول قیمت کسانوں کو مل سکے اور درمیان کے غلہ بیوپاری لوٹ کھسوٹ نہ کر سکیں لیکن غلے کے بڑے بیوپاریوں اور ان کے ہمدرد سیاسی لیڈروں نے کسانوں کو بہکا کر اور انھیں لالچ دے کر حکومت کی جانب سے غلے کی خریداری میں روڑے اٹکائے اور ٹھیک سے کام نہ ہونے دیا تاکہ چوربازاری کے ذریعے حاصل ہونے والے کالے دھن سے ان کی کی تجوریوں کے پیٹ بھرتے رہیں۔

یہ سن کر دادی اماں کی بوڑھی رگوں میں بھی خون جوش مارنے لگا اور انھوں نے کہا تو پھر حکومت ان لوگوں کا تختہ کیوں نہیں الٹ دیتی۔

اس پر عقو بولیں دادی اماں! ہماری حکومت جمہوری ہے وہ جو تبدیلی لائے گی وہ ڈنڈے کے زور سے نہیں قانون کے ذریعہ لائے گی۔

دادی اماں مسکرا کر بولیں، اب میں سمجھی یہ بی ایمرجنسی کوئی بیگم یا رانی نہیں بلکہ کوئی قانون ہے۔ تم لوگوں نے خواہ مخواہ بی ایمرجنسی بی ایمرجنسی کہہ کر مجھے دھوکے میں ڈال دیا۔

میاں کلیم بولے دادی اماں! جب کوئی چیز تلاش کے بعد ملتی ہے تو مزا آتا ہے۔ اگر ہم ایمرجنسی کو یہ قصہ بنا کر آپ کے سامنے نہ لاتے تو آپ کاہے کو ہماری بات سنتیں۔ نوج بیٹا! میں کوئی سٹرن تھوڑی ہی ہوں جو کام کی بات نہ سنتی۔ اچھا یہ تو بتاؤ کہ یہ کیسا قانون ہے؟

دادی اماں! یہ ایک ایسا قانون ہے جو دیس پر کوئی باہری یا اندرونی بپتا پڑنے پر ہنگامی حالات سے نبٹنے کے لیے لاگو کیا جاتا ہے تاکہ کام کی راہ میں روڑے نہ اٹکائے جا سکیں اور غلط کام کرنے والوں کو جلد اور معقول سزا دی جا سکے۔

عقو بولیں دادی اماں! اسی قانون کی برکت ہے کہ ہم لوگوں کے امتحان وقت سے ختم ہو گئے اور نتیجے بھی وقت سے آ جائیں گے۔

دادی اماں! اس عقو کو تو امتحان اور نتیجے کے سوا کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا۔ ارے یہ نہیں دیکھتی کہ ایمرجنسی کے بعد سے ریلیں ٹھیک وقت پر اسٹیشن اور بابو لوگ ٹھیک وقت پر دفتر پہنچ رہے ہیں۔ اب ریلوں کی بلاوجہ زنجیر کھینچی جاتی ہے اور نہ دفتری گھس گھس میں فائیلوں کے سرخ فیتے سب کام ٹھیک سے ہو رہے ہیں۔ ادھر ادھر چھاپے پڑ رہے ہیں اور لاکھوں کا چھپا ہوا کالا دھن روزانہ باہر آ رہا ہے ٹیکس ماری کرنے والے گھبرا کر اپنا چھپا چھپایا دھن ظاہر کر رہے ہیں۔ بدعنوان افسروں کی بوٹی لرز رہی ہے کہ کہیں قبل از وقت ریٹائرمنٹ کا نوٹس نہ آ جائے۔ پابند مزدوروں کی بیڑیاں کاٹی جا رہی ہیں۔ غریبوں کو مہاجنوں کے پنجوں سے چھڑانے کے لیے قرضے معاف کیے جا رہے ہیں بینکوں سے غریبوں کو آسانی سے قرضے دیے جا رہے ہیں تاکہ چھوٹے دھندے کر کے اپنے رہن سہن کا معیار اونچا کر سکیں۔

یہ سب سننے کے بعد دادی اماں کافی سنجیدہ ہو کر بولیں مگر بیٹا! بزرگوں کی یہ بات گرہ میں باندھ لو کہ آگ اور دشمن کو کبھی کم نہیں سمجھنا چاہیے اور ہمیشہ چوکنا رہنا چاہیے کہ معلوم نہیں کب موقع پا کر چھپی چنگاری شعلہ بن جائے اور دبا دشمن حملہ کر دے۔

ابھی دادی اماں یہ نصیحت کر ہی رہی تھیں کہ ریڈیو سے آواز آئی ہمارا نعرہ "آرام حرام"

★

خالد شفائی

عزم

دلِ فسردہ کو پھر گلستاں بنانا ہے
نفس نفس کو ہمیں کامراں بنانا ہے

حیاتِ نو کے لیے ارتقا کی چھاؤں میں
نئی زمین، نیا آسماں بنانا ہے

بساطِ دہر کے پھیلے ہوئے اندھیروں کو
نظر کی ضو سے تبسم فشاں بنانا ہے

وہ اشکِ غم جو سلگتا ہے آج آنکھوں میں
اس اشکِ غم سے نئی کہکشاں بنانا ہے

مٹا کے حسرت و یاس و الم کی بنیادیں
یہ نظمِ خاص، نیا اک جہاں بنانا ہے

شکست خوردہ ارادوں کو اور امنگوں کو
لہو کے دیپ کی لَو سے جواں بنانا ہے

بہ سعیِ جہدِ مسلسل، بہ حسنِ عزم و عمل
دیارِ ہند کو جنت نشاں بنانا ہے

نہ ہونے دیں گے تسلط، خزاں کا اے خالدؔ
بہارِ نو کو ہمیں جاوداں بنانا ہے

مومن خان شوق

خواب سحر تمام ہوا

چاروں جانب شیشہ گرانِ عہدِ الم
بستی بستی پگھل رہے ہیں
کروٹ کروٹ جیسے کونپل
شاخِ الم سبز اندر سبز
مہک چلی ہے
رستے گلیاں کھیت، بغیچے
ایک نئی تاریخ بناتے
کتنے سُندر لگتے ہیں
جیسے گجردم
ننھے ننھے پھولوں ایسے پیارے بچّے
یونی فارم میں مکتب کو نکلے ہوں گھر سے
یہ سُندرتا، یہ ہلچل
پر یہ درشن اندرا گاندھی کے سپنوں کا رنگ محل ہے

ڈاکٹر مرزا رفیع الدین احمد

قومی ترقی اور ۲۰ نکاتی پروگرام

جب بنیادی حقوق کو استحصال کا ایک ذریعہ بنا لیا جاتا ہے تو دوسروں سے زیادتی کی ابتدا ہو جاتی ہے۔ جب آزادی کو بے لگامی کی شکل دے دی جاتی ہے تو طوائف الملوکی کا دور دورہ ہو جاتا ہے۔ جب آزادی کا استعمال جمہوریت کی تخریب کے لیے کیا جانے لگتا ہے تو آزادی ختم ہو جاتی ہے۔ جملہ تصورات کی طرح آزادی کا تصور بھی ایک نسبتی تصور ہے۔ مطلق اور غیر پابند آزادی ایک بے معنی چیز ہے کیونکہ غیر پابند اور بے اصول آزادی عام طور سے لاقانونیت، استحصال اور طوائف الملوکی کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

ہمارے ملک میں بھی ایمرجنسی کے نفاذ کے قبل آزادی کا کچھ ایسا ہی غلط استعمال کیا جا رہا تھا کہ ملک میں بے حد بدنظمی اور تقریباً طوائف الملوکی والی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ سماج دشمن اور رجعت پسند طاقتوں نے طرح طرح کے حیلے بہانے تراش کر جمہوریت کو ہی ختم کر دینے کا بیڑا اٹھایا تھا اور سارے بے اصول اور خود غرض لوگ اپنے اپنے ذاتی مفاد کے لیے نظم و نسق کو تباہ کرنے پر تل گئے تھے۔ عوام کو ان حالات میں بڑی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ لیکن وہ اپنے کو مجبور اور بے بس پاتے تھے۔ کسی ادارے کا بھی سکون کے ساتھ چلنا مشکل تھا، چاہے وہ معاشی ادارہ ہو یا تعلیمی یا سماجی۔ جب آزادی کے اس بیجا استعمال سے نہ صرف جمہوریت بلکہ پورے ملک و قوم کی زندگی کو خطرہ لاحق ہو گیا تو وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے ایک جرأت مندانہ اقدام کر کے ملک کو تباہی سے بچا لیا۔ ۲۶ جون ۱۹۷۵ء کو جب ایمرجنسی کا نفاذ ہوا تب جا کر ملک سے بے لگام آزادی اور طوائف الملوکی کا خاتمہ ہوا اور عوام نے اطمینان کی سانس لی۔ وزیر اعظم نے بہت ٹھیک کہا کہ "جمہوریت جسے لوگوں نے پٹری سے اتار دیا تھا، اسے پھر سے پٹری پر لانا ہے[1]۔" انھوں نے یہ بھی کہا کہ "کبھی کبھی ہمیں ایسے کام کرنے پڑتے ہیں جنھیں عام حالات میں ہم نہیں کرتے جنھیں میں خود کرنا پسند نہیں کرتی اور جنھیں میں ابھی ابھی پسند نہیں کرتی۔ لیکن اس وقت سوال یہ تھا کہ وہ کام کیے جائیں یا اس طوائف الملوکی کو چلنے دیا جائے۔" جمہوریت میں اپنے اعتقاد کی پختگی کو ظاہر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ "بھارت ایسے عظیم اور گوناگونیت والے ملک کے لیے سوائے جمہوریت کے اور کوئی دوسرا نظام موزوں نہیں ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چونکہ ہمارے یہاں ایمرجنسی ہے اس لیے اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جمہوریت کو ترک کر دیا ہے یا ہم جمہوریت کو بھارت کے لیے ناموزوں سمجھتے ہیں۔ میں اس کو بالکل واضح کر دینا چاہتی ہوں۔ لیکن ہماری جمہوریت میں کچھ نقائص آ گئے تھے اور ان نقائص کو دور کرنا ہے[2]۔" ایک اخباری نمائندے سے گفتگو کرتے ہوئے وزیر اعظم نے فرمایا کہ ہمارے ملک میں اس بات کی ضرورت ہے کہ "افراد کے سیاسی اور دیگر حقوق اور کروڑوں لوگوں کے اقتصادی حقوق میں ایک صحتمندانہ توازن لایا جائے[3]۔"

اس توازن کو قائم کرنے کے لیے اور ملک کو سماجی اور اقتصادی ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کے لیے وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے

---

[1] روزنامہ نیشنل ہیرالڈ لکھنؤ مورخہ ۱۱ جولائی ۱۹۷۵ء۔ [2] روزنامہ نیشنل ہیرالڈ لکھنؤ مورخہ ۱ جولائی ۱۹۷۵ء۔ [3] روزنامہ نیشنل ہیرالڈ لکھنؤ مورخہ ۷ جولائی ۱۹۷۵ء

[4] ہفتہ وار بلٹز مورخہ ۲۳ اگست ۱۹۷۵ء۔

یکم جولائی ۱۹۷۵ء کو ایک بیس نکاتی معاشی پروگرام کا اعلان کیا۔ یہ بیس نکاتی پروگرام ہمارے ملک کے کروڑوں عوام کے لیے ایک طرح کا منشور آزادی ہے جس نے عوام کو معاشی بدحالی اور پریشانی سے نجات دلا کر انھیں ترقی کی راہ پر گامزن کر دیا ہے۔

جیسا کہ ہم آپ سب جانتے ہیں کہ ایمرجنسی کے نفاذ کے قبل ضروری اشیا کی زبردست کمی ہو گئی تھی اور ملک کی پیداوار اتنی کم ہو گئی تھی کہ عوام کو سخت معاشی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا اور یہ سب سماج دشمن طاقتوں کے کرتوت تھے۔ ضروری اشیا کی تقسیم عوام میں صحیح طریقے پر نہیں ہو پاتی تھی کیونکہ ذخیرہ اندوزا اور چور بازاری اور کالا دھندا کرنے والے لوگوں نے مال جمع کر کر کے قیمتیں بے حد بڑھا رکھی تھیں۔ ضروریات کی تمام چیزیں مثلاً ڈالڈا، تیل، اناج وغیرہ کی بے صدقات اور کمیابی پیدا کر دی گئی تھی اور دام بجید بڑھا دیے گئے تھے۔

بیس نکاتی پروگرام کا پہلا نکتہ یہی تھا کہ ضروری اشیا کی قیمتیں کم کی جائیں اور ان کی صحیح پیداوار، حصول اور تقسیم کا انتظام کیا جائے۔

ہم نے دیکھا کہ اس پروگرام کا کتنا زبردست اثر ملک پر پڑا۔ ساری ضرورت کی اشیا آسانی کے ساتھ عوام کو ملنے لگیں اور قیمتوں میں بھاری کمی آ گئی۔ سرکاری تھوک قیمتوں کا اشاریہ جو جولائی ۱۹۷۵ء میں تین سو دس تھا وہ جنوری ۱۹۷۶ء میں دو سو اکیانوے رہ گیا۔ گیہوں کی قیمت میں بھاری کمی ہو گئی۔ جولائی ۱۹۷۵ء میں ہی گیہوں کی قیمت جولائی ۱۹۷۴ء کی بہ نسبت پچاس فی صد کم ہو گئی[۱]

اسی طرح ایمرجنسی کے نفاذ کے چار ہی مہینے بعد یعنی اکتوبر ۱۹۷۵ء میں چاول کی قیمت بارہ فی صد کم ہو گئی، جوار کی بیس فی صد، باجرے کی اٹھارہ فی صد، جوار کی گیارہ سے لے کر ۳۲ فی صد، مونگ پھلی کے تیل کی آٹھ سے اکتیس فی صد، سرسوں کے تیل کی ۲۵ سے ۴۰ فی صد اور بناسپتی گھی کی ۱۲ سے ۲۹ فی صد قیمت کم ہو گئی۔ شکر جو کھلے بازار میں چھ روپے کیلو گرام فروخت ہو رہی تھی وہ کھلے بازار میں ہی چار روپے ستر پیسے کیلو فروخت ہونے لگی[۲] اسی طرح دالوں اور چنے کی قیمتوں میں بھی کمی ہوئی۔

پیداوار میں اضافہ

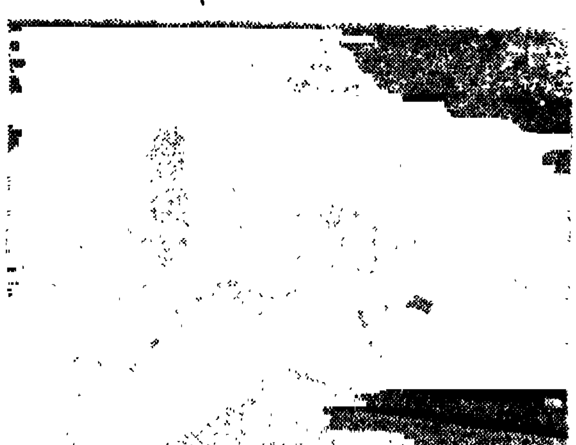
اگر ایک طرف عوام کو چیزیں بہ آسانی اور کم قیمتوں پر دستیاب ہونے لگیں تو دوسری طرف پیداوار میں بھی اضافہ ہونے لگا۔ جولائی۔ ستمبر ۱۹۷۴ء کے مقابلہ میں جولائی۔ ستمبر ۱۹۷۵ء میں بناسپتی، کھاد، المونیم، تانبے، سیسے، اسکوٹر، ڈیزل انجن وغیرہ کی پیداوار میں بیس فی صد کا اضافہ ہوا۔

غذائی پیداوار

غذائی پیداوار ۱۹۷۵ء میں تخمیناً گیارہ کروڑ چالیس لاکھ ٹن ہوئی جو گذشتہ سال یعنی ۱۹۷۴ء سے ایک کروڑ تیس لاکھ ٹن زیادہ تھی[۳]

زرعی زمین کی حد بندی

بیس نکاتی پروگرام کا دوسرا نکتہ زرعی زمین کی حد بندی اور بے زمین لوگوں میں فاضل زمین کی تقسیم تھا۔ بھارت میں بے زمین



بے زمین افراد کو زمین کا الاٹمنٹ۔ (رانی چوراد ٹہری)

کاشتکاروں کی تعداد بہت زیادہ تھی جو دوسروں کی زمین پر مزدوروں کی طرح بہت ہی کم اجرت پر کام کرتے تھے اور اس طرح ان کا استحصال ہو رہا تھا۔ اس پروگرام کے تحت ہزاروں مزدور کاشتکاروں کو فاضل زمین تقسیم کی گئی جس کے سبب وہ بھی زمین کے مالک

---

[۱] روزنامہ نیشنل ہرالڈ مورخہ یکم اگست ۱۹۷۵ء۔

[۲] " " " " ۱۳ اکتوبر ۱۹۷۵ء۔ [۳] روزنامہ نیشنل ہرالڈ مورخہ ۷ دسمبر ۱۹۷۵ء

بن گئے۔ اترپردیش میں ہی اپریل ۱۹۷۶ء تک چھتر ہزار ایکڑ فاضل زمین بے زمین کاشتکاروں میں تقسیم کی گئی۔ ساتھ ہی ساتھ کمزور طبقوں سے تعلق رکھنے والے تقریباً ۱۳ لاکھ خاندانوں کو مکان تعمیر کرنے کے لیے مفت زمین بانٹی گئی[1]

اس طرح پورے ملک میں نومبر ۱۹۷۵ء تک مجموعی طور پر پچاس لاکھ قطعہ زمین ان لوگوں کو الاٹ کی گئی جن کے پاس گھر بنانے کے لیے زمین نہ تھی[2]

اکتوبر ۱۹۷۵ء میں اترپردیش سرکار نے بے زمین کاشتکاروں کی کم سے کم اجرت از سر نو مقرر کی، اور مزدوری کی کم سے کم حد پانچ روپے سے ساڑھے چھ روپے فی کس روزانہ کے حساب سے مقرر کردی۔

اکتوبر ۱۹۷۵ء میں ایک آرڈی نینس کے ذریعہ پابند مزدوری کے رواج کو ختم کر دیا گیا۔ جس سے دیہاتوں میں ہزاروں لاکھوں غریب کسانوں کو صدیوں کی غلامی سے چھٹکارہ حاصل ہوا اور وہ اس قرض سے بری کر دیے گئے۔ جس کے عوض انھیں ایک غلام کی صورت میں کھیتوں پر بلا معاوضہ اس وقت تک کام کرنا پڑتا تھا۔ جبتک کہ وہ اپنا قرض نہ ادا کر دیں جب کہ غریبی کے باعث وہ یہ قرض ادا ہی نہ کر پاتے تھے۔ یہ ایک بڑا ہی منصفانہ اور انقلابی قدم تھا جو حکومت نے اٹھایا۔ شہری زمین کی بھی حد بندی کردی گئی ہے اور فاضل زمین مکان بنانے کے لیے غریبوں اور کمزور طبقے کے لوگوں کو دیے جانے کا بندوبست کیا جا رہا ہے۔

اسمگلروں کی جائداد کی ضبطی

ایمرجنسی کے نفاذ سے قبل اسمگلروں نے ملک میں لوٹ کھسوٹ مچا رکھی تھی۔ حاجی مستان اور سکر نارائن بھاکیہ جیسے لوگوں نے کروڑوں کی مالیت کی ناجائز جائدادیں بنا رکھی تھیں اور ملک کی بیرونی تجارت اور زر مبادلہ کو نقصان پہونچا رہے تھے۔ بیس نکاتی



اسمگلنگ اور ذخیرہ اندوزی کے خلاف سخت کارروائی (علی گڑھ)

پروگرام میں ان کی ناجائز جائیدادوں کو ضبط کرنے کا بندوبست کیا گیا۔ کروڑوں روپے جو ناجائز طور پر اسمگلروں نے جمع کر رکھے وہ حکومت کے ہاتھ لگے اور انھیں ترقیاتی کاموں میں لگایا گیا۔ حکومت نے ایک نئی اسکیم کے تحت از خود ناجائز آمدنی کا انکشاف کرنے والوں کو سزا دینے کے بجائے معافی دینے کا انتظام کیا۔ ۳۱ر جنوری ۱۹۷۶ء تک تقریباً پندرہ سو کروڑ روپے کی ناجائز آمدنی کا انکشاف کیا گیا۔ اس سے حکومت کو ٹیکس کی شکل میں تقریباً ڈھائی سو کروڑ روپے حاصل ہوئے۔

بیرونی زر مبادلہ کی تجارت میں جو بے ایمانی اور بدعنوانی برتی جاتی تھی اس پر بھی کڑی روک لگائی گئی۔ جولائی ۱۹۷۵ء تک جائز طریقوں سے تقریباً تین سو تیرہ کروڑ روپے ملک میں باہر سے بھیجے گئے جبکہ ۱۹۷۴ء کی جولائی میں اسی مدت کے دوران تقریباً دو سو کروڑ روپے بھیجے گئے تھے۔ اس سے ملک کی معشیت اور زر مبادلہ کو فائدہ پہنچا۔

انکم ٹیکس ماری کرنے والوں کے خلاف ملک بھر میں ہزاروں چھاپے مارے گئے۔ اگست ۱۹۷۵ء تک انکم ٹیکس کے

---

[1] روزنامہ نیشنل ہیرالڈ مورخہ ۱۲ اپریل ۱۹۷۵ء

[2] ،، ،، ،، ،، ،، ،،

چھاپوں میں آٹھ کروڑ روپے حاصل ہوئے جبکہ ۱۹۷۴ء میں صرف ڈھائی کروڑ ہی حاصل ہوئے تھے بیس نکاتی پروگرام میں طلباء کی بہبود کے لیے متعدد بروئے کار لائے گئے۔ مثلاً ان کے لیے ہاسٹلوں میں ضروری اشیاء کم قیمت پر فراہم کی گئیں کتابیں کاپیاں کنٹرول قیمت پر مہیا کی گئیں ان کے روزگار کے لیے تربیتی اسکیم چلائی گئی

انکم ٹیکس سے چھوٹ کی حد بڑھا کر آٹھ ہزار روپے کردی گئی جس سے کہ درمیانی طبقے کو بڑی راحت ملی۔ اس طرح قومی زندگی کے ہر شعبے میں بیس نکاتی پروگرام سے ترقی ہوئی ہے۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ ملک میں ضبط و نظم کی ایک فضا قائم ہو گئی اور اپنے حقوق کے ساتھ ساتھ لوگوں کو اپنے فرائض کا بھی احساس ہو گیا۔ اتنے کم عرصے میں بھارت نے جو ترقی کی ہے وہ دنیا میں ایک انوکھی مثال ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جمہوریت اب اپنے صحیح راستہ پر آگئی ہے۔

حال ہی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو بیس نکاتی پروگرام کے سلسلے میں خطاب کرتے ہوئے وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے پانچ مزید نکتوں کا اضافہ فرمایا جو یہ ہیں۔ قومی مستعدی اور صلاحیت، خاندانی منصوبہ بندی، شجرکاری، فلاح اطفال اور شہری نشو و نما٭

بیس نکاتی پروگرام ایک انقلابی پروگرام ہے جس نے ملک کی زندگی میں واقعی ایک تعمیری انقلاب برپا کر دیا لیکن اس پروگرام کو کامیاب بنانے کی ذمہ داری جتنی حکومت پر ہے اس سے کہیں زیادہ اس ملک کے عوام پر ہے۔ خاص طور سے پڑھے لکھے لوگوں کی زیادہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس پروگرام کے فوائد سے عوام کو روشناس کرائیں اور نہ صرف روشناس کرائیں بلکہ پروگرام کی کامیابی کے لیے عوام کا تعاون حاصل کریں۔ یونیورسٹیوں، کالجوں، اور اسکولوں کے طلبا کی توجہ اس طرف ڈالنا چاہیے اور پروگرام کے نفاذ میں ان سے مدد لینا چاہیے۔ ۲ رجون ۱۹۷۶ء سے لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ سوشل ورک کے ایم۔ اے کے طلبا اپنے چھ ہفتے کا فیلڈ ورک (FIELD-WORK) سرکاری محکمے کے تعاون سے فیملی پلاننگ کے سلسلے میں کر رہے ہیں۔ تقریباً چالیس طلبا ہر روز پندرہ اشخاص سے فیملی پلاننگ کے سلسلے میں رابطہ قائم کریں گے۔ اس طرح لکھنؤ میں ۱۴ رجولائی ۱۹۷۶ء تک یہ چالیس طلباء تقریباً ستائیس ہزار لوگوں سے فیملی پلاننگ کے سلسلے میں رابطہ قائم کر لیں گے اور انھیں اس اسکیم کے بارے میں ضروری معلومات بہم پہونچا کر اس پر عمل کرنے کی ترغیب دیں گے۔ علاوہ اس کے نیشنل سروس اسکیم کے ذریعے بھی طلباء کو بیس نکاتی پروگرام میں لگایا جا رہا ہے۔ بیس نکاتی پروگرام ملک کی ترقی کا ضامن ہے۔ ہم سب کو اس کے نفاذ میں ہاتھ بٹانا چاہیے۔

اندرا گاندھی

روشن مینار اندرا گاندھی ہیں
گلشن کی بہار اندرا گاندھی ہیں
آغاز حکومت سے "ایمرجنسی" تک
بھارت کا وقار اندرا گاندھی ہیں

وجیہہ ادیب

٭ نیشنل ہیرالڈ لکھنؤ۔ مورخہ ۳۱ رمئی ۱۹۷۶ء

ایمرجنسی

راجیندر بہادر موج

امرجینسی ہے امرجینسی ہے
یہ جمہوریت کے لیے لازمی ہے
نظام وطن کی حفاظت کی خاطر
ڈسپلن کی تعلیم دی جا رہی ہے
ڈسپلن ہی انسانیت کا ثمر ہے
ڈسپلن بغیر آدمی جانور ہے

جب اہل چمن ہی چمن کو جلائیں
مکیں جب مکاں کی عمارت گرائیں
بچاری اہنسا کے ہنسا سکھائیں
وطن کے نو اسی وطن کو بنائیں
امرجینسی ایسی صورت کا حل ہے
امرجینسی اس لیے آج کل ہے

جو فوج اور پولیس کو اکھائے وہ دشمن
بدیسیوں سے لے اشائے وہ دشمن
کریں ریل اور ڈاک میں گڑبڑی جو
وہ ہیں ملک دشمن ہمارے وہ دشمن
نہ رہ پائیں گے اب یہ دشمن وطن میں
نیا انقلاب آ رہا ہے چمن میں

وزیر اعظم ہند کی ہوشمندی
بگڑتے ہوئے وقت پر کام آئی
بہت سے بھنور حملہ آور تھے لیکن
بچا کر صفائی سے کشتی نکالی
امرجینسی ایک پتوار سمجھو
سفینے کو طوفاں سے پار سمجھو

امرجینسی کا نمایاں اثر ہے
جو بیکار تھا آج وہ کام پر ہے
ہری کھیتیاں، باندھ اور کارخانے
ترقی جدھر دیکھیے جلوہ گر ہے
ابھی دور گو ہوئے منزل ہے لیکن
رواں کارواں سوئے منزل ہے لیکن

وطن کو سنوارو وطن کو بناؤ
گرو کو اٹھاؤ غریبی مٹاؤ
گرانی نے لگی آنچ کو بڑھاؤ
یہ سنکلپ ساکار کر کے دکھاؤ
کڑی محنت ہو موج ارادہ اٹل ہو
جب ہی اپنی منصوبہ بندی سپھل ہو

شادان بارہ بنکوی

جمہور کی عظمت — اندرا گاندھی

وقت کچھ ایسا تھا بھارت میں پریشاں لوگ تھے
اک نظامِ بے عمل سے سخت حیراں لوگ تھے

ایسے نازک دور میں آیا ایمرجنسی نظام
شادمانی کا دیا ہے اہل بھارت کو پیام

چینی گیہوں اور گھی بازار میں ملتا نہ تھا
غمزدہ لوگوں کے دل کا پھول بھی کھلتا نہ تھا

اس کے آتے ہی ہر اک شے خود بخود ملنے لگی
غمزدہ لوگوں کے دل کی بھی کلی کھلنے لگی

اے وزیر اعظم ہے اعلیٰ آپ کا دل اور دماغ
آپ نے فرقہ پرستی کا کیا ہے گل چراغ

آپ نے سرمایہ داروں کو ہلا کر رکھ دیا
لعنت فرقہ پرستی کو مٹا کر رکھ دیا

آپ نے دنیا میں روشن نام باپو کا کیا
جو ادھورا رہ گیا تھا کام وہ پورا کیا

رہبر دنیا کہوں یا رہبر بھارت کہوں
دل یہ کہتا ہے تمھیں جمہور کی عظمت کہوں

جے. ایم. شاہ

ایمرجنسی ـــــ ایک ضرورت

مہاتما گاندھی ایک ایسے ہندستان کی تعمیر کرنا چاہتے تھے جس میں مذہب و ملت کی کوئی تفریق نہ ہو، نہ کوئی چھوٹا ہو اور نہ بڑا۔ ایک ایسا ہندستان جس کے بسنے والوں میں نہ اعلیٰ طبقہ ہو اور نہ ادنیٰ۔ ایک ایسا ہندستان جس میں غریب سے غریب شخص بھی یہ محسوس کر سکے کہ یہ اس کا اپنا ملک ہے جس کی تعمیر میں اس کی آواز کی اہمیت کسی دوسرے سے بھی کم نہیں ہے۔ ایک ایسا ہندستان جس میں چھوت چھات کی لعنت نہ پائی جائے اور ملک کے ہر باشندے کو مساوی حقوق حاصل ہوں۔

چنانچہ آزادی کے بعد جواہر لال نہرو اور اندرا گاندھی نے مہاتما جی کے ان سنہرے خوابوں کو عملی جامہ پہنانے کا عزم کیا۔ لیکن بعض موقع پرست اور سماج دشمن عناصر نے گاندھی جی کے ان سنہرے خوابوں کو ملیامیٹ کرنا چاہا۔ ان رجعت پسند اور قوم دشمن عناصر نے ملک کی آزادی کے لیے زبردست خطرہ پیدا کر دیا تھا۔ باپو کے دست راست بن کر ہندستان کو آزاد کرانے کے بعد پنڈت جواہر لال نہرو ہندستان کے وزیر اعظم منتخب ہوئے۔ انھوں نے بھارت کو اقوام عالم کی برادری میں ایک ممتاز جگہ دلائی۔ اس عظیم رہنما، مدبر، سیاست داں، مفکر ادیب اور دانشور نے دنیا کو بقائے باہم، امن و آشتی کا پیغام ہی نہیں دیا بلکہ فسطائیت نواز اور انتشار پسند طاقتوں کو سر اٹھانے کا موقع ہی نہیں دیا۔

عظیم جواہر لال کی عظیم بیٹی شریمتی اندرا گاندھی نے انتہائی مشکل حالات میں، زبردست بحران اور سخت چیلنجوں کے ماحول میں ملک کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لی۔ اس زمانہ میں فسطائی طاقتوں اور تخریب پسند عناصر کی ریشہ دوانیاں نقطۂ عروج پر پہونچ گئیں تھیں۔ تحریر اور تقریر کی آزادی کا کھلے عام مذاق اڑایا جا رہا تھا۔ ملک میں انتشار اور نراج کی سی کیفیت پیدا ہو رہی تھی۔

ان جمہوریت دشمن عناصر کی فسطائیت پسند ریشہ دوانیاں جمہوری حکومت کے خلاف ایک گہری سازش کی شکل میں رونما ہوئیں۔ ابتدا میں حکومت انتشار پسندوں کی سرگرمیوں کو صبر اور ضبط سے دیکھتی رہی لیکن اسے سماج دشمن عناصر نے کمزوری سے تعبیر کیا۔ پانی دن بہ دن سر سے اونچا ہونے لگا۔ حد یہ ہو گئی کہ جمہوریت کے نام پر جمہوریت کو ختم کر دینے کی کوششیں کی گئیں۔ فوج اور پولیس کو بغاوت پر اکسایا جانے لگا۔ صورت حال اس قدر سنگین ہو گئی کہ ملک کی ایکتا، استحکام اور سالمیت کو ہی خطرہ لاحق ہو گیا۔ واقعہ تو یہ ہے کہ یہ ہمارے ملک کے لیے سخت امتحان کی گھڑی تھی۔

اگر وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی ملک میں ایمرجنسی۔ (ہنگامی حالات) کے اعلان کا بروقت اور برمحل فیصلہ نہ کرتیں تو ملک کی آزادی اور جمہوریت ہی خطرہ میں پڑ گئی ہوتی۔

یہ اقدام صرف آزادی کے استحکام، جمہوریت، اور سیکولرزم کی بقا اور عوام کی خود اعتمادی اور حوصلوں کو

بلند کرنے کے لیے کیا گیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہنگامی حالات کے اعلان نے ملک کو تراج اور انتشار سے بچا لیا۔ عوام نے ہنگامی حالات کے اعلان کا بڑی گرم جوشی سے خیر مقدم کیا کیونکہ اس کی وجہ سے ان کو دن پر دن راحت مل رہی ہے۔ اس کے سبب ملک میں ضبط و نظم کا ایک نیا دور شروع ہو گیا ہے۔

اس ایمرجنسی کے اعلان کی سب سے بڑی دین یہ ہے کہ اس نے اشیائے صرف کی بڑھتی ہوئی قیمتوں کے اژدہے کا سر کچل دیا ہے۔ عوام اطمینان اور راحت کی سانس لے رہے ہیں۔ ہنگامی حالات کے اعلان نے جمہوریت اور ملک کو محض انتشار اور لاقانونیت سے ہی نہیں بچایا۔ بلکہ ترقی پسند اقدامات کو مستحکم بنایا اور ملک کی معیشت میں ایک نئی روح پھونک دی۔

ایمرجنسی کے دوران وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کا اہم قدم ۲۰ نکاتی معاشی پروگرام کا اعلان ہے۔ اس پروگرام میں خاص طور پر سے ملک کے غریب اور دبے کچلے عوام کو محرومیوں اور ناکامیوں سے نجات دلانے کے اقدامات شامل ہیں۔ ۲۰ نکاتی پروگرام کے اعلان کے ساتھ دیش میں ہریجنوں، پس ماندہ اور کمزور طبقوں کی ترقی اور انھیں سماج میں برابری کا درجہ دلانے نیز صدیوں سے ان پر روا رکھے جانے والے ظلم اور جبیرہ دستیوں کا خاتمہ کرنے کے اقدامات کی رفتار تیز کر دی گئی ہے۔

پس ماندہ اور کمزور طبقوں کی فلاح و ترقی کی جانب مختلف اسکیموں کے علاوہ کئی قوانین بھی وضع کیے گئے۔ ایک آرڈی نینس جاری کر کے بے زمین اور ایک ایکڑ تک کے کھاتے دار اور ہریجنوں اور اقوام و قبائل مندرجہ فہرست کے ان لوگوں کو جو کئی پشتوں سے مہاجنوں کے قرض دار چلے آ رہے تھے۔ ان قرضوں سے نجات دلا دی گئی ہے گاندھی جی ہی کی وہ ذات تھی جو تمام عمر ستم زدہ ہریجنوں، پچھڑے ہوئے طبقوں اور اقلیتوں کے مفاد کے لیے لڑتے رہے اور بالآخر انھیں کے لیے اپنی جان کی بھی قربانی دے دی۔ یہ آرڈی نینس گاندھی کے تئیں ایک چھوٹا سا نذرانہ عقیدت تھا۔ بعد میں اس آرڈی نینس کو قانونی شکل دیدی گئی۔ اس کی رو سے تمام بے زمین افراد اور ایک ایکڑ تک جوت رکھنے والے کسان بھی خواہ وہ کسی طبقوں، قوم اور قبیلے سے تعلق رکھتے ہوں مہاجنوں سے چھٹکارا پا گئے ہیں۔

کمزور طبقوں کی معاشی حالت کو بہتر بنانے کے لیے ایک اور اہم قدم پابند مزدوروں کے رواج کو ختم کرنے کے لیے بھی اٹھایا گیا ہے۔ کسی اقرار نامہ، معاہدے یا رواج کے مطابق مزدوروں، ان کے خاندان والوں یا ان کی آئندہ نسلوں کو دھمکی یا لالچ کے ذریعہ کام کرنے کے لیے پابند بنانے کا طریقہ بھی قانوناً ختم کر دیا گیا ہے۔ اس رواج کے خاتمہ سے بلاشبہ ایک نئے دور کا آغاز ہوا ہے۔

مختصر یہ کہ ان اقدامات سے پسماندہ طبقوں کا مستقبل نہ صرف روشن اور تابناک ہو گیا ہے۔ بلکہ ملک کی سماجی اور اقتصادی، زندگی میں ایک نمایاں کایا پلٹ ہو گئی ہے۔

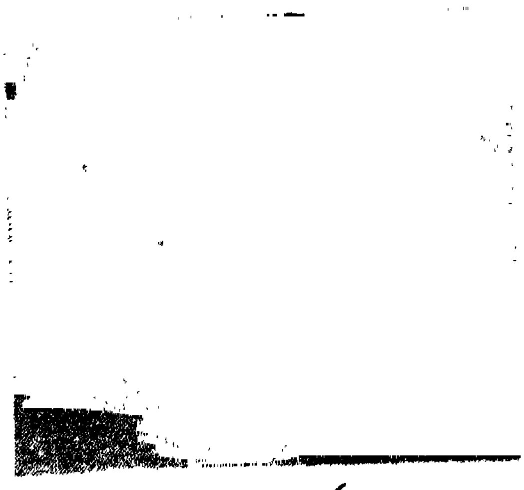
ایمرجنسی کے دوران جوت حد بندی قانون کا ذکر بھی ضروری ہے۔ اس قانون میں بعض ضروری ترمیمیں کر کے نہ صرف جوت حد بندی کم کر دی گئی ہے بلکہ اس پر عمل درآمد کے لیے زیادہ موثر قواعد مرتب کیے گئے ہیں۔ جوت حد بندی قانون کے تحت، فاضل قرار دی جانے والی آراضیات کی بے زمین کھیت مزدوروں اور دیہی دستکار خاندانوں میں جلد تقسیم اور اس کی دیکھ بھال کے لیے مناسب بندوبست کیا گیا ہے اس سے نہ صرف تقسیم کے کام کی رفتار بڑھ گئی ہے بلکہ فاضل زمینوں کی منصفانہ تقسیم بھی ہو رہی ہے اور شکایتوں اور بے قاعدگیوں کا موقع ہی پر ازالہ بھی ہو جاتا ہے۔ موجودہ پروگرام کے مطابق فاضل زمینوں کی تقسیم کا کام قریب مکمل ہو چکا ہے۔

اس کے علاوہ جو دیگر سہولتیں عوام کو دی گئی ہیں وہ ہیں کمزور طبقوں کو مفت قانونی سہولتیں، غیر قانونی قبضوں کو

ختم کرنے کے لیے قانونی بندوبست، بے زمین کھیت مزدوروں اور دیہی دستکار خاندانوں کو مکان بنانے کے لیے زمین کا الاٹمنٹ قیمتوں پر کنٹرول اور ضروری اشیا کی مناسب تقسیم جنتا دوکانوں کی نئی اسکیم، اسمگلنگ، ذخیرہ بازی، چور بازاری اور ٹیکس مازی کی روک تھام کے لیے اقدامات، مختلف کارخانوں میں اپرنٹسوں کے لیے نئی جگہیں محفوظ کرنا اور مرکز در طبقے کے درجہ اوّل سے درجہ ہشتم تک کے طالب علموں کو کورس کی مفت کتابوں کی فراہمی وغیرہ وغیرہ۔

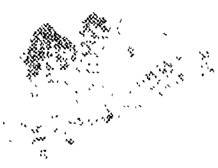
جہاں تک ان اقدامات میں کامیابی کا تعلق ہے اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ مکانات کی تعمیر کے لیے بیشتر بے گھر مزدوروں اور دیہی دستکار خاندانوں کو زمین دی جا چکی ہے۔ کھیت مزدوروں کی کم سے کم اجرت مقرر کر دی گئی ہے اسمگلنگ۔ ذخیرہ اندوزی، چور بازاری اور ٹیکس ماری کے خلاف سخت کارروائی کے نتیجہ میں گرفتاریوں کے علاوہ کروڑوں روپیہ کی مالیت کا سامان ضبط کیا جا چکا ہے۔

ملک میں ضبط و نظم کا ایک نیا دور شروع ہو گیا ہے۔ ہنگامی حالات کے اعلان سے انتظامیہ چابق دچوبند ہو گئی



چوری اور ڈکیتی کے خلاف پولیس کا سخت پہرہ

ہے اور کھیتوں، کارخانوں اور صنعتی اداروں میں پیداوار برابر بڑھ رہی ہے۔ اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ہلڑبازی کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ غرضیکہ ہر شعبۂ زندگی میں کام ہی کام ہو رہا ہے۔ اس طرح ایمرجنسی کے سبب ملک کی آزادی، جمہوریت سیکولرزم اور سالمیت کو مستحکم کرنے کا سنہرا موقع ملا ہے۔ وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی کا ۲۰ نکاتی معاشی پروگرام ملک کی خوشحالی کا ضامن ہے۔ جس کی بدولت ملک میں ایک سماجی انقلاب تیزی سے آ رہا ہے۔ ہمارا یہ فریضہ ہے کہ وزیراعظم اندرا گاندھی کے پروگرام کو کامیاب بنانے کے لیے اپنا پورا تعاون دیں۔ کیونکہ اسی میں ہماری، آپ کی اور سارے ملک کی بھلائی ہے



یہ ہمارے ملک کی خوش بختی ہے کہ اس کو ہماری محبوب وزیراعظم شریمتی اندرا گاندھی کی قیادت نصیب ہوئی ہے۔ گزشتہ چند برسوں میں انھوں نے ملک کی ترقی، خوشحالی اور استحکام کے لیے متعدد ایسے انقلابی فیصلے کیے ہیں جن کی وجہ سے وہ ایک تاریخ ساز شخصیت بن کر سامنے ابھر آئی ہیں۔ انھوں نے عوام سے جو کہا وہ کر کے دکھا دیا ہے۔ ملک میں ایمرجنسی کا اعلان بھی ایک ایسا تاریخی اور جرأت مندانہ فیصلہ ہے جس نے ملک دشمن عناصر کی ناپاک سازشوں کا پردہ چاک کر دیا ہے۔ ملک کو آئے دن کی تحریکوں، معاشی پریشانیوں اور روزافزوں مہنگائی سے نجات مل گئی ہے۔ اسی لیے عوام نے اس ایمرجنسی کا نہ صرف خندہ دلی سے خیر مقدم کیا ہے بلکہ اس کو ملک کی ترقی کے لیے ایک نعمت قرار دیا ہے۔

★

شہرت نکاروی

امن و آشتی کی روشنی

(محترمہ وزیر اعظم ہند کے بیس نکاتی پروگرام کے نفاذ کے بعد جو ہمہ جہتی اثرات ہیں ان سے متاثر ہو کر)

گل کھلے غنچے ہنسے آئی چمن میں کیا بہار
وجد میں ہر سو خراماں ہے نسیم مشکبار
دیدنی ہیں بیل بوٹوں کی یہ کیا رعنائیاں
لے رہی ہیں گلستاں میں شاخ گل انگڑائیاں
اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا نظام گلستاں
پھول تو پھر پھول ہیں، ہے پتہ پتہ شادماں
پی رہی ہے زندگی ہر سو سبوئے آسودگی
ہر طرف آتی نظر ہے زندگی ہی زندگی
شہر ہو قصبہ ہو قریہ ہو کہ صوبہ ہو کوئی
ہر جگہ پھیلی ہے امن و آشتی کی روشنی
بند اور ہڑتال کی ہنگامہ خیزی رک گئی
سیل بد نظمی کی دھاروں کی وہ تیزی رک گئی
چور بازاری و اسمگلنگ کا دھندھا رک گیا
ہر ذخیرہ باز کا سر خود بخود اب جھک گیا
آج مزدوروں کے ہر طبقہ میں اطمینان ہے
ملک کا ہر نظم اک نظم عظیم الشان ہے
خوردنی چیزوں کے داموں میں گراوٹ آگئی
تھوک بیوپاری کے پیروں میں تھکاوٹ آگئی
ملک سے اب ہو گئی ہیں دور بدعنوانیاں
وقت پر سب کام اب ہونے لگے ہیں بے گماں
ملک کی تعمیر میں یہ بیس راہیں کیا کھلیں
مسئلے سب حل ہوئے دشواریاں آساں ہوئیں
گر وزیر اعظم نہ لیتیں عزم و ہشیاری سے کام
ملک میں پیدا نہ ہوتا اس طرح بہتر نظام

ذکی پرواز

سفیر امن - اندرا گاندھی

اے اندرا اے ہند کی جانباز و جاں نثار
گاندھی کی جانشین اے نہرو کی یادگار
بخشا ہے تو نے ہند کو رتبہ فلک وقار
تیرے کرم سے گلشن بھارت میں ہے بہار
گمراہ کن بساط سیاست الٹ گئی
بڑھتی ہوئی وہ ظلم کی آندھی پلٹ گئی
حرف غلط کی طرح مٹے فتنہ و فساد
آئے گا کام بغض کسی کے نہ اب عناد
باد سموم تھم گئی مہکے گل مراد
مظلوموں کو اماں ملی، مفلس ہوئے ہیں شاد
ٹھوکر سے تیری جور کی بنیاد اکھڑ گئی
اور ہاتھوں سے بنائے مساوات پڑ گئی
ہیئت جو بگڑی ملک کی تو نے درست کی
مضبوط اقتدار پہ اپنی گرفت کی
پیش آئی احتیاج جو اقدام سخت کی
بروقت باگ تھام لی رہوار وقت کی
ہر مرحلے کو طے کیا پائے ثبات سے
پرچم وطن کا اونچا ہو تیرے ہی ہاتھ سے
اے میر کاروان وطن تجھ کو گام گام
دل سے دعائیں دیتے ہیں سب ملک کے عوام
سر فیصلوں پہ تیرے جھکے ہیں بہ احترام
کہتے ہیں تیری طرز جہاں بانی کو سلام
عمر دراز دے خدا اس دار فانی میں
لگ جائے اپنی عمر تیری زندگانی میں

احمد جمال پاشا

کایاپلٹ

(ڈرامہ)

وقت :- ۴۵ منٹ
مقام :- ایک ہندستانی گاؤں
کردار :- مہاجن
۲- منیم
۳- پرانا زمیندار
۴- دکھیا
۵- بھکیا
۶- ڈگی پیٹنے والا
۷- انگنو
۸- مختلف آوازیں

مہاجن —— ہمارے کھیت آج کیوں نہیں جوتے گئے —— ؟
منیم جی ! پانی برس کر کھل چکا ہے ۔ اس سے اچھا موقع کم خرک آئے گا —— ؟

منیم جی —— مہاراج بٹائی والے نہیں مل رہے ہیں —— !

مہاجن —— (غصّہ کی آواز میں) نہ ملیں مگر مزدور تو لا سکتے تھے ۔

منیم جی —— مہاراج مزدوروں کے تو بڑے دماغ ہوئے ہیں ۔

مہاجن —— ہوں ...... ! ہمارے ٹکڑوں پر پلنے والے آج ہم کو دماغ دکھا رہے ہیں ۔ ہوں ..... !
منیم جی ...... !

منیم جی —— ہجور !

مہاجن —— "دکھیا کیوں کھیت جوتنے نہیں آیا —— "

منیم جی —— ہجور اسے اپنے لڑکے کا گونا لے کر کل سندگاؤں جانا ہے ۔ اسی کی تیاری میں لگا ہے ۔

مہاجن —— دیکھو منیم جی ! آج ہم نے زندگی میں پہلی بار اسے ایک بہت اچھا نیا جوتا پہنے دیکھا تھا تو آج رات کو جس طرح بھی ہو تم اس کا ایک جوتا غائب کر دو ۔

منیم جی —— جوتا غائب ہو جائے گا سرکار !

مہاجن —— اور وہ بھکیا جو ہے نا ؟

منیم جی —— جانتا ہوں سرکار !

مہاجن —— تم اس کا ایک بیل رات کو چپکے سے کھلوا کر ہماری سسرال کے گاؤں پہنچوا دو ——

منیم جی —— پہنچوا دوں گا سرکار —— !

مہاجن —— اور صبح ہم کو یاد بھی دلا دینا —— !

دوسرا منظر

(مرغ کی آواز مندر کی گھنٹیاں)

منیم جی —— (آواز دیتے ہوئے) مہاراج کی جے !

مہاجن —— (دروازہ کھولنے کی آواز) ایک بجے یا دونوں بجے ۔

منیم جی —— دونوں قلعے فتح کر لیے —— مگر آپ کہاں چل دیے —— ؟

مہاجن —— دکھیا کے دکھ سکھ میں ساتھ دینے ۔

منیم جی —— (ہنستے ہوئے) مہاراج کی جے ہو ! جے ہو !

(قدموں کی چاپ)

دکھیا ——— مہاراج آپ ؟

مہاجن ——— ہاں ! مگر ہم تمھاری آنکھ میں آنسو کیسے دیکھ رہے ہیں ——— ؟ کیوں رو رہے ہو ؟ بولو !

دکھیا ——— (روتے ہوئے) مہاراج میں لٹ گیا ! مجھے اپنے لڑکے کا گونا لیکر آج نند گاؤں جانا تھا — !

مہاجن ——— ضرور جاؤ ! میں بھی چلوں ؟

دکھیا ——— ایسے ہمارے بھاگ کہاں ؟ پرسوں رات میرا نیا جوتا کسی نے چرا لیا ——— اب میں گونا لے کر کیسے جاؤں گا ——— ارے میں تو کہیں کا نہیں رہا ——— (رونے کی آواز)

مہاجن ——— بس اتنی سی بات، چلو جوتا میں تمھیں دوں گا۔

دکھیا ——— مہاراج مگر . . . . .

مہاجن ——— اگر نہ مگر۔ آدمی آدمی کے کام آتا ہے — آج ہم تمھارے دکھ درد میں شریک ہوں گے تو کل تم ہمارے میں۔ ہے نا یہ بات ؟ اسی کا نام دنیا ہے۔

(تیز تیز چلنے کی آوازیں)

مہاجن ——— منیم جی !

منیم جی ——— جی مہاراج !

مہاجن ——— دیکھو دیوار پردہ جو، جوتے کی نئی جوڑی لٹکی ہے دے آؤ ——— تیرتھ یاترا پر جانے کے لیے ہم نے رکھی تھی مگر دوسرے کے وقت پر کام آنے سے بڑی یاترا کون ہو سکتی ہے۔

دکھیا ——— مہاراج آپ بڑے دیالو ہیں۔ بھگوان آپ کو سدا سکھی رکھے۔

مہاجن ——— ارے پہنو ——— ! دونوں پہنو ! ہاں ! ٹھیک آ گئے دونوں — !

دکھیا ——— مہاراج ! یہ تو بالکل ٹھیک ہیں ——— پر میں اس کے دام کہاں سے ادا کروں گا۔

مہاجن ——— (ہنستے ہوئے) دیکھو بھئی اب کی فصل پر تم میرے کھیت جوت، بو، کاٹ دو ——— دام بھی ادا ہو جائیں گے ——— بولو

دکھیا ——— مہاراج مگر جوتا پیٹ تھوڑی بھر سکتا ہے۔

مہاجن ——— پیٹ تو ہم جوتے ہی سے بھرتے ہیں خیر ایک وقت چینا بھی مل جایا کرے گا

دکھیا ——— منظور۔ جو مرجی سرکار کی۔

مہاجن ——— جاؤ اب ٹھاٹ سے گونا لے کر۔

دکھیا ——— پائے لاگی !

مہاجن ——— خوش رہو۔

منیم جی ——— بجو ربھکیا آیا ہے۔

مہاجن ——— بلاؤ۔

بھکیا ——— (چلا چلا کر روتے ہوئے) ہو ہو ہو ! مہاراج میں تو لٹ گیا ! ارے اب میں کا کروں ! کوئی میرا بیل کھول لے گیا ——— ہو ہو ہو !

مہاجن ——— تسلی دیتے ہوئے ——— تو یہی ہو سکتا ہے کہ ہم اپنا ایک بیل تمھیں دے دیں۔

بھکیا ——— (حیرت سے) سچ ! کیسے ؟

مہاجن ——— ایسے کہ بھکیا ہم تمھارے آنسو نہیں دیکھ سکتے۔

بھکیا ——— مہاراج آپ نے بھی دیا کی حد کر دی۔

مہاجن ——— منیم جی — وہ ہمارا جو کونے میں بڑھیا والا بیل بندھا ہے نا، کھول کے بھکیا کو دے دو۔

بھکیا ——— سرکار بیل تو دے رہے ہیں پر اس کے دام ادا کہاں سے کروں گا ——— پھوٹی کوڑی تو گانٹھ میں ہے نا ہیں !

مہاجن ——— (ہنستے ہوئے) نہیں ہے تو کون سی نئی بات ہو جہاں تم لوگوں کا ہمیشہ پورا کیا، اب بھی کروں گا ——— بس بیل تمہارا مرے یا جیے اس کے بدلے تم دس فصلیں ہماری جوت،

بو اور کاٹ دینا ــــــ! بو بو منظور!

بھکیا ــــــ منظور! پر ایک اتنے دان کھائیں گے کہاں سے؟

مہاجن ــــــ خیر ایک وقت جھینا دے دیا کریں گے۔

بھکیا ــــــ منظور ــــ جو مرضی سرکار کی۔

مہاجن ــــــ جاؤ اب ٹھاٹ سے بیل لے جاؤ۔

بھکیا ــــــ پاے لاگی ــــ!

مہاجن ــــــ خوش رہو۔

منیم ــــــ مہاراج پرانے جمیندار صاحب آئے ہیں۔

مہاجن ــــــ بلاؤ۔ بلاؤ؟

پرانا زمیندار ۔ رام رام۔

مہاجن ــــــ جے رام جی کی۔ کہو کیسے پدھارے؟

پرانا زمیندار ۔ جی یوں ہی چلا آیا۔ کیا ہو رہا تھا ــــ؟

مہاجن ــــــ ہو کیا رہا تھا ــــــ؟ معلوم ہوا لوگ کھیت جوتنے ـ ک کو نہیں مل رہے ہیں۔ دو کو تو نپٹ کر دیا میں نے ــــ ایک کو ایک جوڑ جوتے کے بدلے ایک فصل جوتنا، بونا، کاٹنا ہوگا اور دوسرے کو ایک بیل کے بدلے دس فصلیں۔

پرانا زمیندار ــــ (ہنستے ہوئے) جوتے اور بیل بھی تو انھیں کے ہوں گے۔

مہاجن ــــــ (ہنستے ہوئے) وہی میاں کی جوتی میاں کے سر!

پرانا زمیندار گر یہ اندھیر ہے کہ ایک جوڑ جوتے اور ایک بیل پر صرف ایک اور دس فصلیں جتوا لوگے۔

مہاجن ــــــ کیسے؟

پرانا زمیندار ۔ وہ ایسے کہ یہی دکھیا کا دادا مجھ سے دس روپے بیاج پر لے گیا تھا۔ ایک تو کاٹ کے ۹ دیے تھے ــــ پھر اس کے دادا نے بھرے، باپ نے بھرے اور خود ۹ سال اس نے بھرے تھے۔

مہاجن ــــــ ہائے ہائے پھر میں تو لٹ گیا۔

پرانا زمیندار ــــ اور یہ بھکیا اس کے پر دادا نے کھیت رہن کھا تھا۔ اب یہ بھکیا اس کھیت کو چھڑا پایا ہے ــــ وہ بھی پنچایت نے اسے دلوا دیا۔

مہاجن ــــــ کیوں نہیں آپ نے تو ہمیشہ حکومت کی ہے ــ سب داؤں گھات جانتے ہیں۔

پرانا زمیندار ــ جب نہ سمجھ میں آیا کرے تو پوچھ لیا کرو۔

مہاجن ــــــ یہ شور کیسا ہو رہا ہے؟

پرانا زمیندار ــ ڈگی پٹ رہی ہے ــــــــ کوئی اور نئی مصیبت ہوگی۔ اس سرکار نے تو جینا دوبھر کر دیا ہے۔

مہاجن ــــــ (غصے میں) ہوگا کیا ــــــ؟ پھر اس کے پیٹ میں مزدوروں کا درد اٹھا ہوگا ــــــ منیم جی! جاؤ سن کر آؤ یہ کیا بک رہا ہے!

منیم جی ــــــ ابھی آیا ــــ (بھاگنے کی آواز)

(ڈگی پیٹنے کی آواز تیز ہوتی جاتی ہے۔)

اعلانچی ــــــ حکم پرجا کی سرکار کا ــــ ہر مزدور کسان اور کاریگر بھائی کو سوچت کیا جاتا ہے کہ وہ کسی بھی حالت میں کسی مہاجن، بڑے پر روپیہ دینے والے، پرانے زمیندار یا کسی بھی جنون سے کوئی پیسہ ادھار نہ لیں۔

(ڈگی کی تیز آواز) حکم پرجا کی سرکار کا۔ کسان، مزدور بھائیو! ــــــ اگر تم پر یا تمھارے پرکھوں پر کسی مہاجن کا کوئی قرضہ ہے ــــــ تو سرکار تمھاری بھلائی اور ترقی کے لیے اُسے معاف کرتی ہے۔ کوئی شخص بھی کسی قرضے یا چیز کے بدلے تم سے زبردستی کام نہیں لے سکتا ــــ اگر وہ ایسا

کھنے کی کوشش کرے گا تو اسے سخت سزا دی جائے گی —— سرکار نے کسانوں مزدوروں کے لیے بینک کھول دیے ہیں —— جو تمہیں بیج، کھاد، بیل اور کھیتی و کاریگری کا سامان خریدنے کے لیے قرضہ دے گا۔

(ڈگی کی آواز تیز ہوتی جاتی ہے)

حکم پرجا کی سرکار کا —— اب دیہات میں کوئی بھائی بے روزگار نہ رہے گا —— لوہاری، بڑھئی گیری اور دوسرے گھریلو دھندے سکھا کر سرکار سب کو اپنے اپنے پیروں پر کھڑا کر دے گی۔

(ڈگی کی آواز تیز ہوتی جاتی ہے)

حکم پرجا کی سرکار کا —— جس بھائی پر مہاجن کا جو بھی قرضہ ہو اس کے بدلے اب وہ اس سے کوئی بے گار نہیں لے سکتا —— قرضے سب معاف کیے جاتے ہیں —— اپنے اپنے قرضوں کی اطلاع پنچایت کو دے دیں اور سرکار کے حکم کے خلاف کسان مزدور بھائیوں کو جو دبانے کی کوشش کرے اس کی اطلاع پولیس تھانے اور قریبی حاکم کو فوراً دیں۔

(ڈگی کی آواز تیز ہوتی جاتی ہے)

حکم پرجا کی سرکار کا جس زمین کو جو کسان جوتے گا وہ اس کی ہوگی، اس کی فصل اس کی ہوگی —— کسان مزدور بھائیو بولو۔

پردھان منتری اندرا گاندھی کی جے ہو!

زور سے بولو —— فلک شگاف نعرے۔

بیس نکاتی معاشی پروگرام زندہ باد، کسان مزدور زندہ باد، جے جوان جے کسان۔

(تیسرا منظر)

منیم جی —— "سرکار گجب ہونے گیو ——"

مہاجن —— بولتا کیوں نہیں —— ؟

پہلا زمیندار —— بتا تو ڈگی والا کیا اعلان کر رہا تھا؟

مہاجن —— (روتے ہوئے) ارے اب بتانے کو کیا رہ گیا ہے۔

پرانا زمیندار —— ہم بھی تو سنیں۔

منیم جی —— سرکار نے کسان مزدوروں کے سب قرضے معاف کر دیے۔

مہاجن —— (چھاتی پیٹ کر) ہائے غضب۔

منیم جی —— اب کسان مزدور سے کوئی پابند محنت نہیں لے سکتا۔

پرانا زمیندار —— تو اتنے بڑے بڑے ریلوں لمبے کھیت کیا سرکار جوتے گی۔

منیم جی —— اب پرجا جوتے گی —— جس کھیت کو جو آدمی جوتے گا وہ اس کا ہو جائے گا۔

مہاجن —— اور بٹائی پہ

منیم —— بٹائی کا کام سرکار نے ختم کر دیا۔

پرانا زمیندار —— ہمارے کھیتوں کا کیا ہوگا؟

منیم —— جوت حد کے باہر سارے کھیت بے زمینوں اور مزدوروں کو مل جائیں گے۔

مہاجن —— ہم لڑیں گے۔

منیم —— سرکار سے کوئی لڑ سکتا ہے —— ؟ اور لڑے گا کیا —— ؟ کسان مزدور کو ہر طرح کا قرضہ تو اب بینک سے مل جایا کرے گا بیج لو، کھاد لو، ہل لو، بیل لو، شادی غمی کا قرضہ لو۔

مہاجن —— (روتے ہوئے) اب ہمارے پاس کون پھٹکے گا۔

پرانا زمیندار۔ ہم پر دنیا ہنسے گی۔

(دُنّد کی کھٹکھٹانے کی آواز)

مہاجن —— دیکھو منیم کون ہے —— ؟

منیم —— آؤ انگنو بھیا —— کیا ہوا ؟

انگنو —— ہائے بنیا غضب ہو گیا۔ کھیتوں پر جتنے مزدور آئے تھے سب کے سب چلے گئے۔

مہاجن —— (غصے میں) کیسے چلے گئے۔

انگنو —— اس لیے کہ اب وہ صرف اپنے کھیت جوتیں گے۔

مہاجن —— اُن نکھٹوؤں کے پاس کھیت ہی کہاں ہیں جو وہ جوتیں گے —— ؟

انگنو —— سرکار، یہ کھیت مزدوروں کو رہنے کے لیے زمین اور کھیتی کے لیے کھیت دے رہی ہے۔

مہاجن —— (مہاجن بہت غصے میں) ارے سرکار زمینیں لٹا دے رہی ہے —— !

انگنو —— زمینیں ہی نہیں کھیتی میں کام آنے والا کل سامان بھی سرکار انہیں دے رہی ہے۔

پرانا زمیندار۔ (چلا کر) لالہ بھاگو گاؤں چھوڑ کر کلجگ آ گیا کلجگ —— !

مہاجن —— دیکھو کون پکار رہا ہے —— ؟ (وقفہ)

منیم —— وہ حضور دکھیا کا لڑکا —— آپ کے جوتے واپس کر گیا ہے۔

مہاجن —— کیا کہا —— ؟ جوتے واپس کر گیا۔ کیسے واپس کر گیا۔ کیا لڑکے کا گونا لینے ننگے پاؤں جائے گا۔

منیم —— لڑکا بتا رہا تھا کہ تھوڑے سے اناج کے بدلے گھوروداس نے اُسے جوتے کی نئی جوڑی دے دی ہے۔

مہاجن —— (غصہ میں) چمار کے بچے کی یہ ہمت۔

پرانا زمیندار —— سرکار نے ذات پات کا بھید بھاؤ بھی اٹھا دیا ہے —— اب ہم چمار کو چمار تک نہیں کہہ سکتے۔

مہاجن —— اور اگر کہہ دیں تو ——

پرانا زمیندار —— تو جس کو کہا اس سے معافی مانگو، اور اگر وہ نہ معاف کرے تو جیل کی ہوا کھاؤ۔

مہاجن —— پھر کوئی پکار رہا ہے۔ آج کس کا منھ دیکھ کر اٹھا تھا —— ہر خبر بری سنائی دے رہی ہے۔

منیم —— جی وہ بھیکو نے بھی بیل واپس کر دیا۔

مہاجن —— تو بھیکو بھی ہمارے کھیت نہیں جوتے گا ——

منیم —— بھیکو تو بہت بڑا آدمی ہو گیا۔

مہاجن —— بھیکو . . . . اور بڑا آدمی ؟ کیا بک رہے ہو ؟

منیم —— گرام پنچایت نے اسے اپنا نیا پنچ چن لیا ہے۔ گاؤں میں اس خوشی میں چوپال پر بڑا جماؤ ہے۔

مہاجن —— (چلا کر) کیا سرکار کایا پلٹ کر کے دم لے گی۔

پرانا زمیندار کایا پلٹ تو کر دی۔

منیم —— سرکار غضب ہو گیا۔

مہاجن —— کوئی غضب باقی رہ گیا تھا کیا۔ ؟

منیم —— نند گاؤں میں بھیکو کے کسی گھر والے نے بھیکو کا بیل دیکھ لیا —— معاملہ رپوٹا پائی کا ہو گیا ہے۔

مہاجن —— بھیکو کا بیل کہاں ہے ؟

منیم —— سنا ہے پنچایت کے پاس ہے۔ اب اس کی پیشی ہے۔

مہاجن —— تو کیا ہم کو جانا ہو گا۔

(بہت سی آوازیں) مہاجن چور ہے۔

"مہاجن بیل چور !"

"چور کے گھر کی تلاشی ہو گی ! "

(باقی صفحہ پر)

وحشت سیتاپوری

خاموش انقلاب

زمیں کے ذرّے ستاروں سے ہم کلام ہوئے
جو پستیوں میں رہے صاحبِ مقام ہوئے
وہ رند تنگ تھی جن پر فضائے میخانہ
وہ میرِ میکدہ بن کر شریکِ جام ہوئے
حقیقتوں کی نئی صبح مسکرائی اُدھر
روایتوں کے اندھیرے اِدھر تمام ہوئے
ہوائے جبر سے اس طرح انتقام لیا
چراغِ صبح جو تھے وہ چراغِ شام ہوئے
جو فصلِ گل میں بھی ہنسنے کو جرم کہتے تھے
وہ دَور آیا وہی پھول شاد کام ہوئے
تمام دنیا نے دیوانگی کہا جن کو
خود اپنے گھر میں تماشے وہ صبح و شام ہوئے
جنوں مزاج تشدد سے ہم کنار ہوا
یہ انقلاب شکاری ہی زیرِ دام ہوئے
ہوا عروج کچھ ایسا جنوں پرستی کا
نہ جانے کتنے ہی دیوانگی کے نام ہوئے
طریقِ عشق کو جن سے ملی ہے رعنائی
وہ کارنامے بانداز احترام ہوئے
جو اپنے گھر میں بھی لگتے تھے اجنبی جیسے
غریبِ شہر وہ مقبولِ خاص و عام ہوئے
گھٹی گھٹی سی فضاؤں میں زندگی دوڑی
سکوں کی سانس ملی شادماں عوام ہوئے
ہم اعتماد قیادت پہ اس کی کرتے ہیں
کہ جس کے دَور میں فتنے سبھی تمام ہوئے

فرحت قادری

خوشگوار تبدیلی

دشت میں آبلہ پا ہو جیسے!
زندگی کوئی سزا ہو جیسے
دور تک کوئی شناسا ہی نہ تھا
یہ جہاں دشتِ بلا ہو جیسے
ہر بشر لگتا تھا تنہا تنہا
آپ ہی اپنا خدا ہو جیسے
لب پہ ہر موجِ تبسم زخمی
آدمی برگِ حنا ہو جیسے
چلتے چلتے کسی صحرا کی طرف
قافلہ رک سا گیا ہو جیسے
ظلمتِ شب سے اُجالے پھوٹے
معجزہ کوئی ہوا ہو جیسے
شمعِ احساس کی لَو تیز ہوئی
تیشہ بر دار اُٹھا ہو جیسے
نبضِ افکار نے لی انگڑائی
قلبِ گیتی کی صدا ہو جیسے
دھوپ میں ابر کا ٹکڑا سر پر
دشت میں بادِ صبا ہو جیسے
صبحِ امید کی ہلکی سی کرن
کسی بچے کی دعا ہو جیسے

ادارہ

۲۰ نکاتی معاشی پروگرام

اترپردیش کی سرگرمیاں اور کامیابیاں

وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کے اعلان کردہ نئے معاشی پروگرام کو بروئے کار لانے کے لیے ہر سطح پر بھرپور کوششیں کی جا رہی ہیں۔ اس پروگرام کے تحت ایک نئی پالیسی وضع کی گئی ہے جس کا مقصد سماجی اور معاشی انصاف کا بندوبست کرنا ہے۔ چنانچہ غریبوں اور دیگر کمزور طبقوں کے حالات کو بہتر بنانے اور عام آدمی کو راحت پہنچانے کے کام کو سب سے اولیت دی گئی ہے۔

اس پروگرام کی رفتار ترقی کو تیز تر کرنے کی غرض سے ایک ریاستی کمیٹی قائم کی گئی ہے۔ اس طرح ریاست کے تقریباً ہر ضلع میں بھی ضلعی سطح کی کمیٹیاں قائم کی جا چکی ہے۔

ملک کی سب سے بڑی ریاست ہونے کی حیثیت سے اترپردیش نے اس پروگرام کو مستعدی اور ذمہ داری کے ساتھ شروع کیا ہے۔ اس ریاست نے غریبوں اور مراعات سے محروم افراد کی مدد کرنے کے لیے اہم اقدامات کیے ہیں۔ اس سلسلہ میں قیمتوں کو ایک سطح پر برقرار رکھنے، قیمتوں پر کنٹرول، ضروری اشیاء فراہم کرنے، زمین حد بندی قوانین کو نافذ کرنے، دیہی قرضوں کو بیباق کرنے، دیہی اور شہری علاقوں کی زمین کو سماجی مقاصد کے لیے استعمال کرنے، آبپاشی اور بجلی کی سہولتیں مہیا کرنے، ہریجنوں کو مکانات کی تعمیر کے لیے زمین تقسیم کرنے اور کمزور نیز قبائلی افراد کو راحت پہنچانے کے لیے موثر اقدامات کیے گئے ہیں۔ طالب علموں کو غلہ، ضروری اشیاء، درسی کتابیں اور کاپیاں کنٹرول شرحوں پر فراہم کی جا رہی ہیں۔ طالب علموں کو کتب بینکوں اور لینڈنگ لائبریریوں کے توسط سے درسی کتابیں مہیا کی جا رہی ہیں

قیمتیں کم کرنے کے لیے اقدامات

غلہ اور دیگر ضروری اشیاء کی قیمتیں کم کرنے اور عوام کو کافی مقدار میں ان کی یقینی فراہمی کا بندوبست کرنے کے لیے متعدد اقدامات کیے گئے ہیں۔ اترپردیش ضروری اشیاء آرڈر ۱۹۷۵ء کے تحت ۲۶ ضروری اشیاء کی فروخت کو منتخب کیا گیا ہے اور ہر تھوک اور خوردہ بیوپاری کے لیے اسٹاک کی صورت حال اور ضروری اشیاء کی قیمتیں ظاہر کرنا ضروری قرار دے دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ان اشیاء کی فروخت قرار دے دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ وہ ان اشیاء کی فروخت سے گریز نہیں کر سکتا ہے۔ بیوپاری کو اس قیمت سے زیادہ وصول کرنے کا اختیار نہیں ہوگا جو حکومت یا کارخانہ دار یا فراہم کنندہ نے مقرر کی ہے۔ ان احکامات کے نتیجہ میں گوشت، مچھلی، انڈے، مٹھائیوں، ترکاریوں کی قیمتیں کم ہوئی ہیں اور کپڑوں کی سلائی کی شرحوں میں بھی ۵ سے ۲۵ فیصد تک کی کمی ہوئی ہے۔

قیمتوں کے رجحان پر نظر رکھنے اور دکانوں کی باقاعدہ جانچ کا بندوبست کرنے کے لیے ہر شہر میں غیر سرکاری کمیٹیاں قائم کی جا رہی ہیں۔ صدر مقام پر ایک نگراں شعبہ قیمتوں کے رجحان اور ضروری اشیاء کی دستیابی پر نظر رکھتا ہے۔

ریاست کے مختلف حصّوں میں سرگرم کار ۱۹۲ منڈیوں سے غلّہ کے بارے میں پابندی کے ساتھ باقاعدہ اطلاعات موصول ہوتی رہتی ہیں۔ اس کے علاوہ اکنامکس اینڈ سٹیٹکس اور اعداد و شمار کے ڈائرکٹر سے ۴۳ ضروری اشیاء کی قیمتوں کے رجحان کے بارے میں اطلاعات موصول ہو رہی ہیں۔ اس قسم کے شعبے اضلاع کے صدر مقامات پر بھی قائم کیے گئے ہیں۔

لکھنؤ میں امداد باہمی ڈیری کے دودھ کی فروخت سے متعلق ۴۰ مرکزوں کے ذریعہ روزمرہ ضرورت کی اشیاء مثلاً مکھن، ڈبل روٹی، دودھ اور انڈے فروخت کرنے کے لیے انتظامات کیے جا رہے ہیں۔

ریاست میں ذخیرہ اندوزی، چوربازاری اور اسمگلنگ کی روک تھام کے سلسلہ میں اب تک ۷۰۴ چھاپے مارے گئے اور ۱۶۴۱ افراد کو ڈی، آئی، آر، میسا اور دیگر قوانین کے تحت گرفتار کیا گیا۔

غلّہ کی خریداری

ربیع کی غلہ کی خریداری مقررہ نشانے سے تجاوز کر گئی ہے۔ چنانچہ ۲۶ مئی ۱۹۷۶ء تک مجموعی طور پر ۱۰۰۲۲۴۸ ٹن گیہوں کی خریداری کی گئی ہے جبکہ ۱۲۰۰۰۰۰ ٹن کا نشانہ مقرر کیا گیا تھا۔ اس طرح ۶ لاکھ ٹن کے مقررہ نشانے کے مقابلے میں ۷۵۴۰۰۰ ٹن چاول کی خریداری کی گئی ہے جس میں لیوی دھان بھی شامل ہے۔

غلّہ اور ضروری اشیاء کی تقسیم

ریاست میں ۱۶۱۲۱ سستے غلّہ کی دکانوں کے ذریعہ غلّہ اور شکر کی تقسیم کی جا رہی ہے۔ ان میں سے ۵۵۵۸ دکانیں شہری علاقوں میں اور ۱۰۵۶۳ دیہی علاقوں میں ہیں۔ حکومت نے جعلی یونٹوں اور کارڈوں سے نپٹنے کے لیے اترپردیش ضروری اشیاء تقسیم آرڈر ۱۹۷۵ء کے تحت قانونی اختیارات حاصل کر لیے ہیں۔ اس آرڈر کے تحت جعلی یونٹوں یا کارڈوں کا تیار کرنا، انھیں اپنے قبضہ میں رکھنا اور ان کا استعمال کرنا اور سستے غلّہ کی دکانوں کو شکمی حیثیت سے کرایہ پر اٹھانا قابل سزا فعل قرار دے دیا گیا ہے۔

نینی تال میں گزشتہ اکتوبر ۱۹۷۵ء سے ضروری اشیاء کی تقسیم کے لیے ایک مثالی اسکیم شروع کی گئی ہے جس کا مقصد عوام کے لیے نہ صرف ضروری اشیاء بلکہ روزمرہ استعمال کی چیزوں کی بہ آسانی دستیابی کا یقینی بندوبست کرنا ہے۔ ضلع نینی تال کے شہری اور دیہی علاقوں میں راشن کی غیر مساوی تقسیم کو ختم کر دیا گیا ہے اور اب ضلع بھر میں راشن کی فی یونٹ ماہانہ مقدار ایک کیلوگرام شکر، ۴ کیلوگرام چاول مقرر کر دی گئی ہے۔

اترپردیش ریاستی غذا و ضروری اشیاء کارپوریشن نیشنل کارپوریشن کے فراہم کردہ کپڑے کا کاروبار بھی کر رہا ہے جس میں کنٹرول اور بغیر کنٹرول دونوں اقسام کا کپڑا شامل ہے۔

ضروری اشیاء کی فروخت کے لیے جنتا اسٹور

کارپوریشن نے اب تک ۵۰ خوردہ دکانیں قائم کی ہیں اور ۴۱ر۵۴ لاکھ روپیہ کی مالیت کا کپڑا فروخت کیا ہے۔

جانچ پڑتال اور نگرانی

ریاست میں جولائی ۱۹۷۵ء میں سستے غلہ کی دکانوں کی جانچ پڑتال کے لیے ایک مہم چلائی گئی تھی جس کے نتیجہ میں شکر کی ۳۸۲ دکانیں اور سستے غلہ کی ۱۳۱۶ دکانیں منسوخ کی گئیں اور شکر کی ۱۳۶ اور سستے غلہ کی ۶۴۲ دکانیں معطل کی گئیں۔ خطاکار بیوپاریوں کی ۵۰ لاکھ روپیہ کی ضمانتیں ضبط کرلی گئی ہیں اور ۲۶۵ معاملات میں رپورٹیں درج کرائی گئی ہیں۔ ریاست بھر میں اب تک ۱۲۷۱۴۶۱۱ جعلی یونٹ منسوخ کیے جا چکے ہیں۔

ناپ اور تول کے غیر معیاری پیمانوں کے استعمال کو ختم کرنے کے لیے بھرپور مہمیں مسلسل چلائی جا رہی ہیں جن کے نتیجہ میں تقریباً ڈیڑھ لاکھ روپیہ بطور جرمانہ وصول کیا گیا اور ناپ تول کے ہزاروں غلط پیمانے ضبط کر لیے گئے۔ ناپ تول کے معیاری پیمانوں کے استعمال کا یقینی بندوبست کرنے کے لیے دیہی علاقوں میں منڈیوں، دیہی بازاروں اور میلوں کا احاطہ کرنے کے لیے ایک بھرپور مہم شروع کی گئی ہے۔

جوت حد بندی کا نفاذ اور فاضل زمین کی تیز رفتار تقسیم

کمزور طبقوں یعنی اقوام و قبائل مندرجہ فہرست کے بے زمین زرعی مزدوروں، دیگر بے زمین زرعی مزدوروں اور چھوٹے جوت داروں کے مفاد میں تمام دستیاب زمین کا استعمال ریاستی حکومت کی زرعی پالیسی کے اہم ترین پہلوؤں میں سے ایک پہلو ہے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے قوانین اور طریقہ کار کو چست بنا دیا گیا ہے۔

زمین حاصل کرنے کے دو خاص ذرائع یہ ہیں: (۱) گاؤں سبھاؤں کی زمین (۲) حد بندی قوانین کے تحت فاضل قرار دی جانے والی زمین۔

ریاست میں یکم اگست ۱۹۷۵ء سے یکم مئی ۱۹۷۶ء تک مجموعی طور پر ۶۶۰۵۸۱۶ ایکڑ زمین تقسیم کی گئی۔ اس میں گاؤں سبھا کی ۲۱۴۱۱۶ ایکڑ زمین اور حد بندی کی ۴۸۱۵۷ ایکڑ زمین شامل ہے۔ جس سے اقوام و قبائل مندرجہ فہرست کے ۱۰۵۳۰۵۰ بے زمین زرعی مزدور، ۴۱۵ء دیگر بے زمین مزدور اور دیگر زمروں کے ۲۱۱۲۰۴ مزدور مستفید ہوئے۔

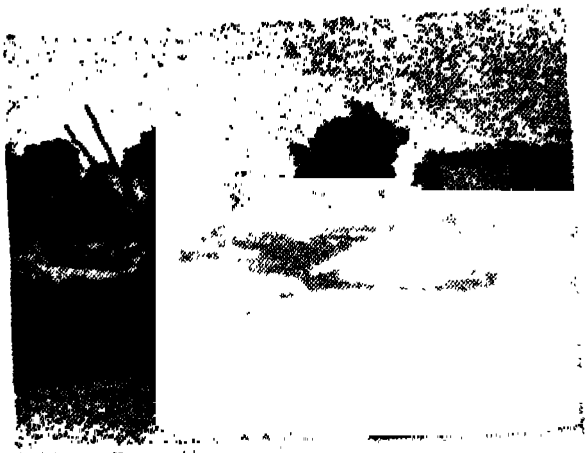
کھاتے داروں کے اختیار کردہ کچھ غلط طریقوں کا سدباب کرنے کے لیے جس کا مقصد جوت حد بندی کے مقصد کو ناکام بنانا تھا اور جوت حد بندی ایکٹ پر عمل درآمد کے دوران علم میں آنے والی بعض خامیوں کو دور کرنے کے پیش نظر مذکورہ ایکٹ کو اور زیادہ سخت کر دیا گیا۔ اس مقصد کے تحت بے نامی جوتوں اور امداد باہمی فارموں کو بھی مذکورہ ایکٹ کے دائرۂ عمل میں لایا گیا۔

تخفیف شدہ حد بندی پر موثر عمل درآمد کے پیش نظر حکومت نے حد بندی قانون کو بروئے کار لانے کے لیے ایک سہ سطحی مشینری قائم کی ہے۔ (۱) ریاستی صدر مقام (۲) بورڈ آف ریونیو اور (۳) ضلع کی سطح پر ریاستی سطح پر جوت حد بندی اور اصلاحات اراضی سے متعلق دیگر پروگراموں کے عمل درآمد کا جائزہ لینے کے لیے تین ڈپٹی سکریٹری پر مشتمل ایک اصلاحات اراضی شعبہ قائم کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ محکمہ مال کے کمشنر اور سکریٹری کی نگرانی میں اصلاحات اراضی سے متعلق مختلف اسکیموں کی رفتار ترقی کے بارے میں ہر ۱۴ دن کے بعد اعداد و شمار مرتب کرنے اور اس کا تجزیہ کرنے کے لیے ایک اصلاحات اراضی نگراں شعبہ بھی قائم کیا گیا ہے جس کے ذریعہ ایک ڈپٹی سکریٹری مقرر کیے گئے ہیں۔ بورڈ آف ریونیو جو محکمہ کے سربراہ کی حیثیت سے کام کر رہا ہے، مقررہ مدتی پروگرام پر عمل درآمد اور کلکٹروں کو وقتاً فوقتاً ہدایات جاری

کرنے کے لیے ذمہ دار ہے۔

اصلاحاتِ آراضی سے متعلق اقدامات پر تیز رفتار اور موثر عمل درآمد کے لیے کابینی وزیروں بورڈ آف ریوینیو کے ممبروں اور ڈویزنل کمشنروں کو ایک ایک ضلع الاٹ کر دیا گیا ہے تاکہ اس سلسلہ میں جو کام کیا جا چکا ہے اس کی رفتار ترقی کا جائزہ لیا جا سکے۔ کمشنروں کو بھی یہ ہدایات کر دی گئی ہیں کہ وہ اپنے حلقۂ انتخاب میں آنے والے بڑے کاشت کاروں کے خلاف جوت حدبندی کارروائی پر ذاتی طور پر نظر رکھیں۔

نئے زمین پانے والوں کو زمین کا واقعی قبضہ دلانے کے سلسلے میں ضلع مجسٹریٹوں اور سب ڈویزنل مجسٹریٹوں کو ذاتی طور پر ذمہ دار بنایا گیا ہے۔ اس مقصد کے لیے ربیع کی کٹائی کے بعد ایک مہم شروع کی جائے گی۔ اس غرض سے کہ زمین پر قبضہ حاصل کرنے کے سلسلے میں کسی قسم کی تاخیر کی گنجائش نہ رہ جائے اترپردیش جوت حدبندی قانون میں ضروری ترمیم کر دی گئی ہے۔ ضلع مجسٹریٹوں کو اب یہ اختیار دے دیا گیا ہے کہ اگر ضروری ہو تو وہ زمین کے ناجائز قبضہ کو ہٹانے کے لیے طاقت استعمال کر سکتے ہیں۔ ضلع مجسٹریٹوں کو ہدایت دی گئی ہے کہ وہ نئے زمین پانے والوں کو زمین کا قبضہ ربیع کی کٹائی کے فوراً بعد ہر حالت میں آئندہ ۳۰ جون تک یقیناً دلا دیں۔ کوشش کی جا رہی ہے کہ ان سبھی لوگوں کو جنھیں زمین الاٹ کی گئی ہے۔ آئندہ خریف کی بوائی سے قبل ہی زمین الاٹ ہو جائے۔ نئے زمین پانے والوں کو امداد باہمی اداروں کے ذریعہ زرعی ساز و سامان مہیا کرنے کی غرض سے کروڑ روپیہ کی رقم مخصوص کر دی گئی ہے۔ دریں اثناء حکومت نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ہر زمین پانے والے کو کم سے کم ایک (معیاری) ایکڑ زمین دی جائے گی۔ نئے زمین پانے والوں سے الاٹمنٹ کی تاریخ سے تین برس تک کوئی مال گزاری نہیں لی جائے گی۔



ہریجن بستی (سبھا، کرسی روڈ، لکھنؤ)

بے زمین اور کمزور طبقوں کو مکانات کی تعمیر کے لیے زمین

ریاست میں ۱۴۱۲۰۱۴ بے زمین زرعی مزدوروں، دیہی دست کاروں اور ہریجنوں کو مکانات کی تعمیر کے لیے زمین فراہم کی جانا تھی۔ اس سلسلہ میں ۱۵ مئی ۱۹۷۶ء تک ۱۲۰،۹۱۳ خاندانوں کو مکانات کی تعمیر کے لیے زمین الاٹ کی جا چکی ہے۔ جن میں سے ۱۱۸،۹۰۰ خاندانوں کو زمین پر قبضہ مل گیا ہے۔ ہر خاندان کو ۱۰۰ سے ۱۵۰ مربع گز تک زمین دی گئی ہے۔ اس ضمن میں جہاں تک ممکن ہوتا ہے گاؤں سبھا کی زمین الاٹ کی جاتی ہے اور جہاں کہیں ضروری ہو زمین حاصل کر لی جاتی ہے۔ حکومت نے مکانات کی تعمیر کے لیے نئے زمین پانے والوں کے تعلقات آراضی کو ترقی دینے کے لیے ۳۵ لاکھ روپیہ کا بندوبست بھی کیا ہے۔

پابند مزدوری کا خاتمہ

ایسے علاقوں کا پتہ لگانے کے لیے جہاں پابند مزدوری کا طریقہ رائج تھا، ایک ریاست گیر سروے کیا گیا ہے۔ اس طریقہ کو ختم کرنے کے لیے قانونی اور انتظامی کارروائی مکمل ہو چکی ہے۔ اسی اثناء میں ریاستی حکومت

نے پابند مزدوری سے نجات دلائے گئے مزدوروں کی بحالی کے لیے ایک اسکیم مرکز کو بھیجی ہے جس کو باہمی گفت وشنید کے بعد قطعی شکل دے دی جائے گی۔

ضلع دہرہ دون میں کولٹا قبیلے کے تقریباً ۱۹۰۰۰ افراد کو پابند مزدوری سے نجات دلائی جا چکی ہے۔ ریاست کے تمام تھانیداروں کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ پابند مزدوری کے معاملوں کی رپٹ فوراً درج کریں اور خطاکاروں کے خلاف مقدمات قائم کرنے کے سلسلے میں کارروائی کریں۔

دیہی قرضوں کی ادائیگی سے نجات

اترپردیش بے زمین زرعی مزدور قرضہ راحت ایکٹ ۱۹۷۵ء کے نفاذ سے ایسے زرعی مزدوروں جن کے پاس زمین نہیں ہے یا جن کے پاس بھومی دھر، سیردار، اسامی یا سرکاری پٹے دار کی حیثیت سے ایک ایکڑ سے زیادہ زمین نہیں ہے، انھیں قرض کی ذمہ داریوں سے آزاد کر دیا گیا ہے۔ اترپردیش دیہی کمزور طبقات (قرضوں کی وصولی کا التوا) قانون ۱۹۷۵ء کے تحت بے زمین زرعی مزدوروں، چھوٹے کسانوں اور دیہی دستکاروں کے قرضوں کی وصولی ایک سال کے لیے ملتوی کرنے کا بندوبست کیا گیا ہے۔ امداد باہمی انجمنوں کے نئے ممبر بنا کر امداد باہمی قرضہ انجمنوں کو مستحکم کیا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں تقریباً ۲۳٫۸۱ لاکھ ممبر بنائے جا چکے ہیں اور انہیں ۲۲٫۳۰ لاکھ روپیہ کے درمیانہ مدت کے قرضے منظور کیے جا چکے ہیں۔ اس منصوبہ کے تحت ہریجنوں کو امداد باہمی قرضہ انجمنوں کا ممبر بنا کر ان کے حالات بہتر بنانے پر خصوصی توجہ دی جا رہی ہے۔ گورکھپور، دیوریا اور مرادآباد کے اضلاع میں تین دیہی بینک قائم کیے جا چکے ہیں اور ان میں سے ہر ضلع میں ان بینکوں کے حلقے میں کسانوں کی آٹھ خدمتی انجمنوں کی تشکیل کی جا چکی ہے۔

کاروباری بینکوں نے ۱۳۲ اسکیمیں شروع کی ہیں جن کے تحت کاریگروں اور دیگر افراد کو مالی امداد فراہم کی جا رہی ہے۔ اس مقصد کے پیش نظر دیہی علاقوں میں بھی ۶ بینک قائم کیے جا رہے ہیں۔

کھیت مزدوروں کی کم سے کم اجرتوں پر نظرثانی

ریاستی حکومت نے زرعی مزدوروں کی کم سے کم اجرتوں پر ۲۳ اکتوبر ۱۹۷۵ء سے نظرثانی کی ہے۔ اجرتوں کی نئی شرحیں پانچ روپیہ سے ساڑھے چھ روپیہ کے درمیان ہیں۔

مزید آبپاشی

پانچویں منصوبہ کے دوران ریاستی آبپاشی اسکیموں کے ذریعہ مزید ۲۷٫۶ لاکھ ہیکٹر آبپاشی صلاحیت پیدا کرنے کی تجویز ہے۔ ۳۰ جون ۱۹۷۶ء تک ایک لاکھ ہیکٹر رقبہ کے لیے مزید آبپاشی صلاحیت پیدا کرنے کے لیے کوشش کی جا رہی ہیں۔ گوروں، پانی کی نالیوں اور ٹیوب ویلوں کی تعمیر کے لیے مجموعی طور پر ۱۲ کروڑ ۵۰ لاکھ روپیہ کی رقم فراہم کی جا چکی ہے۔ گوروں کی تعمیر کا کام اپریل اور مئی کے دوران بڑے پیمانہ پر شروع کیا گیا۔



پمپنگ سیٹ کے ذریعہ آبپاشی

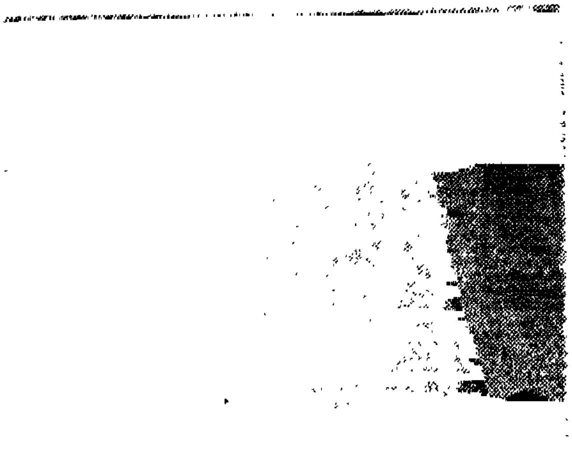
میرٹھ ڈویژن اور ضلع علی گڑھ میں آب پاشی کی صد فیصد سہولتیں مہیا کرنے کے لیے ایک اسکیم وضع کی جارہی ہے۔ تمام گولیں اور نالیاں شرم دان کے ذریعہ صاف کی جارہی ہیں۔ چھوٹے پیمانہ کے آب پاشی پروگرام کے تحت نمایاں کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ موجودہ ربیع کے دوران زیر آب پاشی رقبہ میں ۱۰ء۳۳ لاکھ ہیکٹر کا اضافہ ہوا ہے۔



چھوٹی آبپاشی اسکیم کے تحت کھیتوں کی آبپاشی (دیوریا)

بجلی کی ترقی

موجودہ ہائیڈل اور تھرمل بجلی گھروں کی بجلی کی پیداواری صلاحیت میں اضافہ کرنے کے لیے متعدد اصلاحات کی گئی ہیں۔ رام گنگا کی ۶۶ میگاواٹ کی دوسری یونٹ اور ٹنکی تھرمل بجلی توسیعی پراجکٹ کی ۱۱۰ میگاواٹ کی پہلی یونٹ کو حتی المقدور جلد سے جلد چالو کرنے کی بھرپور کوششیں کی جارہی ہیں بجلی کی بہتر صورت حال کے نتیجہ میں دیہی علاقوں میں ۲۴ گھنٹے بجلی فراہم کی جارہی ہے اور صنعتوں کی جملہ مانگ کو پورا کیا جارہا ہے۔ پانچ بجے سہ پہر سے ۹ بجے رات تک کے انتہائی مانگ کے اوقات میں بجلی کی سپلائی پر جو پابندیاں تھیں وہ مسلسل کام نہ کرنے والی صنعتوں کو



ہائی ٹینشن لائن (مئو-غازی پور)

چھوڑ کر باقی صنعتوں کے لیے ختم کر دی گئی ہیں تقسیم اور ترسیل کے نظام کو بہتر بنایا جارہا ہے اور ۸۰۰۰ ایسے ٹرانسفارمروں کی جگہ پر دوسرے ٹرانسفارمر مہیا کر دیے گئے ہیں جو جل گئے تھے یا چوری ہو گئے تھے

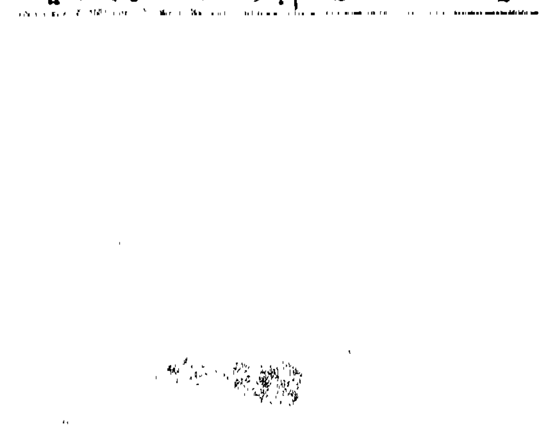
بقایاجات کی وصولی، بجلی کی چوری کی روک تھام اور صارفین کو بہتر سہولیتں مہیا کرنے کی غرض سے بڑے پیمانہ پر مہمیں چلائی گئی ہیں۔ اتر پردیش بجلی بورڈ کی قرض لینے کی حد ۲۰۰ کروڑ روپیہ سے بڑھا کر ۴۰۰ کروڑ روپیہ کر دی گئی ہے۔ ریاستی حکومت نے سہارن پور، مظفر نگر، میرٹھ، بلند شہر اور علی گڑھ میں ۱۱۵۰۵ نجی ٹیوب ویلوں اور پمپنگ سیٹوں کو بجلی فراہم کرنے کا بھی فیصلہ کیا ہے اس مقصد کے لیے ریاستی بجلی بورڈ کو پانچ کروڑ روپیہ کی رقم دی جا چکی ہے۔

جہاں تک دیہی علاقوں کو بجلی فراہم کرنے کا تعلق ہے ۸۹۳۲ نجی ٹیوب ویلوں اور پمپنگ سیٹوں، ۴۴۵ سرکاری ٹیوب ویلوں، ۳۰۷ مواضعات اور ۸۱۲ ہریجن بستیوں کو بجلی فراہم کی جا چکی ہے۔

ہینڈلوم زمرہ کی ترقی اور بنکروں کو نئی مراعات

ہینڈلوم کی صنعت کی ترقی کے لیے ایک جامع پالیسی اپنائی گئی ہے۔ گورکھپور اور بستی میں اس صنعت کی ترقی کے لیے ایک اسکیم شروع کی گئی ہے جس کے تحت بنکروں کو خام مال، تکنیکی معلومات اور نئے ڈیزائن کی سہولتیں مہیا کی جائیں گی۔ اٹاوہ اور فرخ آباد میں ایک پراجکٹ شروع کیا جائے گا جس کے تحت ۱۰۰۰ کرگھے خریدے جائیں گے۔

ہینڈلوم کارپوریشن نے اب تک دس فروخت ڈپو قائم کیے ہیں جن کے ذریعہ ہینڈلوم کپڑے فروخت کیے جاتے ہیں۔



ہینڈلوم ٹکنیکل انسٹی ٹیوٹ — وارانسی

بنکروں کی تعلیمی اور عام ضرورتوں کی دیکھ بھال کے لیے جولائی ۱۹۷۵ء میں ہینڈلوم ویلفیئر فنڈ قائم کیا گیا ہے بنکروں کے بچوں کو کتابیں مہیا کرنے کے لیے سات کتب بینک کھولے گئے ہیں۔ اسی طرح بنکروں کے بچوں کے وظائف دینے کے واسطے ایک اسکیم تیار کی جا رہی ہے۔

معیاری کپڑے کی فراہمی

اترپردیش میں کنٹرول کے کپڑے کی تھوک تقسیم کے لیے ۲۲۶ تھوک بکری مرکز قائم کیے ہیں۔ ان میں سے ۱۶۱ مرکز دیہی علاقوں میں اور ۶۵ شہری علاقوں میں ہیں۔ ان امداد باہمی تھوک دکانوں سے جولائی ۱۹۷۵ء سے ۱۵ مئی ۱۹۷۶ء تک ۴ء۱۸ کروڑ روپیہ کی مالیت کا ۵۹ء۰ کروڑ میٹر کنٹرول کا کپڑا صارفین کو فروخت کیا گیا۔

کنٹرول کپڑے کی تقسیم کے سلسلہ میں مقدار، آمدنی اور جوت کے رقبہ سے متعلق تمام پابندیاں ختم کر دی گئی ہیں دیہی علاقوں میں نیائے پنچایت میں کم سے کم ایک تھوک دکان قائم کرنے کا بندوبست کیا گیا ہے۔ شہروں کے ایسے محلّوں میں، جہاں مزدوروں، ہریجنوں اور سماج کے دیگر کمزور طبقہ کے لوگوں کی زیادہ آبادی ہے۔ تھوک دکانیں قائم کرنے کے اقدامات بھی کیے گئے ہیں۔

غذا اور ضروری اشیاء کارپوریشن نے بھی ۵۰ فروخت مرکز قائم کیے ہیں۔ ان مرکزوں نے ۱۳۱ لاکھ ۴۵ ہزار روپیہ مالیت کا کنٹرول کا کپڑا فروخت کیا ہے۔

ٹیکس چوری کی روک تھام اور معاشی مجرموں کو سزا

اترپردیش میں ٹیکس چوری کی روک تھام اور معاشی جرائم کا ارتکاب کرنے والوں کو سزا دینے کے سلسلے میں متعدد اقدامات کیے گئے ہیں۔ ذخیرہ اندوزی، چور بازاری کرنے والوں اور اسمگلروں کے خلاف جون ۱۹۷۵ء سے ۱۵ مئی ۱۹۷۶ء تک ۷۴۴ چھاپے مارے گئے اور ۲۵۲ رپورٹیں درج کرائی گئیں۔ قانون دفاع ہند اور ضروری اشیاء قانون کے تحت ۱۳۲۴ معاشی مجرموں اور ۳۴۲۶ سماج دشمن عناصر کو گرفتار کیا گیا۔

صنعتوں میں مزدوروں کی شرکت

صنعتوں میں مزدوروں کی شرکت سے متعلق اسکیم جو حکومت ہند سے موصول ہوئی ہے ایسے تمام سرکاری امداد باہمی اور نجی اداروں میں بروئے کار لائی جا رہی ہے جہاں ۵۰۰ سے زیادہ مزدور کام کرتے ہیں۔ اس اسکیم کو مجموعی طور پر ۱۶۰ اداروں (سرکاری زمرہ کی ۵۵، اور نجی زمرہ کی ۱۰۵) میں سے اب تک سرکاری زمرے

کی ۳۴ صنعتوں اور نجی زمرہ کی ۱۰۱ صنعتوں میں بروئے کار لایا جا چکا ہے جہاں ۵۰۰ سے زیادہ مزدور کام کرتے ہیں، ریاستی حکومت نے نجی اور سرکاری زمرہ کے باقی ۱۷ واحدوں میں بھی مقررہ مدت کے اندر اس اسکیم کو نافذ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

طالب علموں کو کنٹرول نرخ پر ضروری اشیاء کی فراہمی

ریاست کے ۱۲ بڑے شہروں میں ڈگری کالجوں اور یونی ورسیٹیوں کے ہاسٹلوں اور منظور شدہ اقامت گاہوں میں طالب علموں کو غلہ اور دیگر ضروری اشیاء کھوک قیمتوں پر فراہم کی جا رہی ہیں۔ اس کے علاوہ رڑکی اور پنت نگر یونی ورسیٹیوں کو محکمہ جنگلات کی جانب سے جلانے کی لکڑی کی مسلسل فراہمی جاری ہے۔ ان دونوں یونی ورسیٹیوں کی بیکریوں کو میدہ بھی فراہم کیا جا رہا ہے۔ اس اسکیم سے مجموعی طور پر ۱۱۸۵۴ طلباء مستفید ہو رہے ہیں۔

ریاست کے تمام قصبوں اور شہروں میں دیگر اداروں کے طالب علموں کو ادارہ جاتی کارڈ جاری کر دیے گئے ہیں جن پر چاول، گیہوں، شکر اور مٹی کا تیل مہیا کیا جاتا ہے۔ اس طرح دیگر تمام طلباء اپنے راشن کارڈوں پر گیہوں، چاول شکر اور مٹی کا تیل حاصل کر رہے ہیں۔

اس کے علاوہ طالب علموں کو ضروری اشیاء فراہم کرنے کی غرض سے لکھنؤ، گورکھپور، وارانسی، میرٹھ اور کمایوں یونی ورسیٹیوں میں امداد باہمی گودام قائم کیے گئے ہیں۔ اس قسم کے گودام دیگر یونی ورسیٹیوں اور ڈگری کالجوں میں بھی قائم کیے جا رہے ہیں۔ ان انتظامات سے طالب علموں کو آسانی کے ساتھ کنٹرول نرخ پر ضروری اشیاء حاصل کرنے میں کافی مدد ملی ہے اور مطبخ کے اخراجات بھی کم ہو گئے ہیں۔

کنٹرول قیمت پر کتابیں اور اسٹیشنری

ریاست میں قانون دفاع ہند کے تحت ایک حکم کے ذریعہ جولائی ۱۹۷۵ء میں تقریباً ۱۵۰۰ کتابوں کی قیمتیں مقرر کی گئیں جس کے نتیجہ میں بیشتر کتابوں کی قیمتیں ۲۰ سے ۳۰ فی صد تک کم ہو گئیں اس کے علاوہ ۷۷-۱۹۷۶ء کے لیے بھی کتابوں کی قیمتوں کو منضبط کرنے کی کارروائی کی جا رہی ہے۔

حکومت نے منظور شدہ کتابوں کی کلچرل ورائٹی کے کاغذ کے علاوہ دوسرے کاغذ پر طباعت بھی قانوناً ممنوع قرار دے دیا ہے۔ ۷۶-۱۹۷۵ء کے تعلیمی سال کے دوران مرکزی حکومت سے موصول ہونے والے ۹۰۰۰ ٹن کاغذ کے کوٹہ سے کاپیاں تیار کر کے طالب علموں کو مہیا کی گئیں۔ پہلے سے آٹھویں درجے تک کی درسی کتابوں اور نویں سے بارھویں درجوں تک کی ہندی کی نصابی کتابوں کو قومیایا جا چکا ہے۔ اسی طرح نویں اور دسویں درجے کی انگریزی کی نصابی کتابیں بھی آئندہ تعلیمی سال سے قومیائی جائیں گی۔ اس کے بعد ریاضی اور سائنس کی کتابیں بھی قومیائی جائیں گی۔ ہر کاپی کی پشت پر ۲۰ نکاتی معاشی پروگرام شائع کیا گیا ہے تاکہ طالب علموں کو اس پروگرام سے متعارف کیا جا سکے۔

سماج کے کمزور طبقوں کے پہلے درجہ سے پانچویں درجہ تک کے طالب علموں کو درسی کتابیں مفت فراہم کی گئیں جن سے دیہی علاقوں کے ۳۴۰۰۰ طالب علم اور شہری علاقوں کے ۱۰۰۰۰ طالب علم مستفید ہوئے ہیں۔ بیسک اسکولوں کے ایک لاکھ سے زیادہ طالب علموں کو ۱ لاکھ روپیہ کی سائنس کی کتابیں فراہم کی گئیں۔ مستقل طور سے ملحق ۲۶۰ ڈگری کالجوں میں سے ۲۳۱ کالجوں میں کتب بینک قائم کیے گئے ہیں۔ اور باقی کالجوں میں بھی جون ۱۹۷۶ء تک کتب بینک قائم کر دینے کے اقدامات کیے جا رہے ہیں۔ آئندہ تعلیمی سال سے ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کالجوں میں بھی ایک کروڑ روپیہ کی تخمینی لاگت سے کتب بینک قائم کرنے کی ایک اسکیم تیار کی جا رہی ہے۔

(باقی صفحہ پر)

واصف نظامی طاہرپوری

ارتقا کا زینہ

قطعات

دیکھ کر حیران ہیں سب تیرا حسنِ انتظام
بڑھ گیا ہر ایک دل میں اور تیرا احترام
اے جواہر لال کی بیٹی ترا عزم و عمل
تو نے برہم کر دیا جاگیر دارانہ نظام

بے گھروں کو گھر ملے منسوخ قرضہ ہو گیا
اور زمینیں دی گئیں ہیں بے زمیں افراد کو
ہیں مگن اپنے وطن کے آج سب پچھڑے ہوئے
شادمانی مل رہی ہے آج ہر ناشاد کو

بے زمیں کھیتی کا اور بےگار کا ٹوٹا طلسم
آبپاشی کی سہولت میں اضافہ ہو گیا
ٹیوب ویلوں اور صنعت کے لیے بجلی بڑھی
اور بندوبست سرمائے کا اچھا ہو گیا

گاؤں کی خوشحالیاں بھی ہونگی شہروں کی طرح
شادمانی ہو گی حاصل اب ہر اک رنجور کو
اب سہولت ہر طرح کی پائیں گے مفلس عوام
کوئی دقت بھی نہ پیش آئے گی اب مزدور کو

سربلندی اور حاصل ہو گی اپنے دیس کو
ارتقا کا ایک زینہ ہیں یہی بیسوں نکات
ہو گا ہر سو شادمانی اور خوشحالی کا دور
اب عوام الناس پائیں گے غریبی سے نجات

کملا پتے سہائے ماہر بلگرامی

زندہ باد

زندہ باد اے اندرا، اے فخرِ بھارت زندہ باد
زندہ باد اے افتخارِ ملک و ملت زندہ باد
زندہ باد اے پیکرِ عزم و شجاعت زندہ باد
زندہ باد اے محرمِ رازِ سیاست زندہ باد
تو بہن بھی، ماں بھی، بیٹی بھی وزیر اعظم بھی ہے
غم کے ماروں کے دلوں کے زخم کا مرہم بھی ہے

رشوت و کنبہ پرستی و گرانی و فساد
دیکھ کر حالاتِ ہنگامی برائے انسداد
بیس نکتوں کی چلا دی تو نے تحریکِ مفاد
فصد دے دے کر بہے روز کا خون میں بڑھتا فساد
عرصۂ اک سال میں اس پُر اثر اقدام نے
جو ترقی کر دکھائی وہ ہے سب کے سامنے

آج پورے اوج پر ہے ارتقا کا آفتاب
لہلہاتے کھیت ہیں شاداب کیاری میں گلاب
بیٹ بھوکے ہیں نہ ہونٹوں پر وہ شورِ انقلاب
لے چکا ہے آخری ہچکی بغاوت کا شباب
دور اب منزل نہیں کہتے ہیں یہ بڑھتے قدم
ہو سلامت یہ قیادت ہم پہ یہ تیرا کرم

ہر نفس تیرا ترقی وطن کا سنگ میل
ارتقائے قوم کے خاطر کی تو نے ہر سبیل
ذات عالی ہے حصارِ ملک کے گرد اک فصیل
جس نے ٹکرا لی گرا وہ سر کے بل ہو کر ذلیل
لکشمی بائی کا تو نے نام اونچا کر دیا
رہ گیا باقی تھا جو وہ کام پورا کر دیا

پیار کے انداز بھی ہیں وار بھی تلوار کے
سب ہیں ششدر دیکھ کر جوہر ترے کردار کے
قوم کو آگے بڑھانے خواہشوں کو مار کے
کل کی خاطر آج سے آثار ہیں ایثار کے
ہے دعا ماہر کی جیتے جی رہے تو یونہی شاد
زندہ باد اے رہنمائے ملک و ملت زندہ باد

رتن سنگھ

اُمید کی کرن

(افسانہ)

صرف ہمارا گھر ہی نہیں بلکہ سارا محلہ اور ایک طرح سے کہا جائے تو پورا شہر ہی نہیں، تمام شہر، سارے قصبے اور گاؤں یا یوں سمجھیے کہ پورا ملک ہی چوہوں کی یلغار سے عاجز تھا۔ چوہوں کی وجہ سے حالات کس قدر سنگین ہو گئے تھے، اس کا تھوڑا بہت اندازہ آپ ہمارے گھر میں چوہوں کی مچائی ہوئی تباہی سے لگا سکتے ہیں۔

پہلے تو یوں سمجھ لیجیے کہ چوہوں کی وجہ سے سب سے زیادہ نقصان ہمارے باورچی خانے میں ہوتا تھا۔ آدمی کو بھی شاید ڈبّوں کے ڈھکن کھولنے میں دقّت ہوتی ہوگی، لیکن ہمارے گھر میں بسیرا لینے والے یہ چوہے اتنی چابکدستی اور ہوشیاری سے ڈھکن کھول کر دالیں، چاول، چینی، گڑ، آٹا وغیرہ چٹ کر جاتے تھے کہ کچھ پوچھیے ہی نہیں۔ یہی نہیں بلکہ ہوتا یہ تھا کہ آج چوہوں نے ڈبہ گرا کر دو کلو تیل فرش پر گرا دیا ہے تو دوسرے دن پتہ چلا کہ بچے صرف اس لیے پھیکی چائے پی رہے ہیں، کہ چوہوں نے شکر کے ڈبے میں پیشاب کر کے اسے کھانے کے قابل ہی نہیں چھوڑا۔ پھر یہ کہ آٹے کے کنستر میں گھس کر مینگنیاں کر دی ہیں۔ نعمت خانے کی لوہے کی جالی کاٹ کر اس میں سے دودھ کو صفاچٹ کر گئے ہیں جو دہی جمانے کے لیے رکھا گیا تھا۔

جہاں ایک طرف یہ خطرہ رہتا تھا کہ چوہوں کا جھوٹا کھا لینے کی وجہ سے کہیں طاعون یا کسی دوسرے مہلک مرض کا شکار نہ ہو جائیں وہاں ان چوہوں کی وجہ سے ہر وقت کہیں نہ کہیں کھٹر پٹر ہوتی رہتی تھی، جس کی وجہ سے نہ رات کو چین سے سونے کو ملتا تھا اور نہ دن کو آرام۔

باورچی خانے میں ہونے والے نقصان کی تلافی تو خیر آدمی کسی طرح کر ہی لیتا یا اس نقصان کو برداشت کر لیتا، لیکن جب گھر کے دوسرے حصّوں میں چوہوں کی سرگرمیاں بڑھ گئیں تو زندگی ہی اجیرن ہو گئی۔

پتہ چلا کہ آج شیکسپیئر کے سر کو چاٹ گئے ہیں تو کل کالی داس کی شکنتلا کو عین اس وقت نیند سے اچاٹ کر دیا جب دشینت کو ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے تھک کر اس کی ایک پل کے لیے آنکھ لگی تھی۔

ایک دن معلوم ہوا کہ ہمارے بڑے لڑکے نے حساب کے جو سوالات بڑی مشکل سے حل کر کے میز پر اس غرض سے رکھے تھے کہ صبح امتحان کے لیے جانے سے پہلے ان پر ایک نظر ڈال لےگا، وہ کاغذ ہی ندارد ہے۔ کاغذ گم دیکھ کر بھائی بہنوں میں خوب جم کر لڑائی بھی ہوئی۔ بھائی کہتا تھا۔ تم لوگوں نے میرے کاغذ لاپرواہی سے کوڑے میں پھینک دیے ہیں اور بہنیں کہتی تھیں کہ انھوں نے کاغذ دیکھے تک نہیں۔ آخر کافی دنوں بعد پتہ چلا کہ وہ کاغذ چوہوں کی بل کے اندر پائے گئے۔ انھیں ان حساب کے سوالوں کی کیا ضرورت در پیش تھی اور وہ ان کو کیوں اچک لے گئے تھے یہ سوال ابھی تک ہم لوگ

مل نہیں کر پایا ہے۔

یہی حال گھر کے کپڑوں لتّوں کا تھا۔ آج اوورکوٹ کی جیب کتر گئے۔ تو کل بیوی کے اکلوتے دوپٹے پر چوہوں نے رات بھر ایسے ایسے نقش و نگار بنائے کہ دوپٹے میں دن کو تارے دکھائی دینے لگے۔

غرضیکہ ان چوہوں کی وجہ سے کوئی چیز نہیں بچی تھی۔ خواہ وہ کھانے پینے کی چیزیں ہوں یا پہننے اوڑھنے کی۔ یہاں تک کہ چمڑے کے سوٹ کیس، بستر بند، لحاف، رضائیاں، کوئی چیز ایسی نہیں تھی جن پر چوہوں نے اپنے دانتوں کی آزمائش نہ کی ہو۔

ہمارا گھر ان چوہوں کے لیے ایک ایسے مقبوضہ علاقے کی طرح تھا کہ جیسے ان چنگیزوں نے فتح کرنے کے بعد بڑی بے رحمی سے لوٹا ہو۔ گھر کی ایک ایک چیز کو الٹ پلٹ کر نوچ کھسوٹ کر رکھ دیا تھا۔ یوں سمجھیے کہ ان ظالم فاتحوں نے ہمارے گھر کی ایک طرح سے، اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔

یہی نہیں کہ ان کی وجہ سے صرف گھر کی چیزوں کو ہی نقصان پہنچا تھا بلکہ گھر کے مکینوں کے ذہنوں پر بھی یہ چوہے بھوت کی طرح سوار رہتے تھے۔ ادھر آدھی رات کے وقت چوہوں نے کھٹر پٹر شروع کی اور ادھر سارا گھر اس وہم میں جاگ کر بیٹھ گیا کہ یا خدا کہیں ہمارے گھر میں چور تو نہیں گھس آئے۔ پھر کافی کھسر پھسر اور صلاح مشورے کے بعد ہاتھوں میں ڈنڈا تھامے ہم بڑی ہمت کر کے ڈرتے ڈرتے سہمے سہمے دوسرے کمرے کا دروازہ کھولتے تو پتہ چلتا کہ چور تو کہیں نہیں ہاں چوہوں کی فوج تھی، جس نے یلغار کر دی تھی۔

ایسا نہیں کہ ان چوہوں کو گھر سے نکالنے کی کوشش نہ کی گئی ہو۔ کئی بار دیواروں میں بنے ہوئے ان کے بل اینٹوں کے روڑے بھر بھر کر اور اوپر سیمنٹ لگا لگا کر بند کیے لیکن دوسرے روز ہی پتہ چلتا کہ انھوں نے دیوار کے کسی دوسرے گوشے میں نقب لگا لی ہے۔

جب ہم ان چوہوں کو گرفتار کرنے کے لیے چوہے دان لے آئے تو پتہ چلا کہ چوہے زیادہ بڑے اور موٹے ہیں اور ہمارا چوہے دان چھوٹا ہے اور پھر یہ کہ وہ اتنے ہوشیار ہیں کہ چوہے دان کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے۔ اگر چوہے مار دوا کی گولیاں ڈالتے تو کبھی کبھی ایک آدھ چوہا مردہ پایا جاتا لیکن وہ کمبخت کسی ایسی جگہ جا کر مرتا کہ وہاں سے اس کی لاش کو نکالنا ممکن نہ ہوتا۔ نتیجے کے طور پر ہفتوں اس کی بدبو ہماری زندگی کو دوبھر بنائے رہتی۔ پھر یہ کہ مرتا تو ایک چوہا اور دوسرے دن اس کی جگہ پُر کرنے کے لیے چار چوہے اور پیدا ہو جاتے۔

آخر جب ان چوہوں کے روز روز کے ظلم سہتے سہتے ایک مدت ہو گئی اور نہ صرف یہ کہ ہمارے گھر کی حالت بگڑی بلکہ ہمارے سارے محلے، پورے شہر اور سارے ملک میں لوگ جگہ جگہ ان چوہوں کی زیادتیوں سے تنگ آ گئے تو آخر قومی پیمانے پر سرکار کو سوچنا پڑا کہ اگر ان چوہوں کی یلغار کو نہ روکا گیا تو یہ چوہے ملک اور قوم کے لیے خطرہ بن جائیں گے۔

مزید تفتیش کرنے پر پتہ چلا کہ ہمارے ہاں چوہوں کی کچھ ایسی تنظیمیں بھی ہیں جو منظم طور پر یہ کوشش کر رہی ہیں، کہ حکومت کا تختہ پلٹ دیا جائے تاکہ عوام کو پوری طرح لوٹنے کھسوٹنے کے لیے انھیں پوری آزادی مل جائے اور اس مقصد کے حصول کے لیے انھوں نے چوہوں کی کچھ ایسی غیر ملکی تنظیموں سے بھی رابطہ قائم کر رکھا تھا جو ساری دنیا میں حکومتوں کو گرانے کے لیے بڑی تجربہ کار اور ہوشیار سمجھی جاتی ہیں۔

اور پھر یہ ہوا کہ قومی سطح پر ان چوہوں کی دھڑ پکڑ شروع ہوئی۔ بڑے بڑے موٹے چوہے جو قوم کی دولت کو مالِ مفت دلِ بے رحم کی طرح چوری چھپے کھا کھا کر موٹے ہو رہے تھے پکڑ کر بڑے بڑے آہنی چوہے دانوں میں بند کر دیے گئے۔

جب ان کے بلوں کی تلاشیاں لی گئیں تو ان کے اندھیرے تہہ خانوں میں کیا کچھ نہ ملا۔ اناج اور کپڑے کے گودام ملے۔ سونے چاندی اور ہیرے جواہرات کے ذخیرے ملے۔ اور کروڑوں کی تعداد میں روپیہ ملا۔

سنتے ہیں کسی ملک میں جب لوگ چوہوں سے بے حد عاجز آ گئے تھے تو ایک جادوگر آیا تھا وہاں۔ اس کے سر پر عجیب وضع کی لمبی سی ٹوپی تھی اور اس کے ہاتھ میں کوئی لمبا سا بانس کا ساز تھا۔ اس جادوگر نے جب وہ عجیب و غریب ساز بجایا تھا تو اس کی آواز کو سن کر سارے چوہے ناچتے کودتے گھروں سے باہر نکل آئے تھے۔ پھر آگے آگے چلا تھا وہ جادوگر اپنا ساز بجاتا ہوا اور اس کے پیچھے پیچھے ہو لیے تھے سارے ملک کے چوہے اپنی دمیں ہلاتے ہوئے کہتے ہیں کہ جادوگر ساز بجاتا ہوا ایک دریا میں اتر گیا۔ اور اس کے پیچھے سارے چوہے بھی دریا میں اتر گئے۔ جادوگر تو تیر کر دوسرے کنارے جا لگا لیکن سارے چوہے اس دریا میں ڈوب گئے اور اس طرح اس ملک کو چوہوں سے نجات ملی تھی۔

یہ واقعہ تو خیر بہت پرانا ہے۔ اور کسی دوسرے ملک کا ہے۔ اسی نوعیت کا جو واقعہ ہمارے ہاں ہوا ہے وہ تو اس تاریخی واقعے سے بھی کئی معنی میں سبقت لے گیا ہے۔ وہاں تو صرف ایک ہی آدمی نکلا تھا۔ ان چوہوں کو ختم کرنے کے لیے۔ لیکن یہاں تو پوری قوم ہی جیسے ان دیش دشمن چوہوں سے صف آرا ہونے کے لیے نکل پڑی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے ہمارے سیدھے سادے عوام نے بانسوں کو تراش کر کوئی ساز بنا لیا ہے۔ اور پھر اس دھن میں انھوں نے کوئی ایسا سحر پھونکا کہ تمام چوہے ملک کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے دریاؤں میں ڈوب گئے۔ کچھ ستلج و بیاس میں ڈوب گئے، کچھ گنگا و جمنا میں غرق ہو کر رہ گئے اور جو بچے تھے ان کو نربدا اور گوداوری کی لہریں کھا گئیں۔

اس طرح جا کر ہمیں ان موٹے دیش دشمن چوہوں سے نجات ملی ہے جن کی وجہ سے ہماری زندگی اجیرن ہو کر رہ گئی تھی۔

★

۲۰ نکاتی معاشی پروگرام: صفحہ ۳۳ کا بقیہ

اپرنٹس شپ اسکیم

ریاستی حکومت اس پر مسلسل کڑی نظر رکھتی ہے کہ اسامیوں کو پُر کرنے میں اقوام و قبائل مندرجہ فہرست، پسماندہ طبقوں، معذور افراد، خواتین اور اقلیتی فرقوں اور دیگر کمزور طبقوں سے تعلق رکھنے والے اپرنٹسوں کو مناسب نمائندگی دی جا رہی ہے۔ اپرنٹس شپ ایکٹ کی دفعات کی خلاف ورزی کرنے والے آجرین بھی چھ ماہ کی قید یا ایک ہزار روپیہ جرمانہ یا دونوں سزاؤں کے مستوجب ہوں گے۔ اس قانون کی سختی سے نفاذ کے سلسلے میں پوری پوری نگرانی رکھی جاتی ہے، اب تک ۱۸۹ آجرین کے خلاف مقدمات دائر کیے گئے جن میں ۷۸ آجرین کو سزا ہوئی اور باقی مقدمات زیر سماعت تھے۔

مجموعی طور پر ۲۷۳۴ اداروں میں ۱۰۳۰۰ اسامیوں کا پتہ چلا جن میں سے ۱۰۱۷ اسامیاں اپرنٹسوں کو دی گئیں۔ ان میں اقوام مندرجہ فہرست کے ۴۳۶، قبائل مندرجہ فہرست کے ۶۲، جسمانی طور پر معذور دو، اقلیتی اور کمزور طبقہ کے ۲۹۵ اور ۱۵ خواتین اپرنٹس شامل ہیں۔

★

شاعر علی ادیب

اِندرا انقلاب

(ایمرجنسی اور شریمتی اندرا گاندھی کے بیس نکاتی فارمولے کے پس منظر میں لکھی گئی نظم)

قدم قدم پہ گھنا نامراد سایا تھا
ہر ایک راستہ تاریکیوں میں ڈوبا تھا

جگہ جگہ تھے چھپے اس میں قاتلِ تہذیب
بنامِ خدمتِ بھارت تھی ہر جگہ تخریب

غریب خون سے امرا کی شمعیں تھیں روشن
تمام دیس کو لوٹنے چلا تھا کالا دھن

کوئی جیے کہ مرے، تاجروں کو کیا پرواہ
فقط ذخیرۂ اجناس پر تھی ان کی نگاہ

ملازموں کی وفاداری کا عجب تھا حال
مطالبات تھے بے جا، تو تھی کبھی ہڑتال

بشر کے روپ میں راون تھے گام گام چھپے
ردائے عصمتِ جمہور لوٹنے تھے چلے

انھیں تھی آرزو فقط اقتدار پانے کی
انھیں تھی حرص و ہوس سلطنت چلانے کی

ہر اک سو آگ سی دہکا رہے تھے دیوانے
عوام و فوج کو بہکا رہے تھے دیوانے

اس انقلاب کو اک "اندرا انقلاب" کہو
یا اس کو سوشلزم کی نئی کتاب کہو

گھنے گھنے سے اندھیرے اجالوں میں بدلے
فساد و شر کے اکھاڑے شوالوں میں بدلے

پیامِ دوستی ہر ایک لب پہ عام ہوا
تمام لوگوں کا اک بھارتی میں نام ہوا

تمام ملک کے بندہ نواز، بندے سے
امیر سارے، غریبوں کی صف میں آ ٹھہرے

ہے جنس جنس مہیا سبھی دکانوں میں
ہے پیٹ پیٹ بھرا آج سب مکانوں میں

ملازم اہلِ وفاداری سے ہوئے مانوس
عمل سے کام سے بھارت میں جل اٹھے فانوس

ہے کالے دھندے کا منھ کالا اور سیہ ابھی کرنی
سماج دشمنوں کی زیست بھی حرام ہوئی

وہ جو کہ عصمتِ جمہور لوٹنے تھے چلے
وطن کے قدموں پہ اب گر کے کرتے ہیں سجدے

خوشا خوشا کہ کرشمہ عجیب دکھلایا
سبق دوانوں کو بروقت تم نے سکھلایا

تمہاری عقل و فراست کا کچھ جواب نہیں
تمہاری اپنی سیاست کا کچھ جواب نہیں

تمام ہند کی خاتونِ اولین ہو ... تم
ہمیں ہے ناز کہ مردوں سے بھی ذہین ہو تم

تمہارے دم سے ہے محفوظ ورثۂ قومی
حیات، قوم و وطن کو نئی تمہیں سے ملی

نفاذ گر نہ ایمرجنسی کا کیا ہوتا
نہ جانے قوم کا بھارت کا حشر ہوتا کیا

تمہارا ایک اک اقدام قابلِ تحسین
تمہارے بیس نکات اپنی زندگی کے امین

انھیں نکات میں مضمر ہے اپنا مستقبل
یہی نکات ہیں اپنے نصیب کا حاصل

انھیں نکات سے ابھرے گا نام بھارت کا
انھیں نکات سے چمکے گا کام بھارت کا

عارف عزیز قدوائی

ایمرجنسی کی دین

بدترین سے بدترین مخالف بھی زبان سے نہ کہے لیکن اپنے دل کے نہاں خانے میں یہ ضرور محسوس کرے گا کہ ہنگامی حالات کا اعلان ہونے کے بعد سے ایک سال کے اندر ہندوستان میں ایک ننھا انقلاب (MINI REVOLU-TION) آچکا ہے اور یہ کہ اس کی چھاپ قومی زندگی کے مختلف شعبوں پر نظر آرہی ہے۔ یہ چھاپ دھندلی تو نہیں البتہ اسے اور زیادہ واضح کرنے کی ضرورت بلاشبہ ہے۔ ایک ایسا مکمل انقلاب لانے کے لیے جو ہر گوشے کا احاطہ کرسکے ضروری ہے کہ ان نقوش کا رنگ شوخ سے شوخ تر ہو۔ خوب سے خوب تر کی جستجو اور جد و جہد بہرحال جاری رہنا چاہیے۔

وزیراعظم کے ۲۰ نکاتی پروگرام کو بجا طور پر سماجی۔ معاشی ترقی کا منشور قرار دیا گیا ہے۔ اس کی کلیدی اہمیت ضرور ہے لیکن یہ حرف آخر نہیں اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ اندرا جی نے پروگرام کو وسعت دینے کے لیے کچھ اور نکات کا ذکر کیا ہے اور اس ضمن میں قومی یکجہتی۔ خاندانی منصوبہ بندی۔ شجر کاری۔ بچوں کی بہبود اور شہری ترقیات کو بھی قابل ترجیح بتایا ہے بہرکیف کسی بھی پالیسی یا پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ایک خاص مزاج کی ضرورت ہوتی ہے۔

قدیم ترین سیاسی مفکروں نے بھی یہ بات تسلیم کی ہے کہ مملکت کا کام چلانے کے لیے کسی قدر جبر ضروری ہے۔ ان لوگوں کے لیے جو راہ راست پر آنے کے لیے تیار نہیں ہیں کسی قدر جبر کا استعمال ناگزیر ہو جاتا ہے لیکن یہ بات ہمیشہ ذہن میں رہنا چاہیے کہ یہ جبر شر کے لیے نہیں بلکہ خیر کے لیے ہے۔ یہ وہ نشتر ہے جس کا مقصد عمل جراحی کے ذریعہ فاسد مادے کو خارج کرنا ہے جو لوگ بدنظمی اور بددیانتی جاری رکھنے پر مصر ہیں وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر ان مخالف اور غیر ذمہ دار عناصر کے آلہ کار بن رہے ہیں جنھوں نے ملک کو تباہی کے دہانے تک پہونچانے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔

ایک ہمہ گیر اور ہمہ جہت انقلاب لانے کے لیے مزاج سازی کی بڑی اہمیت ہے۔ سارے چمن پر بہار آسکتی ہے بشرطیکہ ایک ایک پھول اور ایک ایک پتہ سنوارا جائے۔ ایمرجنسی نے لوگوں کو وقت کی پابندی سکھائی ہے۔ دفتروں کے حالات نے خوشگوار کروٹ لی ہے۔ کارخانوں میں ہڑتالیں نہیں ہوتیں۔ تالہ بندی اور چھٹکی کی نوبت نہیں آتی اس لیے پیداوار میں تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ شہروں میں سڑکیں زیادہ صاف ستھری نظر آتی ہیں۔ کوڑے کے ڈھیر مٹ گئے ہیں، ٹریفک کے قواعد کی پابندی سختی سے کرائی جاتی ہے' بدمعاشوں اور گنڈوں کو پکڑ کر بند کر دیا گیا ہے' جرائم کی زیادہ مؤثر روک تھام پر توجہ کی جا رہی ہے' معاشی بداعمالی کے مرتکب لوگوں اور ٹیکس ماروں کو عدالت میں گھسیٹ لایا گیا ہے یا جیل پہنچا دیا گیا ہے' غرضیکہ مختلف محاذوں پر خوشگوار تغیر و تبدل کے آثار خاصے نمایاں ہیں۔

ایمرجنسی ظاہر ہے کہ دائمی چیز نہیں ہے لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ ایمرجنسی ہٹنے کے بعد بھی نظم و ضبط کا موجودہ ماحول برقرار رہے گا اور لوگ نکھٹو پن، کاہلی اور لاپرواہی کے پرانے رویہ پر واپس نہیں جائیں گے۔ بہترین صورت تو وہی ہوتی ہے کہ لوگ از خود کچھ پابندیاں اپنے اوپر عائد کرلیں اور اپنا کردار ایسا بنالیں جو ملک کی ترقی کے لیے معاون ثابت ہو سکے لیکن جب لوگ خود اپنا محاسبہ کرنے پر تیار نہیں ہوتے تو حکومت کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ وہ محاسبہ کرے۔ ایمرجنسی ایسا سیلاب ہے جو گزر جانے کے بعد زرخیز زمین چھوڑ جائے گا۔

مزاج سازی اور کردار سازی کے سلسلۂ عمل میں حکومت کی جانب سے کچھ اور کارروائیاں کی جا رہی ہیں۔ ان میں اہم ترین یہ ہے کہ بنیادی

فرائض اور ذمہ داریاں آئین کی زینت بنیں گی۔ شہریوں پر جو فرائض اور ذمہ داریاں عاید کرنے کی تجویز ہے ان میں ہندستان کے اتحاد اور سالمیت کو برقرار رکھنا، امن وامان قائم رکھنا، ڈسپلن پر عمل پیرا ہونا اور عوامی املاک کی حفاظت کرنا شامل ہوگا۔ یہ ایک مثبت اور خوش آیند اقدام ہے اور اس کی حیثیت مرض کی صحیح تشخیص اور صحیح علاج کی سی ہے۔

وزیر اعظم نے اپنی ایک حالیہ تقریر کے دوران رجائیت اور قنوطیت کے مابین راستہ اختیار کیا ہے اور بتایا ہے کہ چھوٹی پہاڑیاں سر کرلی گئی ہیں لیکن بڑے پہاڑوں کو سر کرنا باقی ہے۔ ۲۰ نکاتی پروگرام پر تسلی بخش رفتار سے عمل ہو رہا ہے لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کام کو مکمل کرکے اور آگے بڑھایا جائے۔ جو ملک کسی زمانے میں بہت بڑے کہے جاتے تھے وہ آج ترقی کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ برطانیہ کی مثال سامنے ہے۔ نئی نئی قومیں ابھر کر میدان پر میدان مار رہی ہیں۔ ہندستان بھی اپنی وسیع افرادی طاقت اور معدنی وسائل سے ترقی کی اس دوڑ میں نہ صرف شریک ہے بلکہ بہتوں سے آگے نکل چکا ہے۔ نوری مسئلہ انسانی وسائل کے بھرپور استعمال کا ہے جسے حل کرنے میں ایمرجنسی سے بڑی مدد مل رہی ہے۔ کاہلی، نااہلی اور نکمے پن کے دن لد گئے۔ پیداوار بڑھانے پر پوری توجہ مرکوز ہے۔ یہ سلسلہ عمل پوری تندہی، لگن اور قوت سے جاری رہنا چاہیے۔



بے زمین کسانوں کو زمین کے الاٹمنٹ کے موقع پر حکومت کے ذریعہ زرعی آلات اور عمدہ بیجوں کی تقسیم

افسردہ دل ساری انجمن کو افسردہ بنا دیتا ہے۔ یہی حال قوم اور ملک کا ہوتا ہے۔ متوازن ترقی کی ضرورت کا خاص خیال ایمرجنسی میں رکھا جا رہا ہے۔ بے زمین افراد کو زمین، زرعی آلات اور بیج فراہم کرنے پر خصوصی توجہ اسی لیے دی جا رہی ہے کہ خوش حالی کے نئے سرچشمے بے اطمینانی، محرومی اور مایوسی کا کوئی جزیرہ نہ رہنے پائے۔ انصاف کا یہی تقاضا ہے۔

★

غلام محمد انور سلونوی

اے رہبر ہندوستاں

تیری عظمت کے ترانے گاتے ہیں پیر و جواں
زندہ باد اے اندرا اے رہبر ہندوستاں

دیش بھر میں ہو تری تدبیر کا سکّہ رواں — ہر کس و ناکس کے دل پر ہو تو ہی تو حکمراں
حاکم و محکوم پر عائد ہوئیں پابندیاں — ختم ہونے کو ہیں اپنی سب مجبوریاں

تیری عظمت کے ترانے گاتے ہیں پیر و جواں
زندہ باد اے اندرا اے رہبر ہندوستاں

ایکتا کی مسکراتی جاگتی تصویر ہے — اہل بھارت کے لیے یہ باعث توقیر ہے
اے ایمرجنسی یہ تیری جلوہ گر تنویر ہے — جگمگاتی ہر بشر کی دیکھیے تقدیر ہے

تیری عظمت کے ترانے گاتے ہیں پیر و جواں
زندہ باد اے اندرا اے رہبر ہندوستاں

اب تو غلّہ بھی مناسب بھاؤ سے ملنے لگا — مفلسوں کا کچھ تو جینے کا سہارا ہو گیا
تیرگی شام غم کا ہو چلا ہے خاتمہ — ہے افق پر جلوہ گر دیکھو اجالا صبح کا

تیری عظمت کے ترانے گاتے ہیں پیر و جواں
زندہ باد اے اندرا اے رہبر ہندوستاں

فتنۂ تخریب کاری حد سے جب آگے بڑھا — دیش میں قانون ایمرجنسی کا نافذ کر دیا
لفظ ناممکن تری حکمت سے ممکن بن گیا — زندہ باد اے اندرا پائندہ باد اے اندرا

تیری عظمت کے ترانے گاتے ہیں پیر و جواں
زندہ باد اے اندرا اے رہبر ہندوستاں

اے، م۔ شاہد

دیش کے دشمن

ڈرامہ

کِردار:

دولت چند ـــ ایک بیوپاری انکم ٹیکس آفس کے بڑے بابو

دارو غہ جی ـــ

من موہن ـــ ایک لیڈر

موہن چوپڑہ ـــ پلاسٹک فیکٹری کا مالک

بھولا ـــ دولت چند کا نوکر

منظر:

[دولت چند کا مکان۔
ایک بڑا کمرہ۔ فرش پر غالیچہ بچھا ہوا ہے۔ دیوار کی کھڑکی کے پاس ایک شیشے کی میز رکھی ہے۔ میز پر فون اور چند کاغذات رکھے ہوئے ہیں۔ میز کے قریب دو چار کرسیاں پڑی ہوئی ہیں۔ کمرے کے دائیں جانب ایک دوسرا کمرہ بھی کھلتا ہے۔ جب پردہ اٹھتا ہے تو دولت چند ایک گدّے دار کرسی پر بیٹھا ہوا اپنی توند پر ہاتھ پھیرتا ہوا نظر آتا ہے۔ بھولا کمرے میں داخل ہوتا ہے۔]

بھولا۔ کوئی نئے بابو آئے ہیں۔ آپ سے ملنا چاہتے ہیں؟

دولت چند (چونک کر) نئے بابو ـ؟ اچھا آنے دو۔

(موہن چوپڑہ کمرے میں داخل ہوتا ہے)

دولت چند۔ (کرسی کی طرف اشارہ کرکے) آیئے، بیٹھیے۔ کہیے کون ہیں آپ۔ کہاں سے آرہے ہیں؟

موہن چوپڑہ۔ (کرسی پر بیٹھتے ہوئے) میں کانپور سے آرہا ہوں۔ میں ایک پلاسٹک فیکٹری کا مالک ہوں۔ میں آپ کے اس شہر میں بھی ایک فیکٹری قائم کرنا چاہتا ہوں۔ شہر کے بہت سارے لوگوں سے پتہ چلا کہ آپ اس شہر کے بہت بڑے اور ایماندار بیوپاری ہیں۔ فیکٹری کے سلسلے میں میں آپ سے مشورہ کرنا چاہتا ہوں اور میں آپ کے مشورے پر ہی فیکٹری قائم کرنے کی بات سوچوں گا۔ میرا تو خیال ہے کہ آپ بھی فیکٹری میں ایک بڑی رقم لگا کر منافع حاصل کریں۔

دولت چند۔ بھئی مجھ سے جو بھی ہوگا آپ کے لیے کروں گا۔ مگر پہلے یہ تو بتائیے کہ آپ کی فیکٹری میں کیا کیا چیزیں تیار ہوں گی؟

موہن چوپڑہ۔ پلاسٹک کے تکیے، غلاف، چادریں، پاجامے، کرتے، ٹوپیاں اور جوتے۔

دولت چند۔ یہ سبھی پلاسٹک کے ہوں گے؟

موہن چوپڑہ۔ بالکل ـــ آپ کو یہ سن کر شاید تعجب ہوگا کہ ہماری فیکٹری میں پلاسٹک کی عورتیں بھی تیار کی جائیں گی۔

دولت چند۔ (چونک کر) عورتیں ـــ

موہن چوپڑہ۔ بالکل ـــ جب پلاسٹک کی عورتیں بازار میں آجائیں گی تو آج کے نوجوان گوشت پوست کی عورتوں کو بھول جائیں گے۔

(بھولا آتا ہے)

بھولا۔ انکم ٹیکس آفس کے بڑے بابو آئے ہیں۔

دولت چند۔ آنے دو۔

(بڑے بابو داخل ہوتے ہیں)

دولت چند۔ آئیے آئیے سرکار۔ بیٹھئے۔

بڑے بابو۔ آپ نے ٹیکس کی بقیہ رقم جمع نہیں کی ہے؟

دولت چند۔ جمع کر دوں گا سرکار۔ بزنس ذرا ڈھیلا چل رہا ہے۔ بقایا پیسے جائیں گے کہاں ـــ بھلا سرکار کے پیسے دبا کر کیے کیا جائے گا۔ بیٹھئے۔ کچھ ٹھنڈا پی کر جائیے۔

بڑے بابو۔ نہیں، میں جلدی میں ہوں۔ کل چپراسی کے ہاتھ ایک خط بھجوایا تھا۔ ملا ہوگا۔

دولت چند۔ ملا ہے۔ کب آپ کی لڑکی کی شادی ہو رہی ہے؟

بڑے بابو۔ اسی ماہ کی چوبیس تاریخ کو۔

دولت چند۔ بہت کم دن رہ گئے ہیں۔ خیر خط کے مطابق میں نے آپ کا انتظام کر دیا ہے۔ آپ دوسرے کمرے میں منشی جی سے مل لیجئے۔

(بڑے بابو دوسرے کمرے میں جاتے ہیں)

(دولت چند موہن چوپڑہ کی طرف دیکھتا ہے)

دولت چند۔ آپ اطمینان سے بیٹھئے۔ کھانا کھا کر جائیے گا۔

(بڑے بابو باہر آتے ہیں)

بڑے بابو۔ (مسکرا کر) اچھا اب میں چلتا ہوں۔

دولت چند۔ بہت اچھا۔

(بڑے بابو چلے جاتے ہیں)

جیسی پلاسٹک کی عورتیں جب بازار میں آئیں گی تو ایک ہنگامہ مچ جائے گا۔

موہن چوپڑہ ـــ بالکل۔

(بھولا آتا ہے)

بھولا۔ داروغہ جی آئے ہیں۔

دولت چند۔ آنے دو۔

(داروغہ جی کمرے میں داخل ہوتے ہیں)

دولت چند۔ آئیے داروغہ جی ـــ بیٹھئے۔ کہیے کیا سیوا کروں آپ کی؟

داروغہ جی۔ سیوا کو گولی ماریے۔ آپ کی جو نئی شراب کی دکان سوناری میں کھلی ہے۔ اس دکان کو سنبھالنا مشکل ہو رہا ہے۔ دکان پہ بہت بھیڑ لگی رہتی ہے۔ کل ایک بڑے گھر کے لڑکے کے ساتھ آپ کی دکان کے منشی جی سے جھگڑا ہو گیا ہے۔ صرف اس بات پر کہ وہ لڑکا شراب پی کر بہک گیا تھا۔ اس لڑکے نے تھانہ میں رپورٹ درج کرا دی ہے۔ آپ کی دوکان اٹھوا دی جائے گی۔ اوپر سے حکم آیا ہے۔

دولت چند۔ داروغہ جی۔ بھلا آپ کے ہوتے کہیں ایسا ہو سکتا ہے، جب تک آپ اس علاقہ میں ہیں تب تک میری دوکان بند نہیں ہو سکتی۔ آپ جانتے ہیں کہ اس شہر کے ہر نکڑ پر میری ایک شراب کی دکان ہے۔ لائسنس دلوانے والے آپ ہیں اور میرا اپنا خیال ہے کہ آپ سرکار کے آدمی کم ہیں۔ میرے زیادہ ہیں۔ آپ دوسرے کمرے میں منشی جی سے مل لیجئے۔

داروغہ جی۔ (خوش ہو کر) آپ بھی کمال کے آدمی ہیں سیٹھ جی۔ دل کی بات جان لیتے ہیں۔

(داروغہ جی دوسرے کمرے میں جاتے ہیں اور پھر جیب میں کچھ رکھتے ہوئے باہر نکلتے ہیں اور دولت چند کو سلام کر کے چلے جاتے ہیں۔)

(بھولا آتا ہے)

بھولا۔ من موہن جی آئے ہیں۔

دولت چند۔ آنے دو۔

(من موہن کمرے میں داخل ہوتا ہے)

من موہن۔ آداب۔

دولت چند آئیے من موہن جی۔ بیٹھئے۔ میں آپکے کام سے بہت

خوش ہوں۔ اگر طلبا کے ذہن میں گوداموں پر چھاپے مار کر اناج برآمد کرنے کی بات آجاتی تو میں برباد ہو جاتا۔ وہ سب سے پہلے میرے گوداموں پر چھاپے مارتے۔ کیونکہ اس شہر میں سب سے زیادہ میرے گودام ہیں۔ آپ نے بڑا اچھا کیا کہ جو انھیں اپنے بھاشن سے سرکار کے خلاف بھڑکا دیا۔

من موہن۔ مگر سیٹھ جی اب طلبا پر بھاشن کا جادو نہیں چلے گا کیونکہ وہ سب کچھ بھانپ گئے ہیں۔

دولت چند۔ کیسی باتیں کرتے ہیں آپ بھی۔ میں آپ کو کس کام کے پیسے دے رہا ہوں۔ سنئے۔ آپ چند لیڈر قسم کے طلبا کی مٹھیاں گرم کر دیں۔ وہ طلبا کو بھڑکائیں گے اور ان کا دھیان ہماری طرف سے ہٹ جائے گا اور ہم اپنا کام کرتے رہیں گے دوسری بات یہ کہ لیڈر قسم کے طلبا کو سمجھا دیجیے کہ وہ پہلی فرصت میں غریب طلبا کو سرکار کے ظلم کے خلاف بھوک ہڑتال پر بٹھا دیں۔ ان کو یہ ضرور سمجھا دیجیے کہ وہ بھوک ہڑتال کرنے والے لڑکوں کو بھوک ہڑتال پر بٹھانے سے پہلے پیٹ بھر کھانا کھلا دیا کریں۔ جو بھی خرچ آئے گا میں دوں گا۔ اور آپ کو کیا سمجھاؤں آپ تو اس شہر کے پرانے لیڈر رہیں۔ ہر بزنس مین کو آپ ہی جیسے لیڈروں پر بھروسہ ہے۔ آپ اب دوسرے کمرے میں جائیے اور منشی جی سے مل لیجئے۔

(من موہن دوسرے کمرے میں جاتا ہے)
دولت چند فائل سے کوئی کاغذ نکال کر بڑے غور سے دیکھتا ہے۔
من موہن کمرے سے باہر آتا ہے اور دولت چند کو سلام کر کے چلا جاتا ہے — اتنے میں فون کی گھنٹی بجتی ہے۔

دولت چند۔ (ریسیور اٹھا کر) کون۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں دولت چند بول رہا ہوں۔ ۔ ۔ ۔ کہو کیا بات ہے؟ رام پور والے سیٹھ بھگوان داس کا منشی آیا ہے۔ کیا ٹرک لے کر آیا ہے۔ ۔ ۔ کیا کہا ۔ ۔ ۔ ۔ اوہ ۔ ۔ ۔ چاول کی کتنی بوریاں چاہتا ہے۔ کیا کہا — ساتھ سو بوریاں ۔ ۔ ۔ کیا ۔ ۔ ۔ اسٹاک میں نہیں ہیں؟ کتنی بوریاں ہیں ۔ ۔ ۔ صرف چھ سو پچاس بوریاں ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ سنو ۔ ۔ ۔ ۔ ایسا کرو ۔ ۔ ۔ پتھر کنکر ڈال کر سات سو بوریاں کر دو — ارے اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے۔ تمہیں تو بارہا سمجھا چکا ہوں کہ ایسے معاملے میں کیا کرنا چاہیئے۔ ملاوٹ ہی پر تو ایک بیوپاری زندہ ہے ۔ ۔ ۔ ۔ سنو — چائے، میدہ اور گیہوں میں تم نے میرے کہنے کے مطابق ملاوٹ کی یا نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ؟ کیا کہا۔ اب تک نہیں کی — نوکری کرنی ہے یا نہیں —؟ سنو۔ رام پور کے منشی سے سات سو بوریوں کی قیمت وصول کر لو اور اسے سمجھا دو کہ ہوشیاری سے مال لے جائے — ان دنوں سی۔ آئی۔ ڈی کے آدمی سونگھتے پھرتے ہیں۔ اچھا اب تم اپنا کام کرو۔

(فون رکھتا ہے)

موہن چوپڑہ۔ سیٹھ جی میں ہوٹل نٹ راج سے فیکٹری سے متعلق تمام کاغذات لے آتا ہوں۔

دولت چند۔ جلدی آیئے گا۔ آج میرے گھر پر کھانا کھایئے گا۔

موہن چوپڑہ۔ بہت بہت شکریہ۔ ابھی آیا۔

(دولت چند فائل سے دو چار کاغذات نکال کر دیکھنے لگتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد ایک پولیس کی گاڑی دولت چند کے مکان کے سامنے آکر رکتی ہے۔ گاڑی سے ایک پولیس انسپکٹر اور دو سپاہی اترتے ہیں اور کمرے میں داخل ہوتے ہیں، دولت چند پولیس کو دیکھ کر گھبرا جاتا ہے۔)

پولیس انسپکٹر۔ آپ کے پاس کوئی آدمی کان پور سے آیا ہے؟

دولت چند۔ جی ہاں۔ تھوڑی دیر ہوئی کہ وہ کاغذات لینے ہوٹل نٹ راج گیا ہے۔

پولیس انسپکٹر۔ آپ اس سے واقف ہیں؟

دولت چند۔ جی نہیں۔ اتنا جانتا ہوں کہ وہ کان پور میں پلاسٹک فیکٹری کا مالک ہے۔ وہ اس شہر میں بھی ایک فیکٹری قائم

کرنا چاہتا ہے۔ اس سلسلے میں وہ مجھ سے تعاون چاہتا ہے۔ مگر انسپکٹر صاحب۔ دیکھنے میں وہ کچھ چار سو بیس لگتا ہے۔

(اتنے میں موہن چوپڑہ کمرے میں داخل ہوتا ہے)

دولت چند۔ (خوش ہوکر) یہی ہے وہ انسپکٹر صاحب۔ لیجیے آگیا۔

پولیس انسپکٹر۔ سیٹھ جی۔ یہ سی۔ آئی ڈی کے آدمی ہیں۔ ان کی رپوٹ کی بنیاد پر آپ کو گرفتار کیا جا رہا ہے۔ آپ ایک عرصہ سے بزنس کی اوٹ میں جو غلط کام کر رہے ہیں یہ سب کچھ جاننے کے لیے وہ آپ کے پاس آئے تھے۔ آپ جیسے لوگ دیش کو لوٹ رہے ہیں۔ آپ جیسے لوگ دیش کے دشمن ہیں۔ آپ کے کالے دھندے میں بعض بددیانت سرکاری افسران بھی شامل ہیں۔ انھیں بھی گرفتار کیا جائے گا — آپ کو نہیں معلوم کہ کل ایمرجنسی نہیں تھی مگر آج ایمرجنسی ہے۔ اس دور میں کسی بڑے سے بڑے آدمی کو بھی بخشا نہیں جائے گا۔

[پولیس انسپکٹر سپاہیوں کو اشارہ کرتا ہے۔ سپاہی آگے بڑھ کر دولت چند کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دیتے ہیں۔] (پردہ گرتا ہے)

نیا موڑ

احترام اسلام

کوئی ہم بے سبب گھبرا رہے تھے
اجالوں کو اندھیرے کھا رہے تھے
مسائل کی لگی تھی آگ ہر سو
دماغ و دل جھلستے جا رہے تھے

گلستاں تھا جہنم کا نمونہ
عجب ہی گل کھلائے جا رہے تھے
سمٹتے جا رہے تھے لوگ ڈر سے
غموں کے ناگ پھن پھیلا رہے تھے

بکھرتی تھی جہاں پر مسکراہٹ
وہیں آنکھوں میں آنسو آ رہے تھے
خدا جانے کہاں تھے سفینے
ہوا کے رخ پہ بہتے جا رہے تھے

مگر قسمت سے اب خوشیوں کے بادل
برسنے کے لیے منڈلا رہے ہیں
اُداسی مٹ رہی ہے اور دلوں میں
یقیں کے نقش ابھرتے آ رہے ہیں

تباہی منہ چھپائے پھر رہی ہے
مسائل خون سے تھرا رہے ہیں
حقیقت بن رہے ہیں سارے سپنے
روش کچھ ایسی ہم اپنا رہے ہیں

بلندی کی طرف مائل ہے سورج
سبھی سائے سمٹتے جا رہے ہیں
سیہ خانوں کے دل پر راج پاکر
اُجالے شان سے اترا رہے ہیں

نیا موڑ احترامؔ اتنا حسیں ہے
جسے پاکر سبھی اٹھلا رہے ہیں

عشرت قادری

بڑھتے قدم

اندرا ترے شاسن کے یہ دس سال سنہرے
لہراتے ہیں آکاش پہ دھرتی کے پھریرے

سونے سے سجل کھیت ہیں تن جھوم رہا ہے
وہ شکتی ہے کہ آریہ بھٹ گھوم رہا ہے
جھک جھک کے ہمالہ کو گگن چوم رہا ہے

آشاؤں کی اک جوت نئی جاگی ہے من میں
پھوٹی ہیں اندھیروں کا جگر چیر کے کرنیں
پگ پگ پہ مدھر گیت سے گاتی ہوئی نہریں

"بیس سوتری" کرنیں ہمیں دیتی ہیں سندیسہ
بھارت میں غریبی کا چلن رہ نہیں سکتا
جیون کے نئے رنگ نکھارے ہے ترنگا

جڑ فرقہ پرستی کی نہ اب پھیلنے دیں گے
ہم ایک ہیں سب ایک ہی دھارے میں بہیں گے
انسان تھے، انسان ہیں، انسان رہیں گے

اٹھتی ہیں جہیز اور دکھاوے کی یہ رسمیں
دو پھول ہوں اک گنبے میں کھائی ہیں یہ قسمیں
بدلیں گے سماج اپنا کہ دن رات ہیں بس میں

ظہیر کیفی امروہوی

دغاباز

(افسانہ)

سیٹھ علیا بھائی نے سو روپے کا نوٹ دیتے ہوئے اکبر کو سمجھایا "تم ابھی ٹیکسی پکڑ کر شیومڑی جاؤ اور بابا کی درگاہ پہ جتنے فقیر ہوں سب کو کھانا کھلاؤ۔" اکبر نے سیٹھ علیا بھائی کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے جواب دیا "سیٹھ جی آج انکم ٹیکس کی تاریخ بھی تو ہے وکیل کے پاس کورٹ میں بھی تو جانا ہے۔" "ادھر میں ڈوقو بھائی کو بھیجتا ہوں۔ تم اپنا کام کرو، کھانے کا سمے ہو رہا ہے۔" اکبر نے ہونٹوں میں کچھ ادھورے الفاظ چبائے مگر وہ سیٹھ سے کچھ نہ کہہ سکا۔ سیٹھ کے مزاج کا کیا بھروسہ گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ، ابھی فقیروں کو کھانا کھلانے کے لیے سو روپے خود دیے ہیں مگر میری تنخواہ کی رتی برابر بھی پروا نہیں۔ مہینے کی دس تاریخ ہو چکی ہے مگر میری ضرورت اور پریشانی کا قطعی احساس بھی نہیں کیا۔ اسٹور سے ادھار ملنا بھی بند ہو گیا۔ گھر میں چھ بچے کھانے والے۔ بھوکے پیٹ کتنے دن رہا جا سکتا ہے۔ بچے بغیر لباس کے اسکول کیسے جا سکتے ہیں اور خود اس کی بیوی جہرن کئی دن سے بخار میں تپ رہی ہے لیکن علاج کے لیے ایک نیا پیسہ تک گھر میں موجود نہیں ہے۔ اگر خود اس کے پاس لوکل ٹرین کا پاس نہ ہوتا تو وہ پورے دس میل چل کر اپنی نوکری پر کیسے آ سکتا تھا؟ اتنے سارے معاملات اور پریشانیوں کے باوجود اکبر نے سیٹھ سے تنخواہ کا مطالبہ تک نہیں کیا وہ اپنی بے وقوفی کو کوستا ہوا سیٹھ کے دفتر سے نکل گیا۔ وہ چاہتا تو ان سو روپیوں میں سے کچھ روپے بچا سکتا تھا اور شیومڑی جانے کے بجائے مزنگ گاؤں کی جھونپڑپٹی کا راستہ لیتا۔ جہاں اس کی بیوی جہرن نیم بے ہوشی کی حالت میں پڑی ہوئی تھی اور بچے بھوک سے بلک رہے تھے۔

اکبر سیٹھ علیا کا پرانا اور بڑا وفادار نوکر تھا۔ اسے بس ایک ہی احساس ستاتا رہتا تھا جیسے تیسے کر کے اپنا وہ اعتبار اور اعتماد قائم رکھ سکے جس کو سیٹھ پسند کرتا تھا اس پر چاہے کتنی ہی بڑی آفت اور مصیبت آ جائے مگر وہ اپنے فرض سے لاپرواہی اور بددیانتی اختیار نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی ملازمت میں کئی ایسے خطرناک موڑ آئے تھے جن کی وجہ سے وہ ڈگمگا سکتا تھا لیکن وہ ان لمحوں کو بھی بڑی خوش اسلوبی سے گزار چکا تھا۔ اور یہ سب کچھ اس کی فطرت کا تقاضہ بھی تھا اس نے جوان ہو کر اپنے باپ سے اگر کوئی نصیحت سنی تھی تو یہی کہ مالک کے وفادار رہنا، ایمانداری پہ قائم رہنا، اپنے فائدے کو بھول کر ذمہ داری کو نبھانا اور خود غرضی اور دھوکہ دہی کے نزدیک نہ جانا۔ اکبر اپنے باپ کی نصیحت کو ایک متاع کی طرح سنبھالے رہا تھا اس وقت بھی جب اس کا باپ مردہ حالت میں بے گور و کفن پڑا ہوا تھا۔ اور اس کی جیب خالی تھی۔ وہ چاہتا تو سیٹھ سے مدد مانگ سکتا تھا لیکن اس کی غیرت اور باپ کی نصیحت نے اسے سب کچھ بھلا دیا تھا، اسے اس خطرناک اور غمناک

ساعت میں کبھی اپنے فرض، ذمہ داری اور ایمان کا ہی احساس تھا اور یہ مصیبت بھرا لمحہ بھی جیسے تیسے کرکے گذر گیا تھا اکبر نے اپنے ایک شناسا سے روپیہ ادھار لے کر باپ کی تجہیز و تکفین کا فریضہ انجام دیا تھا۔

زندگی کی گاڑی تو چل ہی رہی تھی مگر دو سو روپے کی تنخواہ میں بڑھتی ہوئی مہنگائی کا سامنا کرنا کتنا دشوار تھا یہ اُس کی بیوی مہرن ہی جانتی تھی۔ اس لیے وہ اکثر اکبر سے کہتی تھی۔ "سیٹھ کو تم بولتے کیوں نہیں کہ ہمارا گذارہ اتنے کم روپیوں میں نہیں ہوتا۔ پگار بڑھوانے کی کوشش کرو نا۔" مگر اکبر عجیب خمیر کا بنا تھا کہ بیوی کی بات پر دھیان بھی نہیں دیتا تھا۔ حالانکہ ہر روز ہی بیوی کی کڑوی کسیلی باتوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ نئی نئی ضرورتوں اور پریشانیوں کو سہنا پڑتا تھا۔ بچوں کی فوج کو زندگی کی بہت سی محرومیوں کا عادی بناتے بناتے وہ خود بھی تنگ آگیا تھا۔ لیکن اس نے سیٹھ سے اپنی ضرورت، پریشانی اور مصیبت کے بارے میں ایک لفظ بھی کبھی نہ کہا تھا۔ ہمیشہ ہی وہ اپنے دکھ بھول کر سیٹھ کی اطاعت کرتا تھا۔ اپنی نوکری اور ذمہ داری نبھاتا تھا۔ سیٹھ کو وہ احساس ہی نہیں ہونے دیتا تھا کہ وہ دکھی ہے پریشان ہے۔ اپنے بچوں کی ضرورتوں، موجودہ مہنگائی، اور بیوی کی بیماری کے لیے اگر وہ سیٹھ سے مالی اعانت کا اظہار کرتا تو یہ ممکن تھا کہ سیٹھ علیا بھائی اسے ہزار پانچ سو روپے آسانی سے دے دیتا، یا اس کی تنخواہ بڑھا دیتا، بغیر روئے تو ماں بھی بچے کو دودھ نہیں پلاتی۔ پھر سیٹھ بھلا کیوں اپنی فیاضی سے اکبر کو نوازتا، یہ تو خود اُس کی اپنی ہی خطا اور کوتاہی تھی جس کے نتیجے میں وہ بچوں کو بھوکا رکھے ہوئے تھا اور بیوی کو بغیر دوا دارو کے بخار میں پھنکتا ہوا چھوڑ کر، اپنی ذمہ داری کو نبھانے، سیٹھ کے حکم کے بموجب شیو ڑی چلا گیا تھا۔ اکبر کو مزنگ گاؤں اپنی جھونپڑی تک واپس لوٹنے میں روز ہی رات کے نو بج جاتے تھے۔ وہ صبح کو ۹ بجے گھر سے نکلتا تھا۔ وہ دوپہر کا کھانا نہیں کھاتا تھا۔ اب تو اسے یہ بھی یاد نہیں تھا کہ کبھی وہ دو وقت کھانا کھاتا بھی تھا۔ اتوار کے دن بھی وہ سیٹھ کے فلیٹ پر کاؤسس جی اسٹریٹ چلا جاتا تھا اور ان کے لیے گھریلو ضروری کام انجام دیتا تھا۔

سیٹھ علیا بھائی کی پانچ بیویاں تھیں۔ سب کی الگ الگ کاریں تھیں، ان کی عمروں اور لباسوں کی طرح مختلف رنگوں، ماڈل اور سائز کی۔ سیٹھ علیا بھائی کی اپنی دس منزلہ بلڈنگ تھی۔ نصف بلڈنگ میں اُس کی بیویاں رہتی تھیں اور نصف میں سیٹھ علیا بھائی کا چھوٹا بھائی چینا بھائی رہتا تھا۔ اُس کی بھی پانچ بیویاں اور پانچ گاڑیاں تھیں۔ بمبئی میں ان کا کاروبار ایک سرے سے دوسرے کونے تک پھیلا ہوا تھا۔ بمبئی سے باہر سورت اور گجرات تک، لیکن دونوں بھائیوں کے کوئی اولاد نہ تھی۔ دونوں سیٹھوں کو اگر کوئی کمی تھی تو بس اولاد کی۔ سیٹھ علیا بھائی کئی برس سے ہر جمعرات کو اکبر کو سو روپے کا نوٹ دیتا اور کہتا۔ "شیوڑی جاؤ اور بابا کی درگاہ سے فقیروں کو کھانا کھلاؤ۔" اکبر بھی ایک مشینی پرزے کی طرح یہ فریضہ انجام دیتا رہتا تھا۔ سیٹھ کہتا "تم ٹیکسی پکڑ کر جاؤ۔" مگر اکبر ہمیشہ ہی لوکل ٹرین میں سفر کرتا تھا۔ سیٹھ کو پتہ ہی نہیں تھا کہ اکبر ان کے حکم کو کس طرح بجا لاتا ہے۔ سیٹھ کو اکبر پر پورا بھروسہ تھا، اعتماد تھا۔ اور اس اعتماد کو اکبر نے ہمیشہ نبھایا تھا۔ مگر بابا کے مزار کے فقیروں کی دعاؤں نے بھی سیٹھوں کے گھروں کو بچوں کی دولت سے مالا مال نہیں کیا۔ ہاں ان دعاؤں کا اگر کوئی نتیجہ تھا تو سیٹھوں کی روز بروز بڑھتی ہوئی لاتعداد دولت اور کاروبار۔ سیٹھ بڑا فیاض تھا۔ وہ تبلیغی جماعت والوں کو دل کھول کر چندہ دیتا تھا۔ مذہبی اداروں کو امداد دیتا تھا۔ مسجدیں تعمیر کرانے والوں اور دینی مدرسے کھولنے والوں کو بھی سیٹھ علیا بھائی خاطر خواہ عطیات دیتا تھا۔ اور یہ سارے کام اکبر کے ذریعے ہی انجام پاتے تھے۔ اکبر چاہتا تو اب تک لاکھوں روپیوں کا مالک ہو سکتا تھا اس کا

اپنا الگ کاروبار ہو سکتا تھا۔ سیٹھ علیا بھائی کا ملازم ہونے کے بجائے کسی کمپنی، دفتر یا کارخانے کا وہ بھی سیٹھ بن سکتا تھا۔ اکبر کی بس ایک ہی کمزوری تھی اور وہ تھی اس کی تعریف۔ سیٹھ جیسا بڑا آدمی جب اپنے کسی واقف کار کو بتاتا ”بیس برس سے اکبر ادھر کام کرتا ہے۔ سوئی کے ناکے کے برابر بھی کبھی بے ایمانی نہیں کرتا۔ چاہتا تو جھونپڑی کو چھوڑ کر میرے پاس ہی فلیٹ میں رہ سکتا تھا مگر رہے گا دس میل دور ہی۔ لوکل ٹرین میں دھکے کھانے کا اس کا چسکہ ہی نہیں چھوٹتا۔“ سیٹھ سے اکبر اپنی تعریف سن کر کسی مجذوب کی طرح دنیا و مافیہا سے گم ہو جاتا تھا!!

پہلی بار سیٹھ علیا بھائی نے خود شیو مڑی بابا کی درگاہ پہ پہنچ کر اکبر کو پرکھنے اور جانچنے کی کوشش کی تھی۔ اسے محسوس ہوا شاید سیٹھ کو میری نیت پہ آج شک ہو گیا ہے۔ ورنہ وہ کیوں میرے ساتھ آتا۔ سیٹھ نے اسے جلدی سے گاڑی میں اپنے ساتھ بٹھایا۔ اور پھر ڈرائیور کو گاڑی تاریک سڑک پہ جلدی لے جانے کو کہا۔ راستے کے مختلف سگنلوں پہ ٹھہرتے، رکتے سیٹھ علیا بھائی اکبر کا جائزہ لینے لگا۔ دونوں کی نگاہیں ایک دوسرے سے ٹکرا جاتیں، دونوں ہی چپ تھے۔ اکبر کو محسوس ہو رہا تھا کہ سیٹھ اس سے ناراض ہو گیا ہے۔ اور اپنی ناراضگی کے نتیجہ میں وہ اسے کسی پولیس اسٹیشن پہ لے جا رہا ہے۔ لیکن وہ یہ سوچ کر بھی مطمئن تھا کہ سیٹھ کا کوئی الزام، تہمت، غصہ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ کیونکہ وہ بے قصور ہے۔ اور ہر قسم کی بے ایمانی اور بددیانتی سے دور ہے۔ مگر ایک شک اور شبہ اور تجسس اس کے ذہن و دل کو ہیجان و اضطراب میں مبتلا کیے ہوئے تھا۔ سیٹھ کے اس پُراسرار اور خشم ناک رویے پہ وہ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا رہا تھا اور اپنے ماضی کے ایک ایک پل کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔ تاریک سڑک پہ پہنچ کر سیٹھ نے اس سے صرف اس قدر پوچھا ”ڈرائیور کو بتا دو تم کہاں رہتے ہو۔“

اس نے بھی اسی قدر مختصر طور پہ ڈرائیور کو اپنا پتہ بتا دیا لیکن اس نے سوچا، تو کیا سیٹھ میری بے عزتی میرے ہی گھر پہ میرے بھوکے بچوں اور بیمار بیوی کے سامنے کرنا چاہتا ہے، یا میری جھونپڑی کی تلاشی لینے وہ میرے ساتھ جا رہا ہے۔ چند منٹوں بعد گاڑی مزنگ جھونپڑ پٹی پہنچ گئی۔ سیٹھ اکبر کے کاندھے پہ اپنے ہاتھ کا دباؤ دیتے ہوئے اس کی جھونپڑی میں چلا گیا۔ اکبر کی بیوی بے ہوشی میں جانے کیا کیا بڑبڑا رہی تھی۔ اور اس کے بچے بھی بھوک سے تنگ آکر لڑتے جھگڑتے سو گئے تھے۔ جھونپڑی میں سامان کے نام پہ کچھ بھی نہ تھا۔ کچھ بچے۔ ایک کے بعد ایک، چھوٹی چھوٹی عمر کے۔ سیٹھ نے حیرت کے ساتھ کہا ”ارے تم ادھر رہتا ہے جانوروں کے مافک، اور بیمار بائی کو بھی ادھر ہی ڈال رکھا ہے۔ ہاسپٹل کیوں نہیں لے گیا۔“ اکبر چپ رہا اور غصے میں اندر ہی اندر کھولتا رہا۔ اسے سیٹھ کی اس غفلت شعاری پہ اور بھی غصہ آیا کہ اس نے تنخواہ کے نام پہ اب بھی کوئی پیسہ جیب سے نکالنے کی ضرورت کیوں نہیں سمجھی۔ سیٹھ علیا بھائی ہمدردی کے لہجہ میں بولا ”اکبر اب تم ادھر نہیں رہے گا۔ سب بابا لوگ اور تیری بائی ہمارے ہی پاس رہے گی۔ بس جب تک یہ ایمرجنسی کا چکر ہے تب تک تم ادھر اور رہ لو۔ ہمارے اوپر تو بڑی مصیبت آپڑی ہے۔ انکم ٹیکس والے دھاوا بول کر ایک ایک فلیٹ کی تلاشی لے رہے ہیں۔ ایک ایک کاغذ پڑھ رہے ہیں۔ ایک ایک چیز کی پڑتال کر رہے ہیں۔ تم ہی بتاؤ جینا حرام ہے یا نہیں، دیکھو گاڑی کی ڈکی میں ہمارے ایک نمبر کے کھاتے ہیں۔ تم اس بکس کو اپنی جھونپڑی میں سنبھال کے رکھ لو۔ ایمرجنسی ہٹتے ہی واپس لے لوں گا۔ دیکھو کسی کو بولنا نہیں۔ نہیں تو اپنی کی بڑی بے عزتی ہو گی، گورنمنٹ بھی نہیں چھوڑے گی جیل میں ٹھونسے بنا۔ تم بہت اچھا آدمی ہے۔ ایمان دار ہے، نیک ہے۔ ہم بہت خوش ہے تم سے پر تم بولو۔ تم کیا چاہتے ہو جتنا پیسہ مانگنا چاہو مانگ لو ہم دے گا ابھی کھڑے کھڑے — بولو۔

بولو۔ چپ کیوں ہو"۔ اکبر بڑی جرات سے شاید پہلی بار سیٹھ سے آنکھیں ملاتے ہوئے بولا۔ "سیٹھ ہم کو اور کچھ نہیں چاہیے آج دس تاریخ ہو چکی ہم کو تو بس اپنی پگار چاہیے۔ ہم کوئی بھی غلط کام نہیں کر سکتا۔ سیٹھ ہم غریب آدمی ضرور ہے' چھوٹا آدمی' جھونپڑی میں جانوروں کی طرح رہنے والا۔ پن ہم اپنی سرکار اور دیش سے دغا نہیں کرے گا' ہم پہلی بار آپ کی بات نہیں مان سکتا۔ اس کے لیے چاہے آپ ہم کو نوکری سے نکال دیں۔ یا پولیس کے حوالے کر دیں۔ پن ہم آپ کے ساتھ مل کر اپنی حکومت سے غداری نہیں کرے گا' ہم غدار رہ کر جینا نہیں چاہتا۔ عزت اور ایمان داری سے مرنا چاہتا ہے۔ چاہے اس کے لیے ہمیں اپنے بھوکے بچوں اور بیمار عورت کی قربانی کیوں نہ دینی پڑے"!

اکبر کا یہ روکھا اور ٹکا سا جواب سن کر سیٹھ علیا بھائی کے قدموں سے اس جھونپڑی کی جیسے چار گز زمین نکل گئی' جہاں وہ پناہ لینے آیا تھا....

★

ایمرجنسی کا اعلان اور جمہوریت کا استحکام (صفحہ ۵ کا بقیہ)

برسر اقتدار جماعت کی ذمہ داریاں بھی بڑھ گئی۔ اب پیچھے ہٹنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ کسی جگہ تھما بھی نہیں جا سکتا۔ ترقی وقت ملک کا مقدر بن گئی ہے۔ یہ ایک ضرورت بھی ہے اور مجبوری بھی۔ پہلے جو بدنظمی پیدا ہو گئی تھی اور فسطائیت پسند اور فرقہ پرست عناصر تحریر و تقریر کی آزادی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر عوام کے لیے جو سنسنی اور خلفشار فراہم کر رہے تھے اس کی وجہ سے ضبط و نظم کی پابندی کچھ لوگوں کو شروع میں کھلی لیکن اب اس پابندی کے فائدے بھی سامنے آ رہے ہیں اور ہمیں تلاق نسخے کے استعمال سے جیسے جیسے زخم مندمل ہو رہا ہے ویسے درد بھی کم ہوتا جا رہا ہے۔

اسی اثنا میں جمہوریت سوشلزم اور سیکولرزم کو ہندستان کے دستور کے بنیادی مقاصد میں شامل کر لینے کی بات تقریباً طے ہو گئی ہے۔ یہ چیزیں دستور میں بالواسطہ طور پہلے بھی موجود تھیں لیکن ان کی صراحت نہ ہونے سے غرض مندانہ مفاد پرست طبقے غلط فہمیاں پھیلا رہے تھے۔ صراحت ہو جانے سے ایک طرف ان طبقوں پر قدغن لگ جائے گا اور دوسری طرف حکومت اور عوام دونوں کی ذمہ داریاں بڑھ جائیں گی۔

★

کایا پلٹ (صفحہ ۲۴ کا بقیہ)

ایک بھیڑ ـــــ آوازوں کے ساتھ گھر میں گھس آئی۔

مہاجن اور زمیندار کی آوازیں۔

ایک آواز ـــــ دکھیا ـــــ یہ رہا تیرا جوتا۔

آوازیں ـــــ مہاجن جوتا چور۔

چور کو پکڑو ـــــ ارے یہ دوسرا چور کا بھائی گرہ کٹ ہے۔ اس کو بھی پکڑو ـــــ لے چلو پنچایت گھر ـــــ بہت سی ملی جلی تیز آوازیں۔

★

آزادی نمبر

نیا دور

جلد ۳۲ نمبر ۵

اگست سنہ ۱۹۷۶ء

ایڈیٹر: خورشید احمد

جوائنٹ ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی

★

پبلشر: یوگیندر نرائن

ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات و رابطۂ عامہ اترپردیش

پرنٹر: اشوک در

سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ واسٹیشنری یوپی
مطبوعہ نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ

شایع کردہ محکمہ اطلاعات و رابطۂ عامہ۔ اترپردیش

سرورق: جاوید حسن

قیمت فی شمارہ: پچاس پیسے
زرِسالانہ: پانچ روپے

ترسیل زر کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ پرکاشن وبھاگ انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو۔پی۔ لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶۔ لکھنؤ

بذریعہ رجسٹری: ایڈیٹر نیا دور انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو۔پی۔ لکھنؤ

عنوانات

نیا دور کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ حکومت اترپردیش ان سے متفق ہو

اپنی بات

ہماری آزادی کو ۲۹ سال پورے ہو چکے ہیں۔ اس سال ہم تیسواں یوم آزادی منا رہے ہیں۔ یہ آزادی بڑی قربانیوں، جانفشانیوں اور جدوجہد کے بعد حاصل ہوئی ہے۔ کسی نو آزاد ملک کے لیے اگرچہ ۲۹ سال کا عرصہ کچھ زیادہ نہیں ہوتا لیکن اس قلیل مدت میں بھی ہمارے ملک نے اپنی آزادی کو مستحکم بنانے کے لیے جو ٹھوس قدم اٹھائے ہیں ان کے نتائج سامنے آتے جا رہے ہیں۔ گزشتہ سال ہمارے لیے بڑی کامیابیوں اور ترقیوں کا سال تھا۔ ایمرجنسی کے سبب ملک میں ضبط و نظم کی ایک عام فضا قائم ہو گئی ہے۔ ہر شعبۂ حیات میں خاص طور سے تعلیمی، صنعتی اور معاشی میدانوں میں ملک نے ہمہ جہت اور تیز رفتار ترقی کی ہے۔ ملک کی اس ہمہ گیر ترقی کا خاص سبب ہماری محبوب وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کا دیا ہوا وہ ۲۰ نکاتی معاشی پروگرام ہے جو اب ۲۴ نکاتی پروگرام ہو گیا ہے۔ اور جس نے صرف ایک سال کی مدت میں ملک کی کایا ہی پلٹ دی ہے۔ گزشتہ سال کا ایک بڑا کارنامہ افراط زر پر قابو پانا ہے۔ ہم خود کفالت کی جانب برابر بڑھتے ہی جا رہے ہیں۔ اب ہم کو اپنی غذائی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے دوسرے ممالک کا سہارا لینا نہیں پڑتا ہے۔ مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو نے آزاد ہندوستان کے لیے جو خواب دیکھا تھا اور اس کو سوشلزم اور سیکولرزم کی جس منزل تک لے جانا چاہتے تھے، شریمتی اندرا گاندھی کا اعلان کردہ معاشی پروگرام اس منزل تک پہنچانے کا ایک بہت ہی بڑا اور انقلابی قدم ہے جس نے ملک بھر میں بیداری کی نئی لہر پیدا کر دی ہے۔ ہماری ریاست اتر پردیش میں بھی اس معاشی پروگرام کے نتیجے میں ایک ہمہ گیر ترقی کے نئے دور کا آغاز ہو گیا ہے اور پردیش مکمل سماجی معاشی انقلاب کی جانب تیزی سے گامزن ہے۔ اس قلیل عرصے میں پردیش میں سماج کے کمزور طبقوں کی فلاح و بہبود کے لیے متعدد ٹھوس قدم اٹھائے گئے، جن کے نتیجے میں ۴ لاکھ بے زمین مزدور خاندانوں کو مہاجنوں کے صدیوں پرانے قرضوں سے نجات مل گئی ہے۔ پابند مزدوری کا بھی دور ختم ہو چکا ہے، ۳۶ء۱۸ لاکھ ایکڑ اراضی ۵۵ء۱۹ لاکھ بے زمین مزدوروں میں تقسیم کی جا چکی ہے، ۱۲ لاکھ سے زیادہ کنبوں کو رہائشی پلاٹ الاٹ کیے جا چکے ہیں، ریاست میں آبپاشی کا ایک نیا ریکارڈ قائم کیا جا چکا ہے جس کے سبب غذائی پیداوار میں برابر اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور بجلی کی موجودہ صلاحیت ۲۲۰۳ میگاواٹ تک پہنچ چکی ہے۔ دیہی بجلی کاری کی جنتا اسکیم کے تحت ہریجنوں اور دوسرے کمزور طبقوں کو ایک لاکھ نئے کنکشن اور سال کے آخر تک تمام صنعتی اداروں کو بجلی کی سہولت مہیا ہو جائے گی۔ صنعتی میدان میں بھی نمایاں ترقی ہوئی ہے۔ چنانچہ ۹۵ صنعتی بستیوں میں ضروری سہولتیں فراہم کی جا چکی ہیں۔ ان بستیوں میں ۱۰۰ کروڑ روپے کے سرمایہ سے جلد ہی نئے صنعتی واحدے قائم کر دیے جائیں گے۔ دس ہزار چھوٹے واحدوں پر مشتمل ایک وسیع و عریض صنعتی بستی اوکھلا ضلع بلند شہر میں قائم کی جا رہی ہے۔ ہینڈلوم کی ترقی کے لیے ۲۰ نئی کتائی ملیں اور متعدد دستکرگھا صنعتی بستیاں قائم کی جا رہی ہیں۔ تعلیم کے میدان میں بھی ہمہ جہت ترقی ہوئی ہے۔ پہلے درجہ سے پانچویں درجے تک کے ۔۔۔۴۴ طالب علموں کو نصابی کتابیں مفت مہیا کی گئیں۔ اسکولوں اور کالجوں کی کتابوں کی قیمتوں میں ۲۰ سے ۳۰ فی صد تک کی کمی ہوئی۔ تمام ڈگری کالجوں میں کتب بنک قائم کر دیے گئے ہیں۔ کتب بنک کی اسکیم انٹرمیڈیٹ کالجوں اور ہائی اسکولوں میں بھی شروع کی جا رہی ہے۔ ہوسٹلوں میں تھوک قیمت پر ضروری اشیا کی فراہمی کی جا رہی ہے۔ صارفین کے مفاد کے لیے سستے غلہ کی دکانوں کی تعداد بڑھ کر تقریباً ۴۴ ہزار تک پہنچ گئی۔ ضروری اشیا کی قیمتوں میں بھی ۱۰ سے ۳۰ فی صد تک کی کمی ہو گئی ہے۔ ملک میں آبادی کے تیز رفتار اضافے نے اس وقت ایک سنگین مسئلے کی صورت اختیار کر لی ہے اور یہ جنگی پیمانے پر حل کرنے کی سعی کی جا رہی ہے۔ اتر پردیش بھی اسی سنگین مسئلے کو حل کرنے اور خاندانی منصوبہ بندی پروگرام کو کامیاب بنانے اور اس طرح اضافہ آبادی کو روکنے کی کوششوں میں پیش پیش ہے۔ پردیش میں خاندانی منصوبہ بندی کی رفتار ترقی کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ اگست کے دوسرے ہفتے تک ایک لاکھ سے زائد نس بندی کے آپریشن ہو چکے تھے۔ ریاست میں سال کے آخر تک ۱۵ لاکھ آپریشن کا نشانہ مقرر کیا گیا ہے۔ اس سلسلے میں ۴۲ گشتی یونٹیں قائم کی جا چکی ہیں اور ریاست میں اوسطاً ہر مہینے چالیس ہزار نس بندی آپریشن کیے جا رہے ہیں۔ ان اعداد و شمار سے ظاہر ہو جائے گا کہ خاندانی منصوبہ بندی پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ریاست اتر پردیش کس مستعدی کے ساتھ سرگرم عمل ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ چھوٹے خاندان کے فوائد کو عوام رفتہ رفتہ محسوس کر کے خاندانی منصوبہ بندی کو اپناتے جا رہے ہیں۔ اس سلسلے میں بعض شکوک و شبہات بھی دور ہو رہے ہیں اور وہ لوگ بھی جو مذہب اور دھرم کو بنیاد بنا کر نس بندی کرانے میں جھجھک محسوس کر رہے تھے، آگے بڑھ رہے ہیں اور نس بندی کے لیے خود کو پیش کر رہے ہیں۔ یہ خاندانی منصوبہ بندی مہم کی کامیابی کے لیے ایک فال نیک ہے۔

آہ مولانا فارقلیط

مولانا محمد عثمان فارقلیط مرحوم سابق ایڈیٹر روزنامہ الجمعیۃ۔ دہلی کی ذات گرامی کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ آپ میدان صحافت کے ایک ایسے عظیم المرتبت شہسوار تھے جس کی مثال مشکل سے ڈھونڈے ملے گی۔ مولانا فارقلیط کا شمار صف اول کے ان صحافیوں میں تھا جنھوں نے اردو صحافت کو اپنے خون جگر سے سینچ کر پروان چڑھایا اور اس کو بام ترقی تک پہنچا دیا۔ آپ ایک بے باک اور نڈر صحافی تھے۔ صحافت آپ کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ اسی لیے ان کو کسی ستائش اور صلے کی پرواہی نہ تھی۔ صحت مند اور تعمیری تنقید کو وہ کامیاب صحافت کا لازمی جز سمجھتے تھے اور آخر دم تک وہ اپنے اصولوں پر مستعدی سے ڈٹے رہے۔ آپ کے انتقال سے اردو صحافت میں ایک ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے جس کا پُر ہونا مشکل ہی نظر آتا ہے۔ البتہ صحافت کے میدان میں ان کے نقش قدم ہمیشہ تابناک رہیں گے اور مستقبل کے صحافیوں کی رہنمائی کرتے رہیں گے۔ خدا مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔

— ایڈیٹر

نازش پرتاب گڑھی

پیام

مرا قلم جو ہے دردِ حیات کی تصویر
مرا قلم کہ ہے صد چاک آستیں کی طرح
مرا قلم جو بٹا ہے مری زمیں کی طرح
اسے مورخِ فردا کو کس طرح سونپوں
میں اس قلم کے مقدر پہ خود پشیماں ہوں
مرے وطن کی نئی نسل اس سے دُور رہے

میں چاہتا ہوں مرے بعد جو قلم اُٹھے
چمن کی بات کرے، گل کی داستاں لکھے
بیانِ شوق کرے، وصفِ دلبراں لکھے
حدیثِ حسن بہ حرفِ دل جواں لکھے

مرا یقین، مرا عزم، میری بے باکی
مرا ضمیر، امانت ہے صبحِ فردا کی
مرے خلوصِ سخن کو بچا کے رکھنا مگر
مری حیات کو ہرگز نہ رہ گزر دینا
مرے قلم کو مرے ساتھ دفن کر دینا
کہ یہ عذاب نئی نسل تک پہنچ نہ سکے

یہ نو بہارِ وطن، تازہ واردانِ چمن
یا ہیوں کا جگر ان کو چاک کرنا ہے
دلوں میں عزم و ارادہ کی روشنی لے کر
سنوارنا ہے انھیں عارضِ عروسِ وطن
مزاجِ لالہ و گل کی شگفتگی لے کر
مرے وطن کی نئی نسل کو نئے ڈھب سے
یقین و جہد کی اک داستان لکھنی ہے
کتابِ عظمتِ ہندوستان لکھنی ہے

عبدالمجیب سہالوی

آزادی صرف پھولوں کی سیج نہیں

آزادی ایک بڑی نعمت ہے لیکن یہ صرف پھولوں کی سیج ہی نہیں بلکہ کانٹوں کا تاج بھی ہے۔ یہ اپنے دامن میں جہاں بہت سی آسانیاں اور سہولتیں لاتی ہے اسی کے ساتھ ساتھ اپنی نعمتوں سے فیض یاب ہونے والوں کے کاندھوں پر کچھ بھاری ذمہ داریاں بھی ڈالتی ہے۔ وہ لوگ جو ان ذمہ داریوں کو اٹھانے کے لیے اپنے کو تیار نہیں کرتے وہ اپنے بزرگوں کی قربانیوں اور ان تھک کوششوں سے حاصل کی جانے والی آزادی کی نہ تو زیادہ دنوں تک حفاظت کر سکتے ہیں اور نہ اس سے خاطر خواہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ سیاسی آزادی آخری منزل نہیں بلکہ وہ منزل مقصود کی طرف بڑھنے کے لیے راہ کھولتی ہے۔ دراصل ترقی اور خوش حالی کا سفر سیاسی آزادی کے بعد ہی شروع ہوتا ہے۔

بیرونی اقتدار کے خاتمے اور غلامی کی زنجیروں کے ٹوٹنے کے بعد اگر دیس کی جنتا اور عام لوگوں کی روکھی پھیکی زندگی میں خوش حالی کی ہریالی نہ آئی اور وہ اسی طرح ننگے بھوکے، بے گھر، ان پڑھ اور بیمار رہے تو یہ آزادی بالکل سطحی اور بے معنی ہوگی۔ کسی ملک کی ترقی اور حقیقی خوش حالی کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ چند گنے گنے لوگوں کے یہاں دولت کی ریل پیل ہو جائے، ان کی فلک بوس عمارتیں کھڑی ہو جائیں اور ان کے لیے یہ دنیا جنت بن جائے۔ اور دوسری طرف عام لوگوں کی زندگی میں کوئی فرق نہ آئے اور وہ اسی طرح دشواری کی زندگی بسر کرتے رہیں۔ انھیں دو وقت پیٹ بھر کر کھانا نہ مل سکے، انھیں سر چھپانے کے لیے چھت میسر نہ ہو، ان کے تن ڈھکنے کے لیے پورے کپڑے نہ ہوں، دوا، علاج کا کوئی معقول انتظام نہ ہو، ان کے بچوں کی تعلیم کا خاطر خواہ بند و بست نہ ہو، انھیں ترقی کے مواقع حاصل نہ ہوں۔ انھیں غربت کی وجہ سے عدالتوں میں انصاف حاصل نہ ہو سکے اور انھیں سماج میں برابری کا درجہ نہ مل سکے۔ یہ ملک کی ترقی نہیں بلکہ ملک کے دامن پر دھبہ ہے۔ یہ صحت نہیں بیماری ہے۔ ملک ایک جسم ہے جس کے تمام اعضا کا صحت مند ہونا ضروری ہے اگر اس کے کچھ اعضا موٹے ہوں گے اور باقی سوکھے رہے تو یہ صحت کی علامت نہیں بلکہ خطرناک بیماری ہے جس کے علاج کی طرف توجہ نہ کرنا ملک کے امن امان اور اس کے استحکام کو خطرے میں ڈالنا ہے۔

گاندھی جی اور پنڈت نہرو کے ذہن میں آزاد ہندستان کا جو نقشہ تھا وہ یہی تھا۔ رام راج کا مطلب یہ تھا کہ چھوٹے اور بڑے، غریب امیر، شہری اور دیہاتی سب کو یکساں سہولتیں اور ترقی کے مساوی مواقع حاصل ہوں، نیچ اونچ کا فرق جاتا رہے۔ اسی طرح نہرو جی نے بھی ملک کو سوشلسٹ جمہوریہ بنانے کا مقصد اپنے سامنے رکھا تھا اور وہ مخالفتوں کے باوجود ملک کو اس منزل کی طرف لے جانے کی برابر کوششیں کرتے رہے۔

ملک کی یہ بڑی خوش قسمتی تھی کہ نہرو جی کی ترقی پسند قیادت سے محروم ہونے کے بعد اس کی باگ ڈور مسز اندرا گاندھی کے ہاتھوں میں آئی جن کے اندر ایک طرف گاندھی جی کی حقیقت پسندی اور دوسری طرف نہرو جی کی بلند حوصلگی پائی جاتی ہے۔ انھیں بھی نہرو جی کی طرح اپنی ترقی پسندانہ پالیسی پر عمل درآمد کے سلسلہ میں سخت مخالفت کا سامنا

کرنا پڑا۔ بینکوں کو قومیانے کا جب مسئلہ اٹھایا گیا تو سرمایہ داروں اور ان کے ہمدردوں کی جانب سے اس کے خلاف آواز بلند کی گئی۔ اسی طرح سابق راجوں مہاراجوں کے صرف خاص اور انھیں حاصل مخصوص مراعات کے خاتمے کے لیے جب قدم اٹھایا گیا تو اس وقت بھی جاگیرداروں سرمایہ داروں اور ان کے حاشیہ برداروں نے متحدہ محاذ بنا کر سخت مخالفت کی لیکن وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے بڑے عزم اور حوصلے کے ساتھ ان تمام مخالفتوں کا سامنا کیا اور اپنی منزل کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے بڑھتی رہیں۔

آزادی حاصل ہوئے چوتھائی صدی سے زائد عرصہ گذر چکا ہے یہ مدت لمبی بھی ہے اور مختصر بھی۔ مختصر اس لیے کہ ملکوں کی تقدیر بدلنے کے واسطے صدیاں درکار ہوتی ہیں۔ جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے یہ ایک بڑا اور وسیع ملک ہے جس میں مختلف زبانیں بولنے والے اور مختلف مذہب رکھنے والے لوگ پائے جاتے ہیں اس کے پاس قدرتی ذرائع کی کوئی کمی نہ تھی لیکن اس کے باوجود وہ ایک پچھڑا ملک تھا جو جہالت اور غربت کا شکار تھا خوشی کی بات ہے کہ رفتہ رفتہ ملک ترقی کی طرف بڑھتا رہا۔ لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ آزادی کے بعد بیس پچیس برسوں میں ترقی کی رفتار سست اور غیر اطمینان بخش رہی۔ اس کے وجوہ بھی تھے۔ ملک جو ایک جاندار جسم کی حیثیت رکھتا ہے اس کے بدقسمتی سے تقسیم کی بنا پر دو ٹکڑے ہو گئے جس کے گہرے زخم کے بھرنے میں کافی وقت لگا۔ اسی کے ساتھ ساتھ فرقہ پرستوں، رجعت پسندوں اور سرمایہ داروں کو تقسیم کی بنا پر فرقہ واریت کا زہر پھیلا کر اپنا الو سیدھا کرنے اور ترقی پسند پالیسی اختیار کرنے والوں کی راہ میں روڑا اٹکانے کا اچھا موقعہ مل گیا اور انھوں نے ملک کے عام مفاد کی پروا کیے بغیر اپنے طبقے کے مفاد کی خاطر فرقہ وارانہ نعرے لگا کر بھولے بھالے عوام کو بہکانے اور ان کو غلط راہ پر لگانے کی بھرپور کوشش کی تا

ان کی توجہ اصل مسائل یعنی غریبی، معاشی نابرابری اور سماجی ناانصافی ختم کرنے کی طرف نہ جانے پائے۔ کیوں کہ اس سے ان کے مفاد پر چوٹ پڑتی تھی۔

سرمایہ داروں نے حالات کو جوں کا توں رکھنے اور معاشی اور سماجی ڈھانچے میں تبدیلی لانے کی کوششوں کو ناکام بنانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ انھوں نے اپنا جال ملک کے ہر شعبے میں اس طرح پھیلا دیا کہ کوئی ایسی جگہ نہ تھی جہاں ان کے آدمی نہ ہوں حد یہ ہے کہ خود کانگریس پارٹی میں ان کے آدمیوں نے اچھا خاصا اثر و رسوخ پیدا کر لیا تھا اور یہی وجہ تھی کہ ترقی پسند اقدامات کی راہ میں وہ ہر قدم پر رکاوٹیں پیدا کرتے رہتے تھے۔ عوام کی بھلائی اور بہبود کے لیے تیزی سے اقدامات کے لیے ضروری تھا کہ کانگریس پارٹی جس کے ہاتھوں میں ملک کی باگ ڈور تھی اسے سرمایہ داروں کے حامی عناصر سے پاک کیا جائے۔ یہ ایک جرأت مندانہ اقدام تھا لیکن اس کا کرنا عوام کی بھلائی کے لیے ضروری تھا۔ چناں چہ مسز اندرا گاندھی نے کسی خطرے کی پروا کیے بغیر بڑی حوصلہ مندی سے یہ کام انجام دے دیا۔ اس تاریخی قدم سے یہ فائدہ ہوا کہ کانگریس کے اندر ترقی پسندوں اور رجعت پسندوں کے درمیان عرصہ سے جو رسہ کشی ہو رہی تھی اس کا خاتمہ ہو گیا اور عوام کی فلاح بہبود کے لیے تیزی سے قدم بڑھانے کے لیے راستہ صاف ہو گیا لیکن سرمایہ داروں، جاگیرداروں، رجعت پسندوں اور فرقہ پرستوں نے یہ محسوس کر لیا کہ اگر متحدہ محاذ بنا کر مسز اندرا گاندھی کے ترقی پسند اقدامات کی روک تھام نہ کی گئی تو یہ سیلاب سرمایہ داری، جاگیرداری، رجعت پسندی سب کو ایک ساتھ خس و خاشاک کی طرح بہا کر پھینک دے گا چناں چہ انھوں نے آخری مورچہ لینے کی ٹھان لی۔ انھوں نے مختلف ریاستوں میں اپنے پیسے اور بعض بیرونی طاقتوں کی شہ پر خلفشار، بدامنی اور لاقانونیت پھیلانے کے لیے ہر قسم کے ہتھکنڈے استعمال کیے۔ کہیں فرقہ وارانہ جذبات

بھڑکانے۔ کہیں زبان کا مسئلہ اٹھا کر گڑبڑ مچانے کی کوشش کی، کہیں صوبائی تعصب پھیلایا اور کہیں طلباء کو بہکا کر انھیں اپنا آلۂ کار بنایا۔ یہی نہیں وہ فوج میں بغاوت کے جذبات پھیلانے کا خطرناک کھیل کھیلنے سے بھی باز نہیں آئے۔ آخر میں انھوں نے ملک کے لیڈروں کو قتل کرنے کا ایک منصوبہ تیار کیا۔ ملک کی یہ بڑی خوش قسمتی تھی کہ وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے حالات کا بروقت جائزہ لے کر ان کی اس ناپاک سازش کو ناکام بنانے کے لیے بلا جھجک ایمرجنسی کا اعلان کر کے بھرپور کارروائی شروع کر دی۔

عوام اس صورت حال سے عاجز آ گئے تھے جو مفاد پرست عناصر نے اپنے مفاد کے پیش نظر ملک کے اندر پیدا کر دی تھی اور جس سے ہر پُرامن شہری کی زندگی اجیرن ہو گئی تھی۔ چور بازاری، ٹیکس ماری، رشوت خوری، بدعنوانی، بے قاعدگی اور بیہودگی کا بازار گرم ہو گیا تھا۔ تاجروں نے موقعہ پا کر چیزوں کی قیمتیں اتنی بڑھا دی تھیں کہ ان کی خریداری عام لوگوں کے بس کی بات نہ رہ گئی تھی۔ اس لیے ایمرجنسی کے اعلان کا عام طور پر خیرمقدم کیا گیا اور لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس ایک سال کے اندر غریب پس ماندہ اور دبے ہوئے طبقے کے لوگوں کی بہتری کے لیے جو کام انجام دیے گئے ان کے ایک سرسری جائزہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس تھوڑے سے عرصہ میں جو کام ہوا وہ اب تک برسوں میں بھی نہ ہو سکا تھا۔ چیزوں کی قیمتیں جو آسمان سے باتیں کر رہی تھیں ان میں گھٹنے کا رجحان پیدا ہو گیا۔ افراطِ زر پر بڑی حد تک قابو پا لیا گیا۔ امن و امان اور نظم و ضبط کی صورتِ حال کافی بہتر ہو گئی۔ اس موقعہ پر وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کے اس ۲۰ نکاتی معاشی پروگرام کا ذکر کرنا بے محل نہ ہوگا جس کا اعلان انھوں نے ملک کے پس ماندہ، کمزور اور دبے ہوئے طبقے کی حالت سدھارنے اور ان کا معیارِ زندگی بلند کرنے کے لیے کیا۔

دیہات میں غریب دستکار، چھوٹے کاشتکار اور بے زمین مزدور عام طور پر مہاجنوں کے قرضے سے اس طرح دبے ہوئے تھے جن سے چھٹکارا ملنا ان کے لیے مشکل تھا۔ ایمرجنسی کے دوران ایک آرڈیننس جاری کر کے ان کے قرضے معاف کر دیے گئے اور انھیں بینکوں سے قرضہ فراہم کرنے کی آسانیاں پیدا کی گئیں۔ دیہاتوں میں ایک دوسری لعنت پابند مزدوری کی تھی جس کی غرض اور مجبوری سے فائدہ اٹھا کر بڑے کاشتکار اسے پیسے دے کر اپنے کام کے لیے پابند کر لیتے تھے وہ زندگی بھر اور بعض صورتوں میں اس کی اولاد بھی اس جال سے نہ نکل پاتی تھی۔ اسی طرح جوت کی حدبندی کے ذریعہ جو فاضل آراضی حاصل ہوئی تھی اس کی تقسیم کا چوکس انتظام کیا گیا تاکہ غیر مستحق بااثر لوگ اسے ہتھیا نہ لیں۔ دیہات کی آبادی کو سہولت پہنچانے کے لیے تحصیل میں تحصیلدار کے علاوہ حاکم تحصیل کا رہنا اور مقدمات کا فیصلہ کرنا ضروری قرار دے دیا گیا۔ تحصیلوں میں منصفی عدالتیں لے جانے کا بھی بندوبست کیا جا رہا ہے تاکہ وہاں کے لوگوں کو انصاف حاصل کرنے کے لیے دور نہ جانا پڑے اور آسانی سے انھیں انصاف مل سکے۔ کمزور طبقے کے لیے مکانات کی فراہمی کا بھی انتظام کیا گیا اور مکان بنانے کے لیے زمین الاٹ کی گئی۔ ضروری اشیاء کی فراہمی کے لیے کنٹرول کی ایسی دوکانیں قائم کی گئیں جہاں غریب لوگوں کو مناسب قیمت پر کپڑا اور دوسری چیزیں مل سکیں۔ کھیت مزدوروں کی کم سے کم اجرت مقرر کر دی گئی تاکہ بڑے کاشتکار ان کا حق نہ مار سکیں۔

اسمگلنگ کی روک تھام میں شاندار کامیابی حاصل کی گئی۔ چھپے ہوئے کالے دھن کو باہر لانے کے لیے موثر اقدامات کیے گئے جن سے خاطر خواہ نتائج برآمد ہوئے۔ اور بڑی تعداد میں کالا دھن برآمد ہوا۔ مجموعی لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو آزادی کا یہ سال بہت مبارک سال تھا اور اس مرتبہ ۱۵ اگست کو آزادی کی جو سالگرہ منائی جا رہی ہے وہ رسمی طور پر نہیں بلکہ حقیقی طور پر خوشی و مسرت کی حامل ہے۔

★

فضل النقوی

اندھیرے کے بعد روشنی

رونق بزم سسکتی ہوئی ویرانوں میں
شمع خاموش تھی سہمے ہوئے پروانوں میں
اشک کے قطرے ابھرتے ہوئے انسانوں میں
آگ کے شعلے بھڑکتے ہوئے پیمانوں میں

تالہ بندی تو کہیں بند کی بیداد یں تھیں
کہیں ہڑتالوں سے لپٹی ہوئی فریادیں تھیں

ظلم کا دور تھا مزدوروں کو بے حال کیے
جھونپڑی میں کہیں بجھتے ہوئے غربت کے دیے
کوئی مجبور تو پانوں کی طرح دل کو سیے
کوئی ٹوٹا ہوا دل غم کے اندھیرے میں لیے

شورہ پشتوں سے سہمتا ہوا بازاروں میں
کوئی بے چین حقیقت کے طلب گاروں میں

پھول گلشن کا اثر دیکھ کے شرمانے تھے
صبح کو کھلتے تھے اور شام کو مرجھاتے تھے
لوگ بازاروں میں جاتے ہوئے گھبراتے تھے
راہبر بھیس میں رہزن کے نظر آتے تھے

دامنِ خوف چھپائے ہوئے انسانوں کو
چین ہندو کو نہ ممکن نہ مسلمانوں کو

کوئی پُر درد بناتا ہوا افسانوں کو
کوئی آنکھوں میں چھپائے ہوئے ارمانوں کو
شور ہنگاموں کا گھیرے ہوئے میخانوں کو
راہ ملتی نہ تھی بھٹکے ہوئے پروانوں کو

قافلے کے لیے جادہ نہ کوئی منزل تھی
جیسے برباد اندھیرے میں سجی محفل تھی

دھوکے دیتے ہوئے پھولوں کی طرح گلشن کو
دفن کرنے کے لیے سمجھتے ہوئے مدفن کو
رخ پہ ڈالے ہوئے رہزن کی طرح چلمن کو
لاکھوں دیو تھے پھیلائے ہوئے دامن کو

قوم پر ظلم کو ڈھانے کے لیے نکلے تھے
تیر پہ تیر چلانے کے لیے نکلے تھے

ایسے برباد اندھیروں کو مٹانے کے لیے
موت کی نیند سے غربت کو جگانے کے لیے
اپنی مرضی سے مقدر کو بنانے کے لیے
گاندھی اور نہرو کی یادوں کو دلانے کے لیے

روشنی دینے کو اک نور کا دھارا چمکا
اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ستارا چمکا

پھول اور کلیوں کو گلشن میں سجانے کے لیے
ملک کو آئی بلاؤں سے بچانے کے لیے
ظلم کے قلعہ کی بنیاد کو ڈھانے کے لیے
زندگانی کو نیا روپ دلانے کے لیے

سائے مٹنے لگے قبضے میں اندھیرا آیا
کھل گئیں آنکھیں جو پُر نور سویرا آیا

یہ ایمرجنسی کا پیغام سنایا کس نے
ملک اور قوم کے بازو کو ہلایا کس نے
راستہ غم کے اندھیروں میں بنایا کس نے
آئے طوفان سے بروقت بچایا کس نے

پھر خدا جانے کہ کیا قوم کی حالت ہوتی
اندرا گاندھی نہ اٹھتیں تو قیامت ہوتی

چاندنی تیز ہوئی بزم کی رونق جو بڑھی
زورِ سیلاب گھٹا شمع اندھیرے میں جلی
دامنِ گل سے محبت کی ہوا مل کے چلی
راستے والے چلے آس ملی راہ ملی

کھل گیا بابِ قفس قوتِ پرواز آئی
جاگ اٹھا سارا چمن امن کی آواز آئی

مطمئن کرنے کو پُر کیف فضائیں آئیں
حسن پھولوں کا بڑھانے کو وفائیں آئیں
کھیت سر سبز ہوے ایسی ہوائیں آئیں
کارخانوں سے مشینوں کی صدائیں آئیں

غم کا سیلاب گھٹا روح تمنا جاگی
کھل گئی آنکھ تو سوئی ہوئی دنیا جاگی

وقت پہ آ کے ایمرجنسی نے بیدار کیا
عرش سے اونچا محبت بھرا کردار کیا
شدھرے حالات، بلند اور بھی معیار کیا
خدمتِ قوم پہ ہر شخص کو تیار کیا

نور اور حسن وفاؤں کی طرح چھانے لگا
امن اور چین کا ماحول نظر آنے لگا

ڈاکٹر اطہر پرویز

اردو افسانہ

کسی نے کہا تھا کہ فکشن کا کام دراصل جھوٹ کہنے کے فن کی مشق ہے۔ لیکن اس مشق نے قصہ گویوں کے قلم سے کتنے زندہ جاوید فن پارے تخلیق کروائے کہ ان میں ہمیں انسانی نفسیات کے پیچ و خم کو دیکھنے اور سمجھنے کا موقع ملا، کتنی فلسفیانہ گرہیں کھلتی نظر آئیں۔ ادب حقیقتاً ایک استعارہ ہے۔ یہ استعارہ ادب کی ہر صنف کو اپنے احاطے میں لیے ہوئے ہے۔ افسانہ بھی اسی طرح گویا ایک استعارہ ہے۔ یہ استعارہ ہے زندگی کا، گروہوں کا اور افراد کے ذہنی اور جذباتی ردِ عمل کا، اسی لیے ان کی نفسیاتی اور سماجی زندگی سے دلچسپی اور ان پر غور و فکر ــــ افسانے کا ایک اہم حصہ ہے۔

افسانہ ایک ایسی پُرفریب فضا تیار کرتا ہے جو ایک طرح سے حقیقی ہوتی ہے۔ حالانکہ وہ بظاہر اپنے افسانے کا تار و پود حقیقت سے زیادہ فریب اور سچ سے زیادہ جھوٹ سے تیار ہوتا ہے لیکن اصلیت یہ ہے کہ یہ واقعیت اور حقیقت کا اظہار ہے۔ یہاں جھوٹ کے مقابلے سچ کا بول بالا ہے۔ کہانی کہنے والا کچھ اس انداز سے بیان کرتا ہے کہ پڑھنے والا ایسے تجربے سے گزرتا ہے جس میں اسے ایسے افراد اور ان سے متعلق واقعات کو متعین کرنا پڑتا ہے جن کا نہ تو کوئی وجود تھا اور نہ واقعات اس ترتیب اور اس شکل میں کہیں پیش آئے تھے۔ لیکن پڑھنے والے کا ردِ عمل کچھ اس قسم کا ہوتا ہے جیسے وہ افراد فی الواقعی اسی قسم کے تھے اور وہ واقعات ان کی زندگی میں پیش آ چکے ہیں۔ دراصل افسانہ نگار یہاں ایسا پس منظر پیش کرتا ہے جو اتنا حقیقی ہوتا ہے کہ قاری کے ذہن کو اسے قبول کرنے میں ذرا بھی جھجک نہیں ہوتی۔

مختصر افسانہ ادب کا سب سے چھوٹا بچہ ہے اور ہر زبان میں اس کو یہی حیثیت حاصل ہے لیکن صحت مند اور ہونہار ہونے کی وجہ سے بہتوں کو غلط فہمی بھی ہوئی کہ اس کا تعلق ناول سے ہے۔ کچھ لوگوں نے تو یہی سمجھا کہ اگر کسی ناول کو مختصر طور پر بیان کر دیا جائے یا صرف اس کا پلاٹ لے لیا جائے تو وہ مختصر افسانہ بن جائے گا۔ یعنی دوسری طرف یہ بھی کہ افسانہ کو تفصیلات کے ذریعہ پھیلا دیا جائے تو وہ ناول ہو جائے گا۔ لیکن یہ بیان اتنا ہی غلط ہے جتنا یہ کہنا کہ افسانہ مختصر ہوتا ہے اس لیے اس کا لکھنا ناول کے مقابلے میں زیادہ آسان ہے۔

'ناول' میں ناول لکھنے والا کوئی گوشہ قاری کے لیے نہیں چھوڑتا، لیکن افسانے میں جا بجا کھانچے نظر آتے ہیں۔ افسانہ نگار ان کو چھوڑتا جاتا ہے اور اس طرح اپنے پڑھنے والوں کی ذہنی تربیت بھی کرتا جاتا ہے۔ یہاں عام طور پر کہی باتوں سے زیادہ اَن کہی کی اہمیت ہوتی ہے افسانہ نگار کا کمال یہ ہے کہ وہ کم سے کم الفاظ کا استعمال کرے۔ وہ لفظوں سے زیادہ احساسات سے اپنے افسانے کو نمایاں کرے۔ عام طور پر لوگ لفظوں کا ذریعہ نہیں سوچتے۔ افسان کے ذہن میں خیالات اور تصورات لفظوں سے پہلے آتے ہیں اور پھر وہ ان کو لفظوں کا لباس پہناتا ہے۔ افسانہ ایک خیالی پیکر کی عملی تشکیل ہے۔ اسی لیے یہاں احساسات سے کام لیا جاتا ہے۔ یہ بات سننے میں تو عجیب سی لگتی ہے لیکن حقیقت یہی ہے کہ جو کچھ نہیں کہا جاتا، انسانی تجسس اسے تلاش کرتا ہے۔ ممتاز مفتی کی "آپا" ایک لفظ نہیں بولتی، لیکن اس کی خاموشی ہی اس کی گفتگو ہے۔ وہ سرتاپا جذبات سے سرشار ہے لیکن اس کے اظہار کو گناہ سمجھتی ہے وہ خاموشی سے چنگاری کو بھی بجھا دیتی ہے کہ یہ ہلکی سی چنگاری جو راکھ میں چھپی ہوئی ہے' دکھائی دیتی ہے۔ "آپا" کو ہم بہت قریب سے جاننے لگتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ جیسے ہم اسے برسوں سے جانتے ہیں۔ سچ ہے کہ کردار نگاری محض لفظوں کا پُل باندھ کر نہیں کی جاتی۔ اسی لیے افسانے کا فن مشکل فن ہے۔

مختصر افسانہ لفظوں کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتا۔ ہر افسانہ اپنے گنتی کے الفاظ رکھتا ہے۔ افسانے کا فن اس بات کا متقاضی ہے کہ افسانہ نگار دریافت کرے کہ اس افسانے پر کتنے لفظوں کا بوجھ رکھا

جا سکتا ہے۔ ایچ۔ ای بیٹس نے اپنی کتاب "دی ماڈرن شارٹ اسٹوری" میں دو بار یہ بات کہی ہے کہ کہانی لکھنا گویا دیا سلائی کے تنکوں سے عمارت بنانا ہے اور اس عمل میں ایک لمحہ ایسا بھی آتا ہے جب کہ ایک مزید تنکا اِدھر اُدھر کھسکے سب کو گرا سکتا ہے۔ اس لیے افسانہ نگار کو اس بات کا شدت سے احساس ہونا چاہیئے کہ کس وقت اس کی بات پوری ہو گئی اور اب کہاں اسے اپنا قلم روک دینا چاہیئے۔ افسانے میں ایک قسم کی وحدت ہوتی ہے اس لیے یہاں جملوں سے لے کر الفاظ تک کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ کوئی بات غیر ضروری نہ کہی جائے جو زبان لکھی جائے وہ افسانے کی مناسبت سے ہو اور اس فضا کو پورے طور پر ظاہر کرے۔ اظہار کا سب سے بہتر ذریعہ زبان ہے، اور زبان صرف الفاظ کا نام نہیں ہے۔ زبان میں لب و لہجہ اور طرز ادا سب ہی کچھ شامل ہے۔ اس لیے افسانہ نگار کو الفاظ کے انتخاب میں غیر معمولی احتیاط سے کام لینا چاہیئے۔

مختصر افسانہ جادو کی بوتل نہیں ہے جس میں دیو زادوں کو دھوئیں کی شکل میں مقید کیا جا سکے۔ اس میں کردار یا مختلف کرداروں کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ پھر بھلا جھلکیوں میں کردار کا ہر روپ کیسے دیکھ سکتے ہیں ہمیں زندگی میں کتنے انسان نظر آتے ہیں۔ اگر ہم انھیں مختلف صورت حال میں دیکھنا چاہتے ہیں تو پھر ہمیں ان کو مختلف زاویوں سے دیکھنا ہوگا۔ کسی ایک انسان کا ایک ہی روپ نہیں ہوتا، وہ بیک وقت بیٹا، شوہر اور باپ بھی ہوتا ہے اور وہی کارخانے اور دفتر میں کام کرتا ہے وہ افسر بھی ہو سکتا ہے اور ماتحت بھی۔ وہ مقروض بھی ہو سکتا ہے اور کسی کو قرض بھی دے سکتا ہے وہ ایک کا دوست اور دوسرے کا دشمن بھی ہو سکتا ہے۔ وہ فرد کی حیثیت سے منفرد ہوتا ہے لیکن اس کے روپ علاحدہ علاحدہ ہیں۔ مختصر افسانہ اس کردار کا ایک آدھ ہی روپ پیش کر سکتا ہے۔

یہ ضروری نہیں کہ مختصر افسانہ میں ایک آدھ کردار ہی پیش کیا جائے۔ یہاں کئی کردار بھی ہو سکتے ہیں لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ جو واقعات پیش کیے جائیں وہ بہت مختصر وقفے کے اندر ہوں۔ یہ واقعات برسوں پر محمول ہو سکتے ہیں۔ لیکن ان کرداروں سے متعلق یا اُن واقعات سے متعلق کردار چاہے تعداد میں کتنے ہی ہوں اور کتنے ہی برسوں پر پھیلے ہوئے ہوں، وہ ایک ہی مرکزی خیال پر روشنی ڈالیں۔

مختصر افسانہ کوئی دستاویز نہیں ہے جیسا کہ میں نے پہلے لکھا ہے کہ یہاں تخیل کے ذریعے تصویریں بنائی جاتی ہیں لیکن اس کے لیے افسانہ نگار میں دور تک دیکھنے کی صلاحیت ہونا چاہیئے تاکہ ہم کرداروں کو ایکس رے کی طرح آر پار دیکھ سکیں۔ یہ بات کرداروں کے ذریعہ اس طرح پیدا کی جا سکتی ہے جیسا کہ قرۃ العین حیدر کے "ہاؤسنگ سوسائٹی" میں یا اشفاق احمد کے "گڈریا" میں۔

یہ حقیقت ہے کہ ادب پہلے تخلیق ہوا، اس کے بعد تنقید وجود میں آئی۔ کیونکہ تخلیقی ادب کے بغیر تنقید کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ ادب ہی سے تو معیار کا تعین ہوتا ہے۔ اسی بات کو ہم افسانے کی تنقید میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ محض تنقید کے ذریعے افسانے کے فن کو نہیں سمجھ سکتے۔ اس لیے کہ کوئی بھی تنقیدی اصول، افسانے کے فن کو اپنی گرفت میں مکمل طور پر نہیں لے سکتا۔ اگر ہم مختلف قسم کے افسانے پڑھیں تو ہم بہتر طور پر افسانے کے فن کو سمجھ سکتے ہیں۔ ہر افسانے کی اپنی تکنیک اور اس کا اپنا فن ہوتا ہے اور اس کی دریافت افسانہ نگار کی صلاحیت پر منحصر ہے، اگر افسانہ نگار کے قدم یہاں پر ڈگمگا جائیں تو گویا افسانہ اپنی پیدائش سے پہلے ہی فوت ہو گیا۔ اس لیے کہ افسانے کو وجود میں لانے کے لیے افسانہ نگار کو اپنا خونِ جگر پلانا پڑتا ہے اور وہ واقعات جو اس ترتیب اور اس نوعیت سے کسی کی زندگی میں پیش نہیں آئے انھیں اپنے اوپر گوارا کرنا پڑتا ہے۔ گویا یوں سمجھیے کہ تخلیق کے ایک مسرت زا کرب سے گزرنا پڑتا ہے۔

افسانہ نگار کو اپنے ہر افسانے کے اسلوب کو بھی تلاش کرنا پڑتا ہے۔ اسے اسلوب پر بھی اتنی ہی توجہ دینا چاہیے جتنی کہ خام مواد پر۔ اس اسلوب کے اندر لچک ہونا چاہیے کہ ضرورت کے مطابق اس کو موڑا جا سکے۔ افسانے کا خام مواد پلاسٹر آف پیرس کی طرح ہونا چاہیئے۔ اب اس سے کیسا مجسمہ تیار ہوتا ہے یہ افسانہ نگار پر منحصر ہے۔

افسانہ میں جو واقعات پیش کیے جاتے ہیں۔ ان میں انسان تو ہوتے ہی ہیں۔ لیکن ضروری نہیں کہ ہر افسانے میں اس کی صحیح معنوں میں کردار نگاری کی جائے۔ اس سے افسانے میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

مثال کے طور پر غلام عباس کی کہانی "آنندی" میں۔ اس افسانے میں کوئی خاص کردار نہیں، محض افراد کا ہجوم ہے جو عقائد بھی رکھتے ہیں، اور معاشرے کا جبر بھی۔ ان کا ایک دوسرے سے گہرا رشتہ ہے لیکن ان کو ایک افسانہ نگار کی نظر سے ہی دیکھا جا سکتا ہے اور وہ لوگ جو یہاں اقدار کے پاسبان نظر آتے ہیں وہ سب کے سب اس حمام میں ننگے دکھائی دیتے ہیں۔ "آنندی" اسی لیے ایک مثالی کہانی ہے لیکن ہر اچھی کہانی مثالی ہوتی ہے کیونکہ اس میں وہ بات ہوتی ہے جو دوسرے میں نہیں ہوتی۔

بعض نقاد یہ کہتے ہیں کہ افسانے کا فن اتنا نازک ہوتا ہے کہ وہ تبلیغ کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتا۔ لیکن اگر ہم "مہالکشمی کا پل" کے علاوہ بھی کرشن چندر کے افسانے پڑھیں تو ہمیں معلوم ہوگا کہ یہی تبلیغ کرشن چندر کے فن کی جان ہے۔ روایت کی خوبی یہ ہے کہ راوی نظر نہ آئے۔ لیکن کرشن چندر کے یہاں راوی محض جھانکتا ہی نہیں بلکہ خود بھی اچھل کر سامنے آجاتا ہے۔ بالکونی میں جب بوڑھا عبداللہ مر جاتا ہے اور منیجر صاحب پکارتے ہوئے گالی دیتے ہیں تو راوی کہتا ہے:

"بول۔ بول۔ اے سور کے بچے! سپید سپید تتلیوں والے غلیظ بڑھے گنجی چاند والے، کھردرے ہاتھ پاؤں والے نیم برہنہ، فاقہ مست انسان، بول کیا مر کر بھی تجھے گالی کا جواب دینا نہ آئے گا؟"

کرشن چندر کے بہترین افسانے وہی ہیں جہاں انھوں نے تبلیغ کو فنی ہیئت دی ہے۔ اور اسے اپنا اسلوب بنا لیا ہے۔ کرشن چندر نے اپنے زمانے کی روح کو اپنے افسانوں میں اسیر کر لیا ہے۔ ان کے افسانوں سے ان کے عہد کے ہندستانی سماج کی تاریخ مرتب ہو سکتی ہے۔ کرشن چندر کے افسانوں کی یہ خصوصیت نہ صرف ماحول، پس منظر اور زندگی کی کش مکش سے واضح ہوتی ہے بلکہ وہ کرداروں سے بھی خوب کام لینا جانتے ہیں۔ کردار کے افسانے اپنے مصنف سے بڑا زبردست مطالبہ رکھتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ کردار ہی بذاتِ خود افسانے ہوتے ہیں۔ اس کا فن اس بات میں مضمر ہے کہ وہ اپنے کرداروں کو کس حد تک زندگی اور زندہ انسانوں سے قریب کرتے ہیں۔ کرداروں کو جانچنے کا طریقہ بھی یہی ہے کہ وہ کس حد تک زندگی سے میل کھاتے ہیں۔ کردار چاہے کتنے انوکھے کیوں نہ ہوں، لیکن پڑھنے والا ہر لمحہ یہ محسوس کرے کہ وہ اس معاشرے کے اندر سانس لے رہا ہے۔ افسانے انسانی تجربات کو ڈرامائی انداز سے پیش کرتے ہیں۔ افسانہ انسان اور اس کے سماج کے ارد گرد چکر لگاتا ہے اس لیے وہ سماج کے مسائل سے کترا کر نہیں نکل سکتا۔ یہ اور بات ہے کہ افسانہ نگار اپنے مخصوص زاویے سے اس کو دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ افسانہ واقعیت کا اظہار ہے، جسے ہم "شاعرانہ حقیقت" بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ شاعرانہ حقیقت افسانے کے ذریعہ بڑی کامیابی سے ظاہر ہوتی ہے۔ یہاں بظاہر ہر چیز فرضی ہوتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ نام اور مقام کے علاوہ کوئی چیز بھی فرضی نہیں ہوتی۔ اس لیے کہ یہ تمام واقعات زندگی کے اپنے دیے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ واقعات چاہے اس شکل میں نہ پیش آئے ہوں لیکن اس کا تجربہ انسانی معاشرے کا اپنا تجربہ ہے۔ یہ تجربہ افسانہ نگار کے یہاں جتنی سچائی اور شدت کے ساتھ پیش آئے گا، افسانے کی تکنیک اس کو اپنے اندر جذب کر لے گی۔

ابتدائی افسانہ نگاروں کے سامنے یہ مشکل ضرور پیش آئی ہوگی کہ افسانہ اتنا مختصر ہوتا ہے کہ چند صفحات کے اندر کردار کے ساتھ کس طرح انصاف کیا جا سکتا ہے۔ لیکن افسانہ نگاروں نے بہت جلد اپنی چابکدستی سے یہ ثابت کر دیا کہ قوت تخیل چاہے تو جزو میں کل کو بڑی کامیابی سے پیش کر سکتی ہے۔ البتہ افسانہ نگاروں کو اپنے کرداروں سے ضرور مانوس ہونا چاہیے۔

چیخوف کی "ڈارلنگ" اپنی پوری شخصیت کے ساتھ افسانے میں نظر آتی ہے۔ اس کی محرومی، اس کا زندگی سے سمجھوتہ، ہر شکست کو فتح سے بدل لینے کا جذبہ، اور ان گنت احساسات اس بڑے کردار کا سرمایہ ہیں۔ منٹو کے افسانے "نیا قانون" کا استاد منگو، ممتاز مفتی کی "آپا"، کرشن چندر کا مو بی، اور کالو بھنگی، اشفاق احمد کا گڈریا — بیدی کے "اپنے دکھ مجھے دے دو" کی اندو، ہاؤسنگ سوسائٹی کا جمشید، سلمیٰ، اور ثریا۔ اس کی اچھی مثالیں ہیں۔

بعض لوگ مختصر افسانے کے کرداروں سے بڑی توقعات وابستہ

کر لیتے ہیں۔ دراصل مختصر افسانے میں ہمارے سامنے کردار کا پورا ارتقا نہیں ہوتا۔ اگر کچھ ارتقا ہوتا بھی ہے تو اشاروں اور کنایوں میں ہی کیا جاتا ہے جہاں اس کی صرف کمزوری کی رہ جاتی ہے وہاں قاری کا ذہن اسے پورا کر لیتا ہے یہاں کردار قدرے نہیں انداز قدرسے پہچانے جاتے ہیں، زندگی کی طرح افسانے میں بعض اوقات ایسے کردار ملتے ہیں جو ایک ہی جھلک میں اپنی پوری شخصیت کو بے نقاب کر دیتے ہیں۔

عصمت چغتائی کا افسانہ "چوتھی کا جوڑا" ایک معاشرے کا دردناک کرب ہے۔ یہاں عصمت کرشن چندر کی طرح تبلیغ نہیں کرتیں۔ لیکن دبے چاپ ایک 'کیمرا' لیے ہوئے کبریٰ کی ماں کے گھر میں پہنچ جاتی ہیں اور ان تمام اَن کہی باتوں کی تصویر کھینچ لیتی ہیں جنھیں کبریٰ کی ماں سوچتی نہیں، کہتی نہیں۔ اگر اسے معلوم ہو جائے کہ وہاں کوئی اور بھی ہے تو وہ اپنا سر پیٹ لے۔ معاشرے کا جبر بھی عجیب ہوتا ہے کہ انسان کبھی کبھی اُسے اپنے آپ سے بھی نہیں دہرا سکتا۔ یہاں تک کہ اس کے بارے میں سوچنا بھی اس کے لیے کلمۂ کفر کے مترادف ہے کیونکہ یہاں سوچنے پر بھی تو پہرے ہوتے ہیں۔ عصمت صرف کہانی لکھ دیتی ہیں فیصلہ صادر نہیں کرتیں۔ اگر وہ رائے زنی کرتیں یا راوی کا انداز اختیار کرتیں، تو ہم یقیناً انھیں اذیت پسند بھی کہتے۔

افسانے کے لیے موضوعات کی کمی نہیں ہے۔ اس لیے کہ زندگی کے اندر اتنے موضوعات بکھرے پڑے ہیں کہ ان کو سمیٹا نہیں جا سکتا۔ اس لیے کہ جب ہم افسانے کے فن پر غور کریں تو ہمیں موضوع کی اہمیت کی طرف نہ دیکھنا چاہیے۔ چیخوف نے صحیح کہا تھا کہ وہ کسی چیز پر بھی افسانہ لکھ سکتا ہے۔ تکنیک تو موضوع کے اندر ذہنی ربط پیدا کرنے کا نام ہے۔ افسانہ نگاروں کو یہاں افراط و تفریط سے کام لینا چاہیے اور اس پر خوب محنت سے مشق کرنا چاہیے۔ اس لیے ایک موضوع بلکہ ایک ہی واقعہ کو مختلف افسانہ نگار الگ الگ طریقے سے بیان کر سکتے ہیں اور اپنے مخصوص انداز سے پیش کر سکتے ہیں۔ موضوع اپنی ہیئت تو تلاش کرتا ہے لیکن ہیئت کوئی ایک نہیں ہو سکتی۔ اس کی شکلیں مختلف ہو سکتی ہیں۔ اسی کو لوگ افسانے کا پلاٹ کہتے ہیں اس سے افسانے کو ایک طرح کی فنی تنظیم ملتی ہے۔ واقعہ کو ترتیب حاصل ہوتی ہے اور یہ ترتیب ہی قصے کو آگے بڑھاتی ہے۔ اگر یہ بات نہ ہو تو واقعات سے قصے کا عنصر ختم ہو جائے۔ اس کی بدولت مرکزی خیال بھٹکتا نہیں۔ مرکزی خیال کو بہرحال افسانے میں مرکزیت حاصل ہوتی ہے۔ یہی افسانہ لکھنے کا محرک ہوتا ہے بقول وزیر آغا "ہر افسانے کا ایک نقطہ ہوتا ہے اور افسانے کے تمام واقعات اسی ایک نقطے کو ابھارنے کے لیے وقف نظر آتے ہیں۔ چنانچہ ایک اچھے افسانے کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کا ہر واقعہ تاثر، بلکہ ہر جملہ، ایک ہی مرکزی نقطے کی تعمیر میں صرف ہوتا ہے۔"

اردو افسانہ ہندوستان کے بدترین اقتصادی دور کی پیداوار ہے۔ معاشرے میں تیزی سے تبدیلی بھی نہیں ہو رہی تھی اس لیے اردو افسانے نے اپنی نظریں خوب اچھی طرح ان مسائل کی طرف گاڑیں اور ان کو اپنا موضوع بنایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارا افسانہ زندگی کی تصویر ہی نہیں بلکہ تعبیر بھی ہو گیا۔ آزادی کی تحریک زور پکڑنے لگی، اشتراکیت کے نعرے فضا میں گونجنے لگے، اردو افسانہ ہندوستان کی اسی فضا میں سانس لے رہا تھا۔ بچوں میں ماحول کو قبول کرنے کی صلاحیت بڑوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ چونکہ یہ اردو افسانے کا بچپن تھا اس لیے اس نے لازماً اپنے عہد کی تمام تر صفات کو بڑی تیزی سے قبول کر لیا۔ پریم چند کے بعد ترقی پسند افسانہ نگاروں نے زندگی کے ہنگامی مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ وہ چاہے بنگال کا قحط ہو یا کوئی اور ہنگامی مسئلہ ہو۔ ان تمام افسانہ نگاروں نے اپنے سیاسی شعور کی بنا پر افسانے میں مقصدیت کو نمایاں کیا۔ ان کی بدولت پڑھنے والوں کا حلقہ بڑی تیزی سے بڑھا۔ ترقی پسند افسانہ نگاروں کے یہاں ایک غیر معمولی کشش تھی، وہ اپنے پڑھنے والوں کو شدت سے متاثر کرتے تھے انھیں اپنا ہم خیال بنا لیتے تھے کم از کم اس مخصوص کہانی میں تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ اسی لیے اردو افسانوں پر ترقی پسند افسانہ نگاروں کی چھاپ آج بھی گہری ہے اور اردو کے نئے افسانہ نگار چاہے بالواسطہ ہی سہی، لیکن ان سے متاثر ضرور ہیں۔ انھوں نے اس طرح اپنی نسل کو تو متاثر کیا ہی تھا، لیکن نئے لکھنے والوں کی نسل بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ اس میں عہد کا بھی ہاتھ تھا اور زندگی کے حقائق

(باقی صفحہ پر)

مختار ٹونکی

نغمۂ آزادی

آزادیوں کی دیوی ہم پر کرم کیا ہے
آزاد دیش کر کے جنت بنا دیا ہے
آکاش چھو رہا ہے قومی نشاں ہمارا
یہ ہے زمیں ہماری اب آسماں ہمارا
ہندوستاں کے ہم ہیں ہندوستاں ہمارا

آزادیوں کا تو نے جادو جگا دیا ہے
آزاد دیش کر کے جنت بنا دیا ہے
جمہوریت کی خوشبو پھیلی چمن چمن ہے
کیا ذاتیں اور قومیں اب سیکولر چلن ہے
ہندو ہو یا مسلماں سب کا یہی وطن ہے

سب کو برابری کا درجہ عطا کیا ہے
آزاد دیش کر کے جنت بنا دیا ہے
ہر چھوٹے اور بڑے کو آزادیاں ہیں حاصل
آزادیوں میں اور ہیں بنیادی حق بھی شامل
دستورِ ہند سے تو سب کو ملی ہے منزل

جمہوریت کو جس نے کامل بنا دیا ہے
آزاد دیش کر کے جنت بنا دیا ہے
منصوبے پانچ سالہ ہم تو چلا رہے ہیں
نہروں سے کھیتیوں کو پانی پلا رہے ہیں
دیکھو مشینی ہل سے سونا اُگا رہے ہیں

سویا ہوا تھا دہقاں اس کو جگا دیا ہے
آزاد دیش کر کے جنت بنا دیا ہے
تعمیر ہو رہی ہے، تقدیر بن رہی ہے
اب آنے والے کل کی تصویر بن رہی ہے
باپو کے خواب کی یہ تعبیر بن رہی ہے

تو نے ترقیوں کا رستہ دکھا دیا ہے
آزاد دیش کر کے جنت بنا دیا ہے
ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے آگے قدم بڑھائیں
فرقہ پرستیوں کا نام و نشاں مٹائیں
آؤ کہ گنگنائیں اور ساتھ مل کے گائیں

مختار نے جو نغمہ ہم کو سنا دیا ہے
آزاد دیش کر کے جنت بنا دیا ہے

جعفر عسکری

جشنِ طرب

آخر کار بہار آئی کہ آنا تھا اسے ـــــ

رات بیدار، فضا سبز، مہکتی ہے ہوا
خم بہ خم، گیسوئے احساس کے کھلنے کی گھڑی آ پہنچی
جانِ ترا جامِ طربناک چھلکنے کی گھڑی آ پہونچی
اور بوسیدہ تمناؤں کے گلزار میں، شاداب تمناؤں کے گلزار کھلے
شجرِ خواب پہ جس طرح سے تعبیر ثمردار کھلے
آرزوؤں کے، چمن کے لب و رخسار کھلے

آج دل ہائے فسردہ میں مسرت کے چراغوں کی لویں تیز کرو
ساعتِ جشنِ طرب خیز ہے، آک رقصِ طرب خیز کرو
گفتگو آج سرِ محفلِ یاراں، شکر آمیز کرو

یہ شبِ وصل ہے،
احساسِ شبِ ہجر سے پرہیز کرو
آج جذبوں کی کدورت کو، بصیرت میں ملا دو یارو
آج چہروں سے تغیر کی نقابوں کو اٹھا دو یارو!
آج ہر فکرِ گراں بار کو، سُولی پہ چڑھا دو یارو!
آج قصہ نہ کہانی کوئی سرگوشی میں ـــ
آج ہر راز زبانوں کے نہاں خانوں سے باہر لاؤ
آج گلدستۂ جذبات سے،
ہونٹوں پہ کوئی حرفِ معطر لاؤ
جشنِ یاراں ہے، رقیبوں کو صدا دو یارو
آج جو دستِ تہی رنگ نظر آئے، اُسے رنگِ حنا دو یارو!
آج ہر گام پہ اک شمع جلا دو یارو
آج ہر فکرِ گراں بار کو سُولی پہ چڑھا دو یارو!

عبدالقوی دسنوی

مہدی افادی

آج سے تقریباً باون سال پہلے ۱۹۲۳ء میں مہدی افادی کی نگارشات کا مجموعہ افادات مہدی کے نام سے شائع ہوا ہے جس کے لیے بیگم مہدی بجا طور پر اردو والوں سے شکریہ کی مستحق ہیں۔ انھوں نے افادات مہدی کی صورت میں مہدی حسن کی منتشر تحریروں کی شیرازہ بندی کر کے انھیں تلف ہونے سے نہ صرف بچا لیا ہے بلکہ اردو ادب کے خزانے میں خوبصورت اور قیمتی اضافہ کیا ہے جس نے اہل اردو کو اپنی طرف متوجہ ہی نہیں کیا بلکہ اپنا گرویدہ بنا لیا ہے۔ یہ کتاب اس وقت سے آج تک مختلف حلقوں میں پسند کی نگاہ سے دیکھی جاتی رہی ہے اور اسی مقبولیت کی وجہ سے ہائی اسکول سے لے کر ایم۔ اے تک کے نصاب میں کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی شکل میں ضرور داخل رہی ہے۔ میرے خیال میں اردو کا شاید ہی کوئی ایسا نثری مجموعہ ہوگا جو اپنے تنقیدی سرمایہ سمیت اس قدر مقبول ہوا ہو، جس قدر طویل مدت کے لیے افادات مہدی کو مقبولیت حاصل رہی ہے یہی اس کی عظمت کی ضمانت ہے اور اسی سے اس کی قدر و قیمت کی پہچان ہو سکتی ہے۔

افادات مہدی مہدی حسن کی انیس[۱۹] تحریروں کا مجموعہ ہے۔ یہ تمام تحریریں عام طور سے سرسری ہیں اور کسی نہ کسی ضرورت سے قلم بند کی گئی ہیں، جن میں گہرائی کم ہے دلربائی زیادہ، باتیں کم ہیں باتیں بنائی زیادہ گئی ہیں۔ ان مضامین میں مہدی اپنے موضوع اور منزل سے اکثر بھٹکے نظر آتے ہیں، سوائے "معاصرانہ چشمک" کے جس کی اصل حقیقت کچھ اور ہی لیکن یہ مضمون محنت سے لکھا گیا ہے۔ اسی لیے مہدی اپنے مقصد میں کامیاب ہوئے ہیں، عام طور سے اس کے مطالعے کے بعد قاری کسی حد تک ان کا ہم خیال نظر آتا ہے ورنہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھوں نے کسی بھی مضمون میں بہت محنت، سنجیدگی، کاوش اور عرق ریزی سے کام نہیں لیا ہے بلکہ جو کچھ ان کو معلومات حاصل تھیں ان کو اپنے منفرد اسلوب کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی ہے، اس لیے ان میں جو کچھ کہا گیا ہے اس سے زیادہ کس طرح کہا گیا ہے اس سے ہم متاثر ہوتے ہیں۔ یہ ان کا اسلوب نگارش ہے جس میں دلبری بھی ہے، دلکشی بھی، شوخی بھی ہے، شگفتگی بھی رعنائی بھی ہے رنگینی بھی، سادگی بھی ہے بے تکلفی بھی، ساحری بھی ہے پاکیزگی بھی، بے باکی بھی ہے، بے ساختگی بھی۔ ان کے یہاں پرکشش اسلوب دلنشیں زبان، پرفریب لہجہ بے مثل قدرت بیان کے ساتھ جدت خیال قطعیت رائے کا زور ہے۔ ان کی تحریروں میں ندرت، تازگی، نفاست اور شان و شوکت کا اظہار ملتا ہے۔ بات میں بات پیدا کرنے کی صلاحیت کے ساتھ ان کی انانیت اور انفرادیت ان کے اسلوب کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ وہ اپنی بات کو بہت زیادہ پرفریب اور باوزن بنانے کے لیے چست فقرے حسین استعارے، نادر ترکیبیں، نئی نئی اصطلاحیں استعمال کرتے ہیں اور اس سلسلے میں کبھی کبھی انگریزی زبان و اسلوب کا سہارا لیتے ہیں اور کبھی فارسی غزل کا تعاون حاصل کرتے ہیں۔ اس طرح ان کا اپنا اسلوب نہایت باوقار، باوزن، پرشکوہ رواں دواں، چونکا دینے والا، منفرد اور پرکشش نظر آتا ہے۔ چنانچہ قاری پہلی ہی نظر میں ایسا مسحور ہو جاتا ہے کہ پھر نہ سحر ٹوٹتا ہے اور نہ وہ اس سے چھوٹتا ہے۔

اور سچ یہ ہے کہ مہدی کے پاس کچھ ہو یا نہ ہو ان کے طرز نگارش میں نکھار، وقار، اعتماد، خلوص، سچائی اور جذبے کی فراوانی ہے۔ جن کی وجہ سے ان کی تحریروں میں وزن اور بانکپن پیدا ہو گیا ہے۔ چنانچہ یہ ان کا اسلوب ہی ہے جس نے ان کو اردو کے صف اول کے انشا پردازوں میں لا کھڑا کیا ہے جس کے بل پر وہ آج تک زندہ ہیں اور پائندہ رہیں گے۔

مہدی کی تحریروں اور انداز فکر میں ان کے پیشروؤں کا اثر ملتا ہے۔ ان کی تحریروں میں بھی انگریزی طرز فکر کی پرچھائیں نظر آتی ہے۔ انھوں

نے بھی اپنی تحریروں میں انگریزی الفاظ استعمال کیے ہیں، لیکن برجستہ استعمال کیے ہیں جن سے ان کی تحریر میں کسی قسم کا نقص پیدا نہیں ہوا ہے۔

انگریزی الفاظ کے استعمال کا سلسلہ مہدی افادی کی تحریروں میں پہلے مضمون "حکمائے یونان پر ایک نظر" (۱۸۹۰ء) سے شروع ہو کر "شبلی سوسائٹی" (۱۹۱۸ء) تک جاری رہا ہے۔ انھوں نے انگریزی الفاظ اور اصطلاحوں کے ترجمے بھی کیے اور ترجمے کے لیے دوسروں کو زور بھی دیا ہے اور متوجہ بھی کیا ہے۔

مہدی حسن کا قابل ستائش کارنامہ جو ان کے ہاتھوں اردو زبان کے لیے انجام پایا ہے اصطلاح سازی اور نئے نئے تراکیب اور الفاظ گڑھنے اور وضع کرنے کا ہے۔ انھوں نے اس کام کو نہایت چابک دستی ہوشیاری اور عالمانہ انداز سے انجام دیا ہے۔ ان کی ان ترکیبوں اور اصطلاحوں نے ان کی تحریروں میں چمک پیدا کی ہے، جان ڈال دی ہے اور مفہوم میں گہرائی اور گیرائی عطا کی ہے۔

اردو زبان و ادب سے والہانہ تعلق ہی کا نتیجہ تھا کہ وہ اردو کے مصنفین سے عقیدت اور محبت رکھتے تھے، ان کے شیدائی اور فدائی تھے اور ان کے لیے نیک خواہشات رکھتے تھے اور کبھی کبھی ان کی تعریف و توصیف اس انداز اور لہجے کے ساتھ کرتے تھے کہ مبالغے کی سرحدوں تک پہنچ جاتے تھے۔ وہ اردو کے مصنفین جو مہدی کو پیارے تھے یا جن سے وہ دل چسپی لے رہے تھے وہی تھے جن کے ہاتھوں میں اس زمانے میں رہوار اردو ادب کی باگ تھی، میری مراد سرسید، حالی، شبلی، نذیر احمد، محمد حسین آزاد، سید علی بلگرامی، محسن الملک، عبدالحلیم شرر، اکبر الہ آبادی اور ناصر علی وغیرہ سے ہے۔ ان کے علاوہ کچھ ایسے ادبا بھی تھے جو تازہ واردان بساط ادب تھے اور جو ان کے ہم عصر کہے جا سکتے تھے۔ ان میں خاص طور سے سید سلیمان ندوی، عبدالماجد دریابادی، عبدالباری ندوی، مولوی عبدالحق، ریاض خیرآبادی، عبداللہ عمادی، دلگیر اور ابوالکلام آزاد کے نام لیے جا سکتے ہیں۔

مصنفین کی اس فہرست میں ایوان مہدی میں جس کو سب سے زیادہ باریابی کا موقع ملا وہ علامہ شبلی نعمانی تھے۔ شبلی کے وہ شیدائی تھے فدائی تھے، ان کی عظمتوں کے معترف تھے۔ قدرداں تھے۔ چنانچہ افادات مہدی میں تقریباً ایک چوتھائی مضامین صرف شبلیات پر پھیلے ہوئے ہیں۔ شبلی کے بارے میں ان کا یہ خیال بالکل درست ہے کہ وہ ایک ہی وقت میں "وہ اعلا درجے کے مورخ، اعلا درجے کے شاعر تھے"۔ یہ بھی سچ ہے کہ وہ خالص ادیب تھے۔ ان کے یہاں وسیع النظری اور تحقیقات میں گہرائی اور صداقت پائی جاتی ہے۔ ان کا درجہ یورپ کے صف اول کے مورخین کے ہم پلہ شمار کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مہدی کے اتنا لکھنے کے باوجود شبلی کا حق ادا نہیں ہوا ہے۔ انھوں نے انوکھے انداز سے بات کہنے کی کوشش ضرور کی ہے، ان کے اظہار خیال میں ندرت بھی پائی جاتی ہے، ان کے فیصلوں میں صداقت کی جھلک بھی نظر آتی ہے، ان کے ایک ایک لفظ سے خلوص اور عقیدت مندی کا اظہار بھی ملتا ہے۔ ان کے ان صالح جذبات کا بھی اندازہ ہوتا ہے جو ان کے دل میں ایسے باوزن اور با صلاحیت افراد کے لیے موج زن تھے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ چند اچھوتے منتشر خیالات سے شبلی کی اصل تصویر ابھر کر سامنے نہیں آ سکی ہے۔ یہی کمی دوسرے مصنفین کے متعلق ان کے اظہار خیال میں محسوس کی جاتی ہے۔

مہدی نے آنکھیں اس فضا میں کھولی تھیں جب سرسید تحریک شباب پر تھی۔ یہ وہی زمانہ ہے جب خطہ پنجاب نے اقبال کو جنم دیا تھا جو آگے چل کر شاعر مشرق کی صورت میں جلوہ گر ہوا۔ مہدی نے اسی فضا میں سانس لی، اس کی گرمی، نرمی، تیزی، تلخی سے متاثر ہوئے، اسی میں ان کا مزاج بنا، شعور پیدا ہوا، اس میں کوئی شک نہیں کہ قدرت نے انھیں پرکھنے، سمجھنے اور فیصلہ سنانے کی قوت عطا کی تھی۔ انھوں نے کبھی مخالفت میں فیصلے سنائے تو کبھی موافقت میں۔ یہ کوئی ضروری نہیں کہ ان کے ہر فیصلے پر صاد کیا جائے۔ لیکن یہ حق بات ہے کہ ان کے فیصلے آسانی سے نظر انداز نہیں کیے جا سکتے۔

مہدی کی تحریروں کے مطالعے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھیں شاعروں سے کوئی خاص دل چسپی نہیں تھی۔ اس لیے شعرا سے متعلق انھوں نے اپنے خیالات کا اظہار نہیں کیا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ ان کی نثر پر شاعری کا رنگ گہرا ہے لیکن وہ خود نہ تو شاعر تھے اور نہ ہی شاعری سے دلچسپی رکھتے تھے حالانکہ وہ دور جس کے وہ نمائندہ ہیں شاعروں کے نغموں سے، ترانوں سے اور شعلہ زبانیوں سے گونج رہا تھا۔ ہر مزاج اور

ہر خیال کے شعراء، زبان و ادب اور ملک و ملت کی خدمت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ اقبالؔ تو سب میں نمایاں تھے جن کی شاعری نے عالم اور عالِم دونوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ لیکن وہ متوجہ نہیں کر سکے تو مہدی افادی کو۔

لیکن جہاں تک نثر نگاروں کا تعلق ہے افادات مہدی اس دور کے نثر نگاروں کے خیالات و افکار سے متعلق مہدی افادی کے تاثرات کے تانے بانے سے بھری پڑی ہے۔ اردو ادب میں مہدی افادی پہلے شخص ہیں جن کی تحریروں میں جگہ جگہ مختلف ادیبوں کا اس طرح ایک ساتھ ان کی اپنی اپنی خصوصیات اور خوبیوں کے ساتھ ذکر ملتا ہے اور کمال یہ ہے کہ ان کی خصوصیات نہ ایک دوسرے سے متاثر ہوتی ہیں نہ ان کی عظمتوں کو ایک دوسرے کے مقابلے میں نقصان پہنچتا ہے۔ یہ مختلف مصنفین اپنی اپنی انفرادیت کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں اور اپنا اپنا رنگ و روپ ہمارے دل و دماغ پر بٹھاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس خوبی کے لیے مہدی لائق ستائش ہیں۔ مہدی کو یہ سلیقہ وسیع مطالعے کے بعد حاصل ہوا تھا۔ وہ اچھے رسائل اور اچھی کتابوں سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ مطالعے کے سلسلے میں ان کا بڑا صاف ستھرا اور نکھرا مذاق تھا۔ وہ کتابوں کو نازنینانِ حرم کہتے تھے اور کتابوں کی دنیا کو غیر فانیوں کی دنیا سمجھتے تھے۔

افادات مہدی کے مضامین کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ادب سے، اس میں مختلف رجحانات سے واقف تھے، باخبر تھے، اور گہری نظر رکھتے تھے۔ کتابوں سے متعلق ان کی رائیں، رسائل سے متعلق ان کے خیالات، مختلف ادبی کاموں سے متعلق ان کے افکار، نئے نئے کاموں کی طرف متوجہ کرنے کا ان کا انداز اور طرح طرح کے کاموں کے لیے ان کے دل میں آرزوئیں اور تمنائیں، کام کرنے والوں کو کبھی روکنا، کبھی ٹوکنا، کبھی سراہنا، کبھی رہنمائی کرنا، یہ سب باتیں ان کی عظمت، ادبی ذوق و شوق، وسیع مطالعے، زبان سے لگاؤ اور محبت کا پتہ دیتی ہیں۔ وہ اردو زبان سے والہانہ محبت کرتے تھے اور اس کی ترقی و ترویج کے لیے ہمیشہ فکرمند رہتے تھے۔ یہ ممکن ہے کہ ان کے بعض خیالات سے آپ متفق نہ ہوں لیکن یہ ممکن نہیں ہے کہ آپ ان کے جذبات کی قدر نہ کریں، ان کے دل کی دھڑکنوں کو محسوس نہ کریں۔

مہدی کے یہاں اردو کے ساتھ دوسری زبانوں سے بھی دلچسپی تھی، ادب نوازی کا جذبہ تھا، اچھی کتابوں کے مطالعے کا ذوق و شوق، کتابوں کے ساتھ نازنینانِ حرم کا سا سلوک، اردو کے لیے فکرمندی، اس کے خزانے میں اضافے کے لیے رات دن غور و خوض، تگ و دو، مشورے، خطوط نگاری کا شوق، بات میں بات پیدا کرنے کا ملکہ، نئی بات کہنے کی صلاحیت، دل چسپ اور نیا انداز اختیار کرنے کا سلیقہ ہے۔ اسی کے ساتھ متحرک کرنے کی خواہش، متاثر کرنے کا فن، متوجہ کرنے کی ادا بھی۔ یہی سب کچھ ان کی دولت تھی جس نے ان کے تنقیدی شعور کو جگایا، نمایاں کیا، نکھارا، باوزن بنایا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بہت جلد لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر سکے، اپنا ہم خیال بنا سکے اور ایک خاص انداز سے سوچنے کے لیے مجبور کر سکے۔

میرا خیال ہے کہ انھوں نے تنقید کا حق ادا نہیں کیا، انھوں نے تنقید کا اسلوب اختیار نہیں کیا، انھوں نے تنقید کو اپنا مزاج نہیں بنایا، انھوں نے تنقید کو اپنا فن بھی نہیں ٹھہرایا۔ وہ تنقید کے آدمی بھی نہیں تھے، تنقید کے لیے جس ریاضت، جس صبر و تحمل اور جس طبیعت کی ضرورت پڑتی ہے وہ بدقسمتی سے ان کے حصے میں نہیں آئی تھی اور نہ ان کو اتنی فرصت تھی نہ موقع حاصل تھا، نہ ماحول تھا، نہ ان کا کوئی مسلک تھا۔ اس لیے وہ اردو کے تنقیدی خزانے میں کوئی اضافہ بھی نہیں کر سکے۔ لیکن اس کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ اردو تنقید کی تاریخ میں ان کا نام ضرور آئے گا۔ ان کا ذکر ضرور کیا جائے گا، اس لیے کہ انھوں نے تنقیدی شعور کے پیدا کرنے میں حصہ ضرور لیا ہے اور حق بات کہنے کی جرات اور ہمت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے یہاں خیالات میں تضاد بھی ہے، تکرار بھی ہے، لیکن ان کے جذبے کی صداقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ وہ ادب کا صالح ذہن لے کر آئے تھے۔ وہ کسی نظریے کے پابند نہیں تھے، وہ کسی گروہ سے تعلق نہیں رکھتے تھے، وہ کسی خاص مقصد سے کچھ نہیں لکھتے تھے، وہ ادب کی قلم رو میں ہر نو وارد کو خوش آمدید کہتے تھے، اپنی مسرتوں کا اظہار

نے تھے، اس کی ہمت افزائی کرتے تھے۔

اس کی خصوصیات کو اجاگر کرنے کی کوشش کرتے تھے، اس کی خوبیوں سے روشناس کرنے میں حصہ لیتے تھے اور دوسروں کو اس کی طرف متوجہ کرتے تھے۔ ان کا یہی عمل قابل ستائش بن گیا۔ ان کا یہی جذبہ قابل قدر ہو گیا اور ان کی یہی سچائی قابل اعتنا ثابت ہوئی۔

مختلف ناقدین نے مہدی کے بارے میں اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ جمالیاتی، تاثراتی، وجدانی، جذباتی اور تقابلی تنقید کی خصوصیات رکھتے تھے۔ وہ تنقید کی صحیح اسپرٹ سے واقف تھے، وہ انتہا پسند تھے، جدت طراز تھے، انھوں نے تنقید کو تخلیق کے دائرے میں داخل کیا اور اس میں ادب لطیف کی خوبیاں پیدا کیں اور یہی سب خصوصیات ان کی انفرادیت کو ظاہر کرتی ہیں۔ یہ سب باتیں کسی نہ کسی حد تک درست ہیں اور ان کی تحریروں میں کہیں نہ کہیں پائی بھی جاتی ہیں۔ یہ بات بھی بالکل درست ہے کہ ان کے یہاں اچھا تنقیدی شعور تھا، جرأت مندی تھی، بصیرت تھی، بے باکی تھی، بات کا کہنے کا سلیقہ تھا، پرکھنے کا طریقہ تھا لیکن وہ اپنی ان صلاحیتوں سے زیادہ کام نہ لے سکے۔ ادب کو زیادہ سے زیادہ فائدہ نہ پہنچا سکے۔ کچھ تو حالات نے ایسا ہونے نہیں دیا۔ پھر زمانہ بھی گہری تنقید کو پسند نہیں کرتا تھا۔ ان کا میدان بھی دوسرا تھا، سرکاری ملازمت کی الجھنیں تھیں، وقت کی کمی تھی، لیکن ان حالات میں جب بھی وقت نکال کر لکھنے کی کوشش کی تو ان کی تحریر کی انفرادیت بھی آڑے آئی۔ وہ تنقید کے ساتھ انشائے لطیف کے حدود میں جب بھی داخل ہوئے تنقید کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا، پھر لفظوں کی بازی گری میں کھو گئے یا اسے تخلیق کا درجہ دینے میں کامیاب ہوئے بھی تو اپنی منفرد انشا پردازی کا سہارا لیا اور اسی کے سہارے آگے بڑھے اور سچی بات تو یہی ہے کہ ان کا طرز اسلوب یا ان کی انشا پردازی ہی ان کی سب سے بڑی دولت ہے۔ اسی وجہ سے وہ زندہ رہیں گے، نمایاں رہیں گے، یاد کیے جائیں گے۔

ان کو بات کہنے کا ایک خاص ملکہ تھا، وہ دلچسپ انداز اختیار کرتے تھے، اسلوب کی ندرت کا خاص خیال رکھتے تھے، الفاظ کے انتخاب اور اس کے استعمال کے فن سے واقف تھے، اردو والوں کے احساس اور مزاج سے بھی آگاہ تھے۔ وہ جانتے تھے کہ انھیں کہاں اور کس طرح برتا کیا جا سکتا ہے۔

عام طور سے مہدی کی تحریریں شگفتہ ہیں۔ زبان پر لطف اور پُرشکوہ ہے۔ کبھی کبھی ظرافت کی آمیزش سے تبسم زیر لب کا لطف آجاتا ہے۔ لیکن کہیں لہجے کی درشتی، کرختگی اور طنز کی ملاوٹ سے تلخی کا احساس ہوتا ہے۔

مہدی کی تحریروں کی ایک نمایاں خصوصیت یہ بھی ہے کہ جہاں تہاں صنف نازک کا ذکر بار بار ملتا ہے۔ وہ اس کے متعلق مزہ لے لے کر باتیں کرتے ہیں اور اس کے حُسن و جمال کی حسین تصویریں پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب نظر آتے ہیں۔ اس طرح ان کی تحریروں میں خوبصورت تصویریں ہنستی، بولتی اور انگڑائیاں لیتی نظر آتی ہیں۔ اسی لیے افادات مہدی کے صفحات گل بداماں نظر آتے ہیں جن سے جنت نگاہ اور فردوس گوش کا لطف بھی اٹھایا جا سکتا ہے اور ارضی حسن و جمال سے لذت یاب بھی ہوا جا سکتا ہے۔ بعض جگہ مثالیں بھی اس طرح پیش کرتے ہیں کہ بات اس حد تک جا پہنچتی ہے۔

عام طور سے مہدی کی تحریریں دلچسپ ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے ان کی یہ تحریریں وقتی ضرورت کے تحت قلم بند ہوئی ہیں۔ اس لیے بعض خامیاں بھی پیدا ہو گئی ہیں۔ وہ جوش تحریر میں اپنے موضوع سے کبھی کبھی ہٹ بھی جاتے ہیں اس کی وجہ شاید وقت کی کمی اور سب کچھ ایک ساتھ کہہ دینے کی آرزو ہے۔ یہ بات بھی عجیب ہے کہ مہدی جو یونانی حُسن کا مذاق رکھتے تھے صنف لطیف کے نہ صرف شیدائی تھے بلکہ ان سے متعلق اظہار میں ان کا قلم حسن کا لالہ زار اور باغ و بہار بن جاتا ہے جس کی وجہ سے ان کی نثر میں شاعری کا لطف آتا ہے۔ ان کی زبان پر شاعر کا نام نہیں آتا البتہ چند شعر نوک قلم پر آگئے ہیں لیکن یہ اشعار ایسے نہیں جن کی ہم مہدی سے توقع رکھتے ہیں۔

بہرحال مہدی افادی کے متعلق اگر یہ کہا جائے کہ وہ سرسید تحریک کے BY-PRODUCT تھے تو یہ بات بڑی حد تک درست ہوگی اگر یہ "تحریک" متحرک نہ ہوتی اور حالی، شبلی نعمانی، محمد حسین آزاد اور نذیر احمد قریب یا دور سے اس میں شامل یا اس سے متاثر نہ تھے

(باقی صفحہ ۴۴ پر)

غزلیں

نہال رضوی

ساتھ رہتے ہیں منافق کے قرینوں کی طرح
آج کے دوست ہیں شیشے کے نگینوں کی طرح

عمر تو سوچتا ہوں دار و رسن کو دی جائے
کہہ کے سچ بات محبت کے امینوں کی طرح

یہ ہوا ہے اثرِ ترکِ تعلق یارو
اب تو ہر روز گزرتا ہے مہینوں کی طرح

غمِ انساں کی تجلی نہ ہو جس کے دل میں
زندگی اس کی ہے بے فیض زمینوں کی طرح

وقت پڑتا ہے تو مخصوص عزیزوں کی نظر
ہم نے بدلی ہوئی دیکھی ہے حسینوں کی طرح

جب سے ٹھکرایا ہے تم نے میں بسر کرتا ہوں
شہرِ نغمات میں ٹوٹی ہوئی بینوں کی طرح

کاش میخوارواں کی صحبت انہیں حاصل ہو جائے
فرق انسانوں میں کرتے ہیں جو زینوں طرح

محترم لوگ بسر کرتے ہیں اب کیا کہیئے
رات میخواروں کی دن کعبہ نشینوں کی طرح

اچھے فن کار سے کچھ اہلِ قلم مصلحتاً
پھیر لیتے ہیں نظر زہرہ جبینوں کی طرح

دوستو دیکھو بڑا بول نہ بولو ورنہ
غرق ہو جاؤ گے خود کام سفینوں کی طرح

حرم و دیر کے قائل نہیں میرے سجدے
کیوں جھکاؤں میں جبیں عام جبینوں کی طرح

ہم بھی ہیں دینِ محبت کے پرستار نہالؔ
غالبؔ و حافظؔ و خیامؔ کے دینوں کی طرح

سعید عارفی

اس یگ میں بھی میری ہستی اک جنت کی بانی ہے
پھولوں کی دلدادہ ہے یہ رنگوں کی دیوانی ہے

چہرے کو محبوب کے یارو چاند سے تم تشبیہ نہ دو
مجھ پر اب یہ راز کھلا ہے چاند میں بھی ویرانی ہے

بستی بستی ڈھونڈھ رہا ہے اس جوگن کو دیوانہ
وہ جوگن وہ روپ متی، جو اس کے گھر کی رانی ہے

سنگِ ملامت پھینک کے جس پر آسودہ ہوئے لوگو
وہ تو مسیحا ہے اس یگ کا وہ تو انتر گیانی ہے

تنہائی کا نام دیا ہے جس کو دنیا والوں نے
اس انجانے دیس میں اک صورت جانی پہچانی ہے

میری نظمیں، غزلیں نغمے شعلوں میں جلنے والے لوگ
گھر گھر کہتے پھرتے ہیں یہ فنکار بڑی دہقانی ہے

خاموشی کی چادر اوڑھے شہروں میں آوارہ ہوں
کس کو سناؤں رام کہانی کون یہاں پر گیانی ہے

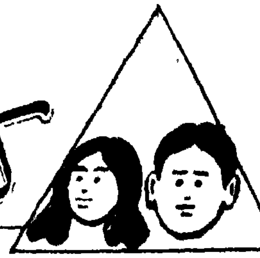
لب پر آہیں، دامن گیلا، ہجر کی سختی قرب کی پیاس
جیون میرا اک صحرا ہے، میں ہوں اور ویرانی ہے

شہروں شہروں میرے قصے بستی بستی چرچا ہے
مجھ کو جانے کیا سمجھی ہے دنیا بھی دیوانی ہے

شعر تمہارے نشتر جیسے، غزلیں تیکھی تیکھی ہیں
چھیڑو سعید اب کوئی نغمہ محفل میں ویرانی ہے

خالد شہاب

کنبہ بندی کیوں؟



اپنا کنبہ کسے عزیز نہیں۔ آپ کو بھی یقیناً عزیز ہے۔ آپ چاہتے ہیں کہ آپ کے بچے جو آپ کے نورِ نظر، لختِ جگر، گھر کی رونق اور آپ کے چمن کے پھول ہیں وہ بن کھلے مرجھا نہ جائیں۔ شاید آپ سوچتے ہوں کہ یہ تو مار و گھٹنا پھوٹے آنکھ والی بات کہی جا رہی ہے۔ آخر کنبہ بندی سے گھر کی رونق کا کیا تعلق؟ سوچا جائے تو بہت گہرا تعلق ہے اور نہ سوچا جائے تو کوئی تعلق نہیں۔ ہمارا آپ کا اور ملک کی آبادی کی اکثریت کا تعلق ایسے طبقے سے ہے جس کے لیے سفید پوشی نبھانا اور دال روٹی چلانا مشکل ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں اپنی تنگ جیب اور محدود وسائل گھر کے باوجود آپ بلا سوچے سمجھے ہر ڈیڑھ یا دو سال بعد بچوں کی شکل میں ناخواندہ مہمانوں کو بلاتے رہیں گے تو آپ جلد ہی اپنی چھوٹی سی آمدنی کی پتلی گردن پر بہت سے چھوٹے بڑے بچوں کا وہ بوجھ لاد دیں گے جو کمزور شاخ کی طرح ٹوٹ کر گر پڑے گی جب سے آپ کا جو حال ہوگا وہ تو ہوگا ہی آپ کے ننھے ننھے چہیتے بچے بھی چوٹ کھا جائیں گے اور وہ ایسی چوٹ ہوگی جو زندگی بھر بوجھ نہ پاسے گی اور ناسور بن کر رستی رہے گی۔ آپ کے پورے کنبے کی زندگی تلخ کر دے گی آپ کے گھر کی خوشی آپ کی حالت زار پر آٹھ آٹھ آنسو بہاتی ہوئی رخصت ہو جائے گی اور آپ کے اندر اتنی بھی سکت نہ ہوگی کہ آپ اس کا دامن پکڑ کر روک سکیں۔

'چھوٹا پریوار سکھی پریوار' محض نعرہ نہیں حقیقت ہے۔ چادر کے مطابق پاؤں پھیلانے کی مثل آج کی نہیں بہت پرانی ہے اور صدیوں کے تجربے کی کسوٹی پر کسنے کے بعد کہی گئی ہے' یہ بالکل موٹی سی بات ہے جس کے سمجھنے کے لیے دماغ پر زیادہ زور دینے کی ضرورت نہیں کہ اگر آپ اپنی آمدنی کی چادر کا خیال کیے بغیر بلا دھڑک آنکھ بند کیے کنبے کے پاؤں پھیلاتے رہیں گے تو ظاہر ہے کہ آپ نہ سر چھپا سکیں گے نہ پاؤں۔ یعنی آپ نہ اپنی اور اپنی بیوی کی صحت درست رکھ سکیں گے اور نہ اپنے بچوں کی صحیح تربیت اور تعلیم کا انتظام کر سکیں گے۔ آپ کی گھر والی ڈھانچا سوکھے، مرجھائے اور ریں ریں کرتے ہوئے بچوں کو دیکھ کر کڑھتی اور گھلتی رہے گی اور آپ دال نون، لکڑی کی فراہمی کے چکر میں اپنی صحت چوپٹ اور زندگی تلخ کرتے رہیں گے۔

کنبہ بندی کا سوال صرف آپ کے گھر کا سوال نہیں پوری دنیا کا سوال ہے۔ پوری انسانی آبادی کی بقا کا سوال ہے۔ جس تیز رفتاری سے دنیا کی آبادی بڑھ رہی ہے اگر بروقت اس کی روک تھام نہ کی گئی تو آخر میں یہی کہنا پڑے گا کہ ع

اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے

روزانہ بڑی تعداد میں بے تحاشا پیدا ہونے والے بچے دنیا کی خوشحالی چہل پہل اور چمک دمک کو روند کر سونا کر دیں گے۔ وجہ یہ ہے کہ زمین محدود ہے اس کے ذریعے پیداوار بھی محدود ہے لیکن پیدا ہونے والے بچوں کی کوئی حد نہیں یہ ایک جانی بوجھی بات ہے کہ زرعی اور صنعتی پیداوار میں چاہے جتنی کوشش کی جائے بڑھتی ہوئی آبادی کی تیز رفتاری کا مقابلہ نہیں کر سکتی اگر اس کی روک تھام نہ کی جائے گی تو وہ اتنی بڑھ جائے گی کہ ہر شخص کو پیٹ بھر کھانا پہنچانا مشکل ہو جائے گا اور دنیا کو خوشحال اور جنت کا نمونہ بنانے کا خیال خوابِ پریشاں بن کر رہ جائے گا۔

آپ سوچتے ہوں گے اور غالباً بجا طور پر سوچتے ہوں گے کہ یہ

دنیا تو بہت پرانی ہے آخر اب تک یہ کیسے بغیر کنبہ بندی کے باقی رہی۔ اگر بالکل شروع دنیا کی بات کیجیے تو اس وقت دنیا کا دامن قدرتی ذرائع سے بھرا اور انسانوں سے خالی تھا اس وقت کنبہ بندی کا نہیں کنبہ بڑھانے کا سوال تھا۔ اس کے بعد جب دنیا کا دامن انسانوں سے بھر گیا اور پیداوار کے ذرائع تنگ ہونے لگے تو آبادی کو کم یا اس کو بڑھنے سے روکنے کا سوال اٹھا۔ جہاں تک آبادی کو کم کرنے کا سوال ہے وہ یا تو جنگ، وبائی بیماری یا قدرتی آفات یعنی سیلاب اور زلزلہ وغیرہ کا شکار ہو کر کم ہوتی تھی۔

اب آپ بتائیے کہ آپ بے سوچے سمجھے انسانی آبادی کا ایک خوفناک جنگل کھڑا کرنے کے بعد اسے جنگ کے شعلوں یا بیماری کی آگ سے جلا کر رہائش کے لیے گنجائش پیدا کرنا پسند کریں گے یا سوجھ بوجھ سے کام لے کر ایک سمجھدار آدمی کی طرح خطرے کی گرفت میں آنے سے پہلے خطرے کی روک تھام کرنا پسند کریں گے۔ کنبہ بندی کا مقصد سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ آپ بے سوچے سمجھے بچوں کو پیدا کر کے انھیں غریبی، تنگی اور بیماری کی آگ میں نہ جھونکیں بلکہ ایسی تدبیریں اختیار کریں کہ صرف اتنے ہی بچے پیدا ہوں جتنی آپ کی چھوٹی سی آمدنی کی چادر میں گنجائش ہو یعنی بچوں کی پیدائش ایک سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق ہو۔ خوشی کی بات ہے کہ دنیا نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ ایسی بے ضرر تدبیریں اور طریقے ایجاد ہو گئے ہیں جن کی مدد سے آپ بچوں کی پیدائش ایک منصوبے کے مطابق کر سکتے ہیں۔

بچوں کی بے تحاشا پیدائش روکنے کا خیال کوئی بالکل نیا خیال نہیں اس سے پہلے بھی یہ کوشش غیر منظم اور انفرادی طور پر ہوتی رہی ہے۔ مسلمانوں کی فقہ کی کتابوں میں اس سلسلہ میں عزل کا ذکر آتا ہے، جس کا مطلب ہم بستری کے دوران بدون انزال کے علاحدہ ہو جانا ہے تاکہ حمل نہ قرار پا سکے۔ چونکہ اس وقت کنبہ بندی کے اچھے اور موثر طریقے ایجاد نہیں ہوئے تھے اس لیے مجبوراً انھیں اس قسم کے طریقے استعمال کرنے پڑتے تھے لیکن اس سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے بچوں کی بے تحاشا پیداوار کو روکنا مذہبی لحاظ سے نہ تو گناہ ہے اور نہ قباحت ہے۔

بعض لوگ اپنی سادہ لوحی سے کنبہ بندی کو ایک طرح سے قتل سمجھتے ہیں حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ کنبہ بندی نہ کرنا اور خراب حالات میں بچوں کو پیدا کر کے انھیں مفلسی اور بیماری کی آگ میں جھونکنا قتل ہے۔ کنبہ بندی تو خاندان کو ایک معقول حد میں رکھ کر کے اپنے بچوں کی زندگی کو خوشگوار بنانا ہے نہ کہ قتل کرنا۔

کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنی کوتاہی اور غلطی کی ذمہ داری بڑے بھولے پن سے قدرت کے سر ڈال دیتے ہیں اور کہتے ہیں واہ صاحب بچوں کی پیدائش میں اپنا کیا دخل یہ تو قدرت کی دین ہے جس کو چاہتی ہے اس کی کوکھ سونی رکھتی ہے اور منتوں مرادوں کے باوجود کوئی شن گن نہیں ہوتی۔ مگر یہ قدرت پر بھروسہ نہیں اپنے کو دھوکا دینا ہے۔ قدرت نے آپ کو پیدا کیا آپ کو عقل دی تاکہ آپ اپنی بھلائی برائی کے متعلق سوچ سکیں اور اسی کے مطابق اپنی راہ اختیار کریں۔ اگر قدرت کی دی ہوئی عقل اور سمجھ سے فائدہ نہیں اٹھاتے تو یہ آپ کی غلطی ہے۔ آپ خواہ مخواہ قدرت کو کیوں بدنام کرتے ہیں۔ قدرت اسی کی مدد کرتی ہے جو آپ اپنی مدد کرتا ہے۔ اگر آپ عقل سے کام لے کر اپنی بھلائی کے لیے کوشش نہیں کرتے تو وہ آپ کو انگلی پکڑ کر بے عقل بچوں کی طرح صحیح راہ نہیں دکھائے گی۔ اس نے عقل کی مشعل آپ کے ہاتھ میں دے دی ہے۔ اس پر بھی اگر آپ آنکھیں بند کر کے خندق میں گر پڑتے ہیں تو آپ کو اپنے اندھے پن پر شرمندہ ہونا چاہیے دیدہ دلیری کر کے قدرت پر الزام نہ لگانا چاہیے۔ ایک دیہاتی مثل ہے کہ "چلنی میں دودھ دوہو اور کرم کو لاگ دو" یعنی غلطی خود کرو اور الزام قسمت پر رکھو یہی حال ان لوگوں کا ہے جو بے سوچے سمجھے بچے پیدا کیا کرتے ہیں اور معصوم بن کر اپنی غلطی قدرت کے سر تھوپ دیتے ہیں۔

آبادی کے بڑھاؤ کو روکنے کے لیے جہاں اور بہت سے سوالات کیے جا رہے ہیں جیسے لڑکے اور لڑکیوں کی شادی کی عمر بڑھانا وہیں یہ بھی کیا گیا ہے کہ اگر بچہ پیٹ میں آ ہی جائے اور حمل کا باقی رہنا ماں کی زندگی کے لیے خطرے کا سبب بن جائے یا اس کی جسمانی یا ذہنی صحت کو شدید نقصان پہنچ جانے کا اندیشہ ہو یا پیدا ہونے والے بچے کی جسمانی یا ذہنی نشو و نما میں کوئی بہت بڑا نقص رہ جانے کا خطرہ ہو یا باپ کے حالات

ایسے ہوں کہ وہ مزید بچوں کی خوشگوار زندگی کا بندوبست کرنے سے قاصر ہوں تو میاں بیوی کی رضامندی سے حمل گرا دینا جرم باقی نہیں رہا۔ کچھ ستم ظریف اس پر بھی ناک بھوں چڑھاتے ہیں اور اسے بھی آوارگی میں اضافہ کا باعث قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں لیجیئے صاحب اسقاط کو جائز قرار دے کر کنواروں اور کنواریوں کے دل سے بدنامی کا خوف بھی دور کر دیا گیا۔ ہمارا خیال ہے کہ شاید ایسے لوگ چاہتے ہیں کہ وہ بھولی بھالی، نادان کنواری لڑکیاں جو برے لوگوں کے پھندے میں پھنس کر نہ صرف اپنی آبرو گنوا بیٹھتی ہیں بلکہ بسا اوقات حاملہ بھی ہو جاتی ہیں وہ بدنامی کے ڈر سے بدستور خودکشی کرتی رہیں یا پھر عطائی دائیوں کے ہاتھوں چوری چھپے حمل گروا کر اپنی جان خطرے میں ڈالتی رہیں ان کا مدعا ہے کسی زنانے اسپتال یا لیڈی ڈاکٹر کے یہاں جا کر انھیں اس مصیبت سے نجات حاصل کرنے کی سہولت نہ فراہم کی جائے۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ استقرار حمل کے پہلے بارہ ہفتوں میں حمل آسانی سے گرایا جا سکتا ہے اور اس میں کوئی قباحت بھی نہیں ہے کیونکہ اس مدت میں نطفے میں جان نہیں پڑتی اور جب تک جان نہ پڑے وہ بچے کے قتل یا جانوں کے ضائع کیے جانے کی تعریف میں نہیں آتا۔

نس بندی کے خلاف یا تو جان بوجھ کر یا نادانی سے عجیب و غریب افواہیں اڑائی جاتی ہیں کوئی کہتا ہے کہ اس سے طرح طرح کی بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں کوئی دور اندیش یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ دو یا تین بچے گھر میں ہوتے ہیں اچھے "محض کہنے کی بات ہے بھلا بتائیے موت پر کس کا قابو۔ خدانخواستہ سب چل بسے تو نس بندی کرانے والے کا تو ہمیشہ کے لیے گھر ہی سونا ہو جائے گا۔ مگر کیا نس بندی پر عمل کیے بغیر یہ صورت ممکن نہیں؟ کون اس کی گارنٹی لے سکتا ہے کہ نس بندی نہ کرائی گئی تو تمام اولادیں زندہ رہیں گی یا یہ کہ اولادیں اس وقت تک زندہ رہیں گی جب تک اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت باقی رہے۔ اگر تمام اولادوں کے چل بسنے کا خطرہ ہے تو وہ اس وقت بھی پیدا ہو سکتا ہے جب میاں بیوی اولاد پیدا کرنے کے لائق ہی نہ رہ جائیں۔ پھر اس وقت کیا ہوگا؟ گھر سونا ہونے کا خطرہ کنبہ بندی سے اور نس بندی سے نہیں بچوں کی بے تحاشا لام بندی سے ہے۔ بچوں کی بھوکی فوج گھر کی خوشی اور خوشحالی کے ساتھ اپنے کو بھی ہضم کر جاتی ہے۔

★

"ہمارے ملک میں فیملی پلاننگ کا پروگرام عوامی فلاح و بہبود کے وسیع تر پروگرام کا لازمی جُز ہے۔ کنبے کو چھوٹا رکھنے کی ضرورت پر اس لیے نہیں زور دیا جا رہا ہے کہ ہمیں بچے پسند نہیں، بلکہ ہمارا مقصد تو یہ ہے کہ ہر بچے کو ملک میں ترقی کرنے کے بہترین مواقع ملیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہم اپنے بچوں کو ایک بہتر دنیا ورثے میں دیں۔ ہر ماں باپ کی یہی خواہش ہوتی ہے اور ہماری منصوبہ بند ترقی کا بھی یہی مقصد ہے۔"

——— اندرا گاندھی

ضیا حسنی

(افسانہ)

چاندی کے تار

چالیس سال کی عمر سے نت نئی بیماریاں میرے یہاں مہمان ہو رہی ہیں اور ان میں سے چند ایک کا میرے ناتوان جسم سے دلی لگاؤ بھی ہو گیا ہے۔ میں ان کے لیے اپنے خانۂ جسم کے دروازے ہمیشہ کھلے رکھتا ہوں مجھے وہ دن اچھی طرح یاد ہیں کہ جب ان سے علیک سلیک شروع ہوئی تھی۔ ان دنوں میں صبح سویرے جیسے ہی آئینہ دیکھتا تو کوئی سپید بال ضرور سر ابھارتا ہوا دکھائی دیتا اور دھیرے سے موت کا سندیسہ سنا دیتا۔ میں ایسا خیال آتے ہی سہم جاتا۔ حالانکہ موت ایک ایسی حقیقت ہے کہ جس سے انکار ممکن نہیں۔ پھر بھی انسان نہ جانے کیوں اسے بھول جاتا ہے اور مرتے مرتے جینے کے خواب دیکھتا رہتا ہے۔

غرض جب کبھی میں کوئی سپید بال دیکھتا تو اسے قینچی سے کاٹ کر اپنے بال سنوار لیتا پھر اپنے کاموں میں لگ جاتا۔ لیکن میں جیسے جیسے ان سپید بالوں کی فصل کو اجاڑتا رہا ویسے ویسے یہ لہلہاتی اور سرسبز و شاداب ہوتی گئی۔ انسان جو کچھ چاہتا ہے اسے کر نہیں پاتا اور اسے قدرت کے فیصلے کے آگے سر جھکانا ہی پڑتا ہے۔ تھوڑے ہی دنوں میں میرے آدھے بال سپید ہو گئے۔ اب میں انھیں خضاب سے سیاہ کر لیتا اور صبح کو جب میں ان پر توے کی سیاہی دیکھتا تو میرے اندر جوانی کی امنگیں اور حوصلے بیدار ہونے لگتے۔ کئی سال یہی معمول رہا۔ لیکن جلد ہی میں اکتا گیا۔ یہ میری فطرت کا قصور ہے کہ وہ مجھے کوئی کام پابندی سے کرنے نہیں دیتی۔ ایک دن میں سوچنے لگا کہ جب قدرت نے انھیں سپید کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے تو میں انھیں کب تک مصنوعی رنگ دیتا رہوں گا۔ ایسی بات ذہن میں آتے ہی میں نے پھر کبھی بالوں کو سیاہ نہیں کیا اور اب میرے بال روئی کے گالے کی طرح ہو گئے ہیں۔

بظاہر ان بالوں سے کوئی نقصان نہیں ہے، ہر جگہ ان کی قدر کی جاتی ہے۔ ہاں! کبھی نوجوان کوئی فقرہ چست کر دیتا ہے تو سر جھکا کر سن لیتا ہوں۔ ایسی بات نہیں کہ مجھے جواب دینا آتا نہیں، لیکن کچھ باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا جواب نہ دینا ہی مناسب ہوتا ہے۔

میں نے نوکری کے بیس سال کئی ضلعوں میں گزارے، گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا، عجیب عجیب چہروں کا مطالعہ کیا، بھانت بھانت کی بولیاں سنیں۔ اب مجھے طویل سرکاری خدمات کے صلے میں صدر دفتر میں تبدیل کیا گیا تو ایسا خیال ذہن میں بار بار آتا کہ شاید میں نئے دفتر نئے ماحول اور نئے ساتھیوں میں کامیاب نہ ہو سکوں لیکن یہاں بھی ایک مہربان افسر مل گئے۔ ویسے میں دل لگا کر کام کرتا ہوں لیکن ان کی مہربانیوں سے متاثر ہو کر یہ سوچتا ہوں کہ کہیں یہ سپید بالوں کی قدر افزائی تو نہیں ہے۔

میں عالم نگر میں تنہا رہتا ہوں اور میرا کنبہ پچاس میل دور ایک قصبہ محمود پور میں رہتا ہے۔ لہٰذا پندرھویں دن وہاں جاتا

ہوں، کبھی ایک دن اور کبھی دو دن وہاں قیام کر کے واپس آجاتا ہوں۔ ایک دن میں رکشا سے اتر کر ایک ہاتھ میں اٹیچی اور دوسرے ہاتھ میں ہولڈال لیے بکنگ آفس کی طرف جا رہا تھا۔ ہولڈال مجھ سے سنبھل نہیں رہا تھا۔ ایک خوب رو نوجوان لڑکی نے بڑھ کر میرے ہاتھ سے ہولڈال لے لیا تو میں گھبرا سا گیا۔ وہ بولی۔

"انکل! میں آپ کی مدد کرنا چاہتی ہوں۔

"شکریہ، بیٹی!"

"سن رسیدہ لوگوں کی خدمت کرنا ان کی ہابی ہے۔"

ایک جوان بولا جس کے بارے میں معلوم ہوا کہ اس کا شوہر ہے۔ لڑکی نے بڑھ کر ٹکٹ بھی لے لیا اور مجھے بس تک پہونچانے آئی جب وہ دونوں جانے لگے تو میں نے دل کی گہرائی سے شکریہ ادا کیا۔ یہ لڑکی میرے ذہن کے کسی گوشے میں چھپ کر بیٹھ گئی ہے۔ اور رہ رہ کر سطح ذہن پر ابھر آتی ہے۔

جہاں یہ لڑکی مجھے یاد آتی ہے وہاں ایک لڑکی اور ذہن میں رینگتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ایک دن میں ٹکٹ لے کر کمپارٹمنٹ میں بیٹھا ہی تھا کہ ایک چھریرے بدن، گوری رنگت اور تیکھے نقوش والی لڑکی بشرٹ اور پینٹ پہنے ہوئے میرے برابر آ کر بیٹھ گئی۔ وہ اپنے زانو پر بریف کیس رکھے ہوئے باتیں کرتی رہی۔ اسی دوران میں چائے والا سامنے آگیا تو وہ بریف کیس میرے حوالے کر کے پلیٹ فارم پر چلی گئی۔ وہیں سے اس نے کہا۔

"چائے پی لیجئے۔"

"شکریہ، میں نہ پیوں گا۔"

وہ چائے پیتے پیتے نہ جانے کہاں چلی گئی؟ تھوڑی دیر بعد ایک کانسٹبل آیا، اس نے مجھے غور سے دیکھا۔ پھر وہ بریف کیس لے کر جانے لگا۔ تو میں نے اسے روکا۔ وہ بولا۔

"کیا یہ آپ کا ہے۔؟"

"ایک لڑکی مجھے دے گئی ہے اسے آجانے دو۔"

"وہ تو اب یہاں نہ آئے گی، اگر آپ اس لڑکی سے دلچسپی رکھتے ہیں تو آپ بھی میرے ساتھ چل سکتے ہیں۔ میں اس سے ملوا دوں گا۔ صرف آپ کے سپید بالوں کا خیال ہے۔ اس لیے آپ کو زحمت نہیں دے رہا ہوں۔"

"وہ لڑکی تو صورت سے بھلی لگتی تھی۔

"بھولے بھالے چہروں کے پھیر میں نہ آجایا کیجیے! وہ افیون اسمگل کرتی ہے۔"

یہ کہتے ہوئے کانسٹبل بریف کیس لے کر چلا گیا لیکن اس واقعہ کا اثر میرے ذہن پر کافی ہوا اور میں آج تک اس لڑکی کو بھول نہیں سکا ہوں۔

بات سے بات نکلتی ہے اس زندگی میں ایک تجربہ ایسا بھی ہوا کہ جب میں سفر کے دوران اپنی زندگی گنوا بیٹھتا۔ لیکن ایک فرض شناس کانسٹبل نے موقع پر میری ایسی اعانت کی کہ موت کا خطرہ صاف ٹل گیا۔ میں بس سے محمود پور پہنچ گیا تھا اور اپنا سامان لے کر رکشا اسٹینڈ کی طرف جا رہا تھا کہ ایسا چکر آیا کہ میں وہیں گر پڑا۔ اس کے بعد مجھے پتہ نہیں چلا کہ مجھ پر کیا بیتی؟ میری آنکھیں تو اس وقت کھلیں کہ جب پانی کے تیز چھینٹے میرے چہرے پر پڑنے لگے۔ میں نے اپنے چہرے سے پانی کو پونچھتے ہوئے جو نگاہ اٹھائی تو ایک کانسٹبل کو اپنے پاس کھڑا ہوا پایا۔ اس نے پوچھا۔

"کہاں جاؤ گے بابا؟"

"نظیر باغ"

پھر میں بیہوش ہو گیا اور گھنٹوں ہوش نہیں آیا۔ اور اس کے بعد جو میں نے آنکھیں کھولیں تو وہی کانسٹبل کھڑا ہوا تھا اور پولیس کی گاڑی بھی کھڑی تھی۔ وہ بولا۔

"چنتا نہ کرو، میں ابھی تمھیں موٹر سے گھر پہنچا دوں گا۔"

"پیشاب کروں گا۔"

اس نے مجھے سہارا دے کر اٹھانا چاہا لیکن گر پڑا۔ وہ مجھے گود میں اٹھا کر پیشاب گھر لے گیا۔ وہاں سے آکر اس نے مجھے پولیس کی گاڑی پر بٹھاتے ہوئے اپنے ساتھی سے کہا۔

"باباکو ان کے رشتہ داروں کے حوالے کرکے ان سے تحریر یے لینا۔

اب میں نے کوٹ کی جیب کا جو جائزہ لیا تو اس میں کچھ روپے رکھے ہوئے تھے لیکن وہ بھیگ گئے تھے۔ پانچ منٹ بعد میں اپنے گھر پہنچ گیا، کئی ہفتے علاج ہوا اور میں اس کے بعد پھر کبھی بے ہوش نہیں ہوا ورنہ وہ فرض شناس نوجوان ملا۔ میں اسے برابر ڈھونڈ رہا ہوں، جو کانسٹبل دکھائی دیتا ہے اس کے چہرے پر متجسس نگاہ ضرور ڈالتا ہوں۔ اگر زندگی نے وفا کی اور وہ سرِراہ کہیں مل گیا تو میں اس کی فرض شناسی کو ضرور سراہوں گا۔ نہ جانے کب وہ گھڑی آئے گی۔

بھری جوانی میں کئی گناہ سرزد ہوئے ہیں اور کچھ کی حسرت آج بھی لیے بیٹھا ہوں۔ جوانی رخصت ہوگئی اب نہ وہ لوٹ کر آئے گی اور نہ میں رندی دستی کے منصوبے بنا سکوں گا۔ اسی زمانے میں ایک گوری چٹی، مست انکھڑیوں اور تیکھے چتونوں والی لڑکی ملا کرتی تھی۔ کبھی پارک کے قریب اور کبھی ذرا سا آگے بڑھ کر تجارتی مرکز میں، وہ کافی شوخ اور شریر تھی۔ اس کی باتیں کافی دلچسپ ہوتیں اور لہجے میں عجیب سی کشش جب وہ مل جاتی تو پھر اسے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا، اور میں اس کے ساتھ کبھی پکچر جاتا اور کبھی رستوران میں بیٹھا رہتا۔ ایک دن وہ مجھے ریجھا کر اپنے گھر لے گئی اور اپنی مست شرابی انکھڑیوں میں ایسا الجھایا کہ میں اسے گلاس بدلتے نہ دیکھ سکا۔ اور جب سے انگور کی بیٹی سے اکثر دل لگا تا رہا ہوں۔ ہر دن نہ سہی تو جب گھٹائیں گھر گھر کر آتیں اور ٹھنڈی ہوائیں چلتیں تو وہ لڑکی بے اختیار یاد آجاتی۔ نہ جانے اب وہ کہاں ہو اور کس حال میں ہو؟ جام کو ہونٹوں سے لگا کر اس کی یاد ضرور تازہ کر لیتا کہ یہ اسی کی دین ہے۔

یہ عادت برسوں سے پیچھا کر رہی تھی سپید بال اکثر ہاتھ روک لیتے۔ لیکن میں زبردستی پی لیتا تھا لیکن کئی ہفتوں سے ایک خوش گوار تبدیلی رونما ہوئی ہے اور اب پینے کی طرف طبیعت راغب ہی نہیں ہوتی اسے بھی سنتے چلیے۔

میں پرمٹ لے کر آزادی سے پیا کرتا ہوں اسی کو حاصل کرنے کے لیے سول سرجن کے دفتر گیا تھا۔ ان کے کمرے میں ایک اور شخص بیٹھا ہوا ان سے میڈیکل سرٹیفکٹ مانگ رہا تھا ڈاکٹر صاحب نے کہا۔

"آپ بیمار نہیں ہیں اس لیے میں سرٹیفکٹ نہ دوں گا۔"

"زیارت کے لیے اجمیر جاؤں گا، آپ کو ثواب ملے گا۔"

"میں سرٹیفکٹ نہ دے سکوں گا۔ آپ سچ کیوں نہیں بولتے۔؟"

"اجمیر جانے کے لیے چھٹی لیجیے۔"

وہ شخص مایوس ہو کر چلا گیا۔ میں کرسی پر خاموش بیٹھا ہوا تھا کہ ڈاکٹر صاحب نے مجھے متوجہ کیا۔

"کہیے آپ نے کیسے زحمت کی؟"

"میں شراب پینے کے لیے اجازت نامہ لینے آیا تھا لیکن پہلی ملاقات میں آپ نے مجھے ایسا تاثر دیا کہ اب میرا جی نہیں چاہتا کہ شراب کو ہونٹوں سے لگاؤں۔"

"میں بھی آپ کو یہی مشورہ دیتا۔ لیکن آپ کے سپید بالوں کے خیال سے ایسی بات کہہ نہ پاتا۔

میں شرمسار کمرے سے باہر آگیا اور اب ہفتوں سے میں نے ایک گھونٹ بھی نہیں پی ہے۔ شروع شروع کافی تکلیف محسوس ہوئی۔ ایسا لگتا تھا کہ جسم سے روح کھنچ رہی ہو اور میرا کسی کام میں جی نہ لگتا کہ جھنجھلاہٹ بھی ہوگئی تھی، بات بات پر الجھ جاتا تھا۔ کئی بار جی چاہا کہ توبہ کو توڑ دوں کہ جان پر بن آئی ہے۔ لیکن ضمیر نے ایسی ملامت کی کہ میں جان پر کھیل گیا اور میں نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے شراب کو ہاتھ نہ لگانے کا تہیہ کر لیا۔ دن بدن اس ارادے میں توانائی آتی جاتی ہے۔ اور اب میں صبح کو جب آئینہ دیکھتا ہوں تو چاندی کے تاروں میں عجیب سا نکھار دکھائی دیتا ہے۔

ایم۔اے۔کاوش

ہمارا ہندوستان

یہ ہندوستاں ہے ہمارا وطن — ہمیں جان و دل سے ہے پیارا وطن
یہ سرسبز پھولوں بھری وادیاں
یہ مستی بھری جھومتی ڈالیاں
خوشی میں جھرنوں کی شہنائیاں
پپیہے کی رٹ 'پی کہاں، پی کہاں'
ہیں جنت سے بڑھ کر یہاں کے چمن — یہ ہندوستاں ہے ہمارا وطن
یہ گنگا اور جمنا کے میداں کی ریت
زمیں پر ہو جیسے ستاروں کا کھیت
گگن کا وہ پانی میں دلکش فریب
اتر آیا مہتاب تاروں سمیت
مچلتی سی دھاروں کا وہ بانکپن — یہ ہندوستاں ہے ہمارا وطن
ہمالیہ کی عظمت ہے سب پر عیاں
بلندی میں ہے ہمسر آسماں
یہ ہے ہند کا قدرتی پاسباں
اسی دیش میں تاج جنت نشاں
محبت کا گھر، مظہر علم و فن — یہ ہندوستاں ہے ہمارا وطن
یہ باپو کا موتی جواہر کا دیش
بھگت اور اشفاق ٹیگور کا دیش
یہ نیتا سبھاش اور جوہر کا دیش
یہی ہے ظفر شاہ بہادر کا دیش
وطن پر فدا ہو گئے سب یہ تن — یہ ہندوستاں ہے ہمارا وطن

لقاء اللہ خاں لقا کرتپوری

ترنگے کا نشاں

دیکھتی ہے جسے حسرت سے زمانے کی نظر
جس پہ ہے سایہ فگن پرتو انوار سحر
ٹکٹکی باندھ کے دیکھے ہیں جسے شمس و قمر
لہلہائے گا جو تا حشر یونہی شام و سحر
اہل بھارت کی عقیدت ہے ترنگے کا نشاں
مژدۂ جذب محبت ہے ترنگے کا نشاں

فخر ہے جس پہ تجھے، ہاں وہی تصویر ہے یہ
جشن آزادی اور اتفاق کی تنویر ہے یہ
اور گاندھی کے ہر اک خواب کی تعبیر ہے یہ
کیوں نہ کہہ دوں کہ مساوات کی تصویر ہے یہ
بادۂ عشق کی لذت ہے ترنگے کا نشاں
مژدۂ جذب محبت ہے ترنگے کا نشاں

میرے محبوب مجھے نانک و چشتی کی قسم
عزم جوہر کی قسم مقصد گاندھی کی قسم
قطرۂ خون بھگت ہمت مدنی کی قسم
خون ٹیپو کی قسم جھانسی کی رانی کی قسم
مادر ہند کی عظمت ہے ترنگے کا نشاں
مژدۂ جذب محبت ہے ترنگے کا نشاں

ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری

تذکرۂ شعرائے ھندی

مولفۂ میر حسن

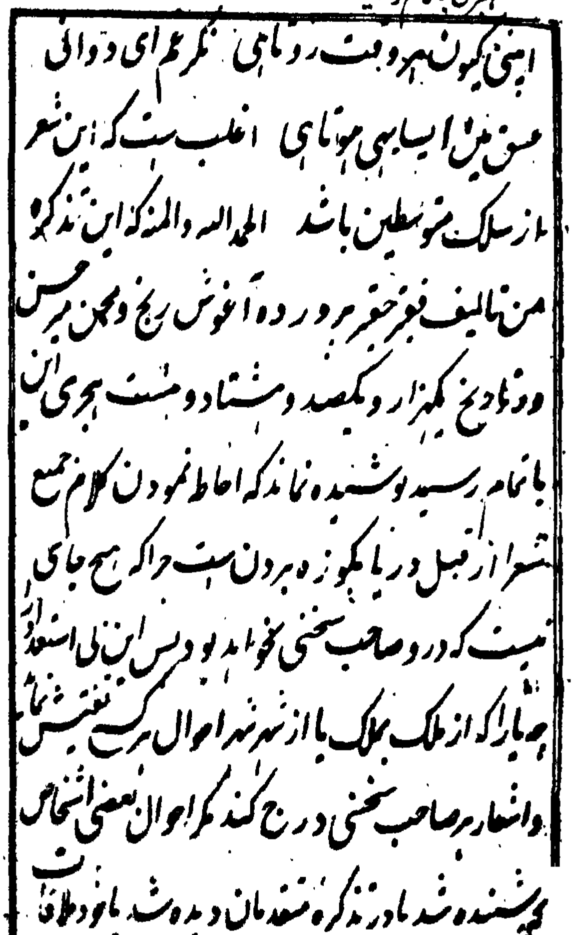
قدیم ترین مخطوطہ

میر حسن (متوفی ۱۲۰۱ ہجری مطابق ۱۷۸۶ء) اردو کے عظیم ترین مثنوی نگار اور مشہور و معروف صاحبِ دیوان شاعر ہیں۔ مثنوی 'سحر البیان' اور دیوان کے چند قلمی نسخے انڈیا آفس لندن اور ہندستان کے بعض کتاب خانوں میں دستیاب ہیں۔ کلیات[1] کا ایک نادر نسخہ جناب راجہ صاحب مرحوم محمود آباد کے کتب خانے میں بھی محفوظ ہے۔

اردو تذکرہ نویسی میں بھی ان کا پایہ بڑا اہم ہے اور ان کا شمار قدیم اور مستند تذکرہ نویسوں میں ہوتا ہے۔ تذکرۂ میر حسن کے قلمی نسخے عنقا کے برابر ہیں۔ جہاں تک معلوم ہو سکا اس تذکرے کا کوئی قلمی نسخہ انڈیا آفس لندن یا یورپ کے کسی اور کتاب خانے میں نہیں ملتا ہے۔ اس کے نادر اور کمیاب ہونے کا ثبوت اس سے بھی فراہم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر اسپرنگر اور گارساں دتاسی کو بھی اس کا کوئی نسخہ دستیاب نہ ہو سکا تھا۔ ان دونوں مستشرقین نے اپنی کتابوں[2] میں اس پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

میر حسن نے تذکرۂ شعرائے ھندی عہد نواب شجاع الدولہ بہادر (متوفی ۱۱۸۸ ہجری مطابق ۱۷۷۵ء) میں فیض آباد میں تصنیف کیا تھا۔ انھوں نے اس کا کوئی نام نہیں رکھا۔ نواب حبیب الرحمن خاں صاحب شروانی نے اسے تذکرۂ شعرائے اردو کے نام سے پہلی مرتبہ ۱۹۲۲ء میں شائع کیا تھا۔ اس کے آخر میں مصنف کا کوئی خاتمہ یا ترقیمہ درج نہیں تھا۔ شروانی صاحب نے تذکرے کا دوسرا ایڈیشن رائل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے نسخے سے مطابقت کرکے تصحیح و تنقید کے ساتھ ۱۹۴۰ء میں انجمن ترقی اردو سے شائع کرایا۔ آخر میں جو خاتمہ درج ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ تذکرہ ۱۱۹۱ ہجری مطابق ۱۷۷۷ء میں تالیف کیا گیا تھا۔ میر حسن کہتے ہیں:

"الحمد للہ والمنۃ کہ ایں تذکرہ من تالیف فقیر حقیر پروردۂ آغوش رنج و محن، میر حسن در تاریخ یک ہزار یک صد و نود و یک ہجری باتمام رسید[3]"


اینی کیوں نہ ہو وقت رونا ہی نکر عمر ای دوانی
عشق میں ایسا ہی ہوتا ہی اغلب ہست کہ این شعر
از سلک متوسطین باشد الحمد للہ والمنۃ کہ این تذکرہ
من تالیف فقیر حقیر پروردہ آغوش رنج و محن میر حسن
در تاریخ یکہزار و یکصد و ہشتاد و ہشت ہجری این
باتمام رسید و پوشیدہ نماند کہ احاطہ نمودن کلام جمیع
شعرا از قبیل دریا بکوزہ بردن ہست چرا کہ ہیچ جای
نیست کہ در و صاحب سخنی نخواہد بود و پس این بی استعداد
ہر بارکہ از ملک بملک یا از شہر بشہر احوال ہر کس تفتیش نماید
و اشعار ہر صاحب سخنی درج کند مگر احوال بعضی اشخاص
کہ شنیدہ شد یا در تذکرہ متقدمان دیدہ شد یا خود ملاقات

---

[1] تفصیل کے لیے راقم الحروف کا مقالہ "کلیات میر حسن کا قدیم مخطوطہ" مطبوعہ اردو ادب علی گڑھ شمارہ ۱ سنہ ۱۹۶۲ء ملاحظہ ہو۔ [2] اردو کیٹلاگ ڈاکٹر اسپرنگر مطبوعہ کلکتہ ۱۸۵۴ء اور خطبات گارساں دتاسی مطبوعہ انجمن ترقی اردو۔ [3] تذکرۂ شعرائے اردو میر حسن ص ۲۰۸

جناب قاضی عبدالودود صاحب کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ تذکرے نے کتابی صورت دراصل ۱۱۸۹ھ مطابق ۱۷۷۶ء میں اختیار کرلی تھی[1]۔

تذکرۂ میر حسن کا ایک قلمی نسخہ کتاب خانۂ رام پور میں بھی محفوظ ہے۔ یہ غالباً نامکمل اور بغیر خاتمے کے ہے۔ اس کے بارے میں جناب عرشی صاحب فرماتے ہیں کہ:

"اس تذکرے کا ایک قلمی نسخہ کتاب خانۂ عالیہ رام پور میں موجود ہے۔ اس میں جا بجا سادہ صفحات یا دس دس پانچ پانچ سطروں کی بیاضیں پائی جاتی ہیں نیز آخری حال دوسرے خط کا لکھا ہوا ہے جس سے یہ قیاس کیا جاتا ہے کہ خود مصنف کا نسخہ ہے کہیں کہیں نسخے میں اختلاف بھی ہے[2]۔"

مذکورے کے سال تصنیف کے بارے میں شروانی صاحب کی رائے ہے کہ:

"تذکرۂ ہذا میں میر صاحب نے جو فہرست اپنی تصانیف کی لکھی ہے اس میں مثنوی رموز العارفین ہے، گلزار ارم نہیں ہے۔ رموز العارفین کا سال تصنیف ۱۱۸۸ ہجری ہے اور گلزار ارم کا ۱۱۹۲ ہجری ہے۔ اس سے واضح ہے کہ تذکرہ ۱۱۸۸ھ اور ۱۱۹۲ھ کے مابین لکھا گیا ہے[3]۔"

شروانی صاحب کی تحقیق کے مطابق میر حسن نے ۱۱۸۸ھ میں تذکرہ لکھنا شروع کیا اور اسے ۱۱۹۲ھ میں تمام کیا۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ تذکرہ نے ۱۱۹۲ھ میں کتابی صورت اختیار کرلی تھی۔

عرشی صاحب شروانی صاحب کی رائے سے متفق ہیں کہ میر حسن نے اسے سنہ ۱۱۹۱ ہجری میں ختم کر دیا تھا اور بعد کے اضافوں میں صرف شاہ فصیح کی وفات ہے جو ۱۱۹۲ ہجری میں واقع ہوئی تھی۔

تذکرہ شعرائے ہندی (نسخۂ سلطان المدارس لکھنؤ) (تالیف میر حسن)

خوش قسمتی سے راقم الحروف کو تذکرۂ میر حسن کے دو نادر الوجود قلمی نسخے دستیاب ہوئے ہیں۔ ان میں کا ایک لکھنؤ کے مشہور و معروف عربی کالج سلطان المدارس اور دوسرا ندوۃ العلماء کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ جہاں تک اول الذکر نسخے کا تعلق ہے اسے تمام نسخوں پر تقدم زمانی حاصل ہے۔ یہ اردو کے محسن عظیم اور لکھنؤ کے رئیس اعظم اسد الدولہ رستم الملک میرزا محمد تقی خاں بہادر فیل جنگ عرف آغا صاحب تخلص ترقی[4] کے کتاب خانے کی یادگار ہے

[1] بہارستان ص۔ [2] دستور الفصاحت ص ۲۰ (حاشیہ)۔ [3] تذکرۂ شعرائے اردو ص۔ [4] میرزا محمد تقی خاں ترقی نیشاپوری سید تھے۔ ان کے والد گرامی کا نام سید محمد امین تھا۔ ان کی شادی نواب برہان الملک (متوفی ۱۱۵۱ھ مطابق ۱۷۳۹ء) کی نواسی نجم النساء بیگم عرف کھیتو بیگم سے ہوئی تھی۔ اس طرح ترقی نواب موصوف کے نواسے تھے (قیصر التواریخ ص ۴۹ جلد اول مصنفہ سید کمال الدین حیدر)۔ ترقی کی ولادت فیض آباد میں ہوئی تھی اسی لیے تذکروں میں ان کا وطن فیض آباد درج کیا گیا ہے (بزم سخن ص ۲۸ سید علی حسن خاں، سراپا سخن ص ۵۶ سید محسن علی محسن)۔ نواب آصف الدولہ بہادر (متوفی ۱۲۱۲ھ مطابق ۱۷۹۸ء) نے فیض آباد میں اپنی اولاد کی طرح ان کی پرورش کی تھی (قیصر التواریخ ص ۲ جلد اول)۔ آصف الدولہ بہادر کی والدہ بہو بیگم صاحبہ نے اپنے رشتے کی ایک لڑکی لطف النساء بیگم کو منھ بولی بیٹی بنایا تھا جن کو بعد میں انھیں ترقی سے منسوب کیا۔ اس طرح وہ نواب وزیر الملک شجاع الدولہ کے داماد کہلاتے تھے۔ (قیصر التواریخ ص ۱۹۱)۔ بہو بیگم نے ان کے لیے وصیت نامے میں وثیقہ بھی مقرر کیا تھا (قیصر التواریخ ص ۱۹۱)

ترقی بڑے باغ و بہار اور جاہ و جلال کے مالک تھے۔ ان کے دامن دولت سے فیض آباد اور لکھنؤ میں بہت سے شعراء وابستہ تھے (ریاض الفصحا ص ۵۴ مصحفی)۔ میر سوز (متوفی ۱۲۱۳ھ م ۱۷۹۸ء) کے شاگرد اور صاحب دیوان شاعر ہیں۔ (سراپا سخن ص ۵۶)۔ انڈیا آفس اور خدا بخش لائبریری پٹنہ میں ان کے دیوان کے دو نسخے موجود ہیں۔ ترقی کا انتقال ۱۲۴۶ ہجری مطابق ۱۸۳۰ء میں لکھنؤ میں ہوا۔ مصحفی کے شاگرد مرزا علی نظر نے تاریخ کہی:

محمد تقی خاں بہادر کہ بود ۔۔۔ بجود و شجاعت عدیم المثال
بحکم خدا زیں سرائے سپنج ۔۔۔ سوے باغ فردوس کرد انتقال
پئے سال تاریخ آں ذی شکوہ ۔۔۔ چو کردم نظر از دل خود سوال

موصوف کے انتقال کے بعد یہ نسخہ ان کے بیٹے دلیر الدولہ[1] محمد علی خاں بہادر عرف آغا حیدر، فیروز جنگ کی ملکیت میں رہا۔ ان کے انتقال کے بعد نہ جانے اس بیش بہا کتاب خانے کا کیا حشر ہوا۔ چند نادر کتابیں جن میں تذکرۂ میر حسن بھی شامل ہے، سلطان المدارس کے کتاب خانے کی زینت بن گئی ہیں۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ محمد تقی خاں ترقی نواب شجاع الدولہ بہادر اور نواب سالار جنگ بہادر (متوفی ۱۲۰۲ھ مطابق ۱۷۸۷ء) کے قرابت داروں میں تھے۔ میر حسن فیض آباد میں سالار جنگ کی رفاقت میں رہتے تھے[2] اور انھیں ترقی کے خاندان سے والہانہ محبت تھی۔ بقول میر شیر علی افسوس (متوفی ۱۲۲۳ھ مطابق ۱۸۰۸ء) ان کے دو فرزند میر مستحسن خلیق (متوفی ۱۲۶۰ھ مطابق ۱۸۴۴ء) اور میر محسن محسن بہو بیگم صاحبہ (متوفی ۱۲۳۰ھ مطابق ۱۸۱۶ء) کے داماد میرزا محمد تقی خاں ترقی کی رفاقت میں رہتے تھے[3]۔ آزاد کی تحقیق کے مطابق میر خلیق پندرہ روپے ماہانہ پر ترقی کے ملازم تھے[4]۔ ان تمام باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ میر حسن اور ترقی کے خاندانی تعلقات کس قدر استوار تھے۔ اس لیے تذکرۂ میر حسن کا ترقی کے خاندان میں پہنچنا کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے۔

نسخۂ سلطان المدارس غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ تذکرۂ میر حسن کا قدیم ترین مخطوطہ ہے اور غالباً مصنف کے ہاتھ ہی کا مکتوبہ ہے۔ اگر یہ کسی کاتب کے ہاتھ کا لکھا ہوتا تو پھر اس میں کہیں نہ کہیں کاتب کا نام یا تاریخ کتابت بھی درج ہوتی۔ پورا نسخہ ابتدا سے آخر تک ایک ہی کاتب کے ہاتھ کا ہے۔

اس مخطوطے سے یہ بات، اب پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ دراصل تذکرے کا پہلا نسخہ ۱۱۸۸ھ ہجری میں کتابی صورت میں مرتب ہوا تھا۔ میر حسن کہتے ہیں کہ:

"الحمد للہ والمنۃ کہ ایں تذکرہ من تالیف نقیر حقیر پروردۂ آغوشِ رنج و محن یک ہزار یک صد و ہشتاد ہجری باتمام رسید"۔ (ورق ۱۷۹ الف)

نسخۂ سلطان المدارس کی تفصیل درج ذیل ہے:

نمبر مخطوطہ ۹۵، سائز ½۵ × ۹، اوراق ۱۷۹، سطر ۱۱، خط نستعلیق۔ ابتدا میں سادہ کاغذ کا ورق ہے۔ اس کے بائیں طرف اوپر کے کونے پر سیاہ روشنائی سے "تذکرۂ شعرائے ہندی تالیف میر حسن" کے الفاظ نہایت خوش خط درج ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ½۲ × ۱ انچ سائز کی تقریباً چوکور مہر بھی ثبت ہے جس میں پورا نام صاف طور پر نہیں پڑھا جاسکتا ہے۔ البتہ اس کے نچلے حصے میں "امیر دوراں ...." اور کچھ مبہم حروف اور اوپر "سالار جنگ" کے الفاظ دکھائی دیتے ہیں "سالار جنگ" کے بائیں کونے میں ۱۱۷۵ھ (مطابق ۱۷۶۱ء) کا سال نمایاں طور درج ہے۔ مہر کی ساخت یوں ہے:

تذکرۂ شعرائے ہندی تالیف
میر حسن

جنگ سالار ۱۱۷۵
امیر دوراں

(بقیہ حاشیہ)

ہماں دم خرد از سر علم گفت ‌ ‌ ‌ ‌ برقت از زماں قدر دان کمال

(۱۲۴۶ھ دیوان نظم قلمی و غیر مطبوعہ)

[1] دلیر الدولہ تخلص حیدر، برق (متوفی ۱۲۷۴ھ مطابق ۱۸۵۷ء) کے شاگرد اور صاحب دیوان شاعر ہیں۔ مرزا غالب کے ساتھ گہرے مراسم تھے (کلیات نثر غالب ص ۱۰۵ مطبوعہ ۱۸۶۸ء نولکشور) ان کا انتقال ۱۲۷۵ھ مطابق ۱۸۵۸ء میں ہوا۔ اسیر لکھنوی نے تاریخ کہی ؎

دلیرے کہ از دو لتش بود شہرت ‌ ‌ ‌ ‌ شجاع کہ مشہور ہمنام حیدر
بتاریخ فوتش ندا کرد ہاتف ‌ ‌ ‌ ‌ کہ جایافت حیدر بقرب پیمبر

(دیوان اسیر ص ۴۰۸ مطبوعہ ۱۸۷۰ء)

[2] عمدۂ منتخبہ ص ۱۶۸، اعظم الدولہ [3] دیباچہ مثنوی سحر البیان مطبوعہ ۱۸۰۳ء کلکتہ [4] آب حیات ص ۲۷۹ مطبوعہ ۱۹۲۲ء الہ آباد

آغاز تذکرہ میں مصنف کا دیباچہ ہے جو ورق ۲ ب میں چوتھی سطر کے وسط میں ختم ہوتا ہے۔ پھر ساتھ ہی اسی سطر میں حرف الف کے تحت آرزو کا ترجمہ ذیل کے الفاظ سے شروع ہوتا ہے:

"از اکرفار مغفرت نشان استاد استادان ہندوستان سر آمدہ سخن سنجان چراغ دودمان گفتگو شیخ سراج الدین علی خان آرزو ......"

تذکرہ حرف ی پر خاتمہ سے قبل حکیم یونس کے ترجمہ کے بعد ان الفاظ پر ختم ہوتا ہے:

بعضے از اشعار کہ قابل نوشتن تذکرہ بودند و
نام شاعر معلوم نیست دریں جا نیز ثبت می نماید[۱]
تو میدِ عشق کے موں اثبات کو نہ پوچھو   باقی رہا فنا سے جن نے جبی ہے ملا
از لفظ "موں" معلوم شود کہ ایں شعر از قدیم باشد
عبث تو بیکسی پر اپنی کیوں ہر وقت روتا ہے
نہ کر غم اے دوانے عشق میں ایسا بھی ہوتا ہے[۲]
اغلب است کہ ایں شعر از سلک متوسطین باشد"

یہ عبارت ورق ۱۷۹ الف کی تیسری سطر کے وسط میں ختم ہوتی ہے۔ پھر اس کے ساتھ ہی اسی سطر میں "خاتمہ" درج ہے جو ورق ۱۷۹ ب کے نصف سے زیادہ صفحہ پر مشتمل ہے۔

نسخۂ سلطان المدارس میں ۱۹۵ شعرا کا حال حروف تہجی میں درج ہے۔ ان میں سے تین شاعر (۱) فضلی (۱۴۹ ب) (۲) مرزا حسین بخش فراق (ورق ۱۱۶ الف) اور (۳) کھتری (ورق ۲۰۶ الف) مطبوعہ اور نسخۂ ندوۃ العلما میں غائب ہیں یہ اب پہلی مرتبہ دریافت ہوئے ہیں۔ البتہ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی ہے کہ مصنف نے ۱۱۸۸ ہجری تک کے شعرا میں اردو کے مشہور و معروف شاعر مصحفی کو تذکرۂ ہذا میں شامل نہیں کیا ہے۔ اس زمانے میں مصحفی کی عمر ۲۴ سال سے کم نہ تھی۔ عرشی صاحب تذکرے (مطبوعہ) کے سال آغاز کے تعین کے سلسلے میں کہتے ہیں:

"مصحفی نے لکھنؤ کا یہ سفر ۱۱۸۰ ہجری (مطابق ۱۷۶۶ء) میں سکرتال کی جنگ کے بعد اختیار کیا تھا۔ اس بنا پر یقین ہے کہ ان کا حال بھی ۱۱۸۴ ہجری (مطابق ۱۷۷۰ء) کے لگ بھگ لکھا گیا ہے[۳]"

راقم کی رائے میں میر حسن نے مصحفی کا ترجمہ ۱۱۸۸ ہجری کے بعد لکھا ہے۔ اگر اس سے قبل لکھتے تو ضرور نسخۂ سلطان المدارس میں درج ہوتا۔ عرشی صاحب کا یہ فرمانا درست ہے کہ میر حسن نے تذکرہ کا کام ۱۱۸۴ ہجری کے لگ بھگ شروع کیا تھا۔

زیر بحث نسخہ میں نئی اور مفید اطلاعیں بکثرت ملتی ہیں جو ذیل میں چند شعرا کے سلسلے میں مختصراً درج کی جاتی ہیں:

(۱) آرزو - چوں مشاعرہ در خانۂ او مقرر بود خود ہم دو سہ ریختہ فرمود (ورق ۱۲ الف)

(۲) جوشش - شنیدہ ام کہ او ہم در تالیف تذکرہ مشغول است (۵۳ الف)

(۳) حاتم - بندہ او را در شاہجہان آباد دیدہ متقدمین وضع بود (۳۹ الف)

(۴) خاکسار - حالا پسرش با فقیر آشنا ست مردے متواضع و مودب است

البتہ پدرش بہتر تر خواہد بود، خدایش بیامرزد، شنیدہ شد کہ تذکرہ درہماں عصر علی الرغم تذکرۂ میر تقی نوشتہ و احوال خود را محض بہ معشوق کسے کہ بنوہ بودہ کہ او را می خواست رقم نمودہ۔ فکرش خالی از دردمندی نیست، خدایش بیامرزد — (۴۵ الف و ب)

---

[۱] یہ نثری عبارت لال روشنائی میں درج ہے   [۲] مطبوعہ نسخہ ص ۱۹۹ میں یہ شعر یکرنگ کے نام سے درج ہے۔
[۳] دستور الفصاحت ص ۶۸ حواشی۔ مصحفی اس مرتبہ لکھنؤ (مع فیض آباد) میں ایک ہی سال رہے تھے۔ وہ دوبارہ دہلی سے لکھنؤ ۱۱۹۸ھ میں گئے تھے (ریاض الفصحا)



وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی اپنی رہائش گاہ پر ۱۳ مئی ۱۹۷۶ء کو مانٹریل اولمپک کے لیے منتخب ہندستانی ہاکی ٹیم کے ممبوں کے ساتھ

وزیر اعلا شری نرائن دت تیواری سیتاپور سے ۴۰ کیلو میٹر دور موضع کلتاج پور
میں ۲۶ جون ۱۹۷۶ء کو بے زمینوں کو زرعی آلات اور بیل قرض کی شکل میں
تقسیم کرتے ہوئے

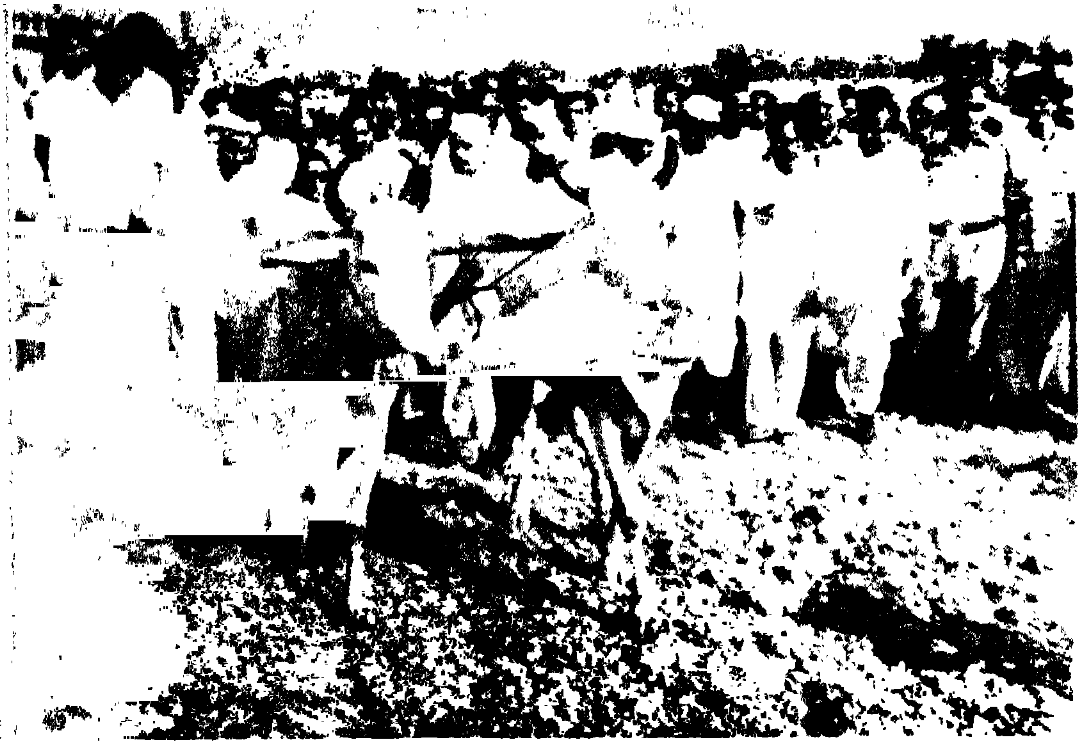


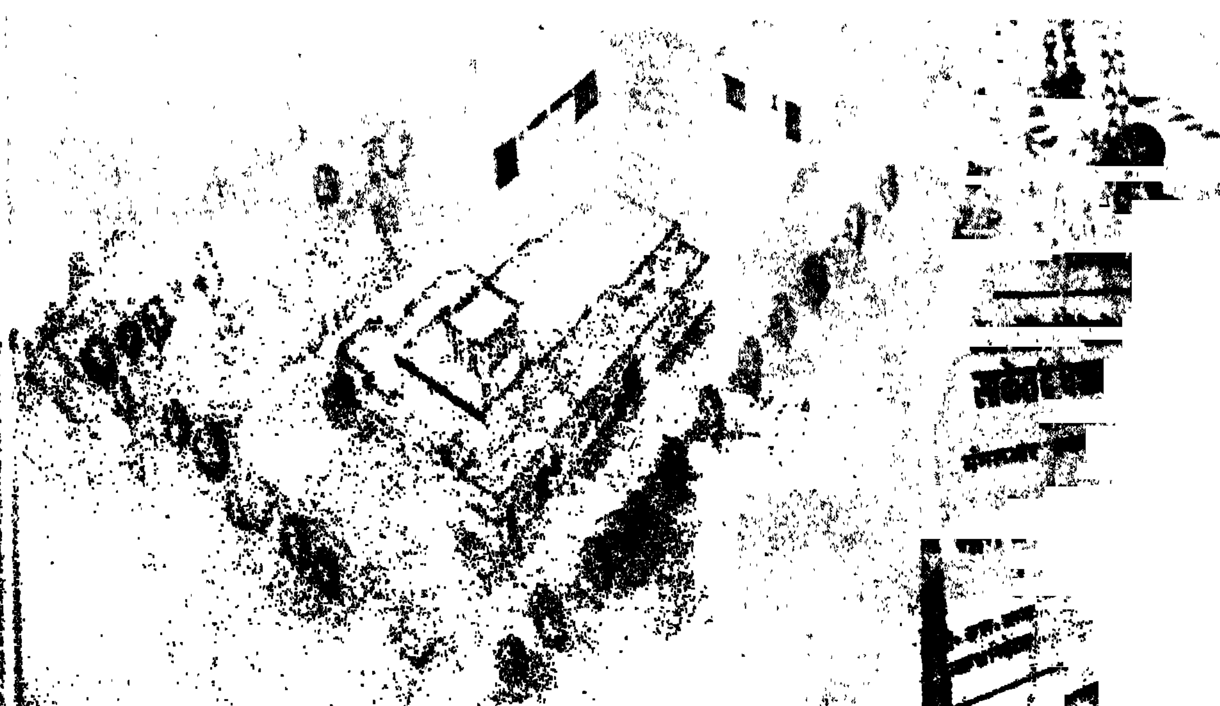






(اوپر دائیں) ٹنڈیشور ضلع آگرہ میں "باغی بھائیوں" (سابق ڈاکوؤں) نے
۳ جون ۱۹۷۶ء کو وزیر اعلا شری نرائن دت تیواری کے سامنے ہتھیار ڈالے —
داہنی جانب تصویر میں ان میں سے کچھ ہتھیار دیکھے جا سکتے ہیں ......
(اوپر بائیں) وزیر اعلا شری نرائن دت تیواری ۱۹ جون ۱۹۷۶ء کو کلیان پور
(کانپور) ترقیاتی بلاک کے جگئی پور گاؤں میں بے زمینوں کو الاٹ کیے گئے
کھیت پر ہل چلا رہے ہیں
(وسط میں) وزیر اعلا ۲۲ جون ۱۹۷۶ء کو فیض آباد کو آپریٹیو فیڈریشن کے
واحد "ساکیت دگدھ شالا" کا سنگ بنیاد رکھتے ہوئے۔ بائیں: دگدھ شالا
کی عمارت کا ماڈل







وزیر ریاست شری رمیندر ورما ۲۴ جون ۱۹۷۶ء کو ضلع لکھنؤ کے ملیح آباد بلاک میں اجتماعی ٹی وی مرکز کا افتتاح کرتے ہوئے

ضلع اناؤ میں اجتماعی جوتائی کا ایک منظر



(۵) دَرد۔ بندہ در صغر سن بخدمت او رسیدہ وارستہ مزاج و آشنائے درست و متواضع، غرضکہ مجموعہ خوبی ہاست رباعیات فارسی ہم بسیار مشہور است کہ ثانی نہ دارد۔ و کتاب فارسی مسمی بنام دارد، در مقدمۂ توحید و تصوف تصنیف نمودہ کہ شرحش برادر او کہ اثر تخلص می نماید مسمی بہ قرار دنوشتہ قابل دیدن و فہمیدن است (۸۵ الف و ب)

(۶) سعدی۔ از دکن است مردم ایں را گمان شیخ سعدی بردہ اند خطاست (۷۷ الف)

(۷) کافر۔ ایں ہر دو شعر او از فارسی است۔ وقتے کہ جنوں تخلص می کرد گفتہ ؎

از کعبہ و بتخانہ جنوں فرق ندارد   سنگیں دل ما کافر یا برہمن ما

(۲۶ الف)

در وقتیکہ تسکین تخلص نمود گفتہ ؎

دل دیوانہ از فرط محبت شادی دارد
مگر تسکین غم از بہر مبارک بادی آید

(۸) میر۔ طرزش مانا بطرز شفائی۔ چنانچہ در مقدمۂ استادی خود فرمودہ ؎

ریختہ رتبے کو پہنچایا ہوا ہے اس کا   معتقد کون نہیں میر کی استادی کا
دلیل بر طرز شفائی او روشن ؎
تھی غزل میر یہ شفائی کی   ہم نے بھی طبع آزمائی کی

از چندے در شاہ جہان آباد است۔ استقامت در زیدہ جوان محمد شاہی است۔ الحال ہم پیش ناگرمل در شاہ جہان آباد سکونت دارد۔ لیکن شنیدہ ام کہ اکنوں لباس فقیری پوشیدہ از جہاں عزلت گزیدہ۔ (ورق ۴۴ الف)

(۹) معین۔ بیشتر شعر خود را بخدمت میر سوز می برد الحال خود را از تلامذہ اے مرزا رفیع می شمارد۔۔۔۔ غرض مرد خوش است مثل او ہم طبع پیدا نیست۔ در مقدمۂ آب بر د قصیدہ خوب گفتہ و ہجو کشمیری نیز خوب کردہ۔ بوسیلۂ شاعری بسر می برد۔ (۱۵۲ الف)

(۱۰) ولی۔ مردے بود از متقدمین عالمگیری، اصلش از خاک اورنگ آباد۔ اگرچہ در زبان اردوئے معلیٰ تفاوت زمین و آسمان دارد، لیکن اکثر در آنہا کہ موافق محاورہ یافتہ شد، بنا بر تیمناً و تبرکاً بقلم آوردہ۔ (ورق ۱۵۹ ب)

غرضیکہ اس نسخہ میں اکثر و بیشتر شعراء کے بارے میں بیش بہا اور نئی معلومات فراہم ہوتی ہیں۔ میر حسن نے تذکرہ میں جن ماخذوں کا ذکر کیا ہے ان میں تذکرۂ آرزو، تذکرۂ میر، اور تذکرۂ قائم قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے زیادہ تر استفادہ تذکرۂ میر سے کیا ہے۔ اس سلسلے میں ایک معمولی مثال فغاں کی پیش کی جاتی ہے۔ میر حسن ان کے ترجمے میں زیادہ تر ان ہی باتوں کا ذکر کرتے ہیں جو تذکرۂ میر میں درج ہیں۔ اس قسم کے واقعات مطبوعہ نسخے میں نہیں پائے جاتے ہیں۔

فغاں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ داخل ذیل نبیرۂ امرایان بودہ بسیار جوان قابل شعر ریختہ را بخوبی می گفت بطور خود گاہے فکر غزل فارسی ہم می کرد۔ اصلش از شاہ جہان آباد بودہ طبع لطیفش مائل بہ لطیفہ بسیار بودہ، چنانچہ ناگرمل را دیوان تن دخیل سرکار بادشاہست "گھی کی منڈی کا سانڈ" گفتہ و حکیم معصوم را در دربار معلیٰ "گاؤ گجراتی" نام نہادہ۔ ہر کہ ایں ہر دو را دیدہ باشد، بداند کہ چہ مناسب گفتہ" (ورق ۱۰۶ الف)

اب میر کی زبانی فغاں کا حال ملاحظہ ہو:

فغاں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ داخل ذیل نبیرہ امرایان است۔ بسیار جوان قابل و ہنگامہ آرا، شعر ریختہ را بخوبی می گوید۔ گاہے فکر غزل فارسی ہم می کند، شاگرد قزلباش خان مرحوم است دریں ایام طبع او مائل لطیفہ بسیار است۔ چنانچہ ناگرمل را "دیوان تن دخیل بادشاہیست "گھی کی منڈی کا سانڈ" گفتہ، ہر کہ دیدہ دیدہ باشد و فہمیدہ باشد۔ و حکیم معصوم را در دربار معلیٰ "گاؤ گجراتی" نام کردہ (مطبوعہ ص ۸۹)

نکات الشعراء[1]

نسخۂ سلطان المدارس اور نسخہ ہائے مطبوعہ دونوں کے متن میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے۔ اول الذکر نسخے میں جہاں تک

معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے صحت متن کا خیال رکھا ہے۔ اس میں شعراء کے حالات زندگی زیادہ اور اشعار کی کافی تعداد موجود ہے۔ آبرو (۳۱ ب) بیان (۲۱ الف) جرأت (۳۷ الف) دردمند (۵۵ ب) میر درد (۵۸ الف) سودا (۸۲ الف)، فغاں (۱۰۶ الف) میر تقی میر (۱۴۳ ب) وغیرہ کے اشعار بکثرت ملتے ہیں۔ اس قسم کے اشعار موخر الذکر نسخوں یا کسی اور تذکرہ میں درج نہیں ہیں۔ یہ سبھی اشعار ترتیب دواوین کے لیے مفید ثابت ہوں گے۔ ذیل میں صرف نمونے کے طور پر میر حسن مولف تذکرۂ ہذا کے متعلق اختلاف کا ذکر کیا جاتا ہے۔ ان کے ترجمے میں جو اشعار درج کیے جاتے ہیں وہ مطبوعہ (م) اور ندوہ (ن) کے نسخوں میں غائب ہیں۔ سب سے پہلے دیباچے میں ہی نام کا اختلاف ہے۔ مطبوعہ اور ندوہ کے نسخوں میں میر غلام حسن درج ہے:

"این پروردۂ آغوش رنج و محن، اسیر دار الحزن میر غلام حسن...... (صفحہ ۲)

نسخۂ سلطان المدارس میں مصنف کا نام میر محمد حسن درج ہے (ورق ۱ ب) اس تذکرے میں جا بجا حیرت انگیز انکشافات کیے گئے ہیں۔ میر حسن کے حالات زندگی کے بارے میں بھی نئی معلومات فراہم ہوئی ہیں۔ مثلاً یہ کہ مولف تذکرہ نے اپنا نام میر محمد حسن اور اپنے پردادا کا اسم گرامی میر ہدایت اللہ بیان کیا ہے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ میر ہدایت اللہ کا نام پہلی مرتبہ صفحۂ تاریخ پر ابھر آیا ہے۔ نسخۂ مطبوعہ اور ندوہ میں ان کے پردادا کا نام میر امامی درج ہے عبارت یہ ہے:

"پوشیدہ نماند کہ اصل این فقیر ابن میر غلام حسین ولد میر عزیز اللہ ابن میر امامی ہروی است۔"

زیر نظر تذکرہ سے یہ بھی منکشف ہوتا ہے کہ میر حسن ابتدا میں فارسی میں شعر کہتے تھے۔ چنانچہ اس زمانے کی ایک فارسی رباعی بھی تذکرۂ ہذا میں درج ہے۔ جب میر ضاحک نے یہ رباعی شیخ علی حزیں کو سنائی تو وہ محظوظ ہوئے۔ انھوں نے میر حسن کے حق میں دعا فرمائی۔ تذکرہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ میر حسن ۱۱۸۸ ہجری تک تقریباً دس ہزار شعر کہہ چکے تھے۔ اس تذ[کرہ] میں ان کے ۵۴ شعر بھی زیادہ ملتے ہیں۔ ان میں سے بعض اشعار پہلی مرتبہ سامنے آرہے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ [میر حسن] نے یہ تذکرہ اپنے مربی نواب سالار جنگ کے لیے بڑے اہتمام سے لکھا تھا۔ اس نسخے میں ان کا ترجمہ ان الفاظ میں در[ج] ہے۔ خط کشیدہ الفاظ اور قوسین کی عبارت میرا[؟] ہے یہ الفاظ اور عبارتیں نسخۂ سلطان المدارس میں زائد ہیں

ورق ۴۶ ب تا ۴۷ الف

"میر محمد حسن۔ بارۂ احوال این فقیر مولف کتاب بر عزیزان و دانش وران ماہر پوشیدہ نماند کہ اصل این فقیر ابن م[یر غلام] حسین بن میر عزیز اللہ ابن میر ہدایت اللہ بن میر امامی از ہرات است (میر امامی ہروی نور اللہ مرقدہ در شاہجہاں آباد آمدہ بہ منصب سہ ہزاری ذات بین الاقران ممتاز گردید فاضل متجر و فقیہ بے مثال و ہفت قلم بودند شعر ہم گاہ می فرمودند) پس این عاجز سخن را سررشتۂ شاعری اجداد نامور زی، حاصل کہ صغر سن میلان طبیعت این فقیر بطرف سخن بیشتر بود۔ بارے حق تعالیٰ درین فن کم و بیش مو[افق] ظرف استعداد و قبولیت بخشید۔

(اول این رباعی فارسی گفتہ بودم۔ چنانچہ از زبان گاہی، شیخ صاحب، شیخ علی حزیں نور اللہ مرقدہ شنیدہ شدند و دعا در حق این عاصی نمودند، شاید کہ این نتیجہ د[عای] آن بزرگوار باشد کہ توفیق سخن یافتم یا از فیض صحبت د[یگر] سلمہ اللہ کہ اصلاح حرفی و معنوی از ایشان گرفتم)

لیکن کما حقہ طرز سخن ایشان از من سر انجام نہ یافتہ۔ بہ دیگر بزرگان است مثل حضرت خواجہ میر درد و مرزا رفیع و میر [تقی] نمودم۔ و آن رباعی این است۔

جمع نمودہ بود تا ملت با شعر سخن دلو و یک رباعی نیز خود موزون
کرد۔ چند مدت ملاقات بازوی نمودہ حق تعالیٰ سلامت دارد
از دست رباعی دنیا دہلی کو جو کہ فال سمجھی تھا اور قصہ گو کو
کتا سمجھی تھا در باب صنعت کو زدہی جاری ہے تا جو مثل حباب
زندگانی سمجھی تھا میر محمد حسن یارہ از احوال این فقیر مؤلف
کتاب بر سخن وران شاعر و دانشوران ماہر پوشیدہ نماند کہ
اصل این فقیر این فقیر غلام حسین بن میر میرزا الہ این میر برات اللہ
بن میر امامی ہروی از نہایت سنت میر امامی ہروی نور اللہ مرقدہ
در شاہجہاں آباد آمدہ بمنصب سہ ہزاری ذات بین الاقران
ممتاز کردہ شدند۔ فاضل متبحر و فقیہ نامثال و صفت علم بودند و شعر
ہم گاہ گاہ بمعز موزوں میفرمودند۔ بس این عاجز سخن را بہ رشتہ شاعری

اجداد نسبت نادر و زہی حاصل کہ از صغر سن میلان طبیعت این
فقیر بطرف سخن بیشتر بود باری حق تعالیٰ درین فن کم و بیش موافق
ظرف استعداد قبولیت بخشید اول این رباعی فارسی گفتہ بود
چنانچہ از زبان فیلکاہی شیخ صاحب شیخ علی حزین نور اللہ مرقدہ
شنیدہ محظوظ شدند و دعا در حق این ہیچمدان نمودند شاید کہ
این نتیجہ دعای آن بزرگوار باشد کہ توفیق سخن یافتم بار از فیض
صحبت میرضا رسلمہ اللہ کہ اصلاح حروفی و معنوی از ایشان گرفتم
لیکن کما حقہ طرز سخن ایشان از من سر انجام نیافتہ بر قدم دیگر
بزرگان ست مثل حضرت خواجہ میر درد و میرزا رفیع و میر تقی
میر روی نمودم و آن رباعی این است رباعی جانا ز تو امید
نگاہی دارم تا امید نگاہی ز تو گاہی دارم تا ماکشتہ چشم

جانا ز تو امید نگاہے داریم — امید نگاہے ز تو گاہے داریم
ماکشتۂ چشم سرما سائیم حسن — نے نالہ و نہ فغاں نہ آہے داریم

بعد ازیں رباعی فارسی مائل ریختہ گر دیدم کہ زبان خود بود۔

گردش روزگار بدہنجار کہ ہرگز بہ کسے وفا نہ کردہ بطرف لکھنؤ فیض آباد رسیدم۔ بارے (دریں زمانہ کہ کسے از قابلیت کے و سخن فہمی سروکارے نہ دارد) کم و بیش از قدردانی نواب فلک جناب سالار جنگ بہادر دام اقبالہ لیب نان رسیدہ در خدمت مرزا نوازش علی خاں سردار جنگ بہادر کہ خلف ارجمند او ست صحبت گزیدم۔ چنانچہ تا حال بہر حال گزراں می نمائم ذاکر بقرابت نواب معلی القاب مرثیہ نیز بگفتن می آید کہ طبع عالیش در ہمہ فن چنیں بلند افتادہ کہ از حصر و بیان بیرون است، علی الخصوص در موسیقی کہ سوز ہائے مرثیہ تصنیف می فرمایند و ایں حسنہ برائے آخرت است۔ حقا کہ دریں فن بعد از امیر خسرو دہلوی تا حال چنیں صاحب کمال برنخاستہ بلکہ از دہم سبقت ربودہ و ایں فن را بجائے صرف نمودہ کہ نتیجہ آخرت گردید و سردار جنگ بہادر نیز بطور پدر بزرگوار دریں کار ذہن رسا دارند۔ حق تعالیٰ مع فرزندان عمر و دولت ایشاں را تا جہان ست قائم دارد۔ بالنبی والہ الامجاد۔

فقیر دریں مدت قریب دہ ہزار بیت مع رموز العارفین و ترکیب بند کہ پسند سخن سنجان گردیدہ و مشہور گفتہ باشد۔ اول

چند اشعار برائے یادگار از دیوان خود در ذیل ایں بزرگان،
مسطور می نمایدؔ شاید کہ مقبول دلہا گردد) بیت۔ ؎
گرچہ از نیکاں نہ ام خود را بہ نیکاں بستہ ام
در ریاض آفرنیش رشتۂ گلدستہ ام
(درج ذیل اشعار مطبوعہ اور ندوہ کے نسخوں میں غائب ہیں)
مرنے کے بعد گل کی ہوا و ہوس کے بیچ
بلبل کے پر بھی اڑتے ہیں کنج قفس کے بیچ
ہاں دل تو چاہتا ہے کہ تجھے کوئی کچھ کہے
موجود ہوں یہ بات تو کہنے کو دس کے بیچ
اب کہاں لطف یار اور اخلاص
تھا کبھی ہم سے پیار اور اخلاص
شمع ساں شب کے میہماں ہیں ہم
صبح ہوتے تو پھر کہاں ہیں ہم
باغباں تک تو بیٹھنے دے کہیں
آہ گم کردہ آشیاں ہیں ہم
پھر گل کے تو وعدہ پہ لگا کھانے قسم آج
کیا بھول گئیں اپنی تجھے کل کی وہ قسمیں
ہم نہ ہنستے ہیں اور نہ روتے ہیں عمر حسرت میں اپنی کھوتے ہیں
کوس حسرت ہے جنبش ہر دم آہ تس پر بھی یار سوتے ہیں
راز دل کہتے تو ہر اک سے کہا میں نے پر اب
مجھ کو یہ ڈر ہے کہ وے ہر کہیں رسوا نہ کریں
کچھ ہو نہ ہو ولے ہو ترا خیال ہر دم
اس بن نہیں گزرتی، اس بن نہیں گزرتی
خوبی چمن میں دیکھو نسیم بہار کی کس کس طرح سے آئی ہوا دل میں یار کی
دل ساتھ رشک کے جو گیا سو پھر نہ پھر سینے سے گرچہ نالے نے کتنی پکار کی
پھر پھر کے ہم نشیں نہ دلا یاد اس کی بس
ہم سن چکے خبر دل زار و نزار کی
چھیڑی دل حزیں نے جو شب بات وصل کی
باتوں میں رات یوں کٹی جوں رات وصل کی

عشق کے جب سے پیچ و تاب میں ہیں
تب سے تو سخت عذاب میں ہیں
نسخۂ دل کو سرسری مت دیکھ
سینکڑوں علم اس کتاب میں ہیں
دلدار و دل اس طرح ہم آئے نظر میں
جس طرح گہر آب میں اور آب گہر میں
ہر چند کہ ہے شام و سحر دہی پر اس بن
وہ لطف نہ اب شام میں ہے اور نہ سحر میں
صبا اب سوگ ہے کس کا چمن میں عندلیبوں کو
پڑے ہیں برگ گل سے جو یہ منھ پر لے کے رومالو
نگہ سے چشم سے ناز و ادا سے
خدا محفوظ رکھے ہر بلا سے
یہ کس کا روٹھنا ملنا حسنؔ کہہ یاد آتا ہے
کہ تو آپ ہی خفا ہوتا ہے آپ ہی مسکراتا ہے
دور سے باغ جہاں دکھلا کے دیوانہ کیا
متصل جانے نہ پایا میں کہ دیرانہ کیا
طرفہ تر یہ ہے کہ اپنا بھی نہ جانا اور یونہی
اپنا اپنا کہہ کے مجھ کو سب سے بیگانہ کیا
دیکھنے بیٹھا جو وہ مہ اپنے گھر کی چاندنی
جب تلک بیٹھا رہا تب تک نہ سرکی چاندنی
ایک شب تو پھر آ آنکھیں تو بس ہو گئیں سفید
کب تلک دیکھا کریں اجڑے نگر کی چاندنی
اگر اس کے آنے کے کچھ طور ٹھہرے تو یہ جاں بلب ایک دم اور ٹھہرے
اک ذرا تم تو بیٹھ کر اٹھ گئے رات ہم نے تڑپ تڑپ کاٹی

جوں شمع استخواں مرے آہوں سے جل گئے اعضا تمام اشک ہو آنکھوں سے ڈھل گئے
غیرت نہ لے چلی تھی گلی سے تری ہمیں پر دل کے کہنے سننے سے کچھ ہم سنبھل گئے
اب تو کیا پوچھے ہے تب درد و الم رہتے تھے
جب ترے گوشۂ گلشن میں ہم رہتے تھے

فیصلہ سیکڑوں کوسوں کا پڑا اُسے اب آہ
ہوگیا وہ بھی زیانہ جو بہم رہتے تھے

دنیا ہے نہ مجھ پاس مری جان نہ دین ہے
اک تو ہے سو کچھ ترا بھروسا بھی نہیں ہے

جو صبر کہ تو ڈھونڈے ہے سو ہم میں نہیں ہے
یہ اور ہی عالم ہے کہ عالم میں نہیں ہے

جس زخم پہ ہاتھ اس کا لگا بس وہ بھر آیا
یہ دست شفا تو کسی مرہم میں نہیں ہے

درمیاں تیغ نظ جب بہتر ابرو ہی نہ ہو
حسن اور عشق کا قصہ کبھی یکسو ہی نہ ہو

ترے ہمنام کو جب کوئی پکارے ہے کہیں
جی دھڑک جاتا ہے مرا کہ کہیں تو ہی نہ ہو

دلبر سے ہم اپنے جب ملیں گے ۔ اس گمشدہ دل سے تب ملیں گے
ظاہر میں تو ڈھب نہیں ہے کوئی ۔ ہم یار سے کس سبب ملیں گے

دوستاں مجھ کو تم اس شوخ تلک جانے دو
عشق کرنے کا مزا پھر تو ذرا پانے دو

کیا بنے اب کوئی اور کیا رو سکے ۔ دل ٹھکانے ہو تو سب کچھ ہو سکے
خبر دل کی اسکے جس کا گھر ہے ۔ کسی کے گھر کی ہم کو کیا خبر ہے
ہمیں کچھ وہ نہیں ہیں آہ ورنہ ۔ وہی ہے شام اور وہی سحر ہے
مجنوں کو اپنی لیلیٰ کا محمل عزیز ہے ۔ تو دل میں ہو ہمارے ہمیں دل عزیز ہے

دریا میں ڈوب جاوے کہ یا چاہ میں پڑے
اے عشق پر نہ کوئی تری راہ میں پڑے

آجا کہیں شتاب کہ مانند نقش پا ۔ تکتے ہیں راہ تیری سر راہ میں پڑے

نسخہ سلطان المدارس میں بھی شعرا کے نام اور تخلص لال روشنائی سے درج ہیں۔ بعض شعرا کے حالات بھی اسی روشنائی میں مندرج ہیں۔ ان میں سے چند یہ ہیں :۔

غریب، کھتری، مجنت، مستمند، مسافر، محب، میر محمد نعیم اللہ خاں مرزائی، موزوں الہ آبادی، منت، مخلص، مشتاق، مخزوں، نظا، نامی، وارث الہ آبادی، وحشت، شاہ واقف، میر ہدایت اللہ ہدایت۔

انتخاب کلام میں بھی ہر شعر کے دو مصرعوں کے درمیان لال روشنائی سے نشان امتیاز (ــہ) رکھا گیا ہے تاکہ دونوں مصرعے آپس میں خلط ملط نہ ہوں۔ جہاں اشعار کے درمیان کوئی قطعہ یا رباعی لکھنے کی ضرورت پڑی تو کاتب نے اسے بھی لال روشنائی سے نمایاں طور لکھا۔ پوری کتاب لال جدول سے آراستہ ہے اور مکمل طور پر بڑی صفائی اور نفاست سے لکھی گئی ہے۔ یہی معلوم ہوتا ہے کہ کسی ممدوح یا سرپرست کے لیے بڑے اہتمام سے لکھی گئی۔

کتاب کی ابتدا میں ورق ۱۲ ب کے آخر میں میر آثم کے ترجمے کے ان الفاظ " این غزل را بیشتر میر امانی مخمس نمودہ و خوب نمودہ" کے بعد ۳ اوراق خالی ہیں۔ پھر ایک ورق خالی ہے۔ یہ خالی صفحے تذکرہ پر اثر انداز نہیں ہوتے ہیں کیونکہ صفحوں کے متن کی عبارت مکمل ہے۔

تذکرے میں املا کی بعض معمولی غلطیاں پائی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر چند غلطیاں درج کی جاتی ہیں :۔

مسنوی (مثنوی)، طلامزہ (تلامذہ)، حاطم (حاتم)، متوصلان (متوسلان)، اکسر (اکثر)، تور (طور)، انتخواب (انتخاب)

تذکرۃ الشعرا، تالیف میر حسن (نسخہ ندوۃ العلما)

تذکرہ میر حسن کا جو قلمی نسخہ ندوۃ العلما لکھنؤ کے کتاب خانے میں موجود ہے وہ بہت اہم اور کارآمد ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے۔

نمبر مخطوطہ ۴، سائز ۸ × ۵، اوراق ۱۶۱ ب، خط نستعلیق، سطر ۱۴۔ یہ نسخہ علامہ شبلی کی کتاب خانے کی یادگار ہے جو انھوں نے بعد میں ندوۃ العلما کے لیے وقف کر لیا تھا۔ دیباچہ مصنف سے قبل صفحہ اول کی پیشانی پر شبلی کے ہاتھ کی یہ تحریر بھی درج ہے۔

"تذکرۃ الشعرا، از میر حسن مصنف مثنوی بدر منیر و جد میر انیس ۱۲
شبلی ۵ اکتوبر ۱۹۰۶ء"

ابتدا میں دیباچہ مصنف ہے۔ پھر حروف تہجی میں حالات شعرا درج ہیں۔ تمام شعرا کے نام اور تخلص لال روشنائی میں لکھے گئے۔ تذکرہ کا آغاز بادشاہ شاہ عالم تخلص آفتاب سے ہوتا ہے اور آخر میں ردیف واو میں نعیم علی وہم کے حال میں ورق ۲۴۲ اب پر ان اشعار پر ختم ہوتا ہے

صبر و ہوش و قرار و تاب و تواں ۔ چل بسے رفتہ رفتہ سب دل ...

مرتے ہیں تب جو پاتے ہیں آرام   نہیں مرتا ہے بے سبب کوئی

اس کے بعد نصف سے زیادہ صفحہ خالی ہے اور پھر دو ورق خالی ہیں یہ غالباً حروف ط اور ی کے شعرا کے لیے رکھے ہوں گے۔ ورق ۱۴۴ ب سے مثنوی گلزار ارم شروع ہوتی ہے۔ مثنوی کا خاتمہ اس شعر پر ہوتا ہے

زبس وصف گل و گلشن بہم ہے   سو اس کا نام گلزار ارم ہے

ترقیمہ میں کاتب کا نام یا تاریخ کتابت درج نہیں ہے۔ صرف اتنی سی عبارت ہے:

"تمت تمام شد این مثنوی مسمّی بہ گلزار ارم تصنیف میر غلام حسن
ابن غلام حسین بن عزیز اللہ المتخلص بہ حسن"

تذکرہ اور مثنوی ایک ہی جلد میں مجلد ہے اور پوری کتاب ایک ہی کاتب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے۔ کتابت بڑی شاندار جدول سے مزین ہے۔ نسخۂ ندوہ بڑا خوبصورت اور دیدہ زیب ہے۔ اس میں اور مطبوعہ نسخے میں مطابقت پائی جاتی ہے۔ متن میں کہیں کہیں اختلاف بھی نظر آتا ہے۔ راقم نے جب نسخۂ سلطان المدارس کا مقابلہ مطبوعہ اور ندوہ کے نسخوں سے کیا تو متنوں میں بڑا فرق نظر آیا اس لیے ضروری سمجھا گیا کہ تذکرۂ میر حسن از سر نو ترتیب دیا جائے تاکہ صحیح متن سامنے آ جائے۔ اس ترتیب نو میں سلطان المدارس کا قدیم ترین نسخہ ہی بنیاد بنایا گیا ہے جو شعرا اس میں درج نہیں ہیں وہ مطبوعہ نسخہ سے شامل کیے گئے ہیں۔ جہاں کہیں تینوں نسخوں میں اختلاف یا اشعار کی تعداد میں کمی و بیشی نظر آئی اس کی نشاندہی فٹ نوٹ میں کی گئی ہے۔ متن میں قوسین یا خط کشیدہ الفاظ کا اندراج جن جن مقامات پر ہے ان کی بھی فٹ نوٹ میں امکانی طور پر وضاحت کی گئی ہے۔

★

سراج مرزاپوری

اگست ہے

تنویرِ آفتاب کا پیکر اگست ہے
حسنِ مہ و نجوم کا منظر اگست ہے
چرخ سیہ پہ نور کا گھیرا اگست ہے
یعنی شبِ الم کا سویرا اگست ہے

جلوہ نمائے حسن عقیدت اگست ہے
آئینۂ خلوص و محبت اگست ہے
احساسِ زندگی کا تبسم اگست ہے
جذبات زندگی کا ترنم اگست ہے

دیر و حرم کا حسن نمایاں اگست ہے
اہلِ وطن کا حاصلِ ایماں اگست ہے
عزم و عمل کے ذہن کا پردہ اگست ہے
تصویرِ انقلاب کا جلوہ اگست ہے

ٹیگور کا نشانۂ منزل اگست ہے
باپو کی سعیٔ زیست کا حاصل اگست ہے
افسانۂ سبھاش کا عنواں اگست ہے
نہرو کی حسرتوں کا گلستاں اگست ہے

پیغامِ دوستی کا اشارہ اگست ہے
امن و اماں کا ذوقِ نظارہ اگست ہے
دنیائے رنگ و بو کا فسانہ اگست ہے
یعنی مسرتوں کا زمانہ اگست ہے

خوش رنگیٔ مزاج کا گلشن اگست ہے
خوش بختیٔ سراجؔ کا دامن اگست ہے

پروفیسر ایم۔ ایل سکینہ وفا مردھوی

پندرہ اگست کی بہار

خوشا نصیب! آج تو بہار ہی بہار ہے
زہے! کہ رونقِ جہاں ہوائے مرغزار ہے

چمن چمن برس رہی ہے بادلوں سے آج مے
یہ نشہ ہے کہ جھومتا ہر ایک مے گسار ہے

بہشت در بہشت اب وطن کی سرزمین ہے
ہزار بار، لاکھ بار شکرِ کردگار ہے

قدم قدم ہیں زینتیں، نظر نظر ہیں رونقیں
ہر ایک سمت پندرہ اگست کی بہار ہے

اٹھائیں کلفتیں بہت، سہیں صعوبتیں بہت
وطن کی سرگزشت سے زمانہ دل فگار ہے

ستم اٹھا کے بے بہ بے وطن نے پائی زندگی
یہ رہبرانِ قوم کے دکھوں کی یادگار ہے

فرنگیوں کے جال میں پھنسے رہے ہیں مدتوں
سرور کیوں نہ ہو ہمیں، زمانہ سازگار ہے

ہر ایک سو ہے اب خوشی، ہر اک قدم پہ تازگی
ہر ایک فرد قوم کا، جہاں میں کامگار ہے

خدا کا شکر ہے وفاؔ، نہیں غلام دیس اب
ہر ایک فرد ہند کا، وطن کا جاں نثار ہے

اظہار شادانی

آزادی کی دیوی

مادرِ ہند کی منہ بولتی تصویر ہے تو
جاگتا خواب ہے، بیداری کی تعبیر ہے تو
پھول سی نرم ہے، نازک ہے محبت کے لیے
اور نفرت کے لیے برہنہ شمشیر ہے تو
دوستوں کے لیے مرہم ہے تری میٹھی نظر
دشمنوں کے لیے اک زہر بجھا تیر ہے تو
حامیِ امن و اماں کے لیے پیغامِ حیات
شر پسندوں کے لیے آہنی زنجیر ہے تو
زندگی بخش اک نغمہ ہے غریبوں کے لیے
اہلِ زر کے لیے اک نالۂ دلگیر ہے تو
مژدۂ صبحِ مسرت ہے شبِ غم کے لیے
ظلمتِ دہر پہ چھائی ہوئی تنویر ہے تو
غیر کے واسطے سرحد پہ نہ چھین رکھا
شانۂ دوست پہ اک زلفِ گرہ گیر ہے تو
قسمتِ ہند کی تحریر ہے ہر لفظ ترا
نطق بھی جس پہ تصدق ہے وہ تحریر ہے تو
عقل و ہمت پہ تری "نورجہاں" ناز کرے
عدل و انصاف میں اک "نئی جہانگیر" ہے تو
گتھیاں جتنی ہیں سلجھیں گی ترے ہی دم سے
جس پہ تقدیر کا سایہ ہے وہ تدبیر ہے تو
ساز شیں لاکھ ہوں تخریبِ وطن کی لیکن
دل کو تجھ پہ ہے یقیں جذبۂ تعمیر ہے تو
تیری ہستی سے ہیں وابستہ امیدیں کتنی
دل کی دھڑکن ہے، غمِ قوم کی تاثیر ہے تو
جانِ گاندھی کی ہے، در اصل تو، نہرو کا ہے دل
ناز ہے جس پہ مصور کو وہ تصویر ہے تو
جہل، مکاری، غریبی کو مٹاتا ہے تجھے
ناظمِ نظمِ وطن، ہند کی تقدیر ہے تو
چشمِ شیطاں میں کھٹکتی ہے تو کانٹے کی طرح
نازشِ حسنِ چمن، جنتِ کشمیر ہے تو
خود ہی مٹ جائیں گے اظہار مٹانے والے
مٹ نہیں سکتی، مقدر کی وہ تحریر ہے تو

ڈاکٹر ثمینہ شوکت

جنگ آزادی کا ایک گمنام مجاہد
شہزادہ مبارز الدولہ

ہماری تاریخ اور تذکروں نے صدیوں کے تہہ در تہہ نقابوں کے اندر ڈھکے اور چھپے ہوئے کتنے ہی پیکروں کو ابھارا اور ان کے کارناموں کو روشناس کرانے کی کوشش کی ہے۔ اس کے باوجود ہمارے ماضی کے بعض گوشے ابھی روشن نہیں ہو سکے ہیں۔

دکن کی سیاسی تاریخ کی ایک گم نام ہستی آصف جاہی شہزادہ گوہر علی خاں مبارز الدولہ کی بھی ہے جو سکندر جاہ، آصف جاہ ثالث کے فرزند تھے۔ محل میں نازونعم کے ساتھ پرورش پائی۔ لیکن معرفتاً ایک حساس دل اور بیدار دماغ لے کر آئے تھے۔ اس لیے اپنے دیش پر انگریزوں کا تسلط انھیں ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا۔ یہ زمانہ وہ تھا جب سارا ہندستان اپنی تاریخ کے ایک نہایت ہی بحرانی دور سے گزر رہا تھا۔ ہندستان کو استحصال پسند مغربی قوموں سے ربط میں آئے ابھی بہت عرصہ نہیں گزرا تھا لیکن ان کے بڑھتے ہوئے حوصلوں، ان کی بہتر تنظیمی صلاحیتوں اور ان کی حکمت عملی سے پہلے ہی پہل ہندستانیوں کے ذہن مرعوب ہو چکے تھے۔ مغل سلطنت کو ابھی باقی تھی لیکن اپنی عظمت رفتہ کا کھنڈر بن کر رہ گئی تھی۔ کچھ مدبروں کو اس کی بقا کی جو فکر تھی کہ وہ اب جواب دینے لگی تھی کیونکہ مغل سلطنت کے تحفظ کا خیال ایک دھوکا معلوم ہونے لگا تھا۔ خود دہلی کی حکومت میں امرا کی سازشوں اور شورشوں کی صورت میں وقتاً فوقتاً اندرونی خلفشار ابھرتا اور نظم و نسق کے کھوکھلے پن کا پردہ فاش کرتا رہتا تھا۔

دکن میں مبارز الدولہ سے کچھ عرصہ پہلے ان کے جد اعلیٰ میر قمر الدین خاں نظام الملک آصف جاہ اوّل کے انتقال کے بعد سے انگریزوں اور فرانسیسیوں کی حریص نظریں آصف جاہی سلطنت پر بھی پڑ رہی تھیں۔ انگریزوں اور فرانسیسیوں کی قومی منافرت نے دکن میں ریشہ دوانیوں کی شکل اختیار کر لی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نظام الملک کے بعد ان کے فرزند ناصر جنگ، نواسے مظفر جنگ اور دوسرے بیٹے صلابت جنگ تھوڑے تھوڑے عرصے کے لیے مسند نشین ہوئے اور پھر قتل کر دیے گئے۔ دکن میں پرسکون اقتدار کا دور ختم ہو چکا تھا اور اٹھارہویں صدی عیسوی کا نصف آخر اپنی تمام آسودگیوں اور قرونِ وسطیٰ کے فرسودہ جاگیردارانہ تصورات اور سماجی توہمات کو اپنے سینہ سے چمٹائے دم توڑ رہا تھا۔ نئے نظام کے جلو میں نئی جاگیرداریت اور نئی سرمایہ داریت آ رہی تھی سیاسی اور سماجی زندگی کی پرانی عمارت جن ستونوں پر قائم تھی ان کی بنیادیں متزلزل ہو گئی تھیں۔ پرانے دستور اور آئین تقویم پارینہ بن رہے تھے اور نئے آئین کا ہیولیٰ نئے سانچوں میں ڈھلنے لگا تھا۔

نئے اور پرانے دو قرنوں کے اس جھٹ پٹے میں فطرتاً کچھ نئے تصورات ابھر رہے تھے اور کچھ نئے عقائد کی صورت گری ہو رہی تھی۔ ایک عقیدہ یہ بھی تھا کہ دم توڑتے ہوئے اقتدار کے ساتھ وفاداری کا دم بھرنا دانشمندی کی بات نہیں ہے۔ اس کے بجائے مصلحت اس میں ہے کہ انگریزوں کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا جائے اس شعور کا نتیجہ یہ تھا کہ ہر صوبے اور ہر ریاست میں انگریزوں کے کچھ

دوست اور طرفدار پیدا ہو گئے تھے۔ حیدرآباد میں اس کی سب سے نمایاں مثال مہاراجہ چندو لعل کی ہے جو سلطنت آصفیہ کے پیشکار اور پھر دیوان مقرر ہوئے تھے۔

چندو لعل جب ۱۲۲۹ھ میں پیشکاری کے عہدہ پر مامور تھے، دکن میں پنڈاریوں کی شورش نے حیدرآباد کی سرزمین پر بھی چنگیز اور ہلاکو کی یاد تازہ کر دی۔ دکن کے مشہور مورخ غلام حسین خاں جوہر گلزار آصفیہ میں لکھتے ہیں کہ:

"اس کے بانی مرہٹہ حکمران باجی راؤ تھے۔ باجی راؤ دراصل غیر ملکی اقتدار کے خلاف تھے اور اسی لیے وہ سلطنت آصفیہ کی انگریزوں کے ساتھ دوستی کو ناپسند کرتے تھے۔ چندو لعل نے ایک خط لکھ کر باجی راؤ کو سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ انگریزوں کے ساتھ اخلاص اور اتحاد وقت کا تقاضہ ہے۔"

لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ ملک کے نظم و نسق میں انگریزوں کی مداخلت اور اقتدار طلبی کی مساعی کے خلاف سارے ہندستان میں ناگواری کا ایک شدید احساس پیدا ہو گیا تھا جو موقع اور حالات کے لحاظ سے خاص خاص صورتوں میں ظاہر ہوتا تھا۔ اس سلسلے میں کسی حد تک منظم کوشش ۱۲۵۵ھ کی شورش ہے جو تاریخ میں وہابیوں کی تحریک کے نام سے موسوم کی جاتی ہے۔ اس کا مقصد انگریزوں کو ہندستان سے نکال باہر کرنا تھا۔ چنانچہ گارساں دتاسی اپنے مقالات میں لکھتا ہے:

"بعض اشخاص نے جو اپنے آپ کو وہابی کہتے تھے، حکومت ہند کے خلاف شورش پیدا کرنے کی کوشش کی اور اس کے خلاف جہاد کا فتویٰ مکہ کے علماء سے حاصل کیا۔"

سید احمد شہید کی یہ تحریک جو دراصل آزادی ہی کی تحریک تھی تھوڑے ہی عرصے کے اندر سارے ہندستان میں پھیل گئی۔ ہندستان کی کئی ریاستوں کے حکمران اور شہزادے، نواب اور سردار سب اس تحریک کے پیچھے تھے۔ رامپور اور کرنول کے نواب، ٹونک، سندھ اور افغانستان کے سردار اور خاص طور پر حیدرآباد کے شہزادہ مبارز الدولہ اس تحریک کے زبردست علمبردار تھے۔ انگریزوں کے خلاف کارروائیوں میں انھیں سارے ہندستان میں شہرت حاصل تھی۔ اس لیے ہندستان کی مختلف ریاستوں نے انھیں اپنا سردار منتخب کر لیا تھا اور وہ اس تحریک کا مرکز بن گئے تھے۔

رزیڈنٹ فریزر نے اپنی یادداشت (MEMOIRS) میں لکھا ہے کہ مبارز الدولہ نے اپنا لقب "عمر بن عبدالعزیز، رئیس المسلمین جانشین سید احمد" اختیار کیا تھا اور ایک مہر بھی بنوائی تھی جس پر یہ پورے القاب کندہ تھے۔

انگریزی اقتدار سے نفرت کرنے والے ان کو اپنا پیشوا اور قائد سمجھتے تھے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ انگریزوں کے خلاف اپنے جذبات کے اظہار میں وہ کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔ انگریزی اقتدار کے شکنجوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے سلسلے میں وہ اپنے ادنیٰ ملازمین کی پشت پناہی اور ان کی تائید سے بھی نہیں چوکتے تھے۔ قومی وقار کی بازیافت کی کوشش میں وہ کبھی کبھی سرفروشانہ اقدام بھی کر بیٹھتے تھے اور کبھی ایسی جرأت رندانہ سے بھی کام لیتے تھے، جس کی اس زمانے کے عمائدین میں سے کسی کو ہمت نہیں ہو سکتی تھی۔

چنانچہ ۱۲۳۰ھ کا واقعہ ہے کہ مبارز الدولہ کے ایک ملازم شیریں نامی نے حیدرآباد رزیڈنسی کے ایک درزی سے جھگڑا کر لیا اور اس کو پکڑ کر مبارز الدولہ کی حویلی میں قید کر دیا اور خود بھی رزیڈنسی کے عہدہ داروں کے خوف سے مبارز الدولہ کی حویلی میں جا کر پناہ گزین ہو گیا۔ جب اس واقعہ کی اطلاع اس زمانے کے رزیڈنٹ ہنری رسل کو ہوئی تو رسل نے مبارز الدولہ کے والد سکندر جاہ آصف جاہ ثالث سے اس کی شکایت کی۔ سکندر جاہ کی بے بسی کا یہ حال تھا کہ" مصنف گلزار آصفیہ میں لکھتے ہیں کہ سکندر جاہ نے رسل کو یہ اختیار دے دیا کہ وہ خود اس کا تدارک کرے۔

چندو لعل اور رزیڈنٹ رسل کی متحدہ سعی سے اسی زمانے میں ایک فوج کا قیام بھی عمل میں آیا تھا۔ جو رسل کے نام پر "رسل بریگیڈ" سے موسوم تھی۔ اس کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ مملکت نظام کے خلاف کوئی فوجی نقل و حرکت عمل میں آئے تو اس سے کام لیا جا سکے۔ چنانچہ بعض مواقع ایسے پیدا ہوئے بھی، لیکن

ریذیڈنٹ نے نظام کو اس بریگیڈ کے استعمال کی اجازت نہیں دی! اسکے برخلاف یہ بریگیڈ نظام کے بھائی کے خلاف میدان میں لائی گئی۔

بریگیڈ نے مبارز الدولہ کی حویلی کو گھیر لیا اور توپیں نصب کر دی گئیں۔ محل پر گولہ باری شروع ہوئی دوسری طرف سے تیروں سے اس کا جواب دیا گیا۔ کیونکہ مبارز الدولہ کے یہاں توپ اور گولہ بارود کی قسم سے کوئی چیز موجود نہیں تھی۔ مبارز الدولہ کے تیر سے ایک انگریز سپاہی زخمی ہوگیا۔ اس کا زخمی ہونا تھا کہ انگریزی جمعیت میں کھلبلی مچی۔ توپوں کے دہانے کھول دیے گئے اور چاروں طرف سے گولہ باری شروع ہوئی۔

رسل نے چھاؤنی سے مزید سپاہیوں کی کمک طلب کی اور مہاراجہ چندو لعل کی بارہ دری میں ٹھہرایا۔ چندو لعل کے لئے یہ بڑا نازک موقع تھا کیونکہ ایک طرف تو وہ انگریزوں کے دوست تھے۔ اور دوسری طرف نظام سے اپنی وفاداری پر کوئی حرف آنے دینا نہیں چاہتے تھے۔ اسی لیے انھوں نے انگریزی فوجوں کو کثیر رقم دے دلا کر اپنی بارہ دری سے چلتا کیا۔ فوجیں ہٹالی گئیں لیکن شرط یہ قرار پائی کہ باغی شہزادے کو دارالسلطنت سے دور گولکنڈہ میں بھیج دیا جائے۔ اس طرح گولکنڈہ بھیجا جانا دراصل نظربندی کے مترادف تھا۔ وطن کی آزادی کے لیے سرفروشی کی پاداش میں مبارز الدولہ پانچ سال تک قلعہ میں نظربند رہے۔ اس اثنا میں رسل اپنے عہدہ سے سبکدوش ہوکر انگلستان چلے گئے اور ان کی جگہ سر چارلس مٹکاف مقرر ہوے۔ مٹکاف کے جائزہ لینے سے پہلے مہاراجہ چندو لعل نے مبارز الدولہ کو قلعہ سے واپس بلوانے کا بندوبست کر لیا۔

اس واقعہ کے چند روسال بعد مبارز الدولہ دیسی فوجوں کے باغی سردار کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتے ہیں، جب رسل بریگیڈ کا قیام عمل میں آیا تو دیسی فوجوں کی تخفیف عمل میں آئی تھی۔ ان بے یار و مددگار فوجیوں کو مبارز الدولہ کی صورت میں اپنا ایک ہمدرد نظر آتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ان کے اردگرد جمع ہوگئے۔ کچھ ایسے فوجی بھی تھے جن کو تنخواہیں وقت پر نہیں ملتی تھیں چنانچہ ۱۲۴۶ھ میں فساد برپا ہوگیا اور یہ شہرت دی گئی کہ مبارز الدولہ تنخواہ نہ ملنے کو بنیاد بنا کر خفیہ طور پر بیروزگاروں کو ریاست کے خلاف اکسایا کرتے ہیں۔ ان بے روزگاروں کی حمایت میں دوسری بار مبارز الدولہ کو قلعہ گولکنڈہ میں نظربند کیا گیا۔

حیدرآباد کے عوام بھی انگریزوں کے تسلط بے جا سے ہیجان زدہ ہو رہے تھے۔ ان کی نظر میں مبارز الدولہ ہی وہ ہیرو تھے جو ان غاصب اجنبیوں کو ریاست سے باہر نکال سکتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ جب عوام کو یہ معلوم ہوا کہ شہزادہ مبارز الدولہ پھر ایک بار قلعہ گولکنڈہ میں قید کیے جا رہے ہیں تو ان کے ہیرو پرستی کے جذبات ابھر آئے۔ ایک عام ہیجان برپا ہوگیا۔

گلزار آصفیہ میں لکھا ہے کہ جب مبارز الدولہ گولکنڈہ جا رہے تھے، ان کی حویلی سے جو اعتبار چوک میں واقع تھی قلعہ گولکنڈہ تک لوگوں کا اژدہام تھا۔ مکانوں کی چھتوں، دیواروں اور درختوں پر بھی چڑھ چڑھ کر لوگ انھیں دیکھ رہے تھے۔ شاہی محل میں کہرام برپا تھا۔ خاص طور پر ان کی والدہ ملکہ فضیلت النسا بیگم کو بڑا قلق تھا۔ ان کی دلجوئی کی خاطر وہ بھی قلعہ جانے کے لیے تیار ہوگئیں۔ گلزار آصفیہ کے مصنف غلام حسین خاں جوہر بھی ملکہ کی سواری کے ہمرکاب چلے۔

اس دفعہ مبارز الدولہ دو سال تک قلعہ میں نظربند رہے۔ بالآخر جمیلہ بیگم کی مساعی اور چندو لعل کی کوششوں کی بدولت ۱۲۴۸ھ میں حیدرآباد واپس آنے کی اجازت ملی۔ نوروز کے جشن کے موقع پر چندو لعل اور ان کے خاندان کے افراد کو والیِ ریاست کی طرف سے منصب اور خطابات سے سرفراز کیا گیا۔

ریاست کے اندرونی معاملات میں غیر ملکی مداخلت اور انگریزوں کا ظلم مبارز الدولہ کے لیے بہرحال ناقابل برداشت تھا۔ انگریز انھیں ایک خطرناک اور پریشان کن شخصیت سمجھتے تھے۔ کرنول کے نواب غلام رسول خاں بھی درپردہ مبارز الدولہ کے مشن کے حامی اور شریک تھے۔ خفیہ طریقے پر اپنے یہاں انھوں نے وسیع پیمانہ پر اسلحہ کی تیاری شروع کر دی تھی۔ انگریزوں کا جوا اپنے کندھوں سے اتار پھینکنے کی خواہش میں بعض مقامات کی فوجیں

(باقی صفحہ ۴۴ پر)

نیاز سلطانپوری

جشنِ آزادی

وہ ماہ و سال میں لپٹا ہوا اگست آیا
حیات کا کوئی پیغامِ جانفزا لایا
بچھا ہوا ہے ہر اک سمت نور کا سایا
پلٹ کے رکھ دیا تاریک رات کی کایا

ہر ایک راہ تجلی سے جگمگاتی ہے
کہ آب زر سے عروسِ چمن نہاتی ہے

اگست گاندھی و نہرو کے خواب کی تعبیر
اگست، خونِ شہیداں کی آخری تصویر
اگست، کاٹنے والا غلامی کی زنجیر
اگست، ہی سے ہے وابستہ قوم کی تقدیر

فقط یہی نہیں بھارت کی آبرو ہے اگست
ظفر کی حیدر و ٹیپو کی آرزو ہے اگست

اگست، مادرِ ہندوستاں کی دھڑکن ہے
جسے گلے سے لگائیں وہ پاک دامن ہے
اگست لکشمی بائی کی شوخ چتون ہے
اگست ہی سے تو وابستہ آج تن من ہے

ملا اگست سے تاریخ کو نیا اک موڑ
جسے دیا تھا کبھی کاروانِ ہند نے چھوڑ

مناؤ جشنِ چراغاں، جلاؤ گھی کے دیے
بڑھے چلو سوئے منزل بلند عزم کیے
ہے اذنِ عام ہر اک رندِ میکدہ کے لیے
شرابِ عیش و مسرت بہ قدرِ ظرف پیے

نہ تیرگی کا ہے شب، نہ رات کا کھٹکا
لگا ہے چار طرف نورِ صبح کا پہرہ

ہر ایک راہ گزر مثلِ کہکشاں ہو جائے
زمیں کو اتنا اٹھاؤ کہ آسماں ہو جائے
نقیبِ امن کے دشمن کا منہ دھواں ہو جائے
نئے سرے سے مکمل یہ داستاں ہو جائے

مٹا دو سارے وطن سے وجوہ بربادی
ہر اک بشر کو ہوں حاصل حقوقِ آزادی

قاضی سید عرشی کاظمی

اشتراکِ عمل

آؤ پھر عہد کریں آج سے ہم ایک ہیں ایک
اپنا غم، اپنی خوشی، اپنے الم ایک ہیں ایک
ایک ہے ذوقِ طلب، دیر و حرم ایک ہیں ایک

ربط باہم سے ہے رشتوں میں رسن کی طاقت
ہم بھی ہیں ایک تو طاقت ہے وطن کی طاقت

آؤ پھر پیار کے ایثار کے پیماں باندھیں
درد سے درد، رگِ جاں سے رگِ جاں باندھیں
سارے عالم میں ہوائے "چمنستاں" باندھیں

اپنے بیگانے کو پھر راحت و آرام ملے
ایک مرکز پہ فضائے سحر و شام ملے

آؤ پھر ایک ہوں تزئینِ چمن کی خاطر
غنچہ و برگ و گل و سرو و سمن کی خاطر
عظمتِ گنگ کی تقدیسِ جمن کی خاطر

یک آپس میں شناسا و یگانہ نکلیں
کوئی میدان ہو سب شانہ بہ شانہ نکلیں

اپنی ہی لاج ہے کانٹا ہو کہ پھول، اپنائیں
اپنی ہی آن ہے غازہ ہو کہ دھول، اپنائیں
آؤ قرآن کے، گیتا کے اصول اپنائیں

پھر ہم آہنگیِ ناقوس و اذاں زندہ کریں
پھر وہی اگلے زمانے کا سماں زندہ کریں

ہم میں وحدت ہے تو کثرت کا تماشا ہم سے
ہم میں الفت ہے تو سو حسن ہویدا ہم سے
ہم ہیں دنیا کے لیے، ہم سے ہے دنیا ہم سے

ایک ہوں ہم تو ہر اک کارِ گراں ہو جائے
امنِ عالم نصب العینِ جہاں ہو جائے

شہناز کنول (افسانہ)

آپ کاج مہا کاج

"میاں جی سلام؟"

"وعلیکم السلام۔ جیتے رہو کہو بھئی خیریت ہے۔"؟

"جی ہاں دعا ہے آپ کی۔"

"اور سناؤ کیا کر رہے ہو آج کل"؟

"جی سوچا ہے کوئی بزنس کر لوں۔"

"بزنس۔؟ کیا بزنس۔"

"یہی اکسپورٹ امپورٹ کے لیے سوچ رہا ہوں۔"

"کچھ روپیہ پیسہ ہے؟"

"اسی سلسلے میں کچھ سوچا ہے"

"میاں عقل کے ناخن لو۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن کی تمھاری پیدائش ہیں پر دن ہی اڑنے لگے۔ اور پھر لگی لگائی نوکری کا کیا ہوگا۔"

"وہ تو چھوڑ دی۔"

"ہائیں — چھوڑ دی، لو بھئی تمھاری وہ مثال ہوئی کہ گھٹا دیکھ کے گھڑے پھوڑ ڈالے۔ پاس پلے پیسہ نہ دھیلہ چلے ہیں بزنس کرنے، ننگی کیا نہائے کیا نچوڑے۔ کیا کہا پہلے دن کر چکے اس لیے تجربہ ہے۔ کوڑیوں کے مول سامان بیچنے کو بزنس کہتے ہیں۔ میں نہیں مانتا تمھارا وہ حساب ہو رہا ہے کہ اصیل مرغی کی ایک ٹانگ، ابھی تیل دیکھو تیل کی دھار دیکھو، یوں دو دو پیسہ میں تجارت ہوا کرتی تو ہرا ایرا غیرا نتھو خیرا تاجر ہوتا۔ اجی یہ بڑا جان جوکھم کا کام ہے تپتا پانی کرنا پڑتا ہے۔ مگر ہم تو یہ دیکھتے ہیں جسے دیکھو بے توے کا سونٹا بنا پھرتا ہے۔ میاں ہم نے دنیا دیکھی ہے رانڈ کے سانڈ بن کر نہیں رہے۔ مگر آج کے بچے تو عجیب ہیں نہ بڑوں کا ادب نہ چھوٹوں کا لحاظ اپنی مٹر الگ بھنانے کی فکر میں رہتے ہیں۔ لیکن کہیں ایک چنا بھاڑ پھوڑ سکتا ہے۔ اکیلے ہر کام کرنے کو تیار ہو جاتے ہیں اکیلی تو لکڑی بھی نہیں جلتی۔ تجارت کرنا معمولی بات نہیں ہے۔ کچے گھڑے پانی بھرنا ہوتا ہے۔ ہم نے یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کیے۔ گھاٹ گھاٹ کا پانی پیے ہوئے ہیں کھرے کھوٹے کی پہچان رکھتے ہیں۔ کام انسان ایسا کرے کہ دنیا تعریف کرے۔ ورنہ جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا۔ ڈرا اور خوف سے کچھ کیا تو کون سا تیر مارا۔ مگر ہم پرانے وقتوں کے لوگ ہیں، بری بھلی سمجھانا ہمارا فرض ہے لیکن نقار خانے میں طوطی کی آواز کون سنتا ہے۔

نیا زمانہ کہاں کا کہاں نکل گیا اور ہم ابھی تک لکیر ہی پیٹ رہے ہیں۔ تم نے بھی سنا ہوگا رسی جل گئی پر بل نہ گئے۔ ہم آج بھی آن پر جان دینے والے لوگ ہیں۔ اب تمھیں کیسے سمجھائیں ہمارا زمانہ کیسا تھا۔ بڑی بوڑی دیکھے بنا تو رشتہ ناطہ بھی نہیں ہوتا تھا۔ آج کا کیا ہے کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا بھان متی نے کنبہ جوڑا۔ خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ بدلتا ہے جیسوں میں ملے ویسے ہو گئے۔

"کیا کہا دنیا بدل گئی ہے۔ ہاں جی سچ ہی ہے آنکھ پھوٹی بیڑ گئی۔ ہمارے زمانے کا کوئی ہو تو پیٹ میں درد اٹھے جیسی گندی سیتلا دیسے پوجن ہار۔ ہم تو اپنی لگی کو کہتے ہیں ورنہ کون سے تمھارے خالہ کے خلیرے ہیں۔ تم جوان ہم بوڑھے۔ آج مرے کل دوسرا دن

تمھارے بھلے کو سمجھایا ہے۔ بزنس ایسا ہو کہ جو لگاؤ اس پر نفع بھی ہو مگر نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی بعد کو جو نقصان ہوگا وہ مثل ہوگی کہ اتنے کی بڑھیا نہیں جتنے لہنگا پھٹ گیا۔ اپنے مین گنوا کر در در کی بھیک مانگتا تو کوئی عقلمندی نہیں ہے۔ کیا ہا کچھ روپے ہیں۔ بھلا اتنے سے سرمایہ سے تجارت ہوگی یا ڈیڑھ چاول رچو بارے رسوئی۔ پھر اتنے شور کی کیا ضرورت ہے۔ اتنے کی بیزش ہوگی جتنا اس کو لانے لے جانے میں خرچ ہوگا۔ کسی نے کہا ہے ڑی کی گرڑ یا ٹکا ڈولی کا، بھلا یہ بھی کوئی بات ہوگی۔

"تمھارا ابھی جواب نہیں قرض لے کر تجارت کروگے خود سو۔ جو پنے پاس نہ بیسا تو پرایا آسرا کیسا۔ لو ابھی سے سٹی گم ہونے لگی، تے ہو اور کیا کروں۔ میاں محنت کرو۔ آج کا زمانہ مزدور کا مانہ ہے وہ دن لد گئے جب خلیل خاں فاختہ اڑایا کرتے تھے تو یہ جانتے ہیں کہ جس کا کام اسی کو ساجھے اور کرے تو ٹھینگا جے۔

"نہیں میاں اب میری عمر اس قابل کہاں ہے کہ مارا ساتھ دوں۔ وہ حال ہے کہ آٹے کا چراغ گھر رکھوں کھا جائے باہر دھروں کوا لے جائے۔ تم خود کرو مگر کام ایسا ہو جو بہ آسانی کر سکو۔ ورنہ کیا مذاق ہوگا کہ جو ہاتھی میں سماتا با دم میں باندھا جہاز۔ ایسے کام کو دو ہاتھوں سے سلام۔

"لو اور سنو ساجھے میں بزنس کروگے۔ دو ملاؤں میں مرغی حرام والی مثل سچ کر دکھاؤگے۔ بڑے بزرگ کہہ گئے ہیں ساجھے ہنڈی چوراہے پر پھوٹتی ہے۔ باٹ بٹی ہاڑ کے تجارت ہوا کرتی۔ اجی ایسے دوستوں کا کیا بھروسہ جب تک نعالی بھات تب تک تیرا میرا ساتھ جب واسطہ پڑے گا خیر ہوگی راہ پڑے جلئیے یا باہ پڑے جلئیے۔ یوں تو سبھی دوست ہوتے ہیں۔ وقت پہ جو کام آئے وہی دوست ہو رہے نادان کی دوستی جی کا جنجال۔

"لو اور سنو تمہیں کیا ضرورت تھی تجارت کی وہ بات نہیں کہ ہاتھی کھڑا اتنا اور کان کو کاٹنا، اللہ شکر خورے کو شکر دیتا ہے۔ ہمارا زمانہ فراغت کا زمانہ تھا۔ کیا کہا ہمارے دور میں جھگڑے بہت تھے ہاں جی ہم لوگ زمیندار تھے اور تم جانو زر، زمین، زن زبان قضیہ چاروں کے گھر۔ ہم تمھاری طرح نہیں تھے کہ دیکھا نہ بھالا صدقے گئی خالہ، آن بان والے تھے۔ کسی کی دو بات سننے کو تیار نہیں تھے۔ ہمیں معلوم ہے کہ بھلے گھوڑے کو لات اور بھلے آدمی کو بات کافی ہے۔ ارے میاں تم کس برتے پر بولتے ہو کیا پدی کیا پدی کا شوربہ۔ ہم محنت کرتے تھے عزت کی کھاتے تھے۔ تم لوگوں کا کیا ہے اس کو نوچ اس کو کھسوٹ چار پیسے کماتے ہو تمھاری وہ مثل ہے کہ دکھ سہیں بی فاختہ کوے انڈے کھائیں دوسروں کے بل پر کیچو بنے اور دماغ عرش معلیٰ پر پہنچا۔ میاں تم جیسوں کے لیے ہی تو کہا ہے کہ ابھی برتن کچا ہے لکڑی کچی ہے۔ کام کرنے والے بیٹھے نہیں رہتے ہر دم انھیں کام کا خیال رہتا ہے۔ ان کی مثال تو ایسی ہے کہ اٹھاؤ میرا کمنا میں گھر سنبھالوں۔ اپنا میاں غرض باؤلی ہوتی ہے۔ وقت پڑے پر گدھے کو باپ بنانا پڑتا ہے جو سویا سو کھویا کاہلی مفلسی کی ماں کہلاتی ہے۔ ذرا سی غفلت ہوئی اور سارا کاتا بینا کپاس ہوگیا۔ یہاں باوا آدم ہی نرالا ہے۔ سوت نہ کپاس جلاہے سے لٹھم لٹھا۔ سنا نہیں جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ خالی باتوں سے پیٹ نہیں بھرا کرتا۔ انسان کمائے اور اس میں سے تھوڑا اچھے برے وقت کے لیے بھی رکھے ورنہ وہی بات کہ سب دن چنگے عید کے دن ننگے۔

"خوب کہا بھلا اس میں کسی کا کیا قصور۔ ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا والی بات تو کرو مت۔ سانچ کو آنچ نہیں خود کر کے دیکھو ابھی آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا۔ محض زمین آسمان کے قلابے ملانے سے کیا ہوتا ہے۔ عمل بھی تو ہو۔ ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں اور اس کے سر الزام رکھ دیا اس کے سر تھوپ دیا زبانی جمع خرچ میں کون سے ہاتھ پیر ہلانے پڑتے ہیں۔ آج کے جوانوں کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر عقل حیران ہے۔ کہو زمین کی سنتے ہیں آسمان کی۔

"اجی دوسرے ملکوں میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں۔

دور کے ڈھول سہانے ہیں۔ خدا کو دیکھا نہیں عقل سے پہچانا۔ وہاں بھی کون سے سارے خوش حال ہیں۔ میاں محنت کرنے والے کہیں کبھی مار نہیں کھاتے حرکت میں برکت ہے۔ جتنا گڑ ڈالو اتنا میٹھا ہوگا۔ اپنے ملک میں کون سے کیڑے پڑے ہیں مگر عادت ہو گئی ہے دوسروں کی تعریف کرنے کی۔ نہیں جی انگریزوں کے دور میں کون سا اچھا انتظام تھا اگلے کو گھاس نہ پچھلے کو پانی۔ آزادی ملی تو میاں ہم نے گھی کے چراغ جلائے تھے کیونکہ ہم جانتے تھے پرائی آنکھیں کام نہیں آتیں۔

"لو اور سنو تم تو میرا بنگو بنائے دے رہے ہو۔ خدا نہ کرے جو ہم نے میٹھے کے ٹکڑے توڑے ہوں۔ میاں ہمارے جیسی محنت کرتے تو چودہ طبق روشن ہو جاتے۔ دن رات کولھو کے بیل کی طرح جتے رہتے تھے۔ تم جیسوں کو تو نانی یاد آجاتی۔ اب ہمارے میں دم نہ درود۔ ایک تو بڑھاپا پھر دکھ بیماری جھیلتے جھیلتے انگنی پر ڈالنے کے قابل ہوگئے۔ مگر اب بھی کون سا کام سے انکار ہے بیکار تو ہم سے بیٹھا ہی نہیں جاتا بڑے کہہ گئے ہیں بیکار مباش کچھ کیا کر کپڑے ہی ادھیڑ کر سیا کر۔ دیکھا ہو گئی نا تری تمام۔ ہم تو ہمیشہ سے یہی کہتے آئے ہیں ارے بھئی اچھے برے کس زمانے میں نہیں ہوتے مگر ایک لاٹھی سے سب کو ہانکنا غلط ہے۔ ہاں ہاں ہمیں کب انکار ہے۔ کہتے ہیں ایک توے کی روٹی کوئی چھوٹی کوئی موٹی۔ پانچ انگلیاں برابر نہیں ہوا کرتیں۔ نئی نسل کبھی ساری کی ساری ہی خراب نہیں ہے۔ لیکن سارے وقت میں مروت اور وضع داری تھی اور انکساری تھی۔ بڑوں کا احترام تھا۔ ہمارے بزرگوں کو ہمارے سلسلے میں یوں بار بار ڈانٹ پھٹکار کی ضرورت نہیں ہوئی۔ اصیل گھوڑے کو ایک چابک کافی۔ میں تو خدا لگتی کہتا ہوں۔ میرا مطلب یہ نہیں ہو کہ ہم اپنے سامنے کے بچوں سے اس طرح ناراض ہوں کہ تعلق ہی توڑ لیں بھلا کہیں لاٹھی مارے پانی پھٹا ہے مگر سچی بات زبان پر آئے بنا رہتی بھی نہیں۔ آج کے بچے آج ہی نہیں جلتے تم ابھی دنیا دیکھنی ہے۔ اچھے برے لوگوں سے ملنا ہے۔ اس زندگی کے اتار چڑھاؤ انسان کا سارا کس بل نکال دیتے ہیں۔ مجھے تم سے دشمنی تو ہے نہیں مگر وہ مثل مت کرو کہ بارہ برس کی بٹیا بھی بر مانگے — وقت اور حالات کے تحت زندگی گزارو۔ جتنی چادر ہو اتنے پاؤں پھیلاؤ۔ بزرگوں نے غلط نہیں کہا آگ کھائے منہ جلے ادھار کھائے پیٹ جلے۔ لیکن ہتھیلی پہ سرسوں نہ جماؤ۔ کہتے ہیں قطرہ قطرہ دریا می شود۔

"اب شیخ نثار کے فتن ہی کو لے لو۔ کیا کیا میری برائی کرتا ہے۔ خیر کرلے وہ تو ہمیشہ کا فتنہ ہے۔ ایسے عزت داروں کے لیے کہا گیا ہے۔ اب ستونتی ہو کر بیٹھی جب لوٹ کھایا سنسار۔ ٹھیک کہتے ہو برائیاں کس میں نہیں ہوتی ہیں۔ بے عیب ذات خدا کی۔ مگر اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہ آئے اور دوسرے کی آنکھ کا تنکا بھی دیکھ لیں۔ ارے اس کی کیا پوچھتے ہو گنگا بیٹھے گنگا رام جمنا بیٹھے جمنا رام۔ آنکھیں پھوڑ کے پلکوں سے نہیں دیکھا جاتا۔ اللہ بری بات اور بری گھڑی سے سب کو بچائے۔ ہمارے بھی کان گنہگار ہیں۔ جو کچھ سنتے ہیں افسوس ہوتا ہے دنیا کا کیا ہے رو رو کے سنتی ہے ہنس ہنس کے اڑاتی ہے۔ ہاں یہ فتن بھی دسیوں کام کر چکا مگر دل لگا کے کبھی نہ کیا جب بات بنتی نہیں تو الزام دوسرے کے سر تھوپ دیتا ہے وہی مثل ناؤ کس نے ڈبوئی خواجہ خضر نے۔ دن بھر لفنگوں لنگاڑوں کے ساتھ پھرتا ہے۔ پرسوں اس کے باپ خود کہہ رہے تھے کہ کم بخت کام کا نہ کاج کا دشمن اناج کا میاں جی تم ہی اسے سمجھاؤ جس طرح تمھیں اچھا برا بتاتا رہتا ہوں ایسے ہی ایک دن اسے چار نصیحتیں کردی تھیں بس اس دن سے میں برا ہوں۔ باپ محنت سے کما رہے ہیں وہ اڑا رہا ہے مال مفت دل بے رحم اس کی گانٹھ سے تھوڑی جا رہا ہے۔ باپ اتنے شریف اولاد ساری نامعقول نکلی راجہ کے گھر موتیوں کا کال اسی کو کہتے ہیں۔ میرے عزیز یہ زبان ہی عزت کرواتی ہے اور یہی جوتے کھلواتی ہے۔ کہتے ہیں نا زبان شیریں ملک گیری۔ ماں باپ سدا کس کے رہے ہیں تم دیکھ لینا باپ کی آنکھ بند ہوتے ہی ساری چوکڑی بھول جائیں گے۔ بیٹھ کے کھانے سے تو قارون

کا خزانہ بھی خالی ہوجائے۔ ہمیں برا کہیں یا بھلا ہمارا تو کچھ نہیں جاتا مگر تم ہماری بات لکھ لو یہ لڑکا ہمیشہ جوتیاں چٹخاتا پھرے گا پوت کے پاؤں پالنے میں نظر آجاتے ہیں۔ اس کا تو ابھی یہ حال ہے کہ ٹھنڈے گئے بیٹھے ہاٹ انھیں سیر ملا نہ باٹ۔ بس میری نصیحت اتنی ہی ہے کہ اپنے بزرگوں کا ادب کرو اور کوئی کام کرنے سے پہلے بڑوں سے مشورہ ضرور کرلو۔ اپنے پرائے میں فرق کرنا سیکھو۔ کہتے ہیں گاڑھی بھری دوستی اور تل برابر خون۔ ایسے مست بنو جیسے کسی کھونٹے بندھے ہی نہیں۔ بزرگوں کی مرضی سے ہر کام کرو۔ کہا جاتا ہے بارہ برس گھالے تب ایک لال پالے۔ جس دکھ تکلیف سے ماں باپ پالتے ہیں اس کا احساس تب کروگے جب صاحب اولاد ہوجاؤ گے۔ نائی رے نائی بال کتنے اس نے کہا ججمان آگے آئے جاتے ہیں، بس اس قرض اُدھار کے بزنس کا خیال چھوڑو اور محنت کرکے عزت کی روٹی کماؤ۔ ہر کام کرنے کی عادت ڈالو۔ آپ کاج مہا کاج تم نے بھی سنا ہوگا۔ گھبراتے کیوں ہو، ہمت مرداں مدد خدا اور بھئی ہم تو اس پر یقین رکھتے ہیں کہ اپنا من چنگا تو کٹھوتی میں گنگا۔

نہیں بیٹے اس میں ناراضگی کیسی۔ میں تم سے بالکل ناراض نہیں ہوں۔ تم میرے لیے سچا سے اولاد ہو۔ اچھا اچھا چلو، معاف کیا، میں خوش میرا خدا خوش۔

★

جنگِ آزادی کا ایک گمنام مجاہد (صفحہ ۳۸ کا بقیہ)

اتنی بے چین ہو رہی تھیں کہ نیلور کے قلعہ میں وقت سے پہلے بغاوت ہوگئی۔ اسٹون ہارنے جو اس وقت نیلور کا مجسٹریٹ تھا۔ بروقت شورش کا پتہ چلالیا اور اس طرح انگریزوں کو بے دخل کرنے کی پہلی کوشش ناکام ہوگئی۔ واقعات کی تحقیق کے لیے کمیشن مقرر کیا گیا، جس میں انگریز اور ہندستانی عمائد شریک تھے۔ تحقیقات کی رو سے اس ساری شورش کی تہہ میں مبارز الدولہ کا ہاتھ تھا۔ ملک کے طول و عرض میں انگریزوں کے خلاف تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ٹونک، رامپور، سندھ اور کرنول کے رئیسوں کے ساتھ اسلحہ اکٹھا کرنے میں مبارز الدولہ کے ربط کا پتہ چلتا تھا اس کو بغاوت پر محمول کیا گیا اور اس کی پاداش میں ان کو قلعہ گولکنڈہ میں نظر بند کردیا گیا۔

مبارز الدولہ کے ساتھ ان کے دس متوسلین خاص بھی حراست میں لے لیے گئے۔ اور وہابیوں کی ایک کثیر تعداد کو بھی غیر معینہ مدت کے لیے قید کردیا گیا۔ اس طرح حصول آزادی کی یہ جدوجہد بھی ناکام ہوگئی جو حقیقت میں مبارز الدولہ کی آخری منظم کوشش تھی۔ قلعہ میں نظر بندی ہی کی حالت میں مبارز الدولہ کا انتقال ہوگیا۔

★

افاداتِ مہدی (صفحہ ۱۶ کا بقیہ)

اور جم کر علم و ادب کی خدمت نہ کرتے تو اس زمانے میں جہاں دوسرے بہت سے لوگ قلم نہ اٹھاتے وہاں مہدی بھی اس طرح ابھر کر سامنے نہ آتے اور نہ اس طرح آج وہ دنیائے اردو ادب میں جانے پہچانے اور قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے۔

وہ اس تحریک کی سب سے زیادہ قدآور شخصیت شبلی نعمانی سے بے حد متاثر تھے۔ وہ ان کی عظمت اور قدر و قیمت کے معترف تھے اور ان سے طرح طرح کی امیدیں وابستہ کیے ہوئے تھے۔ شبلی ان کے دل و دماغ پر جس حد تک چھائے ہوئے تھے اس کا نمایاں اثر ان کی تحریر و تقریر اور فکر و خیال پر پڑا۔ وہ بہت کچھ نہ لکھنے کے باوجود وہ مقام حاصل کرنے میں بہت جلد کامیاب ہوگئے جو بہتوں کو بہت کچھ لکھنے کے بعد بھی نہیں ملتا ہے۔ مہدی قابلِ تعریف اور قابلِ احترام ہیں کہ وہ چند منتشر مضامین کے سہارے اردو ادب میں بلند مقام حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئے۔

★

دیو رسیفی

اندوہناک موڑ

نظروں میں تیری پیار کی سوغات اب نہیں
زلفوں میں خوشبوؤں کی وہ برسات اب نہیں
ملتا نہیں وہ پہلا سا اندازِ حسن بھی !
جو بارہ سال پہلے تھی وہ بات اب نہیں

کرتہ ترا پھٹا ہے دوپٹہ ہے تار تار
میرا بھی جوتا حال پہ ہنستا ہے بار بار
اک ساتھ گھر میں رہ کے بھی ہیں اجنبی سے ہم
تیرا بھی حال زار ہے میرا بھی حال زار

آٹا سنا ہے ہاتھوں میں چہرہ اُڑا ہوا
کالک توے کی غازۂ رخ ہے بنا ہوا
مدقوق سا ہے آج وہ مہکا ہوا بدن
کیا سوچیے کہ گذرے زمانے کو کیا ہوا؟

آنکھیں دھواں دھواں تری اُلجھے ہوئے ہیں بال
میں بھی اداس تو بھی فسردہ، عجب ہے حال
اندوہناک موڑ پہ ہم ہیں کھڑے ہوئے
دونوں کے ایک ذہن میں ہیں ان گنت سوال

خوشیوں کی جستجو میں پریشان حال ہیں
اب زندگی کے گرد بڑے سخت جال ہیں
گھر میں سکون نام کی اب کوئی شے نہیں
اس کا سبب یہ ہے کہ کثیر العیال ہیں

بسنت کمار بسنت

آج کے دن

تابِ نظّارہ کہاں کس کو بھلا آج کے دن
ذرہ ذرہ ہوا خورشید نما آج کے دن
مست و سرشار چمن، لالہ و نرگس شاداب
جھوم کر چھائی ہے گلشن پہ گھٹا آج کے دن
جام پر جام چھلکنے لگے میخانے میں
ساتھ مے پیتے ہیں اربابِ وفا آج کے دن
توڑ دو اہلِ چمن رسمِ عناد اور نفاق
دوستو! ہے یہی اندرا کی صدا آج کے دن
مہندی ہاتھوں میں حنا پیرہنِ نرگس میں
مہ وشوں کی کوئی دیکھے تو ادا آج کے دن
دوستو! صدق و اہنسا کے اصولوں پہ چلو
چھوڑ دو رسم و رہِ جور و جفا آج کے دن
مطرب وقت سے کہہ دو کوئی نغمہ چھیڑے
گونج اُٹھے ساز پہ شاعر کی نوا آج کے دن
ذہن و باطن کو کرو صاف ذرا ہم وطنو
سیکھ لو رسمِ وفا، صدق و صفا آج کے دن
کون سی بزم ہے جس میں نہیں سامانِ طرب
ہے بشر کون جو شاداں نہ ہوا آج کے دن
مٹ گئی تیرہ شبی مہر منور سے بسنت
نور ہی [illegible] گلستاں میں ہوا آج کے دن

امیر حسن نورانی

لکھنوی تہذیب میں

قومی یک جہتی کی جھلکیاں

لکھنؤ کی تہذیب اور معاشرت کو اپنی مخصوص رنگا رنگ خصوصیات کی بدولت ہمیشہ امتیازی حیثیت حاصل رہی ہے۔ اس کا روشن رُخ کبھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ اسے ہماری قومی اور سماجی زندگی کی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ اس تہذیب کے اثرات سے قومی یک جہتی اور اتحاد کی روایت کو نہ صرف تقویت ملی بلکہ اس کی بنیادوں میں استحکام پیدا ہوا۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انتہائی پرآشوب دور اور نامساعد حالات میں بھی لکھنوی تہذیب کے اثرات نمایاں رہے اور آج بھی باقی ہیں۔ لکھنؤ کی تہذیب کی آغوش میں پرورش پانے والی نسل، اتحاد و یک جہتی کی علم بردار رہی ہے۔ امیروں کے ایوانوں اور غریبوں کی جھونپڑیوں میں اس کی جھلکیاں یکساں نظر آتی ہیں۔ ہندوؤں کے تہوار اور میلے، مسلمان بزرگوں کے عرس اور دیگر معاشرتی مذہبی اور ثقافتی مجالس مشترکہ تہذیب و معاشرت کے آئینہ دار ہیں۔ اس اشتراک کا نمایاں اثر شہروں اور قصبوں میں یکساں نظر آتا تھا۔ مذہبی رسوم سے قطع نظر سب ایک تمدنی رنگ میں رنگے ہوئے نظر آتے تھے۔

انیسویں صدی کا نصف آخر سارے ملک کے لیے پُرآشوب دور رہا ہے کہ جب سلطنت مغلیہ دم توڑ چکی تھی اور دوسری خودمختار ریاستیں زوال و انحطاط کی کشمکش میں مبتلا تھیں اس زمانے میں اودھ کی شان و شوکت کا آفتاب نصف النہار پر تھا اور لکھنوی تہذیب و تمدن کو اپنی رنگا رنگ اور پرکشش خصوصیات نے مزید عروج و استحکام سے نوازا اور اس کے زیر سایہ ہندو مسلم اتحاد اور قومی یک جہتی کو پروان چڑھنے کا موقع ملا۔

لکھنوی تہذیب کیا ہے؟ اس کے پس منظر کی تہذیبی تاریخ پر گہری نظر ڈالی جائے تو پیش نظر کو سمجھنے میں دشواری نہیں ہوتی۔ مختصر یہ کہ لکھنوی تہذیب و معاشرت دراصل عربی، ایرانی، تورانی اور ہندستانی تہذیب کی آمیزش سے وجود میں آئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایرانیوں کے ذوق جمال، ترکوں کی سخت کوشی و فراخ دلی، عربوں کی سادات و اخلاقی قدر اور آریائی تہذیب کی رنگا رنگی نے ہم آغوش ہو کر ایک نئی تہذیب کو جنم دیا، جس نے اتحاد و یک جہتی کی فضا میں نشو و نما پائی ہے اور سارے ملک کو اپنے غیرمعمولی اور پرکشش اثرات سے متاثر کیا۔ یہاں عبا و چغہ کے بطن سے انگرکھا اور شیروانی پیدا ہوئی۔ پگڑی اور چوگوشیہ ٹوپی کی جگہ ہلکی پھلکی دو پلی ٹوپی رونما ہوئی۔ یہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے مشترکہ لباس کے خاص جز بن گئے۔ اسی طرح میل ملاقات کے وقت سلام اور رام رام کی جگہ "آداب و تسلیمات" نے لے لی۔ تلوار تو انقلاب و حوادث نے چھین لی تھی لیکن اس کی جگہ نرم و نازک چھڑی شرفا کے ہاتھوں کی زینت بن گئی۔ چوڑی دار پائجامہ کرتا اور ناگرہ جوتا مغلوں کا عطیہ تھا۔ لکھنؤ نے ان کو بھی اپنایا اور اس میں زری اور کام دار جوتوں کا وجود مشترکہ ذوق کا رہین منت ہے۔ لکھنؤ کی مشترکہ تہذیب کے اثرات عوام و خواص کے علاوہ علما، و صوفیا پر بھی نمایاں ہوئے۔ بعض لکھنوی علما کے لباس میں بھی تبدیلی آئی۔ علما فرنگی محل اور شیعہ علما کا لباس خالص لکھنوی ہو گیا کیونکہ نہ وہ خالص عربی رہا نہ اسلامی۔

دلی کی تباہی اور مغلیہ سلطنت کے زوال کے وقت اودھ کی سرزمین امن و امان کا مرکز تھی جہاں مال و دولت کی فراوانی اور علم و ہنر کی قدردانی باعث کشش تھی۔ دلی کے ارباب فضل و کمال، ادیب و شاعر، صناع و

فن کار، قسمت آزمائی کرنے لکھنؤ پہنچ گئے۔ ان میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی۔ ان کی بدولت لکھنؤ، اتحاد و یگانگت میل و محبت کا گہوارہ بن گیا اور اس گہوارے میں جو داخل ہوا وہ اسی کے رنگ میں رنگ گیا۔ دلّی کے بلند پایہ شعرا جو اس دور میں اردو کے آسمان پر چاند تارے بن کر چمک رہے تھے ان میں سے بیشتر دلی چھوڑ کر لکھنؤ جا بسے۔ میرؔ، سوداؔ، انشاؔ، مصحفیؔ وغیرہ اس زمانے میں لکھنؤ کے مذاق سخن پر تکلف و تصنع کی ایسی ملمع کاری ہو چکی تھی کہ اس کی ظاہری چمک دمک سے نگاہیں خیرہ ہوتی تھیں۔ دلّی کے شعرا اس ماحول اور رنگ سخن کے عادی نہ تھے۔ اس لیے ان کو اپنے دہلوی مذاق کی انفرادیت قائم رکھنے کے لیے ناکوں چنے چبانا پڑے۔ لکھنؤ کی رنگین ادبی فضا کو حقیقت آشنا بنانے اور ماحول کو متاثر کرنے کی کوشش میں خود ان کے قدم ڈگمگانے لگے اور ان کے لیے اپنا رنگ سخن قائم رکھنا دشوار ہو گیا۔ یہی حال نثر نگاروں کا تھا۔ پُر تکلف اور رنگین نثر کے شاہکار فسانۂ عجائب، نو طرز مرصع اور بعض دوسری کتابیں اس دور کی یادگار ہیں۔ علمی و ادبی محفلوں میں دونوں فرقوں کے ادیب و شاعر اور سامعین شریک ہوتے تھے اور شرکا کے لباس میں بھی عموماً یکسانیت ہوتی تھی۔ جب تک فارسی زبان کا دور دورہ رہا مسلمانوں کی طرح ہندوؤں میں بھی بکثرت فارسی زبان و ادب کے عالم و شاعر پیدا ہوئے۔ فارسی ادبیات کو ترقی دینے میں اودھ کے ہندو عالموں ادیبوں اور شاعروں کے کارناموں کی شہرت ہندستان کے علاوہ ایران و افغانستان میں بھی ہوئی۔ بعض ایسے علمی و تحقیقی کام ہوئے جو ہندستانی تو کیا ایرانی فضلا سے بھی خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ ٹیک چند بہار کا مقبول عام لغت بہار عجم اور شرح بوستان سعدی سے علمی حلقے بخوبی واقف ہیں۔ ٹیک چند کا یہ لغت ایرانی لغت نویسوں کے لیے مشعل راہ بن گیا۔ اسی طرح اودھ کے ہندو شاعروں کے دیوان اور نثری جواہر پارے بہت سے شائع ہو چکے ہیں اور سیکڑوں کی تعداد میں غیر مطبوعہ مسودے مختلف کتب خانوں کی زینت ہیں۔

علوم و فنون کی ترقی، شعر و شاعری، صنعت و حرفت، محافل و مجالس میں دونوں فرقوں کے ہنرمندوں اور فن کاروں میں اشتراک و تعاون جس حد تک تھا اس کا اندازہ موجودہ دور میں کرنا آسان نہیں۔ رسم و رواج، شادی و غمی کے موقعوں پر باہمی رسم و رواج، شادی و غمی کے موقعوں پر باہمی میل و محبت کے نظارے عام تھے دونوں فرقے شیر و شکر کی طرح گھل مل کر وقت گزارتے تھے۔ لکھنؤ کے حکمراں نوابوں اور ان کے اراکین حکومت نے تعصب و تنگ نظری کی راہ نہیں اختیار کی۔ اردو دونوں فرقوں کی مشترکہ زبان تھی اور دونوں میں یکساں مقبول تھی۔ جب فارسی کا زوال ہوا تو اردو نے اس کی جگہ لے لی۔ جو پہلے عام بول چال کی زبان تھی۔ اس کی ترویج و ترقی میں دونوں فرقوں کی مشترکہ جد و جہد شامل رہی۔ دونوں نے مل جل کر گیسوئے اردو کو سنوارا ہے۔ زبان تہذیب کے اشتراک نے لکھنؤ میں قومی یک جہتی کی بنیاد مستحکم کی۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اتحاد و یک جہتی کو استوار کرنے میں لکھنؤ کے کائستھوں اور کشمیری برہمنوں کا بڑا حصہ ہے۔ کشمیری برہمنوں کے بہت سے خاندان لکھنؤ آ کر آباد ہو گئے تھے۔ ان خاندانوں نے اردو زبان و ادب کی بہت خدمت کی۔ میل و محبت کی فضا قائم رکھی۔ یہ سلسلہ آج تک کسی نہ کسی شخصیت کے سہارے جاری ہے۔ اردو زبان کے دو عظیم شاہکار اسی دور کی یادگار ہیں۔ دیا شنکر نسیم (شاگرد خواجہ آتش) کی مثنوی گلزار نسیم اور رتن ناتھ سرشار کا فسانۂ آزاد۔ جب ۱۸۵۷ء کی پہلی جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد لکھنؤ کی مغموم فضا پر میر انیس کے مراثی اور ان کی اخلاقی شاعری کا رنگ چھا گیا تو لکھنوی شاعری کا روایتی رنگ بھی اڑ گیا۔ اس کے بعد انیس کے رنگ میں قومی شاعری کا علم بلند کرنے والا لکھنؤ کا پہلا شاعر چکبست تھا۔ برج نرائن چکبست کشمیری برہمن خاندان کے فرد تھے۔ ان کی پرجوش نظمیں اور طرز انیس میں لکھے ہوئے مسدس آج بھی دلوں میں میل و محبت کا جذبہ بیدار کرتے ہیں۔

کایستھ فرقے نے ہندستانی سلاطین و شاہان مغلیہ کے زمانے میں فارسی زبان و ادب کی خدمت کی اور سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد اردو زبان و ادب کو فروغ دینے میں پیش قدمی کی۔ لکھنؤ کے کائستھ خاندان جن کے باقیات اب بھی موجود ہیں، اتحاد و یک جہتی اور بے تعصبی کے لیے مشہور ہیں۔ انھوں نے میل محبت کی ایسی فضا پیدا کر دی جس کے اثرات اس پر آشوب دور میں بھی ختم نہ ہو سکے۔

اودھ کے حکمرانوں کے دربار میں کائستھ فرقے کے دانش وروں کی بڑی قدر و منزلت تھی، یہاں تک کہ اہم کلیدی اسامیوں پر ان کا تقرر ہوتا

تھا۔ نواب صفدر جنگ کے دیوان نول رائے سکینہ اٹاوہ کے کائستھ تھے جب صفدر جنگ ایک بار طویل عرصے کے لیے دہلی چلے گئے تو نیابت کے فرائض نول رائے نے انجام دیے۔ عدل گستری اور ملکی انتظامات میں نول رائے کو بڑی مہارت حاصل تھی۔ وہ بات کے پکے اور وعدے کے سچے تھے، فارسی ادبیات میں ان کو خاص مہارت حاصل تھی۔ ایک بار نواب محمد خاں والیِ فرخ آباد نے صفدر جنگ کو ۱۱۴۴ھ میں خط لکھا جس کی عبارت یہ تھی :

نواب نامدار۔ سلامت!

شمشیر خود، درمیان بکن، دگر نہ آب نخواہد ماند"

صفدر جنگ نے اس مختصر مگر جامع خط کا جواب لکھنے کے لیے دیوان نول رائے کو حکم دیا اور کہہ دیا کہ ترکی بہ ترکی جواب لکھو۔ نول رائے نے نہایت مختصر اور جامع جواب لکھا۔

"نواب نامدار۔ سلامت"۔

این شمشیر مردان، درمعرکہ میدان بے خون چشیدہ بہ میان نمی آید"

(تاریخ اودھ جلد اول ص ۱۰۷)

صفدر جنگ کے بعد اودھ کے دوسرے حکمرانوں نے بھی کائستھوں کو وزارت کا منصب دیا۔ راجہ جھاؤلال اور راجہ ٹکیٹ رائے کو لکھنؤ میں جو عروج حاصل ہوا اس کی تفصیلات اودھ کی تاریخوں میں موجود ہیں۔

ہولی، دسہرہ محرم اور عید کے تہواروں میں دونوں فرقوں کے لوگ شریک ہوتے تھے اور ان تہواروں کو میل و محبت کا ذریعہ بنا لیا گیا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی میں دونوں ہی شانہ بہ شانہ انگریزوں کے خلاف صف آرا ہوئے۔ کہیں ہندو افسر کے ماتحت مسلمان سپاہیوں نے داد شجاعت دی اور کہیں مسلمان افسر کی نگرانی میں ہندو جانبازوں نے میدان کارزار میں جرأت و ہمت کے جوہر دکھائے۔ تفرقہ اندازوں کی کوششوں کے باوجود اتحاد و اتفاق کی دیوار میں کوئی رخنہ نہیں پڑ سکا۔ اودھ کی راجدھانی لکھنؤ کو بچانے کے لیے دونوں نے دوش بہ دوش رہ کر انگریزی اقتدار کو ختم کرنے کی جد و جہد کی۔ یہ اتفاق ہے کہ اس راہ میں انھیں کامیابی سے ہمکنار ہونا نصیب نہ ہوا۔

ہمارے قومی رہنماؤں کو اتحاد و یکجہتی کے لیے سب سے زیادہ سازگار فضا لکھنؤ ہی کی نظر آئی، اسی لیے علی برادران نے مہاتما گاندھی کو مولانا عبدالباری فرنگی محلی سے لا ملایا اور اس اتحاد کی بدولت تحریک آزادی کو ایک نیا موڑ ملا۔ اور اس میں ایک نئی روح پھونکی گئی۔

لکھنوی تہذیب کے اخلاقی پہلوؤں کو سنوارنے اور سدھارنے میں علمائے فرنگی محل اور ان کے متعلقین کا بڑا حصہ رہا ہے۔ آج بھی ان کے باقیات صالحات اخلاق و شرافت کے ساتھ ساتھ اتحاد و یگانگت کے علمبردار ہیں۔

علمی و ادبی نقطۂ نظر سے دیکھیے تو آخری دور میں پنڈت رتن ناتھ سرشار، گنگا پرشاد ورما، بشن نرائن در، برج نرائن چکبست، منشی نول کشور، دوارکا پرشاد افق وغیرہ اور ان سب کے خاندانوں کے کارناموں کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ اردو زبان و ادب اور مشترکہ تہذیبی اقدار کے فروغ میں ان کی خدمات مسلم ہیں۔ سرشار نے اتحاد و یگانگت کے جس ماحول میں پرورش پائی تھی اس کا اندازہ فسانہ آزاد سے ہو سکتا ہے۔

لکھنؤ کی روایتی تہذیب کسی مضبوط بنیاد پر قائم نہ تھی، نہ اس کے پیچھے کوئی روایت تھی جس کے سہارے وہ دوسری تہذیبوں کی طرح صدیوں زندہ رہتی۔ اس میں چونکہ تکلف اور تصنع کا بڑا حصہ تھا اور وہ وقتی و ہنگامی حالات کی پیداوار تھا اس لیے اس کو سرعت کے ساتھ زوال سے ہمکنار ہونا پڑا۔ لیکن تکلف و تصنع سے قطع نظر اس تہذیب کے جو اجزا اعلیٰ اخلاقی قدروں سے مرکب تھے، ان کے اثرات لازوال ثابت ہوئے اور پے در پے حوادث و انقلابات کے باوجود لکھنؤ کی تہذیب و معاشرت کے ان اجزا نے بہت کم خارجی اثرات قبول کیے۔ یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ ملک کے دوسرے حصوں سے ترک سکونت کر کے لکھنؤ میں بہ کثرت آباد ہونے والے باشندے لکھنؤ پر اپنا مستقل اثر نہ ڈال سکے بلکہ بتدریج لکھنوی تہذیب شعوری اور غیر شعوری طور پر ان کی معاشرت میں سرایت کرتی رہی اور ان پر لکھنویت کا اثر غالب نظر آتا ہے اس کے برعکس دلی کی تہذیب و معاشرت خارجی اثرات سے نہ صرف متاثر ہوئی بلکہ اس نے اپنی انفرادیت کو بھی تقریباً خیرباد کہہ دیا۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ۱۹۴۷ء کے پرآشوب دور میں بھی لکھنؤ میں اتحاد و یکجہتی کی فضا قائم رہی۔ اور اس کے بعد سے اب تک اس کے آغوش میں ملک کے مختلف حصوں سے آکر آباد ہونے والے تمام فرقے یکجہتی کی پرسکون فضا میں میل و محبت سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔

★

م۔ک۔ مہتاب (افسانہ)

دیوار

آج کے زمانے میں اچھا نوکر کہاں ملتا ہے۔ جنھیں مل جائے وہ اپنے کو خوش نصیب سمجھتے ہیں۔ اب تو پہاڑی علاقوں میں بھی اتنے کام دھندے نکلنے لگے ہیں کہ پشتوں سے شہروں میں آکر بڑے گھروں میں غلامی کرنے والے لوگوں کے بچے بھی نیچے آنے سے کتراتے ہیں۔ لہٰذا دیوان صاحب اور ان کی بیوی بہت خوش تھے کہ انھیں مائی داس جیسا محنتی اور ہاتھ کا صاف لڑکا گھر کے کام کاج کے لیے مل گیا تھا۔

بات یوں تھی کہ دیوان صاحب کا چپراسی بدری داس ان کا مقروض تھا۔ وہ قرضہ کیا چکاتا غربت کے بوجھ سے ہی چل بسا۔ اس کے بھائی نے قرض چکانے کے طور پر بدری داس کا یتیم بیٹا دیوان صاحب کے گھر بھیج دیا۔ دیوان صاحب مائی داس کو کوئی تنخواہ نہیں دیتے تھے لیکن اس کے حق محنت کے طور پر اس کے کھانے پینے کے علاوہ گھر کے پرانے جوتے کپڑے وغیرہ مائی داس کے چھوٹے بہن بھائیوں کے لیے اس کے گاؤں بھیج دیے جاتے۔ دیوان صاحب اور ان کی بیوی مائی داس کے کھانے کپڑے کا بھی خاص خیال رکھتے کیوں کہ وہ سمجھتے تھے کہ اتنا سستا ملازم اور کہیں نہیں مل سکے گا۔ پھر بھی مائی داس شہر میں رہ کر اداس اداس سا تھا۔ یہی کوئی بارہ برس کا اکہرے بدن کا لڑکا گول گول آنکھیں نکھری رنگت۔ ماں بہت دن ہوئے مر گئی تھی۔ باپ ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی چل بسا۔ گاؤں میں مائی داس اپنے چچا کے آلوؤں کے کھیت میں کام کرتا۔ پہاڑ ڈھلان ہی سے ایک سے دوسرے کھیت تک بھاگا کرتا۔ گلہریوں اور چڑیوں سے کھیلا کرتا۔ گھر سے جو دال بھات آ جاتا وہ کھاتا اور رات کو کھیت میں بنی پھوس کی ایک جھونپڑی میں ہی سو جاتا۔ وہ چچا کے گھر نہیں جاتا تھا کیوں کہ چچی اسے منحوس ہی نہیں اپنے پر بوجھ بھی سمجھتی تھی جو اس کے ماں باپ وفات کے بعد ان پر ڈال گئے تھے۔ وہ جب کبھی گھر جاتا اسے چچی کی جھڑکیاں اور صلواتیں سننے کو ملتیں۔ کبھی کبھی تو وہ مائی داس کی خوب پٹائی بھی کر دیتی۔ اس لیے مائی داس گھر کی چہار دیواری میں سونے کی بجائے جھونپڑے کے کچے فرش پر دری بچھا کر سو رہنا بہتر سمجھتا تھا۔ چچی اس کے کھانے کے لیے جو دال بھات بھیجتی کئی بار وہ اس کی بھوک کی نسبت بہت کم ہوتا مگر وہ اس کی شکایت کسی سے نہیں کر سکتا تھا۔ جب بھوک بہت تنگ کرتی تو آگ جلا کر اس میں آلو یا آلو کی جڑیں دبا دیتا اور رات کو یہ بھنے ہوئے آلو کھایا کرتا۔

چنانچہ دیوان صاحب کے گھر آکر مائی داس بہت خوش تھا اسے پیٹ بھر کھانا ملتا اور پورے بدن کے کپڑے ملتے تھے۔ وہ صبح سے شام تک کام میں جٹا رہتا اس پر بھی دیوان صاحب کی بیوی مائی داس کو ڈانٹ دیتی تھی کیونکہ وہ اس عقیدے کی مالک تھی کہ ملازموں کو ڈانٹتے رہنے سے ہی وہ آپ کو مالک سمجھتے ہیں۔ لہٰذا اپنے مالک ہونے کے جذبے کی تشفی کے لیے وہ مائی داس کو کسی نہ کسی بات پہ

دن میں دو چار بار ضرور ڈانٹ دیتی تھی۔ کئی بار یہ ڈانٹ ڈپٹ سن کر مائی داس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ اسے گوشت پھلی پلاؤ اور دیوان صاحب کے گھر میں پکنے والے پکوان بھول جاتے۔ اسے پھر سے بھنے ہوئے آلو اور کھیت میں سے گذرنے والی پہاڑی کول کا میٹھا پانی یاد آجاتا۔ وہ کام ختم کرنے کے بعد مکان کی تیسری چھت پر جا بیٹھتا اور بانسری پہ کوئی پہاڑی گیت چھیڑ کر رونے لگتا۔

مائی داس کو تنخواہ میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ گاؤں میں نہ ماں تھی نہ باپ۔ نہ شہر میں گھومنے کو جی چاہتا تھا نہ گاؤں جانے کو۔ ہاں بچوں کے ساتھ کھیلنے کو ضرور جی چاہتا تھا۔ دیوان صاحب کے بچے مالک تھے اور وہ ان کا غلام اور ملازم۔ مالک اور غلام مل کر کیسے کھیل سکتے ہیں۔ ارد گرد کے مکانوں میں جو ملازم لوگ تھے مسز بھٹی دیوان مائی داس کو ان سے ملنے نہیں دیتی تھیں۔ کیوں کہ وہ چور تھے اچکے تھے، بیڑیاں پینے والے اور جیبیں کاٹنے والے چالاک لڑکے تھے۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ مائی داس جیسا معصوم لڑکا ان سے مل کر ویسا ہی مجرم بن جائے۔ چناں چہ مائی داس دیوان صاحب کے گھر کی چہار دیواری میں قید ہو کر رہ گیا تھا۔ نہ وہ بازار جا سکتا تھا نہ گلی میں کھیل سکتا تھا۔ ہاں کبھی کبھی جب دیوان صاحب بیوی بچوں کو کہیں پکنک کے لیے لے جاتے تو مائی داس بھی گھر سے باہر جاتا۔ وہ باغوں میں جا کر ان کے لیے دریاں بچھاتا۔ برتن صاف کرتا۔ پانی لاتا۔ دیوان صاحب اور ان کے بچے خوب ڈٹ کر کھاتے پیتے۔ مائی داس کو کسی کاغذ پہ کھانا ڈال کر الگ بٹھا دیا جاتا۔

دیوان صاحب کو کئی بار مائی داس سے یہ سلوک اچھا نہیں لگتا تھا لیکن مالتی کا ایک ہی جواب تھا "آپ کے گھر میں کبھی نوکر رہا ہو تب نا۔ میرے مائیکے میں بارہ بارہ نوکر تھے۔ میں جانتی ہوں ان سے کیسے نپٹا جاتا ہے۔ نوکر کو سر چڑھاؤ تو وہ ایک ہفتے میں ہی ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔"

دیوان صاحب کبھی کبھی رات کو مکان کی چھت پر بیٹھے مائی داس کی بانسری کا پُر درد نغمہ سنتے تو من ہی من میں محسوس کرتے کہ انھوں نے ایک آزاد پرندے کو اس مکان میں لاکر قید کر دیا ہے۔ یہ دکھ اس وقت اور بھی بڑھ جاتا جب وہ مائی داس کو حسرت بھری نگاہوں سے بچوں کے ساتھ ماں باپ کو لاڈ پیار کرتے دیکھا کرتا۔ مائی داس جس نے نہ ماں کی ممتا دیکھی تھی نہ باپ کا پیار۔ جب مالتی صبح بچوں کو نہلاتی، کپڑے پہناتی، جبراً کھانا کھلاتی اور ان کے گال چوم چوم کر اسکول کے لیے رخصت کرتی تو مائی داس بت کی طرح یوں کھڑا دیکھتا رہتا جیسے یہ کسی اور دنیا کا منظر ہو۔ شام کو جب دیوان صاحب دفتر سے لوٹتے تو تینوں بچے ممی، ڈیڈی آگئے۔ کہتے ہوئے ان کی ٹانگوں سے لپٹ جاتے۔ دیوان صاحب بچوں کے لیے کھیل، ٹافیاں، بسکٹ وغیرہ لایا کرتے۔ کچھ دیر بعد بچوں کو لے کر وہ بازار کی سیر کے لیے چلے جاتے۔ نل پر برتن دھوتا ہوا مائی داس منھ پھیر پھیر کر ان کی طرف دیکھتا رہتا۔ ایک شام دیوان صاحب نے مائی داس کی آنکھوں سے آنسو چھلکتے بھی دیکھے تھے۔ اس رات وہ بہت دیر تک چھت پر بیٹھا بانسری بجاتا رہا جیسے پہاڑ دل کو بلا رہا ہو اپنی بھیڑ بکریوں کو آواز دے رہا ہو۔ دیوان صاحب نیچے کمرے میں بیٹھے نغمے سنتے رہتے اور سوچتے رہتے کہ ان بچوں کو سیر پہ لے جاتے دیکھ کر مائی داس کو ضرور وہ دن یاد آرہا ہوگا جب میلی سی چادر اور کھدر کی ٹوپی والا ایک شخص جو اس کا باپ تھا ایک ہاتھ میں ناریل کی گڑگڑی اور دوسرے ہاتھ میں اس کی انگلی تھامے اسے میلہ دکھانے لے جا رہا ہوگا، اس نے اپنے بیٹے کو گڑ کی مٹھائی لے کر دی ہوگی اور کوئی تماشا بھی دکھایا ہوگا لیکن نہ اب ماں ہے نہ باپ۔ شہر میں کھانے پینے اور پہننے کو کتنا کچھ ہے لیکن کوئی انگلی نہیں جسے تھام کر مائی داس چل سکے۔ کہیں گرم ہونٹ نہیں جو اس کی پیشانی پر ثبت ہو سکیں۔ پہاڑ پہ کھلنے والے جنگلی پھولوں کی خوشبو تو ہوں گی ہوا اس کے خشک بھورے بالوں میں کنگھی کر جاتی ہوگی۔

لیکن مکان کی چھت پر تو وہ ہوا بھی نہیں پہنچ پاتی۔ اسی لیے مائی داس بانسری پر رو رہا ہے۔

دیوان صاحب کا من چاہا کہ مائی داس نیچے آئے وہ اس کی انگلی پکڑ کر اسے بازار لے جائیں۔ لیکن یہ بات مالک اور ملازم کے تصوراتی رشتے کے کتنی خلاف ہوگی اور مالتی تو مساوات کا یہ کرشمہ دیکھ کر اپنے بال نوچ لے گی۔ اس غریب کی شامت آجائے گی۔ مالتی اسے کھانے پینے کے لیے سب کچھ دے سکتی ہے لیکن ملازم کی سطح پر رکھ کر انگلی پکڑ کر نہیں۔ اس کی ممتا اپنے بچوں کے لیے ہی ہے۔ وہ اس میں مائی داس کو شریک نہیں کر سکتی۔ اسی طرح وہ دیوان صاحب کو بھی یہ اجازت نہیں دے سکتی کہ وہ مائی داس کو اپنی پدرانہ شفقت میں حصے دار بنائیں۔ یہ ایک دیوار تھی جسے مالتی ہر قیمت پر کھڑا رکھنا چاہتی تھی اور اسے تھامے رکھنے کے لیے دیوان صاحب کو بھی کئی بار مائی داس سے ناروا سلوک کرنا پڑتا۔

مائی داس بانسری پر رونے کے بعد جب نیچے آیا تو دیوان صاحب نے اسے ڈانٹ دیا کہ وہ کہاں تھا، بچوں کو دودھ دینا ہے۔ بستر لگانے ہیں۔ کتے کو دوائی کھلانی ہے اور تو ابھی سے چھت پر جا کر گانا بجانا کرنے لگا ہے۔ ابھی وہ اسے اور بھی سخت سست کہنے والے تھے کہ دیوان صاحب کا بڑا لڑکا آکر ان کے گلے لگ گیا۔ وہ اسکول سے انعام لایا تھا۔ دیوان صاحب نے اسے گلے لگایا۔ اس کے گال چومے۔ پیار کیا اور پیٹھ تھپکتے رہے۔ مائی داس بت بنا سب کچھ دیکھتا رہا۔ دیوان صاحب نے اسے یہ کہہ کر بھگا دیا۔ "ابے تو کیا دیکھ رہا ہے جا بستر لگا۔"

سردیوں کی راتیں گزارنے کے لیے ایسے نرم و گداز بستر مائی داس نے کہاں دیکھے تھے۔ اسے تو پچھا کے کھیت میں کھپریل کی جھونپڑی یاد تھی جس میں پڑی گھاس پھوس پر وہ اپنا بستر لگایا کرتا تھا۔ وہ مخمل کے بستروں پر ہاتھ پھیر کر ان کی نرمی کا احساس کرتا لیکن اسے اس بات پر بھی حیرانی ہوتی کہ دیوان صاحب کے بچوں کو ان عمدہ بستروں پر بھی نیند نہیں آتی تھی وہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر ممی اور ڈیڈی کے بستروں میں چلے جاتے تھے۔ انھیں اپنے بستروں میں سردی لگتی تھی۔ مائی داس اپنے چھوٹے سے کمرے میں سینے سے گھٹنے لگائے سوچا کرتا کہ ماں کی قربت میں کتنی گرمی ہوگی جو یہ بچے راتوں کو ایسے اچھے اچھے بستروں سے اٹھ اٹھ کر ماں کے پاس چلے جاتے ہیں۔ ماں کیا ہوتی ہے؟ ممی۔ ماں۔

ایک رات برف کا طوفان آیا تھا۔ اولے پڑے تھے۔ سردی بڑھ گئی تھی۔ مائی داس نے دیوان صاحب اور بچوں کے کمروں میں ہیٹر لگا دیے تھے اور خود اپنی کوٹھری میں آکر پرانے کمبل اور رضائی میں دبک رہا تھا لیکن دانت کٹکٹا رہے تھے۔ پاؤں ٹھنڈے ہوتے جا رہے تھے۔ نیند نہیں آ رہی تھی۔

اچانک دیوان صاحب کی بیوی مالتی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اور چور چور کا شور مچا دیا۔ اور پھر بے تحاشا مائی داس کو پیٹنے لگیں جو سردی میں ٹھٹھرتا ٹھٹھرتا ان کے بستر میں گھس آیا تھا اور گلے میں باز و ڈال کر ان سے لپٹ گیا تھا۔

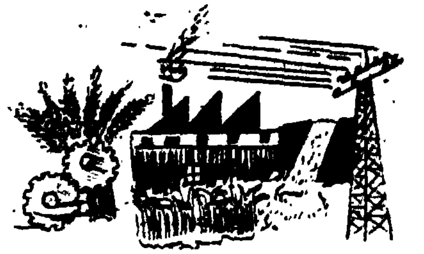
دیوان صاحب نے اسے کھینچ کر مالتی کے بستر سے الگ کر دیا۔ مائی داس ان کے قدموں میں گرا رو رہا تھا۔

"ڈیڈی مجھے ایک رات ممی کے پاس سو لینے دو ......"

اور دیوان صاحب اسے بازوؤں سے کھینچ کر یوں کھڑا کر دیتے تھے جیسے گرتی ہوئی دیوار کو پھر سے کھڑا کر دیتے ہوں۔

★

اتر پردیش شاہراہ ترقی پر



جنتا سروس کے تحت بجلی کے ۵۰۰۰ کنکشن دیے گئے ● ● ● آگرہ کو خوبصورت بنانے کی اسکیمیں بڑے پیمانے پر بروئے کار لائی جائیں گی ● ● ● وزیر اعلیٰ کے ہاتھوں آگرہ ٹرانسپورٹ نگر کا افتتاح ● ● ● بندیل کھنڈ میں آبپاشی کے نجی وسائل کی حوصلہ افزائی: قواعد نرم کر دیے گئے ● ● ● آزاد کا پستول میونسپل میوزیم الہ آباد کو منتقل ● ● ● بارہ بنکی کتائی مل میں مشینوں کی تنصیب ● ● ● ڈپلوما ہولڈروں کے لیے اپرنٹس شپ اسکیم ● ● ● یو پی ریاستی تیل کارپوریشن کے نئے مینیجنگ ڈائرکٹر۔

اتر پردیش میں ۲۰ نکاتی پروگرام اور دوسری ترقیاتی سرگرمیوں پر پوری مستعدی اور سرگرمی کے ساتھ عملدرآمد ہو رہا ہے۔ ذیل میں بعض اہم اقدامات اور پروگراموں کا مختصراً ذکر کیا جا رہا ہے:

جنتا سروس کنکشن: اتر پردیش ریاستی بجلی بورڈ کی جنتا سروس کنکشن اسکیم کے پہلے مرحلے کے تحت راٹھ (ضلع ہمیر پور) میں وزیر اعلیٰ شری نرائن دت تیواری نے جیسے ہی بجلی کے کنکشنوں کا رسمی افتتاح کیا، اتر پردیش کے وسیع دیہی علاقوں میں رہنے والے ہریجنوں، بے زمین مزدوروں، چھوٹے کسانوں اور دوسرے غریب اور کمزور طبقوں کی پانچ ہزار جھونپڑیاں اور مکانات بجلی کی روشنی سے جگمگا اٹھے۔ اس اسکیم کے تحت ریاست میں اس سال کل ایک لاکھ کنکشن دیے جائیں گے۔

اس سلسلے میں آل انڈیا ریڈیو کے لکھنؤ اسٹیشن سے ایک تقریر نشر کرتے ہوئے وزیر اعلیٰ نے کہا کہ وزیر اعظم کے نئے معاشی پروگرام کے تحت جنتا سروس ایک اہم قدم ہے جس سے ترقی اور خوشحالی کی نئی راہیں کھل جائیں گی اور اتر پردیش کے دیہی علاقوں کا سماجی اور معاشی نقشہ ہی بدل جائے گا۔

وزیر اعلیٰ نے اتر پردیش ریاستی بجلی بورڈ کی اسکیم کو ملک کی ایک انوکھی اسکیم بتاتے ہوئے اس بات پر اظہار مسرت کیا کہ اتر پردیش ریاستی بجلی بورڈ نے ایسی نئی ڈیزائن تیار کرنے میں کامیابی حاصل کر لی ہے جن سے دیہات کے کچے مکانوں میں بھی بآسانی بجلی لگائی جا سکتی ہے۔ انھوں نے توقع ظاہر کی کہ بجلی بورڈ اس طرح کی دوسری اسکیمیں بھی شروع کرے گا جس سے گاؤں کے محنت کش طبقے کا معیار زندگی بلند کیا جا سکے۔ بشری تیواری نے بتایا کہ اتر پردیش ریاستی بورڈ ۷۷-۱۹۷۶ء کو "صارفین خدمت سال" کی حیثیت سے منا رہا ہے۔ اور اس دوران صارفین کی ہر امکانی خدمت کرنے کی کوشش کی جائے گی اور ان پروگراموں کی کامیابی کے لیے ان کا تعاون حاصل کیا جائے گا۔

وزیر اعلیٰ نے اس اسکیم کے فوائد کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ریاستی بجلی بورڈ بہت ہی کم قیمت پر بجلی کے کنکشن دے گا اور وہ خود ہی گھروں پر وائرنگ بھی کرائے گا۔ چنانچہ سروس کنکشن اور وائرنگ کی لاگت ایک بلب کے لیے ۶۰ روپے، دو بلبوں کے لئے ۸۰ روپے اور تین بلبوں کے لیے ۱۰۰ روپے ہوگی۔ یہ پوری رقم صارفین کی سہولت کے لحاظ سے یک مشت یا بالترتیب ۶ روپیہ، ۸ روپیہ اور ۱۰ روپیہ کی ۱۲ ماہانہ قسطوں میں وصول کی جائے گی۔ اسی طرح بجلی کی قیمت بھی، انھوں نے کہا بہت کم رکھی گئی ہے۔ یعنی ایک بلب کے لیے ۴ روپیہ، دو بلبوں کے لیے ۶ روپیہ اور تین بلبوں کے لیے ۷ روپیہ ماہانہ۔

وزیر اعلیٰ نے دیہی علاقوں کی تیز رفتار ترقی کے لیے جس پر ریاست کی معاشی خوشحالی کا انحصار ہے، بجلی کو اولین شرط قرار دیتے ہوئے کہا کہ ریاستی حکومت زرعی مقاصد کے لیے بجلی کی مسلسل فراہمی کے واسطے ہمیشہ کوشاں رہی ہے۔ اگرچہ پچھلے کچھ برسوں میں بجلی کی فراہمی پر بعض پابندیاں عائد کرنا پڑیں لیکن اب بجلی رات دن دستیاب

ہے اور بجلی کی پیداوار میں اضافہ کرنے کے لیے اقدامات کیے جا رہے ہیں۔ ریاست میں دیہی علاقوں کو بجلی فراہم کرنے پر خصوصی توجہ دی جا رہی ہے۔ اور تنہا سال رواں کے دوران ۔ ۔ ۔ ۴ نجی ٹیوب ویلوں کو بجلی فراہم کی جائے گی۔

آخر میں وزیر اعلا نے کہا کہ ریاستی حکومت اور اتر پردیش ریاستی بجلی بورڈ کی مشترکہ کوششوں سے زیادہ سے زیادہ علاقوں کو بجلی فراہم کرنا ممکن ہو سکے گا اور سارفین کو حتی المقدور سستی سے سستی بجلی مہیا کی جا سکے گی۔

وزیر اعلا کے ہاتھوں آگرہ ٹرانسپورٹ نگر کا افتتاح

آگرہ، متھرا روڈ پر وزیر اعلا شری نرائن دت تیواری نے گزشتہ ۱۷ر جولائی کو گرو کا تال، گرودوارہ کے قریب آگرہ میں ٹرانسپورٹ نگر کے پہلے مرحلہ کا افتتاح کیا۔

انھوں نے اس موقع پر ایک بڑے مجمع سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ سول حکام، فوج کے جوانوں، مزدوروں، اور تکنیکی ماہروں کی محنت و جانفشانی سے ٹرانسپورٹ نگر کے اول مرحلہ کی تکمیل مقررہ مدت کے اندر ممکن ہو سکی ہے۔ انھوں نے کہا کہ آگرہ شہر کو دلکش بنانے کے دیگر منصوبے بھی مقررہ وقت کے اندر مکمل کر لیے جائیں گے۔

شری تیواری نے کہا کہ بین اقوامی شہرت کا مالک شہر آگرہ غیر ملکی سیاحوں کے لیے بڑی کشش رکھتا ہے۔ اس حقیقت کو ملحوظ رکھتے ہوئے سڑکوں کو چوڑا کر کے، ناجائز قبضے ہٹا کر اور گندی بستیوں کی صفائی کر کے شہر کو خوبصورت بنانے کی کئی اسکیمیں شروع کی گئی ہیں۔ مہاتما گاندھی مارگ کو چوڑا کرنے کا کام آئندہ یکم نومبر تک مکمل ہو جانے کی توقع ہے۔ آگرہ میں جمنا ندی پر ایک بیراج تعمیر کرنے کا معاملہ بھی زیر غور ہے۔ انھوں نے کہا کہ فتح پور، متھرا اور بندرابن کے نواحی علاقوں کو ترقی دینے کے لیے کئی اقدامات کیے جائیں گے۔

آگرہ ڈولپمنٹ اتھارٹی ۳ کروڑ ۳۸ لاکھ روپے کی مجموعی لاگت سے دو مرحلوں میں ٹرانسپورٹ نگر کی تعمیر کر رہی ہے۔ ٹرانسپورٹ نگر کا کل رقبہ ۱۲۶ ایکڑ ہے جس میں سے ۴۶ ایکڑ زمین پر پہلے مرحلے کے تحت کام شروع کیا گیا تھا۔ یہ زمین غیر ہموار تھی اور ٹیلوں کے ٹیلوں کی وجہ سے اس پر جا بجا گہرے گڑھے ہو گئے تھے۔ اس پراجکٹ کا پہلا مرحلہ ۳۰ر جون تک مکمل کر لینے کا فیصلہ گزشتہ مئی میں اس وقت کیا گیا تھا جب وزیر اعلا نے آگرہ کا دورہ کیا تھا۔ ٹرانسپورٹ نگر کی تعمیر کا مقصد یہ ہے کہ ٹرانسپورٹ کے کام میں لگے ہوئے لوگوں اور ان کی کمپنیوں کو خاص شہر کے بجائے زیادہ مناسب مقام پر منتقل کیا جا سکے اور جمنا سڑک پر قلعہ کے قریب اور دیگر علاقوں، مثلاً کوتوالی، موتی کٹرہ اور دریا سی کے علاقوں میں بھاری موٹر گاڑیوں کی وجہ سے آمد و رفت میں جو دشواریاں پیدا ہوتی ہیں ان کو دور کیا جا سکے۔ نیز آگرہ کو خوبصورت بنانے کی اسکیموں کو آسانی اور تیز رفتاری کے ساتھ مکمل کیا جا سکے۔

زمین کو ہموار کرنے کے علاوہ سڑکوں کی تعمیر کرنے، پائپ لائین بچھانے اور بجلی مہیا کرنے کے سلسلے میں کافی کام مکمل ہو گیا ہے۔ ٹرانسپورٹ نگر میں ٹرانسپورٹ کمپنیوں، ٹرک کی باڈی بنانے والوں، فاضل پرزے تیار کرنے والوں، مرمت کی دوکانوں، عام دکانوں، کینٹینوں، پیٹرول سروس اسٹیشنوں، کولڈ اسٹوریج، بینک، تھانہ اور گوداموں وغیرہ کے لیے پلاٹوں کو ترقی دی جا رہی ہے۔

آبپاشی کے نجی وسائل کی حوصلہ افزائی: قواعد نرم کر دیے گئے

ریاستی حکومت نے بندیل کھنڈ علاقے میں آبپاشی کے نجی وسائل کی حوصلہ افزائی کرنے کی غرض سے مالی امداد کی منظوری کے مروجہ قواعد نرم کر دیے ہیں۔

حکومت نئے قواعد کے بموجب بندیل کھنڈ کے ایسے علاقوں کے کاشتکاروں کو، جن کے پاس دو ہکٹیڑ سے زیادہ زمین ہے اور جہاں خشک سالی سے متاثرہ علاقوں سے متعلق اسکیم زیر عمل ہے، پمپنگ سیٹ یا نجی ٹیوب ویل کی واقعی لاگت کے ۲۵ فیصد یا قابل منظوری قرضے کی انتہائی حد کے ۲۵ فیصد کے برابر (جو بھی کم ہو) مالی امداد دے گی لیکن اس کی انتہائی حد ۳۰۰۰ روپیہ سے زیادہ نہ ہوگی۔

اسی طرح ان علاقوں میں جہاں سوکھے کے علاقوں کی اسکیم زیر عمل نہیں ہے ایک ہکٹیڑ جوت تک کے کاشتکاروں کو پمپنگ سیٹ یا نجی ٹیوب ویل کی واقعی لاگت کے ۳۳ ۱/۳ فیصد یا

قابل منظوری قرضے کی انتہائی حد کے ۳۳ ۱/۳ فیصد کے بقدر (جو بھی کم ہو) سرکاری امداد دی جائے گی۔ اس کے علاوہ ان علاقوں میں ایک ہیکٹر سے زیادہ جوت والے کاشتکاروں کو پمپنگ سیٹ یا نجی ٹیوب ویل کی واقعی لاگت کے ۲۵ فیصد یا قابل منظوری قرضے کی انتہائی حد کے ۲۵ فیصد کے مساوی (جو بھی کم ہو) مالی امداد دی جائے گی لیکن یہ امداد ۳۰۰۰ روپیہ سے زیادہ نہیں ہوگی۔

اس سلسلے میں صرف ایسے کاشتکار حکومت سے مالی امداد پانے کے مستحق ہوں گے جو اپنی درخواستوں کا اندراج بلاک ترقیاتی افسر کے دفتر سے کرائیں گے اور اپنی درخواستوں کے اندراج کی تاریخ سے پمپنگ سیٹ کے معاملے میں چھ ماہ کے اندر اور نجی ٹیوب ویل کے معاملے میں ایک سال کے اندر کارروائی پوری کرائیں گے۔ بہرحال ضلع حکام کو اس ضمن میں یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ خصوصی حالات میں اس مدت میں، پمپنگ سیٹ کے معاملہ میں چھ ماہ اور ٹیوب ویل کے معاملہ میں ایک سال تک کی توسیع کرسکتے ہیں۔

کسان اگر اپنے ذاتی وسائل سے یا قرضے حاصل کرکے چھوٹے پیمانے پر آبپاشی کے وسائل مکمل کرلیتے ہیں تو ایسی صورت میں ان دونوں زمروں کے کاشتکار سرکاری مالی امداد کے مستحق ہوں گے۔

یہ مالی امداد ایڈیشنل ضلع مجسٹریٹ (منصوبہ بندی)۔ یا ایڈیشنل ضلع مجسٹریٹ (پراجکٹ) یا ضلع منصوبہ بندی افسر منظور کریں گے۔

امید کی جاتی ہے کہ ان قواعد کو نرم کردینے سے بندیل کھنڈ کے علاقوں میں چھوٹے پیمانے کے آبپاشی کے نجی وسائل کی حوصلہ افزائی ہوگی۔ سال ۷۶-۱۹۷۵ء کے دوران ۸۰ نجی ٹیوب ویلوں کی تعمیر اور ۱۴۸ پمپنگ سیٹوں کی تنصیب کی گئی۔ امید کی جاتی ہے کہ سال رواں کے دوران اس کارگزاری میں دوگنا اضافہ ہو جائے گا۔

آزاد کا پستول میونسپل میوزیم، الہ آباد کو منتقل: ممتاز مجاہد آزادی، اور شہید وطن شری چندر شیکھر آزاد کا پستول ۲ جولائی کو ریاستی میوزیم کے آڈیٹوریم میں محکمہ ثقافتی امور کے کمشنر نیز سکریٹری شری بھیش پرشاد نے میونسپل میوزیم الہ آباد کو پیش کیا جسے میوزیم کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ایس سی کالا نے قبول کیا۔

اس موقع پر شری بھیش پرشاد نے شری آزاد کو نذرانۂ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ ان کی حب الوطنی اور جرأت کی کوئی حد نہ تھی اور وہ ہندستانی انقلابی جماعت کے ایک سرگرم کارکن تھے۔

ہمارے ملک کی تاریخ میں ان کا نام سنہرے حرفوں میں لکھا ہوا ہے۔ شری بھیش پرشاد نے کہا کہ آزاد کا پستول جو ملک کا ایک بیش بہا تاریخی اثاثہ ہے میونسپل میوزیم، الہ آباد کو نمائش کے لیے پیش کیا جارہا ہے۔ تاکہ آنے والی نسلیں مادر وطن کی آزادی کی حفاظت کے لیے ان کی زندگی سے تحریک حاصل کرسکیں۔

محکمۂ اطلاعات و رابطہ عامہ اور ثقافتی امور کے ڈائرکٹر شری ردی موہن سیٹھی نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا اور آزاد کو خراج عقیدت پیش کیا۔

بارہ بنکی کتائی مل میں مشینوں کی تنصیب: چھوٹے پیمانے کی صنعتوں کی وزیر شریمتی محسنہ قدوائی نے ۲ جولائی کو بارہ بنکی میں اترپردیش ریاستی کتائی مل میں مشینوں کی تنصیب کی افتتاحی رسم ادا کی۔

اترپردیش ریاستی ٹکسائل کارپوریشن پانچ کروڑ روپے کی لاگت سے یہ مل قائم کررہا ہے۔ اس مل میں مجموعی طور پر ۲۵۰۸۰ تکلے ہوں گے جن کی پیداواری صلاحیت تقریباً ۴۰ لاکھ کیلو گرام یارن سالانہ ہوگی۔ یہ مل ابتدائی مرحلوں میں ۵۰ فیصد سوتی دھاگا اور ۵۰ فیصد اسٹیپل یارن تیار کرے گی جس کے لیے ہر سال تقریباً ۱۲۰۰۰ گانٹھ روئی اور ۵۰۰ گانٹھ ریشم تیار ہوگا۔

امید کی جاتی ہے کہ یہ مل مارچ ۱۹۷۷ء تک مکمل ہو جائے گی۔ اور اس میں تقریباً ۱۱۰۰ افراد کو براہ راست اور کئی ہزار افراد کو بالواسطہ روزگار ملے گا۔ اس مل میں ۲/۲ ایس اور ۳۰/۲ ایس قسم کا یارن تیار ہوگا جس سے تقریباً ۲۹۸ لاکھ میٹر سالانہ کپڑا

تیار کرنے میں مدد ملے گی۔

اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے شریمتی قدوائی نے کہا کہ اس مل کے قیام سے بنکروں کی ایک دیرینہ مانگ پوری کرنے میں مدد ملے گی۔ انھوں نے کہا کہ یارن کے معاملہ میں خودکفالت کے حصول اور معاشی پروگراموں کی تکمیل کے سلسلے میں یہ پہلا قدم ہے۔

شریمتی قدوائی نے مل کے قیام سے وابستہ افراد سے اپیل کی کہ وہ مقررہ مدت سے قبل ہی بقیہ تمام کام پورا کرلیں۔ انھوں نے کہا کہ اس علاقے کے بنکروں کو فوری راحت ملے گی جو یارن کی قلت سے دوچار ہیں۔

ڈپلوما ہولڈروں کے لیے اپرنٹس شپ ٹریننگ: محکمۂ تعمیرات عامہ میں اپرنٹس شپ اسکیم کے تحت، جو ۲۰ نکاتی معاشی پروگرام کا ایک اہم جز ہے، امسال ایک سال کی تربیت کے لیے ۵۳ ڈپلوما ہولڈروں اور ۴۰ ڈگری ہولڈروں کا اندراج کیا جائے گا۔

تربیت حاصل کرنے والے امیدواروں کی فوری تقرری کے لیے جن ۲۲ سپرنٹنڈنگ انجینیروں کو مامور کیا گیا ہے ان کی رپورٹ کے مطابق اب تک ۴۹ ڈپلوما ہولڈروں اور ۲۳ ڈگری ہولڈروں کی تقرری کی جاچکی ہے۔ ان میں سے پانچ ڈپلوما ہولڈروں اور چار گریجوٹ انجینیروں کا تعلق اقوام مندرجہ فہرست سے ہے۔ مطلوبہ تعداد میں امیدواروں کے دستیاب نہ ہونے کے باعث سپرنٹنڈنگ انجینیروں سے کہا گیا ہے کہ وہ بورڈ آف اپرنٹس شپ ٹریننگ کانپور سے اقوام مندرجہ فہرست اور عام امیدواروں کی فہرست حاصل کریں اور خالی آسامیوں پر فوری تقرری کردیں۔

پل کارپوریشن کے نئے مینجنگ ڈائرکٹر: ریاستی محکمۂ تعمیرات عامہ کے جوائنٹ سکریٹری شری ٹی۔ سی۔ چترویدی نے اترپردیش ریاستی پل کارپوریشن کے نائب چیرمین اور مینجنگ ڈائرکٹر کی حیثیت سے عہدہ سنبھال لیا ہے انھوں نے شری رتیش موہن کی جگہ چارج لیا ہے جو ریٹائر ہوگئے ہیں۔

★

اردو افسانہ

(صفحہ ۱۱ کا بقیہ)

بھی مجبور کرتے تھے کہ فنکار اس طرف متوجہ ہو۔ ایسا نہیں تھا کہ فرد کی طرف توجہ نہ دی گئی ہو، لیکن فرد بہرحال ایک معاشرے کا حصّہ ہوتا ہے اور جب معاشرے کا یہ حال ہو، جو اس زمانے میں تھا تو پھر افسانہ نگار کا کام بھی نسبتاً آسان تھا وہ بہت کچھ تو بغیر کسی مزید رنگ آمیزی کے پیش کر دیتا تھا اور یہ قاری کو متاثر کرنے کے لیے کافی تھا۔ ادب میں حقیقت پسندی کسی چور دروازے سے نہیں بلکہ صدر دروازے سے داخل ہوئی ہے۔ اس کا خاطر خواہ خیر مقدم ہوا۔ مختصر افسانہ ابتدا ہی سے تاریخ کے ادبی تقاضوں سے پورے طور پر ہم آہنگ تھا۔ اس کے بعد پھر اس میں موضوعات کا تنوع ہوا۔ سیاسی، سماجی، تہذیبی عوامل اس پر برابر اثر انداز ہوتے رہے۔ تقسیم ہند نے ایسے سیاسی مسائل پیش کیے جن کے اثرات نہ صرف سیاسی حد تک محدود رہے بلکہ اس نے معاشی، معاشرتی اور تہذیبی اثرات بھی ڈالے چنانچہ اردو افسانہ اُن سے متاثر ہوا۔ منٹو، کرشن چندر، احمد ندیم قاسمی، خواجہ احمد عباس، قرۃ العین حیدر، اشفاق احمد وغیرہ نے اپنے افسانوں سے لوگوں کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ دوسری اصناف کے مقابلے میں اردو افسانے نے بڑی تیزی سے ترقی کی اور بقول ڈاکٹر محمد حسن آج مختصر افسانہ اردو نثر کا سب سے ترقی یافتہ فارم ہے اور اس کی بدولت اردو نثر کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔

★

نقد و تبصرہ

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا لازمی ہیں)

نام کتاب۔ **آگ اور دھواں**۔ مصنف: احمد ابراہیم علوی۔ قیمت: دو روپیہ مجلد، خوشنما کور۔ عمدہ کاغذ نفیس کتابت، اعلیٰ طباعت۔ علوی پبلشرز۔ ۳۔ ہیلیتھ اسکوائر لکھنؤ۔

آگ اور دھواں فلسطینی مجاہدین کے سرفروشانہ کارناموں اور لبنان کی خانہ جنگی کے متعلق تین مضامین کا مجموعہ ہے۔ پہلے دو مضامین "جنگ کیوں؟" اور "آگ اور دھواں" فلسطین اور فلسطینی مجاہدین کے سلسلے میں ہیں اور آخری تیسرا مضمون "جلتا ہوا شہر" لبنان کی خانہ جنگی اور اس سے پیدا ہونے والی تباہی و بربادی کی المناک اور عبرت انگیز داستان ہے۔ ہر مضمون بصیرت افروز نتیجہ خیز اور انتہائی موثر ہے۔

احمد ابراہیم علوی اردو کے ہونہار اور حقیقت پسند ادیب و افسانہ نگار ہیں۔ "متاع قلم" ان کا ورثہ ہے۔ حریت پسندی، حق گوئی، جرأت اور بیباکی فطرت ثانیہ ہے۔ اظہار خیال پر قدرت ہے۔ اسی لیے ان کے قلم میں دلکشی و رعنائی، سچائی و توانائی پائی جاتی ہے انھیں "فطری طور پر حریت پسندوں سے ہمدردی اور ان کو کچلنے والی طاقتوں سے نفرت ہے۔" اسی لیے جب لوگوں کو اپنے وطن سے بے وطن کیا جاتا ہے۔ بچوں کو یتیم اور ماؤں کو بیوہ کیا جاتا ہے تو ان کا دل دکھتا ہے، آنکھ روتی ہے اور قلم چل دیتا ہے، اور وہ "اسے تحریر میں مصنوعی حسن پیدا کرنے یا کسی بھی قسم کی روایت یا بندش کو مدنظر رکھنے کے لیے رکتے نہیں۔

علوی نے بڑے موثر پیرایہ میں تاریخی حقائق کے ساتھ، عرب اسرائیل جنگ پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ اسرائیل کو "ایک مصنوعی ملک سمجھتے ہیں جو غیر قانونی اور ناجائز طریقے سے وجود میں آیا ہے۔ ہندستان نے ہمیشہ فلسطین کے عربوں کا ساتھ دیا ہے۔ اس نے اب بھی اسرائیل کو تسلیم نہیں کیا۔ مہاتما گاندھی نے ۲۱ نومبر ۱۹۳۸ء کے ہریجن میں لکھا تھا کہ:۔

"فلسطین اسی طرح سے عربوں کا ہے جس طرح فرانسیسیوں کا فرانس اور انگریزوں کا انگلینڈ"

اسی طرح پنڈت جواہر لال نہرو نے روزنامہ ہند و مدراس مورخہ ۱۱ دسمبر ۳۸ء میں لکھا کہ:

"فلسطین ایک عرب ملک ہے اور وہاں پر عرب مفادات ہی کو برتری حاصل ہونی چاہیئے"

لیکن عظیم طاقتیں، جمہوری قبا پہن کر "دیو استبداد" بنی ہوئی ہیں، اقوام متحدہ کے اکثریتی فیصلے ان کے "ویٹو" سے مسترد ہو جاتے ہیں، جمہوریت، انصاف اور انسانیت سے اتنا بڑا مذاق، آمریت، ظلم، اور بربریت کے زمانے میں بھی کبھی نہیں کیا گیا۔ علوی کے الفاظ میں:

"دنیا کی تمام بڑی طاقتیں دنیا کے انصاف پسندوں کے ساتھ بڑا بے رحمانہ کھیل کھیل رہی ہیں اور یہ اتنا خطرناک کھیل ہے کہ اس میں ایک دن ساری دنیا تباہ ہو جائے گی۔"

لیکن یہ کھیل بڑی طاقتیں زیادہ دنوں تک نہیں کھیل سکتیں حق قوت ہے، قوت حق نہیں ہے۔ آج اسرائیل اپنے آقاؤں کی بے پناہ امداد سے خواہ کتنا ہی طاقتور اور مسلح ہو جائے لیکن مجاہدین فلسطین کے عزائم کا وہ مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اور وہ دن دور نہیں ہے جب حق حقدار کو ملے گا اور جابر و ظالم کیفر کردار کو پہنچیں گے۔

دوسرا مضمون "آگ اور دھواں" ہے۔ اس کے لکھنے کا سبب، علوی کے الفاظ میں، یہ ہوا کہ:

"میں نے لندن میں رنگین ٹی وی پر یروشلم اور اسرائیل کے دوسرے شہروں میں عرب حریت پسندوں کے مظاہرے، احتجاج اور غم و غصے کو دیکھا اور اسرائیلی بربریت اور ظلم کے دل ہلا دینے والے مناظر سے دل کانپ اٹھا تو پھر قلم اٹھایا اور "آگ اور دھواں" کی تخلیق ہوئی۔"

یہ مضمون کیا ہے؟ ہمت و جرأت، قربانی و ایثار، عزم و حوصلہ، سرفروشی و جانثاری کا پیکر حریت ہے۔

میں نے اس مضمون یا کہانی کو پیکر حریت کہا، اس کا ایک ایک کردار کوہ استقامت ہے۔ علوی نے بڑے پر جوش اور خوبصورت الفاظ میں مرقع کشی کی ہے۔

تیسرا مضمون 'جلتا ہوا شہر' وجود میں اس وقت آیا، جب علوی نے بیروت میں خانہ جنگی کے بدترین مناظر دیکھے اور ان کے رونگٹے کھڑے ہو گئے تو ان کے قلم نے جنبش کی اور جلتا ہوا شہر وجود میں آگیا۔

'آگ اور دھواں' کی تینوں کہانیاں، حریت و انسانیت، اعلیٰ جذبات اور مثالی کردار کا مرقع ہیں۔ علوی کے قلم میں سادگی، روانی، جوش، جذبہ بدرجۂ اتم موجود ہے۔ ایک ایک لفظ، دل پر اثر کرتا ہے۔ انھوں نے اپنا قلم ظالموں کے خلاف اور مظلوموں کی حمایت میں اٹھایا ہے۔ اس سے ہمارے ادب میں قابل قدر اضافہ ہوگا۔ ظلم کہیں بھی ہو کسی شکل میں ہو، اس کے خلاف قلم چلنا چاہیے۔ اور خوشی کی بات ہے کہ نوجوان ادیبوں میں علوی نے شعوری طور پر اس کو اپنا نصب العین بنایا۔

ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی

نام کتاب۔ **پچھلے پہر**۔ مصنف۔ جاں نثار اختر۔ تقطیع ۲۲×۱۸/۱۸ صفحات ۹۶ قیمت۔ سات روپیے۔ شائع کردہ۔ مکتبہ جامعہ نئی دہلی۔

ترقی پسند تحریک کے ذکر کے ساتھ ہی ذہن کے پردے پر صف اول کے جن شعراء کے نام ابھرتے ہیں ان میں جناب جاں نثار اختر کا نام بہت ہی نمایاں ہے۔ جاں نثار اختر اس تحریک کے ان قدآور شعرا میں ہیں جنھوں نے ماحول میں اپنی شخصیت کو ضم نہیں ہونے دیا بلکہ اپنی شخصیت سے ماحول کو نکھارا ہے۔ نعرے بازی کے اس پورے ماحول میں فیض، مجاز، مخدوم اور

جذبی کے بعد اگر کوئی شاعر ایسا نظر آتا ہے جس نے روایت کی صالح نزاکتوں کو محلِ نظر رکھتے ہوئے غزل کو نرم و لطیف لب و لہجے کے ساتھ سرمایۂ سخن بنایا ہے تو وہ ہیں جناب جاں نثار اختر۔

پچھلے پہر جاں نثار اختر کی نئی غزلوں کا دلکش مجموعہ ہے جس کے لیے اگر آل احمد سرور فرماتے ہیں کہ جاں نثار کی شاعری آج بھی جوان ہے اور آج کی حسیت کی عکاسی کر رہی ہے" تو ڈاکٹر محمد حسن کہہ رہے ہیں کہ "جاں نثار اختر ان معدودے چند شاعروں میں ہیں جو زندگی کے بارے میں شاعری نہیں کرتے، شاعری کو زندگی بنا کر گزارتے ہیں" خواجہ احمد فاروقی فرماتے ہیں کہ "جاں نثار اختر کو تقین اور کیٹس کی طرح ادبی مصوری میں بڑا ملکہ ہے۔ وہ ذہنی اور تجریدی تصورات کو جیتی جاگتی شکل میں پیش کر سکتے ہیں"

حقیقت بھی یہی ہے کہ طویل ترین خاموشی کے بعد جاں نثار اختر صاحب نئی غزل کے جلو میں جو تازگی اور دلکشی لے کر ادبی دنیا میں واپس آئے ہیں وہ انھیں کا حصہ ہے۔ الفاظ کی دلکشی، فکر کی تازگی اور تخیل کی رفعتوں کے حصار میں انھوں نے تجربات، حالات اور واقعات کو جس انداز سے مصور کرایا ہے وہ ان کی شعری سحر کاری کا ثبوت ہے۔

پچھلے پہر کے چند متفرق اشعار آپ بھی ملاحظہ فرمائیں۔

اپنے تاریک مکانوں سے تو باہر جھانکو زندگی شمع لیے در پہ کھڑی ہے یارو

کم نہیں نشے میں جاڑے کی گلابی راتیں اور اگر تیری جوانی بھی ملا دی جائے

زندگی ایک خلش دے کے نہ رہ جا مجھ کو درد وہ دے جو کسی طرح گوارا ہی نہ ہو

میں سو بھی جاؤں تو کیا میری بند آنکھوں میں تمام رات کوئی جھانکتا لگے ہے مجھے

تو کہ بہتی ہوئی ندیا کے سمان تجھ کو دیکھوں تو مجھ کو پیاس لگے

ہمارے شہر میں بے چہرہ لوگ بستے ہیں کبھی کبھی کوئی چہرہ دکھائی دیتا ہے

ہماری قدر کرو اے سخن کے متوالو غزل کو کل نہ ملیں گے مزاج داں ہم سے

مختصر یہ کہ پچھلے پہر ایک ایسا شعری مجموعہ ہے جس کے بغیر کسی بھی لائبریری کا عصری ادب نامکمل سا معلوم ہوگا۔

نام کتاب۔ ہماری زندگی : مصنف۔ شفیع الدین نیر۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶
ضخامت۔ ۸۰ صفحات۔ قیمت: دو روپے
ناشر۔ نیر کتاب گھر۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی۔ ۲۵

بچوں کا ادب بادی النظر میں کتنا ہی آسان و سہل کیوں نہ معلوم ہوتا ہو لیکن اس حقیقت سے انکار ناممکن ہے کہ اس ادب کی تخلیق کے لیے بچوں کی پسند اور ان کی نفسیات کا گہرا مشاہدہ ہونا ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہم اردو زبان و ادب کے تمام گراں بہا سرمایے پر نظر ڈالتے ہیں تو چند ہی ایسی شخصیتیں نظر آتی ہیں جنھوں نے بچوں کے لیے بھرپور کام کیا ہے۔

ایک ماہر نفسیات کی طرح ننھے منے ذہنوں میں جھانکنا، ان کی انوکھی اور انوکھی خواہشات کا مطالعہ کرنا، ان کی عجیب و غریب دلچسپیوں سے واقف ہونا اور پھر بچوں ہی کی زبان میں ان کے پسند کے فن پاروں کی تخلیق کرنا کتنا مشکل کام ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ بچوں کے لکھنے والوں کا جب ذکر آتا ہے تو مولانا اسمٰعیل میرٹھی۔ حامد اللہ افسر، ڈاکٹر ذاکر حسین اور شفیع الدین نیر کے علاوہ جلد ہی کوئی نام ذہن میں نہیں آتا ہے حالانکہ اردو زبان کا دامن مختلف اصناف کے ادب پاروں سے بھرا پڑا ہے۔

"ہماری زندگی" جناب شفیع الدین نیر کی ۲۲ مختلف نظموں کا مختصر سا مجموعہ ہے جس میں انھوں نے اپنے مخصوص لب و لہجے میں مختلف پیشوں کے نمائندوں کا ذکر کیا ہے۔ فن کے ان ماہرین میں ڈاکٹر صاحب، استاد صاحب اور باورچی کے علاوہ حمید باورچی، مولا بخش بہشتی، رامو کنجڑا اور راجہ رام مہتر جیسے وہ لوگ بھی شامل ہیں جن کو سماج کا بڑا طبقہ آج بھی حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ نیر صاحب نے ان تمام فن کاروں کا تعارف جس خوبصورت انداز میں کرایا ہے اس سے بچوں کے ذہنوں پر یقیناً ایک اچھا اثر پڑے گا۔ آج کے ترقی پذیر دور میں جبکہ طبقاتی نظام کے خلاف بھرپور جنگ چھڑی ہوئی ہے "نئی زندگی" کی اشاعت ایک حوصلہ مند، خوبصورت اور قابلِ قدر کوشش ہے۔

نام کتاب۔ اُردو ہے جس کا نام : مصنف۔ ضیا بانی۔ تقطیع ۲۰×۳۰/۱۶
ضخامت ۱۰۴ صفحات۔ قیمت۔ چھ روپے
ناشر : نقش کوکن پبلی کیشن ٹرسٹ۔ ۴۴ جیل روڈ ایسٹ۔ ڈونگری بمبئی۔ ۹

جیسا کہ کتاب کے نام ہی سے ظاہر ہے اردو سے متعلق جناب ضیا بانی کی ایک طویل نظم ہے جس میں اردو کے بیشتر شعرا و ادبا کے اسمائے گرامی نظم کیے گئے ہیں اور اس طرح یہ نظم ادیبوں اور شاعروں کا ایک "منظوم انڈکس" کہی جا سکتی ہے۔

جناب ضیا بانی صاحب نے کہنہ مشقی اور شعری مہارت کے ساتھ ناموں کو حد درجہ خوش اسلوبی سے نظم تو یقیناً کر دیا ہے لیکن اردو زبان و ادب کے آغاز و ارتقا کی داستان اتنی طولانی ہے کہ پوری نظم کا مطالعہ کرنے کے بعد بھی تشنگی یقیناً برقرار رہتی ہے۔ اگر ضیا صاحب صرف ناموں ہی کو نظم نہ کر کے ابتدا میں مختصراً اردو زبان کی تاریخ بھی نظم کر دیتے تو یقیناً یہ ایک قابلِ قدر اضافہ ہوتا۔ پھر بھی جناب خلیق انجم کے بقول "ممکن ہے اس کی کوئی غیر معمولی افادیت نہ ہو لیکن تجربے کی بعض اوقات یہی اہمیت ہوتی ہے کہ وہ تجربہ ہوتا ہے اور آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے مشعلِ راہ بنتا ہے"

بہرحال "اردو ہے جس کا نام" جناب ضیا بانی جیسے پرستارِ اردو کی ایک ایسی مخلصانہ اور بھرپور کوشش ہے جو یقیناً ادبی حلقوں میں سراہی جائے گی۔

— ساحر لکھنوی

★

عنوانات

نیا دور

جلد ۳۴ نمبر ۶

ستمبر ۱۹۷۶ء

ایڈیٹر: خورشید احمد

جوائنٹ ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی

★

پبلشر: یوگیندر نرائن

ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ اترپردیش

پرنٹر: اشوک در

سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری، یو پی

مطبوعہ گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ

شائع کردہ محکمہ اطلاعات و رابطہ عامہ، اتر پردیش

قیمت فی شمارہ: پچاس پیسے

زر سالانہ: پانچ روپے

[illegible] پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو پی لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶، لکھنؤ

[illegible] پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو پی [illegible]

اپنی بات

چندر شیکھر آزاد

بھارت کے جن جانباز سپوتوں اور جیالوں نے ملک کی آزادی کے لیے انگریزی سامراج سے بڑی ہمت اور بہادری سے ٹکر لی اور اس کے اقتدار کی چولیں ہلا کر رکھ دیں ان میں چندر شیکھر آزاد کا نام کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ آزاد اور اشفاق اللہ خاں، رام پرشاد بسمل، راجیندر لہری، روشن سنگھ اور سردار بھگت سنگھ جیسے جواں عزم اور حریت پسندوں کے کارنامے ہماری جنگ آزادی کی تاریخ میں سنہرے حرفوں میں لکھے جائیں گے۔ یہ وہ سپہ سالاران حریت ہیں جنھوں نے موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنے عزیز وطن کے لیے اپنی جان کی قربانی دے دی۔ چندر شیکھر آزاد کی یاد کو تازہ کرنے کے لیے گزشتہ مہینے ملک میں ان کی جینتی منائی گئی۔ وہ مدھیہ پردیش کے موضع بھاورا (ضلع جھبوا) میں ۱۹۰۶ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد پنڈت سیتا رام تیواری ضلع اناؤ کے موضع بدرکا کے رہنے والے تھے لیکن فکر معاش نے ان کو مدھیہ پردیش پہنچا دیا تھا۔ ان کی بہت ہی قلیل آمدنی تھی جس سے گھر والوں کی گزر بسر مشکل سے ہوتی تھی۔ اسی لیے آزاد کا بچپن بڑی عسرت اور پریشانی میں گزرا۔ چودہ پندرہ سال کی عمر میں وہ علم کی پیاس بجھانے کاشی آئے اور سنسکرت کا مطالعہ کرنے لگے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ملک میں آزادی کی تحریک شباب پر تھی۔ آزاد کے دل میں نو عمری ہی سے آزادی کی چنگاری روشن ہو چکی تھی۔ چنانچہ ۱۹۲۱ء میں جب ترک موالات کی تحریک شروع ہوئی تو وہ اس میں بلا تامل پھاند پڑے۔ گرفتار ہو کر جب وہ مجسٹریٹ کے روبرو پیش کیے گئے تو اس نے ان سے پوچھا — تمہارا نام؟ — جواب ملا "آزاد"، باپ کا نام — سوتنتر — رہائش؟ — جیل خانہ، کام؟ — جدوجہد آزادی۔ مجسٹریٹ ایک ہندوستانی لڑکے کی یہ بے باکی کو برداشت نہ کر سکا اور پندرہ بید لگانے کا حکم دیا۔ بید لگانے کے لیے جب ان کو سپاہی رسیوں سے باندھنے لگے تو انھوں نے گرج کر کہا — "باندھتے کیوں ہو؟ مارو! میں کھڑا تو ہوں۔" پولیس نے پوری مستعدی دکھائی۔ بید پڑنے لگے اور بید کی ہر ضرب پر وہ "مہاتما گاندھی کی جے" اور "بھارت ماتا کی جے" کے نعرے لگاتے رہے۔ زبان سے نہ اُف کی اور نہ چہرے پر شکن آئی۔ پورا جسم لہولہان ہو گیا اور آخر کار بیہوش ہو گئے۔ ہوش آنے پر ایسے اٹھے جیسے کچھ بھی نہ ہوا ہو۔ اس واقعہ کو جس نے بھی سنا انھیں دیکھنے کے لیے بیتاب ہو گیا۔ لوگوں نے ان کا پرجوش خیر مقدم کیا اور پھولوں سے ان کو لاد دیا گیا۔ اخباروں میں ان کی تصویریں بھی شائع کی گئیں۔ بیدوں سے صرف ان کا جسم ہی لہولہان نہیں ہوا تھا بلکہ ان کا دل بھی زخمی ہو گیا تھا۔ نوجوان آزاد کے خون کی گرمی نے برطانوی سامراج کو اس ظلم و تعدی کا مزا چکھانے اور بہر قیمت ملک کو آزاد کرانے کا ناقابل تسخیر جذبہ ان کے دل میں بھر دیا اور وہ دہشت پسندی کی طرف مائل ہو گئے۔ اس دوران میں وہ راجیندر ناتھ لہری اور سچیندر ناتھ بخشی وغیرہ کے قریب آ گئے، اور دہشت پسندوں کی بھرتی شروع ہو گئی۔ "ہندوستان ریپبلکن ایسوسی ایشن" کا قیام عمل میں آیا جس کا مقصد مسلح انقلاب کے ذریعہ ملک میں جمہوریت قائم کرنا تھا۔ آزاد اگرچہ زیادہ پڑھے لکھے نہ تھے لیکن وہ بہترین تنظیمی صلاحیت کے مالک تھے۔ کاکوری ڈکیتی سازش میں آزاد نے اہم حصہ لیا تھا۔ کاکوری کے پاس ۹ اگست ۱۹۲۵ء کو ٹرین روک کر سرکاری خزانہ لوٹ لیا گیا تھا۔ حکومت نے کاکوری ڈکیتی کیس کے نام سے مقدمہ چلایا۔ اشفاق اللہ خاں، رام پرشاد بسمل، راجیندر ناتھ لہری، ٹھاکر روشن سنگھ جیسے بہادر نوجوانوں کو تختہ دار پر لٹکا دیا گیا اور متعدد کو کالے پانی کی سزا دی گئی۔ لیکن آزاد کو آخر دم تک گرفتار نہ کیا جا سکا۔ صوبائی حکومت نے ان کی گرفتاری کے لیے دو ہزار روپیہ کے انعام کا اعلان کیا۔ انھوں نے عہد کیا تھا کہ وہ خود کو کبھی زندہ گرفتار نہ ہونے دیں گے اور اس میں وہ کامیاب بھی رہے۔ کچھ عرصے تک کانپور میں رہنے کے بعد آزاد جھانسی پہنچ گئے جہاں انھوں نے بہت سے انقلابیوں سے رابطہ قائم کیا۔ جھانسی میں ہی انھوں نے 'اچوک نشانہ' میں مہارت حاصل کی اور وہیں ان کی ملاقات سردار بھگت سنگھ سے ہوئی اور ان کے دست راست بن گئے۔ آزاد کو گرفتار تو نہ کیا جا سکا لیکن اپنے تقریباً تمام قریبی ساتھیوں سے بچھڑنے پر وہ یکہ و تنہا رہ گئے۔

الہ آباد میں ایک دن جب وہ الفریڈ پارک میں بیٹھے تھے پولیس کے ایک مخبر کی اطلاع پر یکایک پولیس کے ایک دستے نے ان کو گھیر لیا۔ آزاد پر پوری صورت حال واضح ہو گئی اور ان کو یقین ہو گیا کہ اب وہ یہاں سے نکل نہ پائیں گے۔ انھوں نے پستول سنبھال لیا اور دونوں طرف سے گولیوں کی بوچھار ہونے لگی۔ یہ سلسلہ تقریباً ایک گھنٹہ تک جاری رہا۔ کہتے ہیں کہ ان کے پاس جب صرف ایک گولی رہ گئی تو انھوں نے پستول اپنی کنپٹی پر رکھ کر داغ دیا۔ اس طرح وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے زندہ جاوید ہو گئے۔ پولیس نے ان کی لاش ان کے خاندان والوں کو نہیں دی بلکہ خود ہی ان کا کریا کرم کیا۔ شریمتی کملا نہرو اور راج رشی پرشوتم داس ٹنڈن کو کسی طرح اس کا علم ہو گیا۔ انھوں نے بنارس میں پنڈت شیو ونائک مصرا کو مطلع کیا۔ مصرا جی کے تشریف لانے پر ان کی استھیوں (راکھ) کو اکٹھا کر کے ہندو مذہب کی رسم کے مطابق دوبارہ سنسکار کیا گیا۔ پھر استھیاں مصرا جی اپنے ہمراہ لے گئے جنھیں وہ انقلابی جلوس میں اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ بعد میں انھوں نے ان استھیوں کو ایک ٹرسٹ کے سپرد کر دیا تھا۔ حال ہی میں ۱۱ر جولائی کو وزیر ریاست شری کلیان سنگھ، شری سچیندر ناتھ بخشی اور شری رام کرشن کھتری (جو کاکوری کیس میں شامل تھے) کی کوششوں سے ان استھیوں کو ایک کلس میں رکھ دیا گیا تھا جہاں سے اس کو چنار، مرزاپور، رائے بریلی، الہ آباد، اوریّا، جھانسی، کالپی، کانپور، بدرکا (اناؤ) ہوتے ہوئے لکھنؤ لایا گیا۔ یہاں وزیر اعلیٰ نے اس کا خیر مقدم کیا اور جلوس کی شکل میں خاص خاص راستوں سے ہو کر کلس بیلی گارڈ شہید اسمارک اور امین آباد کے عام جلسے میں لے جایا گیا۔ آخر میں اس کو ریاستی میوزیم میں رکھ دیا گیا۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ آزاد کا پستول جو انگلینڈ سے منگائے جانے کے بعد لکھنؤ کے ریاستی میوزیم میں رکھا ہوا تھا اس کو حال ہی میں الہ آباد میوزیم کی تحویل میں دے دیا گیا ہے۔

— ایڈیٹر

آوارہ

آگ کا کھیل

برس ساٹھ ایک کی پیٹ میں، بلند قامت، گٹھا ہوا جسم، بھرا بھرا چہرہ، کھچڑی داڑھی، ہاتوں کی کھال جیسے کیمخت، کہیں کہیں پھٹی ہوئی گندھک کی بو میں بسی میلی چکٹ خوچی پہنے، پیڑھیوں کے کاریگر میاں مدار آتش باز، دکان کے آزو بازو دیوار کی کھونٹیوں پر بانس کی کھپانچیوں پہ منڈھے کاغذ کے پتلے، تلے کے ڈنٹے ڈھانچے، پرانی چرخیوں کے چکر اور نمونے کے لیے چھوٹے بڑے چھوٹے ہوئے انار، ناشپال تلے اوپر۔ آپ کو دیکھا، بھانپ گئے کہ آیا گاہک۔

"آیئے ادھر آیئے۔ یہ کس عطائی کو بیعانہ دے رہے تھے آپ! چار چھچھوندروں کی نقلیں لے کے بیٹھ گئے، کیا نام کہ سجا لی دکان، بن گئے آتشباز۔ کوئی پوچھے میاں، کتنے وزن جانتے ہو دارو کے تت ــــــ ہیں! دارو کے نام پہ آپ نے ناک سکیڑلی حضور، آتشبازوں کی بولی میں بارود کو دارو کہتے ہیں۔ پہلے مجھ سے سودا کیجیے، پلٹ کر ان سے پوچھیے کیا نام کہ دارو کسے کہتے ہیں؟ بزرگوں کے نام پہ کان کو ہاتھ لگا کے، خاک چاٹ کے کہتا ہوں بغلیں جھانکنے لگیں گے۔ تو وجہ کیا، دلی کی لال حویلی کے میر آتش کلن خاں کے نام لیوا تو ہیں نہیں۔ باوا ساگ بھاجی بیچتے تھے جیسے دیکھا ویسی ہی ان کے سپوت نے لے لیا نپیں سرکار سے اور کھول بیٹھے دکان آتش بازی کی، کیا نام کہ وہی مثل ہے کہ [illegible] بڑا، کھول کے دیکھو تو آدھا بڑا خود یہ آگ کا کھیل بچوں کے کھیلنے کا نہیں ہے۔ بڑی کتاب کی قسم دے کے پوچھیے جو اڑن گولے کا نام بھی سنا ہو۔ بہت کہیں گے تو یہی کہ شورہ گندھک اور کوئلہ ملا کے پیسا اور گولے میں بھر کے داغ دیا۔ تو وجہ کیا؟ اناڑی سے پوچھیے ان مسالوں کا وزن۔ تو بغلیں جھانک رہے ہیں۔ حضور اڑن گولے بناتے تھے کیا نام کہ اللہ بخشے دادا کلن نے۔ بھگدر کے وقتوں ناریل کے خول میں بارود بھر کے لوہے کے نکیلے ٹکڑے ملائے۔ گولہ چلا، جس کے چھو بھی گیا، چیتھڑے اڑا دیئے۔ اب نمائش کے لیے اگن گولے میں بھی بناتا ہوں۔ ہری لال، نیلی اودی پٹاس کی گولیاں بارود میں ملاتا ہوں۔ گولہ پھٹتے ہی رنگ برنگے پھول ہوا میں بکھر جاتے ہیں۔ چمن کھلا دکھائی دیتا ہے۔ ایسے گولے کو تارہ ماشہ چھتہ ہوائی اور کیا نام کہ گولہ ہفت رنگ بھی کہتے ہیں۔

ایک بات کہوں، برا نہ مانیے گا، اللہ پاک کا دیا پیسے کا کال نہیں، پر شوقینی کا توڑا ہے۔ وہ دن ہوا ہو گئے جب دو دو چار چار ہزار کی آتش بازی دلہن کے دروازے پہ دھواں ہو جاتی تھی۔ اب تو برات چڑھی بشگن کے لیے چار چھ ناشپال، دو چار ہوائیاں چھٹ گئیں۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ شبرات کے وہ ٹھٹھے، وہ دھوم دھڑکے خواب ہو گئے۔ رئیسوں کی ڈیوڑھی میں ٹوکرے بھر بھر کے مال جاتا تھا۔ دیوالی آئی تو بچوں کو بہلانے کے لیے دھیلی آٹھ آنے کی پھلجھڑی پٹاخے لے دیئے، چلیے تیوہار منگیا۔ مجھے اب کس برتے پہ باپ دادا کے نسخے نکالیں، اور کیا نام کہ کانٹے پہ تول تول کے مسالوں کا وزن ملائیں۔ دیکھنا ہو تو چار قدم بڑھا کے غریب کے [illegible]

میاں دیکھئے آتش بازی کے کیسے کیسے عجوبہ نمونے رہے ہیں۔

شادی کی شوبھا بنانا ہو پسند کیجئے، حکم دیجئے، تیاری کا سامان کر دوں۔ دیکھئے یہ آتشی انار ہیں۔ شتابہ دکھاتے ہی انار نے آگ پکڑی، پھولوں کا سرو بن گیا۔ بارود میں ناپ جوکھ کر پٹاس کی پٹ اور لیموں کی چٹکی دے دی یہی آتشی انار ستارے بکھیرتا ہوا ہوا میں اڑ گیا۔ اور لیجیے یہ ہے اگن چرخ۔ استاد لوگ اسے اگن پنکھ بھی کہتے ہیں۔ بانس کی پوریں کاٹ کے تیز وزن کی بارود بھری۔ پلیتے سے ایک دوسرے کو جوڑ دیا۔ شتابہ دکھایا۔ بارود کے زور سے چرخ کیلی پر گھومنے لگا۔ حکم ہوگا اسی چرخ کو جوگلا، موتی دریا، جگنو یا نوچندہ بنا دوں گا۔ میری ایک بات مانیں تو میاں اگن چادر ضرور بنوائیں۔ نہ اس عدار شہر میں بنانا تو کیا، اگن چادر کا نام بھی کوئی نہ جانتا ہوگا۔ پرکھوں سے سنا لکھنؤ میں کیا نام کہ بیرو لی نے بیٹے کی سوگنی میں اور دلی میں فرخ سیر بادشاہ نے شجاع الدولہ کی شادی میں بنوائی تھی۔ بل بل جائیے ان کے ناؤں کے سونے کی ہزار مہریں اور تین پارچے کا خلعت بخشا تھا۔ آپ ہیں تو کہتا ہوں پاسوز کا نام سنا ہوگا؟ اگن چادر کے سامنے کا بڑا جز یہی ہے۔ ادھر شتابہ دکھایا ادھر اندھیاری رات میں سنہری چادر چمکنے لگی۔ مسالے میں ذرا پھیر بدل کر دیا یہی چادر روپہلی ہوگئی۔ چاروں طرف چاند نکل گیا۔ سو پچاس ہتابیاں چھڑوائیے، برات کی برات چمک اٹھے۔ کچھ چندر مکھی ہوں، کچھ سورج مکھی۔ اور یہ دیکھئے دو کھنڈا اور سنگھاڑہ پٹاخوں کی دولڑیاں لٹک رہی ہیں۔ اس دو کھنڈے پٹاخے کا گن یہ ہے کہ شتابہ لگتے ہی تڑاق پڑاق، ایک آواز زمین پر، دوسری اڑ کے ہوا میں۔ البتہ ختنگے بنانا چھوڑ دیے ہیں۔ ایک آدھ بار اس بات کا ختنگا چھوڑا گیا۔ پروائی چل رہی تھی راس نہیں آئی۔ ختنگے کا رخ مڑ گیا اور ترچھا اڑ کے شہر آبادی سے ذرا دور کسی گاؤں کے چھپر پہ گرا۔ آگ لگ گئی اور سارا گاؤں جل کے بھسمنت ہوگیا۔ اسے ہوائی بھی کہتے ہیں۔ اس پر کسی نے شعر بھی بنائی ہے ؎

کون کہتا ہے کہ ہم تم میں جدائی ہوگی
یہ ہوائی کسی دشمن نے اڑائی ہوگی

کسی کسی استاد کی زبانی شور دار اگنی بان بھی سنا ہے۔ پرانے زمانے میں اگنی بان چلا کے دشمن کے مورچے پھونک دیتے تھے۔

خوب یاد آیا۔ برتیوں کی چہل دیکھنا ہو دو چار درجن بچھو بھی بنوائیے۔ کاغذ کی تیلی نلکی میں خاص دم کی بارود بھر کے موڑتے ہیں اور جلیبی بنا کے اوپر سے تیلی جھلی منڈھ دیتے ہیں۔ دلگی دیکھنا ہوئی۔ بچھو کا منہ کاٹا اور آتش پر کالا دکھا دیا۔ پھر دیکھئے ناچا ناچا پھرتا ہے۔ ادھر گیا ادھر گیا، چائیں مائیں کھیلنے لگا۔ اچانک پلٹ پڑا۔ مجمع میں بھگدڑ پڑ گئی۔ بچھو جلیبی کی صورت کا گول ہوتا ہے۔ اور چھچھوندر لانبی قلم کی شکل۔ اسے چکا بھی کہتے ہیں۔ اور کیا نام کہ آخیر میں رہ گیا قلعہ۔ اس کے ٹھاٹھ کا نمونہ دیکھیے دو لٹک رہا ہے۔ بانس کی کھپاچیوں سے اس کا ڈھانچہ بنا کر الگ الگ وزن اور دم کی بارود کی نلکیوں اور خولوں میں بھر کے پورے ڈھانچے پہ تانت کے ریشوں سے باندھ دیتے ہیں۔ نلکیاں اور خول بارود چڑھے ڈورے سے جڑے ہوتے ہیں۔ ادھر آپ نے شتابہ دکھایا، نلکیاں روشن، اور قلعے کے پورے ڈھانچے پہ چراغاں ہوگیا۔

بس میاں۔ اس وقت آتش بازی کے جو دو چار نمونے پڑے تھے دکھا دیے۔ آپ کو نیا مال دوں گا۔ کیا کیا بناؤں گا یہ مجھ پہ چھوڑیے اور ڈھنڈورا پٹوا دیجیے کہ اس برات میں کیا نام کہ مدار آرکے ہاتھ کی آتش بازی چھوٹے گی۔ سارا شہر نہ ٹوٹ پڑے تو ہاتھ قلم کرا دوں۔

★

جگن ناتھ آزاد

غزل

اسی نے آ کے مجھے اذنِ رہنمائی دیا
عجیب سایہ تھا ظلمت میں جو دکھائی دیا

یہ اور بات کہ ہمعصر مجھ کو سُن نہ سکے
وگرنہ میں تو ہر اک دَور میں سُنائی دیا

ابھی تک اُس کو مرے پاؤں یاد کرتے ہیں
وہ جس نے عزم کو ذوقِ شکستہ پائی دیا

ہمالیہ کی طرح تھا میں ان زمینوں پر
عجیب لوگ تھے جن کو نہ میں دکھائی دیا

مہکتے پھول کی خوشبو کہاں کہاں نہ گئی
انھی نے مجھ کو بھی احساس خودنمائی دیا

بغیر چہرہ تو تھے بے ضمیر لوگ بھی تھے
نہ اپنا نالۂ ماتم جنھیں سنائی دیا

کہاں گئی مری خلوت کی زندگی آزاد!
یہ کس خلش نے مجھے دردِ آشنائی دیا

نجم الدین شکیب

سیّد رشید احمد

غالب کا شعر ہے:

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

زندگی کا قافلہ رواں دواں بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ ہم اس سفر میں بے اختیار ہیں۔ اپنے نزدیک ہم اپنے ہر قدم کو سمت دیتے ہوئے چلتے ہیں، لیکن ہمیں خود فریبی ہی ہماری تقدیر ہے۔ شاید ہی کبھی ایسا ہو کہ ہمارے قدم ہماری آرزو کا احترام کریں۔ اکثر ہمارے سفر کا ماحصل شکست آرزو کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ لیکن آرزو کی شکست ہی میں تازہ آرزوؤں کی تخلیق کے جراثیم چھپے ہوئے ہوتے تھے۔ اس کھونے اور پانے کے درمیان اتنا وقت بھی نہیں ہوتا کہ ہم لمحۂ گزشتہ کی ناکامی کا جی کھول کر ماتم کر سکیں ؎

رفتم کہ خار از پا کشم، محمل نہاں شد از نظر
یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد

اگر احساسِ غم کی شدت ہمارے پیر کی زنجیر نہ بن جائے اور ہم سینہ کوبی کے لیے دم بھر ٹھہرے تو آرزو کی بازیابی کا سلسلہ ختم ہو کر ہم کو جمود کے قعرِ عمیق میں گرا دیتا ہے۔ یہاں سے نکلنا توفیق کی ارزانی پر منحصر ہے۔ سنتِ الٰہی کا فیصلہ ٹھہرنے اور مافات پر سینہ کوبی کرنے والے کے حق میں نہیں ہے ؎

یہ بزمِ مے ہے، یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

رشید صاحب نے تعلیم کے بعد اپنی عملی زندگی کا آغاز ایک پولیس افسر کی حیثیت سے کیا۔ لیکن ماحول کا جبر ان کے اندر جو فنکار چھپا ہوا تھا اُسے خاموش نہ کر سکا۔ ان کی شخصیت زندگی بھر ایک کشمکش سے دوچار رہی اور اس نے اپنی تکمیل کے لیے اسی کشمکش سے غذا اور اسی اندرونی پیکار سے آب و رنگ حاصل کیا ؎

مری اک عمرِ فانی نزع کے عالم میں گزری ہو
محبت نے مری رگ رگ سے کھینچا ہو لہو برسوں

ان کا ظاہر ایک پولیس افسر کی حیثیت سے گرمِ عمل تھا اور ان کا باطن اسی ماحول میں ایک فنکار کی ذہنی آسودگی کے سامان تلاش کر رہا تھا۔ شخصیت کی یہ تقسیم ایک ہی پیکر میں نور و نار کو سمو کر ان کے کردار کی تشکیل کی موجب ہو رہی تھی۔ یہ کشمکش ہم کو اس قتل کے مقدمہ کی روداد میں صاف نظر آتی ہے جو ثبوت کے ناکافی ہونے کے باوجود اور اس خامی کے پورے احساس کے ساتھ رشید صاحب نے فاضل جج آر۔ بی ڈیوہرسٹ کے سامنے پیش کیا تھا۔ ایک پولیس افسر کے لیے بقول رشید صاحب محکمۂ پولیس کی "شہرہ آفاق خوش فکری اور طلسم بندی" سے کام لینے کی پوری چھوٹ تھی۔ لیکن رشید صاحب نے اپنے ضمیر کی روشنی میں:

"اپنے روزنامچۂ تفتیش میں ثبوت کی خامیوں کا صاف صاف اظہار و اعتراف کیا اور لکھا کہ باوجودیکہ ملزموں کے خلاف کوئی عینی شہادت نہیں ہے تاہم موقعۂ واردات کی عام تفتیش اور قرائن کی عام شہادت سے میرا ضمیر انھیں مجرم تصور کرتا ہے۔ اس لیے

میں اس ٹوٹے پھوٹے ثبوت ہی پر انھیں عدالت کے عدل و انصاف کے سپرد کرتا ہوں۔ عدالت ان کو ثبوت کی خامیوں کی بنا پر رہا کر سکتی ہے۔" (ڈیو ہرسٹ)

"یتیم بھوج" اور "ہمارا تاج محل" میں فنکار اپنے لطیف احساسات کے ساتھ ایک پولیس افسر کے بھیس میں رواں دواں نظر آتا ہے۔ فرائض اسے مقدمہ کی تفتیش پر مجبور کرتے ہیں، وہ پولیس کی روایتی ڈگروں پر چلتا بھی ہے۔ لیکن اندر بیٹھا ہوا فنکار خاموش نہیں ہے اسے مقدمہ کی روایتی ترتیب سے بہت کم لیکن مقدمہ کے اہم کرداروں سے بہت دلچسپی ہے۔ وہ انھیں اپنے ذہن کے پیمانوں سے ناپتا ہے اور ان قدروں کی کھوج میں سرگرداں ہے جو خود اُسے عزیز ہیں۔ رشید صاحب ملازمت سے سبکدوش ہو گئے لیکن یتیم بھوج کو نہ بھولے اور اپنی سبکدوشی سے کافی دنوں کے بعد اخبار میں ان کا نام پڑھ کر ایک عام شہری کی حیثیت سے پھر لکھنؤ آئے۔ اب ملزم ان کا دوست تھا۔ اب ان کو اس کے جرم سے نہیں (اگر وہ کوئی تھا بھی) اس کی شخصیت سے دلچسپی تھی۔ اس کی شخصیت کے جو نقوش رشید صاحب نے اپنے مضمون میں ابھارے ہیں، وہ ایک لائق پولیس افسر کا نہ صرف نہیں ہیں بلکہ ایک فنکار کی جنبش قلم کا شاہکار ہیں۔ وہ تصویر کشی تو بیر برج کے کردار کی کر رہے ہیں لیکن دراصل یہ اپنے کو پا لینے کی ایک کوشش ہے۔ ان قدروں کی نقاب کشائی ہے جو خود فنکار کو عزیز ہیں۔ رشید صاحب بیر برج کی زبان سے کہتے ہیں:۔

"میں ایک آزاد منش، خوددار اور بے پروا انسان ہوں"

دوسری جگہ بیر برج اپنے فلسفۂ حیات کی تشریح کرتے ہوئے کہتا ہے:

(مصائب) کا "تمام تر تعلق انسان کے احساس و ادراک سے ہے وہ غم میں بھی نشاط اور قید و بند میں بھی آزادی کے تصور کا خلاق بن جاتا ہے":

ہمارا "تاج محل" کا ہیرو جالمس بھی رشید صاحب کی طرح اصول کے جبر کا شدید احساس رکھتا ہے۔ وہ فوجی ڈسپلن کے آہنی شکنجہ میں جکڑا ہوا ہے۔ لیکن باہر کی تازہ ہوا حاصل کرنے کے لیے اپنے ذہن و دماغ کے دریچے کھلے رکھنا چاہتا ہے۔ اس نے انسانیت کو اپنی زندگی کے تشخص کے لیے ایک قدر کے طور پر اختیار کیا ہے۔ اپنی جہاں گردی کے سلسلے میں وہ لکھنؤ میں جس حادثہ کا شکار ہوا، اس نے اسے اپنے فلسفہ کی عملیت کے امتحان کا پورا موقع دیا۔ ۱۹۴۲ء کی تحریک آزادی کا ہندستان بغاوت کے لاوے سے تپ اور بھڑک رہا تھا۔ گاندھی جی کے فلسفہ میں انگریز دشمنی کی گنجائش نہ تھی۔ لیکن اوسط درجہ کا تعلیم یافتہ ہندستانی سماج انگریز کو معاف کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ جالمس عیسائیت کی گود میں پلا اور بڑھا تھا۔ اس لیے اس کو گاندھی جی کے فلسفے کی جہانگیری پر یقین، ہندستانیوں سے کہیں زیادہ تھا، جو گاندھی جی کے بھگت ہونے کے باوجود ان کے پیرو نہ تھے۔ جالمس نے ایک ہندستانی دیوانہ کے ہاتھ سے گولی کھائی لیکن اس نے اپنی روح کی عظمت اس یقین کے سہارے قائم رکھی کہ مجرم کو اپنی غلطی کا احساس ضرور ہوگا۔ رشید صاحب کے الفاظ میں "وہ اکثر بڑبڑا کر خود کہنے لگتا:

"اس غریب سے نہ معلوم کس وحشت اور جنون کے عالم میں اضطراری طور پر یہ فعل سرزد ہو گیا ورنہ کسی سمجھدار اور صحیح الدماغ شخص کا یہ فعل ہرگز نہیں ہو سکتا۔ جب کبھی ٹھنڈے دل سے اُسے اپنے اس فعل پر غور کرنے کا موقع ہوا تو خود اس کا ضمیر یقیناً اسے ملامت کرے گا۔" اور وہ اپنی روح کی تسکین و نجات کے لیے ایک نہ ایک دن خود پردے سے باہر نکل کر اپنے جرم کا اقرار و اعتراف کرے گا":

جالمس کا اندازہ غلط نہ تھا اس کی یہ پیش گوئی پوری ہوگی۔ ملزم اپنے ضمیر کے کچوکے نہ سہہ سکا اور اپنے پاؤں چل کر مجرم کے کٹہرے میں کھڑا ہوا۔ پولیس افسر کے اندر جو فنکار چھپا ہوا تھا۔ وہ جالمس سے ہم آہنگ ہو چکا تھا۔ اس نے وہ سب کچھ کیا جو ایک فرض شناس پولیس افسر کو کرنا چاہیے تھا۔ لیکن اب اس کا ضمیر جالمس کے درد دل کا امین تھا۔ جالمس کا درد اب اس کا درد تھا یا یوں کہیے کہ اب وہ خود جالمس تھا جو پولیس افسر کی وردی میں ملزم کو جالمس کا نہیں خود اپنا خون معاف کر رہا تھا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں انسانیت [illegible] کی حدوں کو توڑ کر ایک ہمہ گیر اور اٹوٹ رشتے کا احساس کرتی ہے۔ وہ رشتہ

جغرافیہ، رنگ و نسل اور ملک و وطن کی حدود سے کہیں بلند، لیکن سب کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے، کبھی فلسفی کے ادراک کو اپنا تمام جلوہ دکھاتا ہے اور کبھی شاعر کی تخیل میں اس کی ایک کرن چمکتی ہے اور کبھی کوئی پیغمبر اس کی رہنمائی کے لیے [illegible] اور فاران کی بلندیوں کی طرف اشارہ کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

انسانی اعمال کے اسی نقطۂ عروج کا جو سماج شکنی اور انسان دشمنی کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے، ہر پولیس افسر کو سابقہ پڑتا ہے۔ پولیس افسر کے فرائض اور اس کی جنگ و دوکا میدان ہی وہاں سے شروع ہوتا ہے، جہاں شہریت پارہ پارہ اور وحشت خیز کیفیت نظر آتی ہے۔ لیکن کتنے پولیس افسر ایسے ہیں جن کو مجرم سے زیادہ اس کھوئے ہوئے انسان کی تلاش ہو، جس کے بغیر جرم آزاد اور انسانیت پا بہ جولاں ہے۔ اس انسان کا نشیمن بھی، انھیں انسانی اجسام کے حدود اربعہ میں ہے۔ اس کی تلاش دشوار سہی لیکن اگر صید افگنی کا ہنر آتا ہو تو ؎

ہمہ آہوان صحرا سر خود نہادہ بر کف
بہ امید آنکہ روزے بہ شکار خواہی آمد

رشید صاحب کا مضمون "حسو خاں" کردار نویسی اور مرقع کشی کا نادر نمونہ ہے۔ رشید صاحب کے حافظہ اور ان کے ذوق کی تعریف کرنا پڑتی ہے کہ انھوں نے حسو خاں کو اتنے طویل عرصے تک اپنی تمام خصوصیات کے ساتھ محفوظ رکھا ہے۔ حسو خاں ایک فرد نہیں ہیں ایک عہد ہیں جو رشید صاحب کے الفاظ کا جامہ پہن کر شاہی محلسرا کے تمام ہنگاموں کو، اس [illegible] اور سرمستی کے ساتھ جگا کر اپنے ساتھ لے آتے ہیں۔ "داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی" یہ شمع ان محفلوں سے کب کی دور کر چکی ہے۔ جن کو اپنے ادبار کے دور میں بھی آنے والی ظلمت کے تصور کا بھی ہوش نہ تھا۔ حسو خاں لوٹ کر پھر اس صحبت شب میں شریک نہ ہو سکے لیکن وہ اپنے تصور کے مو قلم سے اس دور کی تصویر اس طرح کھینچتے ہیں:

"شب ماہ میں کنار چمن بیگمات کے گل گشت" "نے وہ خرام ناز جس سے موسیقی کے بہترین نغمات سیکھے جاسکتے ہیں اور نہر سیمیں پر چاند کی شفاف روشنی کے انعکاس کا وہ طلسمی نظارہ، ایسا معلوم ہوتا کہ موتیوں کو سنہری شراب میں حل کر کے فرش مرمریں پر پھیلا دیا گیا ہے اور چاند نے اپنی تجلی سے سارے عالم کو غرق نور کر دیا اور فطرت اس دریائے نور میں نہا نہا کر نکھر رہی ہے۔ نہر کے پانی پر کنول اور اس کے مست قطرے [illegible] اس طرح پڑے لوٹ رہے ہیں جیسے کسی پری کا ہار ٹوٹ کر سطح آب پر بکھر گیا ہو۔"

حسو خاں نے جاگیرداری کی چھاؤں میں اس وقت آنکھ کھولی جب شمع طرب اپنی آخری سانسیں پوری کر کے سرمایہ داری کے ابھرتے ہوئے آفتاب کو آخری سلام کر کے رخصت ہو رہی تھی۔ حسو خاں بادۂ شبانہ کے نشہ میں اتنے چور تھے کہ انقلاب کا سویرا ہو جانے کے بعد بھی، انھیں ہوش نہ آیا تھا۔ اس وقت بھی دربار کی رنگ رلیاں اور محلسرا کی عطر بیز بہاریں ان کے تصور کو دعوت خرام دے رہی تھیں۔ یہ رشید صاحب کا کمال ہے کہ انھوں نے حسو خاں کی روح میں سما کر ان کے تصور کے وہ سب رنگ اڑا لیے۔ جو حسو خاں کے گزر جانے کے بعد بھی ان کے شہپارہ میں تر و تازہ ہیں۔

حسو خاں کے پردے میں رشید صاحب نے اس وقت کے جاگیرداری سماج کے دور آخر کی بہت کامیاب عکاسی کی ہے اور ان تمام طبقات کو ایک ساتھ اسٹیج پر لے آئے ہیں، جن کے بغیر اس سماج کی تصویر مکمل نہیں ہوتی۔ اس خاکے میں رنگ بھرنے میں رشید صاحب کی موسیقی سے واقفیت بھی کام آئی ہے اور وہ تجربہ بھی یقیناً کام آیا ہے جو بحیثیت پولیس افسر، ان طبقات کے سابقے میں ان کو حاصل ہوا ہے۔ ایک صاحب قلم کے لیے جس کا اسلوب بیان کتنا ہی رنگین کیوں نہ ہو، بزم نشاط کی یہ مرقع کشی، اسی علم، بصیرت اور اشخاص سے واقفیت کے بغیر ممکن نہ ہوتی۔ یہ چھوٹا سا مضمون ان طالب علموں کے لیے مشعل راہ کا کام دے گا جو اس وقت کے سماج کے اس رنگین پہلو پر تحقیق کا قلم اٹھائیں گے۔

[illegible] اور دیگر پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن طوائفات کے

اس انبار میں وہ عناصر نہیں ملتے جن سے ان کی شخصیت ابھرتی ہو اور ان کی نفسیات کے پیچ و خم اپنی پوری خصوصیت کے ساتھ سامنے آتے ہوں۔ لکھنے والوں نے اصغر کو فرشتہ اور جگر کو بچوں کی طرح معصوم تو ثابت کر دیا ہے لیکن ان باتوں سے انسانیت کی سطح پر ان کے صحیح مقام کے تعین میں مدد نہیں ملتی اور نہ یہ سمجھ میں آتا ہے کہ اصغر اتنے بلند قامت اور جگر اتنے معصوم کیوں ہوئے؟

پولیس کے محکمے میں، جہاں رشید صاحب نے اپنی عملی زندگی کا بڑا حصہ گزارا تھا، ایسے کرداروں کے مطالعے کا بہت اچھا موقع ملتا ہے جو یا تو عام سطح انسانی سے بہت بلند ہوتے ہیں یا بہت پست۔ ایسے افراد بھی یقیناً ان کے مطالعے میں آئے ہوں گے جو اگرچہ عام سطح انسانی کے متوازی چلنے کے مدعی ہوتے ہیں، لیکن پیروں کی ڈگمگاہٹ ان کو کبھی اپنے جسم و جان کی طہارت کا پورا یقین نہیں ہونے دیتی۔ یہی وہ افراد ہیں جو انسانیت کے ابھرنے اور گھٹنے کے لیے مثبت اور منفی اقدار متعین کرتے ہیں۔ یہی سواد اعظم ہیں۔ اصغر اور جگر دونوں کا اسی سواد اعظم سے تعلق تھا۔ اصغر کی مروت اور شرافت نے ان کو اپنے دوست ریلوے بابو کے رنگ پر چلایا۔ لیکن ان کو اپنی فطرت کی نشو و نما کے لیے وہاں کی آب و ہوا راس آتی ہوئی نہ معلوم ہوئی۔ اصغر کشاں کشاں اسی ڈگر پر چل پڑے تھے لیکن ضمیر جو زندگی شخصیت کی تعمیر میں بڑا مثبت کردار ادا کرتا ہے، اس فضا میں گھٹن محسوس کرتا ہوگا۔ رشید صاحب نے اپنے مضمون اصغر میں کتنی اچھی بات لکھی ہے:

"زندگی کا حق ادا کرنے میں سب سے پہلے خود آگہی لازم ہے۔ انسان خود اپنی زندگی کا کارساز ہے۔ زندگی میں توانائی خود اپنے زور بازو سے آتی ہے۔ انسان کا ظرف خود اپنی ہمت پر موقوف ہے اور دنیا سے وہ خود بقدر ظرف مستفید ہوتا ہے۔"

اصغر کی خود آگہی نے انھیں اصغر بنا دیا اور انھوں نے بقول رشید صاحب:-

"خدمت علم و ادب اور انسانیت کو اپنا گو ہر مقصود بنایا جس سے بڑھ کر انسان کے لیے کوئی اور شرف نہیں۔"

اصغر نے اپنے ذہن اور عمل کی تنگنائے سے نکل کر روایتی خیال بندی کے بندھے ٹکے ظرف کو توڑ کر:-

"احساس جمال کو حیات اور کائنات کے سمجھنے کے لیے بطور قدر استعمال کیا۔"

جگر کا خمیر جس مٹی سے اٹھا تھا وہ اس سے بہت مختلف تھی، جس سے اصغر بنے تھے۔ لیکن جگر کے شعری تجربات میں انفرادیت تھی اور خلوص نے ان کے نغمات میں تاثیر پیدا کر دی تھی۔ ان کے اشعار شکست دل کی جھنکار تھے۔ غالباً اصغر کو ان کو اس شکستگی ہی کی وجہ سے ان سے دلچسپی پیدا ہوئی اور انھوں نے کوشش کی کہ یہ لاابالی نوجوان جو شعری صلاحیتوں سے معمور ہے، فکر و فن کے میدان میں اپنا مقام متعین کر سکے۔ رشید صاحب اپنے مضمون "اصغر" میں لکھتے ہیں:

"دنیا میں سوا انسان کے ہر چیز اپنا مخصوص اور متعین مقام رکھتی ہے۔ مگر انسان خود اپنا مقام پیدا کرنے کا ذمہ دار ہے۔ اس کا تمام شرف اپنے مقام کی تخلیق و تعمیر ہی میں مضمر ہے۔ اس کا مطالعہ اور مشاہدہ، اس کی ریاضتیں و مجاہدہ، اس کی فکر و نظر اور اس کا تزکیۂ نفس، سب اسی مقصد کے حصول کے لیے ہوتا ہے کہ وہ اپنے مقام کو معلوم و متعین کر سکے۔"

یہ اصغر کا احسان ہے کہ جگر عوام کے "چہیتے مغنی" کی سطح سے ابھر کر خواص کی بزم سخن میں بھی بڑے شاعروں کے ہم پلہ قرار پا سکے۔ جگر نے سماج اور ایوان ادب میں جو بھی مرتبہ اور اعزاز حاصل کیا وہ سب اصغر کی نگاہ فیض اثر کا کرشمہ ہے۔ جگر دلدادۂ محبت تھے۔ محبت ہی سے ان کا خمیر بنا تھا۔ یہ ان کے دل کی آگ ہی تھی جو ان کو جلا جلا کر ان کے نغموں کو آتش سیال بنا رہی تھی۔ جگر کی سرمستی میں اس کی گنجائش نہ تھی کہ وہ کوئی ڈسپلن قبول کرتے۔ وہ شراب کیا جو خط پیمانہ کی پابند رہے۔ لیکن اصغر نے اس ابلتی ہوئی آگ کو "پیار نشین" بنایا اور جگر نے ان کے سامنے ارادت کی نگاہ جھکا دی۔ جگر میں یہ کیفیت اچانک نہیں پیدا ہوئی۔ ان کے اندر سپردگی کی یہ ادا بہ یک جنبش نگاہ نہیں آئی۔ اصغر کی محفل میں جگر کو تنہائی کا احساس کچھ کم ہوتا ہوا معلوم ہوا۔ ان کو ایک ایسی نگاہ کیمیا اثر ملی جو ان کے

زخموں کو تاب کر مرہم جاں کا سامان فراہم کر سکتے۔ نغمہ یہ سب توسب دھنتے ہیں لیکن نغمہ میں جو آگ جذب ہوتی ہے اس کی اہمیت اور قوت کا اندازہ کرنے والے کم لوگ ہوتے ہیں۔ نغمہ ایک راز ہے جو اہل کو دل کی گھٹن کم کرتا ہے۔ دل کی گھٹن اور نغمہ کے تعلق کو جو سمجھ لے وہی ایسے آہوئے رم خوردہ کو رام کر سکتا ہے۔ اصغر نے یہی کیا۔ رشید صاحب نے اصغر اور جگر کے گھریلو تعلقات پر جو روشنی ڈالی ہے اس سے یہ بات اب پوری طرح سمجھ میں آجاتی ہے کہ جگر کیوں اور کیسے اصغر کی تعلیم نغز کا پیوند ہو گئے۔ اور اکھڑنے کے بعد پھر کہیں اور جم نہ سکے اور مرہم جاں کے لیے آخر میں ان کو اصغر ہی کا گوشۂ داماں تلاش کرنا پڑا۔

رشید صاحب اپنی زندگی کا بظاہر کارآمد حصہ ٹوکر پولیس کی خدمت میں گزار کر تھکے ہارے گھر لوٹے تھے۔ ان کی وایسی اس نبرد آزمائی دانشمندی تھی، جو فتح و شکست کے احساس سے بے نیاز ہو کر اپنے جوڑ جوڑ سے بیتی ہوئی کشاکش کی روداد سنتا ہے اور اکتا گئی اس گراں جانی سے نجات پانے کے لیے ان گلیوں میں جا نکلتا ہے، جہاں لڑکپن اور جوانی نے ایک دوسرے سے ہاتھ ملا کر اسے نبرد حیات کے سپرد کیا تھا۔

شہروں کی فلک نشینی رشید صاحب کی دسترس سے اونچی نہ تھی۔ لیکن انھوں نے زندگی کی جدلیت کے طویل تجربے کے بعد شہروں کے ہنگاموں کے مقابلے میں، مادر وطن ہی کے دامن میں سکون کی جستجو کی اور اودھ سرائے (فیض آباد) میں" فراغتے و کتابے و گوشۂ چمنے" کی فضا استوار کر بیٹھ گئے۔ مضامین کا یہ طویل سلسلہ، جو رشید صاحب کی سبکدوشی کے بعد اہل نظر کی ضیافت طبع کا موجب ہو چکا ہے، اپنی بازیابی اور اپنے کھوئے ہوئے تشخص کو متعین کرنے کی بڑی اچھی اور مفید کوشش تھی، جس کی توفیق زندگی کی بھول بھلیاں میں کھو جانے کے بعد بہت کم لوگوں کے نصیب میں آتی ہے۔ رشید صاحب خوش نصیب تھے کہ ان کو سبکدوشی کے بعد کی زندگی کو کارآمد بنانے کا سلیقہ آیا

این سعادت بزور بازو نیست

تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

رشید صاحب کے قلم سے جو مضامین نکلے ہیں وہ تاثراتی بھی ہیں، مقصدی بھی اور "مکاناتی" بھی۔ ان کی زندگی کے بہت سے تجربے ایسے ہیں جو ان کی افتاد طبع کی وجہ سے ان کے لیے مخصوص تھے۔ ان تجربوں نے ان کے دل میں جو احساسات جگائے وہ ان کی فطرت کی نقاب کشائی کرتے ہیں۔ ہم ان کی تہوں میں جھانک کر اس انسانیت کا نظارہ کر سکتے ہیں، جس کے احساس سے نہ جینے والی زندگی بھی جینے کے لائق بن جاتی ہے اور نامرادی کے اس خلا میں بھی زندانی کا احساس کم ہو جاتا ہے ؎

مومن، یہ عالم اس صنم جانفزا کا ہے

دل تنگ گیا جہانِ سراسر خراب میں

رشید صاحب کے ان اصنام جاں فزا نے ان کے وطن فیض آباد کے خزف ریزوں کو دُرِّ تاب بنایا ہے۔ اجودھیا اور فیض آباد کی زمین اتنی شوق انگیز ہے جتنے متھرا اور بندرابن کے سبزہ زار شور انگیز ہیں۔ اجودھیا کی زمین پر عشق و وفا، دلداری و دلبازی اور جاں نثاری جاں سپاری کے جو ڈرامے تاریخ نے کھیلے ہیں انھوں نے ہندستانی سماج کو ان قدروں سے روشناس کیا جن کے سہارے ہم بین اقوامی برادری کے سامنے سربلند اور اپنی روحانی عظمت میں منفرد نظر آتے ہیں۔ تلسی داس نے سرجو کے کنارے جو جام آتشیں نوش کیا تھا۔ اس نے نغموں میں ڈھل کر دنیا کے ادبیات عالیہ میں بڑا مقام پایا۔ اور اسی کی بدولت ہندستانی کا روحانی حسن لازوال ہے اور اس کی سماجی ادائیں اپنی آبرومندی اور دل فریبی میں رہتی دنیا تک مثال بنی رہیں گی۔ رشید صاحب کو اپنے وطن عزیز کی تاریخی عظمت کا احساس تھا۔ یہی احساس ان کو دھائی "شار اور دوسرے ہندو مسلمان ادیبوں، شاعروں، فلسفیوں اور سنگیت کاروں کے آستانوں تک لے گیا۔ انھوں نے اپنے ماحول میں جو کچھ سنا اور پایا اسے من و عن قبول نہیں کیا بلکہ ایک پولیس افسر کی حیثیت سے تلاش و جستجو اور جرح و قدح کا جو ملکہ انھیں حاصل ہوا تھا اس سے علمی تحقیق کا کام لیا۔ علاءالدین شاہ اودھ نشاران کی خاص دریافت ہیں، جن سے ہندستانی ادبیات میں قابل

قدر اضافہ ہوا ہے۔

سب سے آخر میں جو بات کہنے جا رہا ہوں وہ سب سے پہلے کہنے والی بات تھی۔ لیکن رشید صاحب کی شخصیت اور ان کے فن کے مطالعے میں میرے ذہن نے منزلیں جس ترتیب سے طے کی ہیں، اُن کا تقاضا یہی ہے کہ سب سے پہلے کہنے والی بات آخر میں کہوں۔ سید رشید احمد صاحب کو میں نے ادیب اور فنکار کی حیثیت سے بعد میں جانا۔ سب سے پہلے جب میں نے انھیں دیکھا تھا وہ محض ایک پولیس افسر تھے۔ حسرت کو اپنے محبوب سے گلہ تھا کہ ؎

خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

حسرت کا یہ شعر، غزل کی زبان میں برطانوی سیاست پر بڑی اچھی تنقید ہے۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ برطانوی سیاست کو جن شخصیتوں نے عوام سے روشناس کرایا، ان میں اس روایتی پولیس افسر کو اولیت حاصل رہی ہے۔ اس لیے حسرت اگر اس شعر میں اسی محبوب سے الٹی گنگا بہانے کی شکایت کر رہے ہوں، تو بات خلاف قیاس نہ سمجھی جائے۔ میں نے ایک عام آدمی کی حیثیت سے رشید صاحب کو اپنی نگاہ سے دیکھا اور قریب آنے کے بجائے دامن کشی ہی میں عافیت سمجھی تھی۔ میری یہ روش اس تجربے کی وجہ سے جو مجھے رشید صاحب کے پیشرو افسر کی خوئے صید افگنی کی وجہ سے ہوا تھا۔ اگر اس افسر کا دور انتظام زلف محبوب کی طرح کچھ اور دراز ہو گیا ہوتا تو شاید راقم الحروف یہ مقالہ پیش ہی نہ کر پاتا۔ قید و بند کے مصائب شاید انسان کی فطری نیکی سے میرا عقیدہ اٹھا کر میری رگوں سے انسانیت کا وہ رس چوس لیتے، جس سے علم و ادب اور شعر و نغمہ کو "ستاروں کے آگے جہاں اور بھی ہیں" کا احساس ہوتا ہے۔ رشید صاحب نے معاملات کا رخ کچھ اس طرح موڑا کہ مجھے "کردہ گناہوں کی سزا" اور "ناکردہ گناہوں کی حسرت" کی فکر نہ رہی۔ تھوڑے ہی دنوں میں مجھے محسوس ہوا کہ پولیس کا یونی فارم رشید صاحب کے اصل کردار کے لیے ایک حجاب کا کام کر رہا تھا۔ میری دیر آشنائی کے باوجود رفتہ رفتہ اب وہ منزل آ گئی تھی جب وہ اپنے فرائض سے چھٹی پا کر ہم سب نوجوانوں کو لے کر بیٹھتے اور جاڑے کے دنوں میں دیر تک طرح طرح کے مسائل پر گفتگو کرتے۔ اس محفل میں رشید صاحب ایک شفیق بزرگ، سرپرست اور بالغ نظر انسان کی روپ میں ظاہر ہوتے۔ سرکاری معاملات پر نہ انھوں نے کبھی زبان کھولی اور نہ ہم کو کبھی ان کے معلومات میں اضافے کا شوق دامنگیر ہوا۔

رشید صاحب رائے بریلی سے لکھنؤ آ گئے اور بار بار ملاقات کے امکانات کچھ مختصر ہو گئے۔ اسی زمانے میں سرکاری ملازمت مجھے دیوریا لے گئی۔ دو ایک سال کے بعد میں نے سنا رشید صاحب سبکدوش ہو گئے اور پھر برسوں ملنے اور ایک دوسرے کے اندر عمر کے ساتھ بڑھنے والی تبدیلیوں کو جاننے اور پرکھنے کی نوبت نہ آئی۔ ۱۹۶۸ء کی بات ہے جب آپ دوبارہ مجھے پھر لکھنؤ لایا۔ اس وقت دانش محل میں ایک مضمون نگار سید رشید احمد صاحب کا ذکر آیا اور یہ معلوم کر کے حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی کہ وہ فنکار ہم سب کے پرانے کرم فرما پولیس افسر ہی ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو اس طرح بدل دیا ہے کہ اب پولیس افسری کا جامہ ان کی شخصیت کے سامنے سمٹتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ پل بھر میں ان کی کئی سال کی زندگی سامنے آ گئی اور پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ انھوں نے ایک ہی قالب میں دوہری شخصیتوں کو بڑی خوبصورتی سے سنبھال کر رکھا تھا۔ جب تک وہ پولیس افسر رہے ان کی اصل شخصیت زیر نقاب رہی اور ملازمت کے ڈسپلن نے اس کو کسمسانے کا بھی بہت کم موقع دیا۔ اب جبکہ وہ سفر آخرت اختیار کر چکے ہیں مجھے اس کردار کی دلچسپی کا اور بھی احساس ہوا اور میں نے از سر نو رشید صاحب کی شخصیت اور ان کے فن کو سمجھنے کی کوشش کی۔

★

برسات کی رات

ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی

واہ کیا رات ہے، کیا رات ہے، برسات کی رات
آسمانوں سے برستے ہوئے نغمات کی رات

سازِ فطرت پہ یہ بجتے ہوئے آہنگ لطیف
شادیانوں کی سلامی ہے کہ بارات کی رات

جس طرح کوئی پلاتا ہی رہے جام پہ جام
بارشِ کیفِ مسلسل ہے یہ برسات کی رات

خوابِ نوشیں سے خجل نشۂ آبِ انگور
آج قدرت نے منائی ہے خرابات کی رات

کیسے یہ لطف و سرور آج نہ دوتا ہو جائے
آج کی رات ہے دلبر سے ملاقات کی رات

اک طرف ابرِ سیہ مست ہے بھیگی ہوئی شب
اک طرف گیسوئے جاناں کی مہک رات کی رات

لطفِ گل چینیِ فردوسِ تمنا، یعنی
بارشِ ابرِ کرم، مہرِ عنایات کی رات

ہمی شرچاند چوہری

آن کی فتح

(افسانہ)

رنجیت بھون کی تین منزلہ عمارت گھنی اور گنجان آبادی میں بے وجہ نہیں بن رہی تھی شہر کے باہر رنجیت سنگھ بہت بڑا رقبہ خرید چکے تھے وہیں رنجیت بھون تعمیر کرنے کا منصوبہ تھا مگر ماتا جی کو پرکھوں کی یہ جگہ پسند تھی، انھوں نے بیٹے سے کہا:

" رنجو بڑا بھاگوان استھان ہے یہ تیرے باپ کو خوب پھلا ہے وہ ادھ گزی ہاتھ میں لیے کپڑوں کی بھاری گٹھڑی کمر پر لادے دن بھر گلیوں میں آوازیں لگا کے پھرا کرتے تھے "

لے لو کپڑا۔

لٹھا

ململ

تنزیب

پیٹ بھی مشکل سے بھرتا تھا یہاں آ کر دن پھر گئے، چھوٹا سا گھر بنا [illegible] بنک میں کھاتہ بھی کھل گیا، ایک سے لاکھ ہوا اس جھونپڑے کو نہیں چھوڑوں گی جیتے جی نیا مکان بنانا ہے تو یہیں بنا اتنی بڑی فرم کا مالک یوں ہی نہیں بن گیا اسی پوتر بھومی کی دین ہے۔

بات رنجیت کے گلے اتر گئی انھوں نے یہیں رنجیت بھون کا سنگ بنیاد رکھ دیا، سوٹ کیس بنانے کا کارخانہ دور ایک کالونی میں تھا انھوں نے دفتر کرائے کے کمرے میں منتقل کر لیا تاکہ راج اور مزدور ان کے ڈر سے لگن کے ساتھ اپنے فرائض ادا کرتے رہیں اور دفتر کی نگرانی بھی ہوتی رہے، سو تو اسو مزدور جن میں مرد بھی شامل تھے اور عورتیں بھی تھا رنا سے ہر آن آگے پیچھے بھاگتے رہتے تھے۔

سیمنٹ، ریت اور اینٹوں کی ڈلیاں سروں پر رکھے وہ کڑکتی دھوپ میں چیونٹیوں کی سی لائن بنائے ہر آن رینگتے رہتے تھے مردوں کی کالی ننگی سوکھی پنڈلیوں کے لمبے بال دھول میں اٹ کر مٹیالے ہو جاتے، ان کی دھوتیاں رانوں تک اوپر چڑھی رہتیں، سانولی (رانوں) کی مچھلیاں جو نہ جانے کب سے موم بتیوں کی طرح مندی ہوئی دکھائی دیتیں عورتیں لال پیلے اور ہرے دوپٹے کمر پر لپیٹ کر خالی پیٹوں میں بھرے ہوئے پانی کو تھل تھل بولنے سے روکنے کی کوشش کرتیں، کرائے کے آفس میں چند کلرک کرسیوں پر بیٹھے فائلوں پر لکھنے میں مصروف رہتے ایک کونے میں شام لال ہیڈ کلرک کی میز تھی وہ گھومنے والی گول کرسی پر بیٹھنے کا عادی تھا کرسی کا یہ گول چکر ہی اس کا شخصی امتیاز تھا۔ باڈر کا کمرہ رنجیت سنگھ کے لیے مخصوص تھا دروازے پر رنگین پردہ لٹکتا رہتا تھا، شام لال کے سامنے فائلوں کا بے ترتیب سا ڈھیر لگا رہتا وہ کہیں کہیں بال پن سے نشانات لگاتا رہتا گھنٹہ دو گھنٹہ بعد پہلی فائلیں چپراسی اٹھا لے جاتا تو ان کی جگہ دوسری فائلوں کا انبار لگا دیا جاتا۔ رنجیت بھون کی دیواریں کئی فٹ بلند ہو چکی تھیں راجوں کے لیے بلیاں گاڑ کر پاڑھ بنا دی گئی تھی وہ پاڑھ پر اکڑوں بیٹھے کنی سے بھیگی ہوئی اینٹیں جما کر ان پر ریت ملا ہوا سیمنٹ پھیلاتے رہتے ایک دن شام لال ہیڈ کلرک نے شیو پرشاد خزانچی کے خلاف فائل پر بہت سخت نوٹ لکھا کئی بار اسے پڑھا جب پورا اطمینان ہو گیا کہ کوئی کور کسر باقی نہیں رہی تو چپ چاپ بیٹھ کر باس کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔

ن گھنٹی کی آواز پر لگے رہے، وہ کمرے میں آکر گھنٹی بجا دیا کرتے تھے۔ ان کی نغمہ ریز صدائیں فضا میں بکھرتے ہی شیام لال ضروری کاغذات لے کر باس کی میز کے سامنے پڑی ہوئی کرسی پر جا بیٹھتا۔ رنجیت سنگھ ایک کاغذ پر سرخ روشنائی سے دستخط کرتے رہتے۔ آج سب سے پہلے شیام لال نے شیو پرشاد خزانچی کی فائل میز پر رکھ دی، رنجیت نے عینک لگا کر نوٹ پڑھا بھنویں تن گئیں، پیشانی شکن آلود ہوگئی، طیش میں آکر بولے "آج ہی نکال دو گدھے کو۔" اسی دن خزانچی کو ڈسمس آرڈر پکڑا دیا گیا، شیو پرشاد منہ لٹکائے دفتر سے چلا گیا کلرکوں کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی صرف ایک دبلا پتلا بوڑھا انسان کو گدھے کے روپ میں ہانکنے پر بری طرح کڑھ گیا اور اندر ہی اندر کھولنے لگا بالکل اسی طرح جیسے ہیٹر پر بند دیگچی میں رکھا ہوا پانی ابال کھانے لگتا ہے۔

کب تک آدمی کی یہ گت بنتی رہے گی ـــــ وہ قلم دانتوں میں دبائے دیر تک اسی سوال پر غور کرتا رہا، رنجیت بھون کی دیواریں بہت اونچی کھڑی ہوگئیں پہلی منزل پر چھت ڈالنے کی تیاری ہونے لگی مغربی دیوار ایک تنگ گزرگاہ میں کھڑی کی گئی تھی۔ گلی میں ملبے کے کئی بالشت اونچے ڈھیر لگ گئے تھے۔ راستہ چلنے والے ٹھوکریں کھانے لگے۔ رنجیت نے لائٹ لگوا دی تھی پھر بھی لوگوں کو گلی پار کرنا دوبھر ہوگیا وہ روز ہی رنجیت سے شکایت کر رہے تھے، رنجیت نے شیام لال سے کہا:

"بڑے بابو ملبہ جلد ہٹانا چاہیے۔"

"میں کوشش کر رہا ہوں آج ہی کل میں راستہ صاف ہو جائے گا۔"

سڑک تک لمبی گلی چلی گئی تھی، ٹرک بہت دور کھڑا ہوتا تھا مزدوروں کے سروں پر ملبہ ڈھلوانے میں خرچ بہت آ رہا تھا۔ یہ مہم صرف گدھوں ہی سے سر کرائی جا سکتی تھی شہر میں جگہ جگہ تعمیریں ہو رہی تھیں گدھے فالتو نہیں تھے۔ کمہاروں کو بھی فرصت نہ تھی انھوں نے دوسرے جاداروں کی صفائی کے ٹھیکے لے رکھے تھے شیام لال برابر دوڑ دھوپ کرتا رہا بڑی مشکل سے ایک کمہار سے معاملے ہوا اس کے پاس دس بارہ گدھے تھے گلی صاف ہونے لگی، دن رات کام لگا رہا، تیسرے چار دن کا

میں سارا کوڑا کرکٹ گدھوں پر لاد کر باہر پھینک دیا گیا محلہ والوں نے رنجیت کی ہمدردی اور فرض شناسی کی بے حد تعریف کی۔ ان کے الیکشن کا میدان ہموار ہوگیا۔ شیو پرشاد خزانچی روزگار کی تلاش میں دن رات جوتے گھستا رہا کہیں نوکری نہ ملی۔ رنجیت کے یہاں سوالی بن کر جانا اسے گوارا نہ تھا بھوکا مر جانا پسند تھا۔ رنجیت کے آگے ہاتھ پھیلانے کو جی نہ چاہتا تھا۔ بچوں کے کپڑے پھٹ گئے، پیٹ بھر روٹی ملنا مشکل ہوگئی، اسکول کی فیس ادا نہ ہوسکی۔ ایک روز خزانچی کی بیوی موہنی نے درد بھرے لہجہ میں کہا۔

"کیا سیٹھ سے معافی مانگتے شرم آتی ہے، ناک نیچی ہو جائے گی، ایک دن بال بچوں کی خاطر چلے جاؤ سنا ہے کہ وہ بڑے دیالو ہیں ضرور بحال کر دیں گے۔"

"معافی نہیں مانگوں گا، ایک سے ہزار ریگٹ تک۔ وہ جو کسی نے کہا ہے جان جائے پر آن نہ جائے بالکل ٹھیک ہے۔"

"دو بچوں کا اسکول سے نام کٹ گیا دو کو میں نے آپ ہی اٹھا لیا کھانے پینے کا خرچ زیور بیچ کر چلا رہی ہوں"

شیو پرشاد نے موہنی کے گورے چٹے چہرے کو عجب انداز سے دیکھا مرجھائے ہوئے گالوں کو دیکھ کر دل ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا گلاب کے دونوں پھول سوکھ گئے تھے، خزانچی کے شعور میں چنگاریاں سی سلگ اٹھیں جس کہاوت پر اسے پکا عقیدہ تھا وہ ماند پڑنے لگی اس نے گرتی ہوئی دیوار کو سنبھالا اور بیوی کو مخاطب کیا۔

"موہنی میں نے کوئی قصور نہیں کیا ہے۔ ہیڈ کلرک کی بیوی نے دوکان سے راشن لانے کو کہا تھا میں نے انکار کر دیا۔"

"میڈم یہ ہمارا کام نہیں۔"

وہ چڑھ گئی ہیڈ کلرک کے کان بھر دیے۔ اس نے اسی غصہ میں نوکری سے الگ کرایا جھوٹی شکایت کر کے، معافی کس بات کی مانگوں، کوئی غلطی ہوتی تو ضرور شرمندہ ہوتا۔"

"میں کہتی ہوں کھڑے کھڑے صورت ہی دکھا آؤ، انھیں شاید موڈ بدل جائے۔"

موہنی! ـــ اس نے بیوی کو مخاطب کیا وہ بڑے [illegible]

موہنی بش شرٹ سی رہی تھی نگاہیں اٹھائیں تو شوہر کی کمہلائی ہوئی اداس صورت دیکھ کر آنکھیں بھر آئیں پلکوں پر آنسوؤں کی سفید بوندیں لرزنے لگیں۔ جیسے سچے موتیوں کو لڑی میں پرو دیا گیا ہو، سوچنے لگی مجبوری کتنی بری چیز ہے آج میں اپنے پتی کو آن توڑنے کا مشورہ دے رہی ہوں جس کو اس نے ہمیشہ جان سے زیادہ عزیز رکھا۔

"موہنی، تمہارے کہنے سے جاؤں گا ضرور مگر بات پر آنچ نہیں آنے دونگا عزت کے آبگینہ میں بال آجائے یہ کبھی گوارا نہ ہوگا"

"ہاں ہاں ٹھیک ہے، میں بھی مر جاؤں گی پر تمہاری بات بگڑنے نہیں دوں گی۔ زیور گہنا، کیا چیز ہے جان بھی چلی جائے تو پرواہ نہیں بلا سے اولاد ان پڑھ رہ جائے میں تمہارے جیتے جی اپنی کلائیوں میں پڑی چوڑیاں ٹوٹنے نہیں دوں گی"۔ موہنی کی آنکھیں برساتی جھیلوں کی طرح سوکھ گئی تھیں سانس زور سے چل رہی تھی۔

موہنی غم مت کر، میں جا رہا ہوں، اگرچہ دل کہہ رہا ہے "شرم مرد خدا نہیں آتی"، مگر میں بے شرمی کا ارتکاب نہیں کروں گا ہاتھ نہیں پساروں گا رنجیت کے آگے۔

کئی مہینے بیت جانے پر وہ آج آفس آیا تھا رنجیت بھون کی تیسری منزل پر لوہے کے بھاری بھرکم گارڈر چڑھائے جا رہے تھے۔ مزدوروں کی قطاریں بلڈنگ کے آگے یوں متحرک تھیں جیسے بہادر جوانوں کے دستے دشمن پر حملہ کرنے جا رہے ہوں اس کا دل دھڑکنے لگا عورتوں کے رنگ برنگے دوپٹے لہرا رہے تھے۔ اس نے مضبوط ارادے کے ساتھ دفتر میں پاؤں رکھ کر پھر عہد کیا۔

"ہاتھ نہیں پھیلاؤں گا"

کلرکوں نے حیرت سے اسے آتے دیکھا۔

شیام لال ہیڈ کلرک نے اشارے سے بلایا۔

ادھر آؤ شیو پرشاد — کہو کہاں رہے؟

"یہیں"

"کس حال میں؟"

"بہت اچھے ڈھنگ سے زندگی بتا رہا ہوں آپ کی کرپا سے"

نوکری کرو گے؟

"نہیں"!

"کر لو میرے بھائی، افسوس ہے میں نے تمہارے ساتھ زیادتی کی ہے تمہاری جگہ خالی ہے۔ وہ اب بھی تمہارا ہی انتظار کر رہی ہے"

شیو پرشاد نے کچھ نہیں کہا، صرف مسکراتا رہا۔ شیام لال نے گرد آلود فائل نکال کر اسے جھاڑا کچھ لکھا اور باس کے کمرے میں چلا گیا۔

"ایک درخواست ہے سر"

کیسی درخواست؟

"شیو پرشاد کو دوبارہ وہی جگہ دیدی جائے"

"دوبارہ جگہ دیدوں اس گدھے کو؟"

سر، گدھوں کے بغیر بھی تو کام نہیں چلتا، الماری میں فائلوں کا ملبہ بھرا پڑا ہے۔

رنجیت بہت نرم دل تھے ہنس کر چپ ہوگئے اسی زمانہ میں رنجیت الیکشن لڑنے کی تیاری کر رہے تھے، شیو پرشاد کا نام ان کے درکروں نے ووٹر لسٹ میں لکھوا دیا تھا خزانچی کو بالکل خبر نہ تھی۔ مقابلہ بڑے کانٹے کا تھا حریفوں کے کارندے دوڑ دھوپ کر رہے تھے۔ وقت ختم ہونے لگا تو ایک ایک ووٹ سونے سے زیادہ قیمتی ہو گیا سب سے آخر میں ایک کلرک نے شیو پرشاد سے کہا،

"شیو جی آؤ اپنا پرچہ ڈال دو"

اس نے حیران ہو کر پوچھا

میرا نام ہے لسٹ میں؟

بالکل ہے آؤ میرے ساتھ

وہ آخری پرچہ تھا جو شیو پرشاد نے بیلٹ بکس میں ڈالا اور رنجیت کی جیت اسی ووٹ سے ہوئی جو ایک معیاری انسان کا ووٹ تھا۔

★

مہاکوی کالی داس

باوا کرشن گوپال مغموم

واہ! نقاشِ حُسن! کالی داس!
خوب منظر کشی فطرت کی
کیا تعجب کہ تیرا مولد[1] تھا
حسن ہی حسن تھا جو پیشِ نظر
والمیک اور ویدویاس کے بعد
تو کہ تھا آفتابِ چرخِ کہن
مردِ حاضر جواب و خوش گفتار
حسنِ صورت کے ساتھ تجھ کو ملی
تو کہ تھا بحرِ حسن کا غوّاص
بحرِ گنجِ گرانِ علم و ادب
دفترِ شعر تھی ترے حق میں
تو نے جس چیز پر نظر ڈالی
سرِ کہسار، برف کا منظر
پھول، پھل اور طرفہ شادابی
برگ و گل کا بیان بصد ندرت
کوک کوئل کی، آم کے باغات
کہیں آبِ روانِ گنگ و جمن
نربدا، سرسوتی و کاویری
تذکرہ ہے کہیں گھٹاؤں کا
کہیں موروں کا ناچ جنگل میں
کہیں ہجر و وصال کے منظر
کہیں عاشق کی حسرتوں کا بیاں
چھیڑ بھونروں کی تازہ کلیوں سے
مضطرب دل کی دھڑکنیں ہیں کہیں
گھنے پیڑوں کے سائے میں تالاب
مست و سرخوش ہیں راج ہنس کہیں

تو مصور تھا ایک بے تمثال
تجھ میں صنعت یہ تھی بہ حدِ کمال
رشکِ فردوس، خطۂ کشمیر
بن گیا خود بھی حسن کی تصویر!
تیرا دنیا میں نام نامی ہے
لائقِ شہرتِ دوامی ہے
اس میں آمیز تھی ظرافت بھی
جودتِ طبع بھی ذہانت بھی
لولوے تابدار [illegible] یا تھا
گوہرِ شاہوار لایا تھا
دلکش و دلربا ہی دنیا
زیورِ شاعری اسے بخشا
دل فزا حسن دیوداروں کا
واہ! نظارہ مرغزاروں کا
ذکر جھرنوں کا آبشاروں کا
کیف جادو بھری بہاروں کا
کہیں گوداوری کا لطفِ خرام
جن کے سنگیت میں سرورِ دوام
کہیں برسات کے نظارے ہیں
آرزوؤں کے کہیں طرارے ہیں
کہیں گھاتیں ہیں نازنینوں کی
کہیں باتیں ہیں مہ جبینوں کی
کہیں ذکرِ نسیمِ عنبر بیز
کہیں ہنگامۂ نشاط انگیز
کنولوں سے بھرے سرودر ہیں
کہیں فردوس پاش منظر ہیں

رُوح افروز تیری گل کاری
کون ہے تجھ سا محرمِ فطرت
تو نے فطرت کے ہر نظارے کو
اپنے حسنِ نظر سے بھر اس کو
حسن اور عشق تیری جولانگاہ
خوش جمالوں سے پیار کی باتیں
نازکی برگ ہائے گل سے سوا
ہائے! دوشیزگانِ گل اندام
تیری طبعِ رسا کا کیا کہنا
کیا لطافت ہے استعاروں میں
نظر آیا نہیں کوئی تجھ سا
خوب کی ترجمانیِ جذبات
نقشِ عظمت ترے کوئی دیکھے
تیرے کردار مر نہیں سکتے
تیرے سرمایۂ سخن کی روح
آفریں باد! قوتِ اظہار
تیرے الفاظ کی لطافت پر
بحر دو دریس کا کیا کہنا
شاعری ہے کہ بولتا جادو؟
کہیں قاصر نہیں ہے اشہبِ فکر
تیرا حسن قبولِ عالم گیر
کتنی صدیاں گزر گئیں پھر بھی
تیرے نغموں کی گونج آفاقی
تیری فکر و نظر کا شہکار
تیرے مداح گیٹے و ٹیگور
تھا ستائش گزار ولیم[2] جونز

تیرے پھولوں کی آب و تاب ہے اور
تو نے کھولی ہے جو کتاب ہے اور
بہ نگاہِ دقیق دیکھا تھا
اک نیا رنگ روپ بخشا تھا
تو تھا آگاہِ بزمِ راز و نیاز
دلِ بے تاب اسیرِ زلفِ دراز
چاندنی سے لطیف پیکرِ ناز
طوطیانِ چمن سے نرم آواز
نادرہ کار تیری تشبیہات
کتنے نازک ہیں تیرے محسوسات
ماہرِ نفسیاتِ انسانی
ایک دنیا ہے تیری دیوانی
غیر فانی ترے ڈراموں میں
تا قیامت ترے فسانوں میں
حسن و رنگینی و لطافت ہے
کیا فصاحت ہے کیا بلاغت ہے
وجد کرتے ہیں اہلِ ذوقِ سلیم
تیرے مداح ہیں عقیل و فہیم
واہ وا! تیری بزم آرائی
حبذا! تیری رزم آرائی
شہریارِ دیارِ شعر و سخن!
نظر افروز ہے ترا گلشن
تیری پرواز لا مکانی ہے
غیر فانی ہے، جاودانی ہے
تیری شہرت ہے بین الاقوامی
کون ہے تجھ سا شاعرِ نامی

---

[1] ایک گروہ کے خیال کے مطابق کالی داس کشمیری تھے۔ (مغموم) [2] سر ولیم جونز

غزلیں

کرشن بہاری نورؔ

جسم جسم کا چکر اک عجیب چکر ہے
کشتیاں ہیں خوابوں کی، نیند کا سمندر ہے

اور نہ جانے کب تک یہ سلسلہ ہے قائم
تیری یاد کا عالم کتنا خواب آور ہے

بے تعلقی اس کی کتنی جان لیوا ہے
آج ہاتھ میں اس کے پھول ہے نہ پتھر ہے

اس سے اپنا غم کہہ کر کس قدر ہوں شرمندہ
میں تو ایک قطرہ ہوں اور وہ سمندر ہے

کیا بتاؤں دنیا کو کیا چھپاؤں دنیا سے
تم جو خواب میں آئے سارا گھر معطر ہے

بے نیاز سکھ دکھ سے رہ کے جی نہ پاؤں گا
سکھ مری تمنا ہے دکھ مرا مقدر ہے

نورؔ زندگی میری اک کھلا ہوا خط ہے
جو بھی میرے دل میں ہے وہ مری زباں پر ہے

چندر پرکاش جوہرؔ بجنوری

مرا غم تھا نامکمل غمِ ناگہاں سے پہلے
مری زندگی تھی مبہم ترے امتحاں سے پہلے

ترا حسن ہے عبادت، مرے عشق کی یہ دولت
تری داستاں کہاں تھی مری داستاں سے پہلے

یہی اصلِ عاشقی ہے، یہی عینِ زندگی ہے
غمِ دوست چاہتا ہوں غمِ دو جہاں سے پہلے

یہ ایں حادثاتِ پیہم، سرِ منزلِ محبت
کوئی کارواں نہ پہنچا مرے کارواں سے پہلے

ترے عشقِ بے اماں نے مجھے دی نہ اتنی مہلت
کوئی مشورہ ہی کرتا کسی مہرباں سے پہلے

ترے سنگِ در سے پوچھے، کوئی اس جبیں کی عظمت
جو کہیں نہ جھک سکی ہو ترے آستاں سے پہلے

یہ وفا کی سخت منزل کہ جہاں پہنچ کے جوہرؔ
کئی کارواں ہوئے گم مرے کارواں سے پہلے

ضیا بختیاری

ادب کا تعمیر پسند نظریہ

ادبی قدروں کا تعین اس بات سے ہوتا ہے کہ ادب کائنات اور حیات کے بارے میں کیا نظریہ رکھتا ہے اور اس نظریہ کی روشنی میں وہ زندگی اور اس کے مختلف مسائل کو اس کے واقعات اور اس کے تجربات کو کس طرح سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ کس طرح ان کا تجزیہ کرتا ہے اور کیوں کر ان سے استفادہ کرتا ہے۔

دنیا کا کوئی چھوٹے سے چھوٹا معاملہ ہو یا بڑے سے بڑا مسئلہ ایک صحیح الدماغ اور صحیح الفطرت انسان کبھی یہ تسلیم نہیں کر سکتا کہ بالکل خالی الذہن ہو کر وہ اس چھوٹے سے معاملے کی کوئی توجیہ کر سکتا ہے یا بغیر کسی نظریہ کے کسی مسئلہ کا حل پیش کر سکتا ہے۔ ذہن خالی ہی کب رہتا ہے اگر اسے کوئی اچھا نظریہ نہیں ملے گا تو لا محالہ وہ برے اور ناقص تصورات ہی کو اپنے اندر بسا لے گا۔ یہی نظریہ اسے زندگی کے ہر مرحلے اور ہر موڑ پر روشنی دکھاتا ہے۔ یہاں تک کہ منزل کا تعین اور راہ انتخاب بھی اسی کے زیر اثر ہوتی ہے۔ اس کی صحت و عدم صحت اور اہمیت و عدم اہمیت کا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے ممکن ہے ادب کی قدروں کو متعین کرتے وقت فلسفۂ زندگی کے بنیادی تصورات کا تذکرہ کچھ لوگوں کی نظروں میں زیادہ اہم نہ ہو لیکن یہ صحیح ہے کہ اس کے بغیر ادیب بہت سی لغزشوں کے شکار ہو جاتے ہیں۔ اسی ہم آہنگی سے محروم اس تضاد کی مثالیں ہمارے ادب میں جا بجا پائی جاتی ہیں۔

سوال یہ ہے کہ —— کیا صرف اس اشارے پر اکتفا کیا جا سکتا ہے کہ سماجی زندگی میں ایک ایسا خارجی قانون چل رہا ہے جو تغیر پسند ہے۔ ضرورت تو اس بات کی ہے کہ اس سماجی تغیر کو بالکل واضح کر دیا جائے جو اس خارجی قانون کے تحت ہوتا ہے۔ آخر ہمارے پاس حقائق و شواہد کے وہ کون سے ٹھوس دلائل ہیں جن سے ایک دور کے قانون کو اور اس کے تغیر کو دوسرے دور سے ممیز کیا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ تبدیلی اگر غیر مبہم اور واضح نہ ہوئی تو پھر کسی کو یہ کہنے کا حق نہیں پہنچتا کہ آج کا یا کسی بھی مخصوص زمانے کا عمل غلط ہے چاہے وہ فرد کا عمل ہو یا سوسائٹی کا عمل —— جب تک تبدیلی غیر مبہم اور واضح نہ ہو، غلط یا صحیح کا معیار متعین نہ ہوگا۔ انفرادی و اجتماعی زندگی ایک معمہ اور ناقابلِ فہم تاریخی حادثہ بن کر رہ جائے گی۔ اور چوں کہ ادب اس سماج اور اس کے افراد کی زندگی کا عکاس ہوتا ہے، اس لیے وہ بھی غلط روی کا شکار ہو جائے گا۔

لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر غلط اور صحیح کو جانچنے کا معیار کیا کوئی انصاف پسند بھی مبہم پیش گوئی کی بنیاد پر متعین کرنے میں کامیاب ہو سکتا ہے؟۔ اور کیا وہ یہ نہیں چاہے گا کہ غلط اور صحیح کا معیار مبنی بر حقیقت ہو۔

یہاں یہ بھی سوال ذہن میں جنم پاتا ہے کہ تعمیر کیا ہے اور تخریب کیا؟ تعمیر پسند نظریہ اس کے بارے میں کیا کہتا ہے

اس کا صحیح اور واضح جواب یہ ہے کہ اس بالاتر ہستی کا ایک قانون تو وہ ہے جسے کائنات کی ہر شے نے قبول کیا ہے اور وہ ایک مکمل قانون ہے جو حیاتِ انسانی کی رہنمائی کرتا ہے اور اس کے اختیار کرنے کی آزادی انسان کو حاصل ہے اس قانون پر سماجی زندگی کو ریاضی کی صداقتوں کی طرح جانچا جا سکتا ہے ـــ فرد یا سماج کا عمل اگر اس ہی قانون کے خلاف ہے جو اس فوق الفطرت ہستی کا عطا کردہ ہے تو سماجی زندگی کو اس سے نقصان پہنچ سکتا ہے اور ایسا عمل تخریبی ہے اس کے برعکس اگر اس کے عمل میں فوقیت پائی جاتی ہے، تو وہ نہ صرف معروف قدروں کا حامل ہے بلکہ اس نظریے کے تمام پہلو مثبت ہیں اور یہ نظریہ تعمیری ہے۔

اب تک ہمارے ادب میں جو نظریے پیش کیے جاتے رہے ہیں اور مختلف فلسفوں کو سمونے کی کوششیں ہوتی رہی ہیں، ان کی حیثیت کیا رہی ہے۔ کیا ہم نے ان کی نظری اہمیت کو زیادہ شدت سے جگہ دی ہے یا عملی نتائج کے بل پر اپنے فلسفہ کو ادب میں پیش کیا ہے

ایک مدت سے سن رہے ہیں کہ ادب زندگی کا عکاس ہے، اس کا ترجمان ہے۔ اس کا آئینہ دار ہے، اور جانے کیا کیا اسی طرح کے بے شمار الفاظ ہیں جو اس کے بارے میں کہے جاتے ہیں۔ حقیقت نگاری کے چرچے بھی کم نہیں رہے ہیں۔ گویا سماجی زندگی کی تصویر کشی ہی ادب کا مقصد ہے۔ ظاہر ہے ان سب باتوں سے زندگی کی عملی تفسیر کا فرض ادب پر عائد ہوتا ہے۔ ادب سماج کو کیا دیتا ہے یہ سوال پھر بھی باقی ہی رہتا ہے۔ کیا وہ محض عکاس ہے اگر ایسا ہے تو شاید ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ ادیب کسی وقت بالکل خالی الذہن بھی ہو سکتا ہے۔ حالانکہ ایسا کبھی بھی نہیں ہوتا کہ انسان کا ذہن خالی رہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر وہ محض عکاس ہے تو پھر یہ حقیقت نگاری کیسی؟ کیونکہ حقیقت نگاری کا نام لیتے ہی ہمارا فرض ہو جاتا ہے کہ اس کی وضاحت کریں کہ حقیقت کیا ہے۔ اگر حقیقت کی وضاحت نہیں کریں گے تو پھر سماجی یا انفرادی عمل کو حقیقی انداز میں ہم پیش ہی کس طرح کر سکتے ہیں۔ جبکہ ادب کوئی میکانکی عمل نہیں ہے بلکہ اس میں ادیب کی نفسیات کو دخل ہے۔ اور نفسیات کو اصول دیے بغیر کسی عمل کی حقیقت معلوم کر لینا ممکن نہیں

ادیب اور شاعر کو چاہیے کہ وہ ان تاثرات کا جائزہ لے جو نظریۂ حیات و کائنات کے اپنانے سے ادبیات کے اساسی ارکان یعنی فکر، فن اور تنقید پر پڑتے ہیں۔ ایک مخصوص نظریۂ حیات ایک فن کار کا مخصوص فکری میلان اور ذہنی رجحان بنا ہے جس سے زندگی کی مختلف قدروں کو جاننے پہچاننے اور ان نکات و مفہوم کو زندگی کے رواں دواں عناصر سے ہم آہنگ کرنے کی فنی صلاحیت بیدار ہوتی ہے۔ اور فکر حسنِ تناسب کی صورت گری سے فن کا وہ پیکرِ جمیل اختیار کرتا چلا جاتا ہے جس کے نفسیاتی و ذہنی اثرات انسان کے فطری جذبات کو جمالیاتی ذوق کی مدد سے ابھارا کرتے ہیں۔ اور زندگی کے جذباتی پہلوؤں کے بناؤ بگاڑ میں حصہ لیتے ہیں صحیح تنقید ان فنی اور جذباتی پہلوؤں کو حقیقت کی کسوٹی پر جانچتی ہے۔ اور زندگی کے مختلف مسائل کو فکر و فن کی روشنی میں پرکھتی ہے۔

ادب کا نفسیاتی مقصد

ہر نظریہ جو ایک مخصوص فکری میلان رکھتا ہے ادب کے نفسیاتی و ذہنی اثرات سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ نظریے کے مبادی سے ہم آہنگ ہوں۔ ادب جمالیاتی ذوق کو ابھار اور حسنِ تناسب کی پسندیدگی کے احساس کو اکسا کر زندگی کے بنیادی مقاصد کی طرف لے جاتا ہے۔ یہ عمل خالص نفسیاتی اور ذہنی ہے۔ جس سے ادیب ان مظاہر کائنات اور حیات زندگی کی عکاسی سے انسان کے طبقاتی شعور کو ابھارنا چاہتا ہے۔ اس قسم کا مختلف طبقاتی شعور دراصل ان ادیبوں کے پیش کیے ہوئے ادب کا نفسیاتی مقصد ہوتا ہے ـــ اس نفسیاتی مقصد کو ہم حقیقت نا

کرنے کے لیے دو باتوں پر غور کرنا بہت ضروری ہے۔ ایک یہ کہ کیا وہ واقعی مقصدِ زندگی کے واقعات اور نفسیاتِ انسانی کی تہہ میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے؟ دوسرے یہ کہ اس سے نظریۂ حیات اور عمل کے اس امتزاج کی جسے ہم سماجی عمل کہتے ہیں، تعمیر ہوتی ہے یا نہیں۔

تعمیر پسند ادب بھی ایک نظریۂ حیات و کائنات رکھتا ہے۔ اس کا بھی ایک نفسیاتی مقصد متعین ہے۔ جو جدید دور کے ادب کے صحیح امتزاج سے پیدا ہوتا ہے۔ اور وہ کیا ہے؟ تعمیر پسند ادیب کس نفسیاتی مقصد کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اور اس کا نفسیاتی مقصد کیا زندگی کے [illegible] کی تہہ میں موجود ہے یا نہیں۔ اور وہ کم اہم ہے یا اہم ترین؟ اس کے علاوہ جدید ادب کے وہ مختلف رجحانات کیا ہیں جو اپنے اثرات سے قدیم ادب سے الگ کر حیات کے اعلےٰ مقصد سے دور ہو جاتے ہیں۔ ان سب پہلوؤں پر منصف مزاجی کے ساتھ گفتگو کی جائے تب ہم تعمیری ادب کو بہت کچھ سمجھ سکتے ہیں۔

ادب کا صحیح نفسیاتی مقصد

ترقی پسندی کی موافقت میں جو دلائل بھی ملتے ہیں ان کا تجزیہ کرنے کے بعد یہی حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اصل جذبہ انسانی بھلائی کا جذبہ ہے جو ہر سوسائٹی اور ہر دور میں کسی نہ کسی شکل میں ملتا ہے۔ اگر سوسائٹی اچھی ہے اور اخلاقی حیثیت سے اونچی ہے۔ تو یہ جذبہ اپنی بہترین شکل میں ملتا ہے۔ [illegible] ہے تو اس کے چہرے پر غلط توجیہات کے پردے پڑے ملتے ہیں۔ اس سے ادب میں اخلاقی رجحانات کی [illegible] ہوتی ہے۔ یہی ایک تعمیر پسند ادیب کا نظریہ ہے۔ [illegible] ادب کا نفسیاتی مقصد متعین کرتا ہے کہ وہ اخلاقی حسن کو بیدار کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہی ذوق [illegible] واقعات زندگی اور جمالِ فطرت کی عکاسی [illegible] ادب کو تعمیرِ حیات کی راہ پر لے جاتی ہے۔

تعمیر پسند ادب بھی مظلوم طبقہ سے ہمدردی رکھتا ہے وہ مزدوروں کی حمایت بھی کرتا ہے لیکن اس کا انداز تخریبی نہیں ہوتا۔ وہ ہر حال میں ان اخلاقی حدود کو ملحوظ رکھتا ہے جو سماج کی تعمیر کے لیے ضروری ہیں۔ خواہ وہ مظلوم کی حمایت ہو یا ظالم طبقہ سے بیزاری۔ یہی وہ فرق ہے جس کی بنا پر تعمیر پسند ادب اور ترقی پسند ادب کے نفسیاتی مقاصد میں امتیاز کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ تعمیر پسند ادب نے کیوں اخلاقی نقطۂ نظر کو اپنایا ہے۔ ادب اور اخلاق کے اس خوشگوار تعلق کو ہر اچھے ادب میں اہمیت حاصل رہی ہے۔

چند ادبی مسائل

تعمیری ادب کے اس نظریاتی پس منظر کو سمجھ لینے کے بعد قنوطیت، رجائیت، قدامت، جدت اور زبان و بیان کی خوبصورتی اور ایسے ہی دوسرے مسئلوں پر زیادہ تفصیل سے کہنے کی ضرورت کم ہی رہ جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ تعمیرِ حیات کے اہم تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے بڑے حوصلہ کی ضرورت ہے۔ ذہنی تعمیر کے وقت اس حوصلہ کو ابھارنے میں ادب بڑا کام کر سکتا ہے۔ اس لیے ادب میں رجائیت سے بھرپور لہجہ ہی تعمیر پسند نقطۂ نظر کے لحاظ سے درست کہا جا سکتا ہے۔

ہمارے ادب میں راہِ فرار اور عزم و عمل کا چرچا بہت کچھ ہوتا رہا ہے۔ مشکل حالات سے مقابلہ کرنے کا جذبہ یا ان سے گھبرا کر دور بھاگنے کی ذہنیت دو مختلف نفسیاتی کیفیتیں ہیں۔ تعمیر پسند ادب زندگی کی مشکلوں کے مقابلہ میں عزم و حوصلہ کا حامی ہے۔ راہِ فرار اس سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔

اب رہا قدامت اور جدت کا سوال۔ تعمیر پسند ادب کے علمبرداروں کے سامنے یہ سوال کبھی پیدا نہیں ہونا چاہیے کہ وہ اصول جسے ہم ٹھیک اور صحیح سمجھ رہے ہیں وہ نیا ہے یا پرانا۔ اصول چاہے نیا ہو یا پرانا اگر وہ صحیح ہے تو اسے قبول کرنے کے لیے یہی ایک کسوٹی کافی ہے کہ وہ مبنی بر حقیقت ہے۔ جو

(باقی صفحہ ۴۱ پر)

حفیظ بنارسی

رسم جہیز

جہیز ایک سیاست ہے زر پرستی کی
جہیز اصل میں لعنت ہے زر پرستی کی

یہ رسم بد ہے نہایت بری روایت ہے
جو سچ کہو تو چلن اس کا اک جہالت ہے

مرے وطن کے جوانو ذرا سنو اس کو
کسی بھی قوم میں اجازت نہیں کہ لو اس کو

کوئی جو شوق سے دے بھی تو مت قبول کرو
خدا کے واسطے اب تم نہ ایسی بھول کرو

نہیں یہ داغ کسی انجمن کے ماتھے پر
کلنک ہے یہ ہمارے وطن کے ماتھے پر

نہ جانے کتنوں کو زندہ جلا دیا اس نے
نہ جانے کتنے گھروں کو مٹا دیا اس نے

مرے عزیز رفیقو کبھی یہ سوچا بھی
کہ اس کا لینا بھی ہے جرم اور دینا بھی

شکایتیں ہیں مجھے ان سے ان کی عادت سے
خریدتے ہیں جو لڑکوں کو اپنی دولت سے

یہی دکھاتے ہیں اوروں کو بھی جہیز کی راہ
یہی سکھاتے ہیں کرنا یہ بدترین گناہ

وطن کے جسم پہ ناسور ہے جہیز کی رسم
بڑی خرابی سے معمور ہے جہیز کی رسم

تم اس کے داغ سے دامن کو اپنے پاک کرو
سدا کے واسطے اس کو سپرد خاک کرو

حسین شعور کی اچھے چلن کی مانگ کرو
جو مرد ہو تو نہ عورت سے دھن کی مانگ کرو

تلک جہیز کا یہ کاروبار بند کرو
جو ناپسند ہے وہ شے نہ تم پسند کرو

جلاؤ شمع محبت نیا سویرا ہو
کسی غریب کے گھر میں نہ اب اندھیرا ہو

جوان چہرے نہ مرجھائیں گھر کے آنگن میں
کوئی بھی پھول نہ کمھلائے اپنے گلشن میں

کسی کی آبرو برباد ہو نہ دھن کے لیے
جہیز مانگے نہ کوئی کسی دلہن کے لیے

کسی کے سینے میں خنجر یہ اب اتر نہ سکے
اسے مٹاؤ تم ایسا کہ پھر ابھر نہ سکے

ذکی کاکوروی

جلیل مانکپوری کی اصلاحِ سخن

جلیل ایک مسلم الثبوت استاد تھے۔ وہ نہ صرف ایک قادرالکلام شاعر اور بہترین غزل گو تھے بلکہ فن شاعری میں بڑی مہارت اور زبان پر بڑی قدرت رکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ امیر مینائی کے سب سے قابل شاگرد اور ان کے متفق علیہ جانشین قرار پائے۔ تلامذۂ امیر میں سے بیشتر نے امیر کے انتقال کے بعد جلیل سے اصلاح لینی مناسب سمجھی، جو جلیل کی استادی کا بین ثبوت ہے۔ یہی نہیں داغ کے انتقال کے بعد ان کے متعدد شاگرد جلیل کے شاگرد ہو گئے۔ نظام دکن میر محبوب علی خاں آصف نے داغ کے بعد جلیل ہی کو شرف استادی بخشا، جو اس زمانہ میں بہت بڑے اعزاز کی بات تھی۔ میر محبوب علی خاں آصف کے بعد ان کے جانشین سلطان دکن میر عثمان علی خاں نے بھی منصب استادی پر جلیل ہی کو سرفراز فرمایا اور جلیل اس مرتبہ جلیلہ پر اپنی زندگی کے آخری وقت تک انتہائی عزت اور وقار کے ساتھ فائز رہے۔

جلیل، امیر مینائی کی زندگی میں ہی ان کے شاگردوں کی اصلاح سخن ان کے حکم سے کرتے تھے جو بعد کو استاد کے ملاحظہ میں پیش کر کے منظوری حاصل کر لیتے تھے۔ اس لیے ایک مشاق مسلم الثبوت استاد میں جو جو خوبیاں اصلاح سخن کے لیے درکار ہیں وہ سب جلیل میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ ان کی اصلاح سخن کا انداز بڑا ادب آموز تھا وہ عام طور پر صرف لفظی ہیر پھیر کر کے اصلاح دیتے تھے اور حتی الامکان شاگرد کی فکر، موضوع سخن اور معنی میں تغیر نہ فرماتے تھے۔ اس لفظی اصلاح سے ہی شعر کی تاثیر، حسن و لطافت اور شعریت میں بڑا اضافہ ہو جاتا تھا اور اچھے شعر پر ان کی بیشتر اصلاح سونے پر سہاگے کا کام کرتی تھی۔ اصلاح کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ اس سے شاگرد کی صلاحیت، علم، ذوق اور نظر میں وسعت ہوتی تھی جس سے وہ فن، زبان اور شاعری کے محاسن و معائب کو اچھی طرح سمجھ سکتا تھا۔ اصلاح کے معاملے میں جلیل کی نظر شعر کی عروضی خامیوں پر پہلے پڑتی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ زبان کی صحت اور عمدگی کی جانب توجہ فرماتے تھے۔ تضاد معنوی یا غیر فطری خیال نیز دوسری اغلاط کی درستگی بھی پیش نظر رہتی۔ فنی مہارت کا یہ کمال تھا کہ اکثر ایک دو لفظوں کے تغیر و تبدیل سے ہی شعر زمین سے آسمان پر پہنچ جاتا۔ شعر کی تاثیر میں اسلوب بیان کا بہت بڑا ہاتھ ہوتا تھا۔ جلیل داغ کی طرح اسلوب بیان کے ماہر تھے۔ معمولی سی معمولی خیال کو صرف اسلوب بیان کی خوبیوں سے بلند کر دیتے تھے۔

جلیل کے شاگردوں کی تعداد بہت زیادہ تھی اور اسی نسبت سے اصلاح سخن کا بار بھی ان پر بہت زیادہ تھا جو بعض اوقات ان کے لیے بہت زحمت طلب اور دماغی بوجھ بن جاتا تھا۔ مگر وہ اپنی شرافت نفس اور اعلیٰ ظرفی کی وجہ سے زیادہ سے زیادہ دوسروں کو فیض پہنچاتے تھے۔ ہر چند کہ ان کے سر پر بڑی بڑی ذمہ داریاں تھیں جن میں فرائض منصبی، تصنیف و تالیف، فکر سخن وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

جلیل کی اصلاحیں کافی تعداد مطبوعہ اور غیر مطبوعہ شکل میں ملتی ہیں۔ ان میں سے مثال کے طور پر چند منتخب اشعار درج ذیل

بھیجے جاتے ہیں تاکہ ناظرین جلیل کی اصلاح کی خوبیوں سے کما حقہ لطف اٹھائیں۔

مندرجہ ذیل اصلاحیں مجلۂ عثمانیہ کے جلیل نمبر، "ہندستانی ادب" مئی جون ۱۹۴۶ء کے جلیل نمبر اور مشاطۂ سخن از صفدر مرزا پوری سے منتخب کی گئی ہیں اور ان میں ذیلی وضاحتیں راقم الحروف نے اضافہ کر دی ہیں۔"

(۱) مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد۔

شاد ۔

کیا منحصر اک طور پہ دیدار خدا ہے — موسیٰ سے کہو ہر جگہ وہ جلوہ نما ہے

اصلاح ۔ " " " " — آنکھیں ہوں تو ہر ذرہ میں وہ جلوہ نما ہے

"موسیٰ سے کہو" میں حسن تخاطب کی بڑی کمی ہے اور "ہر جگہ" کے مقابلے میں "ہر ذرہ میں" زور کلام اور معنویت بہت زیادہ ہے دوسری بات اس اصلاح میں یہ ہے کہ موسیٰ کی مخاطبت میں فریق کے حق خطابت کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ اصلاح کے بعد یہ معنوی نقص بھی ختم ہو گیا اور شعر میں بڑی آفاقیت یا وسعت پیدا ہو گئی جس کا احساس صحیح ذوق سے تعلق رکھتا ہے۔ "آنکھیں ہوں تو" کے ٹکڑے نے تو شعر میں ناقابل بیان بلندی اور تاثیر پیدا کر دی ہے یہی اصلاح کا کمال ہے۔

شاد ۔ ہر کام میں اب ہوتی ہے تائید خدا کی
اے شاد ترے ساتھ بزرگوں کی دعا ہے

اصلاح ۔ ہر کام میں تائید نہ کیونکر ہو خدا کی

"اب" کا لفظ بے محل اور بیکار تھا اصلاح نے اس نقص کو دور کر کے زور کلام میں بڑا اضافہ کر دیا اور دونوں مصرعوں کے معنوی ربط کو بڑھا دیا۔

(۲) احمد علی شباب۔

شباب۔ کریں گے قتل وہ دشمن کو میرے
ہمارا یہ حق بھی مارا جا رہا ہے۔

اصلاح۔ وہ آمادہ ہیں بہر قتل دشمن " " " "

مصرع اولیٰ میں تعقید لفظی کا عیب تھا اور بندش بھی سست تھی۔ اصلاح کے بعد یہ صورت نہیں رہی اور شعر میں حسن پیدا ہو گیا۔

(۳) صدیق الزماں وفا۔

وفا ۔

بند سی ہے کوچۂ محبوب میں کیسی ہوا مری — لپٹی ہے کسی کی زلف سے آہ رسا مری

اصلاح " " " " — کہ ہے دست و گریباں زلف سے آہ رسا مری

مصرع اولیٰ میں "محبوب" کہنے کے بعد مصرع ثانی میں کسی کی کہنا درست نہیں معلوم ہوتا ہے۔ زلف سے آہ رسا کے لپٹنے کے مقابلے میں دست و گریباں ہونا زیادہ مناسب اور بہتر انداز بیان ہے۔

وفا ۔

میں ہوں، وہ ہیں، شب مہتاب ہے، تنہائی ہے
آج بگڑی ہوئی قسمت مری بن آئی ہے

اصلاح ۔ آج قسمت جو لڑی ہے، مری بن آئی ہے

"آج قسمت جو لڑی ہے" کی اصلاح کا جواب نہیں۔ قسمت کے لڑنے کے بعد بات کا بن جانا ظاہر ہے اور یہ حسن کلام کی بہترین صورت ہے جس کا لطف صرف اہل زبان کا حصہ ہے۔

وفا ۔

اک نگاہ ناز سے میری طرف بھی دیکھ لو — ہے قرار زندگی کا کیا بھروسہ آجکل

اصلاح " " " " — بندہ پرور زندگی کا کیا بھروسہ آجکل

"ہے قرار زندگی" کی تعقید لفظی کے مقابلے "بندہ پرور" کس قدر برمحل اور بلیغ انداز کلام ہے، جس میں قرار زندگی کی غیر واضح معنویت کے بجائے خود زندگی کے وجود اور عدم وجود کا سوال پیدا ہو گیا۔ ہے جس نے شعر کو شعریت اور زور کلام سے ہمکنار کر دیا ہے۔

وفا ۔

سکہ بہار حسن کا دل پر بٹھا گئی — صورت تمہاری صورت یوسف دکھا گئی

اصلاح۔ آنکھوں میں رنگ خواب زلیخا دکھا گئی

"سکہ بہار حسن کا" کس قدر بھونڈا اور معنوی انداز بیان تھا، جس کی جگہ "آنکھوں میں رنگ خواب زلیخا" کے ٹکڑے نے شعر کو انتہائی رنگین اور پر اثر بنا دیا اور پھر مصرع ثانی میں زلیخا کے ساتھ یوسف کی

بضاعت کا کیا کہنا۔ اصلاح دینا اسے کہتے ہیں

(۴) داؤد علی خاں واقف۔

واقف۔

دیدۂ بسمل سے اب اس کا تماشا دیکھنا — رہ گیا ہے اور جو قاتل تری تلوار میں

اصلاح:۔

آبِ حیواں سے نہیں کم تشنہ کاموں کیلیے — رہ گئی ہے آب جو قاتل تری تلوار میں

واقف کے شعر کے معنی صاف نہیں۔ وہ جو کچھ کہنا چاہتے تھے اس کو مناسب الفاظ میں ادا نہ کرسکے، جس کی وجہ سے شعر میں اور خصوصاً مصرعۂ ثانی میں انداز بیان اور خیال عجیب سے معلوم ہوتے ہیں۔ جلیل نے شاگرد کی ہمت افزائی کے لیے اسی قسم کا ایک شعر لکھ دیا۔

(۵) اسماعیل احمد تسنیم مینائی:

تسنیم:۔

وعدہ سچا، وصال ہے یہ وہ دن — تجھ سے دوری میں جو گزارے ہیں

اصلاح

دن وہ ہیں حدِ زیست سے باہر — " " " " "

ایک بے معنی شعر کو بامعنی اور حسین بنا دیا۔

(۶) عزیز احمد:۔

عزیز:۔

لچکتی شاخ میں، غنچوں کی مسکراہٹ میں — بیک نظر تجھے دیوانہ وار دیکھا ہے

اصلاح " " " " — بیک نظر تجھے اے گلعذار دیکھا ہے

لچکتی شاخ اور غنچوں کی مسکراہٹ کے ساتھ گلعذار کا لفظ کس قدر مناسب، خوبصورت اور دلکش ہے۔ ایک لفظ نے شعر کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔

(۷) علی احمد۔

علی:۔

سمجھا ہوا ہے لطف کو بھی پردۂ ستم — آئے سکوں کہاں سے دل بدگماں کو بس

اصلاح:۔

سمجھے ہوئے ہے لطف کو بھی پردۂ ستم — " " " " " "

سمجھا ہوا ہے، غلط زبان ہے۔

(۸) صدق جائسی۔

صدق:۔

عقبیٰ ہوئی بخیر تو جنت کی سیر ہے — جنت میں دردِ عشق کی دولت مگر کہاں

اصلاح " " " " — جنت میں دردِ عشق کی لذت مگر کہاں

دولت کے مقابلے میں لذت کا لفظ زیادہ مناسب اور صحیح ہے۔

(۹) صفدر مرزا پوری۔

صفدر:۔

جو میں نے چوم لیا منہ بہت ہی شرمائے — خطا مری تھی تمھیں صفت انفعال ہوا

اصلاح " " " " " — " انھیں " " "

شعر میں شتر گربہ کا عیب تھا۔ مصرع اولیٰ میں واحد غائب کا صیغہ اور مصرع ثانی میں واحد متکلم کا صیغہ ہے۔ اصلاح نے عیب کو درست کر دیا۔

صفدر:۔

ادھر ہم سے ذرا آنکھیں ملاؤ — نگاہ ناز کیا قاتل نہیں ہے

اصلاح۔

ادھر دیکھو سوئے خنجر نہ دیکھو — " " " "

مصرع اولیٰ کا اسلوب بیان بہت غیر فصیح تھا۔ جلیل نے اسے بولتا ہوا مصرع بنا دیا۔

صفدر:۔

آنکھوں سے دیکھ کر کوئی محفل میں رہ گیا — کانٹا سا اک کھٹک کے مرے دل میں رہ گیا

اصلاح۔

وہ دیکھ کر کنکھیوں سے محفل میں رہ گیا — " " " " "

آنکھوں سے دیکھ کر کہنا نامناسب انداز بیان ہے۔ کنکھیوں سے دیکھنے کا لطف کا جواب نہیں۔ اصلاح نے غضب ڈھا دیا۔ استادانہ اصلاح اسی کو کہتے ہیں۔

صفدر:۔

سمجھنے والے اس کو ماجرائے دردِ دل سمجھے — نظر آئے جو قطرے خون کے کچھ نوکِ مژگاں پر

اصلاح:۔

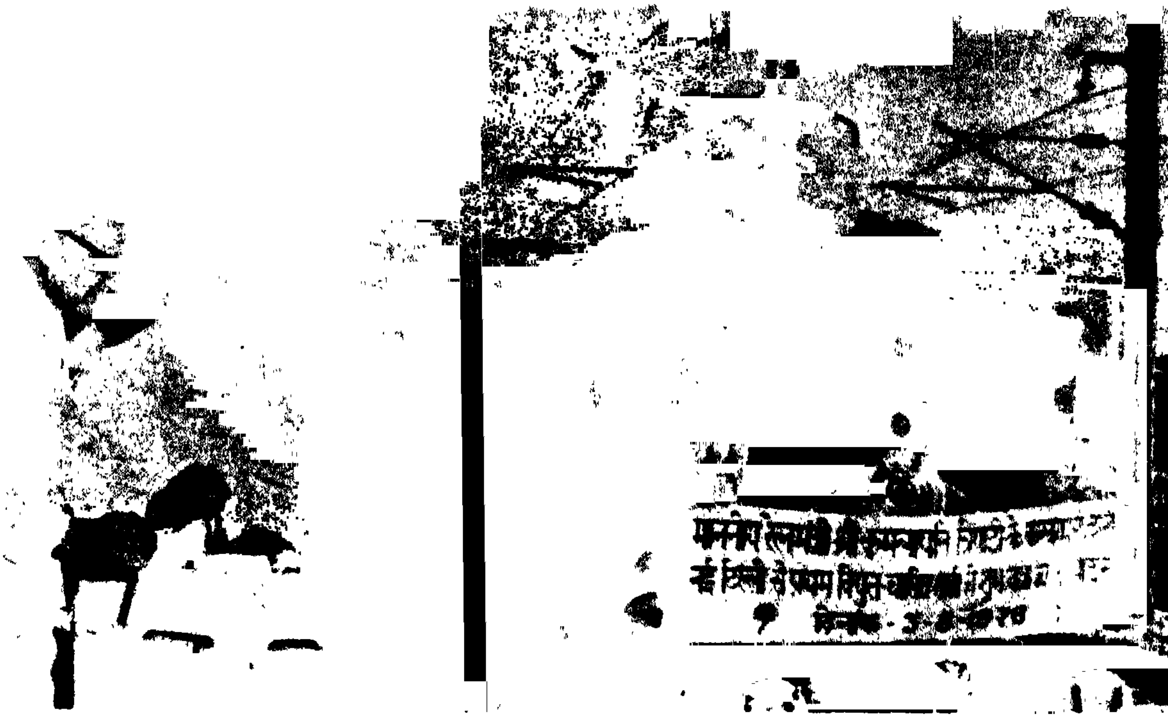
سمجھنے والے رودادِ دلِ بسمل اسے سمجھے — " " " " " "



وزیر اعلا شری نرائن دت تیواری نے
۳۰ جولائی ۱۹۷۶ء کو ودھان بھون لکھنؤ
میں سرکاری افسران اور ملازمین کو
۷۵-۱۹۷۴ء کے اسٹیٹ ایوارڈ تقسیم
کیے۔ تصویر میں شری روی موہن سیٹھ
سابق ڈائرکٹر محکمہ اطلاعات و رابطۂ
عامہ اتر پردیش وزیر اعلا سے ایوارڈ
حاصل کر رہے ہیں



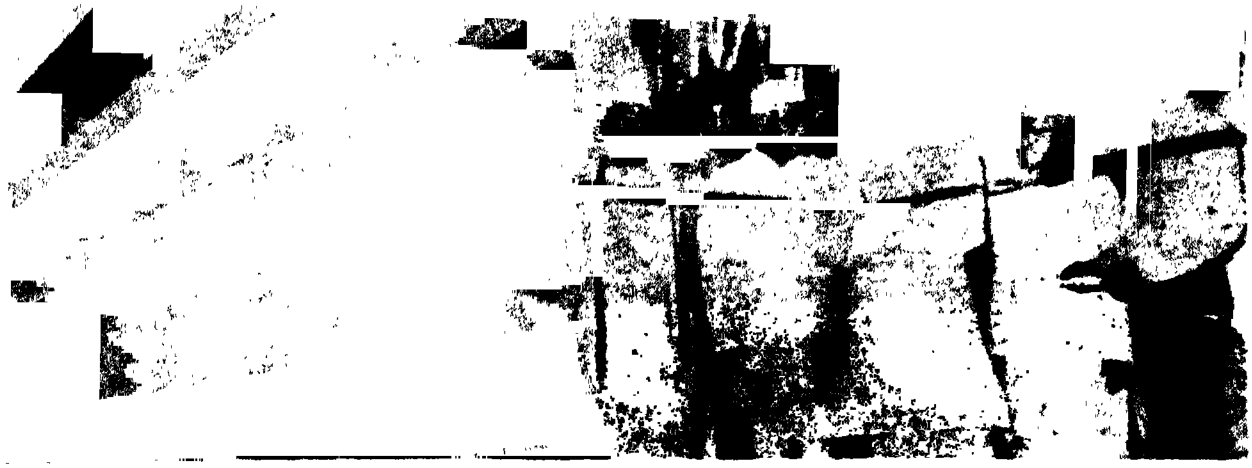
...یر ریاست شری رمیندر ور ما ۲۴ جولائی
...اسٹیٹ بینک کے ذریعہ ترقی کے لیے
...ب کیے گئے محلہ گولہ گنج (لکھنؤ) میں
...نقد قرضے اور سلائی مشین وغیرہ
تقسیم کرتے ہوئے



مرکزی وزیر ریلوے شری کملاپتی ترپاٹھی گذشتہ ۳ اگست کو نئی دہلی اسٹیشن پر موجودہ ریل راستے پر بجلی سے چلنے والی پہلی ٹرین کا افتتاح کرتے ہوئے



وزیر زراعت شری ویریندر
ورما اسپورٹس کالج کے
میدان میں ۲۲ جولائی
کو کدمب کا پودا لگاتے
ہوئے



ڈاکٹر ایم چنا ریڈی گورنر اتر پردیش ۱۴ر جولائی ۷۶ء کو چار باغ (لکھنؤ) میں بال چکستالیہ (بچوں کا اسپتال) کا افتتاح کرتے ہوئے۔
بائیں جانب اسپتال کی ایک تصویر

وزیر اعلا شری نرائن دت تیواری ۲۵ر جولائی ۷۶ء کو اتر پردیش اردو اکاڈمی کی کونسل کے پانچویں سالانہ اجلاس کو
اکاڈمی کے کمیٹی ہال میں خطاب کرتے ہوئے





وزیر اعلا شری نرائن دت تیواری ۸ ر جولائی کو ٹنک پور (نینی تال) میں آئی۔ ٹی۔ آئی کا افتتاح کر رہے ہیں

چھوٹی صنعتوں کی وزیر شریمتی محسنہ قدوائی بینک آف بڑودہ لکھنؤ کی نو آیین شاخ واقع نرہی پارک روڈ کا افتتاح کرتے ہوئے



دوسرے مصرعے کی مناسبت سے روداد دل بسمل کی اصلاح
کس قدر موزوں ہے۔ ماجرائے درد دل میں اظہار کیفیت دل بسمل
کی بات کہاں؟"

صفدر۔

بارہا لوٹ گئی آکے اجل بالیں سے   رحم آیا نہ اسے بھی ترے بیمار دل پر

اصلاح:۔

بارہا پھر گئی آ آکے اجل بالیں سے   "   "   "   "   "   "

صفدر۔

ادا سمجھ کے وہ دامن سے منہ چھپاتے ہیں   حجاب ہے جو یہی تو حجاب کیا ہوگا

اصلاح:۔

ادا سمجھ کے وہ آنچل سے منہ چھپاتے ہیں   "   "   "   "   "   "

دامن میں منہ چھپانے کا محل نہیں۔ آنچل میں منہ چھپانا خاص
ادا ہے۔ ایک لفظ کی اصلاح نے شعر میں جان ڈال دی۔

(۱۰) عبدالغفور شرر استھانوی بہاری۔

شرر۔

آتش الفت میں جل بھن کر مٹے دونوں مگر   شمع روتی ہی رہی پروانہ جلتا ہی رہا

اصلاح۔

آتش الفت نے دونوں کو نہ دم لینے دیا   "   "   "   "   "   "

شعر کے پہلے مصرع کی بندش سست تھی اور الفاظ بھی اچھے
نہ تھے، جس کی وجہ سے جلیل نے مصرع بدل دیا۔

شرر۔

غم میں رہنے دو مبتلا کر کے   درد بڑھ جائے گا دوا کر کے

اصلاح   "   "   "   "   کیا بنا لوگے تم دوا کر کے

دوسرا مصرع بے جان سا تھا۔ اصلاح نے شعر میں تغزل کی روح
پھونک دی۔ "کیا بنا لوگے" میں بڑی معنویت ہے۔

شرر۔

ذرا غمزہ سے اپنے پوچھ لینا   ادا تیری اگر قاتل نہیں ہے

اصلاح

کیا ہے خون کس نے حسرتوں کا   "   "   "   "   "   "

پہلے مصرع کا انداز اور لہجہ نامناسب تھا۔ جلیل نے ایک معنی خیز
مصرع لگا دیا۔

شرر۔

چھپے گا ہم سے کیا محشر میں قاتل   شہادت دیں گی یہ چھینٹیں لہو کی

اصلاح۔

کہاں جائے گا بچ کر ہم سے قاتل   "   "   "   "   "

اصلاح کے بعد شعر میں زور اور کیفیت کا اضافہ ہو گیا۔

شرر۔

میں کیا کہوں کہ کیا نگہ شوخ یار ہے   کوئی شہید ناز کوئی دل فگار ہے

اصلاح۔   "   "   "   "   "   کوئی جگر فگار کوئی دل فگار ہے

"نگہ شوخ یار" کو شہید ناز سے کوئی ظاہری علاقہ نہیں۔ اصلاح
نے یہ نقص دور کر دیا۔

(۱۱) محمد عبدالعلی شوق سندیلوی۔

شوق۔

صورت حال یہ آئینہ راز دل ہے   رنگ چہرے کا سر بزم ہوا ہو جاتا

اصلاح۔

جلوہ افروزی جاناں کی خبر دیتا ہے   شمع کا رنگ سر بزم ہوا ہو جاتا

شوق کے شعر کے معنی مہمل تھے۔ جلیل نے اسی قافیہ میں دوسرا
شعر کہہ دیا۔

شوق۔

اس شے پہ ناز کیا جو نہ ہو اختیار کی   بنیاد دیکھ ہستی بے اعتبار کی

اصلاح   "   "   "   "   "   "   ناپائیدار کی

بنیاد کے ساتھ ناپائیدار کا لفظ ہی صحیح معنی دے سکتا ہے۔

(۱۲) سید شاہ یحییٰ عالم سردار۔

سردار۔

کمائی ہے جب سے اس نگہ فتنہ گر کی چوٹ   یہ عمر بھر کا داغ ہے یہ عمر بھر کی چوٹ

اصلاح۔ "دل پہ"   "   "   "   "   "   "   "

"جب سے" کہنے کا کوئی محل نہیں تھا کیونکہ دوسرے مصرع میں
وقت کی کوئی رعایت نہیں۔ "دل پہ" کی اصلاح نے شعر کے معنی

نقص کو دور کر دیا۔

سردار۔

وہ پھر مری طرح سے ہوں پامالِ آرزو کھاتے پھر رہے گئے یونہی وہ اب بدر کی چوٹ
اصلاح۔ " " " " کھاتے پھر ہمیشہ یونہی دربدر کی چوٹ

اصلاح نے دوسرے مصرعے کے "وہ اب" کے حشو کو ختم کر دیا، لیکن پہلے مصرع میں "پھر" کا صرف اب بھی محل نظر ہے میرے خیال میں اس کی جگہ "بھی" کا لفظ زیادہ مناسب ہوگا!

سردار۔

اے چارہ گر دکھاؤں یہ کیونکر میں زخم دل
کچھ دیکھنے کی چیز نہیں ہے جگر کی چوٹ

اصلاح۔

کیونکر دکھاؤں زخم نہاں چارہ گر تجھے
کچھ دیکھنے کی " " " "

سردار کے شعر میں جگر کی چوٹ اور زخم دل کا تعلق برائے نام ہے۔ نیز الفاظ کی بندش بھی چست نہ تھی۔

(۱۳) نرسنگ راج عالی۔

عالی۔ واعظا خاموش رہ کیا فائدہ دل نہ سمجھے تو کسے سمجھائیں گے

اصلاح۔

آپ واعظ چپ رہیں کیا فائدہ " " " " "

عالی کے پہلے مصرع کا انداز تخاطب کچھ بہتر نہ تھا۔

(۱۴) محمد یوسف نفیس بنگلوری۔

نفیس۔

رہا بیقرار قلب و جگر اے عدو نگ ناز دونوں کو ایک نظر میں ٹھکانے لگا گیا
اصلاح۔ " " " " " " ادا " "

ناز کا تعلق ادا سے ہے، نظر سے نہیں۔ ادا کی اصلاح کس قدر مناسب ہے۔

نفیس۔

کٹنے دل و جگر کے بچا کے یار میں اے چشم تر وفا کے خزانے لٹا دیا
اصلاح۔ " " اس کی راہ میں " " " " "

اصلاح نے شعر کے روایتی رنگ کو کم کر دیا ہے۔

(۱۵) وجیہ الدین حشر سہسرامی۔

حشر:۔

مے کش سے تو نے پھیر لیں آنکھیں برا کیا اے محتسب یہ شیوۂ اہل نظر نہیں
اصلاح۔ " " " " " پیر مغاں " " " "

محتسب سے شکایت غلط تھی۔ پیر مغاں ہی سے ایسی شکایت مناسب ہے۔

(۱۶) زین العابدین عابد۔

عابد۔

ناصحا کیوں نہ میں اس بت پہ فدا ہو جاؤں
لطف جینے میں زیادہ ہے کہ مر جانے میں

اصلاح۔

مانع عشق جو ناصح ہے خبر کیا اس کو
لطف جینے میں " " " " "

مندرجۂ بالا اصلاحیں جلیل کی چند اصلاحیں ہیں جن سے ان کی استادانہ شخصیت کا کافی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اصلاح سخن کا کام وسعت نظر، فنی مہارت اور بڑی قادر الکلامی کا طالب ہے۔ یہ صفات جلیل میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ محمد ابراہیم عارج اپنے مضمون (ذاب فصاحت جنگ جلیل مرحوم) میں لکھتے ہیں:۔

"اصلاح سخن پر آپ کو عجیب قدرت حاصل تھی صرفی عروضی یا معنوی غلطی تو کیا، خلاف فصاحت لفظ بھی فوراً کھٹک جاتا تھا۔ اصلاح میں شاگرد کے مضامین اور خیالات کو امکان بھر قائم رکھنے کی کوشش فرماتے .... آپ کی قابلیت اور سخن وری ایسی مسلم ہے کہ دوسرے گروہوں کے قابل اساتذہ بھی تعریف و توصیف میں رطب اللسان ہیں۔[1]"
اس سلسلے میں جلیل کی ایسی اصلاحیں جن میں انھوں نے خود اصلاح کی ضرورت واضح کر دی ہے، خاص طور پر مطالعہ کے قابل ہے۔ مثلاً

---

[1] ہندستانی ادب جلیل نمبر صفحہ ۱۱۱

محمد ابراہیم خاں بدر (رامپور) کو ان کے مندرجہ ذیل اشعار کی اصلاح کے ضمن میں تحریر فرماتے ہیں[1]۔

یعنی نظروں کا جو مقصود ہے وہ ظاہر ہے
یعنی کچھ سامنے کچھ آڑ لیے بیٹھے ہیں

"اس میں یعنی کی یا بیتک تقطیع سے گرتی ہے بشعرا حتی الامکان فارسی عربی الفاظ کی یا نہیں گراتے لیکن اتفاقی طور سے اگر گر جائے تو اس کو غلط نہیں سمجھتے، کیونکہ اساتذہ کے کلام میں اس کی نظیریں ملتی ہیں کہ مفرد الفاظ کی یا گرائی گئی ہے۔"

بے پیئے حضرت زاہد کی بری حالت ہے
یہ ہمیں ہیں کہ جو خاموش پیئے بیٹھے ہیں

"اس میں ایک حرف زائد ہے یا تو 'کہ' رکھا جائے یا 'جو' رکھیں۔ لیکن اس کو بھی غلط نہیں کہا جا سکتا البتہ بدنما ضرور ہے۔"

ہم سے پوچھو کہ محبت کے نتیجے کیا ہیں
داغ پر داغ کلیجے میں لیے بیٹھے ہیں

"داغ پر داغ اٹھانا۔ کھانا زبان ہے۔ لیے بیٹھے کے ساتھ بول چال نہیں ہے۔"

ہو چکے سیکڑوں مجروح مگر جی نہ بھرا
تیر اسی طرح سے چٹکی میں لیے بیٹھے ہیں

"اسی طرح سے 'میں'، 'سے' زائد ہے۔ اولیٰ یہ ہے کہ بغیر 'سے' کے کہا جائے لیکن غلط نہیں ہے۔ کیونکہ اچھے اچھے شعرا کے کلام میں موجود ہے۔ 'سے' کے بجائے "وہ" کہا جائے تو ہر پہلو سے بہتر ہے۔"

مندرجہ بالا مثالوں سے ظاہر ہے کہ جلیل اپنے شاگردوں کی بڑی ہمت افزائی فرماتے تھے اور اصلاح کے ساتھ ساتھ زبان و بیان نیز فن کے نکات برابر ذہن نشین کراتے رہتے تھے تاکہ شاگرد کی علمی استعداد میں اضافہ ہو اور اسے اصلاح سے پورا پورا فائدہ پہنچے۔ ان کے ایسے عدیم الفرصت استاد کے لیے جس کے ذمہ ہزاروں کام اور شاگردوں کی بہت بڑی تعداد ہو، اتنی بڑی توجہ دینا بہت بڑی بات ہے۔

اسی طرح غلام حسین کسری منہاس[2] کو ایک خط میں اصلاح میں تحریر فرماتے ہیں:۔

ہم تو آئینہ نما منہ پہ بتا دیتے ہیں
عیب ہے کس میں یہاں کون ہنر رکھتے ہیں

"دوسرا مصرع اسی طرح درست ہے۔ میری رائے میں مصرع اوّل کو اس طرح بدل دیجیے تو بہتر ہوگا۔

"صورت آئینہ ہم منہ پہ بتا دیتے ہیں"

آئینہ نما کے مقابلہ میں صورت آئینہ کس قدر برمحل اور عمدہ اصلاح ہے"

★

---

[1] ماہنامہ نقوش، لاہور کا خطوط نمبر صفحہ ۳۶۸۔ [2] صفحہ ۳۷۷۔

واحد پریمی

باعثِ فخرِ وطن ہیں اندرا

ہر نفس یوں ضو فگن ہیں اندرا
جیسے شمعِ انجمن ہیں اندرا

واقفِ ہر منزلِ راہِ حیات
قائدِ قوم و وطن ہیں اندرا

قاتلِ ظلماتِ تخریب و فساد
امن کی روشن کرن ہیں اندرا

اک نئی تہذیب کی معمارِ نو
دشمنِ طرزِ کہن ہیں اندرا

خیر خواہِ کاروبارِ خاص و عام
قدر دانِ علم و فن ہیں اندرا

عزم و سعی و جہد کی تصویرِ خاص
دورِ نو کی کوہکن ہیں اندرا

جذبہ و جوشش و طلب کا ذکر کیا
سر سے پا تک اک لگن ہیں اندرا

دلکشی جنت نشاں کشمیر کی
عظمتِ گنگ و جمن ہیں اندرا

سربلندی ہیں قطب مینار کی
تاج کا بھی بانکپن ہیں اندرا

برگ و گل کو اب خزاں کا خوف کیوں
جب نگہبانِ چمن ہیں اندرا

کیوں نہ ہم اہلِ چمن کو ناز ہو
باعثِ فخرِ وطن ہیں اندرا

کیوں نہ ہو واحدؔ ثنا خواں آج کل
ایک موضوعِ سخن ہیں اندرا

پیکو جعفری (اترولوی)

ترانۂ بیداری

ہوئی ہے کس لیے تخلیق اس کو کچھ جانو
خدارا اپنی حقیقت کو آج پہچانو
جو ہو سکے تو ہماری یہ بات تم مانو
شعور یہ تو نہیں زیست کے نگہبانو
جو زندگی کے طریقے ہیں وہ بتا کے چلو
تم اپنی راہ زمانے میں خود بنا کے چلو

ملی ہے زندگی کچھ کام اس میں کر جاؤ
تم اٹھ کے صفحۂ ہستی کے نقش بھر جاؤ
نہ اپنی زیست کو یوں شرمسار کر جاؤ
مثال اپنی بنو تم جدھر جدھر جاؤ
قدم قدم پہ متاعِ وفا لٹا کے چلو
تم اپنی راہ زمانے میں خود بنا کے چلو

گلوں کے تذکرۂ شوق کو بس اب چھوڑو
بدل چکا ہے زمانہ بہت اٹھو دیکھو
اب اتنا وقت نہیں ہے کہ راستہ میں رکو
تم اپنے ہاتھ میں رفتارِ وقت کی لے لو
ہر ایک شے کے مقدر کو جگمگا کے چلو
تم اپنی راہ زمانے میں خود بنا کے چلو

ابھی تو اور بھی باقی ہیں امتحانِ وفا
ابھی تو اور بڑھانا ہے عزو شانِ وفا
دکھانا ہے تمہیں دنیا کو اپنی آنِ وفا
بلند رکھنا ہے ہر حال میں نشانِ وفا
ہر انقلاب سے اپنی نظر ملا کے چلو
تم اپنی راہ زمانے میں خود بنا کے چلو

حاجی محمد عثمانی

مولانا شاہد فاخری

مولانا شاہد فاخری جنگِ آزادی کے ایک جانباز مجاہد اور ایک شعلہ بیان مقرر کی حیثیت سے ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔ ملک و ملت کا یہ مخلص خادم گزشتہ سال ۹ ستمبر کو اس دارِ فانی سے ہمیشہ کے لیے کوچ کر گیا۔

مولانا الہ آباد کے مشہور و معروف دائرہ شاہ اجمل کی خانقاہ کے سجادہ نشین تھے۔ یہ دائرہ صدیوں سے علم کا مرکز اور شرافت کا منبع رہا ہے۔ مولانا کے والدِ ماجد حضرت مولانا سید محمد فاخر علمائے ہند کی صف اول میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ جنھوں نے تحریکِ خلافت میں سرگرم حصہ لیا اور ۱۹۱۹ء میں سب سے پہلے جیل بھیجے گئے۔ گرفتاری کے وقت مولانا نے شعر فرمایا تھا ؎

بیڑیاں مجھ کو پہننے میں ذرا ذلت نہیں
باپ دادا کا طریقہ سنتِ سجادؑ ہے

لسان العصر اکبر الہ آبادی مرحوم نے مولانا کی گرفتاری کی خبر سن کر ارشاد فرمایا تھا

مولوی جیل میں بیٹنے کو جو موج اٹھتا ہے
گنبدِ چرخ مری آہ سے گونج اٹھتا ہے

مولانا شاہد فاخری نے علم و عمل کی فضا میں آنکھ کھولی اور ابھی صرف انیس سال کے تھے کہ ۱۹۳۰ء میں تحریکِ خلافت و کانگریس کے سلسلہ میں گرفتار کر لیے گئے۔ قید و بند کا یہ سلسلہ ایک عرصۂ دراز تک قائم رہا۔ وہ دور غیروں کی حکومت کا تھا اور اس زمانے میں حق کے لیے زبان کھولنا جیل میں بند ہونے کا مترادف تھا لیکن مولانا نے حق گوئی، راست بازی اور دیانت کو مصلحت پر کبھی قربان نہ ہونے دیا۔ ۱۹۴۷ء کے بعد قومی حکومت نے مولانا کی خدمات کے اعتراف میں دنیوی اعزاز میں کوتاہی نہیں کی لیکن نئے بدلے ہوئے حالات میں بھی مولانا کی جسارت و جرأت کی قدیم خصوصیت ہر حال میں قائم رہی۔ مجلسوں میں، محفلوں میں، جلسوں میں، کاؤنسل میں اور اسمبلی میں ہر جگہ اور ہر مقام پر مولانا اقلیتوں اور کمزور طبقوں کے حقوق کی علمبرداری کرتے رہے اور ان کی شکایتیں حکومت کے سامنے پیش کرتے رہے زندگی کے کسی حصے میں مولانا اس فرض سے غافل نہیں ہوئے۔

جسارت و جرأت ان کو ورثہ میں ملی تھی۔ گرفتاری کے ایام میں نینی جیل میں عجیب واقعہ پیش آیا جس کی توقع ایک بیس سالہ نوجوان سے نہیں کی جا سکتی۔ مولانا جیل میں جماعت سے نماز پڑھاتے تھے۔ مسلمان قیدی مقتدی ہوتے تھے۔ سپرنٹنڈنٹ جیل نے حکم بھیجا کہ جماعت سے نماز نہ پڑھی جائے۔ مولانا نے حقارت سے اس حکم کو ٹھکرا دیا۔ سپرنٹنڈنٹ جیل نے سختی کرنے کا حکم دیا کہ اگر جماعت سے نماز پڑھی گئی تو نمازیوں کو گولی مار دی جائے۔ اس حکم کے باوجود مولانا نماز پڑھانے کے لیے آگے بڑھے اور صفیں درست ہونے لگیں۔ یہ دیکھ کر تمام ہندو قیدی جو تحریک کے سلسلے میں جیل گئے تھے جماعت میں شریک ہونے کے لیے دوڑ پڑے۔ مولانا اور مقتدیوں کی اس جرأتِ بیباک کو دیکھ کر سپرنٹنڈنٹ کو اپنا حکم واپس لینا پڑا اور جماعت سے نماز بدستور ہونے لگی۔

سراپا اخلاق و وفا، مجسم مہر و محبت، دوستوں کے دوست، مخالفین کو معاف کر دینے والے، صاف دل، صاف گو، گفتار میں آتش بیانی الفاظ

میں روانی، ان کی تقریر سحر آفریں۔ یہ تھے مولانا شاہد فاخری جنھوں نے نڈر اور بیباک بن کر ہمیشہ اپنی رائے کا اظہار کیا لیکن راہِ حق سے کبھی منھ نہ موڑا۔

مولانا کی ساری زندگی ملک و ملت کی محبت میں گزری ـــــ وہ بیک وقت محبِ وطن، قوم پرور، عالم، صوفی، واعظ، مذہبی پیشوا اور قومی لیڈر تھے۔ وہ عاشقِ رسولؐ تھے محفلِ میلاد کے دیوانے اور قبرستانوں اور مساجد کے تحفظ و حرمت میں تن من دھن لگا دینے والے بیباک مجاہد بھی۔ مجمع کو مسحور کر لینے والی شیوا بیانی ایسی رکھتے تھے جس کے لیے اب کان ترستے رہیں گے۔ حق کی اس آواز کی حکمرانی قوم و ملت کے دل و دماغ سے کبھی نہ نکل سکے گی۔ حق تلفی تو اس مردِ خدا نے کبھی برداشت کی ہی نہیں خواہ وہ کسی کی بھی حق تلفی ہو۔ مخالفین کی حمایت اولیاء اللہ کا شیوہ رہا ہے۔ اس کا مظاہرہ اس عالی حوصلہ بزرگ اور اس ایثار و کرم کے مجسمہ نے اس طرح کیا کہ اپنے اقتدار کے زمانے میں انتقام کا خیال بھی دل میں نہ لایا۔ یہ صفت عام سطح سے بہت بلند انسانوں میں پائی جاتی ہے اور بس۔

وہ مجاہدِ آزادی تھے اور آج جو آزادی نصیب ہے وہ ان کے جیسے مجاہد ساتھیوں کی کوششوں اور قربانیوں کا نتیجہ ہے۔ آج کے نوجوان ان شدائد کا تصور بھی نہیں کر سکتے جو ہر وقت ان کی نظر کے سامنے تھے۔ لیکن ان کا مقصود ان زحمتوں کو کب نگاہ میں لانے والا تھا وہ عزم کے پیکر تھے، ان کا ایمان مستحکم تھا، ان کو یقین تھا کہ زندگی جہدِ مسلسل کا نام ہے اور یہ ممکن نہیں کہ کام کیا جائے اور اس کا انجام نہ نکلے۔

مولانا کو ہر صف میں سرفرازی حاصل تھی۔ اعزا میں سربلند، شہر میں محترم، ملک میں مقتدر، جمعیۃ العلماء ہند کے مستقل نائب صدر، کونسل کے ممبر، اسمبلی کے رکن، پارلیمنٹری سکریٹری، حج کمیٹی کے ذمہ دار آفیسر اور ڈائرکٹر مغل لائن، وقف بورڈ کے صدر بھی۔

غرضیکہ جب زمیں پہ رہے آسماں رہے

وہ صوفی بھی تھے، سجادہ نشین بھی لیکن خشکی و بدمزاجی کا ان میں شائبہ بھی نہ تھا۔ وہ دردمند دل لے کر پیدا ہوئے تھے اور سیاست و سیادت کے ساتھ سخن سنج و سخن طراز بھی تھے۔ شاعری خاندانی ملکیت تھی کیسے ممکن تھا کہ مولانا فاخر بیخود کا نورِ نظر شاعری میں نام روشن نہ کرتا۔ یہ ضرور ہے کہ سیاست کی مشغولیات اور فرائض نے مولانا کی شاعری کو جلوہ گری کا موقع نہ دیا اور جو غزلیں اور نظمیں مولانا نے وقتاً فوقتاً ارشاد فرمائیں وہ محفوظ نہ رہ سکیں۔

تحریکِ خلافت کے آغاز میں دائرہ شاہ اجملؒ سیاست کا مرکز تھا بعض دیکھنے والے زندہ ہیں جنھوں نے دائرہ کے میدان میں مہاتما گاندھی کو دیکھا، موتی لال نہرو کا لیکچر سنا۔ مولانا محمد علی و مولانا شوکت علی کی زیارت کی اور مولانا آزاد کی وجد آفریں تقریر سنی۔ جواہر لال نہرو تو ہمہ وقت آتے جاتے رہتے تھے۔ غرضیکہ آج جن لیڈروں کے نام وردِ زبان ہیں سب نے بقولِ ناسخ "ہر پھر کے دائرہ میں قدم رکھا" اور اسی راستے سے آگے بڑھے۔

مولانا کے تعلقات کی وسعت کا اندازہ صرف وہی کر سکے گا جس نے ان کا وسیع دسترخوان دیکھا ہے۔ مقررہ اوقات میں مہمانوں کی آمد کے سلسلے میں اہتمام اور انتظام تو سمجھ میں آنے والی شے ہے۔ یہاں ذکر ہے ان اوقات کا جب غیر متوقع طور پر متعدد مقتدر حضرات تشریف لے آتے تھے اور دسترخوان پر کوئی شے کم نہ ہوتی

زندگی تنگ و تاریک راہ سے بھی گزرتی ہے اور خوش خرمی کے انبار بھی بکھیرتی ہے ایسے میں صاحبانِ عزم اور خدا کی مشیت پر یقین رکھنے والے نہ راہ کی تاریکی سے گھبراتے ہیں اور نہ آسائیوں اور آسائشوں پر نازاں ہوتے ہیں اس صفت کو کلام مجید نے انسانی بلندی کا درجۂ اعلیٰ قرار دیا ہے اور یقین کیجیے مولانا نے زندگی کے نشیب و فراز میں صبر و سکون اور عزم و ثبات کا وہ نمونہ چھوڑا ہے جس کی مثال آسانی سے نظر نہیں آتی۔

مولانا نے خاندانی روایات اور دینی عظمت کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے بچوں کو دنیاوی منفعت اور مفاد کے لیے غلط راستے پر چلنے کی کبھی اجازت نہیں دی۔ وہ قناعت پسند اور بے نیاز بزرگ تھے۔

ملک کا خادم قوم کا سرپرست اقلیتوں کے مفاد کا علمبردار اور اعزا و اقربا کا مددگار نہ رہا

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نورستہ اس گھر کی نگہبانی کرے

سراج میرزاپوری

شاہد فاخری

کیوں نہ ہوتے پرتو انوار شاہد فاخری
بادۂ عرفاں سے تھے سرشار شاہد فاخری

جگمگائے عظمت انسانیت کے چرخ پر
آفتاب عظمت کردار شاہد فاخری

محوِ حیرت ہو کے آخر دی سلامی وقت نے
بن گئے جب وقت کی رفتار شاہد فاخری

لے کے پہنچے انقلاب وقت کی دہلیز پر
حلقۂ زنجیر کی جھنکار شاہد فاخری

پرچم تحریک آزادی لیے دیکھے گئے
ہر قدم پر بر سر پیکار شاہد فاخری

ملک و ملت کی طرف جب بھی کوئی طوفاں بڑھا
بن گئے فولاد کی دیوار شاہد فاخری

عظمت خاکِ وطن کی آبرو بن کر رہے
بر بنائے جذبۂ ایثار شاہد فاخری

زندگی میں رہ کے سرگرم سفر، طے کر گئے
زندگی کی منزلِ دشوار شاہد فاخری

آئیے ہم بھی اسی پر گامزن ہو لیں سراج
کر گئے جو راستہ ہموار شاہد فاخری

نثار الماس

اے صبح وطن

اے صبح وطن، اے صبح وطن
گنجینۂ علم و جوہر فن
نانک کی صدا اٹھی ہے یہاں، ٹیگور کے نغمے گونجے ہیں
بھارت کی مقدس دھرتی پر، آکاش کے تارے اترے ہیں
پھیلی ہے یہاں سے جب خوشبو، آفاق کے آنچل مہکے ہیں
فردوس یہاں کے کوہ و دمن
اے صبح وطن، اے صبح وطن

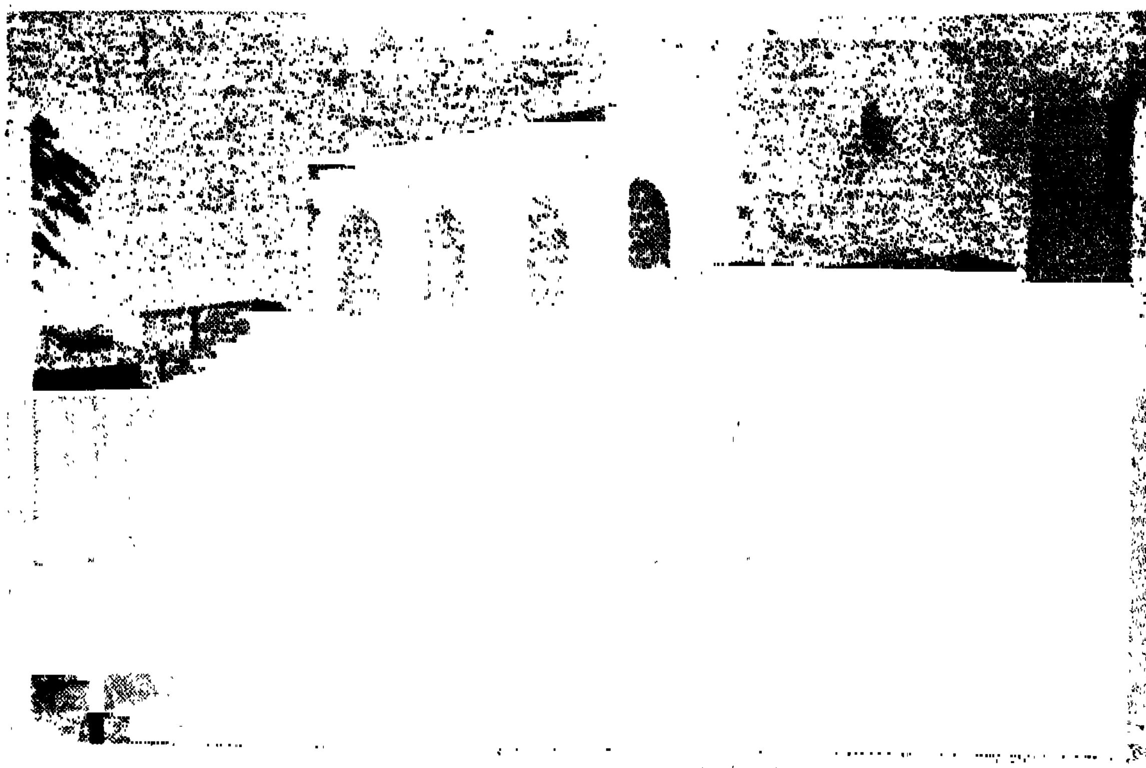
اس گلشن علم و حکمت پر انوار کی بارش ہوتی ہے
ہر ذرہ یہاں کا ہیرا ہے، ہر قطرہ یہاں کا موتی ہے
تو آنکھوں کا ہے اجیالا، تو سارے دلوں کی جوتی ہے
تو تاج و اجنتا گنگ و جمن
اے صبح وطن، اے صبح وطن

یہ تیری عظمت کہتی ہے جا ہو تو گلے کا ہار رہوں میں
اٹھو تو دہکتا لاوا ہوں، نفرت کے لیے تلوار رہوں میں
محکوم نہیں آزاد ہوں میں، مجبور نہیں مختار رہوں میں
تو چاند ستاروں کا مسکن
اے صبح وطن، اے صبح وطن

کہتی ہے ہمالہ کی چوٹی ہر دور میں سرافراز رہوں میں
دعویٰ ہے یہ، وادی وادی کا غمخوار رہوں میں دمساز رہوں میں
خود ناز قدم چھو لے جس کا اک ایسا سراپا ناز رہوں میں
جلوہ ہے مرا گلشن گلشن!
اے صبح وطن، اے صبح وطن

کشمیر سے راس کماری تک، چھائی ہے عجب ہی رعنائی
لیتی ہے بہار لالہ و گل ہر ایک قدم پر انگڑائی
اور اس کی ہر اک رعنائی پر ملتا ہے دل سے شیدائی

ہیں تجھ پہ تصدق تن من دھن
اے صبح وطن، اے صبح وطن



ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری کی عمارت

سید نظر برنی

دہلی کی ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری ایک مطالعہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ کی مرکزی لائبریری ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری کا یہ نام یوں تو زیادہ قدیم نہیں لیکن اس کا وجود اتنا ہی قدیم ہے جتنا جامعہ ملیہ اسلامیہ کا۔ شہر دہلی سے ۱۵ کیلومیٹر دور واقع جامعہ نگر کی تعلیمی بستی کے بالکل وسط اور سابق صدر جمہوریہ ہند و امیر جامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کی آخری آرام گاہ سے متصل ایک خوب صورت عمارت کی یہ لائبریری نہ صرف اپنے خارجی حسن سے دیکھنے والوں کو دعوتِ نظارہ دیتی ہے بلکہ یہ اپنے بے شمار نوادرات، مخطوطات اور مشرقی علوم و ادبیات کی بیش بہا کتابوں کی وجہ سے بھی پرستارانِ علم و ادب کے لیے بے پناہ کشش رکھتی ہے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد سنہ ۱۹۲۰ء میں رکھی گئی تھی جب تحریک خلافت اور تحریک ترک موالات پورے شباب پر تھیں۔ ابتدا میں یہ نوزائیدہ تعلیمی ادارہ علی گڑھ کے چند

تیجوں تک محدود رہا لیکن دہلی پہنچ کر اس کی نشو ونما میں یک لخت تیزی آ گئی۔ مہاتما گاندھی، مولانا محمد علی، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، مولانا آزاد، اور ڈاکٹر ذاکر حسین ان قومی شخصیات میں تھے جنھوں نے جامعہ کی بقا اور استحکام کے لیے جی جان کی بازی لگا دی۔ سنہ ۱۹۲۲ء میں حکیم اجمل خاں کی ایما پر جامعہ کا قافلہ دہلی کے قرول باغ میں آ کر ٹھہر گیا اور وہاں تقسیم ملک کے وقت تک مقیم رہا۔ یوں تو سنہ ۱۹۳۶ء سے ہی رفتہ رفتہ جامعہ کے بعض ادارے اور شعبے جامعہ کی موجودہ جگہ (اوکھلا) منتقل ہونا شروع ہو گئے تھے لیکن سنہ ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں نے جامعہ والوں کو قرول باغ چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ کتب خانہ جامعہ اسی زمانے میں اوکھلے منتقل ہوا تھا جس کی نئی ترتیب و تنظیم میں کارکنان کے کئی سال صرف ہوئے۔

علی گڑھ کی جامعہ بے سروسامانی سے دوچار تھی۔ اس لیے اس کا کتابی سرمایہ بہت تھوڑا تھا۔ جامعہ کے پاس اس وقت مالی وسائل کا بھی فقدان تھا۔ اس لیے عطیات میں موصول ہونے والی کتابوں پر ہی قناعت کی گئی۔ بانی جامعہ مولانا محمد علی نے اپنا پورا کتب خانہ، جامعہ ملیہ کے سپرد کر دیا۔ یہ امر باعث تعجب ہو سکتا ہے کہ اس درس گاہ کا کتابی سرمایہ اس وقت ایک چھوٹی سی الماری تک محدود تھا۔ جامعہ کے اساتذہ اور طلبا نے جس جوش و خروش کے ساتھ اس مادر درس گاہ کی بنیاد استوار کرنے میں حصہ لیا، اسی جذبے سے کتب خانہ کی نشو و ترقی میں جٹ گئے۔ وہ اس ادارہ کے لیے فنڈ جمع کرتے تو ساتھ ہی کتابوں کے عطیات اپنے ہمراہ لے آتے۔ مربیان جامعہ کی اپیل پر جو بڑے بڑے ذخیرے ستمبر سنہ ۱۹۲۳ء تک دستیاب ہوئے ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

(۱) عطیہ مفتی انوار الحق (۲) عطیہ مولانا سیف اللہ

(۳) عطیہ مولانا محمد علی

شیخی رئیس گجرانوالہ

(۴) عطیہ عبدالمجید خواجہ

ظاہر ہے کہ کتابوں کا یہ سرمایہ نہایت قلیل تھا۔ اس سے جامعہ کی ضرورتیں قطعاً پوری نہیں ہو سکتی تھیں۔ چنانچہ فوری ضرورتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے بہت سی کتابیں قیمتاً بھی خریدی گئیں اور اس سلسلے میں فروری سنہ ۱۹۲۳ء تک تقریباً آٹھ ہزار روپے کا صرفہ ہوا۔ عطیات اور خریداری دونوں کا سلسلہ بیک وقت جاری رہا۔ بعد کے عطیات میں عطیہ صاحبزادہ ساجد علی (علی گڑھ)، عطیہ عبدالقیوم نقوی (سہسوان)، عطیہ بیگم ڈاکٹر انصاری اور عطیہ حضرت میر خان (فرخ آباد) خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ سید حالب دہلوی ایڈیٹر ہمدم کا کتب خانہ بھی مرحوم کے صاحبزادے سید عشرت حسین نے جامعہ کے حوالے کر دیا تھا۔ ذخیرہ ہائے مستشرقین میں ڈاکٹر ذاکر حسین، جسٹس ہدایت اللہ، سید سجاد ظہیر، خواجہ غلام السیدین اور ڈاکٹر یوسف حسین خاں کے گرانقدر عطیات کتب شامل ہیں۔ یہاں گوشۂ جگر کا ذکر بھی ضروری اور برمحل معلوم ہوتا ہے جو ایک خوب صورت شوکیس میں مخصوص ہے اور جس کے مشتملات میں رئیس المتغزلین جگر مرادآبادی کی بیاضیں، مطبوعہ دواوین، ذاتی ڈائریاں، خطوط، ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ، جیبی گھڑی اور عینک قابل ذکر ہیں۔

عمارت

جامعہ اسلامیہ کی مرکزی لائبریری، نئی عمارت میں آنے سے قبل سنہ ۱۹۷۲ء تک تعلیم و ترقی کی عمارت میں مقیم تھی۔ یہاں اس کے پاس صرف ایک ہال اور تین کمرے ہی تھے جو یقیناً ناکافی تھے۔ سنہ ۱۹۶۲ء میں جب جامعہ ملیہ کو یونیورسٹی کا درجہ حاصل ہوا، اس وقت سے ارباب حل و عقد مسلسل کوشاں رہے کہ کتب خانہ کو اپنی عمارت مل جائے۔ چنانچہ یو جی سی نے مرکزی لائبریری کی عمارت تعمیر کرنے کے لیے پانچ لاکھ روپے منظور کر دیے۔ یہ عمارت سنہ ۱۹۷۲ء میں پانچ لاکھ چھبیس ہزار روپے کی لاگت سے تیار ہو گئی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری کا کل رقبہ ۲۶-۲ مربع گز ہے اور کورڈ ایریا ۱۶۳۲۶۵ مربع فٹ ہے۔ اس میں ۱۰ ریسرچ کیوبکلز، دو ریڈنگ روم، ایک

ٹیکنکل سیکشن، ایک ریفرنس سیکشن، ایک مخطوطات سیکشن چار اسٹیک روم اور ایک اسٹور سیکشن قائم ہیں۔ عمارت کتب خانہ کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں کو دیکھتے ہوئے ناکافی ہے۔

خدمات قارئین

کسی کتب خانہ کی کامیابی کا انحصار اس پر نہیں کہ اس کی عمارت فلک شگاف یا تاج محل کی طرح خوب صورت ہو یا اس کی کتابوں کے ذخیرے بے پایاں ہوں بلکہ ایک مثالی کتب خانہ وہ ہے جہاں کتابوں کا استعمال کثرت سے ہو اور طریقہ استعمال زیادہ پیچیدگی اور دشوار نہ ہو۔ دوسرے الفاظ میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ لائبریری میں موجود کتابوں اور رسائل تک قارئین کی دسترس آسانی سے ہو۔ ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری میں قارئین کی مطلوبہ کتابوں کے اجرا میں ریزرویشن سلپ کا طریقہ مزید سہولت کا باعث ہے۔ ریفرنس سروس کتب خانہ کی ایک اہم خدمت کا درجہ رکھتی ہے۔ جامعہ میں بھی اس کا التزام بڑے سائنٹفک اور جدید ڈھنگ سے رکھا گیا ہے۔ اساتذہ اور کارکنان کے لیے اسٹیک میں داخلہ کھلا ہوا ہے لیکن طلبا کے لیے پابندی ہے اور انھیں اپنی کتاب کے لیے کیٹلاگ کی مدد سے کال نمبر کی پرچی دینا ہوتی ہے۔

کیٹلاگ سازی اور کلاسی فکیشن

دہلی یونی ورسٹی اور جواہر لال نہرو یونی ورسٹی کی طرح جامعہ ملیہ اسلامیہ میں بھی کیٹلاگ سازی اور کلاسی فکیشن کے رائج الوقت اور جدید طریقے استعمال کیے جاتے ہیں۔ کیٹلاگ سازی میں کلاسی فائڈ کیٹلاگ کوڈ اور کلاسی فکیشن میں کلاس نمبر کے لیے ڈیوی ڈیسیمل کلاسی فکیشن اسکیم کو اور بک نمبر کے لیے رنگاناتھن کے اصولوں کو برتا جاتا ہے۔

اخبارات و رسائل

اس شعبہ میں خریدے ہوئے رسائل و جرائد کے علاوہ اعزازی طور پر آنے والے رسائل کی بھی خاصی تعداد ہے۔ اردو اور انگریزی کے ادبی رسائل کے علاوہ سائنس، انجینیرنگ، تاریخ، سیاست، معاشیات، جغرافیہ اور تعلیم کے موضوعات پر نمائندہ رسائل کے فائل موجود ہیں۔

اردو کے قدیم رسائل میں ہمدرد، کامریڈ، ہمدم، مخزن، دل گداز، زمیندار، زمانہ، اودھ پنچ اور یادوطن اس لائبریری کا قابل فخر سرمایہ تصور کیے جاتے ہیں۔ اردو اخبارات کے سلسلے میں لائبریرین کی کوشش ہے کہ ملک کے مختلف گوشوں سے شائع ہونے والے اچھے اردو اخبارات کی فائلیں لائبریری میں موجود ہوں۔ اس منصوبے کے پیش نظر ۱۹۷۲ء سے اردو کے معیاری اور اہم اخبارات کی جلدوں کو محفوظ رکھنے کا کام شروع ہو گیا ہے۔

مخطوطات اور ذاتی کاغذات

کتب خانہ میں مطبوعہ کتب و رسائل کی تعداد ایک لاکھ کے قریب پہنچ چکی ہے لیکن اس کا عظیم سرمایہ بہرحال عربی فارسی اور اردو کے مخطوطات ہیں جن کی تعداد دو ہزار سے زائد ہے۔ مخطوطات کی فہرست سازی کے لیے ضروری اقدامات کیے جا رہے ہیں۔ ہر تین زبانوں کی مفصل فہرست مخطوطات "فہرست قسط اول" کے عنوان سے دستیاب ہے۔ ان میں ۳۹۵ فارسی کے، ۲۳۸ عربی کے اور ۲۷ اردو کے مخطوطات کی فہرست شامل ہے۔

فارسی مخطوطات میں ابوالفضل کا اکبرنامہ، مکتوبات علامی (۱۱۹۱ھ) آملی کا دیوان (۱۱۲۴ھ) مجدد الف ثانی کے مکتوبات، الواعظ الکاشفی کی لطائف و ظرائف (۱۲۵۴ھ) ٹیک چند بہار کا نوادر المصادر (۱۲۰۹ھ) بیدل کے رقعات (۱۲۵۴ھ) چہار عنصر (۱۱۲۷ھ) جامی کے انشائے جامی (۱۲۴۸ھ) یوسف زلیخا (۱۲۳۲ھ) نصیر الدین محمود چراغ دہلوی کا شرح گلدستہ وصول الی الحق، حافظ شیرازی کا دیوان حافظ، خان آرزو کا ثمر الفوائد، خسرو دہلوی کا خسرو شیرین (مثنوی ۱۰۵۸ھ) دارا شکوہ کا مجمع البحرین (۱۰۶۵ھ) شیخ سعدی کے بوستان (۹۹۱ھ) گلستان

(۱۱۳۸ھ) عالمگیر اورنگ زیب کا دستور العمل آگاہی رقعات عالمگیری (۱۱۴۷ھ) عطار کا منطق الطیر (۱۲۲۴ھ) فردوسی کا شاہنامہ (۱۲۴۷ھ) نظامی گنجوی کا سکندر نامہ (۱۰۸ھ) نعمت اللہ خاں عالی کا وقائع حیدر آباد (۱۱۹۷ھ) قابل ذکر ہیں۔

عربی مخطوطات میں سب سے قدیم مخطوطہ ابن سینا کا احکام الادویہ القلبیۃ ہے جو علی محمد خطاط نے ۲۹ جمادی الاول ۶۵۵ھ (۱۲۵۷م) تحریر کیا تھا۔ اس مخطوطہ کے علاوہ عربی مخطوطات میں ابن حجر العسقلانی کا نزھتہ المنظر (۱۰۰۶ھ) ابن عربی کا شرح خصوص الحکم (۱۲۱۲ھ) ابو حنیفہ کا شرح المواقف السید الشریف علی من محمد الجرجانی (۸۰۷ھ) بخاری کا فضائح الملحدین، ترمذی کا الشمائل النبویۃ، غزالی کا احیاء علوم الدین (۱۱۰۰ھ) اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا البدور البازغۃ (۱۲۰۳ھ) اور جنید بغدادی کا معالی الھمم بھی شامل ہیں۔

اردو مخطوطات کی فہرست قدرے تشنہ ہے۔ اس میں صرف ۳۷ مخطوطات کی فہرست دی گئی ہے۔ قابلِ ذکر مخطوطات حسب ذیل ہیں:

خواجہ میر اثر کا دیوان (۱۲۶۲ھ) امراؤ سنگھ کا اشارات التعلیم (۱۸۹۲ء) امیر مینائی کا واسوخت امیر (۱۲۸۴ھ) تاریخ ریاست رام پور (۱۹۰۱ء) میر حسن کا دیوان (۱۸۴۲ء) خواجہ میر درد کا دیوان اور اسماعیل شاہ خاں کا تاریخ سلطنت دولت عثمانیہ اقلیم روم (۱۲۹۰ھ)

ان مخطوطات کے ساتھ یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ لائبریری میں اردو فارسی اور عربی کتابوں کے پہلے ایڈیشن محققین کے لیے سامان دل چسپی فراہم کرتے ہیں۔ مجلس پریس مکتبہ سلطانی، نامی پریس، مجتبائی پریس، نظامی پریس، نول کشور پریس کی مطبوعات کے علاوہ کتب خانہ میں قومی آزادی کی تحریک کے متعلق وافر تعداد میں مواد دستیاب ہے۔

کتب خانہ کے نوادرات میں مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور دوسرے مسلم عمائدین کے ذاتی کاغذات خطوط، روزنامچے، ڈائریاں، بعض کتابوں کے قلمی مسودے اور ذاتی البم بھی شامل ہیں۔ مولانا محمد علی کے کاغذات میں مولانا کی معرکۃ الآرا کتاب (ISLAM THE KINGDOM OF GOD) کا مسودہ موجود ہے۔ ذاتی کاغذات اور خطوط کا یہ ایسا قیمتی سرمایہ ہے جس سے تحریک آزادی اور اس عہد سے پر کام کرنے والے محقق کو کافی مدد مل سکتی ہے۔ کامریڈ اور ھمدرد کے ساتھ ساتھ قومی مشاہیر کے خطوط کی مائیکروفلم کاپیاں موجود ہیں اور ان کے مطالعہ کے لیے لائبریری میں مائیکروفلم ریڈر دستیاب ہے۔ نوادرات کا شعبہ فارسی، اردو اور عربی زبان کی نایاب کتابوں سے مالامال ہے اور ان ذخیروں میں بیشتر کتابوں کے پہلے ایڈیشن محققین کی دل چسپی کا سامان مہیا کرتے ہیں۔

★

"ہمارے ملک میں فیملی پلاننگ کا پروگرام عوامی فلاح و بہبود کے وسیع تر پروگرام کا لازمی جزو ہے۔ کنبے کو چھوٹا رکھنے کی ضرورت پر اس لیے نہیں زور دیا جارہا ہے کہ ہمیں بچے پسند نہیں، بلکہ ہمارا مقصد تو یہ ہے کہ ہر بچے کو ملک میں ترقی کرنے کے بہترین مواقع ملیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہم اپنے بچوں کو ایک بہتر دنیا ورثے میں دیں۔ ہر ماں باپ کی یہی خواہش ہوتی ہے اور ہماری منصوبہ بند ترقی کا بھی یہی مقصد ہے۔"

—— اندرا گاندھی

احترام اسلام

غزل

ٹ کر ہماری طرح کوئی بے نشاں نہ ہو
ہمش اب کسی پہ بھی کرم دوستاں نہ ہو

لے چل جنونِ عشق مجھے اس دیار میں
پتھر کی مورتی بھی جہاں بے زباں نہ ہو

دنیا کا التفات ہے تیرے کرم کے ساتھ
تو مہرباں نہ ہو تو کوئی مہرباں نہ ہو

دھرتی پہ دستیاب نہیں کون سی خوشی
ہے کون سا الم جو تہہِ آسماں نہ ہو

ل عمر سے تلاش میں ہیں رہروانِ شوق
س رہ کے جس پہ تیرے قدم کا نشاں نہ ہو

. کامنا ہے دھرتی کا سنگار بن سکے
میرا وجود نازشِ ہفت آسماں نہ ہو

ے ہو جسے یاں، نہیں دل اختیار میں
احترامِ محفلِ جادوگراں نہ ہو

نشار چنگیزی

عید

آئی ہے عید جشنِ مسرت لیے ہوئے
دامن میں اپنے سازِ صداقت لیے ہوئے
صبحِ نشاط نور کے سانچے میں ڈھل گئی
آئی ہے شام نغمۂ عشرت لیے ہوئے
ہو محفل یہ سب کے رقص کناں ہیں مسرتیں
دل ہے تمام پیار و عقیدت لیے ہوئے
باہم خوشی میں لوگ ہیں مصروفِ گفتگو
ہر گفتگو ہے حرف و حکایت لیے ہوئے
خاموشیوں سے بھی ہے عیاں کیفِ سرخوشی
صورت ہے سب کی ایک عبارت لیے ہوئے
دیکھو ہر ایک شخص گلے مل رہا ہے آج
دل میں وفورِ شوق و محبت لیے ہوئے
بچے بھی آج اپنی شرارت میں ہیں مگن
ان کی شرارتیں بھی ہیں راحت لیے ہوئے
روزے سے جو ہیں ان کی مسرت نہ پوچھیے
چہرہ ہے ان کا زہد و عبادت لیے ہوئے
کپڑے یہ زرق برق، معطر، نظر فروز
ہر آدمی ہے ایک نفاست لیے ہوئے
دنیا بنی ہوئی ہے سراپا خلوصِ عام
سب کی نظر ہے صرف اخوت لیے ہوئے
جنت سے آ رہی ہے صبا جھوم جھوم کے
ہم عاصیوں کے واسطے رحمت لیے ہوئے
اب جا رہے ہیں لے کے دلوں میں نشاطِ نور
سب عیدگاہ عید کی عظمت لیے ہوئے
آؤ چلو نشار دوگانہ ادا کریں
یہ فرض ہے خلوص کی نیت لیے ہوئے

(افسانہ)

شمس الدین

پیاسا تالاب

روپا نسوانی خوبصورتی کا بے مثال نمونہ تھی۔ سیاہ بال، گورا رنگ، نازک اور تیکھے نقوش، چودھویں کے چاند کی طرح روشن چہرے والی اس حسینہ کی آنکھوں میں ہرنی کی آنکھوں کی سی ترپ اور شباب کی متوالی چمک تھی۔ گلاب کی نازک پنکھڑیوں کی طرح سرخ و ملائم ہونٹ، شہد و شکر کی طرح میٹھی آواز والی گھنی پلکوں والی یہ ماہ جبیں راجہ اندر کے دربار کی حور یا پری لگتی تھی۔ خوبصورت ہونے کے ساتھ ہی ساتھ وہ خوب سیرت بھی تھی۔ اوائل عمر ہی میں اس کو معاشرے کی پرانی تہذیب کا سبق پڑھا دیا گیا تھا۔ عصمت عزت اور شرافت اس کا مقصد حیات تھا۔ اس کے والدین غریب ضرور تھے لیکن عزت و خودداری ان کا شیوہ تھا۔ وہ لوگ مالوہ کے ایک گاؤں میں رہتے تھے۔ ان کو اپنے اعلیٰ حسب نسب پر ناز تھا۔ ان کا آبائی پیشہ تالاب اور کنوئیں کھودنا تھا۔ گاؤں میں روپا کسی آزاد پرند کی طرح ادھر ادھر گھومتی رہی لوگ اس کے حسن سے متاثر ہوتے اور اپنی حقیقی اولاد کی طرح پیار کرنے لگتے عہد شباب میں قدم رکھتے ہی اس کے والدین کو اس کی شادی کی فکر ستانے لگی اور انھوں نے اس کے لیے کسی لائق شوہر کی تلاش شروع کر دی۔

وقت گزرنے لگا ساتھ ہی والدین بوڑھے ہوتے گئے ان میں کام کرنے کی زیادہ طاقت بھی نہیں رہ گئی اور گھر کا خرچ چلانا مشکل ہو گیا۔ روپا ایک سمجھدار اور دور اندیش لڑکی تھی اس نے اپنی ذمہ داری کو محسوس کیا لیکن مشکل یہ تھی کہ اس کو باہر جا کر کام کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس نے کئی بار اس بات کا اظہار بھی کیا کہ اسے کام کرنے کی اجازت دی جائے تاکہ گھر کا کچھ بوجھ ہلکا ہو سکے لیکن اس کو کبھی اجازت نہیں ملی۔ اس کے باپ نے ہمیشہ پیار سے ڈانٹ کر کہا کہ وہ اپنی اکلوتی چہیتی بیٹی کو کام کرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا۔ ایک دن شام کے وقت روپا اپنے گھر کے برآمدے میں خاموش بیٹھی تھی۔ اس کے چہرے پر فکر اور اداسی کے گھنے بادل چھائے ہوئے تھے۔ اس کا باپ سات دن سے بستر علالت پر پڑا تھا۔ ماں تیمارداری میں لگی ہوئی تھی اور آج گھر کا آخری دانہ بھی ختم ہو چکا تھا۔ اس کو یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ اب کل کیا ہوگا۔ باپ کی طبیعت بھی بگڑتی جا رہی تھی اور گھر میں پیسے بھی نہیں تھے کہ دوا لائی جا سکے۔

"دادا او دادا" کسی نے باہر سے آواز دی۔ وہ چونک کر اٹھی اور آنے والے کے بارے میں ماں کو بتلانے اندر چلی گئی۔ ماں باہر آئی اور آنے والے جوان کو ساتھ لے کر اندر چلی گئی۔ وہ ٹھیکیدار تھا جس کی ماتحتی میں بہت سے مزدور گاؤں کے اندر اور گاؤں کے باہر کام کرتے تھے۔ روپا کے والدین چونکہ کئی دن سے کام پر نہیں گئے تھے اس لیے وہ غیر حاضری کی وجہ معلوم کرنے آیا تھا۔ روپا کی والدہ نے شوہر کی علالت کے بارے میں تفصیل سے بتا کر کہا کہ ان کے ایک ہی بیٹی ہے۔ لیکن اس کے باپ کا حکم نہیں ہے کہ وہ کام پر جائے کیونکہ اب وہ جوان ہو گئی ہے۔ ٹھیکیدار نے ہر بات کو خاموشی سے سنا پھر روپا کے والد کے پاس جا کر خیریت پوچھی

دورانِ گفتگو میں اس نے ردپا کو کام پر بھیجنے کی صلاح دی کیونکہ بہت سے نئے کنوئیں کھودے جانے تھے۔ مزدوروں کی سخت ضرورت تھی۔ اس کا باپ ہچکچایا لیکن تکم نے اس کی حفاظت اور دیکھ بھال کا پورا یقین دلایا۔ ردپا کے باپ نے صاف طور پر کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے صرف اتنا کہا کہ وہ اس پر غور کرے گا۔ تکم خاموشی سے اٹھ کر چلا گیا۔

ردپا جو ساری باتوں کو سن رہی تھی، برداشت نہ کر سکی، وہ دوڑ کر باپ کے بستر کے قریب پہنچی اور بڑی منت سے کام پر جانے کی اجازت مانگی۔

اس نے آہستہ سے کہا! "اس کی عمر کی دوسری لڑکیاں بھی تو کام پر جاتی ہیں میں انھیں کے ساتھ جاؤں گی۔" اس کے باپ کا دل بھر آیا اس نے خاموشی سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

ردپا نے اپنی ماں سے منت کی۔ وہ بھی خاموش رہی لیکن جب اسے یہ علم ہوا کہ گھر میں ایک دانہ بھی نہیں ہے تو اس نے مجبوراً اجازت دے دی۔

دوسرے دن ردپا بہت سویرے اپنی ایک سہیلی کے گھر سے تھوڑے چاول مانگ لائی۔ اس کو پکا کر تھوڑا کھایا اور کام پر چل دی۔ وہ لڑکیوں کے ساتھ سیدھی تکم کے پاس پہنچی اور نگاہیں جھکا کر کھڑی ہو گئی۔

تکم نے اس سے پہلے اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ حسن و جمال کے اس مجسمے کو دیکھ کر متحیر رہ گیا۔ اس نے ردپا کو کام بتا دیا اور وہ خاموشی سے کام پر لگ گئی۔ تھوڑی دیر بعد جب تکم معائنے پر آیا تو اس کو اندازہ ہوا کہ ردپا ہزاروں لڑکیوں میں ایک ہے۔ وہ اپنی ہر عادت سے ہزاروں میں پہچانی جا سکتی ہے۔ دوسری لڑکیاں آرام کرنے کے بہانے ایک دوسرے سے باتیں کیا کرتیں۔ لیکن ردپا صرف اپنے کام سے مطلب رکھتی، اُسے دنیا جہان کی کوئی خبر نہ رہتی۔ پہلی ہی نظر میں وہ اسے ایک باعصمت مخلص اور بلند خیال لڑکی نظر آئی تھی۔ شام کے وقت کام کرنے کی وجہ سے اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا تھا اور ماتھے پر پسینے کی بوندیں گل لالہ پر شبنم کی بوندوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ جب مزدوری بٹ گئی تو وہ خاموشی سے مزدوری لے کر گھر کی طرف روانہ ہو گئی۔

اس طرح ردپا معمول کے مطابق کام پر آتی، شام کے وقت خاموشی سے چلی جاتی۔ حالانکہ وہ ایک معمولی مزدور کی حیثیت سے کام کرتی تھی اسے اپنے مالکوں اور آقاؤں کے خاموش اشاروں کا احساس بھی ہو گیا تھا لیکن وہ اپنی محنت پر خوش تھی اور عزت و خودداری کے ساتھ کام کرتی رہتی۔ بذاتِ خود تکم نے اس کے بارے میں بہت کچھ سوچا لیکن اس کی سنجیدگی اور وقار کی وجہ سے اس کی ہمت نہیں پڑتی تھی کہ وہ ردپا سے بات کر سکے۔ ایک دن اس نے سوچا کہ وہ ردپا کے والد کی خیریت پوچھنے کے بہانے اس سے بات کرے گا۔ لیکن پورا دن گزر جانے کے بعد بھی اُسے موقع نہ مل سکا کہ بات کر سکتا۔ ایک دن اس کو ایک سنہرا موقع ہاتھ آ گیا۔ افسرِ اعلیٰ کے معائنے کی وجہ سے شام کے وقت مزدوری تقسیم کرنے میں کچھ دیر ہو گئی۔ اندھیرا ہو گیا تھا۔ ردپا اپنی جگہ خاموشی سے کھڑی رہی، یکے بعد دیگرے سارے مزدوروں کو مختانہ تقسیم کر دیا گیا۔ سب سے آخر میں ردپا کی باری آئی، اس نے مزدوری لی اور دور جاتی ہوئی دیگر لڑکیوں کی جانب تیزی سے گھومی اسی وقت تکم نے پوچھا،

تمھارے والد کی طبیعت اب کیسی ہے۔"

اب وہ ٹھیک ہو رہے ہیں۔" ردپا نے جلدی سے جواب دیا لیکن آگے بڑھنے سے پہلے ہی تکم نے دوسرا سوال کیا! "کس کا علاج ہو رہا ہے؟"

"میں نام تو نہیں جانتی لیکن ماں نے بتایا تھا کہ وہ کسی دید سے دوا لائی ہے جو گھر کے قریب ہی رہتا ہے۔" ردپا نے جواب دیا۔

"اس سے کوئی فائدہ ہے؟" تکم نے دوبارہ پوچھا۔

"جی ہاں۔ اب ان کو بخار نہیں رہتا لیکن نقاہت کی وجہ سے ابھی ان کو آرام کی ضرورت ہے۔" کچھ لمحہ کے وقفے کے بعد ردپا نے پوچھا!

"اب میں جاؤں، شاید میری سہیلیاں انتظار کر رہی ہوں

گی، کافی اندھیرا ہو گیا ہے "

تکم کرسی سے کھڑا ہو گیا اور روپا کے سامنے آکر بولا، شاید وہ لوگ چلے گئے، تھوڑی دیر رکو، میں تمہارے ساتھ چلتا ہوں تاکہ تم کو گھر تک پہنچا دوں، میں خود ہی تمہارے گھر تمہارے والد کی خیریت پوچھنے جانے والا تھا "

روپا دوڑ کر اپنی سہیلیوں کو پکڑ لینا چاہتی تھی لیکن تکم کی تجویز پر وہ پریشان سی ہو گئی ۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے ۔ وہ خاموش کھڑی رہی ۔ اسی وقت تکم نے حساب ختم کیا اور ہر چیز رکھ کر گھر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ گھر پر ماں بے چینی سے منتظر تھی ۔ روپا اندر چلی گئی ۔ تکم بہت دیر تک اس کے والد کے پاس بیٹھ کر یقین دلاتا رہا کہ وہ اپنی بیٹی کے لیے فکر مند نہ ہوا کرے ۔ وہ سب سے بہتر کام کرتی ہے ۔

تکم روپا کی پاکدامنی اور بلند اخلاق سے بہت متاثر ہوا ۔ ایک دن جب روپا کے باپ نے روپا کے لیے کسی لڑکے کو ڈھونڈنے کی بات کہی تو تکم نے خود کو پیش کر دیا ۔ دونوں کی شادی دھوم دھام سے ہو گئی ۔ تکم نے ایک باعصمت اور بے مثال بیوی پائی اور روپا کو بھی ایک مثالی شوہر حاصل ہو گیا ۔ روپا دل کی گہرائیوں سے تکم کو پیار کرتی اور اس کی خدمت کرتی رہتی تھی ۔ تکم نے بھی روپا کو اپنی ساری خوشیوں کا مرکز بنا لیا ۔ دونوں کی ازدواجی زندگی بڑے پر مسرت اور خوشیوں کے سائے میں گزر رہی تھی ۔

اچانک ایک دن مشرقی گجرات میں واقع ایک ریاست کے مہاراج کا پیغام آیا کہ وہ اپنے شہر میں ایک بڑا تالاب بنوانا چاہتے ہیں جس کی کھدائی کے لیے بارہ سے ہزار دن مزدور درکار ہیں ۔ تکم فوراً راضی ہو گیا ۔ اس نے جلدی سے ایک ہزار مزدور جمع کیے اور وہاں جانے کی تیاری کرنے لگا ۔

روپا بھی اس کے ساتھ ہی گئی ۔ کام شروع ہو گیا ۔ ان دونوں کا برتاؤ اتنا اچھا تھا کہ ہر مزدور ان کو دل و جان سے چاہنے لگا ۔ وہ لوگ ان دونوں کو اپنا محافظ اور سرپرست سمجھتے تھے ۔ کام کے دوران مہاراج بذات خود معائنے پر آتے رہتے ۔ ایک دن جب وہ تالاب کے کنارے ایک کرسی پر

بیٹھے کام دیکھ رہے تھے کہ ان کی نظر روپا پر پڑی ۔ اور اس کی ہلکی سی جھلک نے ان کو اس کی جانب متوجہ کر دیا تھا ۔ کام کرتے وقت جب وہ ان کے قریب سے گزری تو ان کی نگاہیں اسی پر جم گئیں اور جس وقت روپا نے ماتھے پر آئے ہوئے پسینے کو پونچھنے کی کوشش کی تو مہاراج نے اس کو اچھی طرح دیکھ لیا ۔ جس طرح ساون کی گھٹاؤں میں اچانک بجلی چمک جاتی ہے اسی طرح میلے اور گرد آلود کپڑوں میں روپا کا حسن و جمال چمک رہا تھا ۔ راجہ اس بے پناہ خوبصورتی کو دیکھ کر کھو سا گیا ۔ اس کے جذبات میں طوفان اٹھنے لگے ۔ وہ اس خوبصورتی کو اپنی باہوں میں لینے کے لیے بے تاب ہو گیا ۔ اس نے روپا کو کئی بار اشارہ کیا، پکارا لیکن ایک باعصمت عورت کی طرح اس نے ان کی جانب دیکھا تک نہیں ۔

اس بات سے مہاراجہ کی انا کو ٹھیس پہنچی، اس کے خیال میں ریاست کا مالک کسی مزدور کے ساتھ کچھ بھی کر سکتا تھا اسے یہ علم نہیں تھا کہ روپا دوسری مٹی سے بنی ہے ۔ حالانکہ اس کی عمر ابھی زیادہ نہیں تھی لیکن پاک دامنی اور عقل مندی کا سبق اسے اوائل عمری سے دیا جا چکا تھا ۔ اس کے والدین کی تعلیم اس کی رگوں میں رچی بسی تھی ۔ کسی لالچ سے اس کے قدم پھسل نہیں سکتے تھے ۔ وہ ایک جوہر بے بہا تھی جس کی بنا پر لوگ تکم کی قسمت پر رشک کرتے تھے ۔

روپا کا انداز دیکھ کر اس وقت تو راجہ خاموش ہو گیا لیکن روپا کے حسن نے اس کے دل میں ایک آگ لگا دی تھی اس کی تپش اور سوزش نے اس کو دیوانہ بنا دیا تھا ۔ ہر وقت روپا کو حاصل کرنے کے بارے میں ہی وہ سوچا کرتا ۔ اچانک اس کے ذہن میں ایک ترکیب آئی جس کے ذریعہ بغیر قوت و طاقت کا استعمال کیے ہی روپا حاصل ہو سکتی تھی ۔ اس نے سوچا کہ روپا ایک معمولی مزدور ہونے کی وجہ سے جواہرات، قیمتی کپڑوں اور آرائش کی خواہاں ہو گی ۔ اس طرح کے لالچ سے وہ پھسل سکتی ہے ۔

دوسرے دن اس نے ایک آدمی کے ذریعے روپا کے پاس پیغام بھیجا ۔ پیغام لے جانے والا روپا کے قریب گیا اور آہستہ

سے بولا "رُوپا! تم مزدوروں کے افسرِ اعلیٰ کی بیوی ہو، مٹی سے بھرا ٹوکرا تمھارے سر پر اچھا نہیں لگتا۔"

"اس میں شرم کی کیا بات ہے" روپا نے سختی سے جواب دیا "اس میں کوئی حرج نہیں ہے، ہم لوگ مزدور ہیں، یہ تو ہمارا فرض ہے۔"

"لیکن تم سے اس طرح کا کام لینا بے انصافی ہے" اس نے دوبارہ کہا "تم ایسی حسین و جمیل عورت کو تو شاہی محل کی رانی ہونا چاہیے تھا۔"

"تم میری قسمت کے بارے میں باتیں کرنے والے کون ہوتے ہو" اس نے تلخی سے کہا ——— "میں اپنے شوہر کے ساتھ بہت خوش ہوں، میرا جھونپڑا محل سے لاکھ درجہ بہتر ہے ——"

"خیر یہ سب باتیں چھوڑ دو اور سنو، مہاراجہ نے کہلایا ہے کہ کسی دن ان کے محل میں آکر پُرسکون اور پُر آسائش زندگی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ جاؤ، اس کے بعد شاید تم کبھی محل چھوڑنا بھی پسند نہ کرو گی۔" اس آدمی نے ہمت کر کے سب کچھ کہہ دیا۔

"کیا؟ کیا تو نے مجھے بدکردار عورت سمجھا ہے؟ میں ایک باعزت شخص کی بیٹی ہوں، جاؤ اپنے راجہ سے کہہ دو مجھے محل کی خواہش نہیں ہے۔" رُوپا نے تیز لہجے میں جواب دیا، اور ڈکری رکھ کر آگے بڑھ گئی۔

وہ شخص بدحواس ہو کر بھاگا اور جا کر راجہ کو ساری تفصیل بتا دی۔ راجہ نے بڑی خاموشی سے پوری بات سنی، اور ایک بار پھر کسی خیال میں کھو گیا۔ اسے اس بات کا یقین ہو گیا کہ رُوپا کوئی معمولی عورت نہیں ہے وہ ضرور کسی اچھے گھرانے سے تعلق رکھتی ہے۔ وہ کسی لالچ کا شکار نہیں بن سکتی۔ ان خیالوں نے رُوپا کو بھلانے کے بجائے اس سے اور قریب کر دیا۔ دوسرے دن وہ خود رُوپا کے پاس گیا اور بولا "یہ سب کام تمھارے کرنے کے لائق نہیں ہیں۔ تمھارے خوبصورت ہاتھ مٹی اور کیچڑ سے گندے ہو جاتے ہیں۔ چاند کی طرح روشن تمھارا چہرہ گرد و غبار میں دھندلا جاتا ہے، تمھارے لیے یہ جگہ موزوں نہیں ہے، تم کو تو شاہی محل کی زینت ہونا چاہیے۔ میرے محل میں چلو جہاں دنیا کی ساری لذتیں اور آسائشیں تمھاری منتظر ہیں ———"

رُوپا نے نہایت نرمی سے جواب دیا! "مہاراج میری عزت و عصمت پر کیچڑ مت اچھالیے، میرا غریب شوہر میرا سرتاج ہے جس کی خدمت کرنا ہی میرا فرضِ اوّلین ہے، میرا چھوٹا سا جھونپڑا کسی جنت سے کم نہیں ہے مجھے آپ کے شاہی محل کی ضرورت نہیں ہے۔"

"لیکن رُوپا میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اس خوشی و مسرت سے کہیں زیادہ تم کو سکون دوں گا، میں تم کو رانی بناؤں گا جو پوری ریاست پر حکمرانی کرے گی، میں تمھارا غلام بن جاؤں گا ———"

"بہت ہو چکا" رُوپا نے چیخ کر کہا "اس بکواس کو ختم کیجیے آپ ایک راجہ ہیں جسے اپنی رعایا کی حفاظت کرنی چاہیے، کسی عورت سے ایسی باتیں کرتے آپ کو شرم نہیں آتی، آپ ایک ریاست کے حکمراں ضرور ہیں لیکن اس بات کو یاد رکھیے کہ میں ایک باعزت شخص کی بیوی ہوں، میرا جسم، دماغ، روح اس مقدس رشتے کے تحت صرف شوہر کا ہے۔ آپ ایک راجہ ہیں، مجھے قتل کرا سکتے ہیں۔ لیکن زندگی کی آخری سانس تک مجھے میرے شوہر سے جدا نہیں کر سکتے، میں اس کی پرستش کرتی ہوں صرف اس زندگی میں نہیں، جتنی بار بھی زندگی ملے گی میں اس کی پرستش کروں گی۔"

راجہ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ دوبارہ کچھ کہہ سکے، اس نے خاموشی سے نگاہیں جھکا لیں اور بوجھل قدموں سے محل کی جانب روانہ ہو گیا۔ اس کا شاہی غرور ایک معمولی عورت نے پاش پاش کر دیا تھا۔ اس نے ایک وفادار پرانے دیوان کو بلایا اور اسے کچھ سمجھایا، اس کو ابھی تک یہ امید تھی کہ اگر رُوپا اس جگہ کسی طرح سے آ ہی جائے تو وہ رانی

ہو جائے گی۔ وفادار دیوان نے راجہ کو بہت سمجھایا کیونکہ اس طرح راجہ کی عزت پر آنچ آنے کا خطرہ تھا لیکن راجہ نے ایک نہیں سنی۔

ادھر روپا نے ساری باتیں تکم سے بتائیں اور اُسے اُس جگہ کو چھوڑنے پر مجبور کیا کیونکہ خطرہ سامنے پیش تھا۔ تکم غصے میں آگ بگولا ہوگیا لیکن اتنی طاقت نہیں تھی کہ وہ راجہ کو جواب دے سکتا۔ روپا ایک لمحہ ٹھہرنے کے لیے راضی نہیں تھی۔ تکم نے مزدوروں کو تیزی سے تیار کیا اور اندھیرے ہی میں فرار ہوگیا۔ سویرا ہوتے ہی ان لوگوں کے فرار کی خبر آگ کی طرح پھیل گئی۔ راجہ کو اس کی اطلاع ملی، ایک لمحہ ضائع کیے بغیر راجہ نے کچھ سواروں کو لیا اور تعاقب میں روانہ ہوگیا۔ جلدی وہ ان لوگوں کو پکڑ لینے میں کامیاب ہوگیا، اس کے مسلح سپاہی مزدوروں کی اس چھوٹی غیر مسلح جماعت پر ٹوٹ پڑے۔ زیادہ تر مزدور قتل کر دیے گئے۔ تکم نے راجہ پر حملہ کیا لیکن وہ تنہا تھا۔ شدید زخم کھا کر اسی جگہ گر گیا۔ اس کو گرتا دیکھ کر روپا تیزی سے اس کے قریب آئی۔ تھیلے سے خنجر نکال کر اس نے اپنے سینے پر مار لیا اور شوہر کے پہلو ہی میں گر گئی۔ ایک کراہتی ہوئی آواز سنائی دی! "ملعون شخص! تو اپنے ناپاک اور گندے ارادے میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ میں اپنے شوہر کے ساتھ رہوں گی۔ اسی کے ساتھ سورگ کو جا رہی ہوں۔ لیکن اس بات کو یاد رکھنا کتنی ہی بارش کیوں نہ ہو تیرا تالاب ہمیشہ پیاسا ہی رہے گا۔ اس میں پانی کبھی نہ رک سکے گا ــــــ" اتنا کہتے کہتے اس کی سانسیں ہمیشہ کے لیے بند ہوگئیں۔ اس سے پہلے کہ راجہ روپا کے قریب پہونچ کر اس کے جسم کو ہاتھ لگاتا، موت کے آہنی پنجے نے سدا کے لیے اس کو دبوچ لیا۔

★

ادب کا تعمیر پسند نظریہ ..

لوگ ہر پرانی چیز کے مخالف ہیں یقیناً وہ اپنے اصول سے انصاف نہیں کرتے اور جو لوگ ہر نئی چیز کے خلاف ہیں وہ اپنے اصول کی عظمت کو گھٹاتے ہیں۔

قدامت اور جدیدیت کے الگ الگ خانے بنا لینا صحیح نہیں ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ اس اصول کی روشنی میں ہم قدیم و جدید ادبی سرمائے پر نظر ڈالیں اور نئے پیمانے تجربات کی روشنی میں مستقبل میں ادب کی تعمیر کا خاکہ بنائیں۔ تجربات سے استفادہ کی بڑی اہمیت ہے۔ اسی قدر قدیم ادبی سرمایے کی اہمیت

.. .. .. (صفحہ ۲۰ کا بقیہ)

ہے۔ اس ادبی سرمائے کے حاصل شدہ تجربات سے کیونکر استفادہ کیا جا سکتا ہے؟ اس کا جواب بہرحال یہی ہے کہ ان سے اصول اور نظریہ کی روشنی میں ہی استفادہ ممکن ہے۔ اس طرح اصول اور نظریہ کی اہمیت بنیادی ہے۔ مگر اس سے قدیم ادبی سرمائے یا نئے ادبی تجربات کی اہمیت اور افادیت کی نفی نہیں ہوتی ؂

زمانہ ایک، حیات ایک، کائنات بھی ایک
دلیلِ کم نظری قصّۂ جدید و قدیم

★

عارف عزیز قدوائی

ہمارے بچے

امریکہ اور روس دو انتہائی وسیع و عریض اور بہت ترقی یافتہ ملک ہیں۔ ان کے رقبہ کے تناسب سے ان کی آبادی بے حد کم یعنی بالترتیب صرف ۲۰ کروڑ اور ۲۴ کروڑ ہے۔ دونوں قومیں زرعی اور صنعتی ہی نہیں ہر میدان میں لمبی لمبی چھلانگیں لگا رہی ہیں اور وہاں کے عوام اس پیش رفت سے بخوبی مستفید ہوتے ہیں۔ ان کے یہاں صورت یہ نہیں ہے کہ جتنی ترقی ہو اسے آبادی کا اضافہ ہڑپ کر جائے۔

ان دونوں ممالک کا مقابلہ ہندستان سے کیا جائے تو بڑا فرق نظر آئے گا۔ تقسیم مملکت کے بعد بھی ہمارے پاس دنیا کا ۲،۴ فی صد رقبہ ہے لیکن دنیا کی آبادی میں ہندستان کی آبادی کا تناسب ۱۵ فی صد ہے۔ صرف چین ایسا ملک ہے جہاں ہمارے ۶۰ کروڑ عوام کے مقابلے میں ۷۰ کروڑ عوام بستے ہیں۔ افرادی طاقت کی اہمیت جنگ ہے۔ ماضی میں کچھ زیادہ ہی تھی۔ مستقبل میں بھی رہے گی لیکن نسبتاً کم۔ مشینوں کی افادیت میں جو وسعت ہو رہی ہے اسے ہر شخص دیکھ رہا ہے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کی روز افزوں ترقی میں یہ ضرورت کم سے کم ہوتی جائے گی۔

عرب ممالک پر ایک نظر ڈالیے تو پتہ چلے گا کہ وہاں آبادیاں بہت کم ہیں۔ اس برادری کے ملکوں کی تعداد کم و بیش بیس ہے۔ لیکن صرف پانچ ایسے ہیں جن کی آبادی کروڑ میں ہے۔ مصر میں تین کروڑ ۸۰ لاکھ، مراکش میں ایک کروڑ ۶۳ لاکھ، الجزائر میں ایک کروڑ ۶۰ لاکھ، سوڈان میں ایک کروڑ ۶۰ لاکھ اور عراق میں ایک کروڑ ۷ لاکھ نفوس بستے ہیں۔ بقیہ عرب ملکوں کی آبادی لاکھوں سے تجاوز نہیں کرتی۔ دنیا کے دیگر علاقوں کی طرح قوموں کی اس برادری کو بھی خاندانی منصوبہ بندی کی شدید ضرورت اور اہمیت کا احساس ہے۔ پاکستان والے بھی اس طرف پوری طرح متوجہ ہیں اور نہیں چاہتے کہ آبادی میں تیز رفتار اضافہ ملک کی ترقی کو بگاڑ دے۔

خاندانی منصوبہ بندی کا ایک پہلو جسے عموماً نظر انداز کرنے کا رجحان ہے خالصتاً فطری ہے۔ مرد کی بڑی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی شریک حیات کا حسن اور جوانی زیادہ سے زیادہ ممکن عرصے تک برقرار رہے۔ خوش گوار اور آسودہ ازدواجی زندگی کے لیے اس کی بڑی اہمیت ہے۔ لیکن جو مرد جان بوجھ کر عورت کو شریک زندگی سمجھنے کے بجائے صرف بچے پیدا کرنے کی مشین تصور کرتے ہیں وہ اپنے آپ پر اور اپنی بیوی پر بڑا ظلم کرتے ہیں۔ افزائش نسل کی ضرورت سے کسے انکار ہو سکتا ہے لیکن زیادہ بچے پیدا کرنے سے نسوانی حسن پر جو مضر اثرات پڑتے ہیں ان سے کون ناواقف ہے۔

موجودہ نسل جو عمر کا بیشتر حصہ طے کر چکی ہے اس کی زندگی کسی نہ کسی طرح گزر ہی جائے گی۔ اصل مسئلہ ہمارے بچوں اور ان بچوں کی اولاد کے لیے ہوگا۔ یہ بڑی خود غرضی کی بات ہوگی کہ ہم اپنے دلارے اور لاڈلے بچوں کے وسیع تر مفاد سے قطعاً بے پروا ہو کر خاندانی منصوبہ بندی کے اصول سے بے اعتنائی برتیں۔ جن بچوں کو عالم وجود میں لانے کا وسیلہ ہم بنتے ہیں ان ہی کی خوش حالی کا تقاضہ ہے کہ ہر خاندان اور ہر کنبہ منصوبے کے مطابق محدود ہو۔ اگر ہمیں اپنی اولاد عزیز ہے اس کا مستقبل اور بہبود عزیز ہے تو اپنے لیے کچھ بندشیں لازماً قبول کرنا ہوں گی۔

ایک زمانہ تھا جب لوگ بڑے فخر کے ساتھ اپنے بچوں کی تعداد ایک درجن ڈیڑھ درجن بتلاتے تھے۔ لیکن یہ اس دور کی بات ہے جب آبادی کے مسئلے کو قطعاً درخور اعتنا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ شاید لاشعوری طور پر اس قسم کا تصور تھا کہ ہمارا ملک بڑا وسیع و عریض ہے اور بڑی سے بڑی آبادی کو کھپا سکتا ہے۔ وہ زمانہ تعلقہ داری، زمیں داری اور جاگیرداری کا تھا۔ ایک شخص کئی کئی مواضعات کا مالک ہوتا تھا، ایکڑوں قابل کاشت آراضی اس کی ملکیت تھی۔ اس دور کا نہ صرف کلیتہً خاتمہ ہوگیا ہے بلکہ اب اس کے واپس آنے کا قطعاً کوئی سوال نہیں ہے۔ یہ سلطانیٔ جمہور کا زمانہ ہے۔ آراضی رکھنے کی ایک حد (سیلنگ) مقرر ہو چکی ہے شہری زمینوں کے لیے بھی اسی قسم کا قانون بن چکا ہے۔ اس صورت حال میں باپ کے مرنے پر کئی لڑکوں والے کنبے میں جائداد جس طرح تقسیم ہوگی اس کا بآسانی تصور کیا جا سکتا ہے۔ ان میں سے ہر لڑکے کی اگر کئی اولادیں ہوئیں تو جائداد کی حیثیت بس ویسی ہی رہ جائے گی جیسی اودھ کے نوابوں کا ایک ڈیڑھ روپیہ وثیقہ ہوتا تھا۔

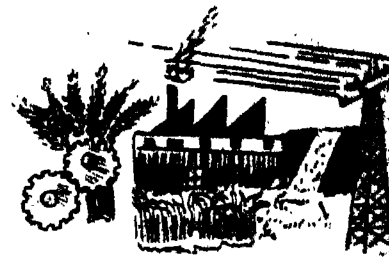
آبادی میں بے تحاشا اضافے کا خطرہ عین ہمارے دروازے تک آ پہنچا ہے۔ سنہ ۱۹۴۷ء میں آزادی ملی تھی۔ اس وقت سے اب تک آبادی میں ۲۵ کروڑ کا اضافہ ہوا۔ گویا کہ ایک "نئے روس" نے ہمارے ملک کے اندر جنم لیا ہے حالانکہ رقبے کے اعتبار سے سویت یونین کے پاس ہمارے ملک کا چھ گنا علاقہ ہے۔ ہر سال ہندستان کی آبادی میں اتنا اضافہ ہو رہا ہے جتنا آسٹریلیا کی کل آبادی، حالانکہ آسٹریلیا ایک براعظم ہے اور ہندستان کا ڈھائی گنا رقبہ رکھتا ہے۔

یہ اعداد و شمار ہیبت ناک ہیں اور اصلاح حال کی فوری کارروائی کے طالب ہیں۔ لیکن اصل مسئلہ عوام کو اس کی ہیبت ناکی ذہن نشین کرانے کا ہے۔ سچ پوچھیے تو توجہ شہر کی طرف نہیں بلکہ دیہات پر مرکوز کرنے کی ہے جہاں اب بھی ہماری ۸۰ فی صد آبادی ۵ لاکھ ۷۶ ہزار دیہات میں پھیلی ہوئی ہے، بقیہ بیس فی صد آبادی تقریباً تین ہزار شہری مرکزوں میں بکھری ہوئی ہے۔ شہر میں بہت کچھ کام ہو چکا ہے اور ہو رہا ہے۔ ضرورت دیہات کے سادہ لوح لوگوں کو سمجھانے اور ترغیب دینے کی ہے۔ وہ اگر خاندانی منصوبہ بندی کی اہمیت کو سمجھ لیں تو راہ کی تمام دشواریاں دور ہو جائیں گی۔

وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے اپنے بیس نکات کے بعد چند اور نکات کا اعلان حال ہی میں کیا تھا۔ ان میں خاندانی منصوبہ بندی پر خاص طور سے زور دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ ملک کے دستور اساسی میں جو ترمیم ہونے جا رہی ہے۔ اس میں خاندانی منصوبہ بندی کو مملکت کے رہبر اصولوں میں شامل کرنے کا فیصلہ تقریباً ہو چکا ہے۔

ہندستان کی لائق اور بیدار مغز قیادت جس کی عظیم ترین رہنما مسز گاندھی ہیں، اس مسئلے سے نپٹنے کی جو کوشش فی الوقت کر رہی ہیں ویسی کوشش اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی اور پوری توقع ہے کہ مرکزی حکومت کے فیصلے کے مطابق شرح پیدائش جو پانچویں پانچ سالہ منصوبے کی ابتدا میں ۳۵ فی ہزار تھی اسے چھٹے منصوبے کے آخر تک گھٹا کر ۲۵ فی ہزار کیا جا سکے گا۔ اترپردیش بھی اس عظیم قومی پروگرام میں اپنے طور پر پوری جد و جہد میں مصروف ہے اور ہر محاذ پر اس سلسلے میں پیش رفت ہو رہی ہے۔ مرکز نے یوپی کے لیے سال بھر میں چار لاکھ نس بندیوں کا نشانہ مقرر کیا تھا لیکن ریاستی حکومت نے از خود اسے بڑھا کر ۱۵ لاکھ کر لیا ہے تاکہ اس اہم پروگرام کو زیادہ سے زیادہ کامیاب بنانے میں پوری معاونت ہو سکے۔ اس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حکومت اترپردیش اس مسئلے کو کس درجہ اہمیت دے رہی ہے۔ لیکن یہ کام تنہا حکومت کے کرنے کا نہیں ہے۔ اگر ہمیں اپنے بچوں کا مستقبل عزیز ہے، اگر ہمیں اپنی خوش حالی اور معیشت کو مستحکم بنانا، ترقیاتی پروگراموں کے فوائد کو گھر گھر پہنچانا اور غریبوں کو آسودہ حال بنانا ہے تو اسے منصوبے کے تحت محدود رکھنا ہوگا۔ وقت آ گیا ہے کہ ہم اس پر پوری سنجیدگی کے ساتھ غور کریں بلکہ عمل بھی کریں۔

★



اُتر پردیش شاہراہِ ترقی پر

سماج دشمن عناصر کو وزیر اعلا کا سخت انتباہ ●●● ٹریفک کے قواعد و ضوابط کی پابندی: وزیر اعلا نے ریاست گیر مہم شروع کرنے کا حکم دیا ●●● لکھنؤ کو دل کش بنانے کے لیے تین اسکیموں کی منظوری ●●● اتر پردیش تقاوی قواعد میں ترمیم ●●● سرکاری واجبات کی تیز تر وصولی: محکموں کو وزیر اعلا کی ہدایت ●●● وزیر ریاست شری رمیندر ورما کی جانب سے محکمہ اطلاعات کے جرنلسٹوں کو ترقی کے بہتر امکانات کی یقین دہانی ●●● ہینڈلوم کی ترقی کے لیے جامع پروگرام ●●● معذور بچوں کے لیے اقامتی اسکول

سماج دشمن عناصر کو وزیر اعلا کا سخت انتباہ۔ وزیر اعلیٰ شری نرائن دت تیواری نے حال ہی میں سماج دشمن عناصر کو سخت انتباہ دیتے ہوئے کہا کہ ذخیرہ اندوزوں، چور بازاری کرنے والوں اور اسمگلروں کے خلاف سخت کارروائی کی جائے گی۔ انھوں نے کہا ضروری اشیاء کی قیمتوں میں اضافہ برداشت نہیں کیا جائے گا۔

شری تیواری نے کہا کہ بددیانت تاجروں اور چور بازاری کرنے والوں کے خلاف میسا کے تحت کارروائی کی جائے گی۔ انھوں نے ضلع حکام سے کہا کہ وہ ایسے عناصر کے خلاف فوری کارروائی کریں۔

وزیر اعلیٰ نے ہلدوانی (ضلع نینی تال) میں ہیوبلس کالج گراؤنڈ پر عوام کے ایک بڑے مجمع سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ریاستی حکومت کے پاس غلہ کا کافی اسٹاک ہے۔ ریاستی حکومت نے اب تک ۲,۱۱ لاکھ ٹن گیہوں کی خریداری کی ہے۔

انھوں نے کہا کہ غلط کاروں کو بچانے کے لیے کسی قسم کی سفارش نہیں کی جانا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ ایسی سفارش کو قبول نہیں کیا جائے گا۔

ٹریفک کے قواعد و ضوابط کی پابندی: اتر پردیش میں ٹریفک کے قواعد و ضوابط کی پابندی کے لیے جلد ہی ایک ریاست گیر مہم شروع کی جائے گی۔

وزیر اعلا نے ریاست گیر مہم شروع کرنے کا حکم دیا۔

وزیر اعلا شری نرائن دت تیواری نے اس سلسلے میں ریاستی محکمہ ٹرانسپورٹ کی عملدرآمد مشینری کو حرکت میں لانے کی ہدایت کی اور اس مہم کی تکمیل کے لیے تین ماہ کی مدت مقرر کر دی ہے۔

یہ ہدایات ۲۰ جولائی کو ودھان بھون میں منعقدہ ایک اعلاسطحی کانفرنس میں لیے جانے والے ریاستی ٹرانسپورٹ تنظیم کی کارکردگی کے تفصیلی جائزہ کے دوران دی گئیں۔

وزیر اعلیٰ نے ٹریفک کے ضوابط اور سڑک ضوابط کی خلاف ورزی پر گہری تشویش کا اظہار کرتے ہوئے ڈرائیوروں کو ضبط و نظم کا پابند بنانے اور ان میں ٹریفک کے قواعد کے احترام کا جذبہ پیدا

کرنے کی اہمیت پر زور دیا۔

وزیر اعلا نے محکمۂ نقل و حمل کے عملدرآمد شعبے کو قواعد کے سختی سے نفاذ اور اندھا دھند موٹر گاڑیاں چلانے والے خطاکار ڈرائیوروں کے خلاف سخت کارروائی کرنے کی ہدایت بھی کی۔ انھوں نے کہا کہ زیادہ سے زیادہ اچانک معائنے کئے جانا چاہئیں اور رات کے معائنوں کے پروگرام پر سختی سے عمل کیا جانا چاہیے۔

لکھنؤ کو دلکش بنانے کے لیے تین اسکیموں کی منظوری۔

وزیر اعلا شری نرائن دت تیواری نے حال ہی میں ایک اعلا سطحی جلسے میں جو شہر لکھنؤ کو دل کش بنانے کے طریقے اور ذرائع کی فراہمی پر غور کرنے کے لیے منعقد ہوا تھا لکھنؤ کی سڑکوں کو کشادہ اور درست کرنے کے لیے تین کاموں کی منظوری دیدی۔

ان کاموں کی تخمینی لاگت ۹۴ لاکھ ۳۳ ہزار روپیہ ہے اور ان کو محکمۂ تعمیرات عامہ اولیت کی بنیاد پر مکمل کرے گا۔ ان میں ۱۷ لاکھ ۴۱ ہزار روپے کی تخمینی لاگت سے لکھنؤ کانپور روڈ پر شاردا نہر سے کارپوریشن کی جانچ چوکی تک ۲۸ لاکھ ۵۵ ہزار روپے کی تخمینی لاگت سے ہیوٹ روڈ کے چوراہے سے چھوٹے امام باڑے تک اور ۴۸ لاکھ ۳۷ ہزار روپے کی تخمینی لاگت سے کنٹونمنٹ روڈ پر ٹیڑھی پلیا سے این۔ آر۔ اسپتال تک سڑک کو چوڑا کرنے اور اسے بہتر بنانے کے کام شامل ہیں۔

اس جلسے میں دیگر شرکا کے علاوہ وزیر لوکل سیلف گورنمنٹ ڈاکٹر شریمتی راجیندر کماری باجپئی وزیر ہریجن و سماجی فلاح ڈاکٹر چرن سنگھ، چیف سکریٹری اور ریاستی حکومت، لکھنؤ ڈیولپمنٹ اتھارٹی اور محکمۂ تعمیرات عامہ کے دیگر سینیئر افسروں نے شرکت کی۔

وزیر اعلا نے کہا کہ لکھنؤ شہر کو دلکش بنانے اور اسے صاف ستھرا رکھنے کے کام میں کوئی تساہلی نہ برتی جائے۔ مختلف اسکیموں کو مرتب ہونے اور مقررہ مدت کے اندر عملی جامہ پہنانے کو یقینی بنایا جائے۔ انھوں نے کہا کہ نالوں کی صفائی اور تاریخی عمارتوں کے قریب کی جگہوں کو دلکش بنانے پر خصوصی توجہ دی جانا چاہیے۔

شری تیواری نے سیلاب سے بچاؤ کے لیے گومتی ندی پر تعمیر ہونے والے بند کی رفتار ترقی کے بارے میں بھی استفسار کیا اور کہا کہ وہ لوکل سیلف گورنمنٹ کے ہمراہ جلد ہی بند کا معائنہ کریں گے۔

جلسے میں امام باڑوں اور دیگر تاریخی عمارتوں کے گرد و پیش کو صاف ستھرا رکھنے اور دل کش بنانے، دکھوڑیہ اسٹریٹ اسکیم کی تکمیل صفائی اور کوڑا کرکٹ اٹھانے کے لیے کام میں جدید طریقوں سے کام لینے، نالوں کو ڈھکنے نیز سڑکوں اور چوراہوں کو درست کرنے کی اسکیموں پر تبادلۂ خیال کیا گیا۔ گومتی بیراج کی تکمیل اور باغبانی سے متعلق پروگراموں پر بھی جلسے میں تبادلۂ خیال ہوا۔

اتر پردیش تقاوی قواعد میں ترمیم۔

ریاستی حکومت نے اتر پردیش تقاوی قواعد ۱۹۴۲ء کے قاعدہ ۵۲ میں ترمیم کی ہے جس کا اطلاق گزٹ میں اس کی تاریخ اشاعت سے ہوگا۔

ترمیم شدہ قاعدہ کے تحت یہ بندوبست کیا گیا ہے کہ کلکٹر زرعی قرضہ ایکٹ اور اصلاحات آراضی قرضہ ایکٹ کے تحت افراد کو وقتاً فوقتاً حکومت کی مقرر کردہ شرحوں کے مطابق یا حسب قاعدہ اس حد تک قرضے منظور کر سکتا ہے جس حد تک وہ ضروری سمجھے گا۔ بشرطیکہ اس طرح منظور شدہ رقم اس رقم سے تجاوز نہ کرے جو مجموعی طور پر ضلع کے لیے مخصوص کی گئی ہے۔

چنانچہ پرگنہ حاکم مذکورہ بالا دونوں قوانین کے تحت ۵۰۰۰ روپے تک اور ڈپٹی کلکٹر یا بلاک ترقیاتی افسران ۲۵۰۰ روپے تک کے انفرادی قرضے منظور کر سکتے ہیں۔ تحصیل دار ایکٹ ۱۲ کے تحت صرف ۵۰۰ روپے تک اور نائب تحصیلدار ناگہانی آفات کے معاملے میں ۱۰۰۰ روپے تک کے قرضے منظور کر سکتے ہیں۔

سرکاری واجبات کی تیز تر وصولی: محکموں کو وزیر اعلا کی ہدایات

وزیر اعلا شری نرائن دت تیواری نے پنڈ

آف ریونیو اور سرکاری محکموں نیز سرکاری زمرے کے کارپوریشنوں کے درمیان مسلسل رابطے کی ضرورت پر زور دیا جو اپنے واجبات کی وصولی کے لیے اول الذکر پر انحصار کرتے ہیں۔ انھوں نے متعلقہ محکموں اور کارپوریشنوں کو ہدایت کی کہ وہ ایسے افسر نامزد کریں جو واجبات کی وصولی کا جائزہ لینے اور تیز رفتار وصولی میں حائل دشواریوں کو دور کرنے کے لیے مہینہ میں کم سے کم ایک بار بورڈ کے نمائندوں سے ملیں۔

وزیر اعلا نے ان خیالات کا اظہار اعلا سطح کے ایک جلسہ میں کیا جو دوسری باتوں کے علاوہ زمین کی تقسیم، چک بندی اور مالگزاری نیز دیگر سرکاری واجبات کی وصولی کا جائزہ لینے کے لیے حال ہی میں ودھان بھون میں منعقد ہوا تھا۔ اس جلسے میں دیگر شرکا کے علاوہ وزیر مال شری سوامی پرشاد سنگھ، وزیر ریاست برائے مال شری ویر بہادر سنگھ، چیف سکریٹری شری محمود بٹ، بورڈ آف ریوینیو کے چیرمین اور مال اور دیگر محکموں کے سینیر افسروں نے شرکت کی۔

وزیر اعلا نے سرکاری محکموں کو یہ ہدایت بھی کی کہ وہ اپنے وصولی سرٹیفکیٹ مناسب طور سے تیار کریں اور انھیں بورڈ آف ریوینیو کو وقت کے اندر بھیج دیں تاکہ بورڈ اپنے مقررہ پروگرام کے مطابق وصولی کا بندوبست کر سکے۔ انھوں نے خبردار کیا کہ وصولی سرٹیفکیٹ ایک بار جاری ہونے کے بعد کسی بھی صورت میں واپس نہیں لیے جانا چاہییں۔

وزیر ریاست شری رمیندر ورما کی جانب سے محکمۂ اطلاعات کے جرنلسٹوں کو ترقی کے بہتر امکانات کی یقین دہانی

اطلاعات، بجلی اور محنت کے وزیر ریاست شری رمیندر ورما نے نظامت اطلاعات کے جرنلسٹوں کو (انفارمیشن افسروں) کو یقین دلایا کہ ان میں مایوسی اور جمود کی جو کیفیت ہے اس کو دور کرنے کی غرض سے ان کے لیے ترقی کے مواقع پیدا کیے جائیں گے اور ان کی صلاحیتوں کا بہترین استعمال کیا جائے گا۔

انھوں نے کہا کہ اس محکمہ کے جرنلسٹوں کو جو ذمہ داریاں سپرد کی گئیں ان کو خوش اسلوبی کے ساتھ نبھانے میں وہ اہل ثابت ہوئے ہیں اور اس طرح وہ پوری ہمدردی اور حوصلہ افزائی کے مستحق ہیں۔ انھوں نے کہا کہ جن غیر مستقل جرنلسٹوں نے ۱۰-۲۰-۲۱ ۲۲ سال تک قابل تعریف خدمات انجام دی ہیں انھیں جلد سے جلد مستقل کرنے کی ضرورت ہے۔ تاکہ ان میں تحفظ کا احساس پیدا ہو۔

وزیر موصوف سال رواں کے لیے نئے عہدہ داروں کا انتخاب ہونے کے بعد نظامت اطلاعات اتر پردیش کی جرنلسٹوں ایسوسی ایشن کی جنرل باڈی کے پہلے جلسہ کا افتتاح کر رہے تھے۔ ایسوسی ایشن کے صدر شری رمیش چندر استھانہ نے جلسہ کی صدارت کی۔

وزیر موصوف نے کہا کہ باجپئی کمیٹی کی کچھ سفارشات کو لیکر اور متعدد نئے اقدامات کرکے محکمے کی تنظیم کی جا رہی ہے۔ تاکہ اس کی اہمیت اور افادیت میں اضافہ کیا جا سکے اور اسے ان مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ بنایا جا سکے جن کے تحت آنجہانی گووند بلبھ پنت اور سابق وزیر اعلا ڈاکٹر سمپورنا نند جیسی عظیم شخصیتوں نے اس محکمے کو معرض وجود میں لانے اور اس کی تنظیم کرنے کی شدید ضرورت محسوس کی تھی۔

شری ورما نے محکمہ کے جرنلسٹوں کے مسائل کو ہمدردی سے سنا اور اس بات پر اظہار افسوس کیا کہ ان کے جائز مطالبات مناسب پیروی نہ ہونے کی وجہ سے پورے نہ ہو سکے۔

انھوں نے کہا کہ جرنلسٹوں کو ان کے فرائض منصبی کی بہتر انجام دہی کے لیے مناسب سہولتیں فراہم کی جائیں گی۔

وزیر اعلا کے ڈپٹی سکریٹری شری ٹھاکر پرشاد سنگھ نے کہا کہ میں اپنے ذاتی تجربے کی بنیاد پر یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ محکمے کے جرنلسٹ اپنے فرائض حسن و خوبی سے انجام دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور منصفانہ سلوک کے مستحق ہیں۔

اس سے قبل ایسوسی ایشن کے صدر نے وزیر موصوف کی توجہ جرنلسٹوں کی مستقل ترقی تنخواہ کی شرحوں اور کام کے مناسبت

سے متعلق مسائل کی جانب مبذول کرائی۔

ہینڈلوم کی ترقی کے لیے جامع پروگرام:

ریاستی حکومت سیوارمن کمیٹی کی سفارشات کی بنیاد پر ریاست میں ہینڈلوم زمرہ کی ترقی کے لیے ایک جامع پروگرام بنایا گیا ہے۔ اس سلسلے میں پانچ سال کی مدت میں بنکروں کو ۔۔۔۔ ۱ ہزار کرگھوں پر ٹریننگ دیے کر اور انھیں اعلا درجے کے کرگھے، سوت، رنگ اور کیمیادی اشیا فراہم کرکے ہینڈلوم کو معیاری کپڑا تیار کرنے کی ایک اسکیم وضع کی گئی ہے۔ اس اسکیم کے تحت بنکروں کو کاروباری سرمایہ فراہم کیا جائے گا اور ان کے تیار کردہ مال کی بڑے پیمانے پر خرید و فروخت کے لیے انتظامات بھی کیے جائیں گے۔

اٹاوہ، فرخ آباد، منطقے میں تقریباً۔۔۔ اکرگھوں کا احاطہ کرنے کے لئے ایک برآمدی اسکیم بھی تیار کی گئی ہے۔ میرٹھ، بلند شہر، ایٹہ اور وارانسی اضلاع میں ہینڈلوم کمپلکس قائم کیے جا رہے ہیں جن میں ہتھکرگھا واحدے قائم کرنے کے لیے ۱۹۵ درخواستیں موصول ہو چکی ہیں اور سات صنعت کاروں نے اپنی پراجکٹ رپورٹیں پیش کر دی ہیں۔

ریاست میں گزشتہ ۱۵ر جون تک ۱۵۳۱۴ کرگھوں، اور ۱۲۴۳ بنکروں کو امداد باہمی کے دائرۂ عمل میں لایا گیا اور ریزرو بینک آف انڈیا کی اسکیم کے تحت امداد باہمی زمرے میں ۶۷ لاکھ ۴ ہزار روپے کی گارنٹیاں بنکروں کو جاری کی گئیں۔

بنکروں کی انجمنوں کو ۴ لاکھ ۶۵ ہزار روپے کا سرمایۂ حصص منظور کیا گیا اور ۸۴ نئی امداد باہمی انجمن قائم کی گئیں جن میں سے چار قالین سازی کی صنعت سے متعلق ہیں۔

سوت کا مسئلہ حل کرنے کے لیے اترپردیش ٹکسٹائل کارپوریشن نے سرکاری زمرے میں آٹھ کتائی ملیں اور امداد باہمی زمرے میں دو کتائی ملیں قائم کرنے کے لیے اقدامات کیے ہیں۔

ہینڈلوم کارپوریشن کے فروخت مرکزوں نے جولائی ۱۹۷۵ء سے ۱۵ر جون ۱۹۷۶ء تک کی مدت میں ۱۰ لاکھ ۲۷ ہزار روپے مالیت کے ہینڈلوم کپڑے فروخت کیے۔ اس کے علاوہ ایک عارضی فروخت مرکز الموڑہ میں اور دوسرا ہیرا پیچ میں قائم کیا گیا۔

مئو، سندیلہ، گورکھپور، بارہ بنکی، رام پور اور امروہہ میں جو پیداواری مرکز قائم ہیں انھوں نے جولائی ۱۹۷۵ء سے ۱۵ر جون ۱۹۷۶ء تک کی مدت میں ۹۳ ہزار روپے کی مالیت کا ہینڈلوم سامان تیار کیا۔

اس کے علاوہ ہینڈلوم کارپوریشن نے بنکروں یا ان کی انجمنوں سے براہ راست ۱۳ لاکھ ۴۱ ہزار روپے کا ہینڈلوم کپڑا خریدا جو کارپوریشن کے مختلف فروخت مرکزوں کے ذریعہ فروخت کیا جائے گا۔

معذور بچوں کے لیے اقامتی اسکول:

ریاستی حکومت نے اندھے بہرے اور گونگے بچوں کے علاوہ جسمانی طور پر معذور بچوں کی تعلیم کے لیے لکھنؤ میں ایک اقامتی اسکول قائم کرنے کی غرض سے ۱۲۰۔۔۔ روپے منظور کیے ہیں۔ اس اسکول میں ۵۰ بچوں کے لیے گنجائش ہوگی۔ جنھیں ہائی اسکول تک کی تعلیم مفت دی جائے گی۔ ایسے طالب علموں کو مفت قیام و طعام کی سہولتیں بھی فراہم کی جائیں گی جن کے والدین کی آمدنی ۔۔۔ ۵ روپے ماہانہ تک ہوگی۔ البتہ جن طلبا کے والدین کی ماہانہ آمدنی ۔۔۔ ۵ روپے سے زیادہ ہوگی۔ انھیں قیام و طعام کے لیے ۵۰ روپے ماہانہ ادا کرنا ہوگا۔

نقد و تبصرہ

ابر و باد (مجموعہ کلام) پیام فتح پوری۔ صفحات: ۱۲۸ قیمت: ۴ روپے۔ ملنے کے پتے: ادارۂ شعر و ادب ۸۶/۴ ہمایوں باغ کانپور ۲۔ دانش محل۔ امین آباد۔ لکھنؤ۔

"ابر و باد" مجموعہ کلام ہے مشہور و معروف اور جانے پہچانے شاعر پیام فتح پوری کا۔ اس سے قبل پیام صاحب کے دو مجموعے لالہ زار ۱۹۵۸ء اور "بادۂ شبانہ" ۱۹۶۰ء میں شائع ہو کر منظر عام پر آ چکے ہیں۔ "ابر و باد" میں ۳۴ نظمیں اور ۵۰ غزلیں، چند قطعات و متفرق اشعار شامل ہیں۔ گرد پوش کے حاشیوں پر شور واحدی، "فکر" تونسوی، احتشام حسین اور فراق گورکھپوری کی آرا مجموعہ کے وزن و وقار کی ضمانت کے طور پر شریک ہیں۔ مگر یہ خوشی کی بات ہے کہ دیباچہ کے طور پر پیام صاحب نے سب کچھ خود ہی تحریر کیا ہے اور رسمی دیباچہ نگاری کی روایت کو توڑا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ پیش لفظ میں انھوں نے اپنی شاعری کے بارے میں کم اور اردو نظم و غزل کی روایت اور تاریخ سے زیادہ بحث کی ہے۔ ابر و باد کی کئی نظمیں ظلم و جبر اور ناانصافیوں کے پس منظر میں شاعر کے لطیف اور نازک احساسات و خیالات کی ترجمان ہیں۔ مگر نظموں سے زیادہ پرکشش اور دل کش ان کی غزلیں ہیں جن میں جگہ جگہ ایسے اشعار مل جاتے ہیں جو دعوت فکر و نظر دینے کے ساتھ ساتھ محسوسات کی چمک رکھتے ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

مری حیات ہے خالی مکان کی صورت
مرے حبیب تری راہ کب سے تکتا ہوں

پیام میں ہوں نئے انقلاب کا نغمہ
لہو کی طرح رگوں میں مچلتا جاتا ہوں

میں جلا تو ساتھ میرے کتنی صدیاں جل گئیں
اور دنیا نے یہی سمجھا میں تنہا جل گیا

کیوں نہ میں ایک نئی صبح کی تخلیق کر دوں
کس لیے ڈوبتے سورج سے اجالا مانگوں

کہاں میں گم ہوں مجھے دوستو تلاش کرو
بہت دنوں سے میں خود اپنے انتظار میں ہوں

ظلمتیں چھائی ہیں مے خانے پر
میرے ساغر سے اجالا تو ہوا

دن کے ہمراہ ہو گئے رخصت
دوست بھی روشنی کے بنائے ہیں

ساغر مہدی

عشرتِ غم (مجموعہ کلام) شیو دیال سحاب۔ قیمت: ۲/۱ ۲ روپے
ملنے کا پتہ: سیکٹر ۲۲ چنڈی گڑھ۔

سحاب، جوش ملسیانی کے ہونہار شاگردوں میں نمایاں اور ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ ان کی خداداد صلاحیتوں، خوش مذاقی اور فنی پختگی پر استاد نے بھی اپنے پیش لفظ میں اعتراف کیا ہے:

"سحاب پیدائشی شاعر ہے اور انسانی زندگی کے دوسرے فرائض کی انجام دہی کے علاوہ خدمت شعر و ادب کے لیے اس دنیا میں بھیجا گیا ہے۔"

سہل ممتنع میں شعر کہنا آسان کام نہیں۔ اس میں الفاظ کی شوکت اور تزئین و آرائش تو ہوتی نہیں بلکہ مضامین کی فراوانی خوب ہوتی ہے۔ مقام اطمینان ہے کہ سحاب کے اس مجموعہ میں بیشتر غزلیں اس خوبی سے آراستہ نظر آتی ہیں۔ ان کی پہلی غزل کا ایک شعر زبان کی منھ بولتی مثال بن گیا ہے:

ہر کسی کے لیے غم عشرت
عشرت غم کسی کسی کے لیے

مشہور طنز نگار فکر تونسوی نے سحاب کی شاعری کے متعلق بہت دل چسپ اور پتے کی باتیں تحریر کی ہیں:

"آپ سحاب صاحب کا ایک شعر پڑھ لیجئے۔ اس کے بعد سحاب صاحب کی شخصیت کو پڑھیے تو دونوں چیزیں ایک دوسرے کا ترجمہ معلوم ہوتی ہیں۔ ان کی شخصیت بھی ان کا ہی ایک شعر معلوم ہوتی ہے۔ وہی ٹھہراؤ، وہی متانت، وہی سنجیدگی جو تجربے اور مشاہدے کی گہرائیوں کا پتہ دیتی ہے۔ وہی غور و فکر جس میں ایک صوفی کی سی نرم نرم شوخی اور ایک درویش کی سی بے نیازی شامل ہوتی ہے۔ جو سحاب صاحب کے اشعار میں ملتی ہے اس کی شخصیت کا بھی مستقل حصہ بن چکی ہے۔"

سحاب صاحب کے کلام میں خمریات کے متعلق بھی اشعار ہیں لیکن وہ شاعر معرفت اور فطرت کے شیدائی معلوم ہوتے ہیں کیونکہ انھوں نے شراب، ساقی، ساغر و مینا اور مے خانہ کی اصطلاحیں ضرور استعمال کی ہیں لیکن ان سے دنیاوی تصورات کی طرف ذہن منتقل نہیں ہوتا بلکہ سننے والے کا ذہن حقیقی و ابدی لذتوں کی طرف مرکوز ہو جاتا ہے۔ نمونہ کلام:

وہ روبرو ہوں تو یہ کیف اضطراب نہ ہو
خدا کرے نگہ شوق کامیاب نہ ہو

اس کو دیکھے گا غم اسی کی طرح
غم کو دیکھے جو اجنبی کی طرح

زندگی بھر موت سے ڈرتے رہے
کیا اسی جینے پہ ہم مرتے رہے

(رشید نظر برنی)

نیا دور
جلد ۳۴ نمبر ۷

اکتوبر ۷۶ء ۱۹

ایڈیٹر: خورشید احمد
جوائنٹ ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی

★

پبلشر: یوگیندر نرائن
ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش

پرنٹر: اشوک در
سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری یو پی
مطبوعہ نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ
شائع کردہ محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ۔ اتر پردیش

قیمت فی شمارہ: پچاس پیسے
زر سالانہ: پانچ روپے

ترسیل زر کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ پبلی کیشن پبلک انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو پی لکھنؤ
خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶۔ لکھنؤ
ڈپٹی ڈائرکٹر انفارمیشن پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو پی لکھنؤ

عنوانات

اپنی بات

خاندانی منصوبہ بندی ہمارے ملک کی ترقی اور معیشت کے لیے زندگی اور موت کا سوال بن گئی ہے۔ گزشتہ ۲۵ برس میں ہندستان کی آبادی اتنی تیزی سے بڑھ گئی ہے کہ اگر اس کی روک تھام فوراً نہ کی گئی تو ہمارے تمام ترقیاتی منصوبے خاک میں مل جائیں گے۔ یہ بات سبھی کو معلوم ہوگی کہ دنیا کی آبادی کا ۱۴ فی صد سے زیادہ حصہ ہندستان میں آباد ہے جبکہ ہمارے ملک کا زمینی رقبہ دنیا کے کل رقبے کا صرف ۲ فی صد ہے۔ اس کے باوجود ہمارے ملک کی آبادی کے بڑھنے کی رفتار اتنی تیز ہے کہ ہر سال ہمارے یہاں ایک آسٹریلیا پیدا ہو رہا ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ ہمارے ملک میں اب ہر شخص بے تحاشہ بڑھتی ہوئی آبادی کی سنگینی کو محسوس کرنے لگا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خاندانی منصوبہ بندی پروگرام میں عوام زیادہ سے زیادہ دلچسپی لے رہے ہیں اور عملی تعاون دے رہے ہیں جس کے نتیجے میں مرکزی حکومت نے اتر پردیش کے لیے اس سال ۴ لاکھ کا جو نشانہ مقرر کیا تھا اس کو نہ صرف پورا کر لیا گیا ہے بلکہ ہم اس سے کہیں آگے بڑھ گئے ہیں۔ لیکن یہ انتہا نہیں آغاز کار ہے۔ چنانچہ یہ پروگرام پوری مستعدی اور سرگرمی کے ساتھ جاری رکھا جا رہا ہے اور پوری امید ہے کہ خود پردیش نے اپنے لیے ۱۵ لاکھ کا جو نشانہ مقرر کیا ہے وہ پورا کر لیا جائے گا۔ کوئی مذہب خاندانی منصوبہ بندی کا مخالف نہیں۔ لیکن بعض مفاد پرست عناصر طرح طرح کی افواہیں پھیلا کر اس پروگرام کے خلاف عوام میں غلط فہمی پھیلانے اور اسے ناکام بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ ایک خطرناک کھیل ہے جو ملک کی ترقی اور خوش حالی کے ساتھ یہ عناصر کھیل رہے ہیں۔ حکومت ان سے سختی سے نپٹنے کا تہیہ کر چکی ہے۔ لیکن ہمارا فرض ہے کہ ان شرارت پسندانہ چالوں کو سمجھیں اور انھیں ناکام بنانے میں حکومت کا ہاتھ بٹائیں۔ خاندانی منصوبہ بندی کے سلسلے میں نس بندی کو قانوناً لازمی قرار دینے کا مطالبہ بڑھتا جا رہا ہے۔ لیکن حکومت اس سلسلے میں کسی جبر اور زبردستی کو روا رکھنے کے حق میں نہیں ہے بلکہ پرچار کے ذریعے خاندانی منصوبہ بندی کی افادیت کو ذہن نشین کرنے اور ترغیب و تحریک سے کام لینے پر زور دے رہی ہے۔ چنانچہ اس پروگرام کی رفتار کو تیز تر کرنے کے لیے ۱۶ ستمبر سے ۳۰ ستمبر ۱۹۷۶ء تک قیصر باغ بارہ دری لکھنؤ میں ایک پندرہ روزہ خصوصی ثقافتی پروگرام کا اہتمام اور ایک نمائش کا انعقاد کیا گیا تھا۔ وزیر اعلا اتر پردیش نے اس پروگرام اور نمائش کا افتتاح کرتے ہوئے اعلان کیا کہ ریاست کے تقریباً ۹۰۰ ترقیاتی بلاکوں کو کنبہ بندی پروگرام میں ان کی کارگزاری کی بنیاد پر گرانٹ دی جائے گی۔ اسی طرح کنبہ بندی پروگرام کو اپنانے کے لیے متعدد ترغیبات سے متعلق قواعد و ضوابط بھی وضع کیے گئے ہیں۔ ان امور سے ظاہر ہے کہ حکومت جبر اور زبردستی سے کام نہیں لینا چاہتی۔

گاندھی جی نے کہا تھا "روز افزوں مشکلات کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کرنے ہی میں انسان کی آئندہ ترقی کا راز مضمر ہے۔" آج کے دور میں سب سے بڑا مسئلہ جس کی سنگینی بڑھتی جا رہی ہے اضافہ آبادی کا ہے۔ یہی وہ مسئلہ ہے جس پر قابو پالینے پر ہمارے اقتصادی استحکام، غربت و افلاس کے خاتمے، اخلاقی اقدار کے بلند ہونے اور ترقیاتی کوششوں کے بارآور ہونے کا انحصار ہے۔ گاندھی جینتی کے اس موقع پر اگر خاندانی منصوبہ بندی پر عامل ہونے کا عہد کر کے ہم اسے پورا کرنے کے لیے سرگرم عمل ہو جائیں تو قوم کے باپو نے انسان کی آئندہ ترقی کی جو کسوٹی ہمارے سامنے رکھی ہے ہم اس پر پورے اتریں گے ۔۔ اور یقیناً یہ ہمارے لیے بڑی سعادت ہوگی۔

آہ قاضی نذر الاسلام قاضی نذر الاسلام کا شمار یقیناً دنیا کے ان چند عظیم المرتبت شعرا میں کیا جائے گا جن کے انقلابی نغموں کو ہماری آنے والی نسلیں کبھی نظر انداز نہ کر سکیں گی۔ برصغیر ہند و پاک اور بنگلہ دیش کا یہ بلند پایہ شاعر ۲۹ اگست ۱۹۷۶ء کو اپنے لاکھوں پرستاروں کو داغ مفارقت دے کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دار فانی کو کوچ کر گیا۔ قاضی صاحب جن کو عرف عام میں نذرل کے نام سے پکارا جاتا تھا، سامراج، مذہبی عصبیت اور چھوت چھات کے سخت دشمن تھے۔ بنگلہ زبان نے دو عظیم شاعر پیدا کیے۔ ایک رابندر ناتھ ٹیگور اور دوسرے قاضی نذر الاسلام۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ ایک بار ٹیگور نے نذر الاسلام سے کہا تھا "نذرل! تم بہت اچھے شاعر ہو۔ بنگالی شاعری کو تم پر ناز ہے۔ لیکن تم سیاست سے دور رہ کر ادب اور صرف ادب کی خدمت کرو تو بہت اچھا ہو۔" ٹیگور کی اس بات پر نذر الاسلام نے جواب دیا تھا: "یہی بات مجھ سے نہ کہیے گورو دیو۔ میں دوسروں کو جس راہ پر چلنے کی ترغیب دیتا ہوں اس پر خود بھی چلتا ہوں۔" "ودروہی" نذرل کی وہ شہرۂ آفاق نظم ہے جس نے بنگال میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک آزادی کی زبردست لہر پیدا کر دی تھی۔ اس نظم کا ایک ایک لفظ آگ اگل رہا تھا۔ اسی لیے برطانی حکومت نے اس نظم کو ضبط کر لیا تھا۔ قاضی نذر الاسلام بظاہر ہم سے جدا ہو گئے ہیں لیکن ان کے انقلابی نغمے اور باغیانہ ترانے ہمارے سوئے ہوئے دلوں کو ہمیشہ بیدار کرتے رہیں گے۔ قاضی نذر الاسلام جیسے عظیم المرتبت شاعر صدیوں کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔ ان پر ڈاکٹر اقبال کا یہ شعر پورے طور پر صادق آتا ہے ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے　　　بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

جاں نثار اختر اردو کے ممتاز اور مقبول شاعر جاں نثار اختر کا ۱۸ اگست ۱۹۷۶ء کو بمبئی میں حرکت قلب بند ہو جانے کے سبب انتقال ہو گیا۔ ان کا شمار ترقی پسند تحریک کے صف اول کے شعرا میں کیا جاتا رہا ہے۔ جاں نثار اختر نے نظمیں بھی لکھی ہیں اور رباعیاں بھی اور ان اصناف میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی ہیں، لیکن ان کا اصلی میدان غزل کا تھا۔ وہ صحیح معنوں میں غزل کے مزاج داں تھے۔ جاں نثار اختر ۱۹۱۴ء میں گوالیار میں پیدا ہوئے تھے۔ جہاں ان کے والد مضطر خیر آبادی بہ سلسلۂ ملازمت سکونت پذیر تھے۔ مضطر کا تعلق اودھ کے مردم خیز قصبہ خیر آباد کے مشہور خانوادہ علم و ادب سے تھا جس نے غالب کے یار غار اور مجاہد وطن مولانا فضل حق خیر آبادی جیسی عظیم شخصیت پیدا کی ہے۔ مضطر ایک باذوق اور کہنہ مشق شاعر تھے۔ جاں نثار اختر کو شاعری اپنے والد بزرگوار سے ورثے میں ملی تھی۔ جاں نثار اختر سے لکھنؤ کا بھی بہت گہرا تعلق تھا۔ ان کی پہلی شریک حیات صفیہ، شاعر شہر نگاراں مجاز مرحوم کی بہن تھیں۔ صفیہ کے انتقال کے بعد جاں نثار نے دوسری شادی بھوپال میں کی تھی۔ ان کے پسماندگان میں بیوہ کے علاوہ تین بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ جاں نثار کے متعدد شعری مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں جو خاک دل، پچھلے پہر اور گھر آنگن کے ناموں سے شائع ہوئے ہیں اور کافی مقبول ہیں۔ ان کے شعری کارنامے موضوع و مواد اور زبان و اسلوب کے اعتبار سے اپنے اندر بڑی انفرادیت سموئے ہوئے ہیں۔ ان کے انتقال سے اردو ادب اور شاعری کو ایسا نقصان پہنچا ہے جس کی تلافی نظر نہیں آتی ہے انھوں نے اپنے بارے میں خود ہی کہا ہے ؎ ہماری قدر کرو اے سخن کے متوالو ۔ غزل کو کل نہ ملیں گے مزاج داں ہم سے — ایڈیٹر

فراق گورکھپوری

غزل

وعدے کی رات مرحبا آمدِ یارِ مہرباں
زلفِ سیاہ شب فشاں، عارضِ ناز مہ چکاں

برق جمال میں تری خفتہ سکونِ بیکراں
اور مرا دلِ تپاں آج بھی ہے تپاں تپاں

میری نگاہِ شوق میں آئینہ ہو گیا جہاں
خالِ رخِ حسیں نہ تھے آنکھوں کی تھیں وہ پتلیاں

چھیڑ کے داستانِ غم اہلِ وطن کے درمیاں
ہم ابھی بیچ ہی میں تھے اور بدل گئی زباں

شام بھی تھی دھواں دھواں حسن بھی تھا اداس اداس
یاد سی آکے رہ گئیں دل کو کئی کہانیاں

اپنی غزل میں ہم جسے کہتے رہے ہیں بار بار
وہ تری داستاں کہاں وہ تو ہے زیبِ داستاں

کوئی نہ کوئی بات ہے اس کے سکوتِ یاس میں
بھول گیا ہے سب گلے آج تو عشقِ بدگماں

رات کمال کر گئیں عالمِ کرب و درد میں
دل کو مرے سلا گئیں تری نظر کی لوریاں

سرحدِ غیب تک تجھے صاف ملیں گے نقشِ پا
پوچھ نہ یہ پھرا ہوں میں تیرے لیے کہاں کہاں

کہتے ہیں میری موت پر اس کو بھی چھین ہی لیا
عشق، کہ مدتوں کے بعد ایک ملا تھا ترجماں

رنگ جما کے اٹھ گئی کتنے تمدنوں کی بزم
یاد نہیں زمین کو بھول چکا ہے آسماں

عارضیت کا سوز بھی دیکھ تو سوزِ عارضی
بیتے ہوئے جگوں سے پوچھ کس کو ثبات ہے یہاں

کوئی نہیں جو ساتھ دے تیرے حریمِ راز تک
بکھرے ہوئے نہ دیکھ نجوم دیتے ہیں سب ترا نشاں

جس کو بھی دیکھیے وہی بزم میں ہے غزل سرا
چھڑ گئی داستانِ دل پھر بہ حدیثِ دیگراں

پا نہ سکا تجھے کہیں اے مری جانِ آرزو — ڈھونڈھ لیا عدم عدم دیکھ لیا جہاں جہاں
ایک حقیقتِ وجود کچھ نہیں جس کے ماسوا — گاہ وہی یقیں یقیں گاہ وہی گماں گماں
بیت گئے ہیں لاکھ جگ سوئے وطن چلے ہوئے — پہنچی ہے آدمی کی ذات چار قدم کشاں کشاں
پاؤں سے فرقِ ناز تک برقِ تبسمِ نشاط — حُسنِ چمن فروش کو دیکھ جہاں سے گلستاں
دادِ سخن وری ملی ابروِ ناز اٹھ گئے — ہے وہی داستانِ دل حُسن بھی کہہ اٹھے کہ ہاں
جیسے کھلا ہوا گلاب چاند کے پاس لہلہائے — رات وہ دستِ ناز میں جامِ نشاطِ ارغواں
رازِ وجود کچھ نہ پوچھ صبحِ ازل سے آج تک — کتنے یقین چل بسے کتنے گزر گئے گماں
تجھ سے یہی کہیں گی کیا گزری ہے مجھ پہ رات بھر — جو مری آستیں پہ ہیں تیرے غموں کی سُرخیاں
حُسنِ ازل کی جلوہ گاہ آئینۂ سکوتِ راز — دیکھ تو ہے عیاں عیاں پوچھ تو ہے نہاں نہاں
دُور بہت زمین سے پہنچی ہے اک کرن کی چوٹ — نیم تبسم خفی رہ گئیں پس کے بجلیاں
کتنے تصورات کے، کتنے ہی واردات کے — لعل و گہر لٹا گیا دل ہے کہ گنجِ شائگاں
سینوں میں درد بھر دیا چھیڑ کے داستانِ حُسن — آج تو کام کر گئی عشق کی عمرِ رائیگاں
آہ فریبِ رنگ و بو اپنی شکست آپ ہے — بعدِ نظارۂ بہار بڑھ گئیں اور اُداسیاں
اے مری شامِ انتظار کون یہ آگیا لیے — زلفوں میں اک شبِ دراز آنکھوں میں کچھ کہانیاں

مجھ کو فراقؔ یاد ہے پیکرِ رنگ و بوئے دوست
پاؤں سے تا جبینِ ناز مہر فشاں و مہ چکاں

★

حضور سہسوانی

حضرت جوش ملسیانی

حضرت داغ دہلوی کے تلامذہ کی تعداد سیکڑوں سے تجاوز کر کے ہزاروں تک جا پہنچی تھی۔ جن میں ایک سے ایک بہتر دارفع شاعر ہوا ہے اور قریب قریب سب کے سب فنکارانہ حیثیت کے مالک تھے حضرت نوح ناروی جو حضرت داغ مرحوم کے جانشین کہے گئے اور ایک بلند مرتبہ شاعر تھے۔ جنہیں ناخ الشعرا اور ناخدائے سخن وغیرہ القاب سے نوازا گیا اور فنی اعتبار سے بہت اونچا مقام رکھتے تھے ان کا ارشاد گرامی ہے کہ حضرت داغ کے تلامذہ میں منتہی فن دو ہی ہوئے ایک تو حضرت مولانا احسن مارہروی اور دوسرے حضرت جوش ملسیانی۔!!

حضرت احسن نے ۱۸۹۳ء میں مرزا داغ سے شرف تلمذ حاصل کیا اور ۱۸۹۷ء میں ان کے پاس حیدرآباد تشریف لے گئے جہاں کئی برس ان کی صحبت میں رہ کر اپنے ذوق شعری کا تکملہ کیا۔

جوش ملسیانی ۱۹۰۲ء میں داغ مغفور کے شاگرد ہوئے اور خط وکتابت کے ذریعہ اصلاح لیتے رہے۔ ۱۹۰۵ء میں حضرت داغ کا انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد آپ نے کسی سے اصلاح نہیں لی۔ ہمیشہ اپنے ہی ذوقِ صحیح کی رہنمائی پر بھروسہ کیا۔ اگرچہ حضرت جوش کا زمانہ شاگردی بہت مختصر رہا تاہم آپ نے اپنے ذوق سلیم کی بدولت کافی استفادہ حاصل کیا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے کلام میں داغ کی سی سادگی و برجستگی محاکات و اندازِ بیان میں بے ساختہ پن، محاورات، ضرب المثال اور روزمرہ کا مناسب استعمال بندش کی چستی، لطفِ زبان، مضمون آفرینی، تشبیہات، استعارات اور اشارات وکنایات بکثرت موجود ہیں۔ جہاں کہیں استاد کے رنگ میں قلم اٹھایا ہے تو بس یہی محسوس ہوتا ہے کہ حضرت داغ بول رہے ہیں۔ چند شعر ملاحظہ فرمایئے:

زمانے کی باتوں میں آنا بُرا ہے
بُرے تم نہیں ہو زمانہ بُرا ہے

وہ اب اپنا منہ بھی چھپانے لگے ہیں
کہا تھا کہ آنکھیں دکھانا بُرا ہے

خدا جانے گزری ہے کیا آج ان پر
وہ خود کہہ رہے ہیں زمانہ بُرا ہے

دعاؤں میں ہوگا اثر ہوتے ہوتے
شبِ غم کی ہوگی سحر ہوتے ہوتے

گلہ لب پہ اے دل نہ لانا تھا ہرگز
ستم بھی اگر جان پر ہوتے (ہوتے)

جوش نے اپنی نفاست پسندی، حسنِ مذاق اور ذوقِ سلیم کے تحت اپنے اوپر بہت سی پابندیاں عائد کر لی تھیں اور اپنی زبان کو اس قدر سلیس، عام فہم اور صاف بنا لیا تھا کہ جس کی مثال شاذ و نادر ملتی ہے۔ آپ اپنے معاصرین میں نہایت ممتاز رکھتے تھے۔ ایک مشاق اور قادر الکلام شاعر ہونے کی وجہ سے آپ کی توجہ کسی ایک ہی صنف پر مرکوز نہ تھی۔ بلکہ آپ نظم غزل، قطعہ، رباعی، قصیدہ، مخمس، تضمین، سلام، ترجیع بند مرثیہ، تاریخ، اور مثنویات وغیرہ جملہ اصنافِ سخن پر طبع آزمائی فرماتے

تھے۔ آپ نے جس موضوع پر بھی جو کچھ کہا ہے حقیقت میں حق ادا کر دیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

ہم نے زمینِ شعر کو زرخیز کر دیا
جو نخل بو دیا وہی گل ریز کر دیا

آپ کا یہ شعر بھی گستاخانہ بات نہیں بلکہ حق و صداقت پر مبنی ہے۔ لیکن دراصل آپ غزل کے مسلم الثبوت استاد ہیں۔ اردو شاعری میں رباعی کے بعد غزل ہی مشکل ترین چیز ہے۔ رباعی گو شاعر ہر دور میں کم ہوتے ہیں۔ کیونکہ اچھا رباعی گو بننے کے لیے چالیس پچاس برس کی مشقِ سخن کی ضرورت بتائی جاتی ہے غزل گوئی بھی مشکل فن ہے۔ اس کے لیے بھی اچھی علمی استعداد، اور گہرے مطالعے و مشاہدے کے ساتھ ساتھ نفاست و نزاکتِ زبان اور معرفت فصاحت و بلاغت نیز پاکیزگیٔ تخیل اور رازشناس مزاجِ غزل ہونے کی اشد ضرورت ہے۔ لیکن اس کے کہنے والے جس قدر نظر آئیں گے کسی دوسری صنفِ سخن میں اس کا بیسواں حصہ بھی دکھائی نہ دیں گے۔ مگر اچھے غزل نگاروں کا ہمیشہ فقدان رہا ہے۔

مختصر یہ کہ غزل گوئی ہر دور میں شعرا کو محبوب رہی ہے شاید اسی لیے اسے عروسِ سخن کہا جاتا ہے۔ اگرچہ نظم بھی مسلسل اظہار خیال کے لیے ایک اچھی صنفِ سخن ہے۔ مگر اس کے اثرات محض وقتی ہوتے ہیں جب کہ صدیوں پہلے کہی گئی غزلوں میں آج بھی پہلی سی تازگی پائی جاتی ہے۔ ولی دکنی، حیدا بائی، حاتم، شاہ نصیر وغیرہ کسی بھی قدیم شاعر کی غزل گنگنا کر دیکھیے یہی محسوس ہوگا جیسے یہ ابھی تخلیق کی گئی ہو۔ بہ لحاظ تخیل ــــ بہ لحاظ زبان نہیں۔

ایک کامیاب غزل گو میں جن خوبیوں اور صلاحیتوں کا ہونا ناگزیر ہے جوش میں وہ تمام خوبیاں اور صلاحیتیں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ ان کے اشعار سے زندگی کے چشمے پھوٹتے ہیں۔ ان کے کلام کی روانی میں گنگ و جمن کا بہاؤ ہے جو پہاڑ سے میدان کی طرف اترنے میں ہوتا ہے۔ ان کی خوش بیانی سے روح شادمانی و مسرت سے لبریز ہو جاتی ہے۔ ان کے مضامین کی گرمی دلوں میں حرارت پیدا کرتی ہے۔ آپ نے کوثر و تسنیم میں دھلی ہوئی ٹکسالی زبان میں فصاحت و بلاغت کے ایسے دریا بہائے ہیں کہ دلّی اور لکھنؤ والے بھی غرقِ حیرت ہو گئے ہیں۔ روزمرّہ کی باتوں کو اس انداز سے نظم کیا ہے کہ ان میں جدت و ندرت پیدا ہو گئی ہے۔

آپ کا کلام محاسنِ سخن سے آراستہ و پیراستہ ہے آپ کی شاعری واقعیت کے ساتھ ساتھ صاف، سلیس، سہل اور دل نشین اسلوب اور طرزِ بیان کا اعلیٰ نمونہ ہے لفظی مناسبت، جذباتی ہم آہنگی اور آسودہ تسکین پر سکون بہاؤ کے امتزاج سے وہ بعض اوقات ہمیں ان غنائی وادیوں کی سیر کراتے ہیں جن کا تعلق قلم یا جذبات سے زیادہ وجدان سے ہوتا ہے۔ ذیل کے اشعار میرے بیان کی صداقت کے ضامن ہیں۔

آئینے کو بھی نہیں اس جلوۂ تاباں کی تاب
آپ نے پانی کو بھی آتش بداماں کر دیا

صحرا سے اے جنوں مجھے انکار تو نہیں
لیکن اگر وہاں بھی گزارا نہ ہو سکا

زندگی و مرگ دونوں میں قرینا آ گیا
جس کو مرنا آ گیا سمجھو کہ جینا آ گیا

موت ہی انسان کی دشمن نہیں
زندگی بھی جان لے کر جائے گی

ہمیں تو کر دیا خاموش تم نے
مگر روکو گے کس کس کی زبان کو

جنوں کے ہر انداز میں ہے تغزّل
یہ دیوانگی ہے کہ دیوان اپنا

ابھی عرض کرتا ہوں رودادِ وحشت
ذرا چاک کر لوں گریبان اپنا

منظرِ تصویرِ دردِ دل مٹا سکتا نہیں
آئینہ پانی تو رکھتا ہے پلا سکتا نہیں

داغ کے گھر لنے کا یہ سبق ہے کہ آسان الفاظ میں اونچی بات کہو۔ جوش کے یہاں اس چیز کی افراط ہے۔ آپ نے حسنِ بیان، اور حسنِ زبان کا بھی خاص طور پر خیال رکھا ہے۔ علاوہ بریں آپ کے یہیں

شہد ایسی مٹھاس، پھولوں ایسی ملائمیت اور کلیوں ایسی لطافت و نفاست ہے۔

دل ہمارا غم سے کب خالی رہا   اپنا بھر تارات دن بھرتے رہے

دور کر دیتا ہے راہِ شوق کی تاریکیاں
شمع بن جاتا ہے ہر پروانہ جل جانے کے بعد

کیوں کیا دیر سے حرم کا سفر
تو وہاں بھی نہ تھا یہاں بھی نہیں

اب اتنے پریشان ہوتے ہو کیوں   تمھیں نے تو پہلے شروعات کی
کرم میں تجلّی کا یارب اثر کیوں   بنایا زندگی کو مختصر کیوں
بہت معصوم تھیں ان کی نگاہیں   زمانہ ہو گیا زیر و زبر کیوں

تمنّا خود تمنّا کا ثمر ہے
اسے کہیے نہالِ بے ثمر ہے

جناب جوشؔ اپنی کتاب "آئینہ اصلاح" میں لکھتے ہیں:

"صحت زبان کے بعد شعر کی دوسری خوبی حسن بندش ہے مضمون میں لطافت بھی ہو شعریت بھی ہو۔ زبان بھی فصیح اور ٹکسالی ہو۔ پھر بھی حسنِ بندش کے بغیر شعر بے لطف رہتا ہے۔"

ع   چست جب بندش نہ ہو لطفِ بیاں آتا نہیں

موصوف کے اشعار دوسری شعری خوبیوں کے ساتھ ساتھ حسن بندش کا بہتر نمونہ ہیں:

ناخدا! غافل، ہوا ایک تند، موجیں ہولناک
وہ تو قسمت تھی کہ ساحل پہ سفینا آ گیا

رنجِ دنیا، خوفِ عقبیٰ، بارِ غم، فکرِ نجات
ایک جانِ ناتواں پر سو عذابِ زندگی

عقل بھی رکھتا تھا، طاقت بھی، پر پرواز بھی
پھر یہ کیا سوجھی کہ طائر زیرِ دام آ ہی گیا

وہ لطف ہی نہیں اب وہ بات ہی نہیں اب
یا میں بدل گیا ہوں یا تو بدل گیا ہے

آگے فرماتے ہیں:

"شعر کی زبان بول چال سے پوری مطابقت رکھتی ہو، یا بول چال کے قریب ہو اور شعر حشو و زوائد سے اس حد تک پاک ہو کہ کوئی لفظ نثر بناتے وقت کم نہ کیا جا سکے اور ان کی ترتیب و تناسب بھی ترنم یا موسیقیت کے معیار پر ہو ایسی ٹھوس بندش ہی کو حسن بندش کہا جا سکتا ہے۔ سہل ممتنع سے بھی یہی مراد ہے کہ شعر کی نثر نہ بن سکے۔"

عدم کی مسافت ہو کیوں بار ہم کو
کفن کے سوا کیا ہے سامان اپنا

غم کی بھر مار ہوئی جاتی ہے   زندگی بار ہوئی جاتی ہے
موت کے دھوکے میں ہم کیوں آ گئے   زندگی کا بھی مزا جاتا رہا

جب سے تو نے دشمنی کی اختیار
اعتبارِ دوستی جاتا رہا

حضرت جوشؔ کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے الفاظ میں ایک آدھ لفظ ایسا شامل کر دیتے ہیں جس سے شعر میں بے پناہ پہنائیاں اور وسعتیں پیدا ہو جاتی ہیں اور جس سے شعر کے ایک مرقع میں ان گنت، محاکاتی شکلیں نمایاں ہو جاتی ہیں۔ مثلاً

عنایت بہت ہو چکی زخمِ دل پر
اٹھا لو خدارا نمک دان اپنا

اے دلِ درد آشنا خط کا جواب سن لیا
اور تو بے قرار ہو اور تو انتظار کر

کس گنہگار کو یقین نہیں   اتنے قول و قرار کیا معنی
یاد آتا ہے تبسّم ان کا   سانس تلوار ہوئی جاتی ہے
اے شیخ اگر خلد کی تعریف یہی ہے   میں اس کا طلبگار کبھی ہو نہیں سکتا
دل کو کل تک تو چین حاصل تھا   آج کیا ہو گیا خدا جانے

رنج، غم، درد، آرزو، حسرت
یہ کہیں پنجۂ قضا تو نہیں

اشعار مرقومہ بالا میں ہر ایک شعر اپنے دامن میں معانی و مطالب کا ذخیرہ چھپائے ہوئے ہے۔ کسی ایک شعر کا بھی مفہوم

بیان کیا جائے تو کتنی ہی سطور درکار ہوں گی۔

خمریات، حضرت داغ اور ان کے تلامذہ کا خاص موضوع رہا ہے۔ جوش نے بھی رندی و سرمستی کے بہت سے مضمون باندھے ہیں جنھیں پڑھ کر ذہن پر وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اور قاری یہ خیال کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ ان اشعار کا خالق یقیناً پرلے درجے کا مے نوش ہوگا۔ ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ساقی مجھے دو گھونٹ پہ ٹالا ہے جو تو نے
دل بھی مرا توبہ کی طرح ٹوٹ گیا ہے

حشر میں تھا نامۂ اعمال سب کے ہاتھ میں
میرے ہاتھوں میں مرا ٹوٹا ہوا پیمانہ تھا

وہی رندی ہے جس کے ساتھ شانِ پارسائی ہو
وہ مے کیا دامنِ تقویٰ میں جو چھائی نہیں جاتی

بات رندی کی مجھ کو آتی ہے   پارسائی کی پارسا جانے

داد کے قابل ہیں اس کی مصلحت اندیشیاں
جس نے توبہ توڑ ڈالی ہو گھٹا کو دیکھ کر

جناب جوش کی طبیعت میں متانت و سنجیدگی کی طرح جدّت کو بھی بڑا دخل ہے۔ ذیل کے اشعار جہاں آپ کی جدت طرازی کی منہ بولتی تصویر ہیں۔ وہاں آپ کی فنکارانہ عظمت کو بھی واضح کرتے ہیں:

میری ہر مشکل کو محسن بن کر آساں کر دیا
حق تو یہ ہے موت نے جینے کا ساماں کر دیا

گر گئے شرمِ گنہ سے اور رسوائی ہوئی
داغِ عصیاں میں نے دھو دھو کر نمایاں کر دیا

ہر وقت التجائیں خدا کی جناب میں
کہتے ہیں جس کو عشق عبادت سے کم نہیں

لٹ گئیں جب آرزوئیں، دشمنِ جاں ہو گئیں
ان کی بے سامانیاں بھی حشر ساماں ہو گئیں

ہر رگ میں جلالی صورتیں رندوں کی اے زاہد
فرشتے بن گئے یہ لوگ مے خانوں میں رہ رہ کر

حضرت جوش نے سنگلاخ اور خشک زمینوں میں بھی گل کھلائے ہیں۔ اور ایسے موصوف کی کہنہ مشقی اور قادر الکلامی ہی کہا جا سکتا ہے۔ چند مثالیں درج ذیل ہیں:

منحصر قوتِ بازو پہ ہے دولت مندی
دیکھ لو زور ہیں موجود ہے زر پڑا

ملک الموت سے دنیا میں ہراساں نہیں کون
جس کو کہتے ہیں نڈر اس میں ہے ڈر کم

اشارہ تک نہ لکھّا اس نے کوئی ربط باہم کا
بہت بے ربط ہے خط کا جواب اوّل سے آخر تک

میسّر خاک ہوتا زندگی میں لطفِ تنہائی
رہے دو دو فرشتے ہم رکاب اول سے آخر تک

حضرت جوش کے اشعار برائے بیت نہیں ہیں۔ آپ نے اپنے کلام میں تجربات، مشاہدات، آپ بیتی اور جگ بیتی کو نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ نیز آپ نے مضمون اور بیان دونوں کی پیچیدگیوں سے احتراز کیا ہے۔ دقت پسندی اور فارسیت کی فضول بھرمار آپ کے نزدیک علمیت کا نشان نہیں بلکہ ایک قابلِ ترک لغویت ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمایئے۔

اپنے بچوں کو یہ ناگن مار کے خود کھا جاتی ہے
کس برتے پہ دنیا والے دنیا دنیا کرتے ہیں

انجامِ بقا تو ظاہر ہے انجامِ بقا پر بحث نہ کر
ہر سانس خبر دیتی ہے تجھے ہستی کے ہوا ہو جانے کی

ہر گام پہ آفت ہے مصیبت ہے بلا ہے
ہستی مری نظروں میں گناہوں کی سزا ہے

حضرت جوش ملسیانی ہماری پرانی تہذیب کے آئینہ دار۔ اسی لیے آپ کا شمار باقیاتِ صالحات" میں تھا۔ موصوف نے تقریباً اسّی برس اردو ادب اور شاعری کی بے لوث خدمت کی۔ اردو کی نوک پلک سنوارنے اور اسے نکھارنے میں جو محنت

آپ نے کی ہے وہ قابلِ ستائش ہے۔ آپ نے کلام میں رطب و یابس کی صفائی کی اور متروکات کی سختی سے پابندی کی۔ موصوف اپنی خوش بیانی اور ترزبانی کے لیے اپنا جواب آپ تھے۔ آپ نے ملک کو بڑے بڑے قابل شاگرد بہ کثرت دیئے ہیں۔

موصوف صرف ایک بلند پایہ شاعر ہی نہیں تھے، ایک مستند ادیب اور ایک مایۂ ناز نقاد بھی تھے۔ بادۂ سرجوش، جنونِ دہوش، فردوسِ گوش، دعوتِ عمل" کے علاوہ آپ کا مجموعہ کلام اور شائع ہو چکا ہے۔ "آئینہ اصلاح" میں چار سو سے بھی زیادہ اصلاحات مع توجیہ درج ہیں اور ایک نہایت جامع اور ادبی مضمون بھی شامل ہے۔ جس سے اصلاحات کے سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ یہ کتاب مبتدیکا اور نومشق شعرا کے لیے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ "شرح دیوان غالب" آپ کی ایک معرکہ آرا تصنیف ہے۔ دستور القواعد" ایک کارآمد درسی کتاب ہے۔ "مجموعۂ مضامین" (دو حصے) آپ کے ادبی مضامین کا مرقع ہے۔ اس کے علاوہ متعدد کتابوں میں جوش کے دیباچے، مقدمے اور تقریظیں، ان کی ناقدانہ صلاحیتوں کی مظہر ہیں۔

"جوش ملسیانی یا ابھینندن گرنتھ" (نذرنامہ یا پیش کش نامہ) پانچ سو صفحات پر مشتمل ایک یادگار کتاب ہے۔ جو بزم ادب پنجاب، جالندھر نے ان کی ساٹھ سالہ ادبی خدمات پر انہیں ۱۹۵۸ء میں پیش کی تھی۔

اس ضخیم کتاب میں ملک کے تقریباً تمام وزرا، مشاہیر شعرا اور ادبا کے پیغامات تہنیت ہیں، جن میں آپ کی خدمات کو خلوص دل کے ساتھ سراہا گیا ہے۔ اس کے علاوہ آپ کی شخصیت اور فن پر مشاہیر کے مقالات ہیں۔ اس کے بعد آپ کے شاگردوں، اور شاگردوں کے شاگردوں کا نمونہ کلام اور مختصر حالات زندگی درج ہیں۔

آخر میں موصوف کا ایک مقطع، جو ان کے بارے میں عام خیال کا ترجمان ہے، درج کر دینا ضروری ہے:

انکار کیسے نہ کمالاتِ جوش سے
ستم گو سہی مگر وہ سخن در ضرور تھا

★

غزل

حرمت الاکرام

کیا پکارے گی مجھے سطوتِ جم کی نگری
میں کہاں اور کہاں جاہ و حشم کی نگری

کہیں پگھلی ہے دو اک روز میں زنجیرِ وجود
مدتوں دیتی ہے آواز، عدم کی نگری

کس لیے ہو کوئی آوارۂ صحرائے خیال
دل ہی اللہ کا گھر دل ہی صنم کی نگری

درد سینوں سے گیا نور جبینوں سے گیا
کیا کرے، کس سے تجھے دیر و حرم کی نگری

راز جو لمحوں کو ملتا نہیں اتنا بھی سراغ
کن خرابوں میں ہے روپوش ارم کی نگری

دلِ مجروح! فقط اپنے ہی زخموں کو نہ گن
آسماں بھی ہے سجائے ہوئے غم کی نگری

جھلملاتے ہوئے تاروں سے نہ کھیلو حرمت
محفل آرا ہے پسِ پردہ عدم کی نگری

عبدالرشید

فنِ سیرت نگاری

اور

جیمس باسول کی لائف آف جانسن

ہر زمانے کا بڑا شاعر یا مصنف مقبول و محبوب ہوتا ہے۔ محبت کا تقاضا ہے کہ محبوب کی زندگی کی دلنواز باتیں اور یادیں اس کے بعد بھی بطور یادگار باقی رکھی جائیں۔ سیرت نگاری کا اصلی محرک یہی داعیہ انس و محبت ہے جس کو ایک باکمال سیرت نگار اپنے ناظرین کے دلوں میں پیدا کرنا چاہتا ہے۔

بڑے آدمیوں کے محاسن و کمالاتِ ذاتی کا ذکر سن کر ہمارے دل میں یہ تمنا پیدا ہوتی ہے کہ کاش ہم اس کے زمانے میں ہوتے اور دیکھتے کہ وہ بڑا آدمی کہاں اور کس طرح رہتا تھا۔ اس کے روزمرہ کے مشاغل کیا تھے، کن لوگوں کے ساتھ وہ اٹھتا بیٹھتا تھا، زندگی میں پیش آنے والے واقعات سے وہ کیونکر متاثر ہوتا تھا، اس کی شکل و شباہت کیسی تھی؟ اس کے پسندیدہ مشغلے کیا تھے،

باسول کی معروف و مشہور تصنیف لائف آف جانسن (LIFE OF JOHNSON) اسی تمنائے مشاہدہ و ہم عصری کو بڑی حد تک پورا کرتی ہے۔ جیمس باسول نے ڈاکٹر سیمول جانسن کی سیرت و کردار کا ایسا ہو بہو نقشہ پیش کیا ہے کہ سیرتِ جانسن کا مطالعہ کرنے والے محسوس کرنے لگتے ہیں کہ وہ بھی جانسن کی ادبی مجلسوں میں شریکِ صحبت ہیں۔ باسول نے سیرت نگاری کا ایک نیا باب کھولا۔ اس نے ڈاکٹر جانسن کی شخصیت کی ایسی تصویر کشی کی ہے کہ اس کا کوئی رُخ نظر سے پوشیدہ نہیں رہتا۔ جانسن کی سیرت و کردار کو ان ہی کے دلچسپ مکالمات و مقالات کے اقتباسات کی صورت میں پیش کیا ہے جن میں سے ہر ایک مقالہ بجائے خود مکمل ہے، ایک دوسرے پر منحصر نہیں۔ ہر اقتباس ایک دریچہ ہے جہاں جانسن کی شبیہ اپنی مخصوص وضع و قطع میں نظر آتی ہے۔

کسی سیرت یا سوانح عمری کی خوبی کا دارومدار صاحبِ سیرت کے محاسنِ ذاتی پر اتنا نہیں ہے جتنا کہ خود سیرت نگار کے ذوقِ سلیم اور شعورِ انتخاب پر۔ سیرت نگاری کی اولین غرض و غایت انبساطِ خاطر اور دلچسپی ہے اور افادۂ روحانی یا اصلاحِ اخلاقی اس کا ضمنی فائدہ ہے۔ جن سیرت نگاروں نے اس مقصد کو نظر انداز کر دیا ہے ان کی تالیفات مایوس کن حد تک بے لطف اور بے کیف ہیں۔

سیرت یا سوانح عمری سے متعلق عام تصنیفات جو عموماً امراء و سلاطین یا علماء و مشائخِ دین یا شعراء و مصنفین کے حالاتِ زندگی پر مشتمل ہوتی ہیں ان میں بادشاہوں اور امیروں کی اصلاحاتِ ملکی و مہماتِ سیاسی کا ذکر ہوتا ہے۔ علماء و مشائخ کے سوانحِ حیات میں ان کے علمی و تبلیغی کارنامے تفصیل کے ساتھ بیان کیے جاتے ہیں۔ اولیاء اللہ کے ذکر کے ساتھ ان کا زہد و تقویٰ، ان کی ریاضت و عبادت، تجرد و کرامت کے ایسے واقعات مذکور ہوتے ہیں جو عوام الناس کی دسترس سے باہر ہوتے ہیں۔ ان سوانح عمریوں میں بشریت کے تقاضے اور حیاتِ انسانی کے وہ نشیب و فراز جن کا لُبِّ لباب گلستانِ سعدیؒ کے بابِ سیرتِ درویشاں کا یہ شعر ہے ؎

گہے بر طارمِ اعلیٰ نشینم
گہے بر پشتِ پائے خود نہ بینم

کہیں نظر نہیں آتے۔ زندگی میں اختلافِ احوال اور تناقضِ کردار عین مقتضائے فطرت ہے۔ بزرگوں اور باکمال لوگوں کی سیرت میں بڑی دلچسپی کی چیز ہے لیکن اکثر تذکرہ نویس ان حالات کو نظر انداز

کرتے ہیں۔ باسول کی لائف آف جانسن کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ جہاں اس نے اپنے ہیرو کی عظیم شخصیت اور اس کے کردار کی بلندی کا تذکرہ کیا ہے وہاں اس کی بعض خلقی کمزوریوں کو بھی منظر عام پر لایا ہے جو بجائے خود دلچسپ ہیں اور جن سے ثابت ہوتا ہے کہ باسول کا ممدوح کوئی فرشتہ نہیں بلکہ ایک انسان ہے اور کوئی انسان تمام عیوب بشری سے بالکل پاک و مبرّا نہیں ہو سکتا۔ ان بعض فطری خامیوں کے بالمقابل ڈاکٹر جانسن کی ذاتی خوبیوں کی آب و تاب اور زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے۔ باسول اپنے محبوب ڈاکٹر کو ان کی مخصوص وضع و قطع کے ساتھ دوبارہ زندگی دے کر زندوں کی محفل میں کھڑا کرتا ہے اور ان کو جیتا اور بولتا ہوا دکھاتا ہے۔ انگریزی ادب کی تاریخ میں ڈاکٹر سیمول جانسن کے نام کے ساتھ ان کے سیرت نگار جیمس باسول کا نام بھی ہمیشہ باقی رہے گا۔

باسول کو جانسن کی صحبت کا فیض بیس سال تک حاصل رہا۔ اس طویل مدت میں اس نے اپنے ممدوح کی زبان سے نکلا ہوا ہر علمی نکتہ، ہر لطیفہ بلکہ ان کی زبان و قلم کا ہر چبھتا ہوا فقرہ نہایت صحت کے ساتھ قلمبند کیا ہے۔ اہل علم کے ساتھ جانسن کے مفید و دلچسپ مکالمے، جانسن کا مردانہ کردار، ان کی عظیم اخلاقی خوبیاں، ان کے قومی مذہبی رجحانات، ان کا طریق بحث و استدلال، ان کی نکتہ سنجی، حاضر جوابی اور برجستہ گوئی، ان کی ظاہری طبعی خشونت اور باطنی مہر و محبت، ان کا وہ عجیب و غریب کنبہ جس میں اندھے، اپاہج، لنگڑے اور ادنیٰ طبقہ کے افراد شامل تھے، ان کا غیر معمولی جُثّہ، ان کی مخصوص وضع قطع، ان کا ممتاز لباس یہ سب چیزیں باسول نے ایسی وضاحت اور آب و تاب کے ساتھ پیش کی ہیں کہ ہر طبقہ کے ناظرین ڈاکٹر جانسن سے اسی طرح شناسا ہو گئے ہیں جیسے اپنے ہی خاندان کے کسی فرد سے۔

تمام اہل تذکرہ متفق ہیں کہ فن سیرت نگاری میں باسول کی تصنیف اپنا جواب نہیں رکھتی۔ لارڈ مکالے کا مشہور مقولہ ہے کہ سیرت نگاری کے میدان میں باسول کو اپنے حریفوں پر ایسی فضیلت و سبقت حاصل ہے کہ اس کے نام کے ساتھ اوروں کا ذکر کرنا بھی بے محل ہے۔

سیرت جانسن کی ہر عہد میں مقبولیت کے خاص اسباب اس کے مصنف کا خلوص و انکسار اور راست بیانی ہیں۔ باسول نے جانسن کی زندگی کا کوئی واقعہ بغیر عینی مشاہدہ و ثبوت کے کتاب میں درج نہیں کیا ہے۔ جانسن کی تقریروں اور تحریروں میں ایک لفظ کا بھی تصرف اس نے جائز نہیں سمجھا۔ بعض دوسرے تذکرہ نویسوں کی طرح اپنی شخصیت کو نمایاں کرنے کے بجائے اس نے اپنے ہیرو کی ذات میں اپنی انفرادیت گم کر دی ہے۔ صاحب سیرت اور ناظرین کے درمیان سیرت نگار کہیں حائل نظر نہیں آتا۔ وہ جانسن کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے مگر خود پس پردہ رہتا ہے۔ اپنے آپ کو اگر کہیں نمایاں بھی کرتا ہے تو صرف اس لیے کہ جانسن ہی کی سیرت کا کوئی امتیازی وصف واضح ہو جائے۔ جانسن کے ملکہ ظرافت و بذلہ سنجی کے اظہار کے لیے وہ بعض اوقات ایسے مباحث میں حصہ لیتا ہے جن میں اس کی شکست یقینی ہوتی ہے اور اس کو جانسن کی ستم ظریفی کا نشانہ بننا پڑتا ہے۔ اپنے ممدوح کی عظمت کے سامنے وہ اپنے وقار و خودداری کی مطلق پرواہ نہیں کرتا۔

باسول کے دل میں ڈاکٹر جانسن کا جس قدر احترام تھا اس کا اظہار کتاب کے دیباچہ ہی سے ہوتا ہے۔ لائف آف جانسن کا آغاز وہ اس عقیدت و نیازمندی کی تمہید سے کرتا ہے:۔

"اس عظیم المرتبت شخص کی سیرت پر قلم اٹھانا جو خود فن سیرت نگاری میں تمام ابنائے جنس پر فوقیت رکھتا تھا اور جو اپنی غیر معمولی فطری قابلیتوں اور مختلف علمی کارناموں کے باعث ہر عہد میں عدیم المثال تھا، مجھ جیسے کم مایہ شخص کے لیے ایک جسارت و گستاخی تصور کی جا سکتی ہے۔ مگر چونکہ مجھے ان کے فیض صحبت کا اعزاز بیس سال سے زیادہ عرصہ تک حاصل رہا ہے اور چونکہ اس مدت میں ان کی سیرت لکھنے کا منصوبہ برابر میرے پیش نظر رہا ہے جس سے کہ وہ خود بھی واقف تھے اور میری پرسش حالات کا اطمینان بخش جواب دیتے رہتے تھے۔ اور چونکہ میں ان کے حالات و اقوال کو صحت کے ساتھ قلمبند کرنے میں نہایت محتاط تھا اور ان کی زندگی سے متعلق ضروری اطلاعات فراہم کرنے میں تلاش و تحقیق کا کوئی دقیقہ حتی الامکان میں نے فرو گذاشت نہیں کیا اس لیے میں بزعم خود فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اب تک بہت ہی کم سیرت نگار اس نوعیت کی تصنیف اس سے زیادہ مفید صورت میں معرضِ تحریر میں لائے ہیں۔ البتہ ادبی محاسن کے اعتبار سے مجھے ان فاضل مصنفین سے ہمسری کا دعویٰ نہیں ہے جو مجھ سے پہلے

گذر چکے ہیں:

جیمس باسول اسکاٹ لینڈ کے ایک معزز خاندان کا فرد تھا۔ علوم مروجہ سے فراغت حاصل کرنے کے بعد ادبی تحقیقات اور انسانی زندگی کا مطالعہ اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ مشاہیر وقت سے ملاقات کے شوق میں وہ اسکاٹ لینڈ سے لندن اکثر آتا جاتا رہتا تھا۔ جانسن کے علمی و ادبی کارناموں کی شہرت اور ان کی تصنیفات کے مطالعہ نے باسول کے دل میں جانسن سے ملنے اور اُن کے عقیدتمندوں کے حلقہ میں داخل ہونے کا ذوق و شوق پیدا کیا اور بالآخر اُن سے ملاقات کا ایک ذریعہ نکل ہی آیا۔ ڈاکٹر جانسن سے باسول سے پہلی ملاقات کی تفصیل، باسول ہی کی زبان میں ناظرین کے لیے لطف سے خالی نہ ہوگی۔ باسول لکھتا ہے:

"۱۷۶۳ء میرے لیے ایک یادگار سال ہے کیونکہ اس سال مجھے اس بلند پایہ انسان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا جس کی سیرت میں لکھ رہا ہوں۔ اس تعارف کو میں اپنی زندگی کی سب سے بڑی کامیابی تصور کرتا ہوں گا۔ میری عمر اس وقت صرف بائیس سال کی تھی۔ ڈاکٹر جانسن کی تصنیفات سے مجھے روحانی مسرت و ہدایت حاصل ہوئی تھی اور میرے دل میں ان کے لیے ایک عظیم جذبۂ عقیدت و احترام تھا۔

میرے ایک دوست مسٹر ٹامس ڈیویز نے جن کی دکان رسل اسٹریٹ میں تھی مجھے بتایا کہ ڈاکٹر جانسن سے ان کے دوستانہ تعلقات تھے اور جانسن اکثر ان کے گھر آیا کرتے تھے۔ دوشنبہ ۱۶ مئی کی شام کو جب میں مسٹر ڈیویز کے مکان کے دیوان خانے میں مسٹر اور مسز ڈیویز کے ساتھ چائے پی چکا تھا، مسٹر ڈیویز نے ہماری نشست کے کمرے کے شیشے کے دروازے سے جانسن کو ہماری طرف آتے ہوئے دیکھا اور مجھے ان کی مرعوب کن آمد کی اطلاع ہورشیو کی طرح اس انداز میں دی جب وہ ہیملٹ کو اس کے والد کی روح کی آمد کے موقع پر آگاہ کر رہا تھا "میرے آقا! دیکھیے وہ آرہی ہے" ڈاکٹر جانسن کو دیکھ کر مجھے محسوس ہوا کہ ان کی شکل و شباہت اور جثہ میرے تصور کے بالکل مطابق تھا۔

مسٹر ڈیویز نے نہایت ادب کے ساتھ جانسن سے میرا تعارف کرایا اور میرا نام بتایا۔ یہ بات یاد کرکے کہ ڈاکٹر جانسن کو اسکاٹ لینڈ کے باشندوں سے طبعی نفرت تھی میرے خیالات میں ایک ہلچل سی پیدا ہوئی۔ میں نے چپکے سے ڈیویز سے کہا کہ ان سے یہ نہ بتانا کہ میں کہاں سے آرہا ہوں (کہاں کا باشندہ ہوں) مگر ڈیویز نے شوخی سے چلا کر کہا "اسکاٹ لینڈ سے"۔ جب میں نے دیکھا کہ انکشاف راز ہو چکا ہے تو میں نے خود ہی جانسن سے عرض کیا۔

"جناب میں واقعی اسکاٹ لینڈ سے وارد ہوا ہوں — (اسکاٹ لینڈ کا باشندہ ہوں) لیکن اس کے لیے میں معذور ہوں"۔ میری یہ گزارش نامبارک ثابت ہوئی انھوں نے اپنی فطری ذہانت طباعی سے میرے اسکاٹ لینڈ سے وارد ہونے والے فقرے کی گرفت کرلی اور اس کا یہ مطلب لے کر کہ گویا تلاش معاش میں ترکِ وطن کرکے میں اسکاٹ لینڈ سے انگلستان چلا آیا تھا برجستہ کہا

"جناب کچھ آپ ہی اس کے لیے معذور نہیں ہیں بلکہ میں دیکھتا ہوں کہ آپ کے ملک کے باشندوں کی اکثریت ایسا کرنے کے لیے مجبور ہے"۔ جانسن کے اس جملے سے میں حواس باختہ ہوکر رہ گیا اور اس الجھن میں مبتلا ہو گیا کہ دیکھیے اس کے بعد کیا پیش آتا ہے۔ خوش قسمتی سے میں اس پہلی ملاقات میں بالکل محروم و مایوس نہیں ہوا کیونکہ جلد ہی مجھے ان کی درج ذیل مفید علمی گفتگو سننے کا موقع ملا جس کی روداد آج بھی میرے پاس محفوظ ہے۔

جانسن ڈیویز سے مخاطب ہوکر گویا ہوئے "وہ لوگ غلطی پر ہیں جن کا خیال ہے کہ ایک بڑا مصنف اپنی خانگی یا پرائیویٹ زندگی میں بھی عام آدمیوں سے فائق و ممتاز ہوتا ہے۔ یہ لوگ یہ نہیں سمجھتے کہ غیر معمولی قابلیت کے اظہار کے لیے غیر معمولی موقع و محل ضروری ہوتا ہے۔ ہر جگہ اس کا مظاہرہ بے محل ہے"۔

"ایک غیر متمدن سوسائٹی میں علمی اور عقلی برتری قابل قدر ہے لیکن تہذیب کی ملمع کاری کے زمانے میں ایسے افراد کی کمی نہیں ہوتی جو ہر کام مالی اجرت کے عوض میں کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ خاندانی وجاہت، جاہ و ثروت اور عہدے کی فضیلتیں انسان کی ذاتی فضیلت یا عقلی تفوق کے لیے تعظیم و احترام کا کوئی معتدبہ حصہ باقی نہیں رکھتیں۔

اس میں قدرت کی یہ حکمت ہے کہ بنی نوع انسان میں مساوات باقی رہے"۔

ڈاکٹر جانسن کی زندگی سے متعلق جو واقعات باسول نے بیان کیے ہیں ان میں کوئی واقعہ ایسا نہیں ہے جس سے جانسن کی افتادِ طبیعت یا ان کے جذبات رغبت و نفرت کا اظہار نہ ہوتا ہو۔ ڈاکٹر جانسن نے جب انگریزی زبان کا ایک مبسوط لغت مُدوّن کرنے کا ارادہ کیا تو لارڈ چسٹر فیلڈ (جو اس زمانے میں ادبی و علمی خدمات کی سرپرستی کے لیے مشہور تھے) کے سامنے اپنی تجویز پیش کی اور انھوں نے ڈاکٹر جانسن کی ہمت افزائی کی۔ چسٹر فیلڈ کی سرپرستی و امداد کی توقع کے ساتھ جانسن نے تدوین لغت کا کام تنہا شروع کر دیا لیکن پھر چسٹر فیلڈ نے اس اہم ادبی خدمت کی کچھ خبر نہ لی۔ جانسن کو ان کی بے التفاتی بہت شاق گزری۔ بغیر کسی قسم کی اعانت و امداد کے سات سال تک جانسن تنہا لغت کی تدوین میں نہایت انہماک کے ساتھ مشغول رہے۔ جب لغت تکمیل کے قریب پہنچا اور اس کی طباعت و اشاعت کا وقت آیا تو لارڈ چسٹر فیلڈ نے اس توقع کے ساتھ کہ جانسن اپنی اس بلند پایہ تالیف کا انتساب ان کے نام کریں اور اہل علم یہ سمجھیں کہ یہ بیش بہا علمی خدمت انھیں کی سرپرستی میں پایہ تکمیل کو پہنچی ہے، لغت کی تعریف میں دو مقالے لکھ کر دی ورلڈ اخبار میں اشاعت کے لیے بھیجے۔ اخبار کے مالک کے ذریعہ جانسن کو جب اس کی خبر ہوئی تو ان کے جذبۂ وقار و خودداری کو زبردست ٹھیس لگی۔ انھوں نے اپنے مخصوص ادیبانہ انداز میں ایک طنز آمیز خط لارڈ چسٹر فیلڈ کو لکھا جس کا ترجمہ ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے۔ یہ خط سیمول جانسن کی طنز نگاری کا بلیغ نمونہ ہے اور انگریزی ادب کے کلاسکی طنزیات میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ ترجمہ حتی الامکان لفظی کیا گیا ہے اور انگریزی عبارت کی طرزِ نگارش اور اسلوب بیان کو تا مقدور باقی رکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اردو اور انگریزی طرزِ انشا کی ہم آہنگی کا یہ ترجمہ ایک نمونہ ہے:

"جناب والا! دی ورلڈ اخبار کے مالک نے مجھے حال ہی میں اطلاع دی ہے کہ آنجناب نے میری ڈکشنری کی علانیہ ستائش و سفارش میں دو مقالے تحریر فرمائے ہیں۔ یہ خصوصی امتیاز ایسا اعزاز ہے کہ اہل کرم کی امداد و اعانت سے اب تک ناآشنا ہونے کے باعث میں نہیں جانتا کہ کس طرح اس کی پذیرائی کروں اور کن الفاظ میں اس قبولیت کی اطلاع دوں۔

آنجناب کی تھوڑی سی ہمت افزائی کی بنا پر جب میں پہلی بار آپ کے در دولت پر حاضر ہوا تھا تو آنجناب کے طرز تخاطب سے ہو کر ابنائے جنس کی طرح یہ تمنا کیے بغیر نہ رہ سکا کہ میں بھی اسی التفات و عنایت کا مستحق ہوں جس کے لیے دنیا جد و جہد کر رہی ہے لیکن میری حاضر باشی اس درجہ بے وقعت سمجھی گئی کہ خودداری اور انکسار دونوں نے مجھے اس اقدام کو جاری رکھنے کی اجازت نہ دی۔

ایک بار جب میں نے مجمع عام میں آپ کی خدمت میں ہدیہ پیش کیا تھا تو آپ کی خوشنودی اور رضا جوئی کے لیے اپنی ساری قابلیت جو ایک خلوت نشیں غیر درباری ادیب میں ہو سکتی ہے ختم کر دی تھی۔ میرے امکان میں جو خدمات تھیں وہ سب بجا لایا اور کوئی اس بات سے خوش نہیں ہو سکتا کہ اس کا سارا سرمایۂ عمل خواہ کتنا ہی قلیل ہو اکارت کر دیا جائے۔

جناب والا، پورے سات سال گزر گئے جب میں آنجناب کے در دولت پر حاضری دی تھی اور ناکام واپس کر دیا گیا! اس عرصہ میں تدوین لغت کی جد و جہد بڑی دشواریوں میں میں نے جاری رکھی اور بالآخر بغیر کسی سرپرست کی عنایت و ہمت افزائی ایک مشفقانہ تبسم کے اس کام کو منزل تکمیل تک کھینچ لایا۔ آنجناب سے ایسے برتاؤ کا مجھے گمان نہ تھا کیونکہ اس سے پہلے میرا کوئی سرپرست نہ تھا۔

بندہ نواز! کیا سرپرست اسی شخص کو کہتے ہیں کہ جو ایک ڈوبتے ہوئے اور دریا کی موجوں سے لڑتے ہوئے انسان کو ایک انداز بے تعلقی کی نگاہ سے دیکھ لیا کرتا ہے مگر جب وہی آدمی کنارے آ لگتا ہے تو اس کو اپنے احسان سے زیر بار کرنا چاہتا ہے۔

میری محنت و کاوش کی جانب جو التفات آنجناب نے اب فرمایا ہے اگر اس سے پہلے فرمایا ہوتا تو آپ کا عین احسان ہوتا لیکن اس میں اس قدر تاخیر کی گئی کہ اب مجھے اس کی حاجت نہیں رہی اور میں اب اس سے مستفید نہیں ہو سکتا۔ اس میں اس قدر

(باقی صفحہ ۴۱ پر)

وفا ملک پوری

حسرتِ شعلگی

اپنے اشکوں سے جو آنچل کو بھگو کر تم نے
میرے تپتے ہوئے زخموں کا بنایا پھاہا
اس سے کچھ کم ہوئی سینے کی تپش دل کی خلش
اس سے کچھ کم ہوئی وہ کیفیتِ سوختگی
جو علامت تھی مرے جینے کی

اب نہ وہ شعلگیِ دل ہے نہ وہ سوزِ دروں
اب وہ آتش نفسی ہے نہ وہ آہِ سوزاں
اب سلگتی ہے کہیں آگ نہ اٹھتا ہے دھواں
اب جلن ہے، نہ کسک ہے، نہ تپش ہے نہ خلش

اب نہ انگارے دہکتے ہیں مرے سینے میں
سچ تو یہ ہے کہ مزا اب نہیں کچھ جینے میں

اپنی معصوم محبت کا سہارا دے کر
اپنے اشکوں سے مری آگ کو ٹھنڈا کر کے
میرے تپتے ہوئے زخموں کا مداوا کر کے
تم نے اک رسمِ وفا خوب نباہی لیکن
حسرتِ شعلگیِ عشق کو رسوا کر کے

فرحت قادری

دعوتِ نظارہ

حسنِ معصوم جلوہ فگن دیکھیے
ذرہ ذرہ میں اک بانکپن دیکھیے
دیکھیے دستِ قدرت کا فن دیکھیے
اپنی دھرتی کا رنگیں چمن دیکھیے

اس کو سب لوگ کہتے ہیں ہندوستاں
ہیں یہاں عام قدرت کی فیاضیاں
حسن ہی حسن چاروں طرف ہے یہاں
رشکِ فردوس میرا وطن دیکھیے

ترک و قندھار کی داستاں سن چکے
مصر و ایران کے پھول بھی چن چکے
دجلہ و نیل کے خواب تو بن چکے
آئیے! حسنِ گنگ و جمن دیکھیے

یہ اجنتا، ایلورا کی ہے سرزمیں
اس کی مٹی حسیں، اس کے پتھر حسیں
شامِ لندن سے شامِ اودھ کم نہیں
تاج پر چاندنی کی پھبن دیکھیے

مالوہ کی حسیں رات کا یہ سماں
اف یہ صبحِ بنارس کی انگڑائیاں
اور کشمیر کی خوش نما وادیاں
یہ ہمالہ کا سیمیں بدن دیکھیے

حسنِ پنجاب کی اس میں تابندگی
زلفِ بنگال کی اس میں جادوگری
ہر جگہ حسنِ فطرت کی ہے دلکشی
گلستاں دیکھیے، خواہ بن دیکھیے

یہ مساوات و الفت کا دمساز بھی
شانتی اور اہنسا کا ہمراز بھی
رنگ و نکہت بھی ہے ساز و آواز بھی
شاخِ گل کو یہاں نغمہ زن دیکھیے

وقار عزیز

گاندھی جی کی انسانیت دوستی

گاندھی جی صرف اپنی قوم اور ملک ہی کا بھلا نہیں چاہتے تھے بلکہ ان کا وسیع دل تمام انسانوں کی محبت سے لبریز تھا چاہے وہ کسی ملک و قوم اور ذات و مذہب سے تعلق رکھتے ہوں۔ انھوں نے ستیہ گرہ کا تجربہ سب سے پہلے افریقہ میں کیا۔ وہ افریقہ ایک ہندستانی تاجر کے مقدمے کی پیروی کے لیے گئے تھے لیکن وہاں کالے باشندوں کے ساتھ گوروں کے بے جا اور انسانیت سوز سلوک سے ان کا دل تڑپ اٹھا اور انھوں نے اس برتاؤ کے خلاف آواز اٹھائی اور اس کے لیے سخت ترین تکلیفیں بھی جھیلیں۔

انھوں نے خود کہا ہے کہ "دنیا کا مٹ جانے والا راج پانے کی مجھے کوئی آرزو نہیں میرے لیے نجات کا راستہ اپنے ملک اور انسانیت کی خدمت ہے 'میں ہر ذی روح سے خود کو ملا دینا چاہتا ہوں' گیتا کے مطابق میں دوست اور دشمن دونوں سے یکساں سلوک رکھنا چاہتا ہوں اس لیے میری حب الوطنی اسی راستے کی ایک منزل ہے جو کامل آزادی اور امن کی طرف جاتا ہے۔"

گاندھی جی کی اپنے وطن اور قوم سے محبت تنگ نظر قوم پرستی نہیں تھی بلکہ انسانیت دوستی کی ایک منزل تھی۔ وہ یہ برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ کوئی فرد یا ملک کسی شخص یا ملک پر بے جا دباؤ ڈالے یا ان کے ساتھ نامناسب برتاؤ کرے اسی لیے انھوں نے ملک پر بیرونی اقتدار کے خلاف جھنڈا بلند کیا لیکن جنگ آزادی کے دوران ہر منزل پر اس کا پورا خیال رکھا کہ ان کی یہ جنگ انگریزوں کے خلاف نہ ہو جائے بلکہ انگریزی حکومت کے خلاف لڑی جائے۔

'ہندستان چھوڑو' کی تحریک جب اپنے شباب پر تھی اس وقت جیسے ہی انھیں یہ معلوم ہوا کہ برطانوی حکومت کے خلاف جنگ کرنے والوں نے اہنسا کا راستہ چھوڑ کر تشدد کا راستہ اختیار کر لیا ہے اور حکومت کے بجائے افراد کے خلاف جنگ شروع کر دی ہو تو انھوں نے بے مثال اصول پرستی کا ثبوت دیتے ہوئے تحریک روک دینے کا بے دھڑک اعلان کر دیا اور اس کی بالکل پرواہ نہ کی کہ اس سے ان کی ہر دلعزیزی پر آنچ آ سکتی ہے۔ وہ اس اصول کے سختی سے پابند تھے کہ 'نفرت گناہ سے کرو گناہگار سے نہیں' یہی وجہ ہے کہ جب ایک ناعاقبت اندیش نے ان کے سینے پر گولی ماری تو ان کی زبان پر رام نام تھا اور لبوں پر مسکراہٹ اور غصے کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔

سچائی اور اہنسا گاندھی جی کے بنیادی اصول ہی نہیں تھے بلکہ انھوں نے ان دونوں کو زندگی میں برتنے کی بھی پوری کوشش کی۔ سب جانتے ہیں کہ سیاست کا خارزار میدان ایسا ہے کہ اس میں سچائی اور اہنسا کا دامن مضبوطی سے پکڑے رہنا آسان کام نہیں اس کے لیے غیر معمولی روحانی اور اخلاقی قوت کی ضرورت ہوتی ہے گاندھی جی کا یہ سب سے بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے سیاست میں بھی اخلاقی اعلا قدروں کو کبھی نظر انداز نہیں ہونے دیا۔

ملک کے دو حصے ہو جانے کے بعد جب ملکی سرمایہ کی تقسیم ہوئی تو گاندھی جی نے بعض لیڈروں کی سخت مخالفت کے باوجود پاکستان کے حصے کا ایک ایک پیسہ ادا کرنے پر اصرار کیا۔ وہ فوری فائدے

کے لیے کوئی چھوٹی بات کرنے کے لیے کسی طرح تیار نہ ہوتے تھے۔ ان کا اس پر پکا عقیدہ تھا کہ اچھے مقصد کے حصول کے لیے اچھے ذرائع بھی استعمال کرنا ضروری ہیں کیونکہ خراب ذرائع استعمال کرنے سے قوم کا اخلاق گر جاتا ہے۔ اگر خراب ذرائع استعمال کر کے آزادی حاصل بھی کر لی گئی تو اخلاقی طور پر گری ہوئی قوم اس آزادی کی زیادہ دنوں تک حفاظت نہ کر سکے گی بلکہ ملک کے اندر ایسی غیر صحت مند فضا پیدا ہو جائے گی کہ کوئی تعمیری یا ترقیاتی کام خوش اسلوبی سے نہ کیا جا سکے گا۔

ستیہ گرہ جس کے ذریعہ کشت و خون کے بغیر آزادی حاصل کی گئی وہ ایک نیا اور انوکھا تجربہ تھا جو گاندھی جی نے اپنی زبردست اخلاقی اور روحانی قوت کے بل بوتے کامیابی سے کیا جس سے دنیا بھر کی آنکھیں ہندستان کی طرف اٹھ گئیں۔ ستیہ گرہ کا یہ طریقہ جنگ دنیا کے دبے ہوئے غریب اور غیر ترقی یافتہ ملکوں کے لیے ایک ایسا تحفہ تھا جس کا کوئی بدل نہیں ہو سکتا۔ اس ایٹمی دور میں برتری اقتدار کے خلاف غریب ملکوں کا مسلح جنگ کرنا اور آزادی حاصل کرنا قریب قریب ناممکن تھا۔ گاندھی جی نے ستیہ گرہی طریقۂ جنگ اپنا کر تمام ایسے دبے ہوئے غریب ملکوں کے ہاتھ میں ایک غیر دھاردار لیکن موثر ہتھیار دے دیا جس کے ذریعہ وہ اپنی جنگ جاری رکھ سکتے ہیں۔ لیکن اس ستیہ گرہی جنگ کے لیے بھی بڑی تیاری اور ریاض کی ضرورت ہوتی ہے۔ ستیہ گرہ کے سپاہیوں کو سچائی، محبت اور عدم تشدد کی اخلاقی اعلا قدروں سے پوری طرح لیس ہونا چاہیے اور اپنے مخالف کے خلاف ان کا استعمال بغیر کسی نفرت کے کرنا چاہیے۔ انسان بنیادی طور پر شریف ہوتا ہے۔ ایک سچے ستیہ گرہی کا کام اپنے مخالف کے شریفانہ سوئے ہوئے جذبات کو اپنی اخلاقی قوت سے ابھار کر اسے اپنی غلطی کا احساس دلانا ہے۔ تاکہ وہ خود اس غلطی سے منھ موڑ لے۔ طاقت اور جبر و تشدد سے اپنے مخالف سے کوئی بات منوا لینا جنگ کو ہمیشہ کے لیے ختم نہیں کرتا بلکہ ملتوی کر دیتا ہے اور اس طرح جنگ ختم ہو جانے کے باوجود جنگ کی تیاری مسلسل جاری رہتی ہے دنیا میں پائدار اور مکمل امن کے لیے صرف وہی ایک راستہ ہے جس کی طرف گاندھی جی نے رہنمائی کی ہے یعنی سچائی، اہنسا اور محبت۔

اہنسا کے بارے میں بعض وقت یہ غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے کہ یہ ایک طرح سے مجبوری کا نام ہے یعنی ایک کمزور کا عدم تشدد ہے جو خوف کی بنا پر اختیار کیا گیا ہے حالانکہ حقیقت بالکل اس کے برعکس ہے، گاندھی جی نے اس کے متعلق واضح طور پر کہا ہے کہ اہنسا بزدلی نہیں بلکہ ایک نادان کی غلطی پر رحم کا اظہار ہے جب اُن سے پوچھا گیا کہ اگر کسی عورت کی عصمت پر حملہ کیا جائے تو کیا اس وقت بھی اسے اہنسا کی پیروی کرتے ہوئے مزاحمت سے پرہیز کرنا چاہیے تو انھوں نے کہا کہ بزدلی کے ساتھ خاموش رہنے سے بہتر ہے کہ بہادری کے ساتھ مزاحمت کر کے جان دے دی جائے۔ اہنسا کی صحیح پیروی بزدل آدمی نہیں کر سکتا حملہ ہونے پر کمزور سے کمزور آدمی جان بچانے کے لیے ہاتھ پاؤں چلانے لگتا ہے۔ لیکن حملہ آور کے خلاف دل میں نفرت لائے بغیر سینہ کھول کر گولی کھانے کے لیے سامنے کھڑا ہو جانا کسی بزدل کے بس کی بات نہیں۔

کمزوروں کی بھلائی

ایک بہادر انسان کی طرح گاندھی جی کی توجہ سب سے پہلے غریب اور کمزور طبقہ کی بھلائی کی طرف گئی۔ انھوں نے ایک موقع پر کہا تھا "اگر میں دوبارہ جنم لوں تو میری خواہش ہے کہ میں کسی اچھوت کے گھر پیدا ہوں تاکہ ان کے دکھ درد میں ان کا حصہ دار بنوں اور ان کی تکلیف دور کر سکوں۔"

گاندھی جی نے اچھوتوں اور پسماندہ طبقہ کو اوپر اٹھانے کے لیے بالکل ان میں گھل مل جانے کی کوشش کی تاکہ وہ اس احساس کمتری سے نجات پا سکیں جس کا شکار وہ صدیوں سے تھے۔ گاندھی جی نے اپنا لباس اور رہن سہن ایسا رکھا کہ ان میں اور ملک کے غریب طبقہ سے تعلق رکھنے والوں میں کوئی فرق نہ محسوس ہو۔ انھوں نے ہریجنوں کی تعلیم، ترقی اور بہبود کے مسئلہ کو ہمیشہ اہمیت دی۔ خوشی کی بات ہے کہ وہ کام جو گاندھی جی نے شروع کیا تھا اس کی تکمیل کے لیے ہماری وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی بڑی مستعدی سے

اقدامات کر رہی ہیں اور تیزی کے ساتھ ان کی حالت میں سدھار ہو رہا ہے اور وہ سماج میں برابر کا درجہ حاصل کر رہے ہیں۔

گاندھی جی ملک کی ترقی اور استحکام کے لیے یہاں کے مختلف مذہبی فرقوں میں اتحاد و یگانگت پر ہمیشہ زور دیا کرتے تھے لیکن ان کے نزدیک یہ اتحاد خلوص اور محبت کی بنا پر ہونا چاہیے فوری مصلحت کی بنا پر نہیں۔ انھوں نے اپنے اخبار ینگ انڈیا میں اس مسئلے پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ "اتحاد کی بنیاد باہمی خوف پر نہیں ہونی چاہیے بلکہ دو برابر کے ساتھیوں کا اتحاد ہونا چاہیے جو ایک دوسرے کے مذہب کا احترام کرتے ہوں۔"

گاندھی جی کا خیال تھا کہ عوام لڑنا نہیں چاہتے لیکن کچھ لیڈر اپنے مفاد کے لیے ان کو اس کے لیے اکساتے رہتے ہیں اور چھوٹی چھوٹی باتوں کو اتنی اہمیت دے دیتے ہیں جیسے کہ وہ مذہب کا جز ہوں۔ لوگوں کو اس سلسلے میں چوکنا رہنا چاہیے اور ان کے بہکانے میں آکر کوئی ایسی بات نہیں کرنی چاہیے جس سے ہمارے اتحاد کو نقصان پہنچے، اتحاد کے لیے رواداری اولین شرط ہے ہر فرقہ کو دوسرے فرقے کے مذہبی جذبات کا پورا خیال رکھنا چاہیے اور ایک دوسرے کے مذہب کا احترام کرنا چاہیے۔ یہی طریقہ ہے جس سے فرقہ وارانہ اتحاد مضبوط اور مستحکم ہو سکتا ہے۔

گاندھی جی کی یاد تازہ رکھنے کے لیے سب سے بہتر اور مفید طریقہ ان کے بتائے ہوئے راستے پر چلنا اور ان کے ذہن میں آزاد ہندستان کی جو تصویر تھی اس کو مکمل کرنا ہے جس کے لیے سچائی، انسانیت دوستی اور کمزوروں اور غریبوں کو اونچا اٹھانے کی لگن ضروری ہے۔

★

ماتا پرشاد استھانہ زیبؔ بریلوی

اے باپو

ابھی تک آپکے ایثار کی تصویر بنتی ہے　　ابھی تک آپکے پیغام کی تحریر بنتی ہے
ابھی تک آپکے ارشاد کی تاثیر بنتی ہے　　ابھی تک آپکے احساس کی تنویر بنتی ہے
ابھی تک انجمن میں آپکا پیغام رقصاں ہے
ابھی تک آپکے انوار سے محفل فروزاں ہے

حدیث قوم لکھدی آپنے لوحِ محبت پر　　بنادی شکل انساں کی دماغ آدمیت پر
یہانتک دسترس تھی آپکو قانونِ قدرت پر　　لگادی مہر اپنے ظرف کی ایوانِ فطرت پر
حقیقت آپ کی منظور ہے اہلِ حقیقت کو
محبت آپ کی تسلیم ہے اہلِ محبت کو

جوانوں میں وطن کے وقت کی رفتار پیدا کی　　زبانِ دل میں تم نے فطرتِ اظہار پیدا کی
نگاہِ دل میں تمنے قوتِ دیدار پیدا کی　　مزاجِ زندگی میں جرأتِ ایثار پیدا کی
نمایاں ہوگیا خونِ شہیدانِ وطن جس سے
فروزاں ہے زمانے میں چراغِ انجمن جس سے

سمجھ کر سوچ کر ہر مقصدِ قومی کا افسانہ　　اٹھا کر چل دیے ہاتھوں میں کشکولِ فقیرانہ
عجب انداز سے تمنے کیا ہے نظم میخانہ　　چلایا بادۂ ملت کا تمنے ایک پیمانہ
شعورِ ذہن فطرت نے وقارِ آدمیت نے
کہ جس کی پیروی انداز سے کی عہدِ حکمت نے

تمھیں انسانیت کا دیوتا دنیانے سمجھا ہے　　تمھیں عرفانیت کا دیوتا دنیانے سمجھا ہے
تمھیں حقانیت کا دیوتا دنیانے سمجھا ہے　　تمھیں روحانیت کا دیوتا دنیانے سمجھا ہے
تمھیں نے پرچم انسانیت دنیا میں لہرایا
تمھیں نے انجمن میں داستانِ دل کو دہرایا

ہر اک درسِ محبت کو حسیں انداز دیتا ہے　　مزاجِ قوم و ملت کو نیا انداز دیتا ہے
ہر اک پیغام کو آہنگ سوز و ساز دیتا ہے　　زمانہ آپ کی آواز پر آواز دیتا ہے
جسے اندر اکے عہد نے دہرا دیا دنیا نے
آوازِ بلند ارشاد فرما دیا [illegible]

یہاں تک رنگ لائی ہیں خلوصِ دلکی تدبیریں　　وطن کی ہو رہی ہیں مرکزِ جلووں کی تعمیریں
سنائی جا رہی ہیں آپکی دنیا میں تقریریں　　لگائی جا رہی ہیں آپکی محفل میں تصویریں
بجاتے ہیں وطن حسن وفا سے آپکا باجا
مناتے ہیں جنم دن اس ادا سے آپکا باپو

غزل

ساحر لکھنوی

سیماب سے تھے، نقش بہ دیوار ہو گئے
ہم کیسی سازشوں میں گرفتار ہو گئے

لفظِ وفا کا صرف بھی آتا نہیں جنھیں
جنسِ وفا کے وہ بھی خریدار ہو گئے

نکلے تھے بانٹنے کے لیے دوسروں کے غم
خود اپنے ہی غموں میں گرفتار ہو گئے

کیا بات ہے کہ جتنے بھی حسّاس لوگ تھے
اے زیست تیرے نام سے بیزار ہو گئے

یوں چند سائے سے ہیں اماوس کی رات میں
آسیب جیسے نیند سے بیدار ہو گئے

اٹھو کہ ختم ہو گئی ساحرؔ غموں کی رات
آثارِ صبح دیکھو نمودار ہو گئے

غزل

تسنیم فاروقی

راس آئے جنوں کو تو یہ انجام بہت ہے
جینے کے لیے مجھ کو ترا نام بہت ہے

شمشیر برہنہ ہے تو اچھی بھی ہے لیکن
دامن پہ ترے خون کا الزام بہت ہے

کھلتے ہوئے ان پھول سے چہروں پہ نہ جاؤ
اس شہر میں جذبات کا نیلام بہت ہے

یہ زلف کی مہکار میں سمٹا ہوا ساون
مل جائے تو اس چھاؤں میں آرام بہت ہے

آنکھیں ہوں تو ہر گام پہ مکتب ہے یہ دنیا
جینے کا سلیقہ ہو تو پیغام بہت ہے

سب اس کو ترے نام سے پہچان رہے ہیں
اب تک ترے نزدیک جو گمنام بہت ہے

اے ریشمی احساس میں الجھے ہوئے لمحو
تسنیمؔ کو روکو نہ اسے کام بہت ہے

اقبال متین

دستک

(افسانہ)

میں بیٹھا ہوا بچّوں کے جھرمٹ میں کھو گیا ہوں۔

سیاہ اور اندھیری رات میں جگمگاتے ستاروں کی طرح وہ ادھر اُدھر بکھرے ہوئے ہیں چھوٹے بڑے جھلملاتے اور جگ مگ کرتے ہیں۔

کیسی کیسی باتیں ہو رہی تھیں، میٹھی میٹھی، توتلی توتلی باتیں اس طرح دیدے مٹکا رہی ہے کہ سامنے کھڑی ہوئی چھوٹی ٹکّو بس محو حیرت ہے۔ شاید وہ دل ہی دل میں سوچ رہی ہے کہ جب وہ اپنے گھر لوٹے گی اور اپنی ماں سے بات چیت کرے گی تو بالکل استھلیش کی طرح دیدے مٹکائے گی۔

میں چاہتا ہوں کہ ان بچّوں کی ساری کی ساری باتیں سن لوں ــــ استھلیش اور چھوٹی ٹکّو ایک ہو گئے ہیں۔ ان کی زبان میں جو لکنت ہے جو توتلا پن ہے وہ انسانی ضمیر کی ایسی دھڑکن ہے جسے سچائی کی آنکھ ضرور دیکھ سکتی ہے۔ جھوٹ کے کان سن بھی نہیں سکتے اور وہ شاید اسی لیے مجھے اپنی معصومیت کے قریب آنے دیتے ہیں کہ میرے کان بہرے ہو گئے ہیں۔

ننھا زاہد، پائلٹ نشو اور ببلی خاں یہ مثلث اپنی عمر اور شعور کے ناطے دوسروں سے الگ الگ اپنی دنیا بسائے ہوئے ہیں ــــ ان سے بڑی عمر کے بچے انھیں جب چھیڑتے ہیں تو مشترکہ احتجاج کر کے ہم بڑوں سے وہ اپنے موافق فیصلے لیتے ہیں۔ اور اسی طرح اپنی بات منوا لیتے ہیں۔ اپنے سے بڑے بچّوں کے خلاف ان کا احتجاجی شعور بیدار ہو گیا ہے۔ اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے وہ مل جل کر قدم اٹھانے کے قائل ہیں۔

استھلیش اور چھوٹی ٹکّو، میں نے دیکھا ہے کہ ایک دوسرے پر رعب نہیں کستے ہیں۔ اس کی دو وجوہ ہیں ــ ایک تو یہ کہ یہ بچیاں ہیں۔ گڑیاں اور گھروندے ان کے درمیان امن اور محبت کا ایک ذریعہ ہیں، ایک وسیلہ ہیں۔ دونوں میں اَن بن ہوتی بھی ہے تو ایک دوسری کو طرح دے جاتی ہے۔ اور اس طرح ہر گتھی سلجھ جاتی ہے۔ دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ ایک دوسرے پر فوقیت جتانے کی شعوری کوشش کا ان کے ننھے سے ذہنوں میں ابھی کوئی خیال نہیں گزرا ہے۔

پائلٹ نشو (PILOTNASSH SHOO) ببلی خاں اور ننھے زاہد کی بات جدا ہے۔ کھیل کھیل میں ایک دوسرے پر اپنی برتری جتلانا اس عمر کا وطیرہ ہے۔

ببلی خاں نام کے پٹھان ہیں۔ چھریرا بدن، سانولے سلونے بڑے بانکے سے ہیں۔ لیکن کھیل کھیل میں ذرا ان بن ہوئی کہ انھوں نے ننھے زاہد میاں کو جنھیں پیار سے لوگ زدّو بھی پکارتے ہیں بس چیلنج ہی تو کر دیا۔

کہنے لگے۔ لڑلو کشتی۔

کشمیری سیبوں جیسے گال والے زدّو میاں نے ذرا سا سوچا۔ دوہرا بدن ہے کس بل میں بھی ببلی خاں سے زیادہ ہی ہوں گے۔ بڑے ذہین بھی ہیں۔ پتا نہیں کب انھوں نے کھیلتے میں ہتو خاں سے کوئی اڑنگا کھایا تھا کہ بے وجہ کچھ دہشت سی بیٹھ گئی ہے اور

وہ اپنی دانست میں سمجھ بیٹھے کہ ببلی خاں بڑے طاقت ور آدمی ہیں حالانکہ زقّو میاں ذراسی جی داری اور ڈھٹائی سے کام لیں تو شاید ببلی خاں کو پچھاڑ لیں لیکن ایسے موقع پر ان کی عقل ان کے آڑے آتی ہے۔

کشتی کا چیلنج ادھر سے ہوا تو جواب میں کہنے لگے۔

"لڑ لیں گے، ذرا گدا بچھالیں" — یعنی لڑیں گے لیکن نرم گدے پر۔

ادھر ان کی کنّی دبی اور ادھر ببلی خاں شیر ہوئے۔

"گدّا ودّا کچھ نہیں، بس آؤ لڑ لو" —— —

محلّے کے پائلٹ نتّو —— بڑے سجیلے تیکھے نقوش والے دھان پان سے آدمی ہیں۔ انھوں نے جب دیکھا کہ یہ کشتی دشتی کا چکر ان کے بس کا روگ نہیں ہے تو بیچ بچاؤ کو اپنا فرض گردانا —— کہنے لگے ہم تو بڑے ہوکر پائلٹ بنیں گے کشتی لڑیں گے کنگ کانگ اور دارا سنگھ، اور انھوں نے ہوا میں کاغذ کا جٹ پھینکا —— زوں۔ جٹ اڑا اور سب کے سب لڑنا بھڑنا بھول کر جٹ کی طرف بھاگے جو دالان سے ہوکر آنگن میں پہونچ گیا تھا۔

آنگن میں کھڑے تھے ننھے منّے غفورے۔ یہ ابھی ابھی آئے ہیں ننھی گگو کے بڑے بھائی ہیں کچھ سہمے سہمے سے ہیں۔ کاغذ کا جٹ زمین سے اٹھاکر چپکے سے نتّو میاں کے حوالے کردیا ہے جو ان سے ٹکرا کر آنگن میں گرا تھا۔

میں جان گیا ہوں —— وہ کون سی کمی کا احساس ہے جو ننھے غفورے کو ببلی خاں پائلٹ نتّو اور زقّو میاں سے گھل مل کر، شیر و شکر ہوجانے سے روک رہا ہے۔ یہ صرف نیاپن نہیں ہے۔ کچھ اور ہے —— یقیناً کچھ اور ہے۔

غفورے کی قمیض میں دو جگہ پیوند لگے ہیں۔ اور میں دیکھ رہا کہ غفورے کی چار سال عمر میں چار پیوند اس طرح لگ گئے ہیں کہ وہ اپنی عمر کے تقاضوں ہی کو بھول گیا ہے۔

زاہد میاں کہنے لگے میں بھی پائلٹ ہوں۔ دارا سنگھ نہیں ہوں میں "کیری کال" اڑاؤں گا۔

ببلی خاں نے بھی جیسے لنگوٹ کھول دی ہو کہنے لگے، "میں بھی نہیں ہوں کنگ کانگ"۔ اور اب سب کے سب پائلٹ تھے۔ کاغذ کے جٹ اور کاغذی کیرے ول طیارے اب آنگن میں ادھر ادھر اڑ رہے تھے۔ غفورے میاں ہر طیارے کو جو آنگن میں اتر پڑتا تھا اٹھا کر اس کو اپنے پائلٹ کے ہاتھ میں تھما دیتے تھے۔

میرا جی چاہا کہ میں غفورے میاں سے کہوں کہ تم بھی اڑاؤ ہوائی جہاز اور شامل ہو جاؤ اس صف میں۔

میں نے جھٹ سے اخبار پھاڑا اور جھٹ سے ہوائی جہاز بنا ڈالا۔ یہ بھی بھول گیا کہ یہ آج ہی کا اخبار تھا۔ آنگن میں کان پڑے کا شور تھا۔ زوں زوں —— زوں تین کرے دل ایک ساتھ اڑ رہے تھے۔

آنگن میں پہنچ کر میں نے غفورے میاں کے ہاتھ میں بھی جٹ تھما دیا۔

"اڑاؤ —— اڑاؤ بھئی" —— وہ ہیں کہ سمٹ رہے، سکڑ رہے ہیں، لجا رہے ہیں۔ شرما رہے ہیں، میں نے سوچا، میری موجودگی شاید ان کے کھل کر کھیلنے میں مانع ہو —— یہ لجا —— یہ شرم۔ سمٹنے سکڑنے کی یہ ادائیں کہیں وہی تو نہیں ہیں جو میں سمجھ بیٹھا ہوں —— غفورے میاں کہیں اپنے ہی ہاتھوں، اپنی عمر کا ٹینٹوا تو نہیں دبا رہے ہیں —— میں چپکے سے کھسک آیا۔ بالکل اس طرح ان سے الگ ہوگیا جیسے میں انھیں کن انکھیوں سے بھی نہیں دیکھ رہا ہوں۔ اور میں ستون کی اوٹ سے سب کچھ بغور دیکھتا رہا —— غفورے میاں نے اپنا ہوائی جہاز جب اڑایا تو یہ زوں کرتا ہے نہ زاں —— اس ہوائی جہاز کی کوئی آواز ہی نہیں ہے۔ چپکے سے اڑتا ہے چپکے سے اتر پڑتا ہے۔ زوں، زوں کے اس شور میں غفورے میاں کی آواز بھی دب گئی ہوگی کیوں کہ میرا جی نہ چاہتا تھا کہ اس کی بے آوازی کو مان لوں —— میں نے بغور دیکھا کہ غفورے میاں کے لب نہ ملتے ہیں نہ کوئی آواز ہی نکالتے ہیں۔

مجھے ایسا لگا کہ میرے معاشرے نے غفورے میاں کے ہوائی جہاز کی آواز ہی نہیں چھین لی ہے بلکہ ان سے ان کا بچپن

بھی چھین لیا ہے۔

بوڑھے لوگ بچے نظر آئیں تو پھر زندگی پر پیار آتا ہے اور اگر بچے بوڑھے دکھائی دیں تو یوں لگتا ہے جیسے ساری تہذیب مر رہی ہے۔ سارا معاشرہ دم توڑ رہا ہے۔

جب کوئی بچہ اپنے بچپن سے جدا ہو جاتا ہے تو عمر کے لمبے لمبے فاصلے وہ ڈگ بھرنے میں ناپ لیتا ہے

میں نے امیش اور چھوٹی گکو کی طرف دیکھا۔ ان میں کوئی ایسا فرق نہ تھا۔

دو اور تین سال کی عمر میں گندی کرتنی اور کلف دار فراک شاید ایک ہی منزل میں ہوتے ہیں ــــ اور پھر انسان اپنے ہی ہاتھوں میلی کرتنی کو کسی بدرو میں پھینک دیتا ہے اور کلف دار فراک کو ہینگر میں لگا کر شوکیش میں لگا دیتا ہے ــــ ننھی امیش اور چھوٹی گکو ان ساری باتوں سے بالکل بے خبر ہیں۔

لکڑی کے گھروندے پر رنگ برنگی بتیاں جگمگا رہی ہیں۔

کپڑے اور پلاسٹک کی چھوٹی بڑی گڑیاں ان میں بٹھائی جا رہی ہیں۔ سلائی جا رہی ہیں ــــ اور دونوں بس ایک دوسرے میں مگن ہیں ــــ دیدے مٹکا مٹکا کر امیش کچھ کہے جا رہی ہے اور حیرت زدہ ہو کر ننھی گکو سر ہلا رہی ہے ــــ پھر ننھی گکو کچھ کہتی ہے اور دونوں بے ساختہ ہنستے ہیں ــــ ان کے قہقہے جب فضا میں گونج اٹھتے ہیں تو مجھے یہ سوچ کر تسلی ہوتی ہے کہ ان کے قہقہوں کی کھنک ایک سی ہے اور ابھی ننھی گکو کے ذہن میں سمٹے اور سکڑے ہوئے غرور نے کہیں جنم نہیں لیا ہے۔

میں اپنے ہی خیالوں میں گم ہو کر رہ گیا ہوں۔

آنگن میں اڑتے ہوئے طیاروں کی زوں زوں مجھے سنائی نہیں دے رہی ہے۔ چمکدار چھوٹے سے گھروندے سے بھی میری نظریں ہٹ گئی ہیں۔ میں خلا میں کیا دیکھ رہا ہوں مجھے کچھ نہیں معلوم۔

ننھی امیش نے لمبی سی جماہی لی ــــ میں پھر اس جگمگاتے گھروندے کی طرف متوجہ ہو جاتا ہوں۔ جس میں کچھ گڑیاں بیٹھی ہیں ــــ کچھ سو رہی ہیں۔

امیش کی مٹکنے والی آنکھیں اب نیند سے بوجھل ہو رہی ہیں۔

"نیند آ رہی ہے"۔ وہ ننھی گکو سے مخاطب ہوتی ہے اور اٹھ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔

ننھی گکو کا دل ابھی اس جگمگاتے گڑیا گھر سے باہر نہیں آ سکا ہے۔

امیش چپکے سے اٹھ کر چلی آئی اور تخت پر پیر لٹکا کر بیٹھ گئی۔

اس نے پھر ایک جماہی لی ــــ ننھی گکو کی طرف دیکھا جو گڑیا گھر کے پاس بیٹھی گڑیوں کو ٹکر ٹکر تک رہی تھی۔

ننھی امیش نے ننھی گکو کو پکارا۔

"گکو ادھل آئی"ــــ یعنی اس نے کہا گکو ادھر آؤ۔

"گکو اٹھ آئی تو امیش نے کہا۔

"جلا میلی جوتی آتال دو"ــــ یعنی ذرا میری جوتی اتار دو۔

ننھی گکو پتھر کے فرش پر بڑے اطمینان سے بیٹھ گئی ــ اس نے امیش کے پیر اپنی گود میں رکھ لیے اور بڑے انہماک سے چمکتے ہوئے جوتے کے بٹن کھولنے لگی۔

میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا ــ کوئی چنگاری میرے دل کے قریب جل کر پل بھر میں بجھ گئی اور میں ایک جلن سی محسوس کرتا ہوا سوچ رہا ہوں کہ میرے ملک کے بچے کچھ بننے سے پہلے ہی اپنے بچپن کا ادھورا خواب بن کر رہ جائیں تو؟ ــــ پھر اس مستقبل کا کیا ہوگا جو ان سب کا منتظر ہے اور جن کے ہاتھوں اسے سنورنا ہے۔

میں اپنے ہی خیالات میں گم تھا کہ میں نے دیکھا کہ پائلٹ نٹو کا ہوائی جہاز جو ابھی ابھی میرے اوپر سے گزرا ہے روشنی پھینکتا ہوا لینڈ کر رہا ہے۔ سارے بچے تالیاں بجاتے اس کے پیچھے بھاگ رہے ہیں۔

بچوں نے پلاسٹک کی ایک چھوٹی سی باریک تھیلی میں ایک جگنو رکھ چھوڑا تھا اور یہ چمکتی تھیلی چھوٹے سے دھاگے سے کاغذ کے ہوائی جہاز میں [illegible] دی گئی تھی۔

[illegible] پوچھا "کیا نام ہے اس طیارے کا؟"

بچوں میں سے کسی نے پکارا ــــ "اندرا درشنی، اندرا درشنی"۔

(بقیہ صفحہ ۵۱ پر)

نصر قریشی

قطعات بنام شعرائے کرام

زلف و قد و رخسار کے افسانے چھوڑ — اب حسن کی سرکار کے افسانے چھوڑ
اس دور کی تنظیم تجھے کرنی ہے — پازیب کی جھنکار کے افسانے چھوڑ

(۲)

زلفوں کی حکایات میں کیا رکھا ہے — الطاف و عنایات میں کیا رکھا ہے
مستقبلِ رنگیں کے ترانے اب چھیڑ — ماضی کی روایات میں کیا رکھا ہے

(۳)

افکار میں یہ سلسلۂ زلفِ بتاں — یہ حرف و حکایات، یہ انداز بیاں
ڈرتا ہوں کہ سو جائے نہ قوموں کا ضمیر — اے شاعرِ رنگین بیاں روک زباں

(۴)

اشعار میں پھولوں کی نمائش کیسی — بت خانوں میں پھر آج رہائش کیسی
مستقبلِ انساں کا معمار ہے تو — ماضی کے بتوں کی یہ ستائش کیسی

(۵)

آسانی سے مٹتے ہیں کہیں کہنہ رواج — اک روز میں بدلا نہیں کرتے ہیں مزاج
تشکیل تو ہر آن ہوا کرتی ہے — صدیوں میں ہوا کرتی ہے تکمیلِ سماج

(۶)

آؤ غمِ دوراں کا مداوا کر لیں — یعنی غمِ انساں کا مداوا کر لیں
تخریب میں تعمیر کا ساماں کر کے — ہم زخمِ بہاراں کا مداوا کر لیں

خوشنود اعظمی

نہرو کی بیٹی زندہ باد

اک ایمرجنسی میں پوشیدہ تھے کس درجہ مفاد
جس طرف دیکھو ادھر ہے امن و چین و اتحاد
کارناموں کو ترے ہم تا ابد رکھیں گے یاد
تیرے اس اقدام پر کم ہے ملے جتنی بھی داد
سربراہ ملک اے نہرو کی بیٹی زندہ باد

چوربازاری فنا کے گھاٹ جا پہنچی ہے اب
ایک ہنگامہ جنہیں تو تھا اسی کا روز و شب
لوٹ مار اور قتل و غارت ہر طرف تھا بے سبب
ختم تو نے کر دیے فتنے یہاں سے سب کے سب
سربراہ ملک اے نہرو کی بیٹی زندہ باد

کل بلا رشوت دیے اک کام بھی ہوتا نہ تھا
نام سے رشوت کے آج ہر اک یہاں ہے کانپتا
انقلاب آخر کہاں سے ملک بہ یک یہ آ گیا
جو نہ کوئی کر سکا وہ کام تو نے کر دیا
سربراہ ملک اے نہرو کی بیٹی زندہ باد

گوشہ گوشہ میں وطن کے چھا چکی تھی تیرگی
تیری شمع فیض نے ہر سمت کر دی روشنی
نزع کا عالم تھا نبض ملک تھی ڈوبی ہوئی
تو مسیحا بن کے اٹھی دے دی تو نے زندگی
سربراہ ملک اے نہرو کی بیٹی زندہ باد

ناخدائے کشتی ہندوستاں اندرا ہے تو
بزم اہل ہند کی روح رواں اندرا ہے تو
گلستان بھارت تو جان گلستاں اندرا ہے تو
سچ تو یہ ہے اک بہار بے خزاں اندرا ہے تو
سربراہ ملک اے نہرو کی بیٹی زندہ باد

تو مرے پیارے وطن کی جاگتی تقدیر ہے
نور سے تیرے جبین ہند پر تنویر ہے
تیرے دم سے روز افزوں دیش کی توقیر ہے
تو ہی تو گاندھی کے خوابوں کی حسیں تعبیر ہے
سربراہ ملک اے نہرو کی بیٹی زندہ باد

تیرے قدموں کے تلے جب منزل مقصود ہو
تجھ سے ٹکرانے کی کوشش کیوں نہ بے سود ہو
فیض اور ایثار تیرا جبکہ لا محدود ہو
سرزمین ہند کی ہر شے نہ کیوں خوشنود ہو
سربراہ ملک اے نہرو کی بیٹی زندہ باد

پروفیسر افتخار احمد فخر

راز چاند پوری

دبستان سیماب کا مایۂ ناز شاعر اور ایرانی تہذیب اور روایت کا پرستار راز چاند پوری جب ۲۵ راگست ۱۹۶۹ء کو چل بسا تو راقم الحروف نے قطعۂ تاریخ وفات کہا تھا کہ ؎

راز منصف مزاج و صاحب دل	بودہ در فن شاعری کامل
فخر چوں رفت، راز سیمابی	"گفت ہاتف کہ آہ بوالفاضل"
۱۹۶۹ء

مرحوم کا پورا نام محمد صادق، راز تخلص، اور کنیت ابوالفاضل تھی۔ وہ ۲۵ مارچ ۱۸۹۲ء کو جمعہ کے دن اس عالم آب و گل میں تشریف لائے تھے۔[1] والد کا نام منشی حافظ محمد جعفر اور دادا کا نام منشی شیخ نذر تھا۔ راز چاند پوری کا مولد و مسکن قصبہ چاند پور ضلع بجنور (یو۔پی) تھا جس کی خاک سے قائم چاند پوری جیسا باکمال سخن ور پیدا ہوا، اور تاریخ ادب اردو کی زینت بنا۔ راز چاند پوری کے آبا و اجداد فوج سے متعلق تھے مگر زوال سلطنت مغلیہ کے بعد ان کا خاندان صاحب سیف کے بجائے صاحب قلم ہو کر رہ گیا۔ ان کی تعلیم دستور قدیم کے مطابق مکتب میں ہوئی کلام پاک ختم کرنے کے بعد اردو فارسی کی ابتدائی اور متوسط کتابیں منشی شرف الدین عرف میاں جی کلو مرحوم سے پڑھیں۔ فارسی کا نہایت نفیس اور نکھرا ہوا مذاق رکھتے تھے۔ تحصیلی اسکول چاند پور اور گورنمنٹ ہائی اسکول مراد آباد میں اردو اور انگریزی کی تعلیم حاصل کی۔ ذاتی شوق اور توجہ کی بنا پر عربی اور ہندی میں بھی کافی استعداد پیدا کر لی تھی۔

راز چاند پوری کو ذوق شعری ورثہ میں ملا تھا۔ ان کے والد مرحوم بھی شاعر تھے، اور حافظ تخلص کرتے تھے، اگرچہ فن شاعری میں زیادہ مشاق اور مشہور نہ تھے، تاہم راز چاند پوری کے ذوق شعری کو ابھارنے اور تیز کرنے میں ان کے والد مرحوم کی توجہ اور تربیت کو زیادہ دخل رہا۔ وہ خود بھی اردو فارسی کے عالم تھے علمی ادبی نکات بطریق احسن سمجھاتے تھے اتنا ہی نہیں جب انھیں راز چاند پوری کی موزونی طبع کا علم ہوا تو انھوں نے بیٹے کی حوصلہ افزائی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ خود مرحوم راز چاند پوری کا بیان ہے کہ "جب میں ۱۹۱۰ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول مراد آباد میں تعلیم پا رہا تھا تو میرے ہم درس اور ہم عمر ایک صاحب تھے جن کا نام شاید عبدالصمد تھا۔ وہ فتنہ تخلص کرتے تھے۔ ان سے اکثر چھیڑ چھاڑ رہا کرتی تھی اسی زمانہ میں میں نے راز تخلص اختیار کیا تھا۔ جب میں ۱۹۱۲ء میں بسلسلۂ ملازمت آگرہ میں مقیم تھا تو علامہ سیماب اکبر آبادی کے ایک شاگرد قدیم باغ اکبر آبادی کے توسط سے سیماب صاحب کا شاگرد ہو گیا" آگے چل کر وہ بیان کرتے ہیں کہ "جب تک میں آگرہ میں رہا، ہر ہفتہ سیماب صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا اور وہ بھی کبھی کبھی غریب خانہ پر تشریف لاتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ تعلقات بڑھ کر دوستی کی حد تک پہونچ گئے اور سیماب صاحب کی زندگی کے آخری ایام

---

[1] "شاعر" آگرہ اسکول نمبر ۱۹۳۰ء میں ۲۵ شعبان ۱۳۱۰ھ درج ہے۔

تک قائم رہے:

علامہ سیماب اکبرآبادی کی شاگردی پر رازؔ صاحب کو بڑا ناز تھا اور استاد کو بھی اپنے اس مایۂ ناز شاگرد پر کامل اعتماد تھا، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اپنے خطوط میں علامہ مرحوم نے اکثر رازؔ صاحب کو اپنا رفیق صادق تسلیم کیا ہے جیسا کہ علامہ کے مطبوعہ خطوط سے ترشح ہوتا ہے۔ استاد اور شاگرد کے مابین یہ مخلصانہ تعلقات آخر دم تک قائم رہے۔ مرحوم رازؔ چاندپوری نے اپنے استاد کی عظمت کا اعتراف اپنے ایک شعر میں یوں کیا ہے ؎

سیکھی ہے رازؔ میں نے سیمابؔ نکتہ داں سے
یہ رمز شعر گوئی یہ طرز خوش نوائی

وہ نہایت منکسر المزاج، صلح جو اور ملنسار، شہرت سے بے نیاز اور خاندانی شرافت و نجابت کی زندہ تصویر تھے، کشمکش حیات [illegible] کے باوجود ان کے پائے ثبات میں لغزش پیدا نہ ہوئی۔ وضعداری کو ہاتھ سے نہ چھوڑا۔ ہر حال میں خوش رہے اور، اردو فارسی اور انگریزی ادب کے مطالعہ نے انہیں عصری و ادبی تحریکوں سے باخبر رکھا۔ میرے چند استفسارات کے جواب میں جو میں نے اپنے تحقیقی مقالے "سیماب اور دبستان سیماب" کے سلسلہ میں کیے تھے اپنے خط یکم مارچ ۱۹۶۵ء میں انھوں نے مجھے تحریر فرمایا تھا!

"...... زندگی کے تین دور مانے جاتے ہیں بچپن، جوانی اور بڑھاپا۔ کسی ظالم نے ان تینوں ادوار کو ایک مصرع میں موزوں کو دیا ہے ع "خام بودم، پختہ شدم، سوختم" جو میرے ذاتی حالات پر پورے طور سے منطبق ہوتا ہے اور اگر اس وقت کا قصہ معلوم کرنے کا شوق ہو "جب آتش جوان تھا" تو اس کی ایک سرسری جھلک "شاعر" آگرہ ۱۹۳۷ء کے آگرہ اسکول نمبر میں دیکھی جا سکتی ہے میری نظموں کا، ایک مجموعہ "دنیائے راز" سنہ ۱۹۳۰ء میں شائع ہوا تھا جس کی صرف ایک جلد ہی میرے پاس باقی ہے۔ غزلوں کا انتخاب "نوائے راز" سنہ ۱۹۶۱ء میں شائع ہوا تھا اور وہ پبلشر سے مل سکتا ہے۔ نظموں کا مجموعہ اب بازار میں شاید ہی کہیں ہو۔ "شاعر" کے دفتر میں ہونے کا امکان ہے۔ رباعیوں اور نظموں کا انتخاب مرتب کر چکا ہوں لیکن کوئی پبلشر نہیں ملتا۔ خیر میں تو کسی قابل نہیں ملک میں بڑے بڑے شعراء و ادباء ایسے موجود ہیں جو وسائل نشر و اشاعت نہ ہونے کی وجہ سے گوشۂ خمول میں پڑے ہوئے ہیں۔ دنیا واقعی مردہ پرست ہے" ع

"وائے گر ایں است امروز بود فردائے"[1]

یہاں مرحوم رازؔ چاندپوری کی تصانیف و تالیفات کی ایک نامکمل فہرست درج کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے جس میں غیر مطبوعہ تحریریں بھی شامل ہیں۔

(۱) "دنیائے رازؔ" نظموں کا مختصر سا مجموعہ ہے جو سنہ ۱۹۳۰ء میں چھپا تھا۔

(۲) "نوائے رازؔ" انتخاب غزلیات (سنہ ۱۹۱۶ء تا سنہ ۱۹۵۵ء) مطبوعہ سنہ ۱۹۶۱ء جسے ادارۂ انیس اردو، الہ آباد نے شائع کیا تھا۔

(۳) "زرینے افسانے" جو سنہ ۱۹۲۶ء میں شائع ہوئے تھے۔

(۴) "صحیفۂ رازؔ" قدیم و جدید نظموں کا مکمل مجموعہ (غیر مطبوعہ)

(۵) "حدیث رازؔ" رباعیات کا مجموعہ (غیر مطبوعہ)

(۶) "روداد محبت" ٹالسٹائی کے ایک دلکش ناول کا ترجمہ (غالباً غیر مطبوعہ)

(۷) "داستانے چند" سنہ ۱۹۶۸ء میں نسیم بک ڈپو لکھنؤ نے شائع کیا۔

(۸) "داستان عہد گل" مشاہیر علماء و ادباء کے خطوط کا مجموعہ، اسے بھی مئی سنہ ۱۹۷۱ء میں نسیم بک ڈپو لکھنؤ نے ان کی وفات کے بعد چھاپا ہے۔

---

[1] "داستان عہد گل" از رازؔ چاندپوری ص ۱۱، ۱۲ [2] راقم کے نام ایک خط یکم مارچ ۱۹۶۵ء



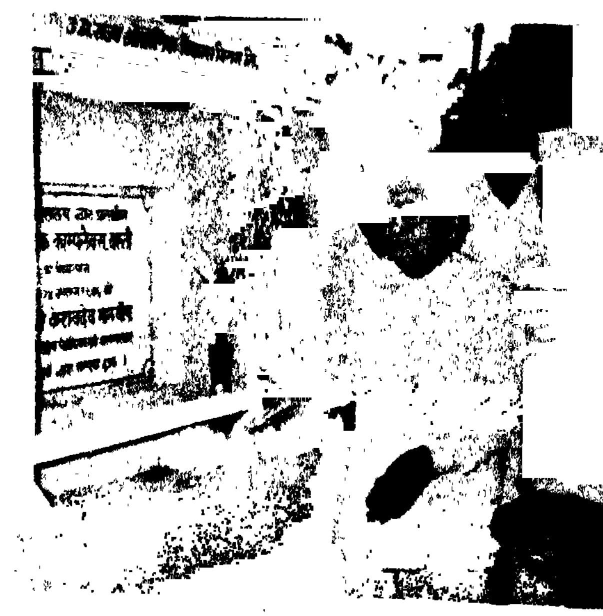
گورنر اترپردیش ڈاکٹر ایم. چنا ریڈی یوم آزادی کے موقع پر پریڈ کی سلامی لے رہے ہیں

گورنر اترپردیش ڈاکٹر ایم چنا ریڈی لکھنؤ یونیورسٹی کے اساتذہ کی کوششوں سے بی. اے (فرسٹ ایر) کے ہندی نصاب کے لیے شائع کی جانے والی کتاب کا اجرا کرتے ہوئے

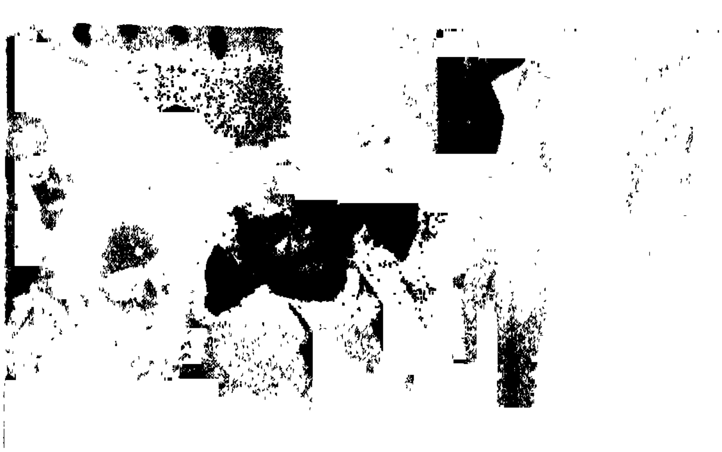




گورنر اتر پردیش ڈاکٹر ایم چنا ریڈی نے ۹ اگست کو راج بھون لکھنؤ میں متعدد ممتاز ادیبوں کو ایوارڈ عطا کیے۔ تصویر میں شریمتی گورا پنت شیوانی
(بائیں) اور ڈاکٹر رام کمار ورما انعامات حاصل کرتے ہوئے



مرکزی وزیر پٹرولیم شری کیشو دیو مالویہ ۱۴ اگست کو بستی میں ۳ کروڑ
روپیے کی لاگت سے تعمیر کی جانے والی پلاسٹک صنعتی بستی
کا سنگ بنیاد رکھ رہے ہیں



وزیر اعلا شری نرائن دت تیواری نے ۳ اگست ۱۹۸۶ء کو رامپور
میں گورنمنٹ گرلز ڈگری کالج رام پور کا افتتاح کیا۔ یہ تصویر
اسی موقع کی ہے



وزیراعلا شری نرائن دت تیواری ۲۰ راگست ۲۰۰۶ء کو مظفر نگر میں تارگھر کی عمارت کا افتتاح کرتے ہوئے



شہید چندر شیکھر آزاد کی استھیاں جب لکھنؤ میوزیم پہنچیں
تو وزیر ریاست برائے اطلاعات شری رمیندر رمااور وزیر برقیات
شریمتی راجندر کماری باجپئی نیز دیگر لوگوں نے استھیوں کی
کی گل پوشی کی



چھوٹی صنعتوں کی وزیر شریمتی محسنہ قدوائی ۲۰ راگست کو
صدر لکھنؤ میں یونین بینک کی جانب سے دیے گئے
قرضے تقسیم کر رہی ہیں





(اوپر) وزیر اعلیٰ ۱۳ اگست ۱۹۷۰ء کو لکھنؤ میں
ڈسٹرکٹ میلتھ و ضلع انفارمیشن افسروں کو
خطاب کر رہے ہیں۔
(بائیں) ضلع بلند شہر میں ۲۰ اگست کو نس بندی
آپریشن کا ایک منظر
(نیچے) وزیر آبپاشی شری لوک پتی ترپاٹھی آگرہ میں
حالیہ سیلاب کا معائنہ کرتے ہوئے



ان تصانیف کے علاوہ مختصر افسانوں کا دوسرا مجموعہ اور علمی و ادبی مضامین کے بھی مجموعے شائع کیے جاسکتے ہیں، کیونکہ اپنے دور میں مرحوم راز چاند پوری نے خوب خوب داد شعر و ادب دی ہے۔ وہ کبھی خاموش نہیں بیٹھے اور علمی ادبی کاموں میں اپنے آپ کو ہمیشہ مصروف رکھا۔ ان کی پوری زندگی خدمتِ ادب و شعر میں گزری۔ انھیں ترجمہ کرنے میں بھی خاص ملکہ حاصل تھا اور وہ اس فن میں بھی کافی مہارت رکھتے تھے۔ ان کے تراجم کے علاوہ بیشتر غزلیں، نظمیں، رباعیاں، افسانے، علمی ادبی مضامین، آئے دن اخبارات اور ملک کے متعدد معیاری رسائل میں شائع ہو کر خراج تحسین وصول کرتے رہے ہیں۔ ان سب کو یکجا کر کے سلیقہ سے شائع کرنے کی ضرورت ہے تاکہ وہ کتابی صورت میں محفوظ ہو جائیں چونکہ اردو ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں۔

میرے ایک دوسرے استفسار پر مرحوم نے اپنی نجی زندگی سے متعلق ایک بار لکھا تھا:

"حضرت!

"۔۔۔۔ چند تصویر بتاں، چند حسینوں کے خطوط تھے، جو، اب نذر طاق نسیاں ہو گئے ہیں۔ خیر ــــ مختصر گویم ــــ چالیس سال کے قریب ملازمت میں گزارے گورنمنٹ فیکٹریز میں فائلوں کی ورق گردانی کے ساتھ کچھ لکھتا پڑھتا رہا۔ کان پور اور جبل پور میں ملازمت کی مدت گزری۔ ۱۹۵۴ء میں ملازمت سے سبکدوش ہو کر کان پور میں مقیم تھا کہ رفیقۂ زندگی نے ساتھ چھوڑ دیا۔ ۱۹۵۵ء میں میرا بڑا لڑکا علی گڑھ یونیورسٹی میں ملازم تھا، منجھلا میرے پاس تھا اور چھوٹا علی گڑھ میں زیر تعلیم تھا۔ راز بیگم کے مرنے کے بعد بڑے لڑکے کی خواہش پر میں یہاں آگیا۔ (۱۹۵۵ء کے آخر میں) آٹھ بچوں میں اب صرف تین باقی ہیں۔ بڑا لڑکا ریڈر ہے، منجھلا اسٹینو گرافر، چھوٹا لکچرار، اور یہ آج کل امریکہ گیا ہوا ہے۔ تینوں کی شادیاں کر چکا ہوں۔ خدا کا شکر ہے اب مجھ پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے ــــ باقی پھر کبھی ــــ یار زندہ صحبت باقی۔ والسلام نیاز کیش راز"[1]

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا۔ ۲۵ اگست ۱۹۶۹ء کو ۷۷ سال کی عمر میں راز چاند پوری کا انتقال ہوا، اور وہیں علی گڑھ میں مدفون ہیں۔ اپنی آخری عمر میں انھوں نے اپنی تحریروں، یادداشتوں اور نظم و نثر کو مرتب کرنے کا کام کیا۔ شعر گوئی عرصے سے ترک تھی۔ ان کے قدیم کلام میں بھی بڑی ندرت و سادگی ہے اور وہ بھی قدر و قیمت کا حامل ہے چنانچہ راز چاند پوری کے کلام پر رائے دیتے ہوئے ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی نے کہا ہے کہ ــــ "۔۔۔۔ شاعر کے یہاں محسوسات بھی ہیں اور تجربات بھی، غم و افسردگی، ناکامی و نامرادی کے لمحے بھی، لیکن شاعر نے ان کو ہضم کرنے کے بعد اسے اس طرح پیش کیا ہے کہ یہ شدت ایک خوشگوار اعتدال میں تبدیل ہو گئی ہے، اور زہر کی تلخی امرت رس معلوم ہونے لگتی ہے ۔۔۔۔ راز صاحب کی شاعری ایک نارمل اور عام انسان کے دکھ درد، مسرت و انبساط، اور اس کی آرزوؤں اور خوابوں کا نارمل اور سادہ اظہار ہے، اس لیے اس میں رنگینی، سرشاری، ربودگی، اڑان، فلسفیانہ فکر، پیچیدگی اور بہت سے ایسے عناصر نہیں ملیں گے جو عام اردو غزل کا طرۂ امتیاز ہیں"[2] چند اشعار ملاحظہ فرمایئے:

ہے ساقی! ایک ساغر، ایک جرعہ، اک نظر
گفتۂ واعظ پہ کچھ تنقید ہونا چاہیے

شعر جدید پر راز چاند پوری کی رائے ملاحظہ ہو

کیا کہا، کیا بے اثر ہے بادۂ شعر جدید
راز اس الزام کی تردید ہونی چاہیے

ان کی غزلوں کے چند منتخب اشعار دیکھیے:

خود غرض ہے برہمن بھی شیخ بھی
ایک دنیا، ایک عقبیٰ سا نہ ہے

---

[1] راقم کے نام ایک خط ۲۲ مئی ۱۹۶۵ء [2] "نوائے راز" از راز چاند پوری دیباچہ ص ۱۴

یہی ہے مختصر روداد راہِ منزل کی
کہ میں خود کھو گیا، ایسا بھی آخر اک مقام آیا

شاید فریب خوردۂ حسنِ بہار ہوں
دشمن سمجھ رہا ہوں ہر اک دیدہ ور کو میں

یہ بزم دہر اور یہ دنیائے روزگار
مدت ہوئی زیارت انساں کیے ہوئے

ہجوم غم میں ہنسنا بولنا دشوار ہوتا ہے
شراب تلخ سے پیدا کیا ہے انگبیں میں نے

انقلابات جہاں دیتے ہیں درسِ زندگی
ہے اگر جینا تو کچھ جینے کا ساماں کیجیے

اہل ظاہر بے خبر ہیں غالباً اس راز سے
خود فراموشی بھی اک صورت ہے اس کی یاد میں

یوں دے رہا ہوں دادِ کرم ہائے بے حساب
گویا نظر میں گردشِ دورِ زماں نہیں

پروفیسر عبدالقادر سروری مرحوم نے حضرت راز چاندپوری کی نظموں کا تجزیہ کرتے ہوئے جو نتائج اخذ کیے ہیں ان سے راز چاندپوری کی نظم گوئی کی خصوصیات پر روشنی پڑتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:۔

"راز صاحب کی شاعری زیادہ تر داخلی رنگ رکھتی ہے۔ ان کی نظمیں واردات قلبی اور احساسات کی ترجمان ہوتی ہیں۔ اس کیفیت کا غلبہ ان پر اس قدر ہے کہ جو نظمیں خارجی تفصیلات سے پُر ہونی چاہییں ان میں بھی شاعر کے جذبات کی فراوانی داخلی رنگ نمایاں کر دیتی ہے۔ مثال کے طور پر ان کی نظم "سکوت شب" ـــــ کافی ہے ـــــ راز کی مرقع نگاری کی عام طور پر یہی خصوصیت ہے۔ راز کی شاعری میں بھی اس زمانے کی جدت پسندی کا اثر موجود ہے۔ بحروں کے انتخاب اور لفظوں کی نشست ترنم اور موسیقی کی نگہداشت، ان کی شاعری میں ہر جگہ نمایاں ہے"[1]

یہاں نظم "سکوت شب" کے چند اشعار درج کیے جاتے ہیں جن سے عبدالقادر سروری کی رائے کی صداقت کا اندازہ ہو سکے گا:

طاری ہے اک سکوت جہانِ خراب پر
ہنگامہ زارِ دہر کی ہر شے خموش ہے

لیلائے شب کے حسن کی جادو طرازیاں
آشفتگانِ عشق کا اب سرد جوش ہے

تنہائی کا خیال نہ احساسِ دردِ دل
پیشِ نگاہ اب کوئی گیسو بدوش ہے

میخانۂ حیات ہے گہوارۂ سکوں
میخوار ہوش میں ہے نہ بادہ فروش ہے

دستِ طلب ہے سبحہ شماری سے بے نیاز
مصروفِ خواب زاہدِ پشمینہ پوش ہے

رندِ خراب حال بھی ہے بے نیازِ ہوش
فردا کی اب ہے فکر نہ کچھ رنجِ دوش ہے

غافل ہے اپنے فرض سے خود ساقیِ حسیں
اب نیم باز نرگسِ پیمانہ نوش ہے

مضرابِ حسن نغمہ طرازی سے بے خبر
سازِ حیاتِ عشق سراپا خموش ہے

المختصر ہے سارا جہاں وقفِ بے خودی
اک رازِ دل فگار کو البتہ ہوش ہے

الغرض راز چاندپوری مرحوم نے تقریباً چالیس سال پہلے ایسی نظمیں لکھی تھیں جنھیں ہم انگریزی زبان میں منظر نگاری یا فطرت کی عکاسی پر مشتمل نظموں کے دوش بدوش رکھ سکتے ہیں۔

وہ نظم و غزل کے نہ صرف اچھے شاعر ہی تھے بلکہ دیگر اصناف سخن میں بھی اپنی طبع رواں کے جوہر انھوں نے دکھلائے ہیں۔ افسانے، تراجم اور علمی ادبی مضامین سے بھی اردو ادب کے دامن کو وسیع کرنے کی انھوں نے سعیِ بلیغ کی ہے اور نصف صدی سے زائد اردو ادب و شعر کی خدمت کی ہے۔ ان کی تخلیقات نظم و نثر قوم کا قیمتی سرمایہ ہیں۔

---

[1] جدید اردو شاعری از عبدالقادر سروری صـ ۲۷۴ و صـ ۲۷۵

غزل

شاکر جڑولی

کوئی پرایا کیسے کہہ دے کون کہے انجانے ہیں
جتنے چہرے آنچل میں ہیں سب جانے پہچانے ہیں

پیار کی ترسی اس دھرتی پر ایسے بھی دیوانے ہیں
پریت نگر میں رہتے ہیں اور چاہت سے بیگانے ہیں

چاند کی دیوی اتنی جلدی کرنوں کا بستر نہ اٹھا
مانگ ابھی بھرنا ہے اس کی گیسو بھی سلجھانے ہیں

دل کا ورق سادہ تو نہیں ہے جس کا جی چاہے پڑھ لے
چند ادھورے گیت ہمارے کچھ ان کے افسانے ہیں

آس کا راہی کیسے گذرے یاس کی سونی راہوں سے
سر پر اڑتی ریت کے بادل پاؤں تلے ویرانے ہیں

من کی دھیرج کیوں کھوتا ہے دکھ کی آندھی میں پنچھی
اک ڈالی گر ٹوٹ گئی تو تیرے لاکھ ٹھکانے ہیں

ناچتے پیروں کا جادو تو سب کو بھاتا ہے لیکن
جو سنگت کا بھید نہ جانیں وہ گھنگھرو بیگانے ہیں

دیپ جلے تو اپنے اپنے من کی جوت جگائیں گے
جان جلانا ایک نہ جانے یوں تو سب پروانے ہیں

قیس کی صورت صحرا صحرا مارے مارے پھرتے ہیں
کون بھلا سمجھائے ان کو شاکر تو دیوانے ہیں

غزل

[illegible]

اغیار کے محلوں پر تنقید نہ کر پہلے
مضبوط بنا اپنا ٹوٹا ہوا گھر پہلے

راحت کے گہر تہہ میں مل جائیں گے اے ناداں
آفات و مصائب کے دریا میں اتر پہلے

اک روز بلندی خود چومے گی قدم تیرے
ماحول کی پستی سے ناداں ابھر پہلے

منزل کی طلب ہے تو چل راہِ تجسس میں
مضبوط ارادوں کو لے ساتھ مگر پہلے

خوشیوں کی تمنا میں غم سہتے ہیں لوگ اکثر
پھولوں کی طلب ہے تو کانٹوں سے گزر پہلے

شیشے کے مکانوں میں کچھ لوگ مقید ہیں
برسائے ہوا لاکر کچھ سنگ اِدھر پہلے

جس گل سے گلستاں میں افزائشِ زینت ہے
اس پر ہی نہ گلچیں کی پڑ جائے نظر پہلے

گم ہو گئے جلوے وہ صحرائے تصور میں
چھائے تھے مرے دل پر جو شام و سحر پہلے

اب شہرِ تمنا میں مدت سے ہے ویرانی
آباد تھا اسے یاد و، کتنا یہ نگر پہلے

تنقید جو کرتے ہیں وہ کرتے رہیں لیکن
جلنے انھیں لازم ہو تحصیل ہنر پہلے

تلک راج گوسوامی

آخری فیصلہ

(افسانہ)

جونہی گاڑی نے رفتار پکڑی سریکھا کے دماغ میں خیالات کا ٹوٹا ہوا سلسلہ ایک بار پھر جڑ گیا۔ اپنے دماغی تناؤ اور تھکاوٹ کو کم کرنے کے لیے اس نے ابھی کچھ دیر پیشتر چائے کا ایک پیالہ لیا تھا چائے کے بعد پان بھی چبایا تھا۔ پان کھانے کی اسے عادت نہیں ہے لیکن جب کبھی وہ دماغی پریشانیوں میں گھر جاتی ہے پان کی ایک گلوری اسے کچھ راحت دیتی ہے۔ اتنا کرنے پر بھی خیالات کی ادھیڑ بن ایک بار پھر شروع ہو گئی۔ وہ بڑی بے چینی سی محسوس کر رہی تھی کبھی وہ پیشانی و کنپٹیوں کو ہاتھ سے دباتی کبھی پھر آنکھیں بند کر کے سونے کی ناکام کوشش کرتی رہی لیکن دماغی پریشانی کم ہونے کے بجائے بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

ابھی چار دن پہلے ہی راجیندر نے اس کے سامنے شادی کی بات کی تھی اور کل شام کو اسے بابوجی کا تار ملا تھا۔ اسے فوراً جلپور پہنچنے کے لیے لکھا تھا۔ وہ بخوبی جانتی تھی کہ اسے کیوں بلایا گیا ہے۔ ایک بار پھر وہی پرانا ڈرامہ کھیلا جائے گا۔ اسے بنا سنوار کر اسٹیج پر لایا جائے گا۔ تھوڑی دیر تک اپنی خونخوار نظروں سے اس کے جسم کی بوٹی بوٹی گننے کے بعد تماشبین لوگ اس کے چہرے پر تھوک کر چل دیں گے۔ لیکن اب وہ ایسا موقع نہیں آنے دے گی۔ وہ دل ہی دل میں خود کو اس بات کے لیے تیار کر رہی تھی کہ اب وہ کسی بازاری شے کی طرح خود کو فروخت کرنے کے لیے پیش نہیں کرے گی۔ وہ بابوجی اور ماں کو صاف الفاظ میں اپنا آخری فیصلہ سنا دے گی۔ کہ اب وہ کسی اور کی ہو چکی ہے اس نے اپنا رفیق حیات چن لیا ہے۔

تبھی اس نے قریب بیٹھے مسافروں کی نظریں بچا کر آہستہ سے اپنا وینٹی بیگ کھولا۔ بیگ میں پڑے ہوئے راجیندر کے فوٹو کو ایک نظر دیکھا اور دل و جسم میں ایک طرح کی سرسراہٹ سی محسوس ہوئی اور اس نے پھر بیگ بند کر دیا۔ راجیندر کی شخصیت اس کے دل و دماغ میں ابھرنے لگی۔ وہ کتنا خیال کرتا ہے میرا۔ جہاں تک ہو سکتا ہے۔ دفتر کے کام میں بھی وہ اس کی مدد کرتا ہے۔ میری سیٹ پر تین ماہ کا ایریر پڑا ہوا تھا۔ اکاؤنٹس آفیسر ہر روز اپنے کمرے میں بلا کر ڈانٹتا تھا شرمسار کرتا تھا۔ دوسرا کوئی بھی میرا ہاتھ بٹانے کو تیار نہ تھا۔ یہ راجیندر کی محنت اور میرے تئیں پریم تھا جس کے تحت اس نے میرے کام کو اپنے گھر لے جا کر اور لنچ ٹائم میں پورا کیا۔ پھر وہ سوچتی کہ اس کے پاس کس چیز کی کمی ہے۔ اپنا شاندار مکان ہے اسکوٹر ہے۔ ماں باپ کا اکلوتا بیٹا ہے پوری جائیداد کا وہی حقدار ہے۔ اس کے پتا شہر کے مانے ہوئے گھڑی فروش ہیں جو گھڑی شہر میں کسی دوکاندار کے یہاں نہیں ملتی وہ ان کی دوکان پر دستیاب ہو جاتی ہے۔ پھر اس کی نظر اپنی آٹومیٹک کلائی گھڑی پر پڑ گئی جو گذشتہ ماہ تحفے کی شکل میں راجیندر نے اسے دی تھی۔ وہ بخوبی جانتی ہے کہ دفتر تو محض اس کے لیے ایک اڈا ہے جہاں پہونچ کر وہ اپنے دوستوں کی محفل میں گپ شپ کرتا ہے جہاں اسے اپنے سوٹوں بوٹوں کی نمائش کرنے کا موقع ملتا ہے۔ وہ دوسروں کی طرح روزی کمانے کے لیے نوکری نہیں کرتا۔ دفتر سے ملنے والی چھ سو روپے کی تنخواہ سے تو اس کا پندرہ بیس دن کا جیب خرچ ہی چل پاتا ہے۔

لیکن تبھی اس کے دماغ میں ایک دوسری رو بہنے لگی۔ وہ سوچنے لگی کہ کیا اس کے باپوجی اور ماں اس کی پسند کو منظور کریں گے۔ وہ بخوبی جانتی ہے کہ گو وہ دونوں پڑھے لکھے ہیں لیکن اس طرح کی باتوں میں وہ دونوں ہی پرانے خیالات اور رسم و رواج کو اہمیت دیتے ہیں۔ اپنے رشتہ داروں اور برادری میں اپنی اونچی ناک کا انھیں بہت خیال رہتا ہے۔ اگر انھوں نے میرے جوالس کو پسند نہ کیا تو۔ ۔ ۔ ۔ لیکن پسند کیسے نہیں کریں گے۔ آخر انھوں نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے۔ محض ایک بے زبان گڑیا نہیں اب تو میں اپنی مرضی کے مطابق ہی قدم اٹھاؤں گی۔ بہت دنوں آزمالیا ان کو۔ آخر انتظار کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ ان کے بھروسے پر ہی تو میں نے اپنی جوانی کا بہترین حصہ ویسے ہی گزار دیا۔ اور یہ رشتے دار، خاندان برادری والے یہ سب بیکار کے اڑنگے ہیں۔ ان سب کو بھی دیکھ لیا۔ اس معاملے میں کس نے باپوجی کی مدد کی۔ خالی بیکار کا زبانی جمع خرچ کرتے ہیں۔ اوپر سے پریم اور ہمدردی دکھائیں گے لیکن من کے بڑے کالے ہیں یہ لوگ۔ کسی کا کام ذرا بنتے جا رہا ہو تو یہ ٹٹی کی آڑ میں اپنا چوک نشانہ مارنے سے باز نہیں رہیں گے۔ کسی کی خوشی میں ان کی خوشی کہاں۔

گاڑی اپنی رفتار سے دوڑتی جا رہی تھی اور اب سریکھا اپنی زندگی کے گزشتہ دس بارہ برسوں کے وقت پر نظر ثانی کرنے لگی تھی وہ اس عمر میں لوٹ گئی تھی جب اس نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا تھا۔ جب وہ تیزی سے کلی سے پھول میں تبدیل ہو رہی تھی۔ جسم میں چمک اور نکھار آ رہا تھا۔ دن بدن ابھرتے ہوئے سینے کو ٹھے اور باہنوں کی گولائیوں کو آئینے میں دیکھ کر وہ اپنے آپ سے شرمانے لگتی تھی اور پھر منوہر کی شخصیت اس کے دماغی پردے پر ابھر آئی۔ منوہر جو اس پر پوری طرح لٹو تھا جو اکثر اس کی ایک چھوٹی سی جھلک پانے کے لیے بیقرار سا رہتا تھا۔ اور پھر ایک رُکتے ڈرتے جب اس نے اس کے سامنے اپنے پیار بھرے جذبات کا اظہار کرنے کی کوشش کی تھی کہ اس نے اسے خوب آڑے ہاتھوں لیا تھا۔ پھر کبھی اس طرح کی بات کرنے کی منوہر میں ہمت نہیں ہوئی۔ شاید اس کا دل ٹوٹ گیا تھا۔ کاش اس نے اس کے ساتھ ایسا سلوک نہ کیا ہوتا۔ کتنی ہی لڑکیاں تو رومانس لڑاتی ہیں اور پھر لو میرج کر لیتی ہیں۔ کاش اس نے بھی ایسا کیا ہوتا۔

اُن دنوں اس پر باپوجی کی اور ماں کی نگرانی قدرے کڑی ہوتی جا رہی تھی۔ ماں تو کبھی کبھی اسے لیکچر ہی پلانے لگتی تھی کہ بیٹی آجکل زمانہ بڑا خطرناک ہے۔ ہر قدم سوچ سمجھ کر رکھنا پڑتا ہے کبھی کبھی ذرا سی بھول کے لیے زندگی بھر پچھتانا پڑتا ہے۔ یہاں وہاں اِدھر اُدھر بنا مطلب کے نہیں جانا چاہیے۔ کتنی پابندیاں لگائی جاتی تھیں اس پر۔ وہ اپنی مرضی کے مطابق کپڑے تک نہیں پہن سکتی تھی۔ یہ بلاؤز نہیں چلے گا۔ اس طرح کا کرتہ پہن کر کیا باہر جایا جاتا ہے۔ بالوں کی یہ ٹیڑھی مانگ تمھارے باپوجی پسند نہیں کرتے بڑوں کے سامنے سر ڈھک کر جایا کرو۔ بات کرتے وقت نظر نیچے رکھنی چاہیے۔

پھر سریکھا کو اس بات کی یاد آئی۔ جب کانپور سے شری و شریمتی جوشی اپنے بیٹے اروِن کے ساتھ اسے دیکھنے آئے تھے۔ یہ شاید پہلا موقع تھا جب کوئی اسے پسند کرنے آ رہا تھا۔ ان لوگوں کے آنے سے پیشتر اس کے دل میں کتنے ہی رنگین ارمان مچل رہے تھے۔ جسم کی نسوں میں کیسا نشیلا رس گھل رہا تھا۔ اس نے نہ معلوم کتنی مرتبہ اور کس کس زاویے سے خود کو آئینے میں دیکھا تھا۔ تب کتنا غرور تھا اسے اپنی خوبصورتی پر اپنی پوری شخصیت پر۔ وہ دن میں بھی صوفے پر پڑی پڑی دماغ میں سپنے سجاتی رہتی تھی کہ ان کے گھر کے سامنے والے میدان میں شامیانہ لگے گا۔ رنگ برنگی جھنڈیاں، غبارے اور ہزاروں رنگین بلب اس پنڈال کی سجاوٹ میں چار چاند لگا دیں گے۔ وہ شادی کا جوڑا پہنے گی۔ ہاتھوں میں مہندی رچے گی۔ گوری گوری کلائیوں کو لال چوڑیاں اپنی گرفت میں کس لیں گی عورتیں سہاگ گیت گائیں گی وہ دلہن کے روپ میں کتنی خوبصورت لگے گی۔ اور پھر بینڈ باجے کے ساتھ بارات آئے گی وہ سہیلیوں کے ساتھ دروازے پر آئے گی۔ دولھا راجہ کے گلے میں جے مالا ڈالے گی۔ پھر

وہ دلہن بن کر سسرال جائے گی کوئی اس کا گھونگھٹ پلٹے گا اور پھر... لیکن یہ سب محض ایک خواب ہی نکلا۔ شرما جی کو لڑکی تو پسند آ گئی لیکن جہیز کی بات پر بات آگے نہ بڑھی۔ وہ لوگ اس کے پتا کی بات کو ٹھکرا کر چلے گئے۔ تب اس نے من ہی من اس سماجی نظام کے ٹھیکیداروں کو کتنی گالیاں دی تھیں اس کا بس چلتا تو وہ جہیز کی بے جا مانگ کرنے والوں کا منہ نوچ لیتی۔ ان کی بوٹی بوٹی کر دیتی لیکن وہ محض پریشان سی ہو کر رہ گئی تھی۔

اس کے بعد اکثر گھر میں اس کے رشتے کی باتیں ہوتی رہتیں کبھی کسی شہر سے کچھ لوگ اسے دیکھنے آئے کبھی بن سنور کر اسے ماں کے ہمراہ کسی پارک میں جانا پڑتا کبھی اسے دکھانے کے لیے کسی چائے پارٹی میں لے جایا جاتا بہانے بہانے سے کہاں کہاں اور کن کن لوگوں سے دکھانے کے لیے اسے نہیں لیجایا گیا۔ کتنی بار اسے اس طرح کی اداکاری کرنی پڑی۔ لیکن آنے والے کوئی نہ کوئی کمی کھوج کر اسے نامنظور کر کے چلے جاتے۔ کئی مرتبہ اس کے نازک دل پر چوٹیں پہنچائی گئیں۔ اس کے دل میں اس سماج کے لیے بغاوت کا جذبہ پیدا ہونے لگا۔ پھر وہ سوچنے لگی کہ آخر مجھ میں کیا کمی ہے۔ پڑھی لکھی ہوں، پوسٹ گریجویٹ ہوں، ساڑھے پانچ سو تنخواہ پاتی ہوں۔ یہ مانتی ہوں کہ میں بہت خوبصورت نہیں ہوں۔ لیکن بدصورت بھی تو نہیں ہوں۔ ذرا تھوڑا گندمی رنگ ہے تو کیا ہوا۔ اس سے کیا خاص فرق پڑتا ہے۔ کتنے ہی لوگ تو اس صورت کو محض دیکھنے کے لیے بیقرار رہتے ہیں۔ پھر سریکھا کو ان دنوں کی یاد آنے لگی۔ جب وہ کالج میں پڑھتی تھی۔ پڑھائی میں تو وہ تیز تھی ہی۔ اس کے کتنے ہی ہم جماعت اس سے دو بات کرنے کو ترستے رہتے تھے۔ نہ معلوم کتنوں کے دلوں میں ارمان مچلتے ہوں گے کہ کاش ایک مرتبہ وہ ان کے ساتھ کسی ہوٹل یا کافی ہاؤس میں ناشتہ وغیرہ کرے۔ کبھی سینما دیکھنے چلے لیکن وہ تھی کہ اپنی شخصیت پر سنجیدگی کا مصنوعی پردے ڈالے رہتی تھی۔ آج وہ پچھتا رہی تھی کہ شرم و حیا کے اس جال میں اپنے آپ کو پھنسا کر اسے کیا ملا۔ آج باوجی اور ماں اسے کسی بھی قیمت پر بیچنے کے لیے کہاں کہاں نہیں جاتے لیکن کوئی خریدار اس کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ پرانی بنا آب شے کوئی کیوں خریدے گا۔ گذشتہ دسمبر میں اس نے اپنی زندگی کے تیس برس پورے کر لیے ہیں۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ اس کی جوانی کی چمک اس کے جسم کو الوداع کہہ رہی تھی۔ آخر شادی کرنے کی بھی کوئی عمر ہوتی ہے۔ اچھے خاندانوں کے تعلیم یافتہ اور برسر روزگار لڑکے تو پچیس ستائیس سال کی عمر میں شادی کر ہی لیتے ہیں۔ کون اس کی راہ دیکھتا رہتا اور پھر تھوڑی دیر بعد اسے کچھ تسکین محسوس ہوئی تھی کہ اس نے ٹھیک ہی کیا جو شرم و حیا کو چھوڑ کر راجیندر سے رسم و راہ بڑھالی اسے راجیندر میں لگ بھگ وہ سبھی خوبیاں نظر آ رہی تھیں جو ایک اچھے رفیق حیات میں ہونی چاہئیں۔ وہ گھر پہنچ کر اپنے دل کی بات بلکہ اپنا آخری فیصلہ باوجی اور ماں کو بتا دے گی اور اگر انھوں نے اس کی بات نہ مانی تو وہ بغاوت کی کسی بھی حد تک پہونچ جائے گی۔ اب وہ ان کی ایک نہیں سنے گی۔ اس نے انکی بیٹ پردری کا ٹھیکہ نہیں لے رکھا۔ اگر انھوں نے اپنی منظوری نہ دی تو مجبور ہو کر اسے سول میرج کے رجسٹرار کا سہارا لینا پڑے گا۔ مجھ کو دکھانے کے لیے کسی کو بلانے سے پیشتر اگر مجھ سے پوچھ لیا گیا ہوتا تو کون سی مصیبت آجاتی۔ بڑے آئے تار دے کر بلانے والے۔

خیالات کی اسی ادھیڑ بن میں وہ صبح گھر پہنچی۔ اس نے دیکھا کہ اس کی دونوں چھوٹی بہنیں جھاڑ پونچھ کر رہی تھیں۔ چیزوں کو قرینے سے سجا رہی تھیں۔ باوجی شیو کر رہے تھے اور ماں پوجا والے کمرے میں بھگوان کی تصویر کے سامنے پوجا پاٹھ میں مشغول تھی۔ اسے دیکھ کر سب نے اس کا خیر مقدم کیا۔ سب کے چہروں پر خوشی اور امید رقص کر رہی تھی۔ باوجی اور ماں کے طرز گفتگو اور چہروں کو دیکھ کر اسے لگا کہ وہ آنے والے مہمانوں سے کافی امیدیں لگائے بیٹھے ہیں۔ باوجی کے خطوط اور اس کے فوٹو سے وہ لوگ کافی مطمئن ہوئے تھے اور انھوں نے لگ بھگ اپنی منظوری کا خط بھی بھیج دیا تھا۔ اب وہ محض ابتدائی رسم اور آگے کا پروگرام ہی طے کرنے کے لیے آ رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد سریکھا اور گھر کے دیگر ممبران چائے پی رہے تھے آنے والے مہمانوں کے بارے میں بات چیت ہو رہی تھی تبھی ماں نے باوجی سے کہا کہ گاڑی آنے سے پندرہ بیس منٹ پیشتر ہی مہمانوں کو ریسیو کرنے کے لیے وہ ریلوے اسٹیشن پر ضرور پہنچ جائیں۔ سریکھا کا دل اندر ہی اندر کہیں ڈوب رہا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ بغاوت اور سول میرج کی بات سوچ رہی تھی لیکن اب اسے لگ رہا تھا جیسے اس کی زبان تالو سے چپک کر رہ گئی ہو۔ اسے اپنا حلق سوکھتا سا محسوس ہو رہا تھا لیکن نہیں وہ خاموش نہیں رہے گی۔ وہ اپنے دل کی بات بلکہ اپنا آخری فیصلہ باوجی و ماں کو بتا کر رہے گی۔ اس وقت اس کی خاموشی سے سب کیے دھرے پر پانی پھر جائے گا۔ اس کا راجیندر اس کے متعلق کیا سوچے گا۔ نہیں وہ اسے دھوکا نہیں دے گی۔ تبھی ہمت بٹورنے کے لیے اور دماغ کو دوسری طرف موڑنے کے لیے وہ تپائی پر رکھے اخبار کو اٹھا کر دیکھنے لگی۔ اخبار کے پہلے صفحے پر شائع ایک خبر کو پڑھ کر وہ چونک اٹھی۔ اسے لگا جیسے کسی نے اس کے دل پر گھونسہ مار دیا ہو۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں ہو رہا تھا۔ اسے اپنے خوابوں کا محل مسمار ہوتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اب وہ باوجی اور ماں کو اپنا آخری فیصلہ نہیں بتا سکے گی۔ شاید اب وہ زندگی بھر بغاوت اور سول میرج کی بات سوچ تک نہ پائے گی۔ اب اسے لگا تھا کہ ہر چمکنے والی شے سونا نہیں ہوتی۔ وہ راجیندر جس کے اخلاق پر اسے اتنا بھروسہ تھا جسے وہ ایک باعزت رفیقِ حیات سمجھے بیٹھی تھی وہ اس وقت اپنے باپ کے ساتھ جیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے بیٹھا اپنی قسمت کو کوس رہا تھا۔ پولیس کے ایک خاص دستے نے ان کے گھر پر چھاپا مارا تھا گھر کے اندر ایک تہہ خانے سے اسمگلنگ کی لگ بھگ اسّی ہزار روپے کی مالیت کی گھڑیاں برآمد ہوئی تھیں۔

★

فنِ سیرت نگاری: (صفحہ ۱۳ کا بقیہ)

تعویق ہوئی کہ اب میں تنہا رہ گیا ہوں (بیوی کی وفات کی طرف اشارہ ہے) اور اس خوشخبری میں اپنی شریکِ حیات کو شریک نہیں کر سکتا۔ اس میں اس قدر دیر کی گئی کہ میری شہرتِ عام ہو گئی اور اب مجھے اس کی ضرورت نہیں رہی۔

میرا گمان ہے کہ یہ بدخوئی یا احسان فراموشی نہ سمجھی جائے گی اگر کسی شخص کے اس احسان کا اعتراف شکر گزاری کے ساتھ نہ کیا جائے جس سے کوئی فائدہ حاصل نہ ہوا ہو یا یہ کہ میں اس بات کو پسند نہ کروں کہ لوگ سمجھیں کہ میں اس کامیابی کے لیے کسی مربی یا سرپرست کا ممنونِ احسان ہوں جو محض فضلِ ایزدی سے مجھے حاصل ہوئی ہے۔

علم و ادب کے کسی سرپرست کا احسان اٹھائے بغیر جب میں نے لغت نگاری کے کام کو اس منزل تک پہنچا دیا ہے تو اگر میں اُسے اسی حالت میں ختم کر دوں تو میں مایوس نہ ہوں گا کیونکہ عرصہ ہوا میں اُس خوابِ امید سے بیدار ہو چکا ہوں جس کے مزے، میں کبھی بڑے فخر کے ساتھ لیا کرتا تھا۔ جناب کا نہایت خاکسار و فرمانبردار خادم

سیمول جانسن"

★

ہم دو
ہمارے دو

خالد ندیم

اس کا ذکر کریں

شعورِ حق و صداقت کی انتہا گاندھی
وفا و مہر و مروت کا آئینا گاندھی
رہِ خلوص و مروت کا رہنما گاندھی
سکون و امن کا پیکر مہاتما گاندھی
جسے ہر اک سے محبت تھی اس کا ذکر کریں
دلوں پہ جس کی حکومت تھی اس کا ذکر کریں
وہ کوہکن تھا اسی کوہکن کی بات کریں
وہ صف شکن تھا اسی صف شکن کی بات کریں
اسی کی رسم اسی کے چلن کی بات کریں
اسی کے ذوق اسی کی لگن کی بات کریں
اسے عزیز تھا جو سازِ آرزو چھیڑیں
برہم دستیہ و اہنسا کی گفتگو چھیڑیں
عجب شان سے اس نے کھلائے فریاد
عجب ڈھب سے کیا چاک دامنِ بے داد
چمن جو اجڑا ہوا تھا اسے کیا آباد
وطن کو اس نے غلامی سے کر دیا آزاد
ندی تمام مصائب کی پاٹ دی اس نے
بغیر تیشہ کے چٹان کاٹ دی اس نے
وہ جس نے بکھری ہوئی زلف کو سنوار دیا
وہ جس نے اجڑے ہوئے روپ کو نکھار دیا
وہ جس نے روٹھی ہوئی زندگی کو پیار دیا
وہ جس نے گرتی ہوئی قوم کو ابھار دیا
اندھیری رات میں آیا خوشی کی دھوپ لیے
وہ دیوتا تھا مگر آدمی کا روپ لیے
وہ شانتی کا پجاری تھا امن کا پیکر
وہ آشتی کا پرستار صبر کا خوگر
تمام عالمِ انسانیت کا تھا رہبر
یقین و عزم کا پتلا مگر بدن لاغر
ندیم آہنی زنجیر توڑ دی اس نے
کلائی ظلم و تشدد کی موڑ دی اس نے

محمد غلام رسول اشرف

یہ ہندوستان ہے

نشان ہائے عظمت ہیں اس کی جبیں پر
تقدس فدا اس کے تخت و نگیں پر
گلوں کو تفوق بہشتِ بریں پر
مجھے ناز کیوں ہو نہ اس سرزمیں پر
یہاں سرنگوں رفعتِ آسماں ہے
یہ ہندوستاں ہے، یہ ہندوستاں ہے

مجھے عشق ہے اس کے دشت و دمن سے
ہمالہ سے، وادیٔ گنگ و جمن سے
میں مانوس ہوں اس کے ہر اک چمن سے
مشابہ ہے ہر سنگ، لعلِ یمن سے
یہاں کی فضا پر فدا میری جاں ہے
یہ ہندوستاں ہے، یہ ہندوستاں ہے

یہ پاکیزہ ماحول، یہ چاند تارے
یہ کہسار و دریا، یہ دل کش نظارے
لگیں یوں کہ جنت سے اترے ہیں سارے
مسرت سے شام و سحر دل پکارے
زمینِ وطن غیرتِ صد جناں ہے
یہ ہندوستاں ہے، یہ ہندوستاں ہے

ہے خیر و اماں کا یہ شفقت درپن
دعاؤں کا مامن ہے ہر فرد کا من
رہا ہے یہ دلیوں کا رشیوں کا مسکن
یہ ہے علم و تہذیب و حکمت کا مخزن
جو خوبی یہاں ہے بعید از بیاں ہے
یہ ہندوستاں ہے، یہ ہندوستاں ہے

مجھے کیوں نہ ہو عشق ہندوستاں سے
تمدن کے پھوٹے ہیں چشمے یہاں سے
بہت دور ہیں اس کے گلشن خزاں سے
وطن میرا بہتر ہے سارے جہاں سے
یقیناً یہ مہدِ محبت نشاں ہے
یہ ہندوستاں ہے، یہ ہندوستاں ہے

محمد اسحاق صدیقی

بھوکی بے چین دُنیا

ہر طرف انسان ہی انسان، سڑک پر انسانوں کا بے پناہ ہجوم، فٹ پاتھ پر چلنے کے لیے جگہ نہیں۔ آخر آدمی چلے تو کیسے؟ ذرا سا فاصلہ طے کرنا مشکل۔ ہر دم ایسا محسوس ہوتا ہے گویا کوئی زبردست میلہ ہے جس میں ہم پھنس گئے ہیں جوں کی چال سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ جب ریلا آتا ہے آگے بڑھ جاتے ہیں، ورنہ بھیڑ ایک جگہ جم جاتے ہیں۔ موٹروں کا دھواں اور ان کے ہارن کی آوازیں، اسکوٹر اور موٹر سائیکلوں کی پھٹ پھٹ، سائیکل اور رکشا والوں کی گھنٹیاں۔ شور سے کان پھٹے جاتے ہیں، دھوئیں کی بو سے متلی ہوتی ہے —— لیکن کیا کیا جائے اس بھیڑ کو بڑھانے والے ہم ہی تو ہیں۔

بھیڑ سڑکوں ہی پر نہیں، ہر جگہ ہے، کیا گھر، کیا باہر، کیا دفتر، کیا کارخانہ، کیا سینما، کیا اسپتال، انسانوں کا امڈتا ہوا سیلاب تھمنے کا نام نہیں لیتا۔

سرکار کا کیا کہنا ہے: "چھوٹا پریوار سکھی پریوار —— "ہم دو۔ ہمارے دو ——" لیکن سرکار کا کہنا کون سنتا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ بچے پیدا کرنا ان کا پیدائشی حق ہے، روٹی کپڑا اور مکان فراہم کرنا سرکار کا کام ہے۔ گویا سرکار ہم سے الگ کوئی چیز ہے یا سرکار کے ہاتھ میں جادو کا ڈنڈا ہے کہ اُدھر گھمایا اِدھر عالیشان مکان بن گئے، اور ہر ایک کی ضرورت کی چیزیں منہ سے نکلتے ہی حاضر ہو گئیں۔

روزگار کی تلاش میں چھوٹے شہروں اور دیہاتوں کے لوگ بھاگ کر بڑے شہروں میں جاتے ہیں اور جب انھیں وہاں رہنے کے لیے مکان نہیں ملتا تو فٹ پاتھ پر یا شہر کے کنارے جھونپڑیوں میں جانوروں سے بدتر زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان کی زندگی کولھو کے بیل کی طرح کام کرنے اور لائنیں لگانے میں ختم ہو جاتی ہے —— کبھی نل کے سامنے کبھی راشن کی دکان پر، کبھی سڑک پار کرنے کے لیے، کبھی بس کے انتظار میں، کبھی اسپتال یا مطب میں —— آبادی بڑھنے کے ساتھ ساتھ یہ لائنیں لمبی ہوتی جائیں گی۔ ان کے چھوٹا ہونے کا کوئی امکان نہیں، جب تک انسان خود اپنی آبادی کو بڑھنے سے نہ روک دے۔

آبادی کس رفتار سے بڑھ رہی ہے، اس کا اندازہ یوں کیجیے کہ ہمارے ملک کی آبادی ۱۹۵۱ء میں ۳۶ کروڑ ۱۰ لاکھ تھی جو ۱۹۷۱ء میں ۵۴ کروڑ ۸۰ لاکھ ہو گئی۔ گویا ۲۰ سال میں ۱۸ کروڑ ۷۰ لاکھ کا اضافہ ہوا۔ اس وقت ملک کی آبادی تقریباً ۶۰ کروڑ ہے اور اسی رفتار سے آبادی بڑھتی رہی تو اب سے ۲۸ سال بعد یعنی ۲۰۰۴ء میں یہ آبادی ایک ارب ۱۶ کروڑ ۲۰ لاکھ تک پہنچ جائے گی۔

ہمارے ملک کی ۸۰ فی صد آبادی دیہاتوں میں رہتی ہے ہندستان میں تقریباً ۵،۶۷،۰۰۰ دیہات ہیں۔ تقریباً ۴½ کروڑ دیہاتیوں کے پاس کھیتی کے لیے زمین نہیں ہے۔ وہ مزدوری کرنے پر مجبور ہیں۔ ملک میں تقریباً ۸ کروڑ ۴۷ لاکھ ایسے خاندان ہیں جن کے پاس یا تو رہنے کے لیے مکان نہیں ہے یا جو مکانات

ہیں جو رہنے کے لائق نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ملک میں ہر چار خاندان کے بعد پانچویں خاندان کے پاس یا تو مکان نہیں ہے یا اگر ہے بھی تو صرف نام کے لیے۔ ایسے لوگ جن کے پاس مکان نہیں ہیں اُن میں سے ۶ کروڑ دیہی علاقوں میں رہتے ہیں۔

تعلیم کے معاملے میں بھی ہم کافی پچھڑے ہوئے ہیں ملک میں اَن پڑھ لوگوں کی تعداد ۳۸ کروڑ ۶ لاکھ ۵۰ ہزار ۵۳۷ ہے۔

ہندستان میں فی کس آمدنی دنیا میں سب سے کم ہے۔ عجیب بات ہے کہ ملک کی قومی آمدنی میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے لیکن فی کس آمدنی میں خاطر خواہ اضافہ نہیں ہوتا۔ اس کا سبب بڑھتی ہوئی آبادی ہے۔

اِن اعداد و شمار سے کچھ اندازہ ہندستان کی بڑھتی ہوئی آبادی اور غریبی کا ہو سکتا ہے۔ اب ذرا دنیا کی آبادی پر ایک نظر ڈالیے۔

آبادی کے لحاظ سے دنیا میں پہلا نمبر چین کا ہے جس کی آبادی ۸۵ کروڑ سے زائد ہے۔ ہندستان آبادی کے لحاظ سے دنیا کا دوسرا بڑا ملک ہے جس کی آبادی تقریباً ۶۱ کروڑ ہے۔ ان دونوں ملکوں کی مجموعی آبادی (ایک ارب ۴۶ کروڑ) پوری دنیا کی آبادی کا لگ بھگ ایک تہائی ہے۔

دنیا کے سب سے زیادہ آبادی والے دس بڑے ملک یہ ہیں:
(۱) چین (۲) ہندستان (۳) روس (۴) امریکہ (۵) جاپان (۶) انڈونیشیا (۷) برازیل (۸) مغربی جرمنی (۹) بنگلہ دیش (۱۰) نائجیریا۔

ان ملکوں کی مجموعی آبادی دنیا کی آبادی کا دو تہائی ہے۔ براعظم ایشیا کی آبادی دنیا کی آبادی کا ۵۶٫۸ فی صد ہے۔ گویا ایشیا میں دنیا بھر کی نصف آبادی رہتی ہے اور دنیا کے ہر دو افراد میں ایک ایشیائی ہے۔ سب سے کم آبادی والا براعظم آسٹریلیا ہے، جس کی آبادی دو کروڑ سے کچھ زائد ہے۔

اندازہ کیا جاتا ہے کہ گزشتہ صدی کے وسط میں ساری دنیا میں تقریباً ایک ارب انسان تھے۔ انسانی آبادی کو یہاں تک پہنچنے میں ہزاروں سال لگے تھے لیکن اسی آبادی کو دوگنا ہونے میں سو سال سے بھی کم لگے اور اس کے صرف تیس سال بعد انسانی آبادی تین ارب ہو گئی:

۱۶۰۰ء	۵۰ کروڑ
۱۸۵۰ء	۱ ارب
۱۹۳۰ء	۲ ارب
۱۹۶۰ء	۳ ارب

دنیا کی موجودہ آبادی چار ارب ہے یعنی ۱۶ سال میں ایک ارب انسانوں کا اضافہ ہوا۔ اضافہ آبادی کی رفتار کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ۱۹۶۹ء میں دنیا میں فی سکنڈ ۳٫۹ بچے پیدا ہو رہے تھے اور ۱٫۷ انسان مر رہے تھے گویا آبادی میں ۲٫۲ فی سیکنڈ کے حساب سے اضافہ ہو رہا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ روزانہ ایک لاکھ ۹۰ ہزار نئے کھانے والے پیدا ہو رہے تھے۔ آبادی میں سالانہ اضافہ ۷ کروڑ ۱۰ لاکھ تھا۔ یہ تعداد پہلی اور دوسری جنگ عظیم میں ہلاک ہونے والے کل انسانوں سے زیادہ تھی۔ انسان کی بار آوری نے ان اعداد و شمار کو بھی اب پیچھے چھوڑ دیا ہے۔

دنیا میں روزانہ تین لاکھ ۵۰ ہزار بچے پیدا ہوتے ہیں اور ایک لاکھ ۳۵ ہزار انسان مرتے ہیں گویا روزانہ ۲ لاکھ ۱۵ ہزار کا اضافہ ہوتا ہے۔ بیسویں صدی کے ختم ہوتے ہوتے یہ آبادی جو دو فی صدی سالانہ کی شرح سے بڑھ رہی ہے اب کی دوگنی ہو جائے گی۔ دنیا کی موجودہ آبادی کو زندہ رکھنا ہی مشکل ہے۔ ذرا سوچئے ... ۲۰۰۰ عیسوی تک یعنی اب سے صرف ۲۴ سال بعد انسانوں کی کیا حالت ہوگی۔

اندازہ کیا جاتا ہے کہ ۲۱ ویں صدی کے آغاز میں تقریباً سات ارب آبادی ہوگی۔ اس آبادی کو دوگنا ہونے میں صرف ۱۷ سال لگیں گے اور پھر اُسے دوگنا ہونے میں محض ۹ سال

دنیا کے بعض حصوں میں پیدائش کی شرح اتنی زیادہ ہے کہ اگر اسے روکا نہ گیا تو صرف سو سال میں دنیا کی آبادی ۵۵ ارب تک جا پہنچے گی اور ۵۰۰ سال کی مدت میں موجودہ آبادی کی ۲۲۰۰۰ گنا ہو جائے گی اور تب زمین پر ہر انسان کے لیے ایک مربع گز زمین یعنی کھڑے رہنے بھر کی جگہ رہ جائے گی۔ لیکن آپ اتنی دور کی بات کیوں سوچیں؟ موجودہ صورتِ حال پر نظر ڈالیے۔ دنیا میں روزانہ تقریباً دو لاکھ انسانوں کا اضافہ ہوتا ہے۔ جنھیں بسانے کے لیے ایک چھوٹا شہر چاہیے۔ ہر مہینے ۶۰ لاکھ آبادی والا ایک بڑا شہر اور ہر سال مغربی جرمنی کے برابر ایک نیا ملک۔ ذرا سوچیے ایک سال میں بڑھنے والی آبادی یعنی ۷ کروڑ ۲۰ لاکھ انسانوں کے لیے روٹی کپڑا، مکان اور روزی فراہم کرنے کے لیے کیا کچھ کرنا ہوگا۔ ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے جتنی بھی کوشش کی جاتی ہے اس میں خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوتی۔ یعنی انسانی آبادی میں جس رفتار سے اضافہ ہوتا ہے اُس رفتار سے ہم اس کی ضرورت کی چیزیں نہیں مہیا کر سکتے۔ کھانے کے لیے اناج، رہائش کے لیے مکان علاج کے لیے اسپتال، تعلیم کے لیے اسکول اور روزگار کے لیے دفتر اور کارخانے اتنی تیزی اور آسانی سے فراہم نہیں کیے جاسکتے جتنی تیزی اور آسانی سے بچے پیدا کیے جاسکتے ہیں۔ بچہ پیدا کرنا ایک انفرادی فعل ہے لیکن اُس کی ضرورت کی چیزیں فراہم کرنے کے لیے پورے انسانی سماج کے تعاون کی ضرورت ہوتی

اضافہ آبادی کی ایک وجہ یہ ہے کہ موت کی شرح گھٹ رہی ہے اور اوسط عمر بڑھ رہی ہے، یعنی لوگ مرتے کم ہیں، پیدا زیادہ ہوتے ہیں، اور زیادہ عمر تک جیتے ہیں، اس کی وجہ سائنس کی ترقی ہے پہلے جو امراض جان لیوا تھے، اب اُن سے لوگ کم مرتے ہیں: بچوں اور عورتوں کی قبل از وقت موتوں میں بہت کمی ہو گئی ہے۔ لوگوں کا معیار زندگی بلند ہوا ہے اور ہوتا ہے اور دیہی علاقوں میں چھوٹے اسپتال قائم کرکے طبی سہولتیں دی جانے لگی ہیں۔ ہندستان میں اب مردوں کی اوسط عمر ۵۰ سال ۷ ماہ اور عورتوں کی ۴۹ سال ۳ ماہ ہے جبکہ آزادی سے پہلے مردوں کی اوسط عمر ۲۲ سال ۶ ماہ اور عورتوں کی ۲۱ سال ۷ ماہ ہوتی تھی۔

اضافہ آبادی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ پہلے کے مقابلے میں ارضی اور سماوی آفات (زلزلے، سیلاب، قحط اور وباؤں) سے لوگ اب کم مرتے ہیں کیونکہ نقل و حمل کے اتنے ذرائع نکل آئے ہیں کہ بروقت امداد سے مصیبت زدہ لوگوں کو بڑی حد تک مرنے سے بچا لیا جاتا ہے۔

مسئلہ آبادی کا ایک تاریک پہلو یہ ہے کہ امیر ملکوں کے مقابلے میں غریب ملکوں میں آبادی کے اضافے کی شرح دُگنی ہے۔ اس وقت بھی غریب ملکوں میں امیر ملکوں کے مقابلے میں تقریباً تگنی آبادی ہے۔ دنیا میں بیس سال سے کم عمر والی آبادی کا نصف حصہ غریب ملکوں میں آباد ہے۔ ذرا سوچیے ان غریب ملکوں (یعنی ایشیا، افریقہ اور جنوبی امریکا کے ممالک) میں پیدا ہونے والے بچوں کا مستقبل کیا ہے؟ دنیا کی آبادی کا ۲۴ فیصد حصہ یورپ، شمالی امریکا اور جاپان میں آباد ہے۔ اور ان ترقی یافتہ ملکوں کی قومی آمدنی دنیا کی کل سالانہ آمدنی کا ۸۲ فی صد ہے جب کہ غیر ترقی یافتہ ملکوں کی قومی آمدنی ۱۸ فی صد ہے اور آبادی ۷۶ فی صد ہے۔

دنیا میں اس وقت جتنی خوراک ہے اگر وہ سب جمع کرکے دنیا کے سارے انسانوں میں برابر برابر تقسیم کردی جائے تو ہر شخص کو روزانہ ایک چائے کی پیالی بھر کھانا ملے گا۔ آپ کو یہ جان کر دکھ ہوگا کہ دنیا کی دو تہائی آبادی کو پیٹ بھر کھانا نہیں ملتا، دنیا کی نصف آبادی جوتے نہیں پہنتی اور دنیا کی دو تہائی آبادی اَن پڑھ ہے۔

اگر دنیا کی آبادی کو بڑھنے سے روکا نہ گیا تو حالات بد سے بدتر ہو جائیں گے، کیونکہ جیسے جیسے آبادی بڑھتی جائے گی فی کس آمدنی گھٹتی جائے گی۔ ضروریات زندگی اور جگہ کی کمی کی وجہ سے لوگ خود غرض ہو جائیں گے جب بے کاری

بڑھے گی تو جرائم میں اضافہ ہوگا۔ عدالتیں مقدمات سے اور جیلیں مجرموں سے بھر جائیں گی۔ مفلس اور صاحبِ حیثیت کے درمیان کشمکش بڑھتی جائے گی۔ لوٹ مار شروع ہو جائے گی۔ حکومتِ وقت کے لیے ملک میں امن و امان قائم رکھنا مشکل ہو جائے گا۔ اناج اور دواؤں کی کمی کی وجہ سے بھوک اور بیماریوں سے مرنے والوں کو بچانا ناممکن ہو جائے گا۔

اس تاریک مستقبل سے بچنے کے لیے ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ بعض سیاست دانوں کا خیال ہے کہ بڑھتی ہوئی آبادی کا واحد حل تیسری جنگِ عظیم ہے لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ لڑ کر مرجانا کون سی دانش مندی ہے۔ یہ تو خودکشی کے مترادف ہے۔ اگر ایسی جنگ ہوئی تو نہ کسی کی جیت ہوگی نہ کسی کی ہار۔ دنیا البتہ تباہ ہو جائے گی اور جنگ کے ساتھ دنیا سے تہذیب و تمدن کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔ وہ لوگ جو بچ جائیں گے، زندہ درگور ہوں گے۔ اُن کی زندگی اتنی تکلیف دہ ہوگی کہ وہ خودکشی کر لینا ہی بہتر سمجھیں گے۔ اس لیے بھلائی اسی میں ہے کہ ہم آبادی کو جلد سے جلد بڑھنے سے روک دیں اور اس کا واحد طریقہ خاندانی منصوبہ بندی اور ضبطِ تولید کے طریقوں پر عمل کرنا ہے۔

آج دنیا کے ہر ملک میں خاندانی منصوبہ بندی اور ضبطِ تولید پر زور دیا جا رہا ہے۔ لیکن تنگ نظر اور خودغرض عناصر نسل، زبان، مذہب یا تہذیب کے نام پر اور سیاسی اغراض کے تحت اس کام میں رکاوٹ ڈال رہے ہیں۔ اب اگر اُن کی بات مان لی جائے اور خاندانی منصوبہ بندی اور ضبطِ تولید کے طریقوں پر عمل نہ کیا جائے تو دنیا کی آبادی بڑھتی ہی چلی جائے گی اور لوگ یا تو لڑ کر مر جائیں گے یا سب قحط اور وباؤں کا شکار ہو جائیں گے۔ ایسے لوگوں سے پوچھنا چاہیے کہ تم اپنی اولاد کو زمانے اور حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دو یا جنگ کا ایندھن بنانے کے لیے تیار ہو یا اتنی ہی اولاد پیدا کرنے پر رضامند ہو، جن کی ضرورتیں تم اور تمھارا ملک پورا کر سکے؟ آخر قدرت نے تمھیں دماغ کس لیے دیا ہے تم سوچتے کیوں نہیں؟ "چھوٹا پریوار سکھی پریوار" محض پروپیگنڈا نہیں حقیقت ہے۔ جاؤ ان کنبوں کی حالت دیکھو جن کے دو یا تین بچے ہیں اور اُن کی حالت کا مقابلہ ان خاندانوں سے کرو جن کے آدھے درجن یا زیادہ بچے ہیں۔ دونوں میں کون سکھی ہے؟ کم اولاد والے یا زیادہ اولاد والے؟ زیادہ بچے پیدا کرنا غریبی کو دعوت دینا ہے۔ دنیا میں غریب ہونا سب سے بڑا گناہ ہے۔ غریب کی تو عزت آبرو تک بک جاتی ہے اور بچے زمانے کی ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ شادی شدہ جوڑوں میں کن کی صحت اچھی ہے، ان کی جو خاندانی منصوبہ بندی کے طریقوں پر عمل کرتے ہیں یا جو ہر سال بچے پیدا کرتے ہیں؟ دو یا تین تندرست بچے اچھے یا درجن بھر مریل بچوں کی فوج جو ہر وقت بھوک کی رٹ لگاتی رہے۔

ہندوستان میں ۱۹۵۱ سے حکومت خاندانی منصوبہ بندی کا پرچار کر رہی ہے لیکن جیسی کامیابی ہونا چاہیے تھی نہیں ہوئی اس کی وجہ تعلیم کی کمی اور عوام کی بے حسی ہے۔ جب تک ہر تعلیم یافتہ شخص گھر گھر خاندانی منصوبہ بندی کا پیغام نہ پہنچائے گا خصوصاً نچلے طبقے میں اور خود اس پر سختی سے عمل نہ کرے گا، تنہا حکومت کی کوشش ناکافی ہے۔

★

طاہر حسین الماس

وقت کی آواز

(فیملی پلاننگ سے متعلق)

شرحِ پیدائشِ اطفال اگر ہو نہ طویل
وقت کے حکم کی ہو جائے گی خود ہی تعمیل

چند بچوں سے زیادہ کی ضرورت کیسی
بن ہوئے بچوں سے آخر یہ محبت کیسی

کیا خوشی بچوں کی، دولت ہی اگر پاس نہ ہو
زیادہ بچے ہوں تو ممکن نہیں، افلاس نہ ہو

فائدہ کیا ہے اگر بچوں کو کھانا نہ ملے
کھانا مل جائے غریبوں کو تو کپڑا نہ ملے

بحرِ تعلیم سے بچے جو کنارا کش ہوں
صاف ظاہر ہے کہ ناکارہ رہیں سرکش ہوں

پڑھ نہ پائیں گے تو اوباش لفنگے ہوں گے
ان کے باعث کہیں جھگڑے کہیں دنگے ہوں گے

کس طرح اہلِ وفا، اہلِ بصیرت ہوں گے
ملک و ملت کے لیے باعثِ ذلت ہوں گے

چند اطفال کو تعلیم دلا سکتے ہو
ان کو حیوان سے انسان بنا سکتے ہو

بچے پڑھ لکھ کے جو حیوان سے انساں ہو جائیں
اہلِ دنیا کے لیے درد کا درماں ہو جائیں

بحرِ تعلیم کے بچے جو شناور ہوں گے
کوئی گاندھی، کوئی نہرو، کوئی جوہر ہوں گے

صرف جذبات کی رَو میں نہیں بہنا سیکھو
اے وطن والو، حقیقت کو سمجھنا سیکھو

تم سے کیا کہتے ہیں، حالات کے انداز سنو
وقت کے ساتھ چلو، وقت کی آواز سنو

منوہر لال ہادی

دو اکتوبر

(سانیٹ)

آج کے دن کوئی آیا تھا یہاں، سنتے ہیں
جس کو تفویض ہوا تھا بڑا مشکل منصب
آدمی تھا کہ وہ تھا حبِ وطن کا کوکب
جس کی ہر سانس میں تھا عزمِ جواں سنتے ہیں

اس ستارے کی ضیا ہند میں جب پھیل گئی
جذبۂ حبِ وطن نشو و نما پانے لگا
ہم کو زنداں میں چراغاں بھی نظر آنے لگا
ظلمتِ دل نہ رہی، تیرگیٔ جاں نہ رہی

اس کو سوجھی کہ اہنسا کی اٹھا کر شمشیر
اپنے گلشن سے فرنگی کو نکالا جائے
رخشِ قسمت کو نئی راہ پہ ڈالا جائے
دیکھتے دیکھتے ہی ملک کی کاٹی زنجیر

کامیابی سے نوازا اسے بھگوانوں نے
پاؤں چومے سبھی فرزانوں نے، دیوانوں نے

سعادت نظیر

اردو کا ایک گمنام شاعر
عبدالوہاب صرفی

اردو کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ کا حیدرآباد برسوں سے شعر و ادب کا گہوارہ رہا ہے جہاں ہزاروں ادیب اور شاعر پیدا ہوئے جن میں بعضوں نے نام کمایا اور اپنی تخلیقات سے اردو ادب میں گراں مایہ اضافہ کیا مگر کئی ایک قلمکار مناسب حوصلہ افزائی کی کمی کے سبب منظرِ عام پر نہ آسکے یا نا مساعد حالات کا شکار ہوئے اور بہت سے ایسے بھی گزرے جنہوں نے شہرت سے گریز کی اور اپنے رشحاتِ قلم کو صرف اپنے ہی ذوق کی تسکین کے لیے کافی سمجھا یا اپنے ہم مذاق دوست احباب کی حد تک محدود رکھا۔ فنکاروں کے اسی آخری گروہ سے ایک سید عبدالوہاب صرفی بھی ہیں جنہوں نے موسیٰ ندی کی قیامت خیز طغیانی سے چار سال پہلے ۱۹۰۴ء کو شہر حیدرآباد کے مردم خیز محلۂ سلطان شاہی میں ایک متوسط گھرانے میں جنم لیا۔ ان کے والد سید عبدالرزاق جو ایک آزاد منش بزرگ تھے بچپن ہی میں انھیں داغِ مفارقت دے گئے۔ ان کے پھوپھا مولوی محمد فاضل نے انھیں اور ان کے بھائی بہن کو اپنی سرپرستی میں لیا اور ان کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا لیکن شومیٔ بخت کہ فاضل صاحب نے بھی جلد ہی دنیا سے منھ پھیر لیا۔ اب بیوہ ماں اور یتیم بھائی بہن کے سوا صرفی کا کوئی نہ تھا، نا مساعد حالات نے سمندِ شوق پر تازیانے کا کام کیا۔ علم کی طلب گھٹنے کے بجائے بڑھتی گئی اور لکھنے پڑھنے میں مہارت حاصل کی، اسی طرح فارسی اور عربی بھی سیکھی البتہ کبھی کوئی شک ہوتا تو اپنے بڑے بھائی حکیم ابوالافتخار سید عبدالغفار فخر سے جو حیدرآباد کے ایک ذی علم اور کہنہ مشق شاعر تھے دوبکر لیتے۔ کسی استاد کی مدد کے بغیر صرف فطری استعداد ذوقِ جستجو اور عقلِ سلیم کی رہنمائی میں اردو، فارسی اور عربی ادبیات کا مطالعہ کرنا کچھ کھیل نہیں مگر صرفی نے اس کارِ مشکل کو آسان کر دکھایا۔ حافظہ اس غضب کا پایا تھا کہ ہر زبان کے اچھے شعر نوکِ زبان رہتے۔ کبھی کہیں کوئی علمی گفتگو چھڑ جاتی تو کئی شعر روانی سے سنا دیتے یا سند کے طور پر مختلف کتابوں کے حوالے پیش کر دیتے جس سے نہ صرف ان کی زبردست قوتِ یادداشت کا اظہار ہوتا بلکہ ان کے تبحرِ علمی کا بھی پتہ چلتا، لیکن وہ اپنے آپ کو کبھی منتہی نہ سمجھتے جس کا ثبوت ان کی یہ مناجات ہے

فرطِ رافت پر تری، موقوف ہے میرا دماغ
زندگی کا ہے مری، تیرے کرم ہی پہ مدار
دولتِ علم و عمل سے مجھ کو مالا مال کر
طبع کو میری تو استغنا کے زیور سے سنوار

---

[1] یگانہ چنگیزی کے ہم عصر اور دوست تھے، شہید یار جنگ کے پاس میں نے یگانہ کو انھیں اپنی فارسی غزلیں سناتے ہوئے دیکھا ہے۔ سعادت نظیر

دہر میں کوئی نہیں تیرے سوا میرا کفیل
کون ہے تیرے سوا دنیا میں میرا غمگسار
بے نوائی سے ہوں دنیا کی نگاہوں میں حقیر
بے گمانی سے ہوں اپنی نظر میں آپ خوار
ناز کرتا ہوں تری حمد و ثنا پر راست دن
اپنے ایسوں کی خوشامد سے مجھے آتی ہے عار
صرف تو دونوں جہاں میں ایک حاکم ہو مرا
نفسِ سرکش ہو مرا محکوم اے پروردگار
اعترافِ جہل کامل کی مجھے توفیق دے
تاکہ میں بھی انتہائے علم کی دیکھوں بہار

صرفی ایک خوددار اور حساس انسان تھے جب گھر کو مالی مشکلات میں گھرا پایا تو غمِ روزگار دل میں کانٹا بن کر کھٹکنے لگا ؎

آدمی ہوں میں فرشتہ تو نہیں
کوئی کب تک ضبط کرتا جائے گا؟

تلاش معاش میں عروس البلاد بمبئی کا رُخ کیا جس کو فردوس بریں سے کچھ کم نہ پایا۔ اس کے خوش نما گلی کوچے، جس کے دامن میں دل کشی کے ہزاروں سامان موجود تھے، دعوت نظارہ دیتے محسوس ہوئے، کہیں یوسفی حسن نظر آیا تو کہیں زلیخائی شان اور کہیں سارہ وہاجرہ کا رقصِ نشاط آہنگ جلوہ ہائے جمال ؎

نہیں یہ بمبئی، خلد بریں ہے
وہاں کیا ہو؟ یہاں پر کیا نہیں ہے
یہاں کا کوچہ کوچہ ہے خیاباں
زلیخا زار ہے اور یوسفستاں
یہ لالہ رُخ ہے اور وہ گلبدن ہے
یہ نسترن، نسترن وہ یاسمن ہے
کوئی خورشید کوئی ماہ پارہ
نشاط آہنگ ہے ہر اک نظارہ
مجسم رنگ ہے کوئی انگوٹھی تو ہر کوئی ہے جلوۂ برق سر طور

بمبئی میں ایک بزرگ شاعر و سیاح خنجر کے ہاں قیام کیا دیگر علمی شخصیتوں سے ربط ضبط بڑھایا اور علمی تبادلہ خیال کیا جس سے صرفی کے جوہر نکھرنے لگے۔ ۱۹۲۰ء میں ایک طرحی مشاعرہ ہوا صرفی نے بھی طبع آزمائی کی، ان کی غزل کو سبھوں نے پسند کیا اور یہی غزل اُن کی شاعری کا نقطۂ آغاز ہوئی جس کا ایک شعر یہ ہے ؎

حقیقت بھی مری کیا بے حقیقت ہے حقیقت میں
شجر ہوں نارسیدہ شاخ موجِ آب گوہر کا

شاعری میں صرفی نے کسی کے آگے زانوئے ادب تہہ نہیں کیا بلکہ ذوقِ سلیم کو اپنا رہبر بنایا۔ شاعر کو بالعموم "تلمیذ الرحمٰن" کہا جاتا ہے لیکن ان کی جدتِ طبع تو دیکھیے کہ خود کو "روح القدس" کا شاگرد سمجھا ؎

وجہ نازش کیوں نہ ہو شاگردیٔ روح القدس
کر رہے ہیں اکتساب فیض قرآن تدا نہ ہم
روح الامین کا یہ مایۂ ناز شاگرد رہِ حیات کے

پیچ وخم سے گزرتا ہے مگر سرسری نہیں بلکہ مشاہدات و تجربات کی رہبری میں ذرے ذرے کو نظر کے کانٹے میں تولتا، کائنات کے رموز کو کھولتا اور زمانے کے نشیب وفراز سے سبق لیتا گزرتا ہے، دنیا کی کوئی چیز بھی جو سرگرم تجسس ہے اس کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں ؎

دینِ ازل کے فیض سے میری نظر میں ہے
ہر ایک شے جو نامِ خدا خشک و تر میں ہے
بے شبہ بے شمار ہیں آیات بینات
اہلِ نظر کے واسطے لیل و نہار میں

عالمِ امکان کے مشاہدے سے شاعر یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ ہر ذرہ اپنی زندگی میں کچھ کمی سی پاتا ہے اور یہی بات نظمِ دنیا کی بنیاد ہے ؎

نظامِ بزمِ عالم کی یہی بنیاد ہے گویا
کہ ہر اک زندگی میں کچھ کمی محسوس ہوتی ہے

امتدگی کی اس کمی کو دور کرنے کے لیے ایک ایک ذرہ منزل کمال کی تلاش میں مضطرب نظر آتا ہے ؎

قطرہ قطرہ بحرِ ہستی کا ہے وقفِ جستجو
ماہی بے تاب ہے ہر موج ساحل کے لیے

ہجومِ آلام میں بھی صرفی دامنِ ہمت تھامے رہتے ہیں، اپنی آرزوؤں اور محنتوں کے ثمرے کے لیے جان پر بھی کھیلنے سے پیچھے نہیں ہٹتے جس سے ان کی جواں مردی اور بلند حوصلگی بے باکانہ طور پر ظاہر ہوتی ہے ؎

میں وہ دہقاں ہوں کہ جس کو زندگی اک کھیل ہے
برق کا بھی سامنا کر لوں گا حاصل کے لیے

بمبئی میں پانچ چھ سال بُرے بھلے گزرے ہی تھے کہ حیدر آباد کی یاد نے صرفی کے دل میں چٹکیاں لیں اور انھیں حیدر آباد لوٹتے ہی بنی۔ کچھ دن بیکاری میں بسر ہوئے اور پھر تھوڑی سی جدوجہد کے بعد کھاتے پیتے گھرانوں میں ٹیوشن مل گئے، جن سے انھوں نے ہزاروں روپے کمائے، لیکن کھلے دل، کھلے ہاتھ تھے جو کچھ کما پاتے، عزیزوں اور دوستوں پر بے دریغ خرچ کر دیتے۔ صرفی کی تدریس و تفہیم کا طریقہ اتنا دل نشین و ذہن فروز ہوتا تھا کہ طالب علم متاثر ہوئے بغیر نہ رہتے تھے، ان کے مقابل لکچرار اور پروفیسر بھی پانی بھرتے نظر آتے تھے، طلبا سے ان کا رشتہ دوستانہ تھا، شاگردوں کو اعلیٰ مدارج طے کرتے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوتے تھے اور یہی حال طالب علموں کا بھی تھا جو فارغ التحصیل ہونے کے باوجود بھی ان سے ادب و احترام سے پیش آتے اور ان کو ہمیشہ اپنا شفیق و عزیز رہنما سمجھتے تھے ؎

اللہ، اللہ، پیشوائے اہلِ دل ہے آج وہ
کل بزعمِ عقل کہتے تھے جسے دیوانہ ہم

ایک زمانہ تھا کہ حیدر آباد رنگینیوں میں ڈوبا ہوا تھا، عیش و عشرت کا دور دورہ تھا۔ سماج پر زندہ دلی چھائی ہوئی تھی۔ فیض، توفیق، مائل، امیر، داغ اور جلیل کے نغمے گونج رہے تھے، گھر گھر شاعری کا چرچا تھا، شعر و سخن کی محفلیں سجتی رہتی تھیں، اسی رنگین فضا میں صرفی پل کر جوان ہوئے، حسن پسندی کا ذوق لے کر آئے تھے، دل عاشقانہ، دماغ مفکرانہ، طبیعت موزوں اور مذاقِ شعری نکھرا ستھرا پایا تھا، فطری تقاضے سے مجبور ہو کر شعر کہنے لگے، اردو میں بھی اور فارسی میں بھی، غزل جو ایک لطیف آرٹ ہے، اس کی فسوں کاری اُن پر اثر کر گئی کہ ان کو اس سے اپنا شعری رشتہ باندھتے ہی بنی، اسی میں ان کی زندگی کے حسین راز شائستہ انداز میں بے نقاب ہوئے، اسی کے رمز و ایما کے مہین پردوں میں ان کے احساسات کی لطافت نظر آئی اور ان کے تجربات و مشاہدات کی روح جلوہ گر ہوئی ؎

دلِ حزیں نے تماشے دکھائے ہیں کیا کیا!
مرے تڑپنے پہ وہ تلملائے ہیں کیا کیا!
فراق و وصل، بہار و خزاں، نعیم و سقر
امید و بیم نے نقشے جمائے ہیں کیا کیا!
کہیں پری ہے، کہیں حور ہے، کہیں انساں
تمھارے جلوے نے بھی نام پائے ہیں کیا کیا!
کہیں حیاتِ ابد، شہرتِ دوام کہیں
صلے وفا کے، محبت نے پائے ہیں کیا کیا!
نگاہِ شوق نے اک مشتِ خاک میں صرفی
خدا گواہ کہ جلوے دکھائے ہیں کیا کیا!

علمی مصروفیات نے صرفی کو شادی یا کسی مستقل ذریعۂ روزگار کے بارے میں سنجیدگی سے غور کرنے کا کوئی موقع ہی نہیں دیا، اس میں کچھ ان کی آزادہ منشی کا بھی دخل تھا، رشتہ داروں اور دوستوں نے توجہ بھی دلائی تو کسی نہ کسی بہانے ٹال دیا لیکن جب ماں بہن اور بھاوج کے دل میں ان کا سہرا دیکھنے کا ارمان مچلنے لگا تو انھوں نے ازدواجی زندگی کا ارادہ کیا، حیدر آباد میں جاگیر شاہی نظام تھا، عام رجحان ملازمتوں کی طرف تھا، آزاد پیشہ معتبر نہیں سمجھے جاتے تھے، لوگ اپنی لڑکیوں کا بیاہ ان ہی سے رچاتے جو ملازمت میں ہوتے، اسی لیے صرفی نے بادلِ نخواستہ مفید الانام ہائی اسکول میں اردو فارسی پڑھانے کی ذمہ داری قبول کی اور کچھ عرصہ بعد وہ

صرف خاص سے منسلک ہو کر شادی کر لی مگر ملازمت کی گھٹی گھٹی فضا کی تاب نہ لا کر مستعفی ہو گئے۔ آزاد پیشہ اختیار کرنے کی سوجھی دوستوں کے مشورے پر تجارتی کاروبار شروع کیا، کچھ دن کشاکش میں گزرے لیکن بعد میں "سولہ سو کے ہزار کر بیٹھے" کیونکہ تاجرانہ ماحول سازگار نہ آسکا اور تجارت سے ہاتھ اٹھانا ہی پڑا، زندگی کے آخری ایام بڑی ہی تنگ دستی اور کسمپرسی کے عالم میں بسر ہوئے لیکن ان کی فطرتِ خودداری نے آخری عمر تک ذلتِ سوال گوارا نہ کی ؎

زندگی گھل رہی ہے، گھلنے دے
دل اگر جل رہا ہے، جلنے دے
رحم کی تو کسی سے بھیک نہ مانگ
دم نکلتا ہے تو نکلنے دے

حاصل ہے واقعی جو حمید رہ صفات کا
جچتا نہیں وہی نگہِ روزگار میں

تلخیٔ حیات کو انھوں نے اتنی شدت سے محسوس کیا کہ وہ مرضِ دق میں مبتلا ہو گئے اور انھیں ایسا لگ رہا تھا جیسے ؎

ہر سانس میرے کیف پہ اک تازیانہ ہے
صہبا سے بے نیاز ہوا ہوں بہار میں

اور ایک سوال رہ رہ کر ان کے ذہن میں نامعلوم طور پر ابھر رہا تھا ؎

ہر نفس اک سانحہ ہے اب مرے دل کے لیے
جانے کتنے مرحلے ہیں اور، منزل کے لیے

اور یہ احساس خصوصاً اس وقت کچھ اور تیز ہو جاتا جب کہ اپنے ہم عصروں کی موت کے سانحے کی خبر ملتی اور اس خبر کے ملتے ہی وہ یہ شعر گنگنانے لگتے ؎

سب اٹھ گئے دکن سے میں جی کے کیا کروں گا
اٹھ جائے کاش! یا رب میرا بھی آب و دانہ

ساتھ ہی ساتھ انھیں اپنی موت کے قریب ہونے کا یقین ہونے لگتا، وہ اپنے دل سے فکرِ عقبیٰ کرنے کو کہتے اور دلِ غم دنیا سے دور یادِ الٰہی میں ڈوب جاتا ؎

نجاتِ اخروی کا فکر کیجئے
قریب الختم ہے عمرِ گرامی

موت کے جلد آنے پر لاکھ یقین سہی پھر بھی چارہ گر دل کا دلاسا تھا کہ جیئے جا رہے تھے مگر کب تک؟ "مرض بڑھتا گیا، جوں جوں دوا کی" بالآخر نبضیں ڈوبنے لگیں، جینے کی رہی سہی آس بھی باقی نہ رہی اور اسی پس منظر میں ان کی زبانِ شیریں بیان سے بے ساختہ نکلا ہوا شعر ایک لازوال نغمہ بن گیا ؎

محسوس کر کے ڈوبتی نبضوں کو دیر تک
تکتا رہا طبیب مجھے، میں طبیب کو

اور حیدرآباد کا یہ گم نام شاعر زمانے کی بے حسی پر مسکراتا ہوا اپنی تین دختران نیک اختر اور زوجۂ وفا شعار کے علاوہ اپنے کچھ سعادت مند شاگردوں کو سوگوار چھوڑ کر دنیا سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کوچ کر گیا اور تکیۂ روشن دل واقع دبیر پورہ حیدرآباد دکن میں ۱۹۶۸ء سے ابدی نیند سو رہا ہے ؎

مرنے کا غلط گماں ہے تم کو
جاگے تھے بہت کہ سو گئے ہم

★

(دستک .... صفحہ ۲۱ کا بقیہ)

میں نے دیکھا پائلٹ لنگوٹی کس کر کھڑے تھے۔
ننھی گڑیا تالیاں بجا کر ناچ رہی تھی۔
غفورے میاں برآمدے کی منڈیر پر کھڑے پائلٹ لنگوٹی کے کندھے پکڑے اچھل رہے تھے اور آنکھیں اس روشنی والے بجولے پر جمائے ہوئے تھے۔
میرے خیالات کے سارے تانے بانے بکھر چکے تھے۔

★

قطعے

۲ نکاتی پروگرام

اے سنیے پیام تاریخی
ل اندرا کے نام کے ساتھ
ع پر شمع جگمگا اٹھی
ں پیام رفاہِ عام کے ساتھ

بط جو بیس انگلیوں کو ہے
دگی کے ہر ایک کام کے ساتھ
ہی اپنے وطن کا رشتہ ہے
یں نکتوں کے پروگرام کے ساتھ

یار سفے نے بھی بڑھائے ہیں
ئی حسنِ انتظام کے ساتھ
ب جو نکتے یہ ہو گئے چوبیس
جیسے گھنٹے ہوں صبح و شام کے ساتھ

شانِ تکمیل زندگی بن کر
بادشاہت چلی عوام کے ساتھ

چودھری تریجان شنکر سروش

غزل

سید محی الدین اظہر

آئینہ ٹوٹا، کیسے احساس ہے
رو پڑا میرا دلِ حساس ہے
زندگی! تج کر تجھے جاتا ہوں میں
اب تو قسمت میں لکھا بن باس ہے
داستاں جب عشق کی چھیڑی گئی
زخمِ دل کا تب ہوا احساس ہے
ٹوٹے رشتے اب جوڑوں گا کبھی
ہر گرہ پیغامِ حزن و یاس ہے
خوفِ رسوائی سے آنسو پی گیا
اور ہنسنا بھی نہ آیا راس ہے
گفتگو گھنٹوں ہوئی ہے بارہا
پھر بھی تجھ کو دیکھنے کی پیاس ہے
چیختا شہروں میں لیکن کیا کروں
مجھ کو تیری آبرو کا پاس ہے

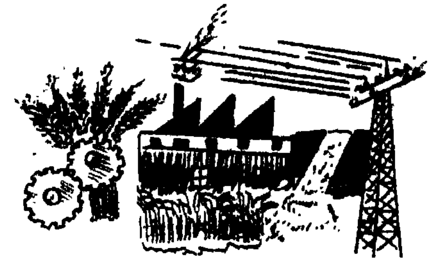
اقبال قریشی

غزل

(ایمرجنسی کے پس منظر میں)

ہر سمت نئی صبح چمن جاگ پڑی ہے
پھر خواب سے تقدیرِ وطن جاگ پڑی ہے
یوں لرزہ بر اندام نظر آتی ہے ظلمت
جیسے کوئی خوابیدہ کرن جاگ پڑی ہے
غم اپنا مقدر تھا بایں فصلِ بہاراں
پھولوں میں بھی کانٹوں کی چبھن جاگ پڑی ہے[1]
پابندِ حفارہ کے کلی جو تہِ بہ لب تھا
اس دل میں بھی اب روحِ سخن جاگ پڑی ہے
آفاق کے ہر غم کو میں اس دل میں سمو لوں
کچھ دن سے یہ تحریکِ محن جاگ پڑی ہے
اقبال میں مایوس نہیں غم کی فضا سے
تدبیر کے ابرو پہ شکن جاگ پڑی ہے

لہ کچھ بزرگ سیاستدانوں کے آزادی سے پہلے کے تعمیری اور آزادی کے بعد کے تخریبی رول سے متاثر ہو کر یہ شعر کہا ہے۔



اتر پردیش شاہراہ ترقی پر

جذباتی یکجہتی پر گورنر کا زور ●●● وزیر اعلا کی مسلم لیڈروں سے اپیل ●●● خاندانی منصوبہ بندی غریبی دور کرنے کا ایک طاقتور ہتھیار ●●● خاندانی منصوبہ بندی پروگرام کے خلاف افواہیں پھیلانے والوں کے خلاف سخت کارروائی ●●● کمزور طبقوں کے لئے مرغبانی ترقیاتی اسکیم ●●● انڈے اور مرغیوں کی پیداوار بڑھانے کی اسکیم ●●● امداد باہمی بینکوں میں کھاتے کھولنے کے لئے وزیر اعلا کی اپیل ●●● اتر پردیش روڈ ویز ٹرانسپورٹ کارپوریشن کو پانچ کروڑ روپیہ کی مالی امداد ●●● اضلاع میں نمائشوں کے لیے مستقل جگہوں کا بندوبست ●●● ضلع فرخ آباد میں خاندانی منصوبہ بندی زوروں پر

جذباتی یکجہتی پر گورنر کا زور: ۔ اتر پردیش کے گورنر ڈاکٹر چنا ریڈی نے ہندی بولنے والوں کو مشورہ دیا کہ وہ دیگر زبانوں کے الفاظ قبول کریں تاکہ ملک میں ہر شخص یہ محسوس کرے کہ ہندی اسکی اپنی زبان ہے۔ انھوں نے کہا کہ جذباتی یکجہتی کے بغیر ملک کی جغرافیائی وحدت بے معنی ہوگی۔ گورنر راج بھون میں ایک ادبی سمپوزیم سے خطاب کر رہے تھے۔

انھوں نے کہا کہ جذباتی یکجہتی کے لیے تلسی داس اور دیگر ممتاز ہندی مصنفین کی لکھی ہوئی کتابوں کا جنوب میں اور جنوبی ہند کے ادیبوں کی تخلیقات کا شمال میں پرچار کیا جانا چاہیے۔

اس سے قبل شری بی۔ رام مورتی رینو نے کہا کہ ہمارے سنت اتحاد کے عظیم علمبردار ہیں جنھوں نے تمام کائنات میں خدا کا جلوہ دیکھا ہے۔ انھوں نے گورنر کو اپنی کتاب "بھارتیہ سنتوں کا تلناتمک ادھین" بھی پیش کی۔

وزیر اعلا کی مسلم لیڈروں سے اپیل: ۔ وزیر اعلا شری نرائن دت تیواری نے کہا کہ ملک کو ایسے تبلیغی اداروں کی ضرورت ہے جو قدامت پسندی اور مذہبی تعصب کی طاقتوں سے برسر پیکار ہو سکیں اور عوام کے اندر فکر اور نظریات کو جدید اور سائنسی رنگ و آہنگ عطا کریں۔

وزیر اعلا نے مسلم لیڈروں کے ایک نمائندہ اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے ان سے پرزور الفاظ میں کہا کہ وہ وزیر اعظم کے بیس نکاتی پروگرام کی اہمیت بالخصوص خاندانی منصوبہ بندی شجر کاری اور صفائی جیسے اہم پروگراموں سے عوام کو آگاہ کریں نیز غریبی دور کرنے اور عوام کے ساتھ منصفانہ سلوک کو یقینی بنانے کے پیش نظر اس کو تیزی سے بروئے کار لانے کے لیے عوام کا تعاون اور حمایت حاصل کریں۔

وزیر اعلا نے کہا کہ انھیں عوام کی جرأت مندانہ رہنمائی کرنا چاہیے اور انھیں ایک چھوٹے خاندان کا تصور بخوشی قبول کرنے کے لیے تیار کرنا چاہیے۔ آبادی میں اضافہ کی موثر روک تھام اشد ضروری ہے تاکہ اس سے ہماری ترقیاتی کوششیں رائیگاں نہ ہوں۔ انھوں نے بڑے پیمانہ پر چھوٹی بچت کو ترقی دینے کی ضرورت پر زور دیا

وزیر اعلا نے کہا کہ وزیر اعظم کے پروگرام کے تحت زرعی زمین رہائشی مکانات کی تعمیر کے لئے قطعات آراضی کی تقسیم، قیمتیں کم کرنے کے اقدامات اور گیہوں کی خریداری کے سلسلہ میں ریاست کی کامیابیاں قابل ذکر ہیں۔ لیکن اب بھی بہت کچھ کرنا ہے۔ ریاست نے ترقی کا ایک حوصلہ مندانہ خاکہ مرتب کیا ہے۔ جس کے تحت مشرقی اتر پردیش کی زرعی پیداوار دگنی کرنے کے پیش نظر اس کے لئے صد فیصد آبپاشی کا بندوبست کرنے اور مغربی اضلاع کو بھرپور ترقی کے ذریعہ غلہ کا قومی گودام بنا دینے کی تجویز ہے۔ حکومت کا مقصد ریاست میں ۱۲ء ۵ لاکھ ہیکٹر گھوں کی نو تنظیم بنانا اور آئندہ چند برسوں میں قالین کی برآمد ۴ ۳ کروڑ روپیہ سے بڑھا کر ۱۰۰ کروڑ روپیہ سالانہ تک کر دینا ہے۔

وزیر اعلا نے کہا کہ ان سب کاموں کے لیے سماج کے تمام کمزور طبقوں کے تعاون کی ضرورت ہے۔ انھوں نے ہر فرقہ کے لیڈروں سے کہا کہ وہ ایسا ماحول پیدا کرنے میں مدد دیں جس میں عوام ترقی کے لیے اور سائنسی طریقہ اپنا کر معاشی ترقی کی رفتار تیز تر کرنے کے سلسلہ میں اور زیادہ سرگرم اور موثر رول ادا کرنے کے لیے آگے آئیں۔

اس جلسہ میں ممبران مجالس قانون ساز، سیاسی اور سماجی کارکنوں، صحافیوں، شاعروں، ڈاکٹروں، ٹیچروں اور وکیلوں نے بھی شرکت کی۔ اس موقع پر چھوٹی صنعتوں کی وزیر شریمتی محسنہ قدوائی اور وزیر ریاست برائے اطلاعات شری رمیندر ورما بھی موجود تھے۔

خاندانی منصوبہ بندی غریبی دور کرنے کا ایک طاقتور ہتھیار

وزیر اعلا شری نرائن دت تیواری نے ملک میں غریبی، اور معاشی پسماندگی دور کرنے کے سلسلہ میں لڑی جانے والی جنگ کو جلد سے جلد سر کرنے میں خاندانی منصوبہ بندی کو ایک طاقتور ہتھیار قرار دیا ہے۔

قومی خاندانی منصوبہ بندی پندرہواڑہ کے ۱۶ ستمبر کو آغاز سے قبل ۲۸ اگست سے شروع ہونے والی خصوصی پبلسٹی مہم کے موقع پر ایک پیغام جاری کرتے ہوئے وزیر اعلا نے ریاست کے عوام سے اپنی فلاح نیز اپنے خاندانوں، سماج اور قوم کی بنیاد مضبوط کرنے کے لیے خاندانی منصوبہ بندی کو بخوشی قبول کر لینے کی اپیل کی ہے۔

خاندانی منصوبہ بندی پروگرام کے خلاف افواہیں پھیلانے والوں کے خلاف سخت کارروائی

اتر پردیش کابینہ نے جس کا جلسہ وزیر اعلا شری نرائن دت تیواری کے زیر صدارت منعقد ہوا۔ بعض مفاد پرست عناصر اور ممنوع تنظیموں کے خاندانی منصوبہ بندی پروگرام کے خلاف افواہیں پھیلانے پر سخت تشویش کا اظہار کیا۔ چنانچہ ضلع مجسٹریٹوں کو ہدایات جاری کر دی گئی ہیں کہ وہ اس سرکاری پروگرام کے خلاف افواہیں پھیلانے والوں کے خلاف سخت کارروائی کریں۔

کابینہ کو مطلع کیا گیا ہے کہ ۲۶ اگست تک مجموعی طور پر ۱۶۹۴۰۶ نس بندی آپریشن کئے جا چکے ہیں۔ اس سلسلہ میں گڑھوال ڈویژن ریاست کے دوسرے ڈویژنوں سے آگے ہے جس نے اپنا نشانہ کا ۴۲ فیصد پورا کر لیا ہے۔ اترکاشی اضلاع میں سرفہرست ہے۔ جہاں کی کارگزاری مقررہ نشانہ کے مقابلہ میں ۶۰۱ فیصد ہے۔

کمزور طبقوں کے لیے مرغبانی ترقیاتی اسکیم

ریاست میں بے زمین افراد کی آمدنی میں اضافہ کرنے کے پیش نظر ۹۸ء ۷۳ لاکھ روپیہ کی لاگت سے ایک مرغبانی ترقیاتی اسکیم شروع کی گئی ہے۔ اس اسکیم کے دائرہ عمل میں دس اضلاع یعنی لکھنؤ، وارانسی، کانپور، گورکھپور، بریلی، آگرہ، فیض آباد، جھانسی، الہ آباد، اور مرادآباد آئیں گے۔ اس مقصد کے لیے ہر ضلع کے ایک علاقہ میں تقریباً ایک ہزار بے زمین افراد (جنھیں زمین دی جا چکی ہے)

کا انتخاب کیا جائے گا اور انھیں پچاس مرغیوں کے پولٹری یونٹ قائم کرنے کے لیے مالی امداد فراہم کی جائے گی۔

اس قسم کے ایک پولٹری یونٹ کی تخمینی لاگت ۵۸۳۲ روپیہ ہے۔ منتخب افراد کو پونجی کی شکل ۳۳ فیصد مالی امداد دی جائے گی۔ بقیہ رقم کا بندوبست ادارہ جاتی سرمایہ فراہم کر کے کیا جائے گا۔

ریاستی حکومت اس اسکیم کے تحت چوزوں اور دانہ کی فراہمی مرغیوں کی نگہداشت اور خرید و فروخت کا بندوبست کرے گی۔ اس مقصد کے لیے ۳۳.۰۱ لاکھ روپیہ کا بندوبست کیا گیا ہے

یہ اسکیم ۷۸-۱۹۷۷ء اور ۷۹-۱۹۷۸ء کے دوران جاری رہے گی اور اس مقصد کے لیے ۷۶.۳۲.۰۱ لاکھ روپیہ اور بالترتیب ۹۹.۶۳۰۱ لاکھ روپیہ کے مصارف کی تجویز ہے۔

انڈے اور مرغیوں کی پیداوار بڑھانے کی اسکیم

ریاستی محکمہ نگہداشت مویشیان نے پانچویں پنجسالہ منصوبہ کے آخر تک انڈوں کی پیداوار میں ۲۳۱۱ لاکھ کا اضافہ کرنے کے لئے ایک اسکیم وضع کی ہے۔ اس اسکیم کا منشاء یہ ہے کہ پہاڑ کے ان سیاحی مرکزوں اور بستیوں کے آس پاس نیز ان مقامات پر جہاں اہم ادارے واقع ہیں اور جہاں انڈوں کی مانگ بڑھتی جا رہی ہے۔ مرغبانی کو ترقی دی جائے۔ اس بات پر بھی زور دیا گیا ہے کہ سماج کے کمزور طبقوں کے افراد کی مرغبانی کے پروگرام کو اپنانے کے لیے زیادہ ہمت افزائی کی جانا چاہیے۔

مرغبانی کو ایک اہم صنعتی پیشہ تسلیم کیا جا چکا ہے جس سے نہ صرف لوگوں کو روزگار فراہم ہوتا ہے۔ بلکہ اس سے سماج کے کمزور طبقوں کی آمدنی بڑھانے میں بھی مدد ملتی ہے۔

آبادی میں اضافہ اور غذائی عادتوں میں تبدیلی کے باعث انڈوں کی مانگ کافی بڑھ گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محکمہ نے پانچویں پنجسالہ منصوبہ کے دوران مرغ بانی کو ترقی دینے کے پروگرام پر خاص زور دیا ہے۔ ریاست میں ۵۶ مرغ بانی فارم یا توسیع مراکز ہیں جن میں چوزوں کی مانگ کو پورا کرنے کے لیے

...۲۰ انڈے دینے والی مرغیاں ہیں۔ ریاست میں ۱۹۷۲ء کی مرغ شماری کے مطابق پولٹری فارموں میں مرغیوں وغیرہ کی تعداد ۳۹ لاکھ ۲۰ ہزار ہے۔

⁂

امداد باہمی بینکوں میں کھاتے کھولنے کے لیے وزیر اعلا کی اپیل

وزیر اعلا شری نرائن دت تیواری نے عوام بر خاص طور سے دیہی باشندوں سے اپیل کی کہ وہ ریاست کے امداد باہمی بینکوں میں زیادہ سے زیادہ انفرادی کھاتے کھول کر جمع کی جانے والی رقم میں اضافہ کریں اور اس طرح اس ۴۵ روزہ مہم کو کامیاب بنائیں جو بچت کھاتوں میں زیادہ سے زیادہ رقم جمع کرنے کے لیے ۱۶ اگست سے چلائی گئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ کارپوریشن اور دیگر اداروں کو بھی امداد باہمی بینکوں میں کھاتے کھولنے کا مشورہ دیا گیا ہے۔

وزیر اعلا نے اپنی اپیل میں کہا کہ اس مہم کے دوران امداد باہمی انجمن کے ممبروں سے بھی کھاتے کھلوانے اور پیداواری قرضہ کی سہولیتیں بآسانی کسانوں کو فراہم کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ آبپاشی کے چھوٹے وسائل، گوبر گیس پلانٹ، اور کیمیاوی کھاد، زمین کے تحفظ، جراثیم کش داؤں اور باغبانی کے پروگراموں کے لیے قرضے کی درخواستوں، بلاک اور پنچایتوں کی سطح پر قبول کی جائیں گی۔

وزیر اعلا نے ریاست میں امداد باہمی تحریک کو فروغ دینے اور مستحکم بنانے کے سلسلہ میں حکومت کے اقدامات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ امداد باہمی واجبات کی ریکارڈ وصولیابی کے نتیجہ میں امداد باہمی بینکوں نے پہلی مرتبہ ریزرو بینک کے تمام بقایاجات کی ادائیگی کر دی جس کے نتیجہ میں ریاست امسال زرعی مقاصد کے لیے ۵۰ کروڑ روپیہ کے قرضہ تقسیم کرنے کے قابل ہو گئی جبکہ اس سے پہلے برسوں میں ۷ کروڑ روپیہ سے ۸ کروڑ روپیہ تک کے قرضے تقسیم کیے گئے تھے۔ انھوں نے کہا کہ پیداوار [illegible]

کے علاوہ ابتدائی قرضہ انجمنیں، جن کی پنچایت کی سطح پر تنظیم کی جا رہی ہے، کمزور طبقوں کے افراد کو اشیائے صرف کے لیے بھی قرضے فراہم کریں گی۔ وزیر اعلا نے عوام سے یہ بھی اپیل کی کہ وہ زرعی پیداوار میں زیادہ سے زیادہ اضافہ کرنے کے لیے امداد باہمی قرضوں کی سہولتوں سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں۔

٭ ٭ ٭

اتر پردیش روڈ کارپوریشن کو پانچ کروڑ روپیہ کی مالی امداد

انڈسٹریل ڈیولپمنٹ بینک آف انڈیا کے چیرمین شری رگھو راج اتر پردیش روڈ ٹرانسپورٹ کارپوریشن کو پانچ کروڑ روپیہ کی مالی امداد مہیا کرنے پر رضامند ہو گئے ہیں تاکہ کارپوریشن اپنی کارکردگی بہتر بنانے کے ساتھ ساتھ مسافر بسوں کی خریداری کر سکے۔

وزیر اعلا شری نرائن دت تیواری اور انڈسٹریل ڈیولپمنٹ بینک آف انڈیا کے چیرمین کے درمیان کل ملاقات کے دوران مذاکرات کے نتیجہ میں یہ فیصلہ کیا گیا ہے۔ اس ملاقات کے دوران جس میں ریاستی حکومت اور مذکورہ بینک کے افسروں نے بھی شرکت کی تھی، اتر پردیش کی صنعت کاری کے مسائل کے بارے میں تبادلہ خیالات کیا گیا۔

وزیر اعلا نے اس موقع پر کہا کہ ریاست کی ۳۷ شکر ملوں کی جدید کاری، بحالی اور توسیع اتر پردیش کی شکر کی صنعت کا اہم مسئلہ ہے۔ ان ملوں کی پیرائی کی صلاحیت ۱۲۵۰ ٹن یومیہ سے کم ہے۔ انھوں نے کہا کہ ان ملوں کو معاشی واحدوں کی شکل میں تبدیل کر کے ان کی پیرائی کی صلاحیت ۳۵۰۰ ٹن یومیہ کرنے پر تخمیناً ۱۰۰ کروڑ روپیہ کے مصارف ہوں گے۔

ان مذاکرات کے نتیجہ میں مذکورہ بینک کے چیرمین نے اس بات پر رضامندی ظاہر کی کہ بینک ریاستی حکومت کے زیر انتظام چلنے والی آٹھ شکر ملوں کی بحالی اور جدید کاری کے لئے بینک کی عام شرائط پر براہ راست امداد مہیا کرنے کے معاملہ پر غور کرے گا جس کے لیے بینک سے پہلے ہی رجوع کیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ انھوں نے دیگر ملوں کی جدید کاری اور توسیع کے سلسلہ میں مشورہ دیا کہ انھیں بینک کی حالیہ اعلان شدہ نرم قرضہ اسکیم کے تحت امداد حاصل کرنا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ بینک ریاست کے پسماندہ علاقوں میں قائم کی جانے والی نئی شکر ملوں کو امداد دینے کے معاملہ پر بھی غور کرے گا۔

شری رگھو راج نے ریاست کی آٹھ نئی کتائی ملوں کو بینک کی امداد کی یقین دہانی کرائی جس کے لیے ہندستان صنعتی مالیاتی کارپوریشن ایک لیڈ مالیاتی ادارہ کی حیثیت سے کام کر رہا ہے۔

وزیر اعلا نے مذکورہ بینک کے چیرمین کو مطلع کیا کہ لکھنؤ، کانپور اور وارانسی کے میونسپل کارپوریشن کو جو خود مختار ادارے ہیں مشینی کمپوسٹ پلانٹ قائم کرنے کے لیے حکومت ہند کی منظوری حاصل ہو چکی ہے اور اس طرح وہ قرضے لینے کے حقدار ہیں۔ ان کارپوریشنوں کو مجموعی طور پر تقریباً دو کروڑ روپیہ کی امداد درکار ہے۔

شری رگھو راج نے اتر پردیش میں صنعت کاروں کو فروغ دینے اور اس سلسلے میں ترقیاتی کاموں سے امداد کی ضرورت پر زور دیا۔

ضلع فرخ آباد میں خاندانی منصوبہ بندی زوروں پر

ضلع فرخ آباد میں مختلف مقامات پر خاندانی منصوبہ بندی کے کیمپ لگائے جا چکے ہیں اور اس ضلع میں خاندانی منصوبہ بندی کا کام زور شور سے ہو رہا ہے۔ قنوج میں قومی یک جہتی کمیٹی کے سکریٹری شری رتی رام بھائی نے ایک کیمپ کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ خاندانی منصوبہ بندی ایک عوامی پروگرام ہے اور اس کا خاص مقصد ملک سے غریبی کو دور کرنا ہے۔ کمال گنج انتخابی حلقہ کے ایم۔ ایل۔ اے سید انوار حمید نے اپنی تقریر میں خاندانی منصوبہ بندی کی اہمیت اور افادیت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ یہ ہمارے لیے امتحان کا وقت ہے۔ اگر ہمارا ملک اس امتحان میں پورا اترتا ہے اور ہم خاندانی منصوبہ بندی کو کامیابی کی منزل تک پہنچا دیتے ہیں تو ہمارا ملک اقوام عالم میں بہت جلد ایک بلند مقام حاصل کرے گا۔

ضلع کے پانچ مقامات چھبرامئو، سانگرام، اگرسہائے گنج، قنوج اور کمال گنج میں نس بندی کے آپریشنوں کو زور شور سے چلایا جا رہا ہے۔

★

نقد و تبصرہ

(تبصرہ کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا لازمی ہیں)

رہنمائے بیت بازی (حصہ نون) مرتب : کاظم علی خاں
طابع : راج پرنٹنگ پریس، لکھنؤ۔
صفحات ۳۲ ۔ قیمت ۔ ایک روپیہ پچیس پیسے ۔ ملنے کا پتہ :
اردو پبلشرز، نظیر آباد، لکھنؤ

یاد ش بخیر! ایک زمانہ تھا جب نہ صرف ہائی اسکول بلکہ انٹر اور ڈگری کالجوں میں بیت بازی کے مقابلے منعقد ہوا کرتے تھے اور طلبا اچھے اور معیاری اشعار اپنے حافظے میں محفوظ کر لیا کرتے تھے ۔ مگر اب بیت بازی کا رواج نسبتاً کم ہو گیا ہے جس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اشعار کو صحیح اور موثر طور پر پڑھنے سے وہ طلبہ بھی بے نیاز ہو گئے جو اردو کی اعلا تعلیم حاصل کر رہے ہیں ۔ جس زمانے میں اس ادبی تقریب کا عام رواج تھا، اس وقت اس فن پر کوئی کتاب نہیں تھی، اب اس مذاق کے احیا اور نشاۃ ثانیہ کے لیے جناب کاظم علی خاں نے رہنمائے بیت بازی کے عنوان سے کتابچے مرتب کیے ہیں اور زیر نظر مجموعہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے ۔

کاظم علی خاں صاحب نے اس کتاب میں یہ اہتمام کیا ہے کہ متقدمین سے لے کر دور حاضر تک کے شعرا کے اچھے اور معیاری اشعار ایک جگہ پر جمع ہو جائیں اور سبھی کا اختتام حرف نون پر ہو تاکہ بیت بازی میں شکست و فتح کا فیصلہ ہو سکے ۔ بظاہر تو یہ ایک مختصر کتابچہ ہے مگر میرا خیال ہے کہ بیت بازی کے ذوق کی یہ آبیاری بہت ہی دور رس نتائج کا پیش خیمہ ہوگی، اور طلبہ کو صحیح تلفظ، اشعار کے معیاری انتخاب اور ان کو ادا کرنے کے مناسب و موثر طریقے سے آشنا کرے گی ۔ اور یہ امر خصوصیت کے ساتھ اس وقت بہت ہی مفید و معاون ثابت ہوگا جب وہ ایک خصوصی مضمون کے طور پر اردو کی اعلا تعلیم حاصل کریں گے ۔

میں کاظم علی خاں کو مبارک باد دیتا ہوں کہ انھوں نے اپنی توجہ اس "خشت اول" پر مرکوز کی ہے جس پر اردو پڑھنے والے مستقبل میں اپنے ذوق کا قصر تعمیر کریں گے ۔

(ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد)

بساط رقص مجموعۂ کلام : مخدوم محی الدین ۔ ناشر : ادبی ٹرسٹ
حیدرآباد ۔ قیمت : ۱۲ روپے
ضخامت ۲۶۲ صفحات

زیر نظر کتاب مشہور ترقی پسند شاعر مخدوم محی الدین کے کلام کا مجموعہ ہے جو ادبی ٹرسٹ نے بہت سلیقے کے ساتھ بساط رقص کے دوسرے اڈیشن کی شکل میں شائع کیا ہے ۔ ابتدا میں عابد علی خاں صاحب کے پیش لفظ کے بعد زینت ساجدہ اور راج بہادر گوڑ صاحب کے مضامین ہیں ۔

مخدوم کی شاعری تعارف کی محتاج نہیں، وہ ترقی پسند حلقے کے بہت ممتاز شاعر تھے اور دور حاضر کے اچھے شعرا میں ان کا شمار ہوتا ہے ۔ کلام بیشتر نظموں پر مشتمل ہے مگر کبھی کبھی غزل بھی کہہ لیتے تھے ۔

مخدوم کی شاعری کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ وقت کی آواز ہے جس میں ان کے عصر کی عام زندگی کی عام کیفیات اور فکریں، رنگ ڈھنگ، دکھ سکھ کی بڑی اچھی اور حقیقی ترجمانی ملتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ مخدوم کی شاعری اگر ایک طرف اس کی انفرادیت کا پرتو ہے تو دوسری طرف اپنے وقت کی آواز بازگشت بھی ہے ۔ مخدوم محدود فکر و نگاہ کے شاعر نہیں ۔ ان کے یہاں قابل قدر سیاسی، انقلابی اور فکری بصیرت ہے ۔ ان کی شاعری میں رومانی عناصر کی بھی کمی نہیں ۔۔۔ بہت سے مقامات پر ان کی رومانیت بڑی سحر کن اور دل فریب ہو جاتی ہے جس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہا جا سکتا ۔

مخدوم کی شاعری میں ہیئت کے کچھ کامیاب تجربے بھی ملتے ہیں ۔ مخدوم کا انتقال ۲۵ اگست ۱۹۶۹ء میں ہوا تھا ۔ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ حیدرآباد میں گزرا اور وہ حیدرآباد میں بے حد مقبول رہے ۔ ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کے اہم اور سرگرم رکن تھے مگر مزاج رومانیت پسند شاعر کا تھا ۔

بساط رقص اردو شاعری سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک خوبصورت تحفہ ہے جس میں ذوق و نظر کی تسکین کے سامان کی کمی نہیں ۔

مثلاً نظم چارہ گر کا ابتدائی حصہ ملاحظہ فرمائیے :

اک چنبیلی کے منڈوے تلے
میکدے سے ذرا دور اس موڑ پر
دو بدن
پیار کی آگ میں جل گئے
پیار حرف وفا
پیار ان کا خدا
پیار ان کی چتا

ایک کا فر غزل کے چند کافر شعر بھی سن لیجیے :

اک شہر میں اک آہوئے خوش چشم سے ہم کو
کم کم ہی سہی نسبت پیمانہ رہی ہے
بے صحبت رخسار اندھیرا ہی اندھیرا
گو جام وہی، مے وہی، میخانہ وہی ہے
ہر دم ترے انفاس کی گرمی کا گماں ہے
ہر یاد تری یاد کے پھولوں میں بسی ہے

مصنف: اخلاق حسین عارف

نام کتاب: **ذوق طلب و جستجو** ملنے کا پتہ: ۱۵ باؤد خانہ لکھنؤ۔ قیمت: دس روپے

صفحات ۲۵۶

یہ کتاب جناب اخلاق حسین عارف کے ۱۶ عدد مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ مضامین مختصر ہونے کے باوجود ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے اور خصوصاً طالب علموں کے لیے کارآمد اور مفید ہیں۔ بعض مضامین میں علمی اور ادبی خوبیاں بھی ملتی ہیں۔ مضامین کا تنوع جو امیر خسرو و عرفی سے لے کر نظیر اکبر آبادی، غالب، مومن، اکبر الہ آبادی، محسن کاکوروی، شبلی، رسوا، شاد، صفی، ظریف، ثاقب اور خبیر تک ہے، مصنف کے مطالعے کی وسعت کا مظہر ہے۔ اور اس لحاظ سے کتاب کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں۔

کتاب اردو اکاڈمی کے مالی اشتراک سے شائع ہوئی ہے۔

—— ذکی کاکوروی

گذرتے لمحوں کی چاپ رام لعل۔ سن اشاعت ۱۹۷۴ء۔ ضخامت ۲۰۷ صفحات۔ قیمت ۷ روپے (علاوہ محصول ڈاک)، کتاب مکتبۂ دین و ادب، بڑا ئن کی مسجد، امین الدولہ پارک لکھنؤ۔ ۲۲۶۰۰۱ سے طلب کی جا سکتی ہے۔

زیر تبصرہ کتاب رام لعل کے آٹھ افسانوں پر مشتمل ہے جن میں چند طویل مختصر افسانے اور ایک ناولٹ جس کا عنوان "نقش پنہاں" ہے بھی شامل ہے۔ رام لعل کا شمار ان اردو افسانہ نگاروں میں کیا جاتا ہے جن کی قلمی کاوشوں نے اردو افسانہ نگاری کو سجایا اور سنوارا ہے اور جن کے قلمی آثار میں بعض ایسے افسانوی شاہکار موجود جو زمانے کے سیل اور وقت کی گرد سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ افسانہ نگاری کے میدان میں رام لعل نے شہرت عام کا قلعہ یقیناً فتح کر لیا ہے اور اب بقائے دوام کے دربار میں وہ کس مقام کے مستحق ہیں اس کا فیصلہ مستقبل کے ناقدین کر سکیں گے۔ رام لعل کی کہانیوں پر اس مختصر سے تبصرے میں کسی تفصیلی گفتگو کی گنجائش نہیں مجملاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ زیر تبصرہ کتاب کے افسانوں میں وہ تمام عناصر موجود ہیں جن کے لیے رام لعل کی کہانیاں مشہور رہیں اور شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔

کتاب کی طباعت، کتابت اور گٹ اپ اوسط درجے کا ہے۔ لیکن معنوی خوبیاں ان معمولی خامیوں کی تلافی کے لیے کافی ہیں۔ اس دلچسپ کتاب کے لیے رام لعل اور مکتبہ دین و ادب لکھنؤ دونوں ہی مبارکباد کے مستحق ہیں۔

—— کاظم علی خاں

اُردو قواعد حصہ اول۔ مصنف: اے دائی انصاری، صفحات: ۸۰۔ قیمت: ڈیڑھ روپے

ملنے کا پتہ:
کتب خانہ امدادیہ دیوبند ضلع سہارن پور۔

اردو میں پچھلے دس سال کے دوران تو اعد اور صرف و نحو کے متعلق بہت کم لکھا گیا ہے۔ حالانکہ اُردو کے مبتدی طالب علموں کے علاوہ خود معلموں کو اپنی مادری زبان کے اس پہلو سے کما حقہ واقفیت کی جو ضرورت ہے اس کے اظہار کی چنداں ضرورت نہیں۔ اس کی بڑی وجہ موضوع کی خشکی اور اردو داں طبقہ کی تن آسانی کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے۔ اے دائی انصاری صاحب کی اس چھوٹی سی کتاب میں حروف تہجی سے لے کر لفظ، اسم، صفت، فعل، حرف اور ان کی قسمیں، پھر جملہ، جملے کے اجزا اور ان کی قسمیں، سوال و جواب کے ذریعے نہایت دلچسپ طریقہ پر بچوں کو بتانے کی کوشش کی گئی ہے۔ جو معلموں کے لیے بھی مفید اور کارآمد ہے۔

—— (سید نظر برنی)

★

—— سچائی سے بہتر کوئی مذہب نہیں ہے۔
—— سچا مذہب ہمیشہ بہتر اخلاق سے منسلک ہوتا ہے مذہب میں اخلاقیات کی اتنی ضرورت ہے جتنی ایک بیج کو پھلنے پھولنے کے لیے پانی کی ضرورت۔

—— مہاتما گاندھی

نیا دور

جلد ۳۲ نمبر ۸

نومبر ۱۹۷۶ء

ایڈیٹر: خورشید احمد

جوائنٹ ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی

★

پبلشر: یوگیندر نرائن

ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اتر پردیش

پرنٹر: اشوک در

سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری، یوپی

مطبوعہ نیو گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ

شایع کردہ محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ، اترپردیش

قیمت فی شمارہ: پچاس پیسے

زر سالانہ: پانچ روپے

ترسیل زر کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ پرکاشن ریبھاگ انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یوپی لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور پوسٹ بکس نمبر ۱۴۶ ۔ لکھنؤ

بذریعہ رجسٹری: ایڈیٹر نیا دور، انفارمیشن و پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یوپی لکھنؤ

عنوانات

اپنی بات

نومبر کا مہینہ ہندستان کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ اس مہینے میں ملک کی دو عظیم المرتبت اور تاریخ ساز شخصیتوں پنڈت جواہرلال نہرو اور شریمتی اندرا گاندھی نے جنم لیا ہے۔ پنڈت جواہرلال نہرو نے آزادی کے بعد نئے ہندستان کی تعمیر کی نہایت ٹھوس بنیادیں رکھیں اور آج انھیں بنیادوں پر ہماری ہردلعزیز وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نہایت بلند اور مستحکم عمارات کی تعمیر کر رہی ہیں۔

ہندستانی قوم اپنے ان دونوں عظیم محسنوں کو کبھی فراموش نہ کر سکے گی اور نئے ہندستان کی تعمیر و ترقی کی تاریخ میں ان کے نام ہمیشہ سنہری حرفوں میں ثبت رہیں گے۔

پنڈت نہرو ہندستان کو بہت جلد دنیا کے دوسرے ترقی یافتہ ممالک کی صف میں نمایاں دیکھنا چاہتے تھے، اس کے لیے ملک میں بڑے پیمانے پر صنعتی انقلاب کی ضرورت تھی اور یہ انقلاب وافر برقی قوت کی دستیابی اور منصوبہ بند معیشت کے تحت ہی ممکن ہو سکتا تھا۔ چنانچہ برقی قوت کے حصول کے لیے ملک میں بڑے بڑے باندھوں کی تعمیر کی گئی جن میں پنجاب کا بھاکڑا ننگل باندھ اور مرزا پور (اتر پردیش) کا ریہانڈ باندھ آپ اپنی مثال ہیں۔

منصوبہ بند معیشت کے لیے پنچ سالہ منصوبوں کی بنیاد رکھی گئی اور ان منصوبوں کے تحت ملک میں بھاری صنعتوں کا قیام عمل میں آیا اور ملک میں بڑے بڑے انجنوں سے لے کر چھوٹی چھوٹی پن اور سوئیاں تک بننے لگیں چنانچہ ملک ان اشیا کے معاملے میں خودکفیل ہو گیا اور حتی کہ وہ اپنی مصنوعات ممالک غیر کو بھی برآمد کرنے لگا جس سے ہمارے زرمبادلہ میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ اسی کے ساتھ زراعت کی ترقی کی بنیادیں بھی جدید اور سائنٹفک ڈھنگ پر استوار کی گئیں جس سے ہماری غذائی پیداوار میں کافی اضافہ ہوا اور اب ہم اس معاملے میں بھی خودکفیل ہو چکے ہیں، لیکن ان تمام زرعی اور صنعتی ترقیوں کے باوجود ملک سے عام غریبی دور نہ کی جا سکی، اس بات کو شریمتی اندرا گاندھی نے شدت کے ساتھ محسوس کیا اور انھوں نے اس لعنت کو دور کرنے کے لیے "غریبی ہٹاؤ" کا نعرہ دیا جو ہندستان کے عوام الناس کے لیے تو بہت خوش آیند اور امید افزا تھا، لیکن وہ طبقہ جو سرمایہ داری نظام میں یقین رکھتا تھا، وہ چاہتا تھا کہ غریب بدستور مفلس رہیں اور وہ ان کا استحصال کرتے رہیں۔ چنانچہ اس طبقے کے لیے یہ نعرہ نہایت پریشان کن تھا، اسی کے ساتھ ملک کی وزارت عظمیٰ سنبھالنے کے بعد جب وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی نے عام لوگوں کے فائدے کے لیے بعض دیگر ترقی پسندانہ اقدامات کرنا شروع کیے تو نہایت گہری اور وسیع پیمانے پر سازشیں شروع کر دی گئیں جن کا اعادہ یہاں مقصود نہیں لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ ان سازشوں کے نتیجے میں نظام حیات درہم برہم ہونے لگا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ خود ملک کی آزادی، ہماری سالمیت اور جمہوریت کو خطرہ لاحق ہو گیا چنانچہ وزیر اعظم کے دلیرانہ مشورے پر صدر جمہوریہ نے ۲۶ جون ۱۹۷۵ء کو ایمرجنسی کا اعلان کیا جو ملک کے لیے ایک نعمت غیر مترقبہ ثابت ہوئی کیونکہ اس کے بعد ہی ہماری وزیر اعظم کو "غریبی ہٹاؤ" کے سلسلے میں ٹھوس قدم اٹھانے کا پورا موقع ملا۔ انھوں نے اس سلسلے میں ملک کے سامنے "بیس نکاتی معاشی پروگرام" پیش کیا جس کی تکمیل کے لیے آج ہماری حکومت اور پردیش کے عوام نہایت جوش و خروش کے ساتھ سرگرم عمل ہیں۔ ان بیس نکاتی معاشی پروگرام میں شری سنجے گاندھی کے پانچ نکاتی پروگرام بھی شامل کر لیے گئے ہیں۔ ان معاشی پروگرام میں خاندانی منصوبہ بندی کا پروگرام ہمارے لیے اولین اہمیت کا حامل ہے، یہ ایک ایسا اہم اور بنیادی پروگرام ہے جس کی تکمیل میں ہی ہمارے سارے معاشی پروگراموں کی کامیابی کا راز مضمر ہے۔ وزیر اعلیٰ اتر پردیش شری نرائن دت تیواری نے حال ہی میں پردیش کے عوام کو اس پروگرام کی اہمیت بتاتے ہوئے ایک بیان میں کہا ہے کہ:

"خاندانی منصوبہ بندی پروگرام نہ صرف ہمارے ملک میں بلکہ دوسرے بہت سے ملکوں میں بھی شروع کیا گیا ہے کیونکہ آبادی میں اضافہ ترقی کے فوائد کو رائیگاں کر رہا ہے اور عوام ان سے پورے طور پر بہرہ مند نہیں ہو رہے ہیں۔ یہ پروگرام انڈونیشیا، ایران، ترکی، پاکستان اور دیگر متعدد ممالک میں شروع کیا گیا ہے۔ یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ اس پروگرام کے بارے میں کچھ سماج دشمن عناصر گمراہ کن پروپیگنڈہ کر رہے ہیں تاکہ عوام گمراہ ہوں اور اس پروگرام سے فائدہ نہ اٹھا سکیں۔ کہیں کہیں تو یہ خبر بھی اڑا دی گئی ہے کہ چھوٹے چھوٹے بچوں کو ایسی گولیاں کھلائی جا رہی ہیں جس سے آگے چل کر ان کے کبھی اولاد پیدا نہ ہو سکے، یہ بالکل غلط ہے اور تعجب تو اس بات پر ہوتا ہے کہ لوگ کیسے ایسی بے سر پیر کی باتوں پر یقین کر لیتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بچوں کی تندرستی ٹھیک رکھنے کے لیے ان کو وٹامن کی گولیاں کھلائی جاتی ہیں اور بیماریوں سے محفوظ رکھنے کے لیے ٹیکے لگائے جاتے ہیں۔ بعض مقامات پر بی سی جی کا ٹیکہ لگانے کا پروگرام بھی جاری ہے تاکہ ان بچوں کو آیندہ ٹی بی دق کی بیماری سے محفوظ رکھا جا سکے، یہ کوئی نیا پروگرام نہیں ہے بلکہ کئی سال سے جاری ہے۔ لیکن افواہیں پھیلانے والے کچھ افراد نے اس پروگرام کے خلاف کچھ سراسر غلط اور بے بنیاد باتیں پھیلائی ہیں۔ یہ غلط فہمی بھی پھیلائی جا رہی ہے کہ مرد نس بندی آپریشن کرانے کے بعد قوت مردمی سے بالکل محروم ہو جاتا ہے۔ یہ بات بھی بالکل بے بنیاد ہے۔ اس سلسلے میں نہ صرف بڑے بڑے ماہرین بلکہ ان لوگوں کا بھی جو نس بندی پہلے کرا چکے ہیں یہ کہنا ہے کہ اس سے ان کی ازدواجی زندگی پر کوئی خراب اثر نہیں پڑا ہے اور وہ اب بھی اسی طرح مسرور و مطمئن زندگی بسر کر رہے ہیں جیسی نس بندی سے پہلے کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں اگر کسی شخص کو کوئی شک و شبہ ہو تو وہ ان لوگوں سے بات کر کے اپنا اطمینان کر سکتا ہے جو پہلے نس بندی کروا چکے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ افواہ بھی پھیلائی گئی ہے کہ لوگوں کی نس بندی زبردستی کی جا رہی ہے۔ یہ بھی بالکل غلط ہے۔ حکومت کی ایسی کوئی پالیسی نہیں ہے اور اسی لیے جہاں دیگر محکموں کے ملازمین کے لیے نشانے مقرر کیے گئے وہاں پولس کے ملازمین کے لیے کوئی نشانہ مقرر نہیں کیا گیا ہے۔ حکومت نے اپنے ملازمین کے لیے ضرور کچھ قواعد وضع کیے ہیں تاکہ لوگ اپنی نس بندی کرا لیں۔ ان قواعد کے تحت یہ فیصلہ بھی کیا گیا ہے کہ کچھ سہولتیں جو حکومت کی طرف سے عام طور پر ملا کرتی تھیں وہ اب انھی لوگوں کو ملیں گی جو خاندانی منصوبہ بندی کو اپنائیں گے۔ یہ اقدام اس غرض سے کیا گیا ہے کہ حکومت اپنے افسران اور ملازمین سے یہ توقع کرتی ہے کہ وہ ملک و قوم کے لیے وضع کردہ ایسے پروگراموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں تاکہ عوام میں ان کے تئیں زیادہ اعتماد پیدا ہو۔

اکثر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ نس بندی کرانا مذہب اور دھرم کے خلاف ہے۔ دراصل اس پروگرام کا مذہب سے کوئی سروکار نہیں ہے یہ تو صرف ایک معاشی اور سماجی پروگرام ہے جس کا مقصد عوام کی معاشی اور سماجی زندگی کا معیار بلند کرنا ہے۔"

— ایڈیٹر

غزل

پنڈت میلارام وفا

ہم رُعبِ حسنِ یار سے تتلا کے رہ گئے
شکوے زباں تک آے مگر آ کے رہ گئے

آیا نہ کوئی لے کے خطِ شوق کا جواب
سب نامہ بر نہ جانے کہاں جا کے رہ گئے

یُوں سا لگا کہ مجھ پہ گھڑوں پانی پڑ گیا
جب عرضِ مدّعا پہ وہ شرما کے رہ گئے

وہ پُھول میری آرزوؤں کی ہیں اک مثال
کِھلنے سے پیشتر ہی جو مُرجھا کے رہ گئے

ایفاے وعدہ کا نہ دلایا وہ یقیں
کھائی ہوئی سی ایک قسم کھا کے رہ گئے

محفل میں کر رہے تھے وہ غیروں سے شوخیاں
مجھ پر پڑی نگاہ تو شرما کے رہ گئے

نغمہ تو اک طرف، نہ ہوا نالہ بھی رواں
سب تارِ سازِ شوق کے تھرّا کے رہ گئے

اُٹھے بھی لے کے دعوئے عظمت جواب وفاؔ
اجداد کے عرُوج پہ اترا کے رہ گئے

ڈاکٹر محمد سلیم قدوائی



جواہر لال نہرو اور تعلیم

ایک ترقی پذیر معاشرہ میں تعلیم کی جو اہمیت ہے اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ایک بہتر تعلیمی نظام کے ذریعہ ہی ایک بہتر سماجی نظام کا خواب شرمندہ تعبیر ہو سکتا ہے۔ یہ جاننا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ہندید ہندوستان کے معمار اول اور عظیم رہنما پنڈت جواہر لال نہرو کے تعلیم کے بارے میں کیا خیالات تھے؟ وہ ہندوستان میں کس قسم کے تعلیمی نظام کو رائج کرنا چاہتے تھے اور ان کے ذہن میں کس طرح کے نظام تعلیم کا نقشہ تھا؟

پنڈت نہرو کی تقریروں اور تحریروں کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ تعلیم کے موضوع سے ان کو خصوصی دلچسپی تھی اور وہ قومی ترقی میں تعلیم کی اہمیت سے بخوبی واقف تھے۔ ایک دوراندیش اور قومی رہنما اور مصلح ہونے کی حیثیت سے تعلیم اور اس کے مسائل سے گہری دلچسپی ناگزیر بھی تھی۔ تعلیم کے بارے میں نہرو جی کا ایک خاص نظریہ تھا جس کا اظہار ان کے اکثر خطبات اور تقاریر میں ملتا ہے۔ نہرو کا عقیدہ تھا کہ کسی ملک کی بڑائی اور عزت وہاں کی آبادی اور دولت سے نہیں آنکی جا سکتی بلکہ اس کی قدر و منزلت اور عظمت کا سہرا اس ملک کے تعلیم یافتہ مردوں اور عورتوں کے سر ہوتا ہے جو ملک و قوم کی ذمہ داریوں کو سنبھالتے ہیں۔ اگر ہم شاہراہ ترقی پر گامزن ہونا چاہتے ہیں تو ملک کا ایک بڑا سرمایہ تعلیم اور اس کی ترویج پر صرف کرنا چاہیے۔

نہرو کے نزدیک تعلیم کے معنی میں بڑی وسعت ہے۔ اسے سانچوں میں نہیں ڈھالا جا سکتا۔ ایک تعلیم یافتہ انسان کو ہمہ صفت ہونا چاہیے۔ ایک ماہر نباتیات کی طرح نہیں جو پھولوں کے نام تو ازبر کر لیتا ہو لیکن پھول کی خوشبو، حسن و نزاکت سے بالکل بے بہرہ ہوتا ہے۔ وہ تعلیمی اداروں میں محض نصابی تعلیم کافی نہیں سمجھتے تھے۔ صرف نصابی علم حاصل کر لینے کو وہ گدھے پر کتابیں لادنے کے مترادف تصور کرتے تھے۔ انھوں نے تعلیمی اداروں کو ایک کارگہ شیشہ گری سے تشبیہ دی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں سے قوم کے نوجوان اپنی متاع زندگی لے کر عملی دنیا میں داخل ہوتے ہیں۔

یہیں ان کے کردار اور شخصیت کی تراش خراش ہوتی ہے اور انھیں سجایا جاتا ہے۔ اگر دانش گاہیں اپنے فرائض سے پوری طرح عہدہ برآ نہیں ہوتیں، اور محض ڈگریاں دے دے کر ہر سال طلباء کو چلتا کر دیتی ہیں تو ایسے لوگ ملکی مسائل کا کوئی حل نہیں نکال سکتے، بلکہ قوم کے لیے وہ خود ایک مسئلہ بن جائیں گے۔ انھوں نے ہمیشہ اس بات پر زور دیا کہ نصابی تعلیم کے ساتھ ساتھ طلباء کو عقل و انسانیت کا بھی سبق پڑھانا چاہیے، تاکہ ان کے خیالات بلند ہوں اور وہ برے بھلے کی تمیز کر سکیں۔ انھوں نے کتابی تعلیم کے ساتھ ساتھ اعلیٰ اقدار کی تبلیغ و اشاعت پر بھی بہت زور دیا کہ دماغ کے دریچے کھلیں اور اس میں باہر کی تازہ ہوا بھی اندر آ سکے۔

تعلیم کے بارے میں نہرو کے خیالات مولانا آزاد یادگار لکچر ۱۹۵۹ء میں نہایت صفائی کے ساتھ پیش ہوئے ہیں۔ اس موقع پر نہ صرف انھوں نے اپنے تاثرات بیان کیے، بلکہ ملک کے تعلیمی نظام اور اس کے مسائل و مقاصد پر بھی روشنی ڈالی۔ ان کے سامنے سوال تھا کہ کون سے نئے نصب العین نئے تقاضوں کے مطابق بنائے جا سکتے ہیں جو مادی زندگی کی ضرورتوں کو بھی پورا کریں اور ذہنی و روحانی بالیدگی کے بھی موجب ہوں۔ انھوں نے اپنے اس تاریخی لکچر کے دوران بار بار یہ سوال اٹھایا کہ مادی ترقی بذاتِ خود کافی ہے یا اس کے علاوہ کچھ اور بھی درکار ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ خواہ مذہب کی ضرورت ہو یا نہ ہو لیکن کسی اچھے آدرش پر اعتماد ضروری ہے کیونکہ اس سے زندگی میں حرارت آتی ہے اور وجود کو تقویت حاصل ہوتی ہے۔ زندگی کو زندگی بنانے کے لیے ایک اعلیٰ اور ارفع مقصدِ حیات اشد ضروری ہے۔

اگرچہ نہرو کو ہندستان کے قدیم تہذیبی اور علمی ورثہ پر بڑا ناز تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ سائنس اور جدید ٹکنولوجی کے بھی بہت مداح اور معتقد تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ سائنس قدرت کا ایسا معجزہ ہے جس کی سحر کاریاں عام ہیں اور اس نے انسانی معیارِ زندگی کو بہت بلند کر دیا ہے۔ لیکن ان کے نزدیک سائنس کی تعلیم کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ ہمارے فکر و نظر میں تیر کی سی تیزی اور "سیدھ" پیدا ہو جائے۔ ان کو دورِ حاضر کا نصب العین سائنٹی نظریۂ حیات میں نظر آتا ہے۔

لیکن وہ اس سائنس کے مخالف تھے جو دنیائے انسانی کو نگل کر رکھ دیتی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ محض سائنس ہی زندگی کی گتھیوں کو کھولنے کے لیے کافی نہیں ہے بلکہ گدازِ قلب کی بھی ضرورت ہے۔ اس لیے انھوں نے سائنس اور روحانیت میں تال میل پیدا کرنے پر زور دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ "سائنسی اور فنی ترقی کے بغیر مستقبل سے آس نہیں باندھی جا سکتی اور یہ بات بھی بالکل درست ہے کہ یہ مستقبل بڑا سطحی اور بے معنی رہے گا اگر ہم اپنے ماضی کو فراموش کر دیں گے۔"

نہرو نے ساگر یونیورسٹی میں خطبہ دیتے ہوئے کہا تھا "کسی قوم کے لیے اس کی تہذیبی میراث سے زیادہ مفید اور قابل قدر چیز کیا ہو سکتی ہے۔ لیکن اس سے خطرناک چیز بھی کوئی نہیں کہ وہ اس پرانی زندگی بسر کرے۔ جو قوم محض اپنے اجداد کی نقالی کرتی ہے وہ کبھی پوری طرح پھل پھول نہیں سکتی۔ قومیں صرف ایجاد، تخلیق اور صلاحیت عمل کے بل بوتے پر اپنی توانائیوں کو فروغ دے سکتی ہیں۔ اس میں ایک ایسے تخلیقی ذہن کی ضرورت ہے جس میں سماجی احساس ہو۔ رواداری اور بھائی چارے کا سلوک کرنے کی صلاحیت ہو۔"

مختصر الفاظ میں نہرو کے نزدیک تعلیم کا مقصد بنی نوع انسان کی روح کو برے بھلے کی تمیز کرنے کی صلاحیت بخشنا ہے۔ اچھی تعلیم انسان کے ذاتی مفاد کے لیے نہیں ہوتی بلکہ علمی سوتے دوسروں کو بھی سیراب کرتے ہیں۔ وہ ایسی تعلیم کے خواہاں تھے جو قومی پیچیدہ مسائل کا حل تلاش کرنے میں معاون ہو، جو نہ موجودہ حالات سے بے خبر ہو اور نہ مستقبل کے امکانات سے، جسے وقت کے تقاضوں کا بھی پورا احساس ہو اور آئندہ کی ضرورتوں کا اندازہ بھی۔ وہ ایسی تعلیم چاہتے تھے جو محدود نظریات کی حامل ہرگز نہ ہو، بلکہ انسانی زندگی میں شائستگی کی ضامن بنے۔ نہرو کے تعلیمی فلسفہ کا بنیادی خیال یہ تھا کہ مشرق اور مغرب کے نظریات میں تال میل پیدا کیا جائے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ کسی قسم کی ترقی کوئی فائدہ نہیں دے گی اگر تعلیم پیچھے رہ جائے۔ نہرو کا تعلیمی فلسفہ آج بھی زندہ ہے اور ان کے تعلیمی خیالات آج بھی مشعلِ راہ کا کام دے رہے ہیں۔

★

اور تھے وہ، جنگ کے میداں میں جو اپنا لہو
اپنے منہ پر مل کے، ماتھے پر سجا کر آ گئے
چاہتے ہو تم کہ دنیا تم کو بھی تعظیم دے
تم کہ اپنی لاش کاندھوں پر اٹھا کر آ گئے
مسخرے کچھ اور ہوتے ہیں مجاہد اور کچھ
مسخرو! یہ تم کفن کس کا چرا کر آ گئے؟

جگن ناتھ آزاد

تخریبی قوتوں کے نام

کس سے اب دادِ وفا پانے چلے ہو احمقو!
تم کو آدابِ وفا آئے نہ آدابِ جفا
تم ہمارے خون کی سرخی پہ ڈالو اک نظر
اس کو کہتے ہیں جہاں میں خونِ شادابِ جفا
بڑھ رہے ہیں اب تمہاری سمت اس کے دائرے
وہ جو خود تم نے کیا تخلیق گردابِ جفا

سچے جھوٹے جس کے تم نعرے لگاتے آئے ہو
اک حقیقت بن کے اب وہ انقلاب آنے کو ہے
تم سمجھتے ہو اندھیرا ہے ابھی تک رات کا
نیند سے جاگو کہ سر پر آفتاب آنے کو ہے
اے جفا کارو! ستم گارو! ستم تو ہو چکا
اک ذرا ٹھہرو کہ اب یومِ حساب آنے کو ہے

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی

بڑے بھائی مرحوم

سنہ ۱۹۵۰ء میں میری ایک کتاب "مرزا شوق لکھنوی" شائع ہوئی۔

ذاکر صاحب قبلہ کا یہ دستور تھا کہ جب بھی ملاقات ہوتی۔ پوچھتے:

"میرے لیے کیا تحفہ لائے؟
کوئی نئی کتاب؟ کوئی نیا مضمون؟"

میں نے عرض کیا: "شوق پر ایک کتاب لکھی ہے"

فرمایا: "ذوق پر کیوں نہیں؟"

عرض کیا: "سوائے اپنی بدذوقی کے اور کوئی چیز اپنی شفاعت میں پیش نہیں کر سکتا"

ہنسنے لگے۔ جب کتاب پڑھ لی اور ملاقات ہوئی تو بہت دیر تک تعریف اور ہمت افزائی کرتے رہے۔ آخر میں فرمایا: "اس پر اس سے بہتر تبصرہ نہیں ہو سکتا جو نیاز صاحب نے کیا ہے"

"مرزا شوق لکھنوی" کا مقدمہ علامہ نیاز فتح پوری نے لکھا تھا۔ ان کے جن جملوں کی طرف ذاکر صاحب نے اشارہ کیا تھا وہ یہ ہیں:

"فاروقی صاحب کوئی غیر معروف نقاد و انشا پرداز نہیں ہیں۔ دس بارہ سال سے ادب و انشا کی گراں قدر خدمات انجام دے رہے ہیں اور "نگار" کو یہ فخر حاصل ہے کہ سب سے پہلے اس نے ان کا انکشاف کیا۔ ان کے تبصرے کے متعلق اس سے زیادہ کچھ کہنا نہیں چاہتا کہ وہ عصر سے زیادہ تنہا ہو کر رہ گیا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر فاروقی صاحب کے اختیار میں ہوتا تو وہ اپنے آپ کو اسی زمانے میں پہنچا دیتے۔ پھر اگر یہ صحیح ہے کہ ایک نقاد اپنے فرض کو اسی وقت صحیح انجام دے سکتا ہے جب وہ تصنیف کے ماحول کو اپنے اندر پوری طرح جذب کر لے تو میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ان دونوں مثنویوں پر تبصرہ کرنے کا حق فاروقی صاحب سے زیادہ کسی کو نہیں پہنچتا"

نیاز صاحب نے یہ بھی لکھا تھا:

"حاسدوں نے (شوق کی) ان مثنویوں کی لغزش مستانہ کو پستیِ اخلاق سے تعبیر کیا۔ برسوں ممنوع الاشاعت رکھا۔ بزرگوں کی صحبتوں میں ان کا تذکرہ اخلاقی جرم قرار پایا۔ لیکن شمع کی روشنی دامن سے اور چاند کا نور خاک سے نہیں چھپ سکتا"

"مرزا شوق لکھنوی کا دیباچہ حضرت جوش ملیح آبادی نے تحریر فرمایا تھا اور اس میں انھوں نے ان نقادوں پر سخت نکتہ چینی کی تھی جو ادب کو اخلاق کے تنگ معیار سے جانچتے ہیں۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

"ہمارے عفیف اور چھوٹی موٹی قسم کے نقاد ان مثنویوں کی "عریانی" پر خیر سے ناک بھوں چڑھاتے ہیں اور جی کھول کر بدمزاج بوڑھی عورتوں کی طرح جن کے احساسات فنا ہو چکے ہیں، برا بھلا کہتے ہیں اور یہ بھی ایک محکم دلیل اور زبردست ثبوت ہے ان مثنویوں کے بے نظیر ہونے کا"

"مرزا شوق لکھنوی" پر ہندوستان اور پاکستان کے تمام رسالوں میں بہت ہمت افزا ریویو ہوئے لیکن نومبر سنہ ۱۹۵۰ء کے "شاہراہ" دہلی میں ہنس راج رہبر نے بہت سخت اعتراض کیا اور لکھا:

"مثنوی پڑھنے کے بعد ہمارے دل میں مختلف سوالات پیدا ہوتے

ہیں۔ کیا مرزا شوق نے محض زندگی کی ترجمانی ہی کی ہے اسے بلند نہیں کیا؟ کیا ان کی بستی میں عفونت ہی عفونت ہے؟ ہم سمجھتے ہیں کہ اس بستی میں عفونت کے سوا اور کچھ نہیں۔ سیہ کاری اور عیش کوشی کی کہانیاں بیان کرکے زندگی کو بلند کرنے کی بات کہنا زندگی کو منہ چڑانا ہے۔ فاروقی صاحب معاف فرمائیں گے انھوں نے گڑے مردے اکھاڑنے کی کوشش کی ہے۔ ہمارے دور میں اس دور کی عفونت ہی کچھ کم نہیں کہ مرزا شوق کی فحش نگاریوں کو دہرایا جائے۔"

سید سجاد ظہیر مقدمہ سازش کراچی میں ماخوذ تھے۔ موت کا فیصلہ صادر ہوچکا تھا۔ انھوں نے یہ تبصرہ پڑھا اور تڑپ اٹھے اور فوراً لکھا "مجھے (ہنس راج رہبر کے) اس تجزیے سے قطعی اختلاف ہے... یہ نقطۂ نظر غلط ہے اور ترقی پسند اسے ہرگز قبول نہیں کرسکتے۔ ہمیں اس قسم کے تمام رجحانات کے خلاف جد و جہد کرنا چاہیے۔" یہی نہیں بلکہ "غلط رجحان" کے عنوان سے ایک پورا مضمون میری [illegible] مرزا شوق کی حمایت میں شائع کیا۔

میں ششدر اور حیران: بہ دار تواں گفت بہ منبر نتواں گفت۔

اس لیے کہ اس وقت تک بنے بھائی سے صرف غائبانہ ملاقات تھی۔ کبھی دیکھنے اور ملنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا لیکن اس واقعہ کے بعد دیکھنے اور ملنے کی بے کراں خواہش پیدا ہوگئی۔ میں نے اس کمی کو اس طرح پورا کیا کہ رضیہ سجاد ظہیر سے خط و کتابت شروع کی۔ وہ اس زمانے میں لکھنؤ میں تھیں اور بنے بھائی کی دوری و گرفتاری سے بہت پریشان تھیں۔ بڑے دلچسپ خط آئے ان کے۔ اور وہ غالباً میرے پاس بکھراؤں میں محفوظ بھی ہیں۔ رضیہ آپا سے یہ ذکر بھی آیا کہ ان کو آپا کے القاب سے یاد کیا جائے یا بھابی کے لفظ سے۔ میں نے بھابی کے رشتے کو پسند کیا۔ ایک تو اس وجہ سے کہ ان سے یہ مراسم بنے بھائی کی وجہ سے پیدا ہوئے۔ دوسرے اس رشتے میں چھیڑ اور شکوہ و شکایت کا زیادہ موقع تھا۔

بھابی سے کئی دفعہ ملاقات ہوئی لیکن بنے بھائی سے سب سے پہلی ملاقات حیدرآباد میں زور صاحب کے مکان پر ہوئی۔ اس وقت مجھے یہ بات کچھ ان مل بے جوڑ سی معلوم ہوئی۔ زور صاحب سجادہ نشین قسم کے آدمی۔ زاہد مناجاتی — بنے بھائی رند خراباتی۔ ان دونوں میں کیا جوڑ ہے؟ معلوم ہوا کہ دونوں برسوں ساتھ رہ چکے ہیں اور دونوں میں بالکل دھول دھپے کے تعلقات ہیں۔

بنے بھائی سے مل کر دل خوش ہوگیا۔ گلزار ابراہیم سے گزر کر ایک عجیب مسکراہٹ ان کے چہرے پر ٹھہر گئی تھی۔ حسن عارض اور اس پر حسن ظن! دیدن ہماں و دل دادن ہماں۔ ان کے ہاتھوں کی رشینیت اب تک یاد ہے۔ نرمی اور شائستگی ایسی کہ لکھنوی تہذیب کا نقشہ سامنے پھر گیا۔ لیکن دل میں فولاد کا سا عزم۔ رائے پیش کرنے میں شرافت اور بلا کا احترام۔ رخِ سخن پر رنگِ ادب موجود لیکن پیرایہ ان کی اپنی تھی جس کے لفظ لفظ سے ان کے دل کا خلوص اور ذہن کی جدت ظاہر ہوتی تھی۔ کہنے لگے: "ہنس راج رہبر آپ کو اور آپ کی کتاب کو غلط سمجھے۔ یہی نہیں بلکہ وہ ترقی پسند تحریک کو بھی غلط سمجھے۔ راجندر سنگھ بیدی [illegible] میرے اور ہنس راج رہبر شوق سے خفا ہیں اور یہی وہ شاعر ہیں جو آپ کی توجہ خاص کا مرکز رہے ہیں۔"

پھر فرمایا: "فاروقی صاحب میرے خیال میں تو شوق کی مثنوی زہر عشق اردو ادب میں ایک شاہکار کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس المیہ کا اس میں ذکر کیا گیا ہے وہ فی الحقیقت عورت کا المیہ ہے جسے جاگیرداری سماج میں محبت کرنے کا حق نہیں دیا گیا تھا۔ شوق کی ہیروئن تو زہر کھا کر مر جاتی ہے لیکن وہ جو زہر نہیں کھاتیں ان کا کیا حال ہوتا ہے؟ یہ ناکام بغاوتیں تاریخ کے ارتقائی عمل کو آگے بڑھاتی ہیں اور زندگی کو پہلے سے زیادہ مہذب اور خوب صورت بنا دیتی ہیں۔"

میں نے عرض کیا: "رہبر کا خاص اعتراض یہ ہے کہ یہ مثنوی پست قسم کے جذبات کو ابھارتی ہے۔"

فرمایا: "ہرگز نہیں۔ اسے پڑھ کر لوگ زیادہ پاک اور زیادہ گہری محبت کرنا چاہیں گے۔ ان کا تزکیۂ نفس ہوگا۔ ان میں دردمندی اور انسانیت کے جذبات ابھریں گے۔"

اس کے بعد بنے بھائی سے دہلی میں ملاقات ہوئی۔ اس زمانے
(بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

رازؔ الہ آبادی

نغمۂ وطن

میرے ہندوستاں میرے ہندوستاں
چھوڑ کر تجھ کو آخر میں جاؤں کہاں

تیری تہذیب سنگم کی موجِ رواں   مندروں میں بھجن مسجدوں میں اذاں
تجھ میں پیدا ہوئی میری اردو زباں   میرے ہندوستاں میرے ہندوستاں
چھوڑ کر تجھ کو آخر میں جاؤں کہاں

تیری خوشبو ملی سب چمن در چمن   ذکر تیرا ہوا انجمن انجمن
نام تیرا ملا داستاں داستاں   میرے ہندوستاں میرے ہندوستاں
چھوڑ کر تجھ کو آخر میں جاؤں کہاں

میرے اپنے ہوں یا پرائے ہوں   تو ہو سب کو گلے سے لگائے ہوئے
تیرے کردار میں ہے تعصب کہاں   میرے ہندوستاں میرے ہندوستاں
چھوڑ کر تجھ کو آخر میں جاؤں کہاں

تیرے آنچل میں حسن بہو آبرو کا ہے   اندرا تیرے ماتھے کی جھومر بنی ہے
تجھ میں گزرا ہے آزاد سا خوش بیاں   میرے ہندوستاں میرے ہندوستاں
چھوڑ کر تجھ کو آخر میں جاؤں کہاں

تجھ میں کالیداس سا انعام بردار ہوا   تجھ میں ٹیگور جیسا سخن ور ہوا
میر و غالب نے کھولی یہیں پر زباں   میرے ہندوستاں میرے ہندوستاں
چھوڑ کر تجھ کو آخر میں جاؤں کہاں

تیرے آنگن میں کشمیر کا بانکپن   تجھ میں اقبال سا صاحبِ علم و فن
بنے گاندھی ہوا تجھ میں پل کر جواں   میرے ہندوستاں میرے ہندوستاں
چھوڑ کر تجھ کو آخر میں جاؤں کہاں

خاک نے تیری کندن بنایا مجھے   پیار نے تیرے جینا سکھایا مجھے
میں ترا رازؔ ہوں تو مرا رازداں   میرے ہندوستاں میرے ہندوستاں
چھوڑ کر تجھ کو آخر میں جاؤں کہاں

چودھری پربھان سنگھ سرشتہ

اِندرا گاندھی

صبح انیسؔ نومبر کی تھی سن سترہ تھا
عطر و گل پاش ہے جو جشنِ ولادت بن کر
تھا مبارک یہ وہی دن کہ زمیں پر اتری
عرش سے ایک کرن تابشِ حکمت بن کر
علم و دانش کی ضیا، فہم و فراست کا فروغ
ڈھل گیا پیکرِ ادراک کی صورت بن کر
زرفشانی جو ابھر لیے موتی کی لڑی
جلوہ آرا ہوئی سنگم کی طہارت بن کر
ہر طرف ہے جو بہ اندازِ نسیمِ سحری
گل فشاں شاخِ گلستانِ فصاحت بن کر
گرم بازاریِ ہنگامہ طرازی پہ کبھی
پرتو افگن ہوئی تنویرِ قیادت بن کر
شورِ دریا سے تکلم بھی زباں پر آیا
زمِ گفتاری و لہجہ کی نزاکت بن کر
ثبت ہے سرخیِ تنظیم نگینوں کی طرح
سرِ تاریخِ وطن، حسنِ عبارت بن کر
اندرا نام ہے جو ہند کے اندر اس کی
نقشِ تدبیر ہے تقدیر کی زینت بن کر

جگمگا اٹھی جو آئینۂ عالم پہ سرِ دش
قوم کی، ملک کی، انسان کی عظمت بن کر

سید قمر الحسن



اندرا گاندھی اور جمہوریت

وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی نے جس ماحول میں ہوش سنبھالا اور جس فضا میں ان کی ذہنی تربیت ہوئی وہ جمہوریت، انفرادی آزادی اور حب الوطنی کے نعروں سے گونج رہی تھی۔ انھوں نے پنڈت جواہر لال نہرو جیسے جمہوریت پسند کے گھر میں جنم لیا انھوں نے جب آنکھیں کھولیں تو ان کے ارد گرد مہاتما گاندھی، مولانا ابوالکلام آزاد، رفیع احمد قدوائی اور دوسرے جمہوریت پسند اور حب الوطن لیڈروں کا جمگھٹا تھا۔ جس کی پرورش ایسے ماحول میں ہوئی ہو جب نے بچپن سے لے کر سن بلوغ تک انھیں باتوں کے چرچے سنے ہوں اور جس کا کردار اسی جمہوری فضا میں پروان چڑھا ہو اس کے متعلق یہ خیال کرنا کہ وہ ایک ڈکٹیٹر بن جائیں گی سوائے بدگمانی اور رشک و حسد کے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

اس قسم کے خیالات کا اظہار وہ مفاد پرست کرتے ہیں جن کے مفاد کو مسز اندرا گاندھی کے ترقی پسندانہ اقدامات سے دھکا لگا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ جس چیز کو صحیح اور عوام کے مفاد میں سمجھتی ہیں اس کے اظہار میں نہ تو جھجکتی ہیں اور نہ اس کے حصول کے لیے موثر اقدام کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتی ہیں بلکہ پختہ عزم اور بلند ہمتی کے ساتھ کسی مخالفت دشواری یا رکاوٹ کی پرواہ کیے بغیر مستقل مزاجی سے آگے قدم بڑھاتی چلی جاتی ہیں۔ اقتدار سنبھالتے ہی انھوں نے بینکوں کو قومیانے سابق راجواڑوں کے صرف خاص اور مراعات کو ختم کرنے کے اقدامات شروع کر دیے۔ ان ترقی پسندانہ اقدامات کی مخالفت سرمایہ داروں جاگیرداروں اور ان کی زیر سرپرستی چلنے والی سیاسی اور فرقہ پرست جماعتوں نے پوری شدت سے کی لیکن مسز اندرا گاندھی کے عزم اور صحیح کام کرنے کی لگن نے راہ کے روڑوں کو صاف کر دیا اور کامیابی نے قدم چومے۔ دوسری طرف ان اقدامات سے مفاد پرستوں اور لوٹی پٹیوں کے حلقوں میں کھلبلی مچ گئی لیکن وہ ان اقدامات کی جو عوام کے مفاد میں تھے کھلم کھلا مخالفت کی ہمت نہ رکھتے تھے کیونکہ ان اقدامات کے پیچھے عوام کی طاقت تھی اس لیے انھوں نے سازش کا راستہ اختیار کیا یعنی جمہوری طریقہ پر منتخب کی گئی حکومت کا تختہ الٹنے کے لیے غیر جمہوری جارحانہ طریقے اختیار کرنے کے منصوبے بنانے لگے مرکزی وزیر شری للت نرائن مسرا کا قتل اور ہندستان کے چیف جسٹس پر حملہ اسی منصوبے کی کڑیاں تھیں

وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی جمہوریت پسند ہونے کے ساتھ نظم و ضبط کی سختی سے پابندی کی قائل ہیں کیونکہ انتشار اور بد نظمی کی حالت میں حکومت کوئی ترقیاتی یا اصلاحی کام انجام نہیں دے سکتی۔ مفاد پرستوں کی جانب سے پیدا کیے جانے والے انتشار کو انھوں نے بڑی تشویش کی نظر سے دیکھا۔ اس لیے نہیں کہ انھیں اپنا اقتدار خطرے میں نظر آیا بلکہ اس لیے کہ پورے جمہوری نظام اور ان جمہوری روایات کے ختم ہو جانے کا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا جن کی بنیاد ہمارے بڑے لیڈروں نے بڑی محنت سے ڈالی تھی۔ یہ محسوس کرتے ہی انھوں نے اس خطرناک

رجحان کی روک تھام کے لیے بلا جھجک پُرعزم قدم اٹھایا اور صدر جمہوریہ نے ان کے مشورے پر ۲۶ جون ۱۹۷۵ء کو ملک میں ہنگامی حالات کا اعلان کر دیا۔

اس موقع پر انھوں نے قوم کے نام جو پیغام نشر کیا اس میں واضح الفاظ میں اس سازش کا ذکر کیا جو مفاد پرستوں کی جانب سے وسیع پیمانے پر کی جا رہی تھی۔ انھوں نے کہا کہ ہنگامی حالات سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ سب جانتے ہیں کہ جب سے میں نے عوام اور کمزور طبقے کی بھلائی کے لیے اقدامات شروع کیے اس وقت سے مفاد پرست جمہوریت کے نام پر جمہوریت کو ناکام بنانے کی سازش کرنے لگے جس کے نتیجے میں متعدد تشدد آمیز واقعات ہوئے۔ یہاں تک فوج اور پولیس میں بغاوت پھیلانے کی بھی کوشش کی گئی۔ میرے خلاف الزام تراشی کی گئی لیکن ہندوستان کے لوگ مجھے بچپن سے جانتے ہیں۔ یہ میرا کوئی ذاتی معاملہ نہیں۔ میں وزیر اعظم رہتی ہوں یا نہیں، اس کی بھی کوئی اہمیت نہیں۔ لیکن وزیر اعظم کا عہدہ ایک اہم عہدہ ہے اس کے وقار کو کم کرنے کی سوچی سمجھی سازش نہ تو جمہوریت کے مفاد میں ہو سکتی ہے اور نہ قوم کے مفاد میں بلکہ اس سے استحکام کو نقصان پہنچتا ہے اور حکومت ترقیاتی اور عوامی فلاح کے کاموں کی طرف پوری توجہ نہیں کر پاتی۔

وزیر اعظم مسز اندرا گاندھی کی یہ خصوصیت ہے کہ اگر وہ کسی بات کو صحیح اور مناسب سمجھتی ہیں تو پھر اس کی انجام دہی میں راہ کی دشواریوں کی کوئی پرواہ نہیں کرتیں اور بے دھڑک اس پر عمل درآمد کے لیے قدم اٹھا دیتی ہیں۔ بالکل شروع میں جب ڈاکٹر رادھا کرشنن کے بعد صدر جمہوریہ کے عہدے کے لیے کانگرس امیدوار چننے کا سوال اٹھا تو انھوں نے بعض مصلحت پسند ساتھیوں کی مخالفت کے باوجود ڈاکٹر ذاکر حسین کا نام تجویز کیا جو اس وقت نائب صدر جمہوریہ تھے۔ کیونکہ وہ انھیں اس کا مستحق سمجھتی تھیں اور مصلحت کی بنا پر ان کے ساتھ ناانصافی برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھیں ان کے عزم اور استقلال نے ہمیشہ انھیں اپنے نیک فیصلوں میں کامیابی سے ہمکنار کیا چنانچہ انھیں اس معاملہ میں بھی شاندار کامیابی حاصل ہوئی اسی بنا پر عوام کا اعتماد تیزی سے بڑھتا گیا۔ اسی عزم اور بلند ہمتی سے کام لے کر انھوں نے کانگریس کو ان رجعت پسند عناصر سے صاف کر دیا جو ہمیشہ ترقی پسندانہ اقدامات کی راہ میں روڑے اٹکایا کرتے تھے۔ اس جرأت مندانہ اقدام میں بھی انھیں وہ کامیابی حاصل ہوئی کہ ان کے مخالف بھی حیرت زدہ ہو کر رہ گئے۔

جمہوریت پسندی۔ جمہوریت کے بارے میں مسز اندرا گاندھی کا ذہن بالکل صاف ہے۔ انھوں نے ۲۲ جولائی ۱۹۷۵ء کو لوک سبھا میں ایمرجنسی کے نفاذ پر بحث کا جواب دیتے ہوئے کہا میں ایک ایسی جمہوریت پر یقین رکھتی ہوں جس میں برسر اقتدار پارٹی پر ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ مخالف پارٹیوں کو اظہار خیال اور تنظیم کی آزادی دے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ امید کرتی ہے کہ مخالف پارٹیاں اور دوسرے لوگ حکومت کے کاموں میں روڑا نہ اٹکائیں گے اور قومی پروگراموں کی راہ میں رکاوٹیں نہ پیدا کریں گے۔

اسی طرح انھوں نے جمہوریت کے بارے میں اپنے خیال کا اظہار کرتے ہوئے راجیہ سبھا میں ایمرجنسی کے نفاذ کے متعلق ایک بیان میں کہا کہ ایمرجنسی کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ ہم نے جمہوریت کی راہ سے منہ موڑ لیا ہے یا ہم جمہوریت کو ملک کے لیے ناموزوں تصور کرتے ہیں۔ میں اس موقع پر اس بات کو بالکل واضح کر دینا چاہتی ہوں کہ ہمارے جیسے وسیع ملک کے لیے جس میں مختلف زبانیں بولنے والے اور مختلف مذہب کے ماننے والے رہتے ہیں اس کے لیے جمہوری نظام کے سوا اور کوئی دوسرا نظام کسی طرح موزوں نہیں ہے۔

انھوں نے ۲ اگست ۱۹۷۵ء کو بنگلور میں کانگریس کے منتظمین کے جلسے میں جمہوریت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ میں جمہوریت کی صرف اس لیے قائل نہیں ہوں کہ وہ ایک اچھا آدرش ہے بلکہ اس لیے قائل ہوں کہ ہمارے جیسے ملک کے لیے جمہوری طریقہ

ہی ایک ایسا طریقہ ہے جس کے ذریعہ ہم عوام کو حکومت کے کاموں میں شرکت کا زیادہ سے زیادہ موقع دے سکتے ہیں۔ کیونکہ عوام کی شرکت ہی جمہوریت کی جان ہے۔

انھوں نے کہا کہ جمہوریت کا مطلب محض انتخابات کی آزادی یا آزادانہ انتخاب نہیں بلکہ جمہوریت دراصل ملک کی تعمیر و ترقی میں عوام کی پُرخلوص شرکت ہے۔

وزیراعظم مسز اندرا گاندھی ہمیشہ اس بات پر زور دیتی رہی ہیں کہ ملک کی حکومت، اس کے انتظام اور اس کی سرگرمیوں میں غریب عوام برابر کے شریک ہوں تاکہ وہ احساس کمتری کا شکار نہ ہوں اور خود کو تمام کاموں اور پروگراموں میں برابر کا شریک سمجھیں اور لگن اور جوش کے ساتھ ان پر عمل درآمد کی کوشش کریں کیونکہ اچھا سے اچھا پروگرام عوام کے پرخلوص تعاون کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتا۔

۲۰ نکاتی پروگرام - مسز اندرا گاندھی نے اپنے ۲۰ نکاتی پروگرام میں سب سے زیادہ زور ملک کے غریب اور کمزور طبقہ کی فلاح و بہبود پر دیا ہے۔ ملک کی آزادی سے ملک میں جو ترقی ہوئی اور جو خوش حالی آئی اس سے اب تک محض ایک مخصوص طبقے کو فائدہ پہنچا اور بڑھی ہوئی قومی دولت کی تقسیم مساوی طور پر نہیں ہوئی اور جس کی وجہ سے غریب اور محنت کش طبقہ جس کی محنت اور جانفشانی کے نتیجے ہی میں ملک کی دولت میں اضافہ ہوا اس سے خود اسے کوئی فائدہ نہیں پہونچا۔ نہ تو اس کا معیارِ زندگی بلند ہوا اور نہ اسے ترقی کے مساوی مواقع فراہم ہو سکے، دولت مند طبقہ کے لوگ اپنے اثر و رسوخ کی بنا پر تعلیم و ترقی کے تمام مواقع سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھاتے اور سماج میں عزت و وقار حاصل کرتے رہے۔

ظاہر ہے کہ یہ صورت حال نہ تو صحت مند معاشی ترقی کے لیے مفید تھی اور نہ اس سے ملک میں استحکام اور اطمینان پیدا ہو سکتا تھا۔ کیونکہ دولت کے چند ہاتھوں میں سمٹ کر رہ جانے اور ایک مخصوص طبقے کے خوش حال ہو جانے سے ملک خوش حال اور ترقی یافتہ نہیں کہا جا سکتا۔ ملک کی ترقی اور خوش حالی کی اصلی پہچان ملک کے عوام کی مجموعی ترقی اور خوش حالی ہے۔ وزیراعظم مسز اندرا گاندھی نے اسی لیے ملک کے غریب اور کمزور طبقے کے لوگوں کی ترقی اور بہتری کی طرف خاص توجہ دی اور اپنے ۲۰ نکاتی پروگرام میں زرعی آراضی کی حد بندی سے حاصل ہونے والی فاضل زمین کی بے زمین کاشت مزدوروں اور پچھڑے ہوئے لوگوں میں صحیح طور پر تقسیم کیے جانے کے بندوبست کے ساتھ ساتھ انہیں قرض کے بارے سبکدوش کرنے، پابند مزدوری سے آزاد کرانے اور ان کے رہنے کے لیے مناسب جگہ کا بندوبست کرنے کے لیے باقاعدہ اور سرگرم پروگرام رکھا۔ ساتھ ہی ساتھ انہیں ملازمتوں میں سہولتیں دینے انہیں قانونی امداد اور تعلیم کے بہتر مواقع فراہم کرنے کے لیے عملی اقدامات بھی کیے۔ ان کے دورِ قیادت میں ہمارے ملک نے اقوام عالم میں ایک نمایاں مقام حاصل کر لیا ہے۔

★

بنے بھائی مرحوم ★ (صفحہ ۸ کا بقیہ)

میں زور صاحب بھی مع قبائل کے میرے یہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ چار بچے، بیگم، دو ملازم، زور صاحب رگنا اور تگنا التفات چاہتے تھے اور ان کا خاموش مطالبہ یہ تھا کہ جہاں کہیں وہ جائیں، میزبان بھی جوابی پوسٹ کارڈ کی طرح ان کے ساتھ جائے۔ ایک روز میں زیادہ مصروف تھا ان کے ساتھ نہیں جا سکا اور ایک طالب علم سے کہا کہ آپ زور صاحب کے ساتھ چلے جائیے۔ شام کو میں نے پوچھا: "زور صاحب آج کا دن کیسا گزرا۔ سب کام ہو گئے آپ کے؟"

کہنے لگے: "میاں یہ طالب علم ہمارے مرتبے کو نہیں پہچانتا۔ اس نے ہمیں بس میں بٹھا دیا۔"

زور صاحب پان بناتے رہے اور بنے بھائی سے اردو کے متعلق گفتگو کرتے رہے۔ یادیں بنی تھیں دلاتے جائیں۔

بنے بھائی مجھ سے کہنے لگے: "فاروقی، تمھیں معلوم ہے میں زور سے کیسی محبت کرتا ہوں۔ میں ان کے عظیم درجے کو تسلیم نہیں کر سکتا۔ اسی لیے شوق اور زور دونوں مجھے عزیز ہیں۔"

★

شوکت بنارسی

جواہر لال

جانتا ہے کچھ وہی سیرت جواہر لال کی
جس کو کچھ حاصل رہی قربت جواہر لال کی

ہند پر موقوف کیا ہے جانتے ہیں اہلِ ہند
غیر ملکوں میں بھی تھی شہرت جواہر لال کی

جس کو کر سکتی نہ تھی مرعوب شانِ خسروی
قابلِ تعریف تھی فطرت جواہر لال کی

دوستوں کا ذکر کیا دوست پھر بھی دوست ہے
دل میں دشمن کے بھی تھی عزت جواہر لال کی

جس طرف جاتے ادھر جاہ و حشم لیتے قدم
دیکھو یہ تھی شان یہ شوکت جواہر لال کی

پھر خیال آیا ہمیں پھر یاد تازہ ہو گئی
پھر نظر میں پھرتی ہے صورت جواہر لال کی
دیکھیے شوکت ہر اک لب پہ ہے ان کا تذکرہ
جاگزیں ہر دل میں ہے الفت جواہر لال کی

نصر قریشی

روحِ نہرو کا پیغام

شمعِ حق بادِ مخالف میں جلائے رکھیے
ہر گذرگاہ کو پُرنور بنائے رکھیے
قاتلِ نور پرستار ہیں تاریکی کے
اپنے سورج کو تو راہو سے بچائے رکھیے
سوختہ ذہنوں کی قندیل کو روشن کر کے
اُجڑے، تاریک مکانوں کو سجائے رکھیے
حق پرستی بھی عبادت کا لقب پاتی ہے
سچ کی آواز میں آواز ملائے رکھیے
ظلم اور جور کا ماحول مٹانے کے لیے
خود کو تخریب پسندوں سے بچائے رکھیے
زندگی جہدِ مسلسل سے سنور جاتی ہے
عزمِ محکم سے دلِ خفتہ جگائے رکھیے
دامنِ صبر و رضا ہاتھ سے چھوٹے نہ کبھی
خود کو آئین کا پابند بنائے رکھیے
گلشنِ وقت کے پھولوں میں چھپے ہیں کانٹے
دامنِ فکر کو کانٹوں سے بچائے رکھیے
ضربِ تیشہ سے چٹانوں میں بھی نغمہ گونجے
پھول محنت کے ہر اک سمت کھلائے رکھیے
دشت در دشت سرابوں کے سفر میں گذری
چشمۂ آبِ رواں خود کو بنائے رکھیے
ٹوٹی دیواروں کا منظر بھی بدل جائے گا
دل میں تعمیر کے جذبات بسائے رکھیے
کارواں وقت کا ٹھہرا ہے نہ ٹھہرے گا کبھی
دورِ منزل بھی نہیں، پاؤں بڑھائے رکھیے
جن اصولوں کے لیے وقف تھی میری ہستی
ان کو سرگرمِ عمل رہ کے بنائے رکھیے
دوستی، پیار، وفا، امن کا پیغام لیے
ملک کا نام زمانے میں جگائے رکھیے

رفیعہ منظور الامین

(افسانہ)

کامگار

اس چھوٹے سے گاؤں کے تقریباً سارے ہی بغیچے کندنا کے باپ بلیا کے تھے۔ پان کے باغیچے جہاں سوزن نما تپلے تپلے لمبے پیڑوں کی جلد میں اپنی شہ رگ سموئے پان کی نازک بیلیں اوپر تک لپٹی چلی گئی تھیں اور چھوٹے بڑے کلی دار پانوں کے پتے کسی بھارت نایٹم رقاصہ کی خوبصورت ہتھیلیوں کی طرح ہلکی ہوا میں تھرکتے جاتے۔ جب کامگار اپنی انگلیوں میں لوہے کے تیز ناخون پہنے کٹ کٹ ـــ ان پانوں کو ڈنڈی سے کاٹ کر جمع کرتے تو ہمیشہ گیلی رہنے والی زمین میں ان کے پیر دھنستے جاتے، بغیچے کے اندر گہرے زمردی سائے میں دوسرے ہر رنگ کا احساس مٹ جاتا۔

پان کے ان بغیچوں کے کناروں پر سپاری کے اکہرے تپلے بانس نما پیڑ تھے۔ جو ایک دوسرے سے دور، دور ـــ شیو جی کے ملبے ترشول کی طرح ایستادہ اور سیدھے تھے۔ اتنی نازک محبوب کی کمر بھی ہوتی تو دوہری ہو جاتی۔ لیکن یہ تپلے منی نما لمبے لمبے پیڑ اپنے سروں پہ یہ سپاری کے ٹوکرے سے اٹھائے کیسے برسوں سے یونہی کھڑے تھے۔

ان بغیچوں سے کچھ دور جہاں سے ایک راستہ شری لسویشور کے مٹھ کو جاتا ـــ بس وہیں نکڑ پہ ـــ ناریل اور چیکو کا بڑا بغیچہ تھا جہاں ناریل کے ہاتھی بر ڈیپڑوں میں ناریل نیچے نیچے لگے ـــ زمین پر کھڑے کھڑے ـــ ہاتھ بڑھا کر توڑے جا سکتے تھے۔

"پیلی گئے ہو گتی ؟" (کہاں جا رہے ہو؟) کندنا نے مینڈ پر کھڑے کھڑے کنڑی میں پوچھا ـــ وہ باسکٹ میں بڑے بڑے چیکو جمع کر رہی تھی۔ وہ کرناٹک کی سانولی سحر تھی جس میں کولار کے سونے کا رنگ گھلا تھا۔

منگل گٹی، رک گیا ـــ اکا مہادیوی کا وچن اس کے لبوں پر ادھورا ہی ٹھٹک گیا۔

بٹا دا میلے مینا ماڈی مرگا گلی دے انجی درے ....

"جب تم پہاڑ پہ گھر بناتے ہو ـــ تو جنگلی درندوں سے ڈر کیسا۔

جب تم سمندر کے کنارے نواس کرتے ہو ـــ تو لہروں کا کیا رونا۔

جب تم بازار میں رہتے بستے ہو ـــ تو شور شغابے کا کیا گلہ اے بھائی زندگی تو....."

اس نے کندنا کو ایک نظر دیکھا۔

"اڈکی (سپاری) نکالنی ہے ـــ وہیں جا رہا ہوں"۔ اس نے درانتی اور کندھے پر رکھی رسی سنبھالتے ہوئے کہا۔

منگل گٹی ابھی تین چار مہینے سے کام پر لگا تھا ـــ وہ سارے کامگاروں میں زیادہ پڑھا لکھا تھا۔ یوں تو کندنا کے پتا اپنے سارے ہی کامگاروں سے گہرا تعلق رکھتے اور حتی الامکان ان کی مدد کرنے کی کوشش کرتے۔ لیکن منگل گٹی سے انھیں خاص لگاؤ تھا، کیونکہ اس سے ان کی دور کی رشتہ داری بھی تھی۔ وہ اس کی ہمیشہ ہمت بندھاتے بلکہ اس کے امتحانوں کی فیس اور کتابوں کی ذمہ داری سب کچھ وہی اٹھاتے اور اس کے بدلے میں منگل نے بھی کسی کام میں آنا کانی نہیں کی، حساب کتاب سے لے کر معمولی سے

معمولی کام میں بھی اس نے کبھی عیب نہیں سمجھا۔

اپنی آمد کے ان تین ہی چار مہینوں میں منگل سپاری توڑنے میں بھی ماہر ہو گیا تھا۔۔ اس کا چست بدن اس کام کے لیے بہت موزوں تھا۔۔ چڑھنا اسے ایک ہی درخت پر پڑتا۔۔ سپاری کے پتلے پتلے تنے کو اپنی باہنوں کی گرفت میں لیے درانتی منہ میں پکڑے وہ گلہری کی طرح اوپر تک چلا جاتا۔۔ وہ وہاں رسّی سے خود کو پیڑ سے باندھ لیتا اور درانتی سے ساری سپاری نوچ لیتا اور پھر کمر کی رسی کھول کر اوپر پیڑ پر جھولنے لگتا۔۔ طوفان کی تیز مانسونی ہوا، جھونکوں کو تیز تر کرتی۔۔ اس کے بدن اور پیر دل کی جنبش سے یہ جھونکے بڑھتے جاتے اور ہر جھونکا اس کے پیڑ کو دوسرے پیڑ سے قریب تر کرتا جاتا۔۔ ایک دو، تین، چار اور ایک آخری جھونکا اسے دوسرے پیڑ سے حتی الامکان قریب کر دیتا۔۔۔

اچانک وہ پہلا پیڑ چھوڑ دیتا اور چھلانگ لگا کر پچاس ساٹھ فیٹ کی بلندی پر دوسرے پیڑ پر جا بیٹھتا۔۔۔ پہلے پیڑ اور دوسرے پیڑ کے درمیان یہ خلائی پل کبھی آٹھ دس فٹ لمبا بھی ہوتا۔۔ اتنا کہ دیکھنے والوں کی سانس رک جاتی اور نظر تخ بستہ ہو جاتی۔

کندنا نے کئی کامگاروں کو سپاری کے ایک درخت سے دوسرے درخت پر چھلانگ لگاتے دیکھا تھا، لیکن اس کی سانس کبھی نہیں رکی تھی۔۔ نظر کبھی تخ بستہ نہیں ہوئی تھی، لیکن منگل کو چھلانگ لگاتے دیکھ کر جب پہلی بار اس کی سانس رکی تو اس پر ایک بالکل نئی حقیقت کا انکشاف ہوا اور وہ سپاری کے پتلے پیڑ کی طرح کانپ گئی۔

"آج بھی وہاں آؤں گی۔۔۔ تم جو سپاری پھینکو گے تو جمع کر دوں گی۔"

"نہیں۔۔۔ تم نا آؤ۔" منگل بولا۔

"کیوں؟۔۔۔ بغیچہ تم نے لگایا ہے کیا؟" اس نے ہنس کر کہا۔

"میں نے کب کہا کہ بغیچہ میں نے لگایا ہے۔۔۔ تم سامنے رہو تو پیڑ پہ میرے پیر نہیں جمتے۔۔۔ ہوگ اپٹ برتی (میں ہو آؤں)" اور وہ آگے بڑھ گیا۔

کندنا جیکو سے بھری ٹوکری لیے گھر کی طرف چل پڑی۔ ٹیوب ویل کے جوشیلے پانی سے وہ ہاتھوں کو گھس کر جیکو کا لیسدار مادہ چھڑانے لگی۔۔ لیکن وہ وہاں جم چکا تھا۔ اس کے دل پر منگل کی شبیہ کی طرح۔۔ اب مشکل ہی سے چھوٹے گا،۔۔ اس نے سوچا۔

لیکن منگل اور کندنا کی الفت ٹیوب ویل کے جوشیلے پانی کی طرح نہیں تھی جو اپنے بہاؤ میں خس و خاشاک لے اڑے، بلکہ سبک روی سے بہتا وہ ٹھنڈے اور میٹھے پانی کا ایسا چشمہ تھی جس کے کنارے صاف ستھرے جنگلی پھول اگتے ہیں۔ کوئی ان پھولوں کو نوچ نہیں پھینکتا۔ کیونکہ وہ کسی کی نظروں میں نہیں سماتے۔

منگل بھی نہیں جانتا تھا کہ یہ سب کب ہوا۔۔۔ وہ پھول کب کھلے۔۔ لیکن وہ شروع ہی سے جانتا تھا کہ اس پھول کی آرزو کرنا بھول ہوگی۔ ظاہر ہے اس کی غریبی آڑے آتی تھی۔

بی۔ اے کا پرائیویٹ امتحان دے کر جب وہ اپنے کام پر واپس آیا تو اس نے سوشیل بابو کو بھی وہاں پایا۔۔۔ وہ کندنا کے باپ ہلیا کے دوست کے لڑکے تھے۔ خوبصورت جوان اور پڑھے لکھے۔ تعلق تو ان کا پیڑھیوں سے کرناٹک ہی سے تھا۔ لیکن ان کے دادا نے بمبئی میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ اور اب پہلی بار وہ کرناٹک آئے تھے۔ بمبئی میں ان کی کافی جائیداد تھی۔۔ ان کے والد کی خواہش تھی کہ ان کے آبائی وطن کرناٹک کی لڑکی ان کی بہو بن کر آئے اور اسی غرض سے وہ وہاں آئے تھے کہ کندنا کو خود ہی دیکھ پرکھ لیں، اور کندنا انھیں پہلی ہی نظر میں بھا گئی تھی۔ انھیں اس چھوٹے سے گاؤں سے بھی ایک لگاؤ سا ہو گیا تھا۔۔ شیوا کے مندر کے اندر ستونوں پر کندہ شبیہوں پر انگلیاں پھیرتے۔ مندر کے سامنے بنے پکے تالاب میں کھلے ان گنت کنول کے پھولوں کو گنتے رہتے۔۔۔ وہ خود کو اس ماحول کا ایک حصہ سمجھنے لگے تھے۔ سرِ شام مویشیوں کے گھر لوٹتے وقت اڑتی ہوئی دھول، کھیتوں میں سرِ شام سے بولتے ہوئے جھینگر اور گنّے کے کھیتوں میں سرسراتی ہوائیں یہ سب کچھ بمبئی کی مشینی زندگی سے اتنا مختلف، اتنا سکون آگیں لگا کہ وہ خود بھی اس بہاؤ کے بارے میں سنجیدگی

سے غور کرنے لگے کہ بمبئی کا کاروبار حسب معمول اپنے بڑے بھائی ندیش بابو کے ہاتھوں میں چھوڑ کر خود گاؤں کے ہو رہیں ۔۔۔ پہلے تو انھوں نے بڑی سختی سے اس گھر داماد کی مخالفت کی ۔ لیکن حالات کا لحاظ کرتے ہوئے کبھی نہ کبھی انھیں گاؤں کی ذمہ داری سنبھالنی ہی تھی کیونکہ کندنا ہلیا کی اکلوتی لڑکی تھی اور اب گاؤں پہونچ کر ۔۔۔ کندنا کو دیکھ کر ان کا خیال بدل رہا تھا۔

"منگل، سوشیل بابو کھیتوں میں اکیلے مارے مارے پھرتے ہیں ۔۔۔ اب تم آگئے ہو تو ان کا خیال رکھنا۔" ہلیا نے کہا۔ اور پھر انھوں نے منگل کو ان کے آنے کی وجہ بتائی ۔۔۔ وہ نہ بھی بتاتے تو منگل سمجھ چکا تھا۔ اس نے سوشیل بابو کی آنکھوں میں علانیہ وہ چمک دیکھی تھی جس کا وہ خود اپنے دل کی کال کوٹھری میں گلا گھونٹ رہا تھا ۔۔۔ سب کچھ سمجھتے ہوئے بھی انھیں ایسا لگا جیسے ان کی بوجھل بیل گاڑی کا ایک پہیہ اچانک نکل آیا ہو ۔۔۔

سوشیل بابو بہت سوشل انسان تھے ۔ لائق ہونے کے باوجود ان میں عام پڑھے لکھوں کا غرور بالکل نہیں تھا ۔۔۔ وہ منگل سے بالکل گھل مل گئے گو بھین میں پتھر رکھ کر گھمانے کا آرٹ منگل نے ہی انھیں سکھایا تھا ۔۔۔ وہ منگل سے پوچھ گچھ کرتے رہتے کہ امتحان پاس کرنے کے بعد وہ کیا کرنے والا ہے ۔۔۔ اسے معلوم تھا کہ اگر وہ کامیاب بھی ہو جاتا ہے تو ان ہزاروں سند یافتہ نوجوانوں میں سے ایک ہوگا۔ جو ہر سال سند کی ہتھکڑی ہاتھ میں لگائے بیروزگاری کے اندھیرے میں ڈھکیل دئیے جاتے ہیں ۔۔۔ قیدیوں کی کوئی راہ نہیں ہوتی۔ کوئی منزل نہیں ہوتی ۔

"جب ہماری شادی ہو جائے تو تم بھی بمبئی آیا کرنا ۔۔۔" سوشیل بابو بولے ۔۔۔

"ضرور آؤں گا" ۔۔۔ منگل نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ سوشیل بابو نے گاڑی میں جتے بیل کی پیٹھ پر کوڑا جتایا ۔۔۔ منگل کو ایک جھرجھری سی آئی، جیسے وہ کوڑا اسی کی پیٹھ پر پڑا ہو۔

"تم شادی نہیں کرو گے منگل؟" ۔۔۔ سوشیل بابو نے ڈوبتے سورج کے شعلوں کو دیکھ کر کہا ۔

منگل ہنسا "مجھ سے کون شادی کرے گا ۔؟"

"ہم تمھاری شادی بمبئی میں کروائیں گے"۔

وہ سوشیل بابو سے پوچھ نہیں پایا کہ انھوں نے خود اپنے لیے کوئی لڑکی بمبئی میں کیوں نہیں ڈھونڈی!"

کندنا اب اس سے کترانے لگی تھی ۔۔۔ ایک روز وہ اسے کوئیں کی منڈیر پر مل گئی۔ شکوے گلے تو اس صورت میں ہوتے ہیں جب کچھ عہد و پیمان ہوئے ہوں ۔۔۔ ان دونوں کی محبت تو آنکھوں کی چوکھٹ پر ہی رک گئی تھی ۔

"سوشیل بابو بہت اچھے آدمی ہیں" ۔۔۔ منگل نے ایک تپلے لمبے بانس کو درانتی سے باندھتے ہوئے کہا۔

کندنا چپ رہی ۔

"وہ تمھیں بہت پیار کرتے ہیں"۔

کندنا اٹھ کھڑی ہوئی ۔

"وہ تمھیں بہت خوش رکھیں گے"۔

کندنا چلی گئی ۔

اس کی آنکھوں میں برسات کی بدلیاں تھیں جو نہ کھلتی تھیں نہ برستی تھیں ۔ وہ جانتی تھی کہ یہ منگل نہیں اس کا جذبۂ احسان مندی بول رہا ہے ۔۔۔ جس دیوار نے اسے سہارا دیا تھا ۔۔۔ وہ اسی پر اپنا قلعہ کیسے بنا سکتا تھا۔ اسے اچانک منگل پر غصہ بھی آیا ۔ کیوں نہیں مردانگی سے وہ اس کا ہاتھ تھام کر اس کے باپ سے کہدیتا کہ تم نے بیشک مجھے سہارا دیا ہے ۔ اب ایک مرد کی طرح میں تمھاری لڑکی کا سہارا بننا چاہتا ہوں ۔ اس نے منگل کی جھجک کو کم ہمتی پر محمول کیا ۔۔۔ کم از کم وہ اس سے ہی کہدیتا کہ، کندنا جو کچھ میری آنکھیں تم سے کہتی ہیں جھوٹ نہیں کہتیں ۔۔۔ مجھے واقعی تم سے پیار ہو گیا ہے ۔۔۔ میں تمھیں اپنانا چاہتا ہوں لیکن کسی کے احسان کا بوجھ سب سے پہلے چٹان بن کر زبان پر ہی بیٹھتا ہے اس کے علاوہ منگل خودغرض بھی نہیں تھا۔ اس

نے اپنا اور سوشیل بابو کا مقابلہ کیا۔ کئی زاویوں سے جو دکو تصور میں ان کے مقابل کھڑا کیا اور آخر کار اپنے آپ اس کی ہنسی چھوٹ گئی ــ پتہ نہیں کندنا نے اس میں کیا دیکھا تھا، اس نے سوچا۔ لیکن سوچتے سوچتے اس کے ہونٹوں کی ہنسی غائب ہوگئی۔ جوہڑ کے گندلے پانی میں تکتے تکتے اس نے دیکھا کہ کندنا سجی سجائی دلہن بنی سوشیل بابو کے پیچھے سر جھکائے مقدس آگ کے پھیرے لے رہی ہے۔ وہ ہون کے اُن اٹھتے شعلوں کو دیکھتا رہا ــ اچانک ان شعلوں نے لپک کر اس کے دامن کو چھو لیا اور ساتھ ہی کندنا کی شعلہ بار آنکھیں اس کی طرف اٹھیں اور کہا، ڈرپوک ــ منگل چونک کر پیچھے ہٹا۔

اس نے خاموشی سے اٹھ کر کھونٹی سے اپنا اجلا کرتا اتارا اور تیار ہو کر باہر نکلا ــ

مانسون آنے والے تھے۔ کھیتوں میں کھاد بکھیری جا رہی تھی ــ ہلیا آدم کے گھنے پیڑ کے نیچے بیٹھے اسے مل گئے ــ شاید ٹریکٹر میں کوئی خرابی آگئی تھی۔ اس کی دیکھ بھال وہ ہی کرلیا کرتے تھے۔ اس وقت بھی کوئی پرزہ ان کے ہاتھ میں تھا جسے وہ درست کر رہے تھے۔

منگل گہری سوچ میں ڈوبا ان کے سامنے جا کر کھڑا ہوگیا۔ ہلیا نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا ــ اس کی نظریں اسی طرح جھکی رہیں۔

"کیوں کیا بات ہے منگل؟" ہلیا نے نرمی سے پوچھا ــ وہ بہت کم اونچا بولتے تھے۔

"کندنا سے میں بیاہ کرنا چاہتا ہوں۔" اس نے نظریں اٹھا کر ہلیا سے کہا۔ ہلیا کچھ دیر تک ان آنکھوں میں دیکھتے رہے جن میں خود اعتمادی تھی، عزم تھا، سچائی تھی ــ انھوں نے ہاتھ سے ٹریکٹر کا پرزہ رکھ دیا۔

"بیٹھ جاؤ ــ" انھوں نے منگل کے کندھے پہ ہاتھ رکھ دیا۔

"جانتے ہو منگل، تم کیا بات کہہ رہے ہو؟"

منگل نے صرف سر ہلا دیا۔

"یہ بات تم نے اب تک مجھ سے کیوں نہیں کہی؟

"مجھ میں ہمت نہیں تھی ــ اب کہہ رہا ہوں۔"

"اب تو دیر ہو چکی ہے ــ میں نے سوشیل بابو کو ہاں کر دی ہے" ــ وہ پلٹ گئے۔

انھوں نے ٹوٹے ہوئے پرزے سے پھر کھیلنا شروع کر دیا۔ "کندنا کو اس بات کا پتہ نہیں چلنا چاہیے۔" انھوں نے کہا۔

منگل کچھ دیر کھڑا ان کی پشت دیکھتا رہا اور پھر سر جھکائے چلا آیا ــ

رات کو اس کی کٹیا میں دیا نہیں جلا ــ ہوا سے دروازہ پھڑ پھڑاتا رہا۔ اور وہ یوں ہی دیوار سے ٹیک لگائے ساری رات بیٹھا رہا۔ وہ بچپن سے دل کی نازک آرزوؤں کو مجبوری کے وزنی پتھروں تلے دباتا آیا تھا۔ آج اسے لگا جیسے اس کے احساس پر ایک سنگلاخ چٹان آ گری ہو ــ اب اس کی زندگی میں کوئی انقلاب نہیں آئے گا۔ جیسے اس کی زندگی اب ہمیشہ کے لیے ایک دلدل بن گئی ہو۔ جس میں آرزو کا سفینہ کبھی نہیں ڈولے گا۔

صبح جیسے اس کے دروازے پہ آکر ٹھٹک گئی تھی ــ وہ سوچنے لگا کہ کندنا کے دل پر بھی کیا یہی کچھ گزر رہی ہوگی۔ لیکن جواب میں صرف ہوا کی سسکیاں سنائی دیں

رات بھر جاگنے کی وجہ سے اس کا سر بوجھل ہو رہا تھا۔ آنکھیں جل رہی تھیں۔ لیکن کام پر تو جانا ہی تھا ــ وہ کام کیسے چھوڑ سکتا تھا ــ اس نے رسی اور درانتی اٹھائی اور کھویا ہوا سا کیاری نکالنے کے لیے چلا گیا۔

اسی روز کندنا اور سوشیل بابو ٹہلتے ہوئے کچھ دور نکل آئے تھے ــ اب یہ جانی مانی بات تھی کہ اگلے مہینے ان دونوں کا بیاہ ہو جائے گا ــ اور ہلیا کی روشن خیالی نے اس میں کوئی قباحت نہیں دیکھی تھی کہ کبھی کبھار انھیں اکٹھا چھوڑ دیا جائے۔ سوشیل بابو اسے اپنے دل کے اندر اور دل کے باہر کی دنیا کی بہت سی باتیں بتا رہے تھے۔ اور وہ سر جھکائے سنتی رہی۔

"بس اب اور آگے نہیں جائیں گے ــ" وہ اچانک رکتی ہوئی بولی۔

"کیوں چلا ہو — مجھے دیکھنا ہے سپاری کس طرح اتاری جاتی ہے۔"

"نہیں — میں نہیں جاؤں گی۔" وہ جانتی تھی وہاں پانی کے نیچے کے پاس منگل ہی سپاری اتار رہا تھا۔

"ٹھیک ہے — اگر تم نہ چلنا چاہو۔" سوشیل بابو اس کے اچانک انکار پر حیران ہوتے ہوئے بولے۔ لیکن اسی وقت ہلیا سامنے سے چلے آئے اور دونوں کو دیکھ کر کہا:

"آؤ — آؤ — چلے آؤ — میں تمھارے ہی انتظار میں تھا۔" اور کندنا آگے بڑھتے ہوئے قدموں کو نہ روک سکی۔ سوشیل بابو کو افسوس ہوا کہ ناحق انھوں نے زور لگایا۔ کندنا کے نا کہنے پر وہ اسی طرح لوٹ جاتے تو ہلیا انھیں دیکھ بھی نہیں پاتے۔

پپیتے کی پنگی سے کچھ ناریل کا پانی پیتے ہوئے انھوں نے دیکھا کہ منگل سپاری توڑ توڑ کر نیچے پھینکتا جا رہا ہے — وہ ان کی موجودگی سے بے خبر اپنے کام میں گم تھا۔ کندنا کی نظریں زمین پر گڑی ہوئی تھیں اور اس کے دل کی دھڑکن اس کے جسم کو کپکپانے لگی تھی۔ ہلیا کچھ کاشتکاروں کو ساتھ لیے جا چکے تھے۔ سوشیل بابو کے لیے یہ نظارہ بڑا حیران کن تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے منگل کا پیڑ لچکنے لگا — پاؤں اور بدن کی جنبش سے وہ اسے جھکاتا رہا۔ جھونکے رفتہ رفتہ بڑھنے لگے۔ اچانک اس نے ایک بڑی جست لگائی اور دوسرے پیڑ پر جا رہا۔ کندنا کے ہاتھ سے ناریل گر پڑا — اس کی گھبراہٹ سوشیل بابو سے بھی چھپی نہ رہی لیکن وہ اس کا باعث سمجھ نہ پائے۔

منگل کا دوسرا پیڑ لچکنے لگا تھا۔ انھوں نے سوچا کہ وہ منگل کی مہارت کی داد دے کر کندنا کے ساتھ واپس ہو جائیں۔ انھوں نے زور دار تالیاں بجائیں۔

"واہ واہ منگل — یار تم نے کمال کر دیا۔" منگل نے جھولتے جھولتے پیڑ سے نیچے دیکھا — کندنا کی پھٹی پھٹی ان حیران آنکھوں کو دیکھا جو اسے دیکھ رہی تھیں — اس تناؤ کو محسوس کیا جو کندنا کی رگ رگ میں سما گیا تھا — پیڑ کی لچک بڑھتی رہی۔ لیکن اسے ایسا لگا کہ جیسے ہر طرف گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا گیا۔ اس نے اپنے حواس جمع کرنے کی کوشش کی اور ایک سانس بھر کر دوسرے پیڑ کی طرف جست لگا دی لیکن اس کا پیڑ لچک کر پیچھے جا چکا تھا۔ ایک دھڑ کی آواز کے ساتھ وہ نیچے کیچڑ اور پانی سے بھرے گڑھے میں آ رہا۔

کندنا کے منھ سے ایک چیخ نکلی اور وہ بے تحاشہ دوڑ کر اس کے ساکت جسم سے لپٹ گئی — سوشیل بابو اسے آواز لگاتے رہے۔ "کندنا — کندنا" لیکن اسے کچھ سنائی نہیں دیا۔ اس کے کپڑے کیچڑ سے لت پت ہو رہے تھے۔ سوشیل بابو نے اسے الگ کیا اور منگل کی نبض دیکھنے لگے — کندنا کی چیخ سن کر آس پاس کام کرنے والے دوڑے آئے — اور بیہوش منگل کو ہوش میں لانے کی ترکیبیں کر رہے تھے۔ سوشیل بابو نے سختی سے کندنا کا ہاتھ پکڑا اور گھر لے چلے۔

دوسرے روز وہ کندنا کے پتا سے دیر تک بات چیت کرتے رہے۔

"میرے خیال میں بیاہ جلد ہو جائے تو بہتر ہوگا۔" — سوشیل بابو نے کہا۔

ہلیا نے صرف سر ہلا دیا۔

لیکن گاؤں والوں میں کسی کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ سوشیل بابو اچانک کیوں واپس ہو گئے — وہ اتنے اداس کیوں تھے۔ اور منگل کے لیے شہر سے بڑا ڈاکٹر بلا کر ہلیا کیوں اسے اپنے گھر اٹھا لے گئے۔

★

داؤد قمر

بنام اندرا گاندھی

ارضِ وطن پہ چھائی ہوئی تھی سیاہ رات
شمعیں جلا گئی ہے مگر ایک تیری ذات

جمہوریت کی لاج بچانے اٹھی ہے تو
دراصل تیرے ہاتھ ہیں ہندوستاں کے ہاتھ

اب روشنی کی سمت رواں ہے قافلہ
اب مل گئی ہے قوم کو ظلمات سے نجات

اب سانس لے رہی ہے ہر اک سمت زندگی
ملنے لگی عوام کو اب لذّتِ حیات

شام و سحر تو اب بھی وہی ہیں جو تھے مگر
محسوس ہو رہا ہے کہ بدلی ہے کائنات

یا اپنے اپنے فکر میں کھوئے ہوئے تھے لوگ
یا ہو رہی ہے عظمتِ ہندوستاں کی بات

ہر دل عزیز راہنمائے وطن ہے تو
سارا وطن ہے تیری طرف اور تیرے ساتھ

سانپوں کو سر اٹھانے سے پہلے کچل دیا
بروئے کار آنہ سکے تلخ سانحات

تیری وجہ سے ملک تباہی سے بچ گیا
تو نے کیا ہے قوم کو محفوظِ حادثات

سوگند کھائے گا تری عظمت کی حشر تک
چشمِ فلک نے دیکھے ہیں کچھ ایسے واقعات

پہلی جگہ ملے گی یقین و خلوص کو
لکھے گا جب مورّخ فرداً ترے صفات

کچھ اور بھی بلند کرے جرأتیں تری
اللہ اور تیرے عزائم کو دے ثبات

اے مادرِ وطن کی نگہدار اندرا!
سجتی ہے تیرے منھ پہ اگر تو کہے یہ بات

• ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما؟

عبدالمنان

اندرا گاندھی

اندرا اے ساورنے ہندستاں کی فرمانروا. مخزنِ عقل و خرد اے قابلِ مدح و ثنا
اے بہارِ باغِ نہرو بانیٔ امن و اماں سارا عالم مانتا ہے تم کو یکتائے جہاں
یوتی موتی لال کی دخترِ جواہر لال کی تم نے ہر اہلِ وطن کی زندگی خوشحال کی
آفریں صد آفریں اے اندرا صد آفریں عقل اور دانش سے تم نے مشکلیں آساں کیں
تم نے ہر دشتِ وطن کو رشکِ گلشن کر دیا اور ہر اک گوشۂ تاریک روشن کر دیا
گلستانِ ہند کو تم نے شگفتہ کر دیا جو بنے تھے خار اُن کو دست بستہ کر دیا
کامرانی ساتھ ہے جس امر کی کی ابتدا کی ہے خالق نے تمھیں کچھ عقل ہی ایسی عطا
ہستی پر آگئے وہ جو کہ تھے بانی شر اس ایمرجنسی کو بس رکھتے ہوئے مدِّ نظر
کتنی بہتر یہ نکاتی بیس کی اسکیم ہے قابلِ تحسین ہے اور لائقِ تسلیم ہے
بس یہی ہر دم تمھارے دل میں ہے اک لگن بھارتی ہوں شاد، ماں اور دور ہوں رنج و محن
خوش نُما نقشہ نس بندی کی یہ اسکیم ہے کنبہ بندی کی پلاننگ یہ نئی تنظیم ہے
صرف دو بچوں سے ہی خوشحال ہوتا ہے گھر ہے بہتر گیدڑوں سے ایک بہتر شیر نر
کثرتِ اولاد ہی برباد کر دیتی ہے گھر غم کا ہوتا ہے بسیرا ہر در و دیوار پر

تم ہزاروں سال اس کرسی پہ بیٹھو اندرا
دے رہا منان ہے تم کو صدقِ دل سے دعا.

ڈاکٹر حنیف نقوی

منشی احمد حسین سحر

احمد حسین سحر اور ان کے تذکرے بہارِ بے خزاں سے عام اہلِ علم غالباً سب سے پہلے ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی کی تصنیف میر تقی میر ـ حیات اور شاعری کے ذریعے متعارف ہوئے جس میں اس تذکرے کے حوالے سے میر کے اپنی ایک "پری تمثال عزیزہ" کے ساتھ معاشقے کا انکشاف کیا گیا ہے۔

بہارِ بے خزاں کا سالِ تالیف ۱۲۶۱ھ/۱۸۴۵ء ہے۔ اس کے دو قلمی نسخے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے کتب خانے اور مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ذخیرۂ مخطوطات میں محفوظ ہیں۔ ۱۹۶۸ء اور ۱۹۶۹ء میں انہی مخطوطات کی بنیاد پر اس کے دو ایڈیشن دہلی کے دو مختلف علمی اداروں کی طرف سے طبع ہو کر منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ پہلا ایڈیشن ڈاکٹر نعیم احمد کے مقدمے کے ساتھ علمی مجلس سے اور دوسرا ایڈیشن حنیف عباسی صاحب کی تصحیح اور تعلیقات کے ساتھ مجلس اشاعت ادب سے شائع ہوا ہے۔ ان دونوں ہی ایڈیشنوں کے مرتبین نے سحر کے زمانۂ حیات اور سوانحِ زندگی کے بارے میں مطلق لاعلمی کا اعتراف کرتے ہوئے اپنے مقدمات کو صرف تذکرے کے مالہٗ و ما علیہ تک محدود رکھا ہے۔ ڈاکٹر نعیم احمد لکھتے ہیں:

" بہارِ بے خزاں کا مصنف احمد حسین سحر لکھنوی ہے۔ اس کے حالات کا پتہ نہیں چل سکا۔ تذکرے کے اختتام پر تاریخِ تصنیف مندرج ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تذکرہ ۱۲۶۱ھ (۱۸۴۵ء) میں مکمل ہوا۔" (مقدمہ ص ۱)

حنیف عباسی صاحب کا بیان ہے کہ:

" احمد حسین سحر ابتدا میں آشفتہ تخلص کرتے تھے کچھ دن بعد انھوں نے غلام مینا ساحر سے اصلاح لینی شروع کی چونکہ استاد کا تخلص ساحر تھا، اسی کی مناسبت سے اپنا تخلص آشفتہ سے بدل کر سحر کر دیا۔"

" کافی تلاش و جستجو کے بعد بھی سحر کے حالاتِ زندگی کے متعلق معلومات فراہم نہ ہو سکیں۔ انھوں نے خود اپنے حالاتِ زندگی کے متعلق کچھ تحریر نہیں کیا ہے۔ انتہا یہ ہے کہ اپنے والد کا نام بھی نہیں لکھا۔" (مقدمہ ص ۱)

ڈاکٹر فرمان فتحپوری نے نگار پاکستان کے تذکروں کا تذکرہ نمبر کے بعد اپنی تازہ تصنیف اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری میں بیشتر معلوم الاسم تذکروں اور ان کے مولفین کے بارے میں حتی المقدور تمام ضروری معلومات فراہم کرنے کی کوشش کی ہے لیکن سحر کے حالات انھیں بھی معلوم نہیں ہو سکے چنانچہ انھوں نے بھی نام اور تخلص کے بعد صرف اس قدر لکھ کر کہ "پہلے آشفتہ تخلص کرتے تھے۔ غلام مینا ساحر سے تلمذ کے بعد سحر کو اپنا لیا تھا"[۱] بہارِ بے خزاں سے سحر کے ترجمے کی پوری عبارت نقل کر دی ہے۔

۱؎ اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری شائع کردہ مجلس ترقی ادب لاہور۔ ص ۳۴۶

سحرؔ نے اس تذکرے میں اپنے بارے میں جو کچھ لکھا ہے، اس کی تلخیص یہ ہے:

"کاتب الحروف احمد حسین از ابتدائے سنِ تمیز تا الیوم بہ تلاش کلام موزوں عمرے بسر کردہ و با اکثر شعرائے زمانش سرگرم اتحاد پرستی ہا بودہ ...... چوں اتفاق موزوں کردنِ اشعار شاذ و نادر افتادہ ...... مناسب نمی دانست کہ شعرے از موزوں کردۂ خود داخل تذکرہ کند لیکن بعض یارانِ طریقت کہ از فکر تا قص ایں تنگ خلائق آگاہی داشتند نگزاشتند کہ ازیں معرکہ دست کشیدہ پا بیروں گزارد ..

...... ازیں پیش آشفتہ تخلص می کرد، اکنوں بہ نظر ایں کہ خوشہ چینِ خرمنِ استفادۂ استادی غلام ضیا ساحرؔ ہستم سحرؔ تخلص پسندیدہ ام۔"

بہارِ بے خزاں سے قبل سحرؔ "طور معنی" کے نام سے شعرائے فارسی کا ایک تذکرہ بھی ترتیب دے چکے تھے، اس تذکرے میں انھوں نے اپنا ترجمہ شامل نہیں کیا البتہ دیباچے میں اپنے بارے میں یہ معلومات فراہم کی ہے:

"چوں از سلیقۂ شعر گوئی زبانِ پارسی حرماں نصیب است، لہٰذا بزمرۂ ایں نکتہ پردازان خود را محسوب نہ کردہ است وگاہ گاہے کہ در زبانِ ریختہ بمقتضائے دردِ دل وگدازیِ طبع باصرار بعض اتحاد پرستانِ محبت سرشت شعرے کہ می گوید بحکم اسناد و کالمعدوم است۔"

اپنے استاد غلام ضیا ساحرؔ کے ترجمے میں اس معلومات پر یہ اضافہ کیا ہے:

"فقیر از مین عنایت دلنواز حرف آشنا گردیدہ سرِ افتخار از نسبت شاگردی او بفلک می ساید۔"

ان مجمل و مختصر بیانات سے نہ تو سحرؔ کی زندگی کے اہم گوشوں کی نقاب کشائی ہوتی ہے اور نہ ان کی شخصیت کا کوئی واضح نقش ابھرتا ہے البتہ یہ بات متیقن ہو جاتی ہے کہ وہ خود کو ایک شاعر کی حیثیت سے اپنے معاصرین سے متعارف کرانا مناسب نہیں سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے دور کے تمام تذکرے ان کے ذکر سے خالی ہیں۔

شعرائے اردو کے تذکروں سے متعلق اپنے تحقیقی کام کے دوران اور خاص طور پر بہارِ بے خزاں کی اشاعت کے بعد راقم السطور نے کئی بار سحرؔ کے حالاتِ زندگی کی تلاش و جستجو کی کوشش کی اور حتی الامکان وہ تمام کتابیں دیکھ ڈالیں جن سے اس سلسلے میں کچھ مدد ملنے کی توقع تھی لیکن کوئی کامیابی نہیں ہوئی ایک مدت کے بعد گزشتہ سال اپریل (۱۹۷۵ء) کے مہینے میں تاریخ گوئی سے متعلق بعض مسائل کے سلسلے میں منشی امیر احمد حسین تسلیمؔ سہسوانی کی تصنیف "ملخص تسلیم" کی ورق گردانی کے دوران بالکل غیر متوقع طور پر سحرؔ کے بارے میں ایک حوصلہ افزا انکشاف ہوا جس نے اس سمت میں تلاش و تحقیق کی نئی راہیں کھول دیں، اس انکشاف کا سرچشمہ اس کتاب کی مندرجہ ذیل عبارت تھی۔

از مولف تاریخ تذکرۂ احمد حسن کاکوری۔

شنیدم بتاریخ می گفت ہاتف
کہ گلدستۂ نو بہار نزاکت[1]

سحرؔ عام طور پر منشی احمد حسین سحرؔ لکھنوی کے نام سے معروف ہیں۔ اس کے برخلاف تسلیمؔ نے ان کا نام احمد حسن اور وطن کاکوری بتایا ہے۔ مزید براں تخلص کا حوالہ بھی نہیں دیا۔ ان ظاہری اختلافات کے باوجود راقم السطور کو یہ فیصلہ کرنے میں دیر نہیں ہوئی کہ یہ بلا شک و شبہ "بہارِ بے خزاں" کے مولف ہیں۔ کیونکہ اوّل تو اس مادۂ تاریخ سے ۱۲۶۱ھ ہی برآمد ہوتا ہے جو بہارِ بے خزاں کا سالِ تالیف ہے اور اس تذکرے کے علاوہ کسی ایسے تذکرے کا وجود نہیں جو ۱۲۶۱ھ میں لکھا گیا ہو اور اس کے مولف کا نام احمد حسن اور وطن کاکوری ہو۔ دوسرے یہ ایک ایسے شخص کی تحریر ہے جسے سحرؔ کے قریبی تعلقات کا علم

---

[1] ملخص تسلیم طبع مطبع مطلع العلوم مرادآباد (دسمبر ۱۸۹۶ء) ص ۸۰ [2] بہارِ بے خزاں طبع ثانی ص ۴۸

عنوان کی اس تحریر سے ہوتا ہے کہ "با راقم السطور اتحاد دلی دارد و بارہا ہم با مزاج و طبع او نسبتے خاص است[۱]" اس کے علاوہ اس بات سے بھی کہ تسلیم نے سحر کے دوسرے تذکروں کی تاریخیں بھی کہی ہیں، اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ یہ مادۂ تاریخ "بھارِ بے خزاں" سے متعلق ہے۔ مولف کے نام کے معاملے میں دوسرے ذرائع "مخفی تسلیم" کی تائید نہیں کرتے، اس لیے اسے سہو کاتب قرار دے کر نظر انداز کیا جا سکتا ہے لیکن لکھنؤ کی بجائے کاکوری سے وطنی نسبت کے بارے میں تسلیم کا بیان ہمارے معلومات میں ایک اہم اضافہ ہے جو سحر کے حالاتِ زندگی کی تلاش و تحقیق کے سلسلہ میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے

کاکوری کا شمار اودھ کے مردم خیز قصبوں میں ہوتا ہے۔ لکھنؤ سے اس کا فاصلہ تقریباً ۱۵ کلو میٹر ہے۔ حافظ محمد علی حیدر علوی سجادہ نشین خانقاہ کاظمیہ کاکوری نے اس قصبے کے نامور فرزندوں کے حالات "تذکرۂ مشاہیر کاکوری" کے نام سے ایک کتاب میں یکجا کر دیے ہیں جو ۱۹۲۷ء میں مطبع اصح المطابع، وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ سے چھپ کر شائع ہو چکی ہے۔ اس کتاب میں منشی احمد حسین سحر کا نام دو جگہ (صفحہ ۱۹۲ اور صفحہ ۳۱۰) "طور معنی" اور "بھار بے خزاں" کے مولف کی حیثیت سے ان تذکروں کے اقتباسات کے ساتھ اور ایک جگہ غلام مینا ساحر کاکوروی کے تلامذہ کے ذیل میں مذکور ہے۔ ساحر کے جن شاگردوں کے نام مصنف کے علم میں تھے وہ انھوں نے اس ترتیب کے ساتھ تحریر کیے ہیں:

(۱) نواب امیر حسن خان متخلص بہ بسمل کاکوروی (۲) منشی مومن علی خاں مفتوں کاکوروی، (۳) مولوی محی الدین خاں ذوق کاکوروی (۴) مرزا حیدر بیگ کاکوروی (۵) مولوی غلام امام شہید امیٹھوی (۶) منشی احمد حسین سحر

اس فہرست میں دوسرے پانچ ناموں کے برخلاف سحر کے نام کے ساتھ وطنی نسبت کا عدم التزام یہ ظاہر کرتا ہے کہ عام لوگوں کی طرح علوی صاحب کو بھی کاکوری سے ان کے وطنی تعلق کا علم نہ تھا۔ اس لاعلمی کی بنیادی وجہ سحر کی شاعرانہ حیثیت ہے جو اہل کاکوری کے لیے قطعاً غیر متعارف تھی، سحر خود بھی اپنی شاعری کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھتے تھے اور ان کی شعر گوئی کے رازسے چند "یارانِ طریقت" اور "اتحاد پرستانِ محبت سرشت" کے علاوہ کوئی واقف نہ تھا۔ اس کے علاوہ وہ اپنے تذکروں میں جو "تذکرۂ مشاہیر" کے مآخذ میں شامل ہیں اپنے وطن اور حسب و نسب کی طرف کوئی اشارہ کرنے کی بجائے آتش، ناسخ اور بعض دوسرے لکھنؤی شعرا سے معاصرانہ روابط اور ملاقاتوں کا ذکر کر کے لکھنؤ میں بود و باش کے قرائن کو تقویت بخشتے ہیں۔ اس لیے فاضل مصنف کا انھیں احمد حسین کاکوری سے مختلف شخصیت تصور کرنا کوئی حیرت کی بات نہیں۔ زیر نظر کتاب میں شیخ احمد حسین علوی، اور منشی احمد حسین حجاجی[۱] کے زیرعنوان اس نام کے دو اشخاص کا ذکر کیا گیا ہے۔ ہماری تحقیق کے مطابق آخر الذکر احمد حسین ہی مولف "بھار بے خزاں" ہیں جن کے حالات سے ان کے تذکرہ نگار عام طور پر ناواقف ہیں۔ فاضل مصنف نے ان کے ترجمے میں جو کچھ لکھا ہے وہ من و عن درج ذیل ہے:۔

"منشی احمد حسین ابن شیخ عبدالحبیب۔ یہ اصل باشندے قصبہ دیوہ

---

[۱] "حجاجی" پر علوی صاحب نے بطور حاشیہ تحریر فرمایا ہے: "حجاجی" کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ ان کے اجداد میں امیر حسام نے بغداد سے آ کر قصبہ دیوہ ضلع بارہ بنکی میں سکونت اختیار کی اور اپنے صاحبزادے ضیاء الدین کی شادی وہیں کی۔ بادشاہ وقت کے یہاں سے عہدۂ قضا عطا ہوا۔ قصبہ دیوہ میں جس محلے میں انھوں نے قیام کیا وہ بوجہ ان کے تازہ وارد ہونے کے حجازی محلہ مشہور رہا۔ کثرت استعمال سے حجاجی محلہ کہا جانے لگا۔ اور امیر حسام کی اولاد حجاجی کہی گئی اور یہ جو مشہور ہے کہ یہ لوگ حجاج بن یوسف ثقفی ظالم حاکم عراق کی اولاد سے ہیں اور اس وجہ سے حجاجی ہیں۔ یہ اب تک پایۂ تحقیق کو نہ پہونچا۔ قصبہ دیوے کے قدیم باشندے وہی بیان کرتے ہیں جو میں نے اوپر لکھا ہے اور یہی مجھے تحقیق ہوا۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال۔" مقالہ نگار کے نزدیک یہ نسبت حجاج ابن عباس کی طرف بھی راجع ہو سکتی ہے، جو امیر حسام سے نویں پشت میں اس خاندان کے ایک بزرگ تھے۔

ضلع بارہ بنکی کے تھے (ص ۲۴)؛ ان کے والد شیخ عبدالحبیب صاحب نے بوجہ تعلق ننہالی یہاں کاکوری میں سکونت اختیار کی۔ ان کے قیام کی وجہ سے ان کے تمام قریبی اعزا یہاں آکر سکونت پذیر ہوئے اور کاکوروی کہلانے لگے۔ اب بھی ان کا بڑا خاندان سکونت پذیر ہے۔ یہ قریشی النسل تھے۔ ان کا نسب نامہ حسب ذیل ہے:۔

شیخ عبدالحبیب ابن شیخ غلام محمد ابن شیخ لطف اللہ ابن شیخ غلام مجتبیٰ، ابن شیخ محمد غوث ابن قاضی عثمان، ابن قاضی عبدالنبی ابنِ قاضی محمود، ابن قاضی الہداد، ابن قاضی خضر، ابن قاضی محمد ابن قاضی ضیاء الدین، ابن امیر حسام، ابن عیسٰی، ابن یوسف ابن امیر احمد، ابن امیر طاہر، ابن امیر مصطفےٰ ابن امیر دانیال، ابن عبدالعزیز، ابن حجاج، ابن عباس، ابن اسحاق، ابن ابی عمر، ابن عامر، ابن زبیر، ابن رضوان، ابن عبید ابن ابی ابن کعب، ابن عبد مناف جدِ رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم۔

منشی صاحب علوم متعارفہ میں پوری دست گاہ رکھتے تھے اور بے مثل منشی فخر خاقانی و ظہوری، رشک ظہیری و فاریابی تھے۔ نثر نویسی میں بہت کمال حاصل تھا۔ اس قصبہ کے بہت سے لوگ فن انشا پردازی و نثر نویسی میں ان سے تلمذ رکھتے تھے۔ ان کے مکان پر بیشتر اوقات اسی مشغلے کی وجہ سے معقول مجمع رہا کرتا تھا۔ اپنے زمانے میں یہ استاد مانے جاتے تھے۔ حضرت والد احمد مولانا حافظ شاہ علی نور قلندر قدس سرہ، بھی انشا پردازی و نثر نویسی میں انھیں سے تلمذ رکھتے تھے اور اکثر بہ سبیل تذکرہ ان کی قابلیت و مہارت بیان فرمایا کرتے تھے۔ انھوں نے بتاریخ ۱۶ر ماہ صفر روز پنجشنبہ ۱۲۸۹ھ سفر آخرت اختیار کیا۔ مولوی محی الدین ذوق کاکوروی سے بہت رسم و اتحاد تھا جیسا کہ ان کی تاریخ سے ظاہر ہے۔ جو درج ذیل ہے:

فغاں کز رحلت احمد حسین آں دوستِ ما صادق
فلک بنہاد بندِ نو بجانِ غم اسیر ما
ہر روش لیکہ آمد شرحہ شرحہ سینہ ہچوں نے
از میان غم چوں نہ پیچید بر سر گردوں نفیر ما
شنیدہ چوں نیر در قعر حسرت ناتواں جانم
کہ ازپائے حیات افتاد یار دست گیر ما
سر آید زیں دو مصرع ذوق در سال وفات او
بہ ہجری و فصلی نامہ موزوں از مریر ما
چو بکشاد او لبشوق گلشنِ جاوید بال اینک
بجنت زمزمہ پردانہ آمد ہم صفیر ما (ص ۲۵)
(۱۲۸۹ھ ۱۲۷۹ فصلی)

غلام علیا ساحر کے شاگردوں کی فہرست کے حوالے سے یہ بات پہلے ہی ہمارے علم میں آچکی ہے کہ ذوق اور سحر دونوں ایک ہی استاد کے دامن فیض سے وابستہ تھے۔ اس قطعۂ تاریخ میں ذوق نے جن الفاظ میں مرنے والے کے ساتھ اپنے روابط کا ذکر اور اس کی دائمی جدائی پر رنج و ملال کا اظہار کیا ہے، اس سے یہ قیاس یقین کی حد تک قوی ہو جاتا ہے کہ یہ وہی احمد حسین ہیں جو ساحر کے شاگرد اور ذوق کے استاد بھائی تھے۔ علوی صاحب کے بقول انھیں نثر نویسی میں کمال حاصل تھا اور کاکوری کے بہت سے لوگ فن انشا پردازی و نثر نویسی میں ان سے تلمذ رکھتے تھے، لیکن اس کتاب میں نہ تو ان کی نثر کا کوئی نمونہ پیش کیا گیا ہے اور نہ کسی تصنیف کی نشان دہی کی گئی ہے۔ ہمارے نزدیک سحر کے تذکرہ "تذکرۂ مشاہیر کاکوروی" کی اس کمی کو پورا کرتے ہیں۔ سحر کی طرح ان کے استاد بھی ایک باکمال انشا پرداز تھے۔ چنانچہ سحر نے "طور معنی" میں شاعری کے ساتھ نثر نگاری کی بھی تعریف کی ہے۔ اس کے معاً بعد جس انداز سے اپنے تلمذ کا ذکر کیا ہے، اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ انھوں نے ساحر سے بہ گمانِ غالب فارسی ادبیات کی تحصیل اور نثر نویسی کے فن میں استفادہ کیا تھا۔ اس ضمن میں تذکرے کی اصل عبارت یہ ہے:

"در نثر ظہوری وقت خویش بود۔ فقیر ازیں عنایت و تلمذ او حرف آشنا گردیدہ"۔

ؔ تقویم ہجری و عیسوی کے بموجب ۱۶ر صفر ۱۲۸۹ھ ۲۵ر اپریل ۱۸۷۲ء کے مطابق ہے۔

ساحر کی تاریخ وفات ۲۰ ذی قعدہ ۱۲۵۰ھ (۲۳ مارچ ۱۸۳۵ء) ہے۔ "بہارِ بے خزاں" اس کے تقریباً اکیس برس بعد ۱۲۷۱ھ/۱۸۵۴ء میں مرتب ہوا ہے۔ گزشتہ سطور میں اس تذکرے سے سحر کے ترجمے کے جو اقتباسات نقل کیے گئے ہیں، ان میں انہوں نے استاد کے تخلص کی مناسبت سے اپنا تخلص بدلنے کا ذکر "اکنون" کے التزام کے ساتھ کیا ہے جو اس بات کی علامت ہے کہ تذکرے کی ترتیب کے وقت اس تبدیلی کو زیادہ مدت نہیں گزری تھی۔ گویا یہ تبدیلی کسی وقتی جذبے کے تحت محض اظہارِ عقیدت و ارادت کے لیے کی گئی تھی، اس لیے نہیں کہ وہ ساحر سے فن شعر گوئی میں فیضیاب ہوئے تھے۔ "ملخص تسلیم" کے اقتباسات اور ذوق کے قطعۂ تاریخ میں ان کے نام کے ساتھ تخلص کی عدم موجودگی بھی اس طرف اشارہ کرتی ہے کہ ان کے مصنفین بھی اس فن سے سحر کے برائے نام شغف کی بنا پر اس التزام کو غیر ضروری تصور کرتے تھے۔

دار العلوم ندوۃ العلماء کے کتب خانہ میں سحر کے تذکروں کے جو خطی نسخے محفوظ ہیں، وہ ایک ہی جلد میں مجلد ہیں۔ اس جلد کے شروع اور آخر کے فاضل اوراق کی بعض تحریریں بھی کاکوری اور اہل کاکوری سے اس تذکرے کی تعلق کی نشاندہی کرتی ہیں۔ مثلاً آخری ورق کے صفحہ دوم کی ایک تحریر یہ ہے:

"رقعۂ امیر حسن خاں بسمل اسمی مومن علی خاں مفتوں کہ در کاکوری آمدہ ملاقات نہ کردہ بودند۔

آمدید و نہ آمدید امروز باید آمد ورنہ فردا

دست من و دامانِ تو اے رخنہ گرِ دل"

بسمل اور مفتوں دونوں کاکوری کے متوطن، ساحر کے شاگرد اور سحر کے استاد بھائی تھے۔

اسی آخری ورق کے اندرونی صفحے پر مختلف شعرا کے متفرق اردو و فارسی اشعار ان کے ناموں کے ساتھ منقول ہیں۔ ان شاعروں میں "سید عبدالباقی بہادر تخلص عبدالحی کاکوروی" بھی شامل ہیں جو "تذکرۂ

مشاہیر کاکوری" کے مطابق حافظ عبدالصمد شہید متخلص بہ یوسفی کاکوروی کے فرزند اور گلبرگہ (دکن) کے صوبہ دار تھے۔ ماہ صفر ۱۳۱۷ھ (جون ۱۸۹۹ء) میں گلبرگہ ہی میں ان کی وفات ہوئی[1]

شروع کے صفحات میں جن شاعروں کے اشعار نقل کیے گئے ہیں ان میں ایک نام مولوی حامد حسن منصف کاس گنج کا بھی ملتا ہے یہ بھی کاکوری کے متوطن اور شیخ عبدالواحد (۲ فروری ۱۸۳۵ء تا ۱۴ اکتوبر ۱۹۰۴ء) کے صاحبزادے تھے[2]

ابتدائی صفحات ہی میں ایک جگہ احمد حسینؔ کے نام کے ساتھ یہ دو شعر منقول ہیں جو بالیقین سحر ہی کے نتائج فکر ہیں ؎

نہیں پروا کسی کا جی نکلے   تم تو کچھ خوب آدمی نکلے

باغ میں آئے وہ گلے لگ جائے   کچھ تو اس دل کی بے کلی نکلے

لکھنؤ سے سحر کے تعلق کی نوعیت واضح نہیں لیکن بعض شعرا کے متعلق ان کے بیانات اس وابستگی کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ ناسخ کا کلام انہوں نے خود انہی کی زبان سے سنا تھا جو اس امر کی دلیل ہے کہ وہ ۱۲۵۴ھ/۱۸۳۸ء میں ناسخ کی وفات سے قبل لکھنؤ میں موجود تھے لیکن "بہارِ بے خزاں" کی تالیف کے وقت وہاں ان کی موجودگی حتمی طور پر ثابت نہیں۔ اگر آتش کے بارے میں ان کا یہ بیان کہ "بر فقیر نظر لطف و عنایت دارد" مبہم طور پر اس کے امکان کی جانب اشارہ کرتا ہے تو مہدی علی خاں ذکی مراد آبادی کے متعلق یہ جملے کہ "در شہر لکھنؤ بفقیر ملاقی شد...... شعر بسے لکھنؤ را استاد مسلم می دانستند"۔ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ان کی تحریر کے وقت سحر کسی دوسری جگہ قیام پذیر تھے۔ عبدالخالق خالق (مرد سیاحت پیشہ جہاں دیدہ) اور مہر شاگرد ناسخ (مجہول الاسم اصلاً میرزا حاتم علی) سے ان کی ملاقاتیں آگرے میں ہوئی تھیں۔ خالق کے متعلق لکھتے ہیں کہ "در اکبرآباد بفقیر ملاقی گردید۔ از اتفاقِ ملاقات یکدیگر بسیار خوش گزشت"۔ مہر کے بارے میں رقمطراز ہیں کہ "از فقیر بہ اکبرآباد ملاقی شد۔ از خواندان اشعار تازۂ خویش برنگ آئینہ سراپا حیرت ساخت"

---

[1] تذکرۂ مشاہیر کاکوری ص ۱۴۴۔ [2] تذکرۂ مشاہیر کاکوری۔ ص ۲۳۶۔ [3] ایضاً ص۔



ودھان بھون لکھنؤ میں گاندھی جینتی کے موقع پر گاندھی جی کی تصویر پر پھول مالائیں چڑھائی گئیں۔ تصویر میں گورنر اتر پردیش اور وزیر اعلا بھی دکھائی دے رہے ہیں

گورنر اتر پردیش ڈاکٹر ایم۔ چنا ریڈی ۲۲ ستمبر ۱۹۷۶ء کو بھیلا دویالیہ لکھنؤ میں للت کلا کے نصاب کا افتتاح کرتے ہوئے اس موقع پر پیش کیے گئے رقص کا ایک منظر





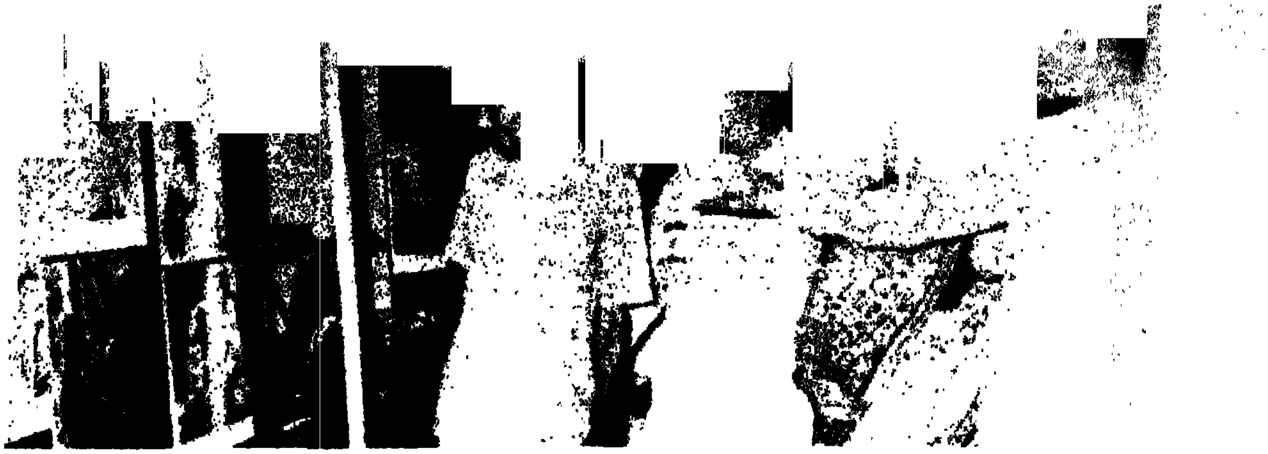
وزیر اعلا شری نرائن دت تیواری نے ۲۶ ستمبر ۱۹۷۶ء کو سہارن پور میں امر شہید سردار بھگت سنگھ کے مجسمہ پر پھول مالائیں چڑھائیں۔ یہ تصویر اسی موقع کی ہے



وزیر اعلا شری نرائن دت تیواری ۲۶ ستمبر ۱۹۷۶ء کو ۲۰ نکاتی معاشی پروگرام کے تحت سہارن پور کی پیپر مل کے
۱۰۴۶ مزدوروں کی مفت جنتا سانحہ بیمہ پالیسی قبول کر رہے ہیں

وزیر اعلا شری نرائن دت تیواری ۱۵ ستمبر ۱۹۷۶ء کو اموسی ٹیکسٹائل مل کے احاطہ میں پودا لگاتے ہوئے

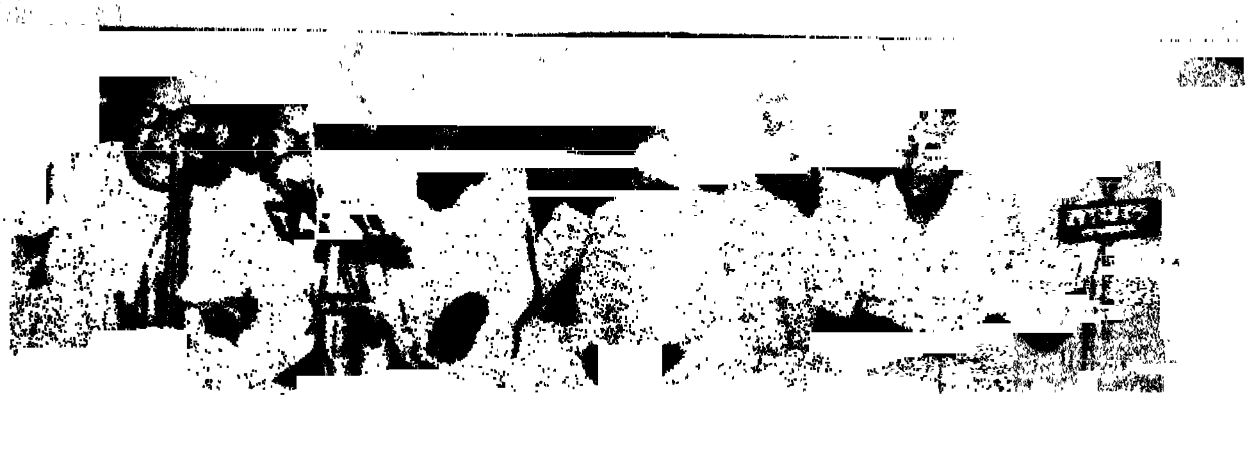




وزیراعلیٰ شری نرائن دت تیواری ۱۶ ستمبر ۱۹۷۶ء کو قیصر باغ بارہ دری لکھنؤ میں خاندانی منصوبہ بندی نمائش کا افتتاح کرنے کے بعد نمائش کا معائنہ کر رہے ہیں



خاندانی منصوبہ بندی مہم کے سلسلہ میں قیصر باغ بارہ دری میں ۲۹ ستمبر ۱۹۷۶ء کو کوی سمیلن اور ۳۰ ستمبر ۱۹۷۶ء کو مشاعرے کا اہتمام کیا گیا۔ یہ تصویریں اسی موقع کی ہیں
(اوپر) ہندی کے ممتاز شاعر شری سوہن لال دویدی اور (نیچے) اردو کے مشہور شاعر جناب نذیر بنارسی اپنا کلام سنا رہے ہیں



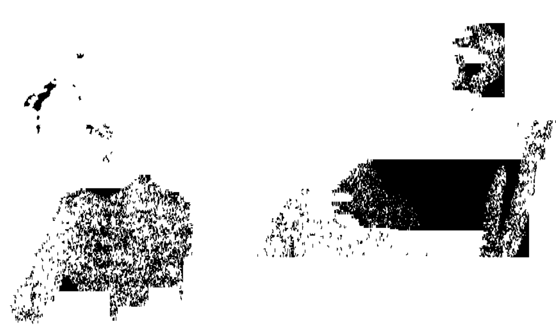


وزیر اعلا شری نرائن دت تیواری مہانگر لکھنؤ میں
۶ اکتوبر ۱۹۸۷ء کو رام لیلا دیکھ رہے ہیں



وزیر اعلا شری نرائن دت تیواری کی رہائش گاہ پر ۱۵ ستمبر
۱۹۸۷ء کو متعدد مسلم اکابرین، علما، اور پروفیسروں نے
روزہ افطار کیا۔ یہ تصویر اسی موقع کی ہے ◄





► سکریٹری مرکزی وزارت اطلاعات و
نشریات شری ایس۔ ایم۔ ایچ برنی (داہنے سے دوسرے) ۱۹
کو غالب اکاڈمی، نئی دہلی میں حضرت علی
کے موقع پر منعقد کیے گئے ایک جلسہ کی صدارت
کرتے ہوئے

ان بیانات سے بھی یہی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ اکبر آباد نیز دور کسی اور مقام پر قلمبند کئے گئے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اکبر آباد کا یہ قیام بہت مختصر تھا۔ یہ قیاس اس امر پر مبنی ہے کہ مہر کے محولۂ بالا، ترجمے میں ان کا نام مذکور نہیں اور چند صفحات کے بعد دوبارہ "مہر تخلص، مرزا حاتم علی بیگ لکھنوی شاگرد ناسخ" کے زیرِ عنوان ان کی ایک غزل کے چھ اشعار نقل کئے گئے ہیں۔ اگر سحر آگرے میں زیادہ دنوں تک مقیم رہے ہوتے اور مہر سے ان کی ملاقات محض سرسری اور رسمی نہ ہوتی تو وہ یقیناً اس طرح دو جگہ ان کا ذکر نہ کرتے۔

لکھنؤ اور آگرے کے علاوہ روہیل کھنڈ کے علاقہ کے بعض شاعروں سے بھی سحر نے اپنے دوستانہ روابط اور ملاقاتوں کا ذکر کیا ہے۔ ان شعرا کے تراجم کے وہ حصے جن سے اس ضمن میں اہم اور مفید مطلب معلومات حاصل ہوتی ہے، درج ذیل ہیں:

(الف) انور حسین انور: "از روسائے قصبہ سہسوان است... کمتر بفکر شعری پردازد۔ دحشت بہ طبعش عارض و فراجش بہ سخن پرستی مائل است...... با راقم السطور اتحاد دلی دارد و مارا ہم بہ مزاج و طبع او نسبتے خاص است۔ چند اشعارش کہ ایں وقت بیاد فقیر (مانده، بہ) تحریرش صفحۂ کاغذ را گلستان می کند و اکنون تسلیم تخلص می کند۔"

(ب) منشی اصغر علی مفتوں: "سررشتہ دار عدالتِ فوجداری ضلع میرٹھ است، بیشتر بہ محکمۂ کمشنری بریلی بہ عہدۂ منشی گری ممتاز بوده۔ از فقیر اتحاد بہ مرتبہ داشت۔"

(ج) مولوی فضل رسول مست: "متوطن قصبہ بدایوں (این) خطہ بہ ایں نسبت کہ مولدش واقع شده، بر خود می بالد) منبع ہزار خیر و برکات است۔ عالم متبحر و طبیب حاذق و شاعر بے بدل۔ بیشتر بمقتضائے صحبتِ اہل دنیا روزگار پیشہ بود، چون نسبت معنوی بہ مراتبِ حقیقت داشت، سالہاست کہ بہ تعلقاتِ دنیوی پشت پا زده مردانہ بہ فقر و غنا پرداختہ۔ گدازِ طبعش بہ عشقِ محبوبِ حقیقی بہ مرتبہ رسانده کہ از سلسلۂ عنانِ ذوقِ طبیعت ہر رگ و پے را جادۂ منازل شوق ساختہ بہ کعبۃ اللہ و مدینہ منوره از چشم و سر رفت۔ جناب والدش کہ در سنِ کہولت آہوئے ست سراپا عالم نور و معرفت، بر شوقِ آواز خانہ تا بخانۂ کعبہ رسیده و از انجا پسر و پدر ہر دو بعد از ادائے مناسک حج معاودت ساختند۔ اکنون بہ مراتبِ اولیائے کامل در بدایوں رسیده سرگرم استغنا صرا است۔ بہ جنابِ تجلی انوارش رنگ بر روئے مہر و ماه شکستہ و از جودتِ طبعش نقابِ حجاب بر رخ معنی آشنایاں بستہ۔"

(د) دلدار علی مذاق: "از قاضی زاده ہائے بدایوں و عزیزانِ ظہور اللہ خاں نوا است...... با فقیر سررشتۂ اتحادش مستحکم است از صحبت نا آشنایانِ مذاق شوریده کہ مس دارم، زنده بودم (کذا) اکنوں ہمدمی و سخن طرازی ہائے او از برائے چاره گری ہائے درد دل کار اعجاز مسیحائی می کند۔"

(ہ) اشرف علی نفیس: "از روسائے عظام بدایوں است آبا و اجدادش بہ عظمت و اقتدار بر جملہ اقرانِ خویش شرفِ امتیاز داشتہ۔ او خود ہم بہ عہدۂ تحصیلداری و پیشکاری ملازم سرکار کمپنی بوده۔ روزے چند است کہ ترک و تجرید پسندیده...... بہ قیاس ناقص فقیر ہمچو عالی طبع نقادِ معانی درین قرب و جوار پیدا نگردیده..."

یہ بیانات بہار بے خزاں۔ اور اس کے مولف کے بارے میں دو اہم اور نتیجہ خیز قیاسات کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ اولاً یہ کہ اس تذکرہ کی تالیف کے وقت سحر بدایوں یا اس کے قرب و جوار میں

۱؎ مست کے والد کا نام مولانا شاہ عبدالمجید تھا، ۲۹ رمضان، ۱۱۷۷ھ / یکم اپریل ۱۷۶۴ء کو پیدا ہوئے اور سہ شنبہ ۱۷ محرم ۱۲۶۳ھ / ۵ جنوری ۱۸۴۷ء کو وفات پائی۔ (تذکرۂ علمائے اہل سنت ص ۱۳۶)

۲؎ مولانا عبدالمجید ۱۲۵۶ھ / ۱۸۴۱ء میں سفر حج و زیارت سے مشرف ہوئے تھے۔ (ایضاً ص ۱۳۶)

مقیم تھے۔ اس قیاس کی وجوہات حسب ذیل ہیں:۔

(الف) تذکرۂ بالا شعرا میں سے منشی انوار حسین تسلیم اور دلدار علی مذاق کے علاوہ باقی تینوں شاعر قطعاً غیر معروف ہیں۔ اس لیے کسی دور دراز مقام پر ان سے کسی شخص کا واقف ہونا بعید از امکان ہے۔[1]

(ب) ۱۲۷۵ھ / ۱۸۵۸ء سے قبل منشی انوار حسین تسلیم کا سہسوان (ضلع بدایوں) اور مراد آباد کے علاوہ کسی اور جگہ قیام ثابت نہیں۔[2] ۱۲۶۱ھ / ۱۸۴۵ء میں انھوں نے مراد آباد سے سہسوان جاتے ہوئے عید کا چاند اثنائے راہ میں دیکھا تھا[3] یعنی ماہ رمضان ۱۲۶۱ھ / ستمبر ۱۸۴۵ء کے اواخر تک وہ مراد آباد میں اور شوال / اکتوبر کی ابتدائی تاریخوں میں سہسوان میں موجود تھے۔ ہمارا خیال ہے کہ ان سے سحر کے تعلقات سہسوان، بدایوں یا مراد آباد میں قیام کے دوران ہی قائم ہوئے ہوں گے۔

(ج) منشی اصغر علی مفتوں کے قیام بریلی اور اس کے معاً بعد ان سے رابطۂ اتحاد کا ذکر صیغۂ ماضی کے تحت کیا گیا ہے جو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ تذکرے کی تالیف سے قبل سحر بریلی میں بھی قیام کر چکے تھے۔[4]

(د) مولوی فضل رسول مست، دلدار علی مذاق اور اشرف علی نفیس کے تراجم کا طرز و لہجہ اور انداز بیان مجملاً اور بعض جملے صریحاً اس طرف اشارہ کرتے ہیں کہ ان کی تحریر کے وقت بدایوں یا اس کے "قرب و جوار" میں قیام پذیر تھے۔

دوسری اہم بات جو مذکورہ شاعروں سے مولف کے تعلقات کی بنیاد پر ان بیانات اور بعض دوسرے ذرائع معلومات کی روشنی میں کہی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ بدایوں یا اس کے اطراف و جوانب میں قیام کے دوران وہ بحیثیت ملازم کسی سرکاری دفتر یا عدالت سے منسلک تھے۔ مفتوں کے ترجمے میں عدالت فوجداری ضلع میرٹھ اور اس سے بیشتر محکمۂ کشنری بریلی سے ان کی وابستگی کا حوالہ اور نفیس کے حال میں "ترک و تجرید" سے قبل پیشکاری اور تحصیلداری کے مناصب پر فائز رہنے کا ذکر واضح طور پر موجود ہے۔ منشی انوار حسین تسلیم تذکرے کی تالیف کے زمانے میں عدالت دیوانی ضلع مراد آباد میں بحیثیت اہلکار برسر کار تھے[5] اور مولوی فضل رسول مست "روزگار رفتگی" کے دور میں کچھ دنوں تک غالباً بدایوں ہی میں مفتی عدالت اور ساڑھے تین برس تک سہسوان میں سررشتہ دار رہ چکے تھے۔[6] اس صورت میں سحر سے ان لوگوں کے دوستانہ مراسم کی استواری میں ہم پیشگی کے دخل اور امکانات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔[7] دلدار علی مذاق کے ذکر میں انھوں نے غالباً اپنے گرد و پیش کے اس دفتری اور کاروباری ماحول ہی کو جس سے انھیں بہ حیثیت ملازم دن رات واسطہ پڑتا تھا "صحبت نا آشنایاں" سے تعبیر کیا ہے۔

تذکرۂ مشاہیر کاکوری" میں منشی احمد حسین کے جن افراد خاندان اور شاگردوں کا ذکر موجود ہے، ان کے نام اور مختصر حالات یہ ہیں:

(۱) منشی نظیر حسن اوج:[8] یہ منشی صاحب موصوف کے صاحبزادے

[1] ملاحظہ ہو مضمون راقم مشمولہ ماہنامہ "آج کل" دہلی۔ شمارہ نومبر ۱۹۵۸ء [2] ملخص تسلیم ص ۲۲۔
[3] اس زمانے میں سحر کے برادر عم زاد منشی محمد احمد بھی بریلی ہی میں مقیم تھے۔ شوال ۱۲۵۸ھ / نومبر ۱۸۴۲ء میں وہیں ان کے صاحبزادے حکیم حافظ مسعود احمد پیدا ہوئے۔ (تذکرۂ مشاہیر کاکوری ص ۲۹۸) [4] مضمون راقم مشمولہ "آج کل" " ملخص تسلیم" ص ۳۳۔
[5] تذکرۂ علمائے اہل سنت ص ۲۰۹۔ [6] مرزا حاتم علی مہر بھی جن کا ذکر اس سے قبل آ چکا ہے۔ اولاً آگرہ میں عدالت دیوانی کے وکیل تھے (مخزن شعرا ص ۸۷) بعد ازاں آگرہ اور دوسرے مقامات پر بحیثیت منصف مامور رہے (قاموس المشاہیر حصہ دوم ص ۲۴۴)۔
[8] شاہ علی اکبر قلندر کے تلامذہ کی فہرست میں فاضل منصف نے اوج کا نام ذال معجمہ کے ساتھ "یعنی نذیر حسن" لکھا ہے۔ لیکن ممکن ہے کہ صحیح نام "نظیر حسن" ہو جس سے ۱۲۶۸ھ برآمد ہوتا ہے جو ان کا سال ولادت ہے۔

تھے ماہ صفر ۱۲۲۸ھ (نومبر/دسمبر ۱۸۱۵ء) میں پیدا ہوئے۔ فارسی کی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ شاعری میں منشی محمد رضا صبر سے استفادہ کیا۔ بسلسلۂ وکالت ہردوئی میں قیام تھا، وہیں بروز جمعہ ۱۳ر جمادی الآخر ۱۳۱۶ھ (۲۸ر اکتوبر ۱۸۹۸ء) وفات پائی۔ (ص ۴۵۷ و ۴۵۸)

(۲) منشی محمد رضا صبر: یہ منشی احمد حسین کے برادر حقیقی، منشی محمد حسین کے فرزند تھے۔ فن شاعری میں شیخ عبدالرؤف شعور لکھنوی شاگرد مصحفی سے تلمذ تھا۔ کاکوری اور قرب و نواح میں ان کے متعدد شاگرد تھے۔ بروز دوشنبہ ۹ر شعبان ۱۲۹۷ھ (۱۹ر جولائی ۱۸۸۰ء) کو سیتاپور میں انتقال ہوا۔ ایک عاشقانہ اور دو نعتیہ دیوان ان کے یادگار ہیں۔ (ص ۲۴۵ و ۲۴۶)

(۳) منشی ولایت احمد: یہ منشی احمد حسین کے عم حقیقی منشی محمد بخش تجلی کے صاحبزادے تھے۔ ولادت ماہ محرم ۱۲۲۸ھ (جنوری ۱۸۱۳ء) میں ہوئی۔ سیتاپور میں عرصے تک تحصیلداری کے منصب پر فائز رہے۔ وہیں شب عاشورہ ماہ محرم الحرام ۱۳۱۰ھ کو (۴ر اگست ۱۸۹۲ء) کو بعارضہ ہیضہ وفات پائی۔ (ص ۴۷۵ و ۴۷۶)

(۴) خاں بہادر مفتی عنایت احمد: منشی ولایت احمد کے چھوٹے بھائی تھے۔ ۹ر شوال ۱۲۲۸ھ (۴ر نومبر ۱۸۱۳ء) کو قصبہ دیوہ میں پیدا ہوئے تھے۔ جامع علوم معقول و منقول اور صاحب تصانیف کثیرہ تھے۔ علی گڈھ اور بریلی میں منصف اور صدر امینی کے عہدوں پر فائز رہے۔ ۱۸۵۷ء میں ان کی ہمدردیاں سرکاری منصب کے تقاضوں کے برخلاف غالباً اپنے ہموطنوں کے ساتھ رہیں۔ جس کی پاداش میں حبس بعبور دریائے شور کی سزا بھگتنی پڑی۔ قید سے رہائی کے بعد حج بیت اللہ کے لیے روانہ ہوئے اسی سفر کے دوران ۱۷ر ماہ شوال ۱۲۷۹ھ (۷ر اپریل ۱۸۶۳ء) کو جدہ کے قریب جہاز کی غرقابی کے حادثے میں وفات پائی۔ (ص ۲۸۹ و ۲۹۰)

(۵) منشی مقصود احمد نطق: منشی ولایت احمد کے صاحبزادے تھے۔ ولادت کی تاریخ ۸ر ربیع الاول ۱۲۵۹ھ (۸ر اپریل ۱۸۴۳ء) ہے۔ شاعری میں اپنے ماموں منشی محمد رضا صبر سے استفادہ کیا تھا۔ اردو کے دو دیوان شائع ہو چکے ہیں۔ ۱۲۹۱ھ (۱۸۷۴ء) میں شعر گوئی ترک کر دی تھی۔ بروز دوشنبہ ۲۵ر رمضان ۱۳۲۹ھ (۱۸ر ستمبر ۱۹۱۱ء) کو کاکوری میں وفات پائی۔ (ص ۴۱۰ و ۴۱۱)

(۶) منشی مقبول احمد محو: منشی مقصود احمد نطق کے چھوٹے بھائی تھے۔ ولادت ذی قعدہ ۱۲۶۰ھ (نومبر ۱۸۴۴ء) میں ہوئی۔ شاعری میں اولاً منشی محمد رضا صبر سے اور اس کے بعد اپنے برادر بزرگ سے اصلاح لی اور مجموعۂ کلام "خمکدۂ خیال" کے نام سے طبع ہو چکا ہے۔ تحصیلداری سے پنشن لینے کے بعد سندیلہ میں بود و باش اختیار کر لی تھی۔ وہیں ۲۷ر جمادی الآخرہ ۱۳۲۵ھ (۹ر اگست ۱۹۰۷ء) کو انتقال ہوا۔ (ص ۴۰۹ و ۴۱۰)

(۷) منشی سلطان احمد سلطان: منشی ولایت احمد کے سب سے چھوٹے صاحبزادے اور اپنے برادر معظم منشی مقصود احمد نطق کے شاگرد تھے۔ صفر ۱۲۶۸ھ (نومبر/دسمبر ۱۸۵۱ء) میں پیدا ہوئے۔ اپنے والد اور منجھلے بھائی کی طرح یہ بھی تحصیلداری کے عہدے پر فائز تھے۔ ۹ر رجب ۱۳۱۹ھ (۲۲ر اکتوبر ۱۹۰۱ء) ریٹائرمنٹ سے قبل کاکوری میں فوت ہوئے۔ (ص ۱۹۴ و ۱۹۵)

(۸) حکیم حافظ مسعود احمد: یہ منشی محمد احمد ابن منشی محمد بخش کے فرزند تھے۔ پنجشنبہ ۶ر ماہ شوال ۱۲۵۸ھ (۱۰ر نومبر ۱۸۴۲ء) کو بریلی میں پیدا ہوئے۔ درویش صفت انسان تھے۔ عرصے تک بسلسلۂ طبابت اناؤ میں قیام رہا۔ آخر عمر میں کاکوری چلے آئے تھے۔ وہیں ۱۳ر ذی قعدہ ۱۳۳۸ھ (۳۱ر اگست ۱۹۱۲ء) کو وفات پائی۔ (ص ۳۹۸ و ۳۹۹)

(۹) منشی سجاد حسین: حاجی بغلول اور احمق الذین کے مصنف اور اودھ پنچ کے ایڈیٹر کی حیثیت سے اردو ادب اور صحافت کی تاریخ میں لافانی شہرت کے مالک ہیں۔ ساتویں پشت میں آپ کا سلسلۂ نسب بھی اس خاندان کے ایک

بزرگ شیخ محمد غوث سے مل جاتا ہے۔ (ص ۱۸۳ و ۱۸۴)

(۱۰) خان بہادر منشی محمد تاج الدین جذب :- ان کے دادا شیخ غلام بخف نے بلگرام سے ترک وطن کر کے کاکوری میں سکونت اختیار کر لی تھی۔ جذب ۱۲۷۲ھ (۵۶-۱۸۵۵ء) میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے فارسی کی ابتدائی تعلیم منشی احمد حسین سے حاصل کی تھی۔ (ص ۷۲ و ۷۳)

(۱۱) شاہ علی انور قلندر :- صاحب تذکرۂ مشاہیر کے والد اور خانقاہ کاظمیہ کاکوری کے سجادہ نشین تھے۔ آپ نے نثر نویسی کے فن میں منشی احمد حسین سے استفادہ کیا تھا۔ تاریخ ولادت ۱۱ ربیع الثانی ۱۲۶۹ھ (۲۲ جنوری ۱۸۵۳ء) اور تاریخ رحلت ۲۰ محرم ۱۳۲۴ھ (۱۶ مارچ ۱۹۰۶ء) ہے۔ (ص ۲۷۸-۲۸۳)

سحر کے قریبی اعزا کی اس فہرست پر نظر رکھتے ہوئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ان کا خاندان ایک ذی علم اور ذی حیثیت خاندان تھا۔ ان کے حقیقی چچا زاد بھائی مفتی عنایت احمد متعدد کتابوں کے مصنف، معزز سرکاری عہدیدار اور خان بہادری کے خطاب سے سرفراز تھے۔ جو برطانوی دور حکومت میں کسی ہندستانی کے لیے بہت بڑا اعزاز تصور کیا جاتا تھا۔ مفتی صاحب کے بڑے بھائی منشی ولایت احمد اور ان کے دو بیٹے منشی مقبول احمد نحو اور منشی سلطان احمد سلطان بھی تحصیلدار رہے۔ نواح بدایوں میں سرکاری ملازمت سے سحر کی وابستگی کے بارے میں اگر ہمارا قیاس درست ہے تو اس خاندانی روایت کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ بھی تحصیلداری یا اسی قبیل کے کسی منصب پر فائز رہے ہوں گے۔

منشی نظیر حسن اوج کے علاوہ سحر کے سلسلۂ اخلاف سے کسی اور شخص کا نام "تذکرۂ مشاہیر کاکوری" میں مذکور نہیں۔ اس کتاب کے مندرجات سے ان کے زمانۂ ولادت پر بھی روشنی نہیں پڑتی۔ البتہ اس بنیاد پر کہ انھوں نے ناسخ متوفی ۱۲۵۴ھ/ ۱۸۳۸ء کی زبان سے ان کا کلام سنا تھا اور غلام مینا ساحر متوفی ۱۲۵۰ھ/ ۱۸۳۵ء سے اصلاح لی تھی، قیاساً یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ ۱۲۳۰ھ/ ۱۸۱۵ء کے قریب پیدا ہوئے ہوں گے۔ اس حساب سے اوج کی پیدائش کے زمانے میں ان کی عمر تقریباً اڑتیس ۳۸ سال اور انتقال کے وقت ساٹھ سال کے قریب ہوگی۔

۲۔ "بہار بے خزاں" کے خطی نسخوں کی کیفیت اور ان سے استفادہ کے سلسلے میں اس کے تبصرہ نگاروں نے جو معلومات فراہم کی ہے وہ حسب ذیل ہے :

(الف) ڈاکٹر فہیم احمد : "اس تذکرے کا صرف ایک خطی نسخہ موجود ہے۔ یہ نسخہ ندوۃ العلما لکھنؤ کے کتب خانے میں ہے۔ میں نے اسی نسخے کی بنیاد پر متن تیار کیا ہے۔ اس خطی نسخے کی ایک نقل مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں ہے ۔۔۔ سحر نے اس کے علاوہ ایک تذکرہ طور معنی کے نام سے بھی لکھا تھا طور معنی میں ایران کے فارسی گو شعراء کا حال بیان کیا گیا ہے۔ بہار بے خزاں اور طور معنی دونوں ایک ہی جلد میں مجلد ہیں ۔۔۔ بہار بے خزاں کے مخطوطے کا سائز ½۸" × ½۶" ہے۔ اس میں ۹۴ صفحات ہیں۔" (مقدمہ ص ا)

(ب) حفیظ عباسی : "اس تذکرے کا ایک خطی نسخہ ندوۃ العلماء لکھنؤ میں ہے، اور اس کی ایک نقل مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں ہے۔ لکھنؤ کا نسخہ بوسیدہ ہے لیکن علی گڑھ کا نسخہ بہت صاف، خوش خط اور روشن ہے لیکن اس نسخے میں کاتب نے لاتعداد غلطیاں کی ہیں۔

میں چونکہ ابتدا ہی میں سی گڑھ والے نسخے کو متن بنا چکا تھا، اس لیے اسی طرح رہنے دیا، اور اصل نسخے سے لکھنؤ جا کر مقابلہ کیا۔ اس مطبوعہ نسخے میں اصل نسخے کے صفحات کی جگہ نشان دہی کر دی گئی ہے۔" (مقدمہ ص ج)

(ج) ڈاکٹر فرمان فتح پوری :- "اس تذکرے کا صرف ایک قلمی نسخہ اب تک دستیاب ہوا ہے۔ یہ نسخہ ندوۃ العلماء لکھنؤ کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ یہ مولوی عبدالحی مؤلف گل رعنا کی ملکیت تھا۔ بعد میں ان کے بیٹے مولانا عبدالعلی ندوی نے اسے کتب خانے کو دے دیا۔ فہرست کتب میں اس کا نمبر ۲۲۴ ہے اور اس کے ساتھ مصنف کا دوسرا تذکرہ

طور معنی بھی مجلد ہے۔ اس نسخے کی ایک نقل مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں بھی پہنچ گئی ہے۔

بہارِ بے خزاں کے مخطوطے میں ½ ۷×۶ ½ " سائز کے ۹۴ صفحات ہیں۔ خط اچھا نہیں ہے۔ بعض جگہ پڑھنے میں خاصی دقت ہوتی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن پورے مخطوطے کا خط ایک ہی ہے۔ کاتب کا نام اور سنہ کتابت درج نہیں ہے۔ مخطوطے کے ایک حاشیے پر کفایت علی کافی[1] کا یہ تاریخی قطعہ درج ہے۔

جب ہوا یہ تذکرہ تالیف رشکِ گلستاں
یادگارِ شاعرانِ کشورِ ہندوستاں
فکرِ کافی سے ہوئی تاریخ اس کی آشکار
یہ عجب گلزار زیبا ہے بہارِ بے خزاں[2]

فرمان صاحب کو اس تذکرے کی تفصیلات اسحق صدیقی صاحب کی وساطت سے معلوم ہوئی تھیں لیکن اس کے دونوں مرتبین یعنی ڈاکٹر نعیم احمد اور جناب حفیظ عباسی ندوۃ العلماء کے نسخے کو بہ چشم خود دیکھنے اور تدوین و تصحیح متن کے سلسلے میں اس سے استفادہ کرنے کے مدعی ہیں۔ راقم السطور کو پہلی بار ۱۹۶۴ء میں اور دوسری مرتبہ مئی ۱۹۷۵ء میں اس مخطوطے کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ دوسری بار دو دن کی قلیل مدت میں جس میں سے ایک دن اس مخطوطے کی تلاش میں صرف ہو گیا، زیرِ نظر مضمون کی متوقع ضروریات کے مطابق جو یادداشتیں قلم بند کی جا سکیں، ان کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ فاضل مرتبین نے محققانہ دیانت کے تقاضوں کے برخلاف اپنے ان بیانات میں بے جا مبالغہ آرائی اور غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ یہ خیال درج ذیل دلائل پر مبنی ہے۔

(الف) حفیظ عباسی صاحب کا یہ بیان کہ "لکھنؤ کا نسخہ بوسیدہ ہے" خلاف واقعہ ہے، اس لیے براہِ راست استفادے کی نفی کرتا ہے۔

(ب) مطبوعہ نسخوں میں ایک جگہ بھی اختلافِ نسخ کی نشاندہی نہیں کی گئی ہے حالانکہ نسخۂ ندوہ اور ان نسخوں کے متن میں بعض بنیادی اختلافات موجود ہیں[3] مثلاً نسخۂ ندوہ میں ردیف الف امین الدین امین کے ذکر پر ختم ہوتی ہے جب کہ ان نسخوں میں اس کے بعد مزید دو شعرا یعنی سید آل نبی بلگرامی اور منشی انوار حسین انور کے تراجم شامل ہیں۔ اسی طرح اس نسخے میں میر قمر الدین منت اور عبد اللہ خاں مشتاق کے تراجم کے درمیان میں ایک نامعلوم الاسم شاعر مقصود کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے:۔

"مقصود تخلص، نامش نامعلوم، یک بیتش بنظر آمد"

ڈاکٹر نعیم احمد کے مرتبہ نسخے میں یہ عبارت موجود نہیں اور تذکرہ شعر منت کے نمونۂ کلام کے ذیل میں منقول ہے۔ عباسی صاحب کے مرتبہ نسخے سے بھی یہ عبارت خارج ہے لیکن انھوں نے غالباً کسی دوسرے تذکرے سے استفادے کی بنیاد پر مقصود کے اس ایک شعر سے قبل ان کا تخلص بطور عنوان درج کر دیا ہے جہاں تک راقم السطور کو یاد ہے نسخۂ علی گڑھ میں بھی یہ شعر منت کے کلام میں شامل ہے۔ ڈاکٹر نعیم احمد نے بعینہٖ اسی کا اتباع کیا

---

[1] سید کفایت علی کافی مراد آباد کے رہنے والے تھے۔ ۱۲۷۵ھ / ۱۸۵۸ء میں انگریز دشمنی کی پاداش میں شہید ہوئے۔ (۱۸۵۷ء کے مجاہد شعرا۔ از امداد صابری) کافی کا یہ قطعہ بھی روہیل کھنڈ سے تحرا دران کے تذکرے کے تعلق کی نشان دہی کرتا ہے۔

[2] اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری ص ۴۸ ۲ و ۴۹ ۲۔

[3] راقم السطور نے اس مخطوطے سے جو یادداشتیں قلم بند کی تھیں وہ بہت مجمل اور محدود ہیں۔ سرسری اندازے کے مطابق اس نسخے میں ایسے بہت سے اشعار موجود ہیں جنھیں نسخۂ علی گڑھ کے کاتب نے قلم انداز کر دیا ہے اور اسی بنا پر انھیں مطبوعہ نسخوں میں بھی جگہ نہیں مل سکی ہے۔ الحاق اور غلط انتساب کی مثالیں بھی بکثرت ملتی ہیں۔ فاضل مرتبین نے ان کی جانب بھی کوئی توجہ نہیں دی ہے۔

نسخۂ ندوہ سے استفادے کی صورت میں فاضل مرتبین ہرگز اس فرد گذاشت کے مرتکب نہ ہوتے۔

(ج) ندوے کا مخطوطہ منشی انوار حسین تسلیم کے شعر پر ختم ہوتا ہے مطبوعہ نسخوں میں اس کے بعد کفایت علی کافی کا قطعۂ تاریخ بغیر یہ بتائے ہوئے کہ اصل نسخے میں یہ کس جگہ منقول ہے، نقل کر دیا گیا ہے متن کی یہ روایت نسخۂ علی گڑھ سے مطابقت رکھتی ہے۔

(د) ہمارے خزانے کے اس نسخے کے ساتھ صرف طور معنی ہی مجلد نہیں سحر کا ایک اور تذکرہ "آئینۂ حیرت" بھی منسلک ہے کسی مخطوطے کے متن کی تدوین و ترتیب کے سلسلے میں مدون کو جس طرح اس کی داخلی و خارجی کیفیات پر نگاہ رکھنا پڑتی ہے اس کے پیش نظر نعیم صاحب کی اس تذکرے سے اور عباسی صاحب کی طور معنی اور "آئینۂ حیرت" دونوں سے لاعلمی ان کے دعووں کی ثقاہت کو مجروح کرتی ہے۔

مسلم یونیورسٹی لائبریری کا قلمی نسخہ ۶۹-۱۹۶۸ء میں قیام علی گڑھ کے دوران راقم السطور کی نظر سے گزر چکا ہے لیکن اس سے متعلق یادداشتیں محفوظ نہیں، اس لیے یہ بتانا مشکل ہے کہ یہ فی الواقع نسخۂ ندوہ کی نقل ہے یا نہیں، البتہ یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ نسخۂ عباسی کی طرح ڈاکٹر نعیم احمد کا نسخہ بھی اسی پر مبنی ہے۔ داخلی شواہد اس خیال کی پرزور تائید کرتے ہیں۔

اس تذکرے کے ایک اور قلمی نسخے کا علم "تذکرۂ مشاہیر کاکوری" سے ہوتا ہے۔ مصنف نے قاضی سید الدین خاں سعید کے حالات میں ان کا ایک اقتباس نقل کیا ہے (ص ۱۹۱) اور فہرست ماخذ میں بہارِ بے خزاں "تذکرۂ شعرا" کے نام سے کتب خانۂ تکیہ شریف (خانقاہ کاظمیہ) کاکوری میں اس کی موجودگی کی نشاندہی کی ہے۔ (ص ۵) سعید کے بارے میں انھوں نے لکھا ہے کہ "ان کے بہت سے اشعار و قصائد وغیرہ تھے جو دستبرد زمانہ سے معدوم ہو گئے۔ چند اشعار اردو فارسی جو مجھ کو بہت تلاش سے ملے ہیں درج ذیل ہیں" (ص ۱۹۲) اس کے بعد فارسی کے آٹھ اور اردو کے تین شعر اور ایک رباعی نقل کی ہے۔ بہارِ بے خزاں کے مطبوعہ نسخوں میں یہ رباعی منقول نہیں لیکن اشعار کی تعداد چار ہے اور پہلے دو اشعار کے متن میں کچھ اختلافات بھی موجود ہیں۔ اگر مصنف نے کسی دوسری روایت کی بنیاد پر ان اشعار میں لفظی ترمیم نہیں کی ہے اور چوتھے شعر کو دانستہ نظر انداز نہیں کیا ہے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ کاکوری کے خطی نسخے کا متن نسخۂ ندوہ سے کسی حد تک مختلف تھا۔ بصورت دیگر یہ عین ممکن ہے کہ نسخۂ ندوہ گل رعنا کے مصنف کو خانقاہ کاظمیہ ہی سے دستیاب ہوا ہو۔ بعض قرائن جو ابھی مزید غور و خوض کے متقاضی ہیں اس امکان کی تائید کرتے ہیں۔

کافی اور تسنیم کے قطعات تاریخ کی رو سے بہارِ بے خزاں ۱۲۶۱ھ/۱۸۴۵ء کی تالیف ہے لیکن بعض قرائن اس امر پر دلالت کرتے ہیں کہ سحر نے اس سنہ کے بعد بھی اس میں کچھ اضافے کیے ہیں۔ "فصل در خاتمہ" جو بلا قید حروف تہجی عاصی، مذاق، نفیس، اور امان علی سحر کے تراجم پر مشتمل ہے، غالباً زمانۂ مابعد ہی میں بطور ضمیمہ شامل کی گئی ہے۔ نفیس کے ذکر میں ان کے تذکرے کے بارے میں سحر کا یہ بیان اس قیاس کو تقویت بخشتا ہے۔

"دریں زمانہ تذکرۂ مبسوط زباندانانِ اردو بہ تکلف کرمی باید و بہ لطائف کرمی شاید بہ وضع تاریخ تالیف کردہ بہ تلاش اصناف کلام شعرا بلا قید رطب و یابس در دسبری برداشتہ۔"

نفیس کے اس تذکرے کا نام انتخاب دہر تھا۔[1] یہ نام بظاہر تاریخی معلوم ہوتا ہے۔ اگر یہ قیاس درست ہے تو اس کا سالِ تالیف ۱۲۶۳ھ/۴۸-۱۸۴۷ء ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں اس تذکرے کے بارے میں منقولہ صدر معلومات اس کے بعد ہی فراہم کی گئی ہوگی۔

---

[1] بحوالہ رسالۂ تذکرات از گارسین دتاسی مترجمہ شمس العلما مولوی ذکاء اللہ مرتبہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی صفحہ ۳۸

آئینۂ حیرت اور طور معنی علی الترتیب ۱۲۵۸ھ/ ۴۳-۱۸۴۲ء اور ۱۲۵۹ھ/ ۴۴-۱۸۴۳ء کی تالیف ہیں۔ اول الذکر خواتین کا تذکرہ ہے[1] اس کی ابتدا ایک مختصر مقدمے سے ہوتی ہے جس میں اس کے اسباب تالیف پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اگرچہ اس سلسلے میں کوئی یادداشت محفوظ نہیں لیکن جہاں تک یاد آتا ہے اس میں صرف اردو شاعرات کا ذکر کیا گیا ہے۔ مخطوطے کے آخری ورق کی اندرونی جانب زیریں حاشیے پر منشی انوار حسین تسلیم کا یہ قطعہ تاریخ منقول ہے ؎

چوں تذکرۂ سحر بالطاف الٰہی | دید آئینۂ حال وے از خاتمہ صورت
از غیب ندا شد پئے تاریخ تمامش | آئینہ دلہاست چہ آئینہ حیرت

۱۲۵۸ھ

یہ قطعہ بہ گمان غالب کاتب تذکرہ ہی کے قلم کا لکھا ہوا ہے لیکن اصل متن کی کتابت کے بعد کسی وقت اضافہ کیا گیا ہے۔

طور معنی ڈاکٹر نعیم احمد کے بیان کے برخلاف عام فارسی گو شعرا کا تذکرہ ہے۔ اس کا مقدمہ آئینۂ حیرت کے مقدمے کی بہ نسبت کسی قدر مفصل ہے۔ اسباب تالیف اور تذکرے کی کیفیت کے سلسلے میں مولف کے بیانات کی تلخیص یہ ہے:

"مولف این تذکرہ از ابتدائے سن شعور از صحبت شعرا مستفیض گردیدہ و کلام ہر یک از شعرائے سابقین و حال بقدر فہم خویش انتخاب زدہ۔۔۔ اکثر کتب تذکرہ و بیاض اشعار اساتذہ کہ دیدہ از قصہ طول (طویل) و خارج از اصل مطلب۔۔۔۔۔۔ از ہر یک (از) سخن سنجان محض بہ لطافت اشعار گو یک بیت ہم باشد، اکتفا کردہ، اشعار شاب دریں تذکرہ کہ موسوم بہ طور معنی است، بکمال ایجاز و اختصار داخل ساختہ۔۔۔۔۔ فصلے درباب خاتمۂ کتاب رقم زدۂ کلک معنی نگار است کہ کیفیت شاعری شعرائے متاخرین بقید تخلص کہ بلا رعایت حروف تہجی است بے تکلف سرمہ سائے دیدۂ اہل بصیرت شود و ایں آشفتہ مزاج پریشان روزگار احمد حسین متخلص بہ سحر۔۔۔۔۔۔ غرض از تالیف تذکرہ فارسی استفادہ از تلاش و فکر عالی اساتذۂ فارسی کہ موجد و مخترع ایں فن شریف اند دارد۔"

"فصل در خاتمۂ کتاب مشتمل بر تذکرۂ شعرائے متاخرین" میں مؤلف نے جن شعرا کے حالات و اشعار نقل کیے ہیں ان میں سے مرزا مظہر جانجاناں، میر تقی میر، مصحفی، مرزا قتیل، قاضی القضاۃ مولوی نجم الدین علی خاں ثاقب کاکوروی، نواب ظہور اللہ خاں نوا بدایونی، قاضی محمد صادق خاں اختر اور غلام میا ساحر کاکوروی کے نام راقم کی یادداشتوں میں محفوظ ہیں۔ ان شاعروں کی موجودگی میں طور معنی کو "ایران کے فارسی گو شعرا کا تذکرہ" کہنا کسی طرح مناسب نہیں۔ آخری دور کے ان ہی شاعروں میں سے ایک شاعر سعید الدین عزیزی عظیم آبادی مقیم لکھنؤ کا ترجمہ اس لحاظ سے اہم اور توجہ طلب ہے کہ اس سے سحر کے ایک معاشقے کا علم ہوتا ہے۔ لکھنؤ میں قیام کے دوران عزیزی سے سحر کے دوستانہ روابط قائم ہو گئے تھے اور انھوں نے سحر کے حسب فرمائش ان کے "محبوب دلنواز" کا سراپا نظم کیا تھا۔ چنانچہ ان کے ذکر میں لکھتے ہیں کہ:

"با فقیر سر رشتۂ اتحادش مستحکم است۔ باقامت لکھنؤ، از ملاقات یک دیگر خوش گذاشت (کذا: خوش گزشت) حسب فرمائش فقیر سراپائے محبوب دل نواز کہ و مسانۂ من بود گفتہ داد سخنوری دادہ۔"

نمونہ کلام میں اس سراپا کے جو اشعار نقل کیے گئے ہیں ان میں آخری دو شعر یہ ہیں ؎

لقب احمد حسین آ آ چوں مجنوں | بہ لیلائے دلش گردید مفتوں
راشد باعث ایں نظم دل سوز | کہ گفتم من سراپائے عم اندوز

اس تذکرے کے آخری شاعر غلام مینا ساحرؔ کاکوروی ہیں جن کا انتخاب کلام آخری ورق کے صفحۂ اول کی ابتدائی سطور میں ختم ہوتا ہے۔ اسی صفحہ کے وسط میں بائیں جانب حاشیے پہ منشی انوار حسین تسلیم کا یہ قطعہ تاریخ تحریر ہے ؎

شدہ ہر شعر تذکرہ دلکش ‌ ‌ ‌ کہ بہوادش نظرہ تو است
گفتمش فی البدیہۃ تاریخش ‌ ‌ ‌ طور معنی چو مطلع نو است
۱۲۵۹ھ

"مشفیۂ حیرت" کے قطعۂ تاریخ کی طرح یہ قطعہ بھی اصل متن کی کتابت کے بعد اضافہ کیا گیا ہے۔ مخطوطے میں اس قطعے کے چوتھے مصرعے کے نیچے ۱۲۵۹ھ لکھا ہوا ہے لیکن بہ صورت موجودہ اس سے ۱۲۶۰ھ برآمد ہوتا ہے۔ اس فرق کو "نو راست" کے املا سے "الف" حذف کرکے جو قواعد کی رو سے بھی زاید اور غیر ضروری ہے دور کیا جا سکتا ہے۔

سحرؔ اور ان کے تذکروں کے بارے میں یہ معلومات ابھی مزید تصدیق و تحقیق اور تفصیل و توضیح کی طالب ہے۔ کاکوری کے اہلِ علم اس طرف توجہ فرمائیں تو زیر بحث مسائل کے بعض پہلو کچھ اور روشن ہو سکتے ہیں۔

★

علی شبر حسینی کرھانی

کنبہ بندی کی کرامت

کنبہ بندی ہزار نعمت ہے
گھر میں چاروں طرف مسرت ہے

ہے میسر تمام آسائش
نہ تو کلفت ہے اور نہ حسرت ہے

ایک بیوی ہے اور دو بچے
یہی چھوٹی سی اپنی جنت ہے

اس گرانی کے دور میں سچ ہے
فوج بچوں کی ایک لعنت ہے

پیٹ بھرنا تو ان کا ایک طرف
پیار کرنا بھی ایک زحمت ہے

مل گئی واہ کنبہ بندی کی
یہ بھی ہم سب پہ اس کی رحمت ہے

دونوں بچے ہمارے دو گوہر
موتیوں سے زیادہ قیمت ہے

دولت علم سے ہیں مالا مال
علم والوں میں ان کی عزت ہے

ہند کے باسلیقہ شہری ہیں
سب کی نظروں میں ان کی وقعت ہے

کنبہ بندی کرائیے اپنی
زندہ رہنے کی گر ضرورت ہے

کوئی تکلیف کا سوال نہیں
پھر جھجک کیوں یہ کیسی وحشت ہے

جس کو زحمت سمجھ رہے ہیں آپ
میری نظروں میں عین راحت ہے

فکر سے دور ہو کے دیکھیں آپ
زندگی کتنی خوبصورت ہے

اب حسینی ہے فکر سے آزاد
کنبہ بندی کی یہ کرامت ہے

"ایک شاندار ورثے سے زیادہ فائدہ مند اور باعثِ فخر کوئی اور چیز نہیں ہے۔ لیکن فقط اس ورثے پر ہی زندہ رہنے اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہنے سے زیادہ خطرناک بھی کوئی اور بات نہیں ہے۔ اگر کوئی قوم صرف اپنے آباؤ اجداد کی نقل کرنے پر ہی اکتفا کرتی ہے تو وہ ترقی نہیں کر سکتی۔"

——— جواہر لال نہرو



ماڈرنٹی

(افسانہ)

عابد سہیل

رام کلی نے بیجو کو سامنے کھڑے دیکھا تو ایک بار تو وہ اسے پہچان بھی نہ سکی۔ سفید موٹے کھدّر کا کرتا، پاجامہ، پیروں میں گہرے نیلے رنگ کی پلاسٹک کی چپل اور سیدھے ہاتھ میں آستین کے اوپر کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی جس کا فریم گھس گھس کر اپنی چمک کھو چکا تھا اور کونوں پر اندر سے اور اس جگہ جہاں چابی بھرنے کی گھنڈی لگی ہوتی ہے کچھ پیلا اور کالا میلا سا رنگ جھانک رہا تھا۔ رام کلی نے اسے پھر اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ گالوں میں ہلکے ہلکے گڈھے ضرور پڑ گئے تھے لیکن اب وہ پورا مرد ہو چکا تھا اور چہرہ سُتا سُتا سا لگ رہا تھا۔

"ارے تو بیجو ہی ہے نا؟" اس نے پوچھا

بیجو مسکرایا "بیجو نہیں تو کون ہوں، تو ہی بتا؟"

اس کی آواز ہونٹوں سے نکلنے کے بجائے اب جیسے گلے سے نکل رہی تھی۔ پکی گہری، بھاری اور پھٹی پھٹی آواز لیکن بات کرنے میں جب اس کے گلے کی نسیں اس طرح ابھریں اور ڈوبیں جس طرح تین سال ادھر ابھرتی ڈوبتی تھیں جب وہ لالہ بیج ناتھ کے ڈھوروں کو باغ کے پچھواڑے سے ان کی حویلی کی طرف ہنکا کر غائب ہو گیا تھا تو اسے ذرا بھی شبہ نہیں رہا تو وہ بالکل بے اختیار ہو گئی اور "ہائے یہ تو بیجو بھیّا ہی ہیں" کہہ کر اس سے لپٹ گئی اور بیجو نے "میری اچھی بہنیا" کہہ کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرا تو اس نے اس خوشی کے موقع پر بھی ذرا سا سر ہلا کر اس کی کلائی پر اس طرح لگا دیا کہ اس کے کان ٹھیک گھڑی پر ٹک گئے۔

"ہائے بیجو یہ تو چل رہی ہے"

وہ بیجو کے تین برس بعد واپس آنے کی خوشی بھی ذرا دیر کے لیے بھول گئی اور یہ سوچ کر ہنسنے لگی، خوش ہونے لگی کہ گھڑی چل رہی ہے، ٹک ٹک کر رہی ہے۔

راموکاکا، چھجّو، نرکی دادا اور دو تین گاؤں کے بچوں پر جب اس کی نظر پڑی تو وہ جیسے ایک دم چونک پڑی اور گھر کے اندر بھاگی۔

"مائی، او مائی، ارے بیجو آیا ہے، بیجو بھیا آئے ہیں"۔

اور قبل اس کے کہ بیجو کی ماں رام دئی جو اندر دالان میں چولھے میں برسات کی سیلی لکڑیاں لکڑی کی پھکنی سے پھونک پھونک کر آگ سلگانے کی کوشش کر رہی تھی میلی دھوتی کے پلّو سے آنسو اور میل بھری آنکھیں پونچھتے باہر نکلے وہ دوڑ کر دوبارہ باہر آ گئی اور بیجو کا ہاتھ پکڑ کے ہوا میں جھلانے لگی۔ اس وقت بھی اس کی نظریں اس ہلتے ہوئے ہاتھ میں بندھی اس کی گھڑی پر ہی لگی ہوئی تھیں۔ اس کے خاندان میں بیجو پہلا مرد تھا جس نے کلائی میں گھڑی باندھی تھی۔

نوازی پور کے اس چھوٹے سے گاؤں میں جہاں زمینداری ختم ہونے کے برسوں بعد بیج ناتھ کی زمینداری قائم رہی تھی کوئی سر اٹھا کر نہیں چل سکتا تھا اور سچ پوچھیے تو کسی کو اس کا خیال بھی نہیں آیا تھا تو پھر ہمت کرنے کا کیا سوال، ڈھائی تین سو کی آبادی کے اس گاؤں میں مشکل سے بیس بائیس کسان ایسے تھے جن کے پاس اپنی زمینیں تھیں اور یہ زمینیں بھی چند بسوؤں سے لے کر زیادہ سے زیادہ دو ڈھائی بیگھے تک تھیں۔

ان میں وہ کیا بوتے، کیا پیدا کرتے، کیا کماتے اور کیا سر اٹھا کر چلتے۔ باقی لوگوں میں کچھ ہریجن تھے، کچھ موچی، کچھ لوہار۔ تین خاندانوں نے دو دو چار چار بھینسیں پال لی تھیں جن کا دودھ بالٹیوں میں بھر کر اور ان بالٹیوں کو سائیکل کے ہینڈل کے دونوں طرف لٹکا کر وہ پاس کے شہر میں روزانہ فروخت کر آتے۔

اس گاؤں کے سارے ہی لوگ کسی نہ کسی طرح لالہ بیج ناتھ کے احسانوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے تھے۔ شادی، غمی، مقدمہ، غرض کون سی مشکل تھی جس میں وہ کام نہ آتے اور اس کے بدلے وہ ان کی زمینوں پر کام کرتے اور انھیں کھانے کے لیے موٹا جھوٹا اناج مل جاتا۔ ان کے لڑکے اس کے یہاں بیگار کرتے، ڈھوروں کو چراتے، جھاڑو دیتے، آم کے باغوں اور پھلواریوں کی رکھوالی کرتے اور لڑکیاں حویلی کے مردانے حقہ بھر کے لے جاتیں، جوتے پر پالش کرنے جاتیں، پیر اور سر دبانے جاتیں۔

اس گاؤں کی زندگی ایک ایسے تالاب کی مانند تھی جس میں پانی ایک مخصوص سطح سے نہ کبھی نیچے جاتا نہ کبھی کناروں سے چھلکتا۔ نہ اس میں کبھی بڑی لہریں اٹھتیں نہ کبھی لہروں کا کوئی بڑا دائرہ ہی بنتا۔ کوئی چھوٹی موٹی کنکری پھینک بھی دیتا تو دو چار دائرے بن جاتے۔ ہفتہ دس دن چوپالوں، کچے مکان کے چھجوں، اور کھیت کی مینڈوں پر اس کے بارے میں باتیں ہوتیں اور پھر دھیرے دھیرے سب کچھ معمول کے مطابق ہو جاتا۔

پانچ سال قبل اس خاموشی اور سناٹے کو سدری نے اس وقت توڑا جب وہ چیخ مار کر حویلی کے مردانے سے بھاگی اور باہر صدر دروازہ پر آ کر اس نے لالہ پر گالیوں کی بوچھار کی، اس کے زندوں مردوں کو وہ سنائیں کہ حویلی میں کام کرنے والے لالہ کے ملازم اس کی بے وقوفی پر افسوس کرنے لگے۔ پھر لالہ دھیرے دھیرے نپے تلے قدم اٹھاتے باہر آئے تو مارے ڈر کے سدری بھی خاموش ہو گئی اور پھس پھس آنسو بہانے لگی۔

لالہ بیج ناتھ نے سدری کے ماں باپ کو بلایا، ان سے دس پندرہ منٹ اکیلے میں بات کی اور جب وہ باہر نکلے تو لوگوں نے ان دونوں کو ہاتھ جوڑ کر لالہ سے کہتے سنا "تمہارا موت ہمیں کا چھنا۔ جو کہیو لالہ ہمیں منجور ہے۔"

دس بارہ دن بعد سدری کی لالہ کے یہاں ڈھوروں کو سانی لگانے والے بھکا سے شادی کر دی گئی اور جب سفید لٹھے کا پاجامہ، شہر میں سلی قمیض، لال موزوں پر بادامی رنگ کا چمکدار جوتا اور پیلے رنگ کا صافہ باندھ کر بھکا منڈپ میں آیا اور سکڑی سمٹی سدری کو اندر سے لایا گیا تو گاؤں والوں نے اس نئے جوڑے سے زیادہ لالہ کو دعائیں دیں۔ پھیروں کے بعد لالہ نے سدری کو دس روپے جہیز اور کھانے کپڑے پر زندگی بھر کے لیے نوکر رکھنے کا اعلان کیا تو گاؤں والوں نے دعاؤں کے اتنے ٹوکرے لالہ کی نذر کیے کہ وہ ان کا بوجھ بھی اٹھا نہ پائے اور احسان سے بھکا کی کمر بھی دہری ہو گئی۔

یہ اور اس طرح کی چند کنکریاں گاؤں کے سکون کے تالاب میں ضرور پھینکی گئی تھیں لیکن، لیکن لالہ نے تو لہروں کو باندھ رکھا تھا، تالاب کی کگاروں کو اتنا اونچا کر رکھا تھا کہ ان کے باہر پانی کے چھلکنے کا امکان ہی نہ تھا۔

لیکن بیچو نے اس سکون پر ایسا زوردار پتھر پھینکا کہ تالاب کی لہریں کگاریں توڑ کر بہہ نکلیں اور پانی کی بوندیں گاؤں کی زبان پر اس طرح پڑیں کہ مہینوں اس واقعہ کا ذکر ہوتا رہا۔

بخار کی وجہ سے جب بیچو کا باپ جگن ناتھ دو دن لالہ کے یہاں کام پر نہ گیا تو لالہ نے کھلیان کے پاس اپنے دو نوکروں سے اس کی اتنی پٹائی کرادی کہ اس نے خون تھوک دیا۔ جگن ناتھ کی بیوی رام دئی اور بیٹی رام کلی نے گڑگڑا کر لالہ سے جگن ناتھ کی غلطی معاف کر دینے کی منتی کی لیکن لالہ کا دل نہ پسیجا اور پٹائی کا سلسلہ اس وقت تک چلتا رہا جب تک دونوں ملازم مارتے مارتے بے دم نہ ہو گئے۔ اس سارے دوران بیچو اکڑوں بیٹھا خاموشی سے اپنے باپ کو پٹتے دیکھتا رہا۔ اس کی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔

اگلے روز شام کو جب لالہ کے ڈھور واپس آئے اور بیچو کے علاوہ ایک بھینس بھی واپس نہ آئی تو اس خاموشی کا راز کھلا۔ تین گاؤں ادھر ڈیڑھ سو روپوں میں بھینس بیچ کر بیچو ایسا غائب ہوا کہ اس کا کوئی پتہ نہ

چل سکا۔ کچھ دنوں بعد لالہ کو یہ تو معلوم ہو گیا کہ بھینس کس کو بیچی گئی ہے لیکن جب وہ اسے واپس کرنے پر تیار نہ ہوا تو انھوں نے زور زبردستی کرنے میں مصلحت نہ سمجھی اور خاموش ہو گئے۔

وہ جانتے تھے کہ اگر بھرٹ کے بھتیجے کو انھوں نے زیادہ چھیڑا اور بھرو لا کو معلوم ہو گیا کہ وہ کاٹ بھی سکتی ہیں تو شہد کی ایک بوند بھی ان کے حلق تک نہ پہونچ پائے گی۔

ایک صبح جب بھینسوں کو سانی نہ ملی اور انھوں نے ڈکارنا شروع کیا تو لالہ کی آنکھ کھل گئی۔ انھوں نے باہر نکل کر دیکھا تو وہاں موت کا سناٹا طاری تھا۔ ایک ایک نوکر کو انھوں نے نام لے لے کر آواز دی لیکن وہاں کوئی ہوتا تو سنتا۔ بچو کا باپ جگن ناتھ ایک کونے میں کھڑا کانپ رہا تھا۔

"سب کہاں مر گئے ہیں" لالہ گرجے

"حجور، حجور ـــ" جگن ناتھ کوشش کرنے کے باوجود اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکا اور ہاتھ جوڑ کر سامنے کھڑا ہو گیا۔

"کیا حجور حجور کر رہا ہے، جا میکو کو بلا کے لا"

میکو گھر پر نہیں ملا۔ معلوم ہوا رات ہی سے کہیں چلا گیا ہے پھر دوسرے نوکر کے یہاں جگن ناتھ کو بھیجا، پھر تیسرے کے یہاں۔ ہر جگہ سے ایک ہی طرح کا جواب ملا۔ کوئی بیمار تھا، کسی کا لڑکا بیمار تھا، کوئی گھر پر تھا ہی نہیں اور بدھو رام کے لڑکے بھگا نے تو صاف صاف کہلا بھیجا کہ اب حکومت نے سارے قرضے معاف کر دیے ہیں لالہ سے کہہ دو کہ ہم آزاد ہو گئے ہیں، نہیں آئیں گے نہیں آئیں گے۔ جو کرنا ہو کر لیں۔

لالہ سناٹے میں آ گئے۔ حالات بدل گئے تھے۔ کسی پر زور زیادتی سے کام نہیں چل سکتا تھا لیکن یہ پچاس گھروں کے برابر حویلی، درجنوں گائے بھینسیں پچاسوں بیگھے زمین جواب بھی ان کے اور ان کے خاندان والوں کے نام تھی بھلا کون دیکھے گا، یہ سارا کاروبار کیسے چلے گا۔

وہ آسانی سے ہار ماننے والے نہ تھے۔

چار دن بعد گاؤں پر پولیس کی دوڑ آئی اور رام پال اور اگنو کو ایک ڈکیتی کے سلسلہ میں پکڑ کر لے گئی۔ تیسرے دن لالہ نے ان دونوں کی ضمانت کر لی اور ان دونوں کے علاوہ ان کے گھروں کے سارے لوگ پھر لالہ کے یہاں کام کرنے لگے۔

بچو کو یہ سب کچھ اپنی ماں رام دئی کے خط سے معلوم ہو چکا تھا جو اس نے رمئی چاچا سے لکھوا کر بھیجا تھا۔ اس خط میں رام دئی نے یہ بھی لکھوایا تھا کہ لالہ کہہ رہے تھے کہ اگر تمہارے پتا جی نے کام چھوڑا تو بھینس کی چوری کی رپٹ لکھوا کر انھیں بھی پھنسوا دیں گے۔ اس لیے ابھی دھیرج رکھو۔ وہیں کام کرتے رہو اور گاؤں کا رخ بھی نہ کرو۔ لیکن بچو کا دل اب گاؤں لوٹنے کے لیے بے چین ہو رہا تھا۔ اسے رام دئی کا خط بھی نہ روک سکا۔ ویسے کانپور کپڑا مل میں نوکری کر کے اب وہ پولیس چوکی جان گیا تھا۔ قانون بھی کچھ کچھ اس کے خیال میں اسے معلوم تھا۔ اخباروں میں چھپنے والی موٹی موٹی خبریں بھی یونین کے کام کرنے والے سارے مزدوروں کے ساتھ اس تک بھی پہونچ چکی تھیں۔ اور سب سے بڑھ کر اس کی ہمت بڑھ چکی تھی۔

لکھنؤ آ کر اس نے بڑے تھانیدار صاحب سے ملاقات کی اور ان کے کہنے پر گاؤں کی ساری کہانی منشی جی کو لکھوا کر اس پر دستخط کر دیے۔ الف کے نام لٹھ بچو کو کانپور میں حاضری رجسٹر اور چھٹے پر انگوٹھا لگانا جب برا لگا تو اس نے اپنا نام لکھنا سیکھ لیا تھا۔

تھوڑی دیر میں اس کے گھر کے باہر سکھیا، مہادیئی، بھگوان دین، رام پال گجریا، بھگو اور بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔

رام دئی نے کہا "بچو۔ بھور اندھیرے میں واپس چلے جانا نہیں تو پولیس ڈکیتی میں پکڑ لے جائے گی"۔

"میں نے سب انتجام کر لیا ہے"۔ بچو نے اطمینان سے کہا اور اپنی جیب سے ناخن پالش، بالوں میں لگانے کے کانٹے اور گھٹیا سی کریم کی شیشی نکال کر اپنی بہن رام کلی کو دے دی اور بھگا کی طرف دیکھ کر بولا

"بھگا چاچا اب پولیس کی دوڑ یہاں نہیں آئے گی، نہیں آئے گی۔ ہم کوئی چور اچکے تو ہیں نہیں۔ زمین کے مالک ہیں مالک اور اب تو گورمنٹ نے بھی ہم کو مالک مان لیا ہے۔

★

دلیر عثمانی

دورِ نو

نظر آنے لگے بھارت میں بربادی کے جب ساماں
پریشاں حال جب دیکھا گیا بھارت کا ہر انساں
رئی یبلک کے مخالف پورا کرنے کو تھے جب ارماں
مسز گاندھی نے سوچا یوں بچالوں گی میں ہندستاں
ایمرجنسی کے باعث ہر طرف خوش باش ہے انساں
مبارک اندرا کو جو ہے بھارت ورش کی نگراں

مقرر ہوگئی بازار میں ہر شے کی پھر قیمت
دکاں والا زیادہ پیسے مانگے یہ نہ تھی ہمّت
چھپالے وہ کسی شے کو نہ اس میں یہ رہی جرأت
ہر اک شے جب ملی سستی غریبوں کو تھی یہ دولت
ایمرجنسی کے باعث ہر طرف خوش باش ہے انساں
مبارک اندرا کو جو ہے بھارت ورش کی نگراں

ایمرجنسی نے کالے دھن کی سب دولت نکلوائی
جو انکم ٹیکس کی باقی رقم تھی وہ بھی دلوائی
ملیں اب بے زمینوں کو زمینیں جو تھیں صحرائی
ہوے بھارت مخالف بند پھر ان کی نہ بن آئی
ایمرجنسی کے باعث ہر طرف خوش باش ہے انساں
مبارک اندرا کو جو ہے بھارت ورش کی نگراں

ہر اک دفتر میں نظم وضبط کا عالم نظر آیا
سزا اس نے بھی پائی دیر سے افسر بھی گر آیا
ٹرین اس نے نہ پائی جو نہ اس کے وقت پر آیا
جو اصلی چال تھی بھارت کی اس پہ ہر بشر آیا
ایمرجنسی کے باعث ہر طرف خوش باش ہے انساں
مبارک اندرا کو جو ہے بھارت ورش کی نگراں

دکھاؤ ایک ایک شعبہ میں ترقی ہے نمایاں اب
دیے الفت کے ہر گھر میں جلے ہیں ہیں فروزاں اب
دوالی سے بھی بڑھ کر ہوگیا ہے یاں چراغاں اب
ہیں سب تائید میں اس کی نہ ہے کوئی پریشاں اب
ایمرجنسی کے باعث ہر طرف خوش باش ہے انساں
مبارک اندرا کو جو ہے بھارت ورش کی نگراں

شاہد جمیل

ناتواں شاخ پہ اب برق کا ڈیرا نہ رہا

(وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کے نام)

اے نئے ہند کی معمار نکونام وطن   اے نئے عزم کی پہچان قدم گنگ وجمن
اے کہ تو عظمتِ اظہارِ حقیقت کی کرن   اے کہ تو باعثِ تجدیدِ تمنا کی لگن
فکرِ نہرو کو شناسائے نظر تو نے کیا
سپنا باپو کا تھا، سا کار مگر تو نے کیا

یوں ہوا تھا کہ ہر اک راستہ معدوم سا تھا   پھول سا چہرۂ معصوم بھی مظلوم سا تھا
حوصلہ ٹوٹتے لمحات سے موسوم سا تھا   جب کہ ہر شخص نئی صبح سے محروم سا تھا
ایسے میں تو نے ہر اک آنکھ کو کرنیں بخشیں
بے صدا لفظ تھے، آواز دی، دھڑکنیں بخشیں

ہر ہتھیلی پہ تھا بے زار لکیروں کا جمود   بڑھنے والے کو زیادہ تھا ٹھہرنا مقصود
صفحۂ فرض سے غائب تھا توجہ کا وجود   خود پرستی ہی ہر اک سمت بنی تھی معبود
یہ گھٹن ختم ہوئی، لائی صبا بوئے سحر
وقت پر آئی 'ایمرجنسی' ضرورت بن کر

بڑھ گئی اور بھی تنویرِ ضوئے آزادی   تیرے اقدام نے کچھ ایسی تجلی بخشی
فرد کو اپنے نئے فرض کی پہچان ہوئی   بس گئی آنکھوں میں تصویر سنہرے کل کی
انگلیاں ہاتھوں کی پاؤں کی بڑھیں اور آگے
تیرے اقدام نے ان کو نئے پھر سے نقشے

دھاندلی ختم ہوئی، ظلم کا پھیرا نہ رہا   ناتواں شاخ پہ اب برق کا ڈیرا نہ رہا
بے بسی کا کہیں اب سایہ گھنیرا نہ رہا   اب کسی ذہن پہ الجھن کا بسیرا نہ رہا
جل گئی شمع نئے زاویے روشن سے ہوے
اُف تری حکمتِ عملی! کہ نئے باب کھلے

آنے والا جو نیا کل ہے وہ روشن ہوگا   پھول سے چہروں پہ آشاؤں کا جوبن ہوگا
بے سہارا نہ کوئی اور نہ نردھن ہوگا   ایک ایک گھر میں مہکتا ہوا آنگن ہوگا

تو نے سمجھا دیا کیسے یہ سفر کرنا ہے
آؤ شاہد! کہ ہمیں مل کے سفر کرنا ہے

ساحل احمد

نہرو اردو شاعری میں

بچپن سے وفات تک ایسے ہزاروں واقعات ہیں جو جواہر لال نہرو کی بردباری، دانشوری، دوربینی، انسان دوستی، اور حق پرستی کو آشکار کرتے ہیں۔ ان کی زندگی عزم و ایثار کا پرتو بن گئی تھی۔ سیاسیات میں ایک بار قدم رکھنے کے بعد ان کی حب الوطنی، قوم پروری اور حریت پسندی نے پھر انھیں پیچھے ہٹنے نہیں دیا۔ اس سلسلے میں انھیں قید و بند کی صعوبتیں، اور سختیاں کو جھیلنا پڑا جنھیں انھوں نے بڑی ثابت قدمی کے ساتھ برداشت کیا۔ وہ ایک عظیم سیاست داں ہی نہیں بلکہ ایک نامور ادیب بھی تھے۔ ان کے کارنامے زندگی کی حقیقتوں اور سچائیوں سے منسلک و منضبط ہیں:

گنگا کا وہ امیں، وہ ہمالہ کا پاسباں،
قدموں میں جس کے اتر آئے دور کی بہار،

سید حرمت الاکرام

ابھرتے حوصلوں کو اعتبار زندگی دے کر
زمیں پر آسمانوں کی بلندی کو جھکایا تھا

خورشید احمد جامی

در در پہ اس نے دستک دی، انگریز کو بڑھ کے للکارا
پارلیمنٹ میں اس کی بیٹھک بھی یا جیل میں اس کا بستر تھا

وقار انبالوی

عمل کی پیہم صداؤں سے قوم کو جگایا
ادھورے خوابوں کی تکمیل کے لیے سب کو بلایا

نصر قریشی

نہرو اپنی پرجوش قیادت کی بنا پر پہلی بار ۶ دسمبر ۱۹۲۱ء کو پرنس آف ویلز کی آمد پر ہڑتال کرانے کے جرم میں گرفتار ہوئے۔ اس کے بعد وہ تقریباً دس بار گرفتار ہوئے اور مجموعی طور پر ۹ سال جیل میں رہے۔ وہ ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم منتخب کیے گئے اور ۱۹۴۷ء سے لے کر ۲۷ مئی ۱۹۶۴ء تک مسلسل اسی عہدہ پر فائز رہے۔ اپنی اعلیٰ صلاحیتوں سے کام لے کر انھوں نے بڑے بڑے مسئلوں کو حل کیا۔ امن و آشتی کے ایک پیامبر کی حیثیت سے انھوں نے عالمی شہرت و عزت حاصل کی:

یہ نکہت آگہی تھا لوگو — نجات کی روشنی تھا لوگو
یہ پھول تھا زندگی کی خوشبو — یہ پھول خود زندگی تھا لوگو

ساغر نظامی

فیض سے اس کے مشرق و مغرب
ہیں شمال و جنوب شیر و شکر

عرش ملسیانی

واماندگانِ شب کو پیامِ سحر دیا
وابستگانِ صبح کو ذوقِ نظر دیا
ناموسِ امن کے لیے خونِ جگر دیا
دامانِ زیست لعل و جواہر سے بھر دیا
ہندوستان میں پیار کی دولت بکھیر دی
سارے جہاں میں پیار کی دولت بکھیر دی

اختر حسن

عظیم انسان دوست نہرو
عظیم فنکار، مصلح عالم
عظیم دانشور زمانہ
وہ عالمی دوستی کا سنگِ بنیاد
وہ صلح اور امن و آشتی کا حسین پیکر

نصر قریشی

نہرو کی زندگی متعدد مرحلوں میں منقسم رہی ہے۔ کبھی انھوں نے جیل کی سختیاں برداشت کیں۔ کبھی اپنے پُر مغز اور حریت افروز تقریروں اور مضامین کے ذریعے بیداری کا درس دیا۔

تلاش ہند (ڈسکوری آف انڈیا) ان کی تاریخ بینی اور تاریخی بصیرت کی آئینہ دار ہے۔ انھوں نے رمز و ایما کے ذریعے ہندوستانی تہذیب و اقدار کی نقشہ کشی کی ہے۔ جس میں بصیرت اور صداقت کے پہلو ممیز ہو گئے ہیں۔ ان کی بڑائی ان کی علمی ذکاوت ذہانت اور انسانیت دوستی میں مستور ہے۔ انھوں نے وطن پرستی کے ضمن میں مقامی سرحدوں کو بھی توڑ دیا تھا۔ ان کی فطرت نوائی نے قدیم و جدید کے تقاضوں کو مرکزیت دی تھی۔ ڈسکوری آف انڈیا میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

"جذبات اور افکار اور ذوق و شوق کی ملی جلی طاقت نے جس کا مجھے ہلکا سا احساس تھا میرے تصورات کو عمل کے میدان میں مہمیز کیا اور پھر عمل کی قوت نے میرے اندر غور و فکر اور عہد حاضر کو سمجھنے کی خواہش پیدا کی۔ اگر کبھی میں محسوس بھی کرتا ہوں کہ میں تو کسی عہد گزشتہ سے وابستہ ہوں تب بھی میرا احساس یہ ہوتا کہ گویا دورِ حاضر کے اندر بھی وہ عہد گزشتہ میری ملکیت ہے۔"

ان کا نصب العین اور نظریۂ حیات اعلا قدروں کا امین تھا۔ انھوں نے اپنی ترقی پسند فطرت کا مظاہرہ بھی کیا۔ اور قدامت پرستوں کی نظر میں معتوب بھی رہے مگر اپنے اندر اپنی متعینہ راہوں سے ڈگمگنے کا احساس انھوں نے کبھی پیدا نہیں ہونے دیا۔ وہ اتحاد کے ایک بڑے داعی کی شکل میں نمودار ہوئے۔ اور اپنی بصیرت کی روشنی میں قدامتی جہالت اور سیاہ بختیوں کا سینہ چاک کیا، تہذیب و تمدن کا بھی تصور وہ نقطۂ اشتراک تھا جس نے انھیں عوام میں محبوب بنا دیا تھا۔ مشعلِ گاندھی کو انھوں نے زندہ و تابندہ رکھا اور ہند جدید کی ایک نیو رکھی جو عالمی امن کے لیے ایک نمونہ بن گئی۔ فیڈریشن آف انڈین چیمبرز آف کامرس اینڈ انڈسٹریز نئی دہلی کے سالانہ اجلاس منعقدہ ۳ مارچ ۱۹۶۰ء میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

"مجھے کسی مذہب یا کسی نظریے کے کٹر پن میں اعتقاد نہیں لیکن میرا یہ عقیدہ ضرور ہے کہ خواہ اسے کوئی مذہب کے نام سے پکارتا ہے یا نہیں، روحانیت انسانی سرشت میں موجود ہے۔ میں انسانی وقار میں اعتقاد رکھتا ہوں۔ میرا یہ عقیدہ ہے کہ ہر فرد کو مساوی مواقع ملنے چاہیئے۔"

اردو شعرا نے ان کی اسی انسانی سرشت کو جو روحانیت سے متعین ہوئی تھی، اپنی نظموں میں نظم کیا ہے:

وہ اہلِ دل، وہ اہلِ نظر جس کی روح میں
سمٹی ہوئی تھی ذرّے کے مانند کائنات

سید حرمت الاکرام

وہ تیرے ذہن کی جودت وہ "عالمی افکار"
بلند کر دیا کردارِ انجمن تو نے،

فضا ابن فیضی

پھول برسائے تھے انگاروں پہ چل کر جس نے
جس کی آواز پہ ہر ملک نے لبیک کہا
جس کو پیغام بر امن و اماں مان لیا

افسر بسوانی

سچائی چارے کا امیں، انسانیت کا پاسباں

دوستی کا دیوتا، پیغمبر امن و اماں
نازشِ ہندوستان، فخرِ زمین و آسماں
شوق لکھنوی

نہرو کا دل روحانیت کا مسکن اور ذہن نئی سیاسی اور سماجی تعبیروں کا خزینہ تھا۔ اپنے دردمند دل، دوربینی اور روشن ضمیری کے سبب وہ عالمی حالات کے نشیب و فراز کو اسی انداز میں دیکھتے اور سوچتے تھے جیسا کہ ملکی حالات کے ضمن میں ان کا وطیرہ اور انداز رہا ہے۔ انھوں نے نوآبادیاتی نظام کی مذمت کی اور بین الاقوامی معاملات میں گہری دلچسپی لی۔ وہ اپنے ملک کی آزادی کی جدوجہد دوسرے غریب اور ترقی پذیر ملکوں کی آزادی سے علاحدہ رکھنا نہیں چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ہندوستان کی آزادی ایشیائی اور افریقی ممالک کی آزادی کے ساتھ ہم رشتہ ہے۔ اسی سلسلے میں انھوں نے ۱۸ مارچ ۱۹۴۶ء کو اخباری نمائندوں کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ:

"ایک ہندوستانی نوجوان کا بازو ایک ایسا طاقتور اور مضبوط بازو ہونا چاہیے جو نہ صرف ہندوستان کی آزادی کے لیے جدوجہد کر سکے، بلکہ ایشیائی آزادی کے لیے بھی جنگ کرنے کے لیے تیار ہو۔"

قوم پرستی اور آزادی کا یہ تصور نہرو کے آفاقی ذہنیت کا پرتو ہے۔ انھوں نے اپنی تقریروں اور مضامین اور مراسلوں کے ذریعے اسی آفاقی فکر کی تبلیغ کی ہے۔ ان کا نظریہ تھا کہ

"قومیت کو ایک دائرے میں محدود نہیں ہونا چاہیے بلکہ ساری دنیا کی فلاح و بہبود اور عالمی امن پر بھی غور و فکر کرنا چاہیے۔"

وہ ظلمتوں کی اداسیوں میں حیاتِ نو کا تبسم
وہ کوہ و صحرا کی خامشی میں چمن کی تہذیب کا ترنم
ساغر نظامی

تھی شخصیت تری پھولوں کی پنکھڑی کا طلسم
حیات و حسن کا ایک پیکرِ جمیل ہے تو
فضا ابن فیضی

یہ واقعہ ہے کہ ایشیا کے ملکوں میں
نہ جانے کتنوں نے ایک تجھ سے زندگی پائی
نازش پرتاب گڈھی

ہر دل کو ارتقا کا جو زینہ بنا دیا
ہر موجِ ابتلا کو سفینہ بنا دیا
تاج قریشی

ہر ایک بے کس و بے زر تری پناہ میں ہے
دلوں کے زخم کا مرہم تری نگاہ میں ہے
سکندر علی وجد

گلاب بن کر مہک رہا ہے ... حسین یادوں کا آئینہ ہے
نصر قریشی

نہرو کی زندگی اپنے اندر ایک وسیع دنیا لیے ہوئے ہے۔ ان سب کا احاطہ کسی ایک مضمون میں ممکن نہیں۔ البتہ دریا کو کوزے میں بند کرنے کی بات آ جائے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی زندگی ایک مجاہد کی زندگی تھی، ایک پارسا کی زندگی تھی، اور ایک سچے قوم پرست کی زندگی تھی۔

ان کی شخصیت میں روشنی اور خوشبو ضم ہو گئی تھی۔ ملک کی مٹی سے، پھول اور سبزے سے، پہاڑوں اور دریاؤں سے، غرض اس کی ہر شے سے عشق تھا۔ گلاب کا پھول ان کی محبت، سبک روی اور نرم گفتاری کا ثبوت ہے۔ گلاب ایک علامت تھا دوستی کا اخلاص کا لیکن وہی گلاب ان کی دائمی خاموشی کے بعد شاعر کے نقطۂ نظر سے

پھول مت دو، مجھے ہونٹوں سے لگانے کے لیے
خار کی طرح مرے دل میں کھٹکتا ہے گلاب
حکیم یوسف حسین خاں

ان کی وفات عالمی اقدار کی وفات تھی۔ ان کی موت روشنی کی موت تھی، ان کی یہ دائمی جدائی انسانیت کے دیوتا کی جدائی تھی، ان کی موت نے نہ صرف ہندوستان کو بلکہ اقوامِ عالم کو افسردہ و غمگین بنا دیا تھا۔ اردو شعرا نے ان کی رفاقت سے محرومی پر جو درد انگیز مراثی

لکھے ہیں وہ شخصی مرثیہ کی اعلیٰ مثالیں ہیں:

سردار جعفری نے ان لفظوں میں ان کی شخصیت اور ان کے کردار کی فضیلت کا اعتراف کیا ہے:

مرے وطن کی زمیں کے اداس آنچل میں
نہ آج رنگ، نہ خوشبو بھری ہوئی ہر دھول
خبر نہیں ہے کہ کس دل جلے کی راکھ ہے یہ
کہ سر جھکائے پہاڑوں نے کبھی کیا ہے قبول
سنا ہے جس کی چتا سے یہ خاک آئی ہے
وہ فصلِ گل کا پیمبر تھا عہدِ نو کا رسول

"راکھ" نہرو کی محبت اور مادرِ گیتی کی اُنسیت کا مظہر ہے۔ وطن کی مٹی سے والہانہ محبت کا نور ہے۔ ان کی وصیت تھی کہ

مری اس راکھ کو سنگم کے پانی میں بہا دینا
کہ اس پانی سے میں بچپن سے الفت کرتا آیا ہوں
مری وابستگی اس سے ابھی تک یونہی قائم ہے
مجھے گنگا پیاری ہے کہ اس کے بہتے پانی میں
مجھے اس دیس کی تہذیب کی تصویر ملتی ہے

مری یہ آرزو ہے جب میں مر جاؤں تو ہم وطنو
چتا کے آتشیں شعلوں میں تم مجھ کو جلا دینا
مرا یہ جسمِ فانی راکھ کا جب ڈھیر ہو جائے
تو خاکستر اڑا دینا وطن کی ان فضاؤں میں
چھڑک دینا اسے کھیتوں میں تاکہ یہ دب جائے
وطن کی پاک مٹی کا جدا ہونے نہ پھر پائے

یوسف ناظم

سلام مچھلی شہری نہرو کی شخصیت کی روشنی ان کی تصنیفات میں ڈھونڈتے ہیں۔

پھر آج ان کے "پرانے خطوط" دیکھتا ہوں
پھر آج ڈھونڈ رہا ہوں میں ان کی تقریریں
تلاشِ ہند کے اوراق پھر الٹتا ہوں

خیال تھا کہ ابھی اس کو سجدہ کر لوں گا
یہ روشنی تو بہرحال میرے گھر کی ہے
تساہلی نے مجھے ہائے کر دیا برباد
کوئی بتاؤ مری روشنی کہاں گم ہے؟
تلاشِ ہند کے اوراق پھر الٹتا ہوں
وہ روشنی تو یہیں تھی، ابھی یہیں ہوگی

فضا ابن فیضی گمشدہ وادی میں ان کھوئی یادوں کو یوں آواز دیتے ہیں:

وہ شیروانی میں الجھا ہوا "گلاب کا پھول"
ترے مذاقِ شگفتہ کی اک علامت تھا
وہی خلوص، وہی سادگی، وہی سوز
ہر اک سے ربطِ وفا تیرا جزوِ فطرت تھا
جو زندگی و حقیقت کا ایک سنگم ہے
تو اس "ثقافت و تہذیب" کی امانت تھا
تری "سماجی بصیرت" تھی "سوشلزم" کی دین
"عوامی قدروں" کا سرمایہ تیری دولت تھا
ترے بغیر ادھورا رہے گا "قومی مشن"
تو میرے دور کی سب سے بڑی ضرورت تھا

ذیل کے اقتباسات شعراء کے وہ احساسات ہیں جن میں نہرو کی محبت اور عقیدت مستور ہے:

پھول رنجیدہ، صبا غمگیں، چمن افسردہ ہے
آج تاباں انجمن کی انجمن افسردہ ہے

غلام ربانی تاباں

ہزار رنگ سے لے اک سبو کی گردش میں
ہزار پیرہن آئے گئے زمانے میں
مگر وہ صندل و گل کا غبارِ کشتِ بہار
ہوا ہے وادیٔ جنت نشاں میں آوارہ
ازل کے ہاتھ سے چھوٹا ہوا حیات کا تیر
وہ کشش جہت کا اسیر

نکل گیا ہے بہت دور جستجو بن کر

مخدوم محی الدین

رات نے ڈس لیا، گل ہو گئے آنسوؤں کے دیے
نیند کم کم سہی، ہر حال میں آجاتی ہے
رام لیلا کا یہ میدان، ہزاروں انساں
پھر وہی چاند سا چہرہ، وہی کندن سی جبیں
پھر وہی دنیں کی باتیں، وہی پردیس کا ذکر

میرہاشم

نسیم صبح چلتی ہے تو ہوتا ہے گماں جیسے
کئی ناکام روحیں دور صحرا میں سسکتی ہیں
مغنی چاک دامن سر بہ زانو ہے
کہ تنہا فرد کا نوحہ بھی مانگے ہے لہو دل کا

بشر نواز

بھارت ماں! تیرے گلشن کا
آج یہ کون سا پھول لٹا ہے
سرخ گلابی پھول لٹا ہے
لگتا ہے اب پیار کی خوشبو
کبھی نہ دھرتی پر پھیلے گی

کنول پرشاد کنول

کارواں بہار ماتم کر
جو امیر بہار تھا نہ رہا

نریش کمار شاد

سچ تو یہ ہے کہ اگر نہرو کے ان مراثی کو یکجا کیا جائے اور ان کا تجزیہ کیا جائے تو ہندستان کی نہ صرف ایک تاریخ مرتب ہو سکتی ہے بلکہ نہرو کی عظمت اور بڑائی کے وہ راز منکشف ہو سکتے ہیں جنھوں نے نہرو کو بین اقوامی شخصیت اور اپنے دور کا ایک معتبر اور عظیم معمار اور آنے والی نسلوں کے لیے روشنی کا مینار بنا دیا۔

★

جے۔ ایم۔ سنہا دھتبر

غزل

عشق کا جوہر جو اس کے دل میں پنہاں کر دیا
خاک کے پتلے کو اس خالق نے انساں کر دیا

یار کی صورت کو میرے دل میں پنہاں کر دیا
عمر بھر کے واسطے ممنون احساں کر دیا

ڈال کر ساقی نے سوئے جام اک نگہہِ فسوں
مے کے ہر قطرہ میں پیدا جوش طوفاں کر دیا

دیکھئے کس کس کو دل کس کس سے الفت کیجئے
مجھ کو اہلِ حسن کی کثرت نے حیراں کر دیا

ہے مری آنکھوں میں وہ اک محشر حسرت نہاں
جس پہ نظریں ڈال دیں اس کو پریشاں کر دیا

آپ کا دیوانہ اس دنیا میں رہتا کس طرح
موت نے آکر بڑی مشکل کو آساں کر دیا

سخت جانی دیکھئے اپنے مریضِ عشق کی
درد کی شدت نے خود سامانِ درماں کر دیا

آپ کیوں کرتے ہیں رہبر راہ مجنوں اختیار
کس لیے عزم طوافِ کوہ ویراں کر دیا

طنز و مزاح

سرور جمال

ہوم سویٹ ہوم

ہمارے گھر کے نام نہاد ڈرائینگ روم میں "ہوم سوئٹ ہوم" کا خوب صورت فریم اس وقت سے آویزاں ہے جبکہ ہم اس کے مفہوم کو سمجھنے سے بالکل کورے تھے لیکن یہ فریم اس وقت بھی مجھے اتنا ہی پیارا لگتا تھا جتنا کہ آج۔ اس وقت ہم فریم کی خوبصورتی پہ جان دیتے تھے اور آج عبارت کی خوب صورتی پہ۔

اب تو اس کا فریم اتنا پرانا ہو گیا ہے جتنا کہ ہمارا گھر اور اس کے شیشے پر اتنی گرد جم چکی ہے جتنی کہ ہمارے گھر کی ہر ایک شے پہ۔ لیکن اگر سچ پوچھیے تو ہمارے گھر کی خوب صورتی اور شان کو بڑھانے میں اس فریم کا بڑا ہاتھ ہے۔ کیونکہ جب گھر میں گھر کے پیارے ہونے کا تحریری ثبوت موجود ہو اس کی خوب صورتی اور جنت مکان ہونے سے کون انکار کر سکتا ہے۔

ہم نے اس فریم کو اتنی بار دیکھا ہے کہ اس کی عبارت شیشے سے اتر کر ہمارے دل پہ نقش ہو چکی ہے۔ اور اس کا مطلب نقش کالحجر سے بھی بڑھ کر ثابت ہو چکا ہے۔ لہٰذا ہمیں اس گھر کے علاوہ کہیں اور اچھا نہیں لگتا۔ کیونکہ دوسری جگہوں پر اور سب کچھ تو مل جاتا ہے لیکن وہ فریم اور اس کی عبارت نہیں ملتی۔ بعض لوگ کتنے بے وقوف ہوتے ہیں کہ گھر کو سجا بنا کر تو رکھتے ہیں لیکن اس کی گواہی دینے والی کوئی ایسی عبارت نہیں لگاتے۔ ایسے احمق بھی بہت پائے جاتے ہیں جو گھر کو پیارا بنانے کے لیے ہمہ تن مصروف رہتے ہیں لیکن کاہلی کا یہ عالم ہے کہ محض یہ فریم نہ لگا کر اس کی وقعت کم کر دیتے ہیں۔

اس طرح ہمیں اپنے پیارے "سائیں بودہ زدہ" گھر سے اتنا پیار ہو گیا ہے کہ اس کے علاوہ کہیں اور رہنے کے لیے سوچ بھی نہیں سکتے۔ اس پیارے گھر میں ایک اکیلی میں ہی تو نہیں رہتی۔ اس میں تقریباً $\frac{3}{4}$ درجن تو ہمارے چھوٹے بڑے بھائی بہن ہیں۔ بھائیوں کی بیویاں اور بہنوں کے شوہر نامدار۔ اور پھر خدا نظر بد سے بچائے ہر ایک کے چیختے چلاتے روتے بلبلاتے پانچ پانچ چھ چھ بچے۔ اس پیارے گھر میں صرف انسانوں سے پیار نہیں کیا جاتا ہے بلکہ جانور بھی اتنے ہی پیارے ہیں۔ اسی لیے گھر میں مرغیاں ہیں، بطخیں ہیں، بکریاں اور کتے بلیاں ہیں۔ کسی کو شوق ہوا تو اس نے کبوتر پال لیے، کسی نے مچھلیاں رکھ چھوڑی ہیں۔ کوئی طوطا پالنے کا شوقین ہے، تو کوئی مینا۔ کمال تو یہ ہے کہ اس گھر میں جانور نہ صرف پالے جاتے ہیں بلکہ ان سے مکمل طور پر مساوات اور بھائی چارہ برتا جاتا ہے۔

اگر بچوں کو صوفہ سیٹوں، مسہریوں اور کرسیوں پہ کودنے پھاندنے اور چھلانگیں لگانے کی پوری آزادی ہے تو ان جانوروں کو بھی ہر جگہ اٹھنے بیٹھنے کی پوری آزادی ہے۔ اگر منے میاں کی مرغی کو بڑے بھیا کے بستر کے گھونسلے

میں بیٹھ کر انڈے دینے کی عادت ہے تو وہ بخوشی وہاں بیٹھ کر نہ صرف انڈے دے سکتی ہے بلکہ باقاعدہ سے کر بچے تک نکال سکتی ہے۔ بکریاں بڑے شوق سے صوفوں پر (جو اب صوفہ کم بیڈ سے زیادہ صوفہ کم جھولا لگتے ہیں) بیٹھ کر جگالی کر سکتی ہیں۔ بطخیں کسی بھی آئے گئے پر گردنیں لمبی کر کے قیں قیں کرتی حملہ آور ہو سکتی ہیں، کتے کسی کو بھی کاٹ کھانے کو دوڑ سکتے ہیں۔ اور طوطے مہمانوں کو میٹھی میٹھی گالیوں سے خوش آمدید کہہ سکتے ہیں۔

اب آپ انصاف کیجیے کہ جس گھر کی کل آبادی خیر سے اتنی ہو کہ جس میں محلے کی آدھی سے زیادہ آبادی سما جائے تو اس کے مکینوں کا جی بھلا کہیں اور کیا لگے گا۔ یہ نہیں کہ اس گھر کے صرف کمرے، برآمدے اور آنگن وغیرہ ہی کسی نہ کسی جاندار کے دم سے آباد ہیں بلکہ اس گھر کا کونہ کونہ اور گوشہ گوشہ تک بھرا پڑا ہے۔ یعنی یہ کہ کسی کونے میں کوڑے کرکٹ کا ڈھیر ہے تو کسی گوشے میں آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام کا نقشہ دکھائی دے رہا ہے، کہیں ردی کاغذ پڑے ہوئے ہیں تو کہیں اخبار کے صفحات پھڑپھڑاتے دکھائی دیتے ہیں۔ غرضیکہ کہنا یہ ہے کہ گھر کے کونے کونے سے پیار و محبت کی بو آتی ہے۔ ایسی کہ اگر کہیں جاؤ تو "ہوم سِک" کا شکار ہو جاؤ۔

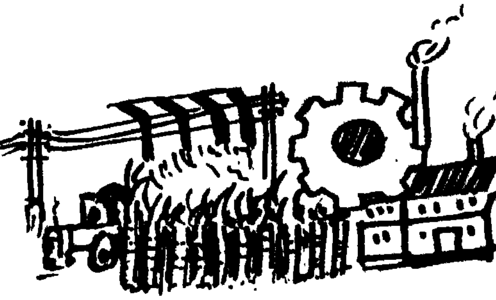
ہمارے گھر کا ایک گوشہ یا حصہ وہ بھی ہے جہاں ہمارے بھائی صاحب معہ بیوی بچوں کے آباد ہیں۔ بھابھی جہیز میں جہاں دنیا بھر کی چیزیں لائیں وہاں "ہوم سویٹ ہوم" کا فریم لانا نہ بھولیں۔ چونکہ ان کا فریم نیا ہے اس لیے اس کی قدریں بھی نئی ہیں۔ ہماری طرح انھیں بھی یہ گھر بڑا پیارا ہے۔ اتنا پیارا کہ اس کو چھوڑنے کا خیال تک دل میں نہیں لا سکتیں کیونکہ پیارا گھر تو رحمتوں کا مسکن ہوتا ہے۔ وہ مسکن جہاں مولا کی رحمت بصورت نزاع رات دن برستی رہتی ہے۔ یوں سمجھیے کہ ان کا گھر "خانہ جنگی" کا بہترین نمونہ ہے۔ صبح ہوئی نہیں کہ ادھر سے آوازیں بلند ہونا شروع ہو گئیں۔

یہ وہ وقت ہوتا ہے جب کہ بچے اپنے اسکولوں کے لیے، مرد دفتروں کے لیے، نوجوان کالج و یونی ورسٹی کے لیے اور گھر کی عورتیں اپنے دن بھر کی گپ شپ کے مسالوں کو اکٹھا کرنے کی تیاریوں میں مصروف ہوا کرتی ہیں۔ عموماً یہ سلسلہ کھانا کھانے وقت نمک کی کمی، زیادتی کے سلسلے میں، یا روٹی کے جل جانے یا چاول کے کچے یا گیلے رہ جانے کی تقریب میں، یا بات آگے بڑھی تو قمیض یا پینٹ کے بٹن غائب ہونے پر یا جوتے کی پالش کی عدم موجودگی پر شروع ہوتا ہے اور کسی برتن کے توڑنے کپڑے کے پھاڑنے یا منے میاں کی پٹائی کے ساتھ چیخ چیخ کر رونے کے تماشے پر ختم ہوتا ہے۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود انھیں اپنے گھر سے پیار ہے۔ اور ہر وقت ان کی زبان پر اپنے گھر کے قصیدے رہتے ہیں۔ ان کو تو جھٹلایا جا سکتا ہے، لیکن اس فریم کو آپ کیسے جھوٹا بنا سکتے ہیں جو بڑے اہتمام سے ان کے گھر پہ ٹنگا ہے۔

تو یہ ہے میرا پیارا گھر، جس کے بغیر ہم ایک پل بھی کہیں نہیں رہ سکتے اور رہیں بھی تو کیسے ہمارا پیارا گھر جو ٹھہرا۔

★



اتر پردیش شاہراہِ ترقی پر

وزیر اعلیٰ کا سیاحت کی مربوط ترقی پر زور ••• خاندانی منصوبہ بندی کے لیے راغب کرنے کے کام میں پردہ کوئی رکاوٹ نہیں ••• ضلع فرخ آباد میں اقلیتی فرقہ کے افراد بڑی تعداد میں نس بندی کے لیے آ رہے ہیں ••• اسلام میں خاندانی منصوبہ بندی کے خلاف کوئی بات نہیں ہے ••• رائے بریلی میں خاندانی منصوبہ بندی اپنانے میں عورتیں مردوں سے آگے ••• شاہجہاں پور میں خاندانی منصوبہ بندی سے متعلق ریلی ••• ضلع مظفر نگر میں خاندانی منصوبہ بندی کے مقررہ نشانے سے ۲۵ زیادہ کام ••• اتر پردیش میں صنعتوں کے لیے سازگار ماحول

اتر پردیش کے اعلا اختیاری سیاحتی بورڈ نے اپنے افتتاحی جلسہ میں فیصلہ کیا کہ وہ ریاست میں سیاحت کی ترقی کے لیے منصوبہ بندی کمیشن کی منظور کردہ ۱۰۵ لاکھ روپیہ کی رقم کے علاوہ پانچویں پنج سالہ منصوبہ کے بقیہ دو برسوں میں زیادہ سے زیادہ ممکن وسائل بروے کار لائے گا۔ ریاست میں سیاحت کی ترقی کے لیے ہریانہ سیاحتی کارپوریشن کے مشاورتی شعبہ کی خدمات حاصل کرنے کا بھی فیصلہ کیا گیا۔

اہم شاہراہوں پر واقع محکمۂ تعمیرات عامہ، محکمۂ جنگلات اور محکمۂ آب پاشی کے بنگلوں کو محکمۂ سیاحت کو منتقل کرنے کا بھی فیصلہ کیا گیا تاکہ سیاحوں کو سڑک کے کنارے دوران سفر سہولتیں مہیا کی جا سکیں۔ یہ بنگلے دہلی۔نینی تال، دہلی۔مسوری، دہلی۔نرورا، الہ آباد، دہلی۔آگرہ شاہراہوں پر واقع ہیں۔ بورڈ نے یہ فیصلہ بھی کیا کہ محکمۂ صحت کے سیاحوں کے لیے مخصوص بنگلے اتر پردیش ریاستی سیاحت ترقی کارپوریشن کو منتقل کر دیے جانا چاہئیں۔ اس کے علاوہ جلسہ میں کچھ دیگر اقدامات کا بھی فیصلہ کیا گیا۔

وزیر اعلا شری نرائن دت تیواری نے جلسہ کی صدارت کرتے ہوئے روزمرہ کے مسائل پر غور کرنے اور فوری فیصلے کرنے کے لیے بورڈ کی ایک مجلس عاملہ کی تشکیل کا اعلان کیا۔

وزیر اعلا نے اس بات کا ذکر کرتے ہوئے کہ اتر پردیش میں سیاحتی، مذہبی اور تاریخی اہمیت کے بکثرت مقامات موجود ہیں، کہا کہ کم سے کم ممکن مدت میں جدید اور سائنسی خطوط پر سیاحت کی صنعت کی ترقی کے لیے مربوط کوششیں کی جانا چاہئیں۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ ریاست میں سیاحوں کی آمد میں اضافہ کرنے کے لیے دستیاب سہولتوں کا بہترین استعمال کیا جانا چاہیے۔

وزیر اعلا نے کہا کہ اگرچہ غیر ملکی سیاحوں کو مائل کرنے کے لیے ہر ممکن کوشش کی جانا چاہیے تاہم ہمیں ملکی سیاحوں کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ ان کے قیام و طعام کے سلسلہ میں تمام ضروری سہولتیں فراہم کی جانا چاہئیں۔

⁂

سید مسلم خاندان کے قدیم روایتی ماحول میں پروردہ ۵۰ سالہ بیگم نور فاطمہ، جو ضلع مظفر نگر کے ایک گاؤں کی واحد خاتون پردھان ہیں، خاندانی منصوبہ بندی کو کوئی ممنوع چیز تصور

نہیں کرتی ہیں۔

صرف اتنا ہی نہیں بلکہ وہ اپنے گاؤں کی عورتوں کے درمیان خاندانی منصوبہ بندی پروگرام کی ایک پرجوش محرک ہیں۔ یہ گاؤں جس کا نام تیوارا ہے، ضلع کے مورنا بلاک میں واقع ہے۔

اپنے گاؤں کے ہر گھر میں خاندانی منصوبہ بندی کا پیغام پہنچانے کے لیے جو امر محرک ہوا وہ ان کے گاؤں کی بڑھتی ہوئی شرح پیدائش ہے۔ انھوں نے یہ انکشاف ایک انٹرویو میں کرتے ہوئے کہا۔ "کہ تقریباً ۲۵ سال پہلے میری شادی کے وقت میرے گاؤں کی آبادی ۲۵۰۰ تھی جو اب بڑھ کر تقریباً ۶۰۰۰ تک پہنچ گئی ہے۔

آبادی میں اضافہ کی اس شرح سے خائف معمر خاتون نے سختی کے ساتھ پردہ کے اپنے خاندانی رواج کی پابندی کرتے ہوئے جرأت سے کام لے کر عورتوں کے درمیان جا کر انھیں ایک چھوٹے خاندان کے فوائد کا قائل کیا اور اسے اپنانے کے لیے انھیں ترغیب دی۔

اپنی کوششوں کے نتائج کا اختصار کے ساتھ ذکر کرتے ہوئے برقع پوش سن رسیدہ خاتون نے انٹرویو لینے والے کو بتایا کہ "عورتیں کچھ کوشش کے بعد یہ بات سمجھ لیتی ہیں کہ اپنے خاندان کو محدود رکھ کر وہ اپنے بچوں کے لیے بہتر کھانا، کپڑا اور تعلیم کا بندوبست کر سکتی ہیں اور خاندانی جائداد کو بہت زیادہ حصوں میں بٹنے سے بچا سکتی ہیں۔ نس بندی آپریشن کے بارے میں ایک بار اپنے غلط اندیشہ دور کرنے کے بعد وہ میری ہمنوا بن جاتی ہیں اور اپنے شوہروں کو نس بندی کرنے کی تاکید کرتی ہیں۔ انھوں نے آخر میں کہا "اب تک گاؤں کے غریب طبقوں کے تقریباً ایک درجن افراد نس بندی کرا چکے ہیں۔"

❖ ❖ ❖

ضلع فرخ آباد میں اقلیتی فرقہ کے افراد چھوٹے خاندان کا اصول اپنانے کے سلسلہ میں دیگر فرقوں پر سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ سماج دشمن اور رجعت پسند عناصر کے گمراہ کن پروپیگنڈہ کے باوجود وہ اتنی بڑی تعداد میں خاندانی منصوبہ بندی اختیار کر رہے ہیں کہ یہ تعداد نس بندی کے ان کے مقررہ کوٹہ سے بھی تجاوز کر گئی ہے۔

راشٹریہ ایکتا پریشد کے زیر اہتمام ۱۸ر جولائی سے منعقدہ چھ غیر سرکاری خاندانی منصوبہ بندی کیمپوں میں ۲۲۰۰ افراد نے نس بندی آپریشن کرائے۔ یہ کیمپ چھبرامئو، کمال گنج، تال گرام، گرسہائے گنج سورکھ اور قنوج میں منعقد کیے گئے تھے جہاں مسلمانوں کی غالب اکثریت ہے۔ اقلیتی فرقہ کے افراد کے لیے ۱۴ فی صد کا کوٹہ مقرر کیا گیا تھا جب کہ یہ کوٹہ ۲۱ فیصد سے بھی تجاوز کر گیا ہے۔

اس موقع پر ان چھ شہروں میں متعدد سیمینار بھی منعقد کیے گئے جن میں مسلم مذہبی رہنماؤں کے اقوال اور رائیں نیز خاندانی منصوبہ بندی کے کتابچوں سے اقتباسات مقامی مسلم لیڈروں نے پڑھ کر سنائے تاکہ مفاد پرست عناصر نے اقلیتی فرقہ میں جو غلط فہمیاں پھیلائی ہیں ان کا ازالہ کیا جا سکے۔

ان غیر سرکاری خاندانی منصوبہ بندی کیمپوں کے مہتمم سید انور جمیل ایڈوکیٹ نے ایک خط میں ریاستی حکومت کو مطلع کیا ہے کہ ماہ رواں کے آخر تک ضلع کے دیگر شہروں میں مزید خاندانی منصوبہ بندی کیمپ شروع کیے جائیں گے۔

❖ ❖ ❖

"میں عالم دین نہیں ہوں لیکن میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اسلام میں خاندانی منصوبہ بندی کے خلاف کوئی بات نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ خاندانی منصوبہ بندی ہماری مستقبل کی خوش حالی کے لیے اشد ضروری ہے۔

وطن دوستی کے یہ خیالات اور یہ مخلصانہ احساسات مشہور مسلم لیڈر شری نفیس الحسن، سابق اسپیکر، یو۔ پی ودھان سبھا، سابق ممبر پارلیمنٹ، سابق چیرمین پبلک سروس کمیشن، سابق وائس چانسلر، کانپور یونیورسٹی اور موجودہ منیجر، اسلامیہ کالج اٹاوہ کے ہیں۔ شری حسن وکالت بھی کرتے ہیں۔

شری نفیس الحسن کے بیان کا مکمل متن حسب ذیل ہے:۔

"آبادی میں زبردست اضافہ کے مسئلہ کا احساس ساری دنیا میں کیا جا رہا ہے اور بیشتر ملکوں نے آبادی میں روک تھام کی واحد تدبیر کے طور پر خاندانی منصوبہ بندی کو اپنایا ہے۔ خود ہمارے ملک میں یہ مسئلہ انتہائی سنگین ہے اور ہماری غذائی پیداوار میں خاطر خواہ اضافہ کے باوجود ہمیں بڑھتی ہوئی آبادی کی غذائی ضروریات کو پوری کرنے کے لیے کروڑوں روپیہ کی مالیت کا غلہ درآمد کرنا پڑتا ہے۔ ایک زمانہ تھا جب کسی ملک کی طاقت کا انحصار اس کی آبادی اور فوج کی کثرت پر تھا لیکن آج اس کا انحصار تعدادی قوت پر نہیں ہے بلکہ پیچیدہ اسلحہ جات اور ان کے استعمال سے واقف تربیت یافتہ افراد پر ہے۔

"تمام والدین چاہتے ہیں کہ ان کے بچوں کو اچھا کھانا اور اچھی تعلیم ملے اور وہ خوش حال رہیں۔ یہ سب باتیں ایک چھوٹے خاندان میں ہی ممکن ہیں۔ یہ بھی سچ ہے کہ ہمیں غریب طبقوں میں زیادہ بچے ملتے ہیں جن میں مسلمان شامل ہیں جو بلا شبہ سماج کے دیگر طبقوں کے مقابلہ میں معاشی اعتبار سے زیادہ کمزور ہیں۔ ان کی معاشی حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہے اور اس کے اس وقت تک سدھرنے کا کوئی امکان نہیں ہے جب تک وہ بھی کنبہ بندی کی افادیت کو نہ سمجھیں اور اپنے خاندانوں کو منصوبہ بند نہ بنائیں۔

"میں عالم دین نہیں ہوں لیکن میں پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اسلام میں خاندانی منصوبہ بندی کے خلاف کوئی بات نہیں ہے۔ میں ایک مسلمان اور ایک ہندستانی یعنی دونوں حیثیتوں سے یہ سمجھتا ہوں کہ ہمارے مستقبل کی خوش حالی کے لیے خاندانی منصوبہ بندی اشد ضروری ہے۔"

* * *

ضلع رائے بریلی کی بہادر اور ترقی پسند خواتین نے یہ تہیہ کر لیا ہے کہ وہ وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی کی منصوبہ بند کنبہ کی اپیل پر لبیک کہنے میں مردوں سے پیچھے نہیں رہیں گی۔ چنانچہ ضلع کے دور دراز علاقوں میں منعقدہ خاندانی منصوبہ بندی کیمپوں میں بھی عورتوں کی تعداد مردوں سے زیادہ ہے۔

اس ضلع میں جسے گزشتہ سال نس بندی کے مقررہ نشانہ کے مقابلہ میں ۱۲۸ فی صد کامیابی حاصل کرنے پر انعام دیا گیا تھا۔ ۲۸ ستمبر تک ۸۸۲۹ نس بندی آپریشن کیے جا چکے تھے اور وہ اس طرح ایک بار پھر مرکز کے مقرر کردہ نشانہ سے تجاوز کر گیا ہے۔

لکھنؤ سے تقریباً ۵۴ کلو میٹر دور کچھراداں میں وزیر غذا رسد و تعمیرات عامہ شری بلدیو سنگھ آریہ نے خاندانی منصوبہ بندی کے ایک روزہ کیمپ کا افتتاح کیا جہاں تقریباً ۵۰ خواتین، جن میں سے بعض کی گود میں پانچ چھ سال تک کی عمر کے بچے تھے، مانع حمل آپریشن کرانے کے لیے آئیں جبکہ صرف پانچ مردوں نے خود کو نس بندی کے لیے پیش کیا۔

اس کیمپ میں ۲۸ ستمبر تک ۳۷۵ افراد کی نس بندی کی گئی جن میں ۳۱۲ خواتین شامل ہیں۔ ان میں سے بیشتر دیہی علاقوں کی تھیں۔ اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے شری آریہ نے خاندانی منصوبہ بندی مہم سے وابستہ کارکنوں سے کہا کہ وہ دیہی علاقوں میں ہر ایک ہل جوڑے تک "چھوٹے کنبہ" کے پیغام کو پہنچائیں۔ انھوں نے کہا کہ گزشتہ برسوں کی ترقی کے فوائد اسی صورت میں حاصل ہو سکتے ہیں جب ہر شخص آبادی میں ہونے والے اضافہ کو روکنے کے لیے خلوص کے ساتھ کوشش کرے۔

* * *

ضلع شاہ جہاں پور میں چھوٹے خاندان کے فوائد کی نشر و اشاعت کرنے کے لیے مختلف قصبوں اور شہروں میں بڑی ریلیوں اور جلوسوں کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔ حال ہی میں جلال آباد میں دس ہزار افراد کی ایک ریلی منعقد کی گئی جس میں بڑی تعداد میں نوجوان کارکنوں، زرعی مزدوروں، شہریوں اور سماجی کارکنوں نے حصہ لیا۔

خدا گنج میں بھی ایک بڑے جلوس اور ریلی کا اہتمام کیا

گیا۔ جلوس میں ہاتھی، گھوڑے، ٹریکٹر اور جھانکیاں وغیرہ شامل تھیں۔ اسی طرح کے جلوسوں اور ریلیوں کا اہتمام ضلع کے دیگر حصوں میں پیش کیا جا رہا ہے۔

⁂

ضلع مظفر نگر کے لیے گزشتہ اگست کے واسطے خاندانی منصوبہ بندی کا جو نشانہ مقرر کیا گیا تھا وہاں اس کے مقابلہ میں ۲۵۰ فی صد زیادہ کام ہوا ہے۔

ضلع میں گزشتہ ۳۱ اگست تک ۴۹۳۳ افراد نس بندی کرا چکے تھے جب کہ ۲۱۱۵ کا نشانہ مقرر کیا گیا تھا۔ اس طرح اس ضلع میں اپریل سے اگست تک مجموعی طور پر ۲۷۲ نس بندی آپریشن کیے گئے۔

اتر پردیش کے وزیر صحت شری پربھو نرائن سنگھ نے ایک جلسہ میں عوام اور خاندانی منصوبہ بندی کے کام سے وابستہ سرکاری اور غیر سرکاری افراد کو مبارک باد دیتے ہوئے کہا "میں اس ضلع میں ان تمام افراد کو ذاتی طور پر مبارک باد دینے کے لیے آیا ہوں جنھوں نے اپنی مربوط کوششوں اور مجموعی کارگزاری سے یہ شاندار نتیجہ برآمد کیا ہے۔"

وزیر موصوف نے چار ڈاکٹروں کو نس بندی آپریشنوں کے سلسلہ میں ان کی نمایاں کارگزاری پر ۵۰۰ روپیہ فی کس کی شرح سے نقد انعام دینے کا اعلان کیا۔ ان ڈاکٹروں میں لیڈی ڈاکٹر (مسنر) کے شرما، سرجن ڈاکٹر ایس سی گپتا، ڈاکٹر بی۔ این شرما اور ڈاکٹر بی۔ پی سنگھ شامل ہیں۔

⁂

چھوٹی صنعتوں کی وزیر شریمتی محسنہ قدوائی نے کہا کہ ریاست میں ہر طرح کی صنعتوں کے قیام کے لیے سازگار ماحول موجود ہے۔ اس وقت بجلی، کوئلہ اور خام مال کافی مقدار میں دستیاب ہے اور متعدد ریاستی کارپوریشن ریاست کے کسی بھی حصہ میں صنعتیں قائم کرنے کے خواہش مند صنعت کاروں کو مالی اور دیگر امداد مہیا کر رہے ہیں۔

شریمتی قدوائی بندکی (ضلع فتح پور) میں مشترکہ زمرہ کے چھوٹے پراجکٹ یو۔ پی ایبکاٹ کی افتتاحی تقریب کی صدارت کر رہی تھیں۔

پسماندہ اضلاع میں چھوٹے پیمانہ کی صنعتوں کے قیام سے متعلق حکومت کی پالیسی کی وضاحت کرتے ہوئے شریمتی قدوائی نے کہا کہ ان اضلاع میں دستیاب مقامی وسائل اور صلاحیتوں کا صحیح استعمال کرنے اور روزگار کے مواقع فراہم کرنے کے ساتھ ہی مراعات اور خصوصی سہولتوں سے فائدہ اٹھانے کا یہ بہترین طریقہ ہے۔

شریمتی قدوائی نے کہا کہ یو۔ پی ایبکاٹ لمیٹڈ میں مجموعی طور پر ۱۷ لاکھ ۳۲ ہزار روپیہ کی سرمایہ کاری کی گئی ہے جس میں سے ڈھائی لاکھ روپیہ شری اے۔ کے سنگھ اور ان کے معاونین نے اور دو لاکھ ۶۰ ہزار روپیہ اتر پردیش کی بنی ہوئی صنعتوں کے کارپوریشن نے لگایا ہے اور بقیہ رقم کا بندوبست اتر پردیش مالیاتی کارپوریشن اور بینک آف بڑودہ نے قرضہ کی شکل میں کیا ہے۔

شریمتی قدوائی نے کہا کہ کسی خاص پراجکٹ کا قیام ہی کافی نہیں ہے بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ بازار میں مسلسل مانگ برقرار رکھنے کے لیے اعلیٰ درجہ کا مال زیادہ مقدار میں تیار ہو۔ انھوں نے کہا کہ اس وارحدہ میں تیار کیے جانے والے سامان میں تولیوں، روئی، پٹی اور گاج وغیرہ کا سب سے بڑا خریدار محکمہ صنعت ہے۔ اس کے علاوہ تیار مال کا کچھ حصہ برآمد بھی کیا جا سکتا ہے۔

★

نقد و تبصرہ

(تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں)

ہم ایک ہیں از عرش ملسیانی، پبلی کیشنز ڈویژن وزارت اطلاعات و نشریات حکومت ہند، پٹیالہ ہاؤس نئی دہلی - ۱۱۰۰۰۱ - صفحات ۲۴۸ - قیمت ۱۰ روپے -

"ہم ایک ہیں" کے مرتب نے قومی یک جہتی کی رنگا رنگی پر اہم مواد دیکھا کہ ہندستان میں پھلنے پھولنے والی لسانی وحدتوں، تہذیبوں اور ثقافتوں کا ایک تاریخی گلدستہ پیش کیا ہے۔ اصل ہندستانیت یہی ہے جو ہماری رنگا رنگ زندگی کی آئینہ دار ہے۔ یہی اس کتاب کا موضوع ہے۔

عرش ملسیانی نے اردو ادب کی غیر مسلم خدمات اور ہندی ادب کی مسلم خدمات، صوفیوں، بھگتوں اور شاعروں کی اخلاقی تعلیم سے قومی یک جہتی کے پہلو کو نمایاں کیا ہے۔ گوتم بدھ، کبیر، نانک، گورو ارجن دیو، گورو گوبند، نام دیو، تکا رام، میرا بائی اور عزیب داس سے لے کر خواجہ غریب نواز، بابا فرید، امیر خسرو، سرمد، نظیر اور رسکھان تک کے ارشادات، تعلیمات اور کلام سے اپنے موضوع کو چمکانے میں مدد لی ہے۔ تاکہ ہندستانی زندگی کے زیادہ سے زیادہ پہلو اس روشنی میں سامنے آ سکیں۔

انھوں نے اس کے تاریخی اور ثقافتی پس منظر پر بحث کی ہے۔ اس سلسلے میں اردو کی عظیم الشان خدمات کا جائزہ لیا ہے۔ موسیقی، مصوری، فن تعمیر، مذہبی اور تہذیبی اجتماعات کے ثقافتی پہلوؤں میں اس کی بڑی تلاش کی ہے۔ فرقہ پرستی ایک فریب ہے جس کے دام میں ہمارے مشترک دشمن یعنی غیر ملکی سامراج نے ہمیں پھنسا دیا ہے۔ جس سے نکلنے ہی میں ہماری کامیابی، ترقی اور خوشحالی ہے۔

شمال میں کوشل اور مگدھ کی حکومت (تقریباً ایک ہزار قبل مسیح) سے ۱۹۶۱ء تک کا ایک تاریخی جائزہ مرتب نے لیا ہے۔ خواہ حکمرانی ہو یا ملک گیری، تخت اور دربار نے رعایا کو ایک نظر سے دیکھا۔ فلسفہ و اخلاق مختلف تحریکات و تخصیصات کی شکل میں ابھرا ابھر کر قومی یک جہتی کے دھارے کو تیز تر کرتا رہا۔ مذاہب، سچائی نیکی اور عبادت کے ذریعہ اس جذبے کو ابھار کر صلح، آشتی اور یک جہتی کو فروغ دیتے رہے۔

ہندو مذہب، فلسفہ اور سنسکرت میں مسلمانوں کی گہری دلچسپی اور سنسکرت کے عظیم شہ پاروں کی اردو میں منتقلی کا بھی کتاب میں جائزہ لیا گیا ہے۔

کتاب میں اکابرین ہند کے حوالوں اور ان کی تقاریر کے اقتباسات سے بھی یہ پہلو ابھارنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس کتاب کی تیاری میں تقریباً پچاس کتب سے مدد لی گئی ہے۔

عرش ملسیانی صاحب مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے قومی یک جہتی کے موضوع کو اتنی شرح و بسط کے ساتھ پیش کیا ہے۔ انھوں نے موضوع کو اتنا پھیلا دیا ہے کہ اسلوب کی شگفتگی برقرار نہ رہ سکی کہیں کہیں تاریخی حقائق کی ترتیب بھی متاثر ہوگئی ہے تکرار سے بھی دامن نہ بچا سکے اس کے باوجود "ہم ایک ہیں" اتنی اچھی پیشکش ہے کہ ہر پڑھنے والے کے لیے دلچسپ و مفید ثابت ہوگی اور اس کی معلومات میں خوشگوار اضافہ ہوگا۔

— احمد جمال پاشا

غنچہ و گل (مجموعہ کلام) نثار عباسی - قیمت ۳ روپے ۵۰ پیسے
ملنے کا پتہ: عمران پبلی کیشنز ۳۱ - دائرہ شاہ اجمل - الہ آباد -

غنچہ و گل نثار عباسی صاحب کی کم و بیش پچاس طبع زاد اور ترجمہ شدہ نظموں کا خوبصورت مجموعہ ہے جس کا پیش لفظ مرحوم ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب نے تحریر کیا تھا۔ نثار عباسی صاحب نے بڑی لگن اور خلوص کے ساتھ ان چھوٹی چھوٹی خوبصورت اور سبق آموز نظموں کو تخلیق کیا ہے جو بچوں کے ادب میں یقیناً ایک خاص اہمیت کی حامل ہیں۔ مولانا اسمٰعیل میرٹھی، حامد اللہ افسر، محشر بدایونی اور شفیع الدین نیر کی روایت کو آگے بڑھانے میں غنچہ و گل کے شاعر کو شامل کیا جا سکتا ہے۔ ان کی زبان نہایت سلیس، بامحاورہ، صاف اور سلجھی ہوئی ہے۔ ترجمہ میں بھی عباسی صاحب نے زبان و بیان کا خاص خیال رکھا ہے جو بچوں کی نفسیات کے عین مطابق ہے۔ طبع زاد نظموں کے علاوہ ورڈسورتھ، شیکسپیئر، جے۔ ایل۔ ہنٹ، آر۔ ڈبلیو۔ ایمرسن، ٹینی سن، مسز ہمینز، ایڈورڈ لیر، کا ڈبلیو۔ ڈی ڈی اور ایس۔ ٹی۔ کولرج کی منظومات کے تراجم قابل داد ہیں۔ زیر تبصرہ مجموعہ بچوں کے ادب کے لیے ایک فال نیک ہے۔

— ساغر مہدی

مخدوم علی مہائمی از مولانا عبد الرحمٰن صاحب پرواز اصلاحی، صفحات ۲۱۲ قیمت ۱۶ روپے، ناشر: نقش کوکن پبلی کیشنز، ۱۴۴ جیل روڈ، ڈونگری، بمبئی

ہندستانی علما میں مخدوم علی مہائمی اپنی علمی خدمات کے لحاظ سے بہت ممتاز مقام کے مالک گزرے ہیں، مولانا عبد الحی حسنی مصنف "یاد ایام" کا خیال ہے کہ ہندستان کے ہزار سالہ دور میں شاہ ولی اللہ دہلوی کے سوا حقائق نگاری میں ان کا کوئی نظیر نہیں ......

مخدوم صاحب کی دقت نظر کا اندازہ ان کے ایک رسالے سے بھی ہوتا ہے جس میں انھوں نے سورہ بقرہ کی پہلی آیت کے اعراب کی صورتیں ۱۶ لاکھ ۱۱ ہزار ۶ سو ۴۴ کی تعداد میں بتائی ہیں۔ اس رسالے کے علاوہ بھی فقہ و تصوف اور اسرار شریعت میں آپ کی کئی کتابیں ہیں جن میں عربی میں قرآن کی تفسیر تبصیر الرحمٰن و تیسیر المنان اب تک بعض مدارس کے نصاب اور علما کے مطالعہ میں رہتی ہے۔ مخدوم صاحب ہندستان کے چند اولین مفسروں میں ہیں انھوں نے اپنی تفسیر میں آیتوں اور سورتوں کے درمیان ربط و مناسبت کو خاص طور پر موضوع بنا لیا ہے اور قرآن کو مربوط کلام ثابت کیا ہے اور اس اعجاز سے پردہ اٹھایا ہے، ہر سورہ کی وجہ تسمیہ، موضوع کی نشاندہی اور حروف مقطعات کی تشریح بھی اہمیت کی حامل بحثیں ہیں جو اس تفسیر میں آتی ہیں۔ صاحب سوانح نے بڑے اچھے ڈھنگ سے مخدوم صاحب کی سیرت جمع کر دی ہے اور جدید و قدیم ماخذ سے استفادہ کیا ہے۔ ابن عربی کے وحدۃ الوجود کی تشریح و تفصیل اس کتاب کا خاص مضمون ہے جس سے اس کی علمی قدر و قیمت میں اضافہ ہو گیا ہے۔

البتہ سوانح و حالات کے حصے میں تشنگی محسوس ہوتی ہے اور مخدوم صاحب کی کتابوں کے تعارف میں صفحات کی تعداد واضح نہیں ہوتی جس سے یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ کتاب ہے یا رسالہ؟ بہ حیثیت مجموعی کتاب ہر صاحب علم کے پڑھنے کی چیز ہے۔

(شمس تبریز خاں)

جلد ۳۴ نمبر ۹

دسمبر ۱۹۷۶ء

ایڈیٹر: خورشید احمد

جوائنٹ ایڈیٹر: امیر احمد صدیقی

★

پبلشر: یوگیندر نرائن

ڈائرکٹر محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ اترپردیش

پرنٹر: اشوک در

سپرنٹنڈنٹ پرنٹنگ و اسٹیشنری، یوپی
مطبوعہ گورنمنٹ پریس عیش باغ لکھنؤ

شائع کردہ محکمۂ اطلاعات و رابطۂ عامہ۔ اترپردیش

قیمت فی شمارہ: پچاس پیسے
زرِ سالانہ: پانچ روپے

ترسیلِ زر کا پتہ: سپرنٹنڈنٹ پبلک پبلی کیشن، پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو۔پی۔ لکھنؤ

خط و کتابت کا پتہ: ایڈیٹر نیا دور پوسٹ باکس نمبر ۱۴۶۔ لکھنؤ

[illegible] ایڈیٹر نیا دور [illegible] پبلک ریلیشنز ڈپارٹمنٹ یو۔پی۔ لکھنؤ

عنوانات

اپنی بات

دسمبر کے ساتھ عیسوی کلینڈر کا ایک اور سال ختم ہو رہا ہے اور ہم ۱۹۷۷ء میں قدم رکھنے جا رہے ہیں۔ ہماری ریاست اتر پردیش نے وزیر اعلیٰ جناب نرائن دت تیواری کی زیر قیادت ۱۹۷۶ء میں ہر شعبۂ حیات میں جو نمایاں ترقی کی ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔ اتر پردیش جیسی بڑی ریاست کے لیے یہ کوئی معمولی کارنامہ نہیں ہے کہ صرف ایک سال کی قلیل مدت میں بجلی سے متعلق تمام مسائل حل ہی نہیں ہو گئے ہیں بلکہ اس کی ضرورت سے زیادہ بجلی پیدا ہونے لگی ہے۔ اس کے علاوہ کسی ریاست کے لیے یہ بھی ایک بڑا کارنامہ ہے کہ اتنی کم مدت میں غذائی پیداوار کا مسئلہ حل ہو جائے اور وہ وافر زرعی پیداوار والی ریاست بن جائے۔ ریاستی حکومت کے نئے پروگراموں سے خاص طور پر اقوام و قبائل مندرجہ فہرست کو فائدہ پہنچا ہے۔ موجودہ حکومت وہ پہلی حکومت ہے جس نے حکومت ہند کے طرز پر ایک اقوام و قبائل مندرجہ فہرست کمشنر مقرر کیا ہے۔ ملک بھر میں یہ پہلی ریاست بھی ہے جس نے نجی زمرے میں بھی اقوام قبائل مندرجہ فہرست کے لیے اسامیاں محفوظ کی ہیں۔ حکومت نے ان لوگوں کو رعایتی شرحوں پر قرضے دینے کے لیے ایک کارپوریشن قائم کیا ہے۔ سماج کے کمزور طبقوں کی فلاح و بہبود کے لیے انھیں زمین، تعمیر مکانات کے لیے قطعات آراضی اور ضروری ساز و سامان کے ساتھ ساتھ مالی امداد بھی فراہم کی جا رہی ہے تاکہ وہ خود کفیل ہو کر سماجی اور معاشی زندگی میں اپنے لیے بہتر سے بہتر جگہ بنا سکیں۔ اب تک ۷ لاکھ ہیکٹر فاضل زمین ۱۹ لاکھ سے زائد بے زمینوں کو دی جا چکی ہے۔ ان میں سے تقریباً ۱۲ لاکھ افراد اقوام و قبائل مندرجہ فہرست سے تعلق رکھتے ہیں۔ نئے زمین پانے والوں کو نہ صرف مالی امداد دی گئی بلکہ انھیں تین سال تک مالگذاری کی ادائیگی سے مستثنیٰ بھی کر دیا گیا۔ زرعی مزدوروں کے مفاد کے پیش نظر کم سے کم اجرتوں پر نظر ثانی کر کے ان میں اضافہ کیا گیا اور مقررہ شرحوں سے کم اجرت دینے کو ایک جرم قرار دیا گیا۔ کمزور طبقوں پر ظلم اور زیادتی کرنے والوں کے خلاف سخت سے سخت کارروائی کی گئی ہے۔ ان لوگوں کے مفاد کے تحفظ کے لیے ضلع مجسٹریٹوں اور پولیس حکام کو ذاتی طور پر ذمے دار قرار دیا گیا ہے۔ شہری علاقوں میں پہلی بار زمین کو سماجی ملکیت بنانے کا کام بھی شروع کیا گیا۔ ریاست کے ۱۲ شہری علاقوں میں شہری زمین (حد بندی و ضابطہ) قانون نافذ کیا جا چکا ہے اور دیگر ۱۰ علاقوں میں اس کی توسیع کی تجویز ہے۔ اتر پردیش میں اس سال ربیع میں ۱۲۰ لاکھ ٹن کی ریکارڈ پیداوار ہوئی۔ اس کے علاوہ ۵۵ لاکھ ٹن کی خریف کی توقع پیداوار کے پیش نظر امید کی جاتی ہے کہ موجودہ خریف کے دوران پیداوار کا موجودہ ریکارڈ برقرار رہے گا۔ اس کامیابی میں آبپاشی نے زبردست رول ادا کیا ہے۔ کسانوں کو آبپاشی کے لیے ریکارڈ سہولتیں مہیا کی گئیں۔ ریاست میں ایک لاکھ ۲۸ ہزار ہیکٹر رقبے کے سالانہ اوسط کے مقابلے میں پانچ لاکھ ۸۰ ہزار ہیکٹر رقبے کی آبپاشی صلاحیت پیدا کی گئی۔ زرعی پیداوار کی خرید و فروخت کے سلسلے میں ۱۷٫۰۱ لاکھ ٹن غلہ خریدا جا چکا ہے جبکہ ۱۲ لاکھ ٹن کا نشانہ مقرر کیا گیا تھا۔

بجلی کی پیداواری صلاحیت جو ۱۹۷۵ء میں ۱۹۵۰ میگاواٹ تھی، اب بڑھ کر ۲۳۱۵ میگاواٹ ہو گئی ہے۔ ضلع مرزاپور میں پیپری تھرمل اسٹیشن قائم کر کے اتر پردیش نے بجلی کے زمرے میں ایک اور امتیازی قدم اٹھایا ہے۔ اس کے ذریعے اتر پردیش کے علاوہ مدھیہ پردیش کو بھی زرعی اور صنعتی کاموں کے لیے مزید بجلی فراہم ہونے لگے گی۔ بجلی کی وافر فراہمی اور صنعت کاروں کے لیے تمام ضروری وسائل کے بندوبست سے ہماری ریاست میں صنعتی ترقی کے لیے بہت ہی سازگار ماحول پیدا ہو گیا ہے۔ موجودہ ۵۹ صنعتی بستیوں میں ۱۱۰ کروڑ روپے کی لاگت سے نئے صنعتی وحدے قائم کیے جا رہے ہیں۔ دادھلا میں ایک عظیم کمپلکس بہت تیزی کے ساتھ معرض وجود میں آ رہا ہے۔ نئے صنعتی پراجکٹ جن پر حال ہی میں کام شروع کیا گیا ہے ان میں کیرا سیمنٹ فیکٹری، ۲۵ شکر ملیں اور ۳۰ کتائی ملیں شامل ہیں۔ ان حقائق سے ۱۹۷۶ء میں زبردست صنعتی سرگرمیوں کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک جامع ہینڈلوم اسکیم بھی تیار کی گئی ہے جس کے تحت بنکروں کو ۱۰ ہزار کرگھوں پر تربیت دی جائے گی۔ حکومت طلبا اور نوجوانوں کے مفاد کے تحفظ میں گہری دلچسپی لے رہی ہے۔ تعلیمی اداروں میں ضبط و نظم کا ایک نیا ماحول پیدا ہو گیا ہے۔ نوجوانوں کی فلاح و بہبود کے لیے ایک محکمہ بھی قائم کیا جا چکا ہے۔ تقریباً تمام کالجوں میں "کتب بنک" قائم ہو چکے ہیں۔ اور پہلے سے پانچویں کلاس تک کے ۴۴۰۰۰۰ طلبا کو مفت کتابیں مہیا کی گئی ہیں۔ صارفین کو مناسب قیمت پر ضروری اشیا فراہم کرنے کے لیے بھی ٹھوس اقدامات کیے گئے جن کے نتیجے میں ان کی قیمتیں ۱۰ سے ۴۰ فیصد کم ہو گئیں۔ موجودہ حکومت کے نظم و نسق سنبھالنے کے بعد سے ریاست میں امن و امان کی صورت حال بہتر ہو گئی ہے اور ہر قسم کے جرائم میں نمایاں کمی ہوئی ہے۔ پولیس مشینری کو ایک موثر فورس میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ خاندانی منصوبہ بندی جو ملک و قوم کے لیے زندگی اور موت کا سوال ہے، اس کے سلسلے میں ریاست کے لیے مرکز کے مقرر کردہ ۴ لاکھ کے نشانے کو پار کر کے ایک ریکارڈ کامیابی حاصل کی ہے۔ ۳۲ء۶ لاکھ افراد کی نس بندی ہو چکی ہے اور اب حکومت نے اپنے طور پر ریاست کے لیے ۱۵ لاکھ نس بندیوں کا جو نشانہ مقرر کیا ہے اسے پورا کر کے ایک نیا ریکارڈ قائم کر دینے کے لیے ہر طرح کوشاں ہے۔ ترقیاتی کاموں اور کامیابیوں کے جو اعداد و شمار سطور بالا میں دیے گئے ہیں وہ ظاہر ہے کہ ان سطور کو ضبط تحریر میں لانے کے ٹھیک پہلے تک کے نہیں ہو سکتے۔ لیکن ان سے یہ اندازہ تو ہو ہی جاتا ہے کہ بعض قدرتی آفتوں مثلاً سیلاب کے باوجود ہماری ریاست اتر پردیش نے ۱۹۷۶ء میں ہر شعبۂ حیات میں کس تیزی سے ترقی کی ہے اور کامیابیوں کا ایک نیا ریکارڈ قائم کیا ہے۔

ــــــ ایڈیٹر

وہ منزل ابھی نہیں آئی

نازش پرتاپ گڑھی

نظر نظر میں لیے شمع جلوہ بار، چلو — بہت قریب ہے اب خیمۂ بہار، چلو
ابھی سے پاؤں کے زخموں کی بات کیوں کیجیے — ابھی ملیں گے ہزاروں ہی خار زار، چلو
ابھی سے خرمنِ ہستی کی فکر کیا کیجیے — ابھی تو ہو گی فضا اور شعلہ بار، چلو
بڑھا ہے پنجۂ وحشت، بہت ہی شغلِ جنوں — مگر لیے ہوئے دامانِ تار تار، چلو
ہزار راہِ طلب ہے سیاہ رنگ مگر — تمھارے ساتھ چلے گا جمالِ یار، چلو
چھپاؤں دل میں اک اک زخم اپنے سینو کا — بھلا کے سارے ستم ہائے روزگار، چلو
یہ وہ گھڑی ہے کہ جس کا شمار کل ہوگا — یہ وقت وہ ہے کہ بن کر پیامِ یار، چلو
اٹھو، صدا کی طرح تم نشاطِ جاں کے لیے — سکونِ دل کے لیے ہو کے بے قرار، چلو
دیارِ امن و اماں کے سفیر ہو تم ہی — تمھیں ہو شہرِ اخوت کے تاجدار، چلو
سکوتِ شب میں ضروری ہے میرے ہم سفرو! — چلو تو ساز بہ دست اور نغمہ بار، چلو
قریبِ ختم ہے اب نفرتوں کی مکّاری — شروع ہوگا محبت کا کاروبار، چلو
قدم قدم پہ کھلاتے ہوئے ہزار چمن — مثالِ بادِ صبا، موجۂ بہار، چلو
نفس نفس میں بسائے ہوئے غرورِ جنوں — چلو عزیزو! سوئے جلوہ گاہِ یار، چلو
صدائیں دیتا ہے تم کو مؤرخِ فردا — پکارتی ہے سحر تم کو بار بار، چلو
تمھارے ساتھ ہے منزل شناس راہ نما — الگ ہوئے ہیں رفیقانِ کم عیار، چلو

طلب کی راہ میں رکنا حرام ہے یارو!
چلے چلو کہ سفر نا تمام ہے یارو

فخر الکریم صدیقی

احتشام حسین اور مولانا حالی

بیسویں صدی کی تیسری دہائی سے جن لوگوں نے اردو تنقید کی سطح کو بلند کرنا شروع کیا ان میں کچھ تو وہ لوگ تھے جو قدیم راستوں سے تحقیق کے نئے راستے دریافت کر کے تنقید کو اسی طرف لے چلے لیکن کچھ لوگ جو مغرب کے بدلتے ہوئے معیار اور حالی کی روایتوں کے قائل تھے انھوں نے تنقید کا وہ رخ اختیار کر لیا جس نے ادب کا محاسبہ تاریخی اور سماجی راستوں سے ان فکری سمتوں کو نظر میں رکھ کر کیا جس سے ادیب کے ذہن کی ایسی پرتیں کھلتی ہیں جہاں تخلیق اپنی پہلی شکل میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ ان باتوں کا احساس بہت تیز ہو گیا تھا کہ کسی تخلیق میں ادیب کی انفرادی فکری کاوشوں کے ساتھ ساتھ اس کے گرد و پیش کے عوامل کا کیا ہاتھ ہوتا ہے۔؟ ذہن کے مختلف پردوں میں فکر اور ماحول کے کون سے اثرات کام کرتے رہتے ہیں! تخلیق کسی مقصد سے ہوتی ہے یا اس کا کوئی مطلب نہیں ہوتا۔ وہ محض تفنن طبع کے لیے ہے یا اس سے کسی زندگی کا شعور ملتا ہے۔

احتشام حسین تنقید کے میدان میں ایسے ہی شعور کے حامل تھے۔ جنھوں نے تنقید کے اسی راستے کو پسند کیا جو حالی کا راستہ تھا۔ ایک طرح سے احتشام حسین کی تنقیدی نگارشات کو حالی کے طرزِ فکر کا پھیلاؤ سمجھنا چاہیے۔

مقدمۂ شعر و شاعری میں جو باتیں مختصر طور سے اشاروں میں بیان کی گئی ہیں اس کی توسیع ہمیں احتشام حسین کی تنقیدوں میں ملتی ہے۔ شاعری اور سوسائٹی کا کیا رشتہ ہے؟ اچھا یا برا شعر کیا ہے؟۔ شعر میں کن کن باتوں کا ہونا اس کو فکری طور پر پُراثر بناتا ہے۔ یہی وہ نظریاتی باتیں ہیں جن کے بغیر اردو تنقید نظریاتی مباحث سے دور رہ جاتی ہے۔ احتشام حسین کے مضامین اسی کمی کو پورا کرتے ہیں جو حالی کے مقدمۂ شعر و شاعری میں تشنہ رہ گئی تھی۔ جگر کی شاعری اور محرکات، اردو نظم کا تاریخی اور فنی ارتقا، مجاز، فکر و فن کا چند پہلو، ادب اور افادیت، تنقید اور ادبی اور غیر ادبی قدریں، غالب کا تفکر، اقبال کی رجائیت کا تجزیہ، تنقید اور عملی تنقید، نیا ادب اور ترقی پسند ادب، جدید اردو شاعری اور سماجی کشمکش، یہ تمام ایسے مضامین ہیں جن میں ان نظریاتی مباحث کو پیش کیا گیا ہے جو مقدمۂ شعر و شاعری میں تفصیل سے نہیں اٹھائی گئی تھیں۔ لیکن اس سے یہ مطلب نہیں نکالنا چاہیے کہ احتشام حسین کی تنقید اپنا کوئی مزاج نہیں رکھتی۔ اور ایسا ہو بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ نئے سماجی علوم، سائنسی ترقیاں اور تاریخ کے بدلتے ہوئے امکانات پر نظر رکھنے والے کے لیے جو وقت سماج اور تاریخ کے تقاضوں کو سمجھتا ہے اس کے لیے ایک نئی جہت پیش کرتے تھے۔ ترقی پسند ادب اور تحریک نے ان تمام عناصر کو یکجا کر کے تمام ان ادیبوں کے ذہن میں وہ مواد فراہم کیا جو اس سے اثر لینے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ احتشام حسین نے وقت کے ان تقاضوں کو سمجھا اور ان پر اپنی تنقیدی صلاحیتوں کو صرف کیا۔

احتشام حسین اپنے تنقیدی نظریات کو وضاحت، استدلال آہنگ اور مسائل کو ادبی اور سائنٹفک طریقوں سے حل کر کے

اس طرح ذہن نشین کراتے ہیں کہ بحث کا کوئی ایسا پہلو تشنہ نہیں رہ جاتا جس سے پڑھنے والے کے ذہن میں کسی طرح کی خلش باقی رہ جائے اور یہ دلائل، تاریخ، عہد اور ان معاشرتی حالات کو ذہن میں رکھ کر پیش کیے جاتے ہیں جو کسی ادیب یا اس کے فکر کو پوری طرح سے احاطہ کر لیتی ہیں۔ غالب کے سلسلے میں ایک خیال یوں پیش کرتے ہیں۔

"مغل دور کی تہذیب صرف ہندستان کی تاریخ میں نہیں بلکہ تاریخ عالم میں اہمیت رکھتی ہے۔ اس کی تخلیقی قوتیں، تعمیری صلاحیتیں، موسیقی، شعر و ادب، مصوری اور منظم مرکزی حکومت کی شکل میں ظاہر ہوئی تھیں۔ عروج کے زمانہ میں ہر گوشہ بساطِ دامانِ باغبان و کفِ گل فروش رہ چکا تھا۔ تعیش کی لاتعداد صورتیں فرصت نے پیدا کی تھیں اور جس طبقے کا غالب سے تعلق تھا وہ نشاطِ زندگی سے بہرہ ور تھا لیکن جب حالات بدل گئے تو یہ احساس ہوا کہ وہ دور مٹ رہا تھا اور اسے پھر سے زندہ کرنا ناممکن تھا۔"

اس یقین کا احساس ان کے یہاں ہے کہ اب وہ عیش رفتہ آنے والا نہیں۔ یہ یقین بار بار مختلف اشعار میں ظاہر ہوا ہے۔

گھر ہمارا جو نہ روتے تو بھی ویراں ہوتا
بحر اگر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

میری تعمیر میں مضمر ہے ایک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

"تعمیر اور تخریب کا یہ نیم جدلیاتی تصور زبردست مشاہدہ کا نتیجہ کہا جا سکتا ہے۔"

دوسری مثال بھی ملاحظہ کیجئے:

"نظریے شعر و ادب پر لکھنے اور جانچنے ہی کے دوران پیدا ہوتے ہیں اور کہیں سے بن کر نہیں آتے۔ اس لیے تنقید اور تخلیق میں بہت زیادہ فرق کرنا مناسب نہیں ہے۔ ادبی جائزہ ادیب کو اپنی کاوشوں کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے اور ادب کے حسن کو دوبالا کرتا ہے۔"

احتشام حسین کی یہ تحریریں بتاتی ہیں کہ وہ حالی کے طریق استدلال اور ادبی نظریات سے کتنے قریب تھے۔ باتوں کو سمجھانے پیش کرنے اور پھر ان پر تفصیلی بحث کرنے کا ڈھنگ اگرچہ حالی سے قریب ہو کر گزرتا ہے لیکن تجزیے میں ان سے بہت آگے بڑھ جاتا ہے۔ احتشام حسین نے جہاں عملی تنقیدیں پیش کی ہیں وہاں بھی ان کی بحث کا دائرہ ان ہی سماجی، تاریخی، اور کسی حد تک شاعر اور ادیب کی نفسیات کو نظر میں رکھ کر پیش کیا گیا ہے۔ وہ حالی سے کس حد تک متاثر تھے، اس کا خود انھوں نے کہیں اعتراف نہیں کیا لیکن اس میں کوئی دو رائیں نہیں ہیں کہ حالی ان کے پسندیدہ نقاد تھے۔ تقریباً ان کے تمام مجموعوں میں حالی سے متعلق یا تو بحث ملتی ہے یا ان کے مضامین کی سرخیاں ___ حالی اور پیروی مغرب، حالی کا سیاسی شعور، مقدمۂ شعر و شاعری، حالی اور ان کا عہد، مسدس حالی اور اس کے نقاد، اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ احتشام حسین حالی سے کس حد تک متاثر تھے۔ اردو تنقید کے ارتقاء میں وہ جن تین ناقدین کو اہم سمجھتے ہیں یعنی آزاد، حالی اور شبلی ان میں بعض حیثیتوں سے حالی کا اہم ترین مقام ہے۔ اس بات کی وضاحت، احتشام حسین کی تحریر کردہ مندرجہ ذیل سطور سے بھی ہو جاتی ہے۔

"جب ہم ان نقادوں پر یہ سرسری نظر ڈال رہے ہیں تو یہ بات نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونی چاہیے کہ انفرادی طور پر ان کے (آزاد، حالی، شبلی) شعور کے دائرے مختلف ہیں۔ چنانچہ مادی زندگی میں تغیر اور اس کے نتائج پر، مادے اور خیال کے تعلق پر، حالی نے جس طرح نظر ڈالی ہے وہ ان کے طرزِ فکر کا پتہ دیتی ہے۔ انھیں اس عہد کے دوسرے نقادوں سے آگے بڑھاتی ہے اور ان کے دائرۂ خیال میں اس حصے کا اضافہ کرتی ہے جس سے آج کا نقاد بھی بہت کچھ سیکھ سکتا ہے۔ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اس وقت سے تنقید کی نئی

راہیں کھل گئیں۔ سماجی نقطۂ نظر کی جستجو کرنے والا حالؔی کے یہاں اس کی جھلک دیکھ سکتا ہے۔"

(اردو تنقید کا ارتقاء)

(۱) ۔ ذوق ادب اور شعور"

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ احتشام حسین کی تنقیدوں میں جو ہر وقت سیاسی اور سماجی شعور کی یا تاریخ کے اثرات کی بحثیں چلا کرتی ہیں، وہ ان کے مضامین میں یکسانیت پیدا کر دیتی ہیں۔ اور پڑھنے والوں کو یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ شاید ادب کی تنقید میں ان باتوں کے علاوہ اور کسی بات سے بحث نہیں کرنا چاہتے۔ یا یہ کہ احتشام حسین خالص فن اور جمالیات کی بحث اپنے مباحث میں نہیں لانا چاہتے۔ بات یوں نہیں ہے۔ دراصل احتشام حسین اور ان کے طرزِ فکر پر سوچنے والے تمام ناقدین خالص فن اور جمالیات کو مقصد بالذات نہیں سمجھتے۔ بلکہ کسی بھی فنی یا جمالیاتی تصور میں اس کے دور اور اس دور کے مذاق، تاریخ اور ان سماجی حالات کا بھی ہاتھ ہوتا ہے جس سے ہو کر کوئی ادیب یا شاعر گزرتا ہے۔ خالص فن نام کی چیز بغیر ان محرکات سے رشتہ جوڑے ہوئے وجود میں نہیں آ سکتی۔ اسی سبب سے احتشام حسین قاری کو بھی پہلے کسی فن پارہ کے تاریخی، سماجی، سیاسی اور نفسیاتی پس منظر سے بخوبی واقف کرا دینا چاہتے ہیں اور اس کے بعد اس کے فن سے بحث کرتے ہیں۔ زیادہ تر حالؔی نے بھی اسی طرز سے شعر و ادب کا تجزیہ کیا ہے اور بحثیں اٹھائی ہیں، اگرچہ ان کو عملی تنقید کا ایسا موقع نہیں ملا جو ان کے بعد اس انداز پر لکھنے والوں کو ملا۔ پھر احتشام حسین کی تنقیدوں میں کسی مقام پر بھی فن یا جمالیات کی اہمیت اور افادیت سے انکار نہیں کیا گیا ہے۔ لیکن خالص فنی اور جمالیاتی نظریوں سے فنون کو پرکھنے اور ان کا تجزیہ کرنے کو سعیٔ لاحاصل ضرور قرار دیا گیا ہے اور جگہ جگہ اس طرزِ فکر کی دلائل کے ساتھ نفی بھی کی گئی ہے۔

یہی وہ ٹھوس دلائل ہیں جو اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ احتشام حسین کے تنقیدی مضامین تنقیدی آدرشوں کی مکمل عکاسی کرتے ہیں۔ حالؔی نے جو تخم بویا تھا وہ ایک تناور درخت کی صورت میں احتشام حسین کی تنقیدی نگارشات میں پھیلا ہوا ہے۔ انھوں نے تنقیدی مضامین میں تنقیدی ذوق کو اکسانے، نئے موضوعات کو کریدنے اور نئے ادبی مسائل کو پیش کرنے اور تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ تاریخی حقائق اور زندگی کے تغیرات کو پیش نظر رکھتے ہوئے فن اور فنکار کے جذبات اور افکار کو سمجھنے کی کوشش بھی کی ہے وہ تبدیلیوں کو قوت اور حیات کی ایسی علامت سمجھتے ہیں جن کے بغیر تنقید، ادب اور زندگی کے راستے استوار نہیں ہوتے۔

★

بیکل اتساہی

ترانۂ اتر پردیش

بھارت ہے ہمارا پیارا وطن اتر پردیش ہے اپنا چمن
دیروں کا چلن، رشیوں کا وچن اتر پردیش ہے اپنا چمن
کیلاش اس کے ماتھے کا تلک، چرنوں پہ جھکے ہے وندھیاچل
ہری دوار حسیں ہونٹوں کی دمک گودی میں لہکتا تاج محل
باہوں میں مچلتے گنگ و جمن اتر پردیش ہے اپنا چمن
تہذیب کا گہوارہ ہے یہی، ہر دھرم کی انگنائی ہے یہی
جو بزم سجائیں عالم کی ان پھولوں کی امرائی ہے یہی
ہے اس کی مہک گلشن گلشن اتر پردیش ہے اپنا چمن
یہ کرشن کی بگیا البیلی، رہتے ہیں سیا کے رام یہیں
غازی، صابر، وارث کا نگر، گوتم کا مقدس دھام یہیں
ہر دھرم یہاں من کا درپن اتر پردیش ہے اپنا چمن
یہ لکھے ہے رسیلی شہنائی، یہ نیل کنول کی دھرتی ہے
ہے امن یہیں کی انگڑائی، یہ عزم و عمل کی دھرتی ہے
بھارت کی جبیں اس سے روشن اتر پردیش ہے اپنا چمن
یہ ویر بندیلوں کی وادی، جانباز روہیلوں کی بستی
جو دیش پہ اپنی جاں دے دیں یہ ان البیلوں کی بستی
ہر پھول یہاں ہے شعلہ بدن اتر پردیش ہے اپنا چمن
رنگت ہے صبح بنارس کی یہ شام اودھ کی خوشبو ہے
یہ نینی تال مسوری کی لہکی ہوئی رات کا گیسو ہے
ہر رنگ ہے فطرت کا درشن اتر پردیش ہے اپنا چمن
ودیا دائن کی دہلیز ہے یہ، یہ دیانت کا سنسار یہی
یہ سنت کبیر کا تیاگ بھون ہے مست نظیر کا پیار یہی

رسکھان کی بستی کا مدھوبن اتر پردیش ہے اپنا چمن
بسمل کا یہیں جذبہ ہے امر، اشفاق کی قربانی کی قسم
ہے عزم شہیداں کی یہ ڈگر، بڑھتے ہوئے سنیاسی کی قسم
آزادیٔ ملک اس کا جیون اتر پردیش ہے اپنا چمن
موتی کے جواہر پارے بھی، جوہر کی ضیا باری ہے یہاں
ہیں لال یہاں انگارے بھی، ذاکر کی رواداری ہے یہاں
ہیروں سے بھرا اس کا دامن اتر پردیش ہے اپنا چمن
یہ پنتھ کا پیچھا جیارا ہے، قدوائی کا ارمان ہے یہی
رخ موڑتا وقت کا دھارا ہے، فتنوں کے لیے طوفان ہے یہی
سیکھے ہے یہاں ہر نیت چلن اتر پردیش ہے اپنا چمن
گیہوں کے سنہرے جھومر ہیں، دھانوں کی روپہلی پیجنیا
مکئی کی بتیسی موندر ہیں، مرچا کی جوڑا اڈکر دھنیا
کھیتہر ہے انھیں سپنوں میں مگن اتر پردیش ہے اپنا چمن
لہکا دیں نئے ڈھب سے اپنی کھیتی کو نیا جیون دے دیں
چاندی سی کھنکتی پرتی کی، فصلوں کو سنہرا پن دے دیں
ماٹی کو بنا دیں اب کنچن اتر پردیش ہے اپنا چمن
محنت کی حسیں تدبیروں سے گلزار کریں صحراؤں کو
اُدیوگ کی پھیلی باہوں میں شہروں سے ملا دیں گاؤں کو
سب توڑیں نفرت کے بندھن اتر پردیش ہے اپنا چمن
جو راہ ملی ہے باپو سے اس راہ کو ہم چمکائیں گے
ہر موڑ پہ ہنس برسائیں گے اقدار کی ساکھ بڑھائیں گے
یہ عہد ہے بیکل عہد سخن اتر پردیش ہے اپنا چمن

شمس تبریز خاں

شاعر انسانیت
تلوک چند محروم

تلوک چند محروم کا شمار اردو ادب کے ان چند ممتاز شعرا میں ہوتا ہے جن کا شاعرانہ کمیت وکیفیت دونوں کے لحاظ سے بہت ہی قابل لحاظ حیثیت کا مالک ہے وہ شعر گوئی میں اقبال، درگا سہائے سرور، چکبست اور رواں کے معاصر تھے اور سر عبدالقادر کے مخزن اور دیا نرائن نگم کے زمانہ سے ہی ان کی شاعری کا بھی آغاز اور تعارف ہوا۔

محروم کو یہ خوش نصیبی بھی حاصل رہی کہ ان کے کلام میں شروع سے پختگی وسنجیدگی موجود رہی جس کے سبب وہ قبول عام سے محروم کبھی نہیں رہے "نورجہاں کا مزار" ان کی ابتدائی نظموں میں سے ہے لیکن جب شائع ہوئی تو ملک میں اس کی دھوم مچ گئی اور اقبال تک نے اس کی تعریف کی اور برسوں تک وہ اردو کے نصاب میں داخل رہی۔ مولانا حالی، آزاد، شبلی اور اسماعیل میرٹھی نے اردو نظم وغزل کو جس ڈگر پر ڈالا تھا، محروم کے رہوار فکر نے اپنے لیے اسی کو منتخب کیا اور اپنی منزل متعین کرلی اور اس میں ایسی وفاداری اور استواری برتی جو آپ اپنی مثال بن گئی۔ اردو میں ادب لطیف، نظم معرا، ترقی پسندی، رومانویت اور جدیدیت کے کتنے ہی طوفان اٹھے مگر محروم ایک قابل قدر وضع داری کے ساتھ اور بڑے عزم واستقلال کے ساتھ وہی راہ پر چلتے رہے۔

پرگوئی اور کثرت کلام کا یہ عالم ہے کہ انھوں نے تقریباً ایک ہزار نظمیں کہیں اور ایک لاکھ اشعار لکھے جو تقریباً ایک درجن مجموعوں پر مشتمل ہے۔ ان کے اولین قدردانوں میں سر عبدالقادر، ڈاکٹر اقبال، اکبر، اور کیفی رہے ہیں اور بعد میں تو ان کا کلام سکۂ رائج ہی رہا۔

محروم کی پرگوئی، نغز گوئی سے خالی نہ تھی وہ بھرتی کے اشعار سے گریز کرتے تھے اور سخن سازی سے پرہیز ان کا شعار تھا۔ ان کے کلام کا تنوع اور رنگارنگی بھی دیدنی ہے؛ نظم وغزل، رباعی ومثنوی، قطعہ ومستزاد کسی میں وہ بند نہ تھے نظموں میں بھی انھوں نے مختلف بحریں اختیار کی ہیں جو جدت واختراع اور تخلیقی دسترس کی غماز ہیں۔ ان کا بڑا کمال ان کی قادرالکلامی اور غیر معمولی فنی مہارت وہنرمندی ہے۔ الفاظ ومعنی پر وہ حاکمانہ اقتدار رکھتے ہیں کہ عجز بیان کا کہیں دعوکا بھی نہیں ہوتا، وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں اپنے سیدھے سادے الفاظ میں نہ صرف یہ کہ کہہ ڈالتے ہیں بلکہ سامع کے دل میں اتار دیتے ہیں۔ انھیں الفاظ کی گھن گرج پسند نہیں۔ وہ ایک معتدل لہجہ کے مالک ہیں جو ایک متوازن ذہن وفکر، نارمل شخصیت اور صحت مند ذوق کا اشاریہ ہوتا ہے۔ وہ کسی نفسیاتی گرہ (COMPLEX) کے شکار نہیں، نہ اپنے کو برتر سمجھتے ہیں نہ کمتر بلکہ مساوی سطح سے ہر انسان کو مخاطب کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، نہ ان کے یہاں کوئی ماورائی کیفیت ہے نہ فلسفہ طرازی ہے نہ کوئی ازم ہے۔ وہ زندگی کو خانوں میں نہیں دیکھتے بلکہ زندگی سے بہ حیثیت مجموعی محبت کرتے اور انسان سے باعتبار نوع انسانی پیار کرتے ہیں۔ امن وانسانیت اور اخلاق وشرافت ان کی شخصیت کی طرح ان کے کلام کا بھی جوہر ہیں۔

انسانیت واخلاق ان کی شاعری کا محور ہیں۔ اسی قابل قدر جذبے نے انھیں بچوں کے لیے نظمیں لکھنے پر مجبور کیا، اسی نے قومی تحریک سے ان کا تعلق پیدا کیا اور "کاروان وطن" جیسا مجموعہ تیار ہوا، اسی نے ان سے رباعیاں کہلائیں، اور انھوں نے اپنی نظموں کو اسی کا ذریعۂ اظہار بنایا۔ غرض ایک شمع تھی جو رنگ برنگے فانوسوں میں جلتی رہی۔ ایک درد تھا جو فریاد کے مختلف لہجوں میں ڈھل گیا۔

ایک ایسے دور خلفشار وانتشار میں جب شرافت وانسانیت

اور تمام اقدار عالیہ تہ وبالا ہو رہی تھیں، اخلاقِ فاضلہ کے پیمانے دستبرد زمانہ کے کھلونے بنے ہوئے تھے، محروم نے اخلاق و انسانیت کا علم بلند رکھا اور وہ انھیں کا کلمہ پڑھتے رہے اور انھیں کا دم بھرتے رہے اور بے یقینی کے طوفان میں ایمان و یقین کی مشعل لے کر آگے بڑھتے رہے۔ ان کی غزلوں کی سادگی و متانت اور تعمیری و اخلاقی رنگ دیکھ کر مجھے حافظ و سعدی، جامی و خاقانی، کلیم و نظیری جیسے شعرا یاد آجاتے ہیں جن کا کلام صحیفۂ اخلاق اور سفینۂ انسانیت ہے۔

محروم کے کلام کی ایک خاص چیز سوز و گداز اور ان کا غم آگیں لہجہ ہے جو ان کی غم پسند فطرت اور ان کی غمگین زندگی کی نشاندہی کرتی ہے۔ وہ خود لکھتے ہیں "نصف صدی کی طویل ملازمت کے دوران میں بعض ناخوشگوار حالات اور کچھ ذاتی رنجیدہ واقعات پیش آئے، طبیعت شروع سے رقت آشنا تھی حالات نے میری شاعری میں غم و اندوہ کا عنصر شامل کر دیا تھا۔" گنج معانی کے دیباچہ میں سر عبد القادر نے اس پہلو پر کافی روشنی ڈالی ہے[1]۔

ان کا غم مصنوعی نہیں بلکہ فطری و حقیقی ہے اس لیے ایک خاص کشش اور اثر رکھتا ہے۔ ایک حادثہ جوانی میں ان کی بیوی کی وفات پر اور پھر ایک دو سالہ بچی کی موت اور ایک نوجوان لڑکی کی خودکشی سے تعلق رکھتا ہے جو ایک انسان کو پیکر غم بنا سکتا ہے، ان نظموں میں ایک محروم باپ کی بے قراری اور شفقت پدری کی تپش صاف محسوس ہوتی ہے، اور دوسری نظموں میں ایک غم زدہ و مہجور شوہر کی داستانِ فراق ہے جو دل پر اثر کیے بغیر نہیں رہتی۔

میرے محترم دوست پروفیسر عبد المغنی صاحب نے کلام محروم کے بارے میں لکھا ہے کہ "اس میں غالب طور پر تین قسم کے مضامین شامل ہیں، ایک فطرت، دوسرے درس اخلاق، تیسرے ذاتی غم، اس تجزیے سے ایک اور بات معلوم ہوگی کہ ان تینوں ہی قسم کے مضامین میں تین عناصر قدر مشترک ہیں، یعنی مرقع نگاری دردمندی اور عبرت انگیزی[2]۔"

یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ محروم کا غم، صرف رونے دھونے تک محدود نہیں بلکہ اس میں بڑی گہرائی و گیرائی اور مہذب و شائستہ سلیقہ ملتا ہے، ان کے غم میں ایک رچی ہوئی کیفیت، اور ایک نکھری ہوئی اور کڑھی ہوئی شخصیت کی جھلک ملتی ہے، ان کے غم میں نہ اشتہار ہے نہ مریضانہ اظہار بلکہ اس میں ایک بانکپن اور مردانہ وقار شامل ہے۔ وہ ایک صحت مند اور معتدل انسان کا غم ہے جس سے شخصیت کی تطہیر اور تزکیہ کا سامان ہو جاتا ہے اور جس میں شخصیت تپ کر نکھر اور سنور جاتی ہے۔

جہاں تک محروم کی غزل کا تعلق ہے اس میں کلاسیکی انداز غالب ہے۔ عام طور پر ان کی غزلوں کا رنگ استادانہ ہے الفاظ اور ترکیبوں کی صحت کا انھیں پورا خیال رہتا ہے۔ وہ روایت سے بغاوت نہ فکر میں پسند کرتے ہیں نہ فن میں۔ انھیں لفظ و معنی دونوں ہی میں نزاکت و نفاست سے زیادہ اصلیت اور ثقاہت پسند ہے۔ ان کی غزلیں زندگی سے بہت قریب ہیں، اور ان میں غم جاناں اور غم زمانہ کے حقیقی خد و خال اس قدر نمایاں ہیں کہ ہمیں ان کے پہچاننے میں ذرا بھی دیر نہیں لگتی۔ وہ کم سے کم الفاظ میں بڑی بے ساختگی لیکن باضابطگی کے ساتھ اپنے جذبات و محسوسات کی تصویر کھینچا جاتے ہیں۔ اس خصوصیت میں وہ مولانا حالی سے بہت قریب ہو جاتے ہیں۔ کبھی کبھی ان کے کلام میں مومن و شیفتہ، حسرت و اصغر کا رنگ کھل اٹھتا ہے۔

یہ بات بڑے ریاض کے بعد حاصل ہوتی ہے کہ کسی شاعر کا کلام بظاہر سادہ نظر آئے لیکن اسی سادگی میں پرکاری، بے تکلفی میں بناوٹ سنگار اور معصوم الفاظ کے اندر شوخ و شنگ معانی

---

[1] نقوش، لاہور آپ بیتی نمبر ص ۱۱۱۲ [2] جادۂ اعتدال ۲۷۱ (پٹنہ ۱۹۷۲ء)

کی ایک دنیا آباد ہو اور کلام کے سطحِ ساکن کے نیچے معنویت و تہ داری کی تند و تیز لہریں کروٹیں لے رہی ہوں۔ محروم کی غزلوں میں کچھ ایسا ہی رنگ و آہنگ اور نیرنگ نظر آئے گا۔

ان کی غزلوں میں صرف دلکشی ہی نہیں دل کشائی بھی ہے۔ صرف جذبات کی آئینہ داری ہی نہیں بلکہ خیالات و صداقتِ احساس کی تازہ کاری بھی ہے۔ تصویرِ حیات و کائنات ہی نہیں بلکہ تعمیر کی حسرت و جرأت بھی ہے۔ مرحوم کی بیشتر غزلوں اور کچھ نظموں کی خاص نوعیت ایک بالیدہ ذوق، ایک مہذب و شستہ مزاج، ایک حکیمانہ اور عمومی لہجے میں پوشیدہ ہے۔ ایک خاص قسم کا رکھ رکھاؤ، ایک ٹھہرا اور رچا ہوا انداز اور ایک فطری و حقیقی طرزِ فکر، محروم کا طرۂ امتیاز ہے۔ فراق گورکھپوری نے بہت صحیح کہا ہے کہ:

"ان کی غزلوں کا کلاسیکی رکھ رکھاؤ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ ان غزلوں کا مطالعہ تعلیم کا درجہ رکھتا ہے۔ ان کے بیشتر اشعار میں بہ یک وقت نغمگی اور اثر آفرینی پائی جاتی ہے، وہ اخلاقی قدروں کے حامل ہوتے ہیں اور اکثر زبان زد ہو جاتے ہیں۔ ایک تربیت یافتہ احساس، ایک پروقار ضبط ان کا خاصہ ہے ...... ان کی انگلیوں میں ایک باکمال ماہرِ فن کا جادو ہے مگر فن انہیں کبھی دھوکے نہیں دیتے وہ جوشِ جنوں میں بہکتے نہیں ایک سلجھے ہوئے دنیاوی بشر کی سی سنجیدگی اور متانت ان کا حصہ ہے۔ صحت مندی ان کی شاعری کا وصفِ اعلیٰ ہے۔"[1]

ان کے کلام کی کچھ اور خصوصیات میں سرِ فہرست ان کی پاک طینتی اور نیک طبعی ہے۔ شرافت و بلند طبعی، رواداری اور وسیع المشربی، بلند نظری اور کشادہ قلبی ان کی نظم و غزل اور رباعی بلکہ سارے کلام کا امتیازی رنگ ہے۔ وہ مسلم تہذیب و ثقافت سے اتنے قریب ہیں کہ بیگانگی اور اجنبیت کہیں سے نہیں ثابت ہوتی وہ مذہبی و تہذیبی اور تمام گروہی حد بندیوں سے اٹھ کر اس مقام پر نظر آتے ہیں جہاں اعلیٰ انسانی اقدار اور عالمگیر صداقتوں ہی کی کارفرمائی رہ جاتی ہے۔

ان کے کلام کی ایک خاص الخاص خوبی اس کا حکیمانہ اور مصلحانہ پہلو ہے۔ وہ سعدی کی طرح ہر جگہ ایک معلمِ اخلاق نظر آتے ہیں۔ زندگی کے حقائق پر ان کی نظر اکثر رہتی ہے۔ حسن و عشق کی داستانِ پارینہ سے زیادہ وہ حسنِ زندگی اور حسنِ فطرت پر نگاہ رکھتے ہیں اور زندگی کی بصیرتوں اور حکمتوں کو ہر خاص و عام تک پہنچا دینا چاہتے ہیں۔ وہ بہکتے کبھی نہیں یہی ان کی خوبی بھی ہے اور اگر کہیے تو عیب بھی ان کے ساغر کی موجیں ہمیشہ "خطِ پیمانہ" بن کر ہی اٹھتی ہیں۔ ان کا جام کبھی چھلکتا نہیں لیکن اس میں سرشاری کی کیفیت ضرور ہوتی ہے۔ ان کے کلام پر عموماً تفکر کی ایک فضا قائم رہتی ہے اور ایک اعلیٰ سنجیدگی اکثر انہیں تنہا نہیں چھوڑتی۔

محروم کی غزلوں کے یہ اشعار شاید ان کا رنگِ سخن بتا سکیں گے:

کسی کی یاد کو ہم زیست کا حاصل سمجھتے ہیں
اسی کو راحتِ جاں اور سکونِ دل سمجھتے ہیں

سہارا ہے کہاں یارب ترے کشتی شکستوں کا
نکل آتی ہے موج آخر جسے ساحل سمجھتے ہیں

کہاں ذرّہ کہاں خورشید خوش فہمی ہے اپنی
کہ خود کو جلوہ گاہِ دوست کے قابل سمجھتے ہیں

خزاں فسردگی کس کی ہے کوئی کیا سمجھے	بہار کس کا تبسم ہے کوئی کیا جانے

واقف ہیں اک فسردگیِ جاوداں سے ہم	ناآشنا ہیں فرقِ بہار و خزاں سے ہم
خونابِ دل کو بہنے دو آنکھوں کی راہ سے	پیدائی بہار کریں گے خزاں سے ہم

یہی انجامِ مسرت ہے کہ خنداں ہو کر	شاخساروں سے گرے پھول پریشاں ہو کر
دیکھیے حسن کا اعجاز کہ بے جاں ہو کر	آئینہ دیکھ رہا ہے انہیں حیراں ہو کر
رہ گئی عالمِ حیرت میں دمِ نظارہ	نگہِ شوق نقابِ رخِ جاناں ہو کر

---

[1] آثارِ محروم ۴۸

ارزاں سمجھ اگر غمِ الفت گراں ملے   نقصاں نہیں اگر عوضِ نقدِ جاں ملے
اے راہروؔ قدم نہ رکھو اس پہ غرور سے   یہ خاک وہ ہے جس میں کئی کارواں ملے

قریبِ شاخِ گل ہوتی ہے جب دستاں سرا بلبل
ہمیں بھی بھولی بسری اک کہانی یاد آتی ہے
جوانی اور بوئے گل میں یارب کیا تعلق تھا
کہ بوئے گل سے پیری میں جوانی یاد آتی ہے

یوں زندگی سے مل کے جوانی جدا ہوئی   جیسے کوئی کسی سے سرِ رہ گزر ملے

وہی ہے فصلِ گل جب کھل گیا دل   بہار آنے کا اک موسم نہیں ہے

چمکے جگر کے داغ طلوعِ سحر کے ساتھ   پایا نہ ہم نے چین شبِ غم گزار کے

زوالِ حسن کو حسنِ نگار کیا جانے   خزاں قدم بقدم ہے، بہار کیا جانے
لکھا ہے اس کے مقدر میں اضطرابِ دوام   قرار کیا ہے دلِ بے قرار کیا جانے

کشتیٔ امید اپنی دور ساحل سے رہی   جب چلی بادِ موافق، بادباں گم ہو گیا

وہ کہہ گئے تھے کہ آئیں گے ہم چراغ جلے   نمودِ شام سے پہلے جگر کے داغ جلے

ہو گیا آخر تلف وہ کاروانِ آرزو   مدتوں جس نے اڑائی دل کے ویرانے کی خاک

اس گل کی بو صبا! نفس دوست اے صبا!
غنچے سے بھی زیادہ ہوں دل تنگ آج کل

جس پہ رندوں کو گمانِ لغزشِ مستانہ تھا
پائے ساقی پہ وہ اپنا سجدۂ شکرانہ تھا

پژمردہ جب سے ہے دلِ غم دیدہ کی کلی
میرے لیے ہیں ایک، خزاں کیا بہار کیا۔

اسیرِ حلقۂ گیسوئے خوباں ہو نہیں سکتا
وہ دل، تو جس کو تسکیں دے پریشاں ہو نہیں سکتا

محرومؔ نے غزلوں سے زیادہ نظمیں کہی ہیں۔ بچوں کے لیے انھوں نے 'بہارِ طفلی' اور 'بچوں کی دنیا' کے نام سے دو مستقل مجموعے تیار کیے تھے۔ وطنی اور سیاسی نظمیں کاروانِ وطن میں آ گئی ہیں۔ 'گنجِ معانی'، 'نیرنگِ معانی' اور 'شعلۂ نوا' میں غزلیں زیادہ ہیں۔ نظمیں زیادہ تر درسِ اخلاق و حکمت، مناظرِ فطرت اور یادِ رفتگاں پر مشتمل ہیں۔ ذیل میں ان تینوں کے کچھ نمونے درج کیے جاتے ہیں ان کی نظمیں فکر و فن کے لحاظ سے ان کی غزلوں سے بڑھی ہوئی ہیں اور ان کے موضوعات کے تنوع سے ان کی غیر معمولی قادر الکلامی کا اندازہ ہوتا ہے۔ بچوں کے لیے نظمیں بہتوں نے لکھی ہیں لیکن محرومؔ نے بچپن کی معصومیت اور بچوں کی نفسیات کا جیسا اور جتنا لحاظ رکھا ہے وہ کہیں اور مشکل ہی سے ملے گا۔ بچوں کی زبان سے محرومؔ نے یہ دعا کی ہے:

حاضر ہیں تیرے در پر پروردگار ہم بھی   ہیں رحم اور کرم کے امیدوار ہم بھی!
علم و عمل کا رستہ یارب ہمیں دکھا دے   جس سے ملے سعادت اس راہ پر چلا دے
عقبیٰ کی سرخروئی دنیا کی کامگاری   حاصل ترے کرم سے ہم کو ہو ذاتِ باری

مناظرِ فطرت کی عکاسی میں محرومؔ کو خاص ملکہ تھا۔ وہ لبادۂ فطرت سے ہم آہنگ اور ہم رنگ ہو جاتے ہیں۔ بادِ نسیم کے لیے اس سے بہتر کیا کہا جا سکتا ہے ؎

تاروں کی چھاؤں میں تو جو آتی ہے باغ میں
ٹھنڈک سی ڈال دیتی ہے لالے کے داغ میں

مندرا بن کی صبح کی ایک جھلک دیکھیے:

صبحِ خنداں عروسِ تازہ   آئی مل کر شفق کا غازہ
آئی اور کس ادا سے آئی   شانوں پر کاکلیں طلائی
ہر چیز کو یہ تو سحر سے   قدرت نے نگاہِ آب تیرے الخ

"آندھی" کا زور ملاحظہ ہو:

وہ گرد کا پہاڑ اٹھا پھر شمال سے — بالیدگی میں دو قدم آگے خیال سے
صورت میں ہے اگرچہ یہ باہر مثال سے — آتی ہے فوجِ دیو نظر جال ڈھال سے
روپوش اس کے خوف سے کوہ گراں ہوا
ہیبت وہ ہے کہ زرد رخِ آسماں ہوا

"آفتاب" کا جلوہ دیکھیے:

اے شمع دل فریب شبستانِ کائنات
تیری کرن کرن ہے رگِ جانِ کائنات
گزری ہے شب جہاں کو ترا انتظار ہے
ہر ذرہ جستجو میں تری بے قرار ہے
مرغانِ صبح خیز کی مشرق پہ ہے نظر
ہیں راہ دیکھتے تری داماندۂ سفر
چڑیوں کے دل میں بھر ہے چہکنے کی آرزو
کلیاں لیے ہوئے ہیں چٹکنے کی آرزو الخ

"بادِ بہاری چلی" کے یہ دو بند ملاحظہ کیجیے:

گلشنِ آفاق میں پھول کھلاتی ہوئی — ناچتی گاتی ہوئی
جلوۂ فردوس کا رنگ جماتی ہوئی — عطر اڑاتی ہوئی
بادِ بہاری چلی

اگلی بہاروں کے دن یاد دلاتی ہوئی — صبر اڑاتی ہوئی
پھر دلِ افسردہ میں آگ لگاتی ہوئی — درد اٹھاتی ہوئی
بادِ بہاری چلی!

حزنیہ اور المیہ شاعری کے نمونے کلامِ محروم میں بیوی اور اپنی دو بیٹیوں کی موت پر جو اشعار انھوں نے کہے ہیں وہ اردو ادب میں یادگار نوعیت کے ہیں، دو سالہ بچی "شکنتلا" کے ماتم کا انداز دیکھیے:

کیوں ہم سے روٹھ کر نکل آئی ہے تو یہاں
اٹھ میرے ساتھ چل مری پیاری شکنتلا
وحشت فزا مقام ہے جنگل ہے ہولناک
یاں رات تو نے کیسے گزاری شکنتلا
آنکھوں میں آگیا دلِ صد چاک کا لہو
پتھر یہ تجھ پہ دیکھ کے بھاری شکنتلا
ویرانہ ہو گیا ہے بسرا گھر ترے بغیر
کہتے ہیں سب کہاں ہے ہماری شکنتلا

اقبال کا نوحہ اقبال کے شایانِ شان ہے:

ظاہر کی آنکھ سے جو نہاں ہو گیا تو کیا — احساس میں سما گیا دل میں اتر گیا
کنجِ مزار میں تنِ خاکی کو چھوڑ کر — قدسی نژاد اوجِ سماوات پر گیا
باغِ جہاں میں صورتِ گلہائے تر رہا — باغِ جناں میں مثلِ نسیمِ سحر گیا
ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق — روشن تر اس حقیقت روشن کو کر گیا
محروم کیوں ترے دلِ حرماں نصیب کو — یہ وہم ہو گیا ہے کہ اقبال مر گیا

"نور جہاں کے مزار پر" محروم کی لافانی نظم ہے اس موضوع پر اس سے بہتر نظم اب تک نہیں لکھی جا سکی۔ اس کے چند بند ملاحظہ ہوں:

دن کو بھی یہاں شب کی سیاہی کا سماں ہے
کہتے ہیں یہ آرام گہِ نور جہاں ہے
مدت ہوئی وہ شمع تہِ خاک نہاں ہے
اٹھتا مگر اب تک سرِ مرقد سے دھواں ہے

جلوؤں سے عیاں جن کے ہوا طور کا عالم
تربت پہ ہے ان کی شبِ دیجور کا عالم

اے حسنِ جہاں سوز کہاں ہیں یہ شرارے
کس باغ کے گل ہو گئے کس عرش کے تارے
کیا بن گئے اب کرمکِ شب تاب وہ سارے
ہر شام چمکتے ہیں جو راوی کے کنارے
یا ہو گئے وہ داغ جہانگیر کے دل کے
قابل ہی تو تھے عاشقِ دلگیر کے دل کے

تجھ سی ملکہ کے لیے یہ بارہ دری ہے
غالیچہ سرِ فرش ہے کوئی نہ دری ہے
کیا عالمِ بے چارگی اے تاجوری ہے
دن کو یہیں بسرام یہیں شب بسری ہے

(باقی ص ۲۵ پر)

ہلال رضوی رامپوری

رحمت یا زحمت

یہ درویش ملے مجھ کو سرِ راہ گزرا   بولے اولاد بے خبر اپنی بھی ہے کچھ تجھ کو خبر
سنے کی عرض کہ اک شاعرِ مخصوص نظر   ہو تو جاتا ہے کبھی خود سے بھی بیگانہ مگر
"جب کوئی حادثۂ کون و مکاں ہوتا ہے
سب سے پہلے دلِ شاعر پہ عیاں ہوتا ہے"
ن کے اس بات کو کہنے لگے تو بہ تو با   غور کر دل میں تو کچھ سوچ تو کمبخت ذرا
ں سے بڑھ کر بھی کوئی حادثہ غافل ہوگا   بارھواں گھر میں ہوا ہے ترے بچہ پیدا
کون سے خاص گناہوں کا ہے یہ کفارا
تو ہے ماں باپ کا اک اور ترے بچے بارا
باپ بازار کو جاتے ہیں پسر گود میں ہے   اک کمر پر ہے تو اک نورِ نظر گود میں ہے
یک کے پاؤں بغل میں ہیں تو سر گود میں ہے   اک ادھر گود میں ہے ایک اُدھر گود میں ہے
واہ کیا نخلِ تمنا میں بہار آئی ہے
ہیں اُدھر لوٹ تو ہر شخص تماشائی ہے
پوچھے جب تو کہا میں نے یہ تنقید ہے کیوں   آج یہ طبعِ رواں مانعِ تولید ہے کیوں
ضبطِ اولاد کی اب ہم سے یہ تاکید ہے کیوں   اپنے ہی قول کی فرمایئے تردید ہے کیوں
بڑھے اولاد یہ ہر در پہ صدا دیتے تھے
آپ تو ان کے اضافہ کی دعا دیتے تھے
بولے ہاں ٹھیک ہے سچ کہتے ہو تم یہ تو جناب   وقت لیکن یہ بدل دیتا ہے قدروں کا حساب
اب جو ہوتے ہیں سوالی تو یہ ملتا ہے جواب   پیٹ بچوں کا بھریں ہم کہ کریں کارِ ثواب
مانگنے والے سے پیسوں کو چھپا لیتا ہے
کوئی اب راہِ خدا میں بھی نہیں دیتا ہے
مصرفِ خیر بھلا کب ہے زمانے کی نظر   فاتحہ ہے نہ کہیں اب نہ کہیں حلوۂ تر
اب جمعرات کبھی جانے بھی خالی اکثر   ہاتھ پھیلائے ہوئے پھرتے ہیں مانگے در در
شانِ بخشش کی بڑے میں ہو نہ اب چھوٹے میں
ہم بھی ہیں کثرتِ اولاد سے اب ٹوٹے میں
سن چکا میں تو ہوا مجھ کو یہ فوراً ہی خیال   کہہ نہ کر بیٹھیں کہیں مجھ سے یہ میبوکل سوال
کیونکہ میں جانتا تھا اپنی بھی خود جیب کا حال   ہے تو یہ سوئے ادب پھر بھی میں کہتا ہوں ہلالؔ
یا رب ایسی بھی نہ اولاد کی کثرت ہو جائے
اتنی رحمت نہیں درکار کہ زحمت ہو جائے

اسحاق ملک

نئی غزل کی مہک

(جاں نثار اختر کی یاد میں)

اُسے شرحِ وفا لکھوں
اسے حرفِ جنوں لکھوں
نئے لہجے کی رنگینی لکھوں
لکھوں تو کیا لکھوں
غزل اس نے لکھی ایسی نئی، ایسی تر و تازہ
سنی جس نے دعائیں دیں
پڑھی جس نے بلائیں لیں
وہ "پچھلے پہر" "خاکِ دل" میں "گھر آنگن" میں روشن تھا
تو لگتا تھا خرابے میں بہاریں رقص فرما ہیں
"اشارت کیا، عبارت کیا، ادا کیا"
وہ شخصیت سراپا رنگ و فن، نغمہ، محبت
ہمارے عہد میں سرچشمۂ اخلاص و الفت تھی
وہ اب ہم میں نہیں لیکن
سخن کی چاندنی، خوشبو، مہک نزدیک لگتی ہے

رام لعل

دیارام اخبار والا

(افسانہ)

دیارام جانتا تھا کہ اس کا کوئی بھی پیچھا نہیں کر رہا ہے۔ یہ اس کا محض وہم ہے کہ وہ ہر وقت محسوس کرتا ہے کوئی اس کے پیچھے پیچھے ضرور لگا ہوا ہے۔ اسے ٹھیک ٹھیک یاد نہیں ہے۔ اسے پہلے پہل یہ وہم کب ہوا تھا! شاید بچپن سے ہی جب وہ اسکول جانے سے جی چراتا تھا اور کندھے کے ساتھ کتابوں کا تھیلا لٹکائے گھر سے نکلتا تو اس کی خواہش ہوتی کسی ایسی گلی یا بجریا کی طرف گھوم جائے جو اسکول کی طرف نہ جاتی ہو۔ لیکن وہ جب بھی ایسا ارادہ کرتا اور ڈر کر پیچھے دیکھتا تو اپنے باپ کو پیچھے پیچھے ہی آتا ہوا دیکھتا تھا۔ سر پر لکڑی کا پرانا بکس رکھے اور پیٹھ پر بیشمار پھٹے پرانے جوتوں اور چمڑے کی کترنوں کا ایک بورا بھی لادے ہوئے۔ اس کے خالی ہاتھ میں لوہے کا وہ فریم بھی ہوتا جس کے کئی رخ تھے اور اس پر جوتوں کو رکھ کر وہ ان کی مرمت کیا کرتا تھا۔ کبھی کیلیں ٹھونکتا، کبھی سلائی کرتا تھا۔ دیارام کو اس اوزار سے بہت ڈر لگتا تھا۔ کیونکہ ایک بار اس کے باپ نے غصے میں آکر اس کی طرف پھینک دیا تھا جب وہ اسکول جانے سے انکار کر رہا تھا۔ لوہے کا فریم اس کے ٹخنے پر آ لگا تھا اور اس کے ٹخنے کی ہڈی چور چور ہو گئی تھی۔ وہ کئی روز تک اسپتال میں پڑا رہا تھا۔ پھر کئی مہینوں تک پورے پاؤں پر پلاسٹر لگا دیے جانے پر وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گیا تھا۔ جب پلاسٹر کاٹ دیا گیا تھا تب بھی وہ کسی قدر لنگڑا کر ہی چل پاتا تھا۔ لنگڑا کر چلنے کا نقص ابھی تک باقی تھا۔ اس کے بعد اس کے باپ نے اسے کبھی نہیں مارا تھا۔ وہ اس کی طرف بس گہری نظر سے ہی تاکتا تھا جیسے آنکھوں ہی آنکھوں اس سے کہتا ہو — کچھ پڑھ لکھ لے بیٹا۔ ورنہ میری طرح جوتیاں ہی گانٹھتا رہ جائے گا۔!

اس کا باپ شاید یہی خواب دیکھتے دیکھتے ایک دن اچانک اپنے فٹ پاتھ کے اڈے پر ہی مر گیا تھا کہ اس کا بیٹا تعلیم پا کر ایک روز بڑا آدمی بن جائے گا یا کسی دفتر کا بابو جس طرح اس کی برادری کے کئی اور لوگوں کے بیٹے بن گئے تھے۔ لیکن دیارام بڑی مشکل سے آٹھ جماعتیں ہی پاس کر پایا تھا اور اس کے بعد اپنے ایک پڑوسی سرجو کی سفارش سے ایک دفتر میں چپراسی بن گیا تھا۔ اسے یاد تھا وہ اپنے کاندھے پر فائلوں کا بستہ اٹھائے اٹھائے جب صاحب کے پیچھے پیچھے چلتا تھا تو اس وقت بھی اسے کوئی انجانی پرچھائیں تعاقب کرتی ہوئی لگتی تھی۔ وہ کون تھا؟ اس کا اس طرح پیچھا کیوں کرتا پھرتا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔

اسی زمانے میں اس نے اپنے محسن سرجو کا ہاتھ بٹانا شروع کیا تھا جو بیمار ہو کر اسپتال میں داخل ہو گیا تھا۔ وہ اخباروں کا ہاکر تھا۔ دیارام انہی کے پاس شہر میں رہتا تھا۔ سرجو اور اس کی بیوی کے پاس، جو اب زیادہ تر وقت اپنے آدمی کے ساتھ اسپتال میں بتاتی تھی۔ صرف دو وقت کا کھانا اور ناشتہ ہی بنانے کے لیے کچھ دیر گھر چلی آتی تھی۔ ان کی مدد کرنے کے لیے دیارام تڑکے ہی اٹھ کر چھاپے خانوں میں پہنچ جاتا۔ اخبارات کے بڑے بڑے بنڈل سائیکل کے آگے پیچھے باندھ لیتا اور سرجو کے بندھے ہوئے دو سو کے قریب گاہکوں کے گھروں پر پہنچا دیتا۔ راستے

میں "اخبار، اخبار" چلاتا ہوا بھی جاتا جس طرح وہ سرجو کو کرتا ہوا دیکھا کرتا تھا۔ کچھ اخبار اس طرح بھی بک جاتے تھے۔ یہ کام وہ بڑی آسانی سے ساڑھے نو بجے تک ختم کر لیتا تھا۔ اس کے بعد ناشتہ پانی کر کے دفتر چلا جاتا۔ سرجو کی بیوی اس کے لیے ناشتہ پانی تیار کر کے انتظار کرتی ہوئی ملتی تھی۔ اس کی جوان خوبصورت آنکھوں میں شکر گزاری کی بے پناہ چمک بھی ہوتی جسے وہ اس کے ماتھے تک کانے گھونگھٹ میں سے بھی دیکھ لیتا تھا۔ وہ ان کے پاس عرصہ ڈیڑھ سال سے رہ رہا تھا۔ لیکن سرجو کی بیوی اب بھی اسی سے کانا گھونگھٹ ضرور کرتی تھی۔ وہ بھی اس کی طرف پوری طرح سر اٹھا کر کبھی نہیں دیکھتا تھا۔ بلکہ ہمیشہ جھکی جھکی نظروں سے ہی اس کے سامنے آتا تھا۔ یہ تو کبھی کبھار ہی ہو جاتا کہ وہ ایک دوسرے کے سامنے اچانک آ جاتے اور ایک دوسرے کی طرف کچھ لمحوں تک بڑی حیرانی سے دیکھتے رہ جاتے تھے۔ اس کے بعد چمپیا فوراً ماتھے پر گھونگھٹ کھینچ لیتی اور دیا رام سر جھکا لیتا۔

سرجو کی بیوی چمپیا اس سے کچھ برس بڑی ہی تھی۔ اس لحاظ سے تو اسے دیا رام سے اس طرح پردہ نہیں کرنا چاہیے تھا جب کہ وہ اُس کے گھر میں ہر وقت اس کی نظروں کے سامنے رہا کرتا تھا۔ لیکن عورتوں میں کچھ جھجک فطری ہوتی ہے جس سے وہ بچ نہیں سکتیں یا شاید یہ جھجک اُن کی اندرونی کیفیتوں کی بھی غماز ہوتی ہے! جن کے بارے میں وہ اکثر سوچتی ہیں اُن کا سامنا ہو جانے پر پردہ کرنے کی بھی کوشش ضرور کرتی ہیں۔

دیا رام کو یہ سوچ کر ہنسی آتی تھی کہ ابھی پچھلی ہولی پر اسی چمپیا نے کتنی شوخی سے اُس پر رنگ ڈالا تھا اور اس نے بھی سرجو کے سامنے ہی ہاتھوں بڑا گلال مل کر اس کے پورے چہرے پر پوت دیا تھا۔ سرجو تو یہ دیکھ دیکھ کر زور، زور سے ہنستا رہا تھا لیکن وہ چمپیا کے جوان گدار جسم کا اچانک لمس پا کر کانپنے سا لگا تھا۔ چمپیا بھی اب بھرے سر پر بھیگی ہوئی دھوتی لے کر اس کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھ گئی تھی۔ اس کے لیے اپنے اندر کی خوشی کو چھپا لینا کتنا آسان ہو گیا تھا، جسے کوئی بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ نہ سرجو نہ وہ۔ چمپیا نے اسی طرح بیٹھے بیٹھے ہی کہہ دیا تھا —— "لالہ، اگلے برس اسی طرح اپنی دلہنیا کے ساتھ ہوری کھیلنا۔ کہو تو ڈھونڈ لاؤں ایک سُندر سی لڑکی؟"

دیا رام گھبراہٹ کی وجہ سے کوئی جواب نہیں دے سکا تھا لیکن سرجو نے اپنی ہتھیلیوں پر تمباکو تھپتھپاتے ہوئے کہا تھا —— "اری اس سے کا پوچھت ہے۔ تیری نجر میں کوئی چھوکری ہے تو اُس کا اتا پتا بتا، ہم ابھیں بارات لے کر اُس کے گھر پہنچ جاتے ہیں!"

بات ہنسی مذاق میں ہی اُڑ گئی تھی۔ لیکن دیا رام کو یقین ہو گیا تھا چمپیا اُس کے لیے ضرور کوئی لڑکی ڈھونڈ نکالے گی۔ جو آٹھویں درجہ پاس دفتر کے چپراسی کی بیوی بننا سویکار کرے گی۔ وہ اب ہر روز رات کو اپنی کوٹھری میں لیٹتا تو سونے سے پہلے اسی لڑکی کے خواب دیکھتا تھا۔ کھلی آنکھوں سے، جب تک اسے نیند آ کر دبوچ نہیں لیتی تھی۔ لیکن جب سے سرجو اسپتال میں جا پڑا تھا دیا رام کو اپنے محسن اور سرپرست سرجو کی بیوی سے ایک خوف سا محسوس ہونے لگا تھا۔ کیونکہ اس نے اب اس سے پردہ کرنا اچانک چھوڑ دیا تھا۔ جب وہ اس کے سامنے اکیلی ہوتی تو پہلے کی طرح ماتھے پر گھونگھٹ نہیں کھینچتی تھی۔ اس قسم کا تکلف وہ صرف سرجو کی موجودگی میں ہی کرتی تھی جب وہ اُس سے اسپتال میں ملنے جاتا تھا۔ سرجو کی غیر موجودگی میں تو وہ اس سے اس قدر بے تکلف ہو جاتی تھی کہ کوئی اور دیکھ لیتا تو یہی سمجھتا وہ اُسی کی جورو ہے!

دیا رام گھبرا اٹھا۔ وہ اچانک ان کا گھر چھوڑ کر گاؤں چلا گیا۔ اپنی نوکری سے کئی مہینوں تک غیر حاضر رہا —— دیا رام نے اخبار بیچنے کی جو خدمت خود ہی سنبھال لی تھی وہ بھی چھوڑ دی لیکن گاؤں میں پڑے پڑے رہنا بھی اسے اچھا نہیں لگتا تھا۔ نوکری چھوٹ چکی تھی —— پیٹ بھر روٹی کمانے کے لیے کچھ نہ کچھ کرنا تو ضروری تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا اُسے اخبار ہی بیچنے چاہئیں۔ اخبار بیچنے کا کام چپراسی گیری کرنے سے کہیں

آسان اور دلچسپ تھا لیکن یہ کام وہ شہر میں جاکر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہاں جاکر اُسے سرجو اور اس کی بیوی کا سامنا کرنا پڑتا جن سے اسے ڈر لگتا تھا۔

اس نے شہر اور گاؤں کے بیچ پھیلے ہوئے فاصلے کا جائزہ لیا۔ اس بیس کلومیٹر لمبی سڑک کے آس پاس بکھری ہوئی آبادی تھی۔ کچھ پرانے مکان تھے کچھ نئے مکانوں کا سلسلہ حکومت نے شروع کر دیا تھا تاکہ شہر کی آبادی کم ہو اور لوگ گاؤں کے قریب رہنا سیکھیں، اُن میں رہنے والے شہر جاکر ہی نوکری کرتے تھے۔ وہ کتنے لوگوں کو صبح سویرے سائیکلوں پر شہر کی جانب بھاگتے ہوئے دیکھا کرتا تھا۔ اور شام کو ادھر سے واپس آتے ہوئے بھی۔ ان میں کئی ایک گھروں میں ریڈیو اور ٹرانزسٹروں سے نغمے بھی گونجتے تھے۔ پرانی اور نئی نسل کے لوگ سائنس کی اس دین سے پورا پورا فائدہ اٹھا رہے تھے دیارام نے دیکھا تھا کہ اگر کسی کے ہاتھ اچانک کوئی پرانا اخبار یا باتصویر رسالہ لگ جاتا تو وہ اسے گھنٹوں بیٹھ کر چاٹتا تھا۔ گاؤں والوں کے اندر بھی پڑھنے کی بھوک جاگ اٹھی تھی۔ یہ بھوک شہر والوں کے یہاں تو بہت زیادہ تھی جسے وہ دیکھ چکا تھا۔

دیارام تجربے کے طور پر شہر سے بیس پچیس اخبار اور کچھ باتصویر رسالے لے آنے لگا۔ جب وہ سائیکل پر سوار ہوکر آواز لگا لگا کر گاؤں والوں کو اپنی جانب متوجہ کرتا تو لوگ بڑی دلچسپی سے اس کی طرف تاکتے۔ بچے بالے تو اسے گھیر لیتے جو بڑی عمر کے بچے اسکولوں وکالجوں میں پڑھتے تھے وہ تو بہت ہی خوش نظر آتے۔ جو لوگ اخبار پڑھنے کے عادی تھے وہ تو اس کے فوراً خریدار بن گئے۔ جن کی عادت ابھی خرید کر پڑھنے کی نہیں بنی تھی وہ مفت میں ہی اس کے اخبار اور رسالے پڑھنے کی کوشش کرتے تھے۔ دیارام انھیں منع نہیں کرتا تھا بلکہ خود ہی ان کے آگے اخبار کر دیتا۔ وہ جان گیا تھا جن لوگوں کو ایک بار اخبار پڑھنے کا چسکا لگ جائے گا وہ اس سے پھر بچ نہیں سکیں گے۔ ان میں سے کئی ایک اس کے مستقل گاہک بن جائیں گے۔ لیکن اسے کو سب سے

بڑی خوشی یہ دیکھ کر ہوئی تھی کہ جو لوگ مستقل اخبار پڑھتے تھے وہ دیش بدیس کے بارے میں کئی طرح کا علم حاصل کرکے پہلے سے زیادہ ذہین بھی نظر آنے لگے تھے وہ اس کی عزت بھی کرتے تھے، جیسے انھیں احساس ہو چکا ہو کہ ان کے علم میں اضافہ کرنے کا وہی ایک ذریعہ ہے۔

دیارام کی آمدنی بڑھنے لگی۔ وہ اور زیادہ تعداد میں اخبار لانے لگا۔ بلکہ اس نے اپنے لئے ایک مستقل اڈہ بھی ڈھونڈ لیا۔ صبح سویرے گھروں پر اخبار بانٹ آنے کے بعد وہ بس اسٹاپ پر جا کھڑا ہوتا۔ جہاں کچھ بسیں یا ٹمپو ٹیکسیاں کچھ دیر کے لیے رک جاتی تھیں۔ سواریاں اتارنے اور چڑھانے کے لیے۔ وہاں بھی کچھ اخبار بک جاتے تھے۔ دوسرے گاؤں کے پاس کچھ فیکٹریوں کی تعمیر شروع ہو گئی تھی۔ اسی کی وجہ سے بھیڑ بھاڑ میں کچھ اضافہ ہو گیا تھا۔ بسوں، ٹمپو ٹیکسیوں اور ٹرکوں کے علاوہ موٹریں بھی آنے لگی تھیں۔ بس اسٹاپ پر جب لوگوں نے چائے اور پان سگریٹ کے اسٹال لگانے شروع کیے تو دیارام نے بھی ایک اسٹال لگوا لیا۔ مستقل اسٹال بن جانے کی وجہ سے بہت سے لوگ جو بسوں اور ٹیکسیوں کی انتظار میں کھڑے رہتے تھے اس کے اسٹال پر جمع ہو جاتے۔ کچھ نہ کچھ بکری تو یقیناً ہو جاتی تھی لیکن اس بھیڑ کے بے شمار چہروں کی طرف دیکھتے ہوئے اُسے ایک خوف بھی محسوس ہوتا تھا۔ وہی انجانا خوف — اُن میں سے کوئی ایک چہرہ اچانک اسے پہچان لے گا۔ وہ کوئی بھی ہو سکتا تھا۔ اُس کی دھندلی یادوں میں کھویا ہوا چہرہ ایک بار تو اسے ٹیکسی میں بیٹھا ہوا اپنا صاحب بھی نظر آیا تھا جس کی نوکری اُس نے چھوڑ دی تھی۔ لیکن وہ اُسے پہچان نہیں پایا تھا، اخبار لے کر آگے بڑھ گیا تھا۔ اُسے کچھ حیرت بھی ہوئی تھی۔ کیا وہ اس قدر بدل گیا ہے کہ اُسے اُس کا صاحب پہچان ہی نہیں سکا ہے! یہ صحیح تھا کہ وہ پانچ سال اور بڑا ہو گیا تھا۔ اس نے بڑی بڑی مونچھیں بھی رکھ لی تھیں لیکن پھر بھی وہ تھا تو وہی آدمی! گاؤں کے لوگوں نے اس کے نام کے ساتھ اخبار

والا بھی جوڑ لیا تھا۔ اب کوئی اُسے آدھے نام سے نہیں پکارتا تھا۔ اس نے بھی اب اخبار والا کو اپنے نام کا ضروری حصہ سمجھ کر قبول کر لیا تھا۔ اُسے کچھ خوشی بھی محسوس ہوئی تھی جیسے وہ پہلے ادھورا تھا۔ اب مکمل ہو گیا تھا۔ چنانچہ جب چائے اور پان سگریٹ والوں نے اپنے اپنے اسٹال کی پہچان کے لیے سائن بورڈ بنوا لیے تو دیا رام نے بھی ایک چھوٹا سا سائن بورڈ بنوا لیا جس پر لکھا تھا "دیا رام اخبار والا" اور پھر ایک دن بسوں، ٹمپو، ٹیکسیوں اور مسافروں کی بھیڑ بھاڑ میں ایک بے ہنگم شور مچاتی ہوئی موٹر سائیکل نمودار ہوئی جس پر دو لوگ سوار تھے۔ موٹر سائیکل سوار بڑی حیرت سے اس کے اسٹال پر لگے سائن بورڈ کو پڑھتا رہا اور اس کے پیچھے بیٹھی ہوئی دھوتی میں ملبوس اور آنکھوں پر کالا چشمہ چڑھائے ہوئے عورت اس کے چہرے کی طرف تاکتی رہی۔ جیسے اسے پہچاننے کی کوشش کر رہی ہو۔

پھر وہ دونوں جیسے خوشی سے اچھل پڑے۔ انھوں نے اس کے بڑی بڑی مونچھوں کے پیچھے چھپے ہوئے بچپن کے چہرے کو بھی پہچان لیا۔ سرجو نے اس کے سر پر ایک دھول جما کر کہا —— "سالا، ہم سے بھاگ کے کہاں جائے گا——؟ ڈھونڈ ہی لیا نہ آخر!"

اُس نے آگے بڑھ کر چمپا کے پاؤں چھوئے تو چمپا نے حسبِ عادت اپنے ماتھے تک گھونگھٹ کھینچ لیا لیکن مسکرا کر بولی —— "ارے، یہ تو اپنا دیا رہوا ہے!"

دیا رام نے اُن سے اُن کے گھر سے اچانک بھاگ آنے کے لیے معافی مانگی اور اُن کے لیے ٹی اسٹال سے چائے اور بسکٹ منگوائے اور جب اُن کی سگریٹ و پان سے بھی تواضع کر چکا تو ان سے ڈرتے ڈرتے ہی پوچھا —— "آج آپ لوگ ادھر کیسے نکل پڑے؟"

سرجو نے اسٹال سے ذرا فاصلے پر تھوک کی لمبی پیک پھینکتے ہوئے کہا —— "ہم لوگ بدرپور کے فیکٹری ایریا کی طرف جا رہے ہیں۔ وہاں کئی ہزار آدمیوں کی آبادکاری ہو گئی ہے۔ وہاں تک اخبار وغیرہ سپلائی کرنے کا وچار کیا ہے۔ لیکن تم فکر مت کرو ہم تمھارے ساتھ یہاں کمپٹیشن ہرگز نہیں کریں گے۔ بلکہ ایسا کرو تم ہمارے ساتھ ساجھے داری کر لو —— نام تمھارا ہی چلتا رہے گا۔ ہم تمھیں صبح پہلی بس سے اخباروں کے بنڈل بھجوا دیا کریں گے۔ وہاں تک جانے کے لیے موٹر سائیکل بھی ادھار کر دیں گے۔ سمجھے! اور کمیشن آدھا آدھا! منظور؟"

دیا رام نے پہلی بار اپنے اسٹال کے سامنے لیٹی ہوئی اس سرمئی سڑک کو غور سے دیکھا جو شہر سے آکر آگے نکل جاتی ہے اسی کی وجہ سے شہر کی تہذیب کا اژدہا بھی رینگتا رینگتا اس کے گاؤں تک اور پھر اس گاؤں سے بھی بہت آگے نکل گیا ہے۔ کہیں یہ وہی اژدہا تو نہیں ہے جو اس کا پیچھا کرتا رہتا تھا اور وہ اس سے ڈر کر آگے ہی آگے بھاگتا پھرتا تھا! وہ تو اُس سے بھی آگے جا چکا ہے۔ جس کا پیچھا کرنے کے لیے سرجو اب اس کو اُکسا رہا ہے۔!

دیا رام نے کسی قدر جھجک کے ساتھ پہلے سرجو کی طرف دیکھا پھر چمپا کی طرف جو آنکھوں پر ابھی تک کالا چشمہ چڑھائے اور ماتھے تک گھونگھٹ کھینچے اس کی طرف دیکھ دیکھ کر بڑی اپنائیت سے مسکرا رہی تھی۔ وہ بولی —— "سوچت کا ہو بھیا؟ ہاں کہہ ڈارو اب —— اس سے تمھار کاروبار نہ پھیلی؟ اس کے بعد تمھاری شادی بھی تو رچاؤں گی۔ تم سے کہا تھا نا! ایک لڑکی دیکھ لی ہے میں نے۔ ہاں!"

وہ دونوں زور سے ہنس پڑے تو دیا رام کو بھی ان کے ساتھ ساتھ ہنستے ہی بن پڑی۔

★

باوا کرشن گوپال مغمومؔ

جوشؔ ملسیانی

۱
متزلزل ہے قصرِ اردو کا — وہ ستونِ ادب گرا ہے آج
رحلتِ جوشؔ ملسیانی پر — محشرِ رنج و غم بپا ہے آج

۲
ہو گئی کم چراغِ علم کی ضو — محفلِ شعر میں ہے ظلمت سی
پیکرِ غم ہیں جملہ اہلِ نظر — اہلِ دل پر ہے ایک وحشت سی

۳
وہ جو ستّر برس سے جاری تھا — چشمۂ فیضِ شعر بند ہوا
تشنہ کامانِ فن کہاں جائیں — آسماں دسپئے گزند ہوا!

۴
سرنگوں ہے غزل کا پرچم آج — آخری یادگارِ داغؔ مٹی
چھا گئی یوں زبان و فن پہ خزاں — دمِ زدن میں بہارِ داغؔ مٹی

۵
اٹھ گیا وہ مزاج دانِ غزل — فن پہ جس کو عبورِ کامل تھا
دے گیا سب زبانِ اردو کو — جو زبان و بیاں کا حاصل تھا

۶
عمر بھر کے ریاضِ پیہم سے — نورِ پاکیزگی غزل کو دیا
اور وجدان و ذوق سے اپنے — حُسنِ شائستگی غزل کو دیا

۷
ماہرِ کاملِ نکاتِ عروض — وہ رموز آشنا فصاحت کا
ہو گیا راہیِ عدم، افسوس — وہ جو نبّاض تھا بلاغت کا

۸
اُس کا اصنافِ شعر پر قابو — اُس کی تاریخ گوئی کامل
اُس کے رُتبے کا اب کہاں ہوگا — صاحبِ فن و شاعرِ فاضل

۹
ایک نقّادِ بے بدل تھا وہ — اک ادیبِ شہیر تھا مرحوم
نکتہ سنجی میں، نکتہ فہمی میں — آپ اپنی نظیر تھا مرحوم

۱۰
بزمِ شعر و سخن میں تحت اللفظ — اُس کے پڑھنے کا باوقار انداز
چھا ہی جاتی تھی ہر "ترنّم" پر — سرِ محفل وہ گونجتی آواز

۱۱
نثر و نظم و غزل کے میداں میں — سخت مشکل تھی ہمسری اس کی
مانتے تھے اکابرِ اُردو — اک زمانے سے رہبری اس کی

۱۲
محترم المقام ہو کر بھی — سر بسر سادگی کا پیکر تھا
کبر و نخوت کی بو نہ تھی اس میں — وہ کہ انسانیت کا مظہر تھا

۱۳
نامِ پنجاب اس سے روشن تھا — فخرِ ہندوستاں تھی ذات اسکی
واہ رے! اس کی رفعتِ کردار — کتنی اونچی تھی بات اسکی

۱۴
محسنِ ادب میں ہے جاوید — نامِ نامی رہا فصاحت کا
اور تاریخِ فن میں چمکے گا — ایک اک نقش اس کی عظمت کا

سید محمد امین

مومن کی قصیدہ گوئی

مومن اپنے معاصرین میں ایک اہم حیثیت کے حامل تھے۔ بحیثیت غزل گو تو ان کا ایک منفرد مقام ہے ہی، قصیدہ گوئی میں بھی ان کا اپنا الگ مقام ہے۔ اردو ادب کی بدقسمتی ہے کہ مومن پر سیر حاصل کام نہیں ہوا۔ پروفیسر ضیاء احمد بدایونی، نیاز فتح پوری اور ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی ان چند مقتدر نقادوں میں ہیں جنھوں نے مومن پر کام کیا۔ زیر نظر مضمون میں مومن کی قصیدہ گوئی کا تنقیدی جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔

کلیات مومن میں قصائد کی مجموعی تعداد کل نو ہے، جن میں ایک حمد، ایک نعت، پانچ خلفائے راشدین کی منقبت ہیں۔ ایک محمد وزیر خاں والیِ ٹونک اور دوسرا قصیدہ مہاراجہ پٹیالہ کے بھائی راجہ اجیت سنگھ کی مدح میں ہے۔ مومن نے کوئی قصیدہ حصولِ زر یا صلے کی غرض سے نہیں لکھا۔ آخر الذکر دونوں مدحیہ قصائد کی نوعیت بھی یہی ہے۔ والیِ ٹونک نواب محمد وزیر خاں کی مدح میں جو قصیدہ ہے اس میں اپنی عدم حاضری کی معذرت کی گئی ہے اور راجہ اجیت سنگھ کی مدح میں جو ہے اس میں مومن نے بلا طلب عطیہ کا شکریہ ادا کیا ہے۔ انھوں نے کسی رئیس یا بادشاہ کی تعریف میں کوئی قصیدہ نہیں لکھا۔ اس کی اہم ترین وجہ ان کی خودداری اور غیور فطرت تھی۔

پروفیسر ضیاء احمد بدایونی کے یہ چند جملے مومن کی قصیدہ گوئی کے سلسلے میں بہت اہم ہیں:

"مومن سے پہلے جس قدر شعرا گزرے ہیں (بہ استثنائے سودا) مومن کا کوئی ہمسر نہیں ہے اگرچہ پختگی اور روانی میں قصائد ذوق کا درجہ کہیں ارفع ہے تاہم زور اور ندرت میں مومن کا جواب نہیں ہو سکتا۔ ان کی تشبیب عموماً نادر اور انوکھی ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ہی ہر قصیدہ میں تعلّی اور شکایت زمانہ کہ جو سنت الشعرا ہے، اس شکوہ اور زور کے ساتھ پائی جاتی ہے کہ عرفی کا دھوکا ہوتا ہے۔ تخلص یا گریز البتہ نسبتاً کمزور ہوتا ہے۔ کلام میں عقیدت کی جھلک اکثر نظر آتی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں مذہبی تعریض بھی کر جاتے ہیں۔ کلام میں علمی مضامین بکثرت لاتے ہیں۔۔۔۔ کہیں کہیں تلمیحات اور آیات و احادیث کی طرف بھی اشارات کرتے ہیں اور بعض جملوں کی تو اس خوبی سے تضمین کر جاتے ہیں کہ انگوٹھی میں نگینہ کا گمان ہوتا ہے[1]۔"

مومن نے فارسی شعرا یا سودا کے قصائد کی تقلید نہیں کی بلکہ مجتہدانہ طرز اختیار کرتے ہوئے خود اپنے لیے نئی نئی راہیں

---

[1] مجموعۂ قصائد مومن مرتبہ ضیاء احمد بدایونی۔

اختلافِ فن کی ہے۔ ان کے دو قصائد چھوٹی بحروں میں بھی ہیں۔ ان سے پہلے سوائے سوداؔ کے چھوٹی بحروں میں کوئی قصیدہ نہیں ملتا۔ مومنؔ کے بعض قصائد مشکل زمینوں میں بھی ہیں۔ ایک قصیدے میں انھوں نے ردیف کا بھی اہتمام کیا ہے۔ ان کے قصائد کی زمینیں یہ ہیں:

۱۔ اَلحَمدُ لِوَاہِبِ العَطَایَا
اس شور نے کیا مزا چکھایا

۲۔ چمن میں نغمۂ بلبل ہے یوں طرب مانوس
کہ جیسے صبحِ شبِ ہجر نالہائے خروس

۳۔ کوئی اس دور میں جیے کیونکر
ملک الموت ہے ہر ایک بشر

۴۔ جو اس کی زلف کو دوں اپنے عقدۂ مشکل
تو بوالہوس کا بھی ہرگز کبھی نہ چھوٹے دل

۵۔ ہے یہی صورتِ دیدار تو مرنا دشوار
دم شماری کی مری عمر ہے تا روزِ شمار

۶۔ کشتی ہے میری تیغِ زباں سے زبانِ تیغ
کیونکہ سخن فروش ہوں سوداگرانِ تیغ

۷۔ چاہنا خلق کو صہبائے ستم سے محروم
ایسی نیت سے ہے بستہ آپ کو داعظِ مظلوم

۸۔ یاد ایامِ عشرتِ فانی
نہ وہ ہم ہیں نہ وہ تن آسانی

۹۔ صبح ہوئی تو کیا ہوا ہے وہی تیرہ اختری
کثرتِ دود سے سیاہ شعلۂ شمعِ خاوری

قصیدے کا پہلا شعر مطلع ہوتا ہے اور مطلع سے شاعر کے کمالِ فن کا اظہار ہوتا ہے۔ مومنؔ کے قصائد میں بعض مطلعے بہت پرشکوہ ہیں اور بلاشبہ عمدہ مطلعوں کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں۔ مثلاً ان کے یہ دو مطلعے:

۱۔ صبح ہوئی تو کیا ہوا ہے وہی تیرہ اختری
کثرتِ دود سے سیاہ شعلۂ شمعِ خاوری

۲۔ کشتی ہے میری تیغِ زباں سے زبانِ تیغ
کیونکہ سخن فروش ہوں سوداگرانِ تیغ

ان مطلعوں میں نازک خیالی بھی ہے اور قصیدہ کا لب و لہجہ اور شان و شکوہ بھی۔ اس کے علاوہ ان میں بلند آہنگی اور زورِ بیان کے ساتھ ساتھ جو روانی ہے اس سے بھی قاری متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

قصیدے کا پہلا حصہ یعنی تمہید تشبیب کہلاتی ہے۔ مومنؔ نے اپنے قصائد کی تشبیبوں میں وارداتِ حسن و عشق، مناظرِ فطرت، کائنات، رندی و میخواری، گردشِ چرخ کا گلہ، شکایتِ زمانہ، تغیراتِ مملکت، اپنی ہنرمندی اور زمانے کی ناقدری کے مضامین نظم کیے ہیں۔ ان کے بیشتر قصائد بزرگانِ دین کی شان میں لکھے گئے ہیں۔ ان قصائد میں بھی مومنؔ نے عاشقانہ اور رندانہ تشبیب روا رکھی ہے۔ مومنؔ کے اکثر قصائد کی تشبیبوں میں موضوع کے اعتبار سے غزل کا سا انداز ملتا ہے جو دراصل تشبیب کی خوبی ہے کیونکہ لفظ 'تشبیب' 'شباب' سے مشتق ہے اور عشق کے مضامین پر دلالت کرتا ہے۔ عشقیہ تشبیب کی دو مثالیں ملاحظہ ہوں:

تم اور حسرتِ ناز، آہ کیا علاج کروں
میں نیم جاں نہ رہا امتحان کے قابل
چلا ہی جاتا ہوں میں گو چلا نہیں جاتا
غضب ہے شوقِ رسائی و دوریِ منزل
یہ کیا غضب ہے کہ تم کو تو ربط غیر سے اور
مجھے یہ حکم کہ زنہار تو، کسی سے نہ مل
(قصیدہ در منقبت حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ)

دوسری جگہ مومنؔ تشبیب میں لکھتے ہیں:

ہے یہی صورتِ دیدار تو مرنا دشوار
دم شماری کی مری عمر ہے تا روزِ شمار
بدگمانی نے دعا سے بھی رکھا محروم آہ
مانِع دل غیر سے کس طرح میں کرتا انکار

دور اتنے رہے محرومیِ قسمت سے کہ ہم
سمجھے ہندی مضموں کو بھی تبانِ فرخار
(قصیدہ در منقبت حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ)

راجہ اجیت سنگھ کی مدح میں جو قصیدہ لکھا ہے اس کی تشبیب میں اپنی بدقسمتی کا بیان کرتے ہوئے مومن کہتے ہیں :

صبح ہوئی تو کیا ہوا، ہے وہی تیرہ اختری
کثرتِ دود سے سیاہ شعلۂ شمعِ خاوری
چشمِ ستارۂ سحر لون زحل سے سرمہ سا
دشنۂ ترک چرخ سے تیز نگاہ مشتری
مجھ کو فغاں سے کام اور ذکر میں اہلِ خانقاہ
دیر میں شور بے رخواں میکدہ میں نوا گری

حضرت علی کی شان میں مدحیہ قصیدے کی تشبیب فخریہ ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں :

کشتی ہے میری تیغِ زباں سے زبانِ تیغ
کیونکر سخن فروش ہوں سوداگرانِ تیغ
میرے نفس کی دیکھ کے معجز نمائیاں
کیا دور ہے کہ دم نہ رہے درمیانِ تیغ
فردوسی ایک خارِ جنانِ بیان تھا
گلریز میرے دم سے ہوئی داستانِ تیغ
میدانِ کشت و خوں میں مرا دستِ نے سوا
جادے عناں کشیدہ تو ہو ہم عنانِ تیغ

نعتیہ قصیدے کی تشبیب مضمون کے اعتبار سے بہاریہ ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں :

نوائے طوطیِ شکر فشاں کی لذت سے
سماع و رقص میں اہلِ مذاق جوں طاؤس
نیاز بہ سحن چمن کیمیائے عیش و نشاط
بہار لالہ و گل سیمیائے عرض شموس
نہ ہے فریب صفا، خاک بیز ہے گلچیں
پڑے ہے جو وسعت گلزار میں گلوں کے فلوس
ہجوم سبزہ نے کی بسکہ رنگ آمیزی
زمیں پہ چادرِ مہتاب بن گئی ہے سندس

مومن کی تشبیب اکثر کافی طویل ہوتی ہے۔ ان کے قصائد میں تشبیب کے اشعار تقریباً مدحیہ اشعار کے برابر ہوتے ہیں۔ مومن کی تشبیب ان کے دوسرے معاصرین کے مقابلے میں بہت اعلا اور بلند مرتبہ ہوتی ہے۔ ان کے بعض قصائد کی تشبیب میں جیسا کہ سطور بالا میں ذکر کیا گیا تغزل کا سا انداز پیدا ہو گیا ہے۔ مومن نے بڑی کامیابی کے ساتھ تغزل کے انداز کو برقرار رکھتے ہوئے قصیدہ کی شان و شوکت اور بلندیِ معنی کو مجروح نہیں ہونے دیا۔ مومن نے جو قصیدہ نواب محمد وزیر خاں والی ٹونک کی مدح میں لکھا ہے، اس کی تشبیب میں تغزل کا انداز ملاحظہ ہو :

یاد ایام عشرت فانی — نہ وہ ہم ہیں نہ وہ تن آسانی
جائیں وحشت میں سوئے صحرا کیوں — کم نہیں اپنے گھر کی ویرانی
خاک میں ٹونک کی سماں سے ملی — ہائے کیسی بلند ایوانی

مومن نے تشبیب میں تعلّی اور ناقدریِ زمانہ کے مضامین بھی بڑی قدرت اور زورِ بیان کے ساتھ باندھے ہیں اور خصوصاً فخریہ اشعار میں ان کا لب و لہجہ قصیدہ گوئی کی اعلا منزل پہ پہنچ جاتا ہے۔ جہاں تک صرف سودا کی رسائی ہے بلکہ بعض اوقات تو قدرتِ بیان، جدتِ خیال اور معنی آفرینی میں وہ سودا سے بھی آگے جاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ قصیدہ کا دوسرا حصہ گریز کہلاتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں سے شاعر تشبیب سے گریز کر کے اصل موضوع مدح کی طرف آتا ہے۔ اس حصے کی خوبی یہ ہونا چاہیے کہ تشبیب سے مدح کی طرف اس طرح گریز کیا جائے کہ فطری معلوم ہو اور تصنع نہ پیدا ہونے پائے۔ علماء نے اسے دو سرکش بیلوں کو ایک جوئے میں جوتنے سے تعبیر کیا ہے۔

مومن کے ہاں گریز اگرچہ ان کے قصائد کی دوسری خصوصیتوں کی طرح تو زوردار نہیں لیکن وہ تشبیب اور مدحیہ

حصّے کو ایک دوسرے سے چسپاں کر دینے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ ان کے بعض قصائد کے گریز کے اشعار ملاحظہ ہوں :

ہوا ہے کون سی ایسی مگر مدینہ کی — دم مسیح کو ہے جس کی حسرتِ پابوس
شرف مدینہ کو جس سے ہے، ہو نہ ہو وہ ہے — جسے بتاتے ہیں محبوب حضرتِ قدوس

حضرت علی کی مدح میں قصیدے کی تشبیب میں اپنی شاعری کی تعریف کرتے کرتے اس طرح گریز کرتے ہیں :

مومن کو آرزو ہے ثوابِ جہاد ہے — کفار کاش آ کے بنیں امتحانِ تیغ
آئی ہے لب پہ مدح خداوند ذوالفقار — لے جاؤ منکروں کے لئے ارمغانِ تیغ

'مدح' جو عام طور پر قصائد کی جان ہوتی ہے، مومن کے یہاں عروجِ کمال پر ہے مدحیہ حصے میں جو ندرت، جدت اور نازک خیالی مومن کے یہاں ملتی ہے وہ انھیں کا حصہ ہے۔ ان کے قصائد کی مدح میں جوش و ولولہ، عقیدت اور خلوص کی جھلکیاں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں۔ ان کے قصائد کی مدح کو پڑھ کر ان کی سچی عقیدت اور حقیقی خلوص کا اندازہ ہوتا ہے۔ حضرت عثمان کی مدح کرتے ہوئے مومن کہتے ہیں :

لطف سے اس کے زمیں غیرتِ باغِ فردوس
خلق سے اس کے زماں رشکِ دکانِ عطار
کرّۂ آب ہو گر قطرۂ عمّانِ ہمم
صدفِ چرخ کرے شکوۂ طغیانِ بحار
اس کے تمکیں سے اگر کوہ کو دیجے تشبیہ
ہے یقیں شعلۂ جوّالہ کو آجائے قرار

حضرت علیؓ کی شان میں مومن اس طرح مدح سرا ہیں :

وہ آنچ تیری تیغ میں جل جائے مشلِ طور
گر تو صنم کدہ پہ کرے امتحانِ تیغ
حسرت ہے تیرے بوسۂ دستِ بلند کی
کس طرح چرخ پر نہ چڑھے کہکشانِ تیغ
دشمن کا ایک نیم اشارے میں کام ہو
ابرو کا تیرے عکس پڑے گر میانِ تیغ

مومن کے دو مدحیہ قصائد راجہ اجیت سنگھ اور نواب محمد وزیر خاں کی مدح میں ہیں۔ ان میں مومن بھی بعض جگہ دوسرے قصیدہ گو اردو شعرا کی طرح بہک گئے ہیں اور اپنے ممدوح کی شان میں ایسی مدح سرائی کی ہے جو مومن جیسے غیور طبیعت شاعر کو زیب نہیں دیتی۔ مثلاً محمد وزیر خاں کی مدح سرائی کرتے ہوئے مومن لکھتے ہیں :

اوّل اس در پہ جبہ ریزی کر
تا ملے مفت جاہِ کیوانی
پھر طوافِ حرم میں ہو مشغول
تیرے صدقہ شروطِ ایمانی

لیکن ان خامیوں کے باوجود ہم اس بات سے منکر نہیں ہو سکتے کہ مومن کی مدح بے حد پُر اثر اور جاندار ہوتی ہے اور مومن کی نازک خیالی اور قدرتِ بیان کا مظہر ہوتی ہے۔ یوں بھی مدح پر استدلال کرتے وقت ہمیں پروفیسر رشید احمد صدیقی کے ان جملوں کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے جو انھوں نے قصائدِ مومن مع شرح مرتبہ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی کے مقدمہ میں لکھے ہیں :

"قصیدہ نگار کے لیے ممدوح در اصل ایک بہانہ ہے جس کی آڑ لے کر وہ اپنا اور اپنے فن کا کمال دکھاتا ہے۔ ممدوح بھی یہ نہیں سمجھتا کہ لفظاً و معناً ساری ثنا و صفت اس پر صادق آتی ہے وہ اپنی بڑائیاں سن کر نہیں بلکہ شاعر کے کمالِ فن پر انعام دیتا ہے...... آج تک کسی قصیدے سے کسی ممدوح کا مرتبہ بلند نہیں ہوا لیکن اس قصیدے کا ہوا جو ممدوح کی شان میں لکھا گیا تھا اور اس شاعر کا ہوا جس نے وہ قصیدہ تصنیف کیا تھا۔"

رشید صاحب کے مذکورہ بالا اقتباس کی روشنی میں اگر ہم قصائدِ مومن کی مدح کا جائزہ لیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ مومن کے قصائد کا یہ حصہ فنی اعتبار سے بہت بلند ہے اور علاوہ سودا کے کوئی بھی دوسرا اردو قصیدہ نگار ان کا مقابلہ کرنے سے عاجز ہے۔

راجہ اجیت سنگھ کی مدح میں مومن لکھتے ہیں:

دستِ گہر فشاں سے وہ نامہ اگر کرے رقم
دامِ ہما ہو حسرتِ مرتبۂ کبوتری

حاتم و معن پائمال اس کے صفِ نعال میں
صدر نشینِ بزم کام بخشش و فیض گستری

لعل لبِ اس کے دُر فشاں جیسے گہر نثارِ دست
جائزہ کم نہ آفریں دونوں میں ہے برابری

جمع ہیں تجھ میں عدل و حسن جن سے خرابیاں خراب
مستِ شرابِ لب شراب، محو پری رُخی پری

ممدوحین کے اسبابِ متعلقات کا بیان بھی قصائد میں اکثر مروج ہے۔ مومن کے قصائد میں بھی ممدوحین کے ساز و سامان اور متعلقات کی تفصیل بیان کی گئی ہے نعتیہ قصیدہ میں حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی شمشیر مبارک کے بارے میں لکھتے ہیں:

دو نیم ہوں تری شمشیر کے تصور سے
بسانِ ساغرِ خورشید کاسہ ہائے رؤس

دوسرے شعر میں نیزے اور گرز کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے:

ہلا دے گاؤ زمیں گاؤ چرخ سے نیزہ
بٹھا دے خاک پہ شیر سپہر کو دبوس

بُراق کی تعریف میں مومن اس طرح زمزمہ خواں ہیں:

براقِ اسپ ترا ابر دے فرشتہ رکاب
کہاں ہو چشم بشر ایسے پاؤں سے ممسوس

محمد وزیر خان کے لشکر اور ساز و سامان کے بیان میں مومن اس طرح رقم طراز ہیں:

اس کے ایک ایک لشکری کا دنگ — دعوئے سامری و نریمانی
خنجر جاں شگاف میں اس کے — ابروئے یار کی سی برانی

راجہ اجیت سنگھ کے مدحیہ قصیدہ میں آلاتِ حرب و ضرب کا بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

بال و پر فرشتۂ موت ہیں یا پرِ خدنگ
دشنۂ تشنۂ قضا یا تیرسے تیر کی سری

خندۂ برق تیغ میں گرمیِ مہر و ماہ تیر
گریۂ زخم تیر میں جوشِ سحاب آذری

گھوڑے کی تعریف بھی قصیدہ کا ایک اہم پہلو ہے۔ مومن نے بھی اپنے بعض قصائد میں ممدوحین کے گھوڑے کی تعریف میں اشعار کہے ہیں۔ راجہ اجیت سنگھ کے گھوڑے کی تعریف کرتے ہوئے مومن لکھتے ہیں:

توسن بادپا ترا روز دغا ر بگاڑ دے
صرصرِ عاد کی ہوا دم میں دکھا کے سرسری

اطلسِ چرخ زیر گرد جوش ہوا ہے رشک سے
آتشِ سینۂ نجوم خجلت آبِ پیکری

ہائے سبک عنانیاں واہ گراں رکابیاں
گاہ غزال چیں ہے وہ گاہ پلنگ بربری

مومن نے بعض قصائد میں ممدوح کے ظاہری حسن کی بھی تعریف کی ہے۔ راجہ اجیت سنگھ کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

تو وہ بہارِ باغِ حسن جس پہ کرے نثار جاں
لالہ رخی، سہی قدی، گل بدنی، سمن بری

لب کو مثال کس سے دوں لعل و عقیق سب بے مزا
گل میں کہاں یہ نازکی مُل میں کہاں یہ احمری

اردو قصائد میں مدح کے بعد فخریہ اشعار مومن کا خاصہ ہیں۔ مدح کے بعد فخریہ اشعار کی پابندی مومن کے علاوہ کسی دوسرے شاعر نے نہیں کی۔ یہ ان کی انفرادیت ہے۔ ان فخریہ اشعار سے بھی ان کی قدرتِ بیان کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ تحرّ خود ستائی مومن کو زیب بھی دیتی ہے۔

فخریہ اشعار کے چند نمونے دیکھیے:

سامنے میری تر زبانی کے — نطق الکن حدیث سحبانی
میرے ربطِ کلام کو پہنچے — نثرِ سعدی نہ نظمِ سلمانی

میرے گوہر تمام ناسفتہ — میرے یاقوت سب بدخشانی
میں وہ سرمایۂ بلاغت ہوں — جس کے در کا گدا ہے خاقانی

دوسرے قصیدہ میں تعلّی کرتے ہوئے مومن کہتے ہیں:

سحر حلال سے مرے جادوے سامری تخیل
طورِ کلیم اوجِ فکر، نورِ خدا فسونِ گری
میری زبان میں وہ بات جس سے ملک سخن بہ دست
میرے بیان میں وہ سحر جس سے جنوں زدہ پری

مومن کی قصیدہ نگاری کی ایک امتیازی خصوصیت یہ بھی ہے کہ انھوں نے کسی بھی قصیدہ میں مدح کے بعد اپنی دشواریوں اور بدحالیوں کا بیان کر کے ممدوح کے آگے دست سوال نہیں پھیلایا ہے بلکہ ان کے تقریباً سبھی قصائد میں مدح کے بعد خود ستائی ملتی ہے۔

دعائیہ حصے میں مومن پُر خلوص اور عقیدت مندانہ انداز میں دعا دیتے ہیں۔ چند قصائد کے دعائیہ اشعار پیش ہیں۔ نواب وزیر خاں کو دعائیہ دیتے ہوئے مومن کہتے ہیں:

جب تلک باعث نشاط و ملال — ہے وصال و فراقِ جانانی
تیرے حساد و رنج گوناگوں — تیرے احباب اور تن آسانی
تیرا اقبال روز افزوں ہو — جیسے مومن پہ لطفِ رحمانی

نعتیہ قصیدہ میں دعائیہ انداز ملاحظہ ہو:

ہے جب تلک گل و بر قسمت نہال و شجر
ہے جب تلک دل لالہ میں داغ حسرتِ بوس
مدام پھولے پھلے دوستوں کا نخلِ مراد
رہیں داغ عدو کا رہے دل مایوس

مومن کے قصائد میں علمی مضامین بکثرت ملتے ہیں۔ مومن بذاتِ خود طب، نجوم، رمل، حکمت وغیرہ کے ماہر تھے یہی وجہ ہے کہ ان کے قصائد میں جا بہ جا ان سب علوم کی اصطلاحات ملتی ہیں مثلاً نعتیہ قصیدہ میں علمی اصطلاحات ملاحظہ ہوں:

جو ہوں معالج مبطون تو قابض ارواح
کرے دعاے رواج طریقِ جالینوس

کروں جو گردشِ انجم کی میں رصد بندی
فدا ہو وجد میں آ کے روانِ بطلیموس

تلمیحات، آیاتِ قرآنی اور احادیث کا استعمال بھی مومن نے اپنے قصائد میں بڑی خوبی اور مہارت کے ساتھ کیا ہے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں:

جو دیکھیں میری طبیعت کی گوہر افشانی
شریک ور ہوں محمود و نکتہ پرور طوس (تلمیح)

بو سر روا بہر طریق، سجدہ و فرق ہر فریق (تلمیح)
سنگ در اس کا اک صنم رشکِ بتانِ آذری

وہ ترا پایہ ہے اے شاہِ جوانانِ بہشت
کہ ہو گی حرمتِ پیری کی تمنا محروم
(حدیث)

اَلحَمدُ لِوَاهِبِ العَطَایه — اس شور نے کیا مزا چکھایا
(عربی جملے کی تضمین)

وَالشُّکرُ لِصَانِعِ البَرِیَّه — جس نے ہمیں آدمی بنایا
(عربی جملے کی تضمین)

جب تب وَالضُّحیٰ پڑھے ہے امام — مقتدی تا نہیں فَلَا تَنهَر
(آیت قرآنی)

ان سب خصوصیات کے علاوہ قصیدہ میں فنی اعتبار سے اس کی زبان کی بڑی اہمیت ہوتی ہے قصیدہ کی زبان کے لیے جزالت و متانت ضروری ہے۔ اس کے الفاظ باوقار اور پُر شکوہ ہونا چاہیے۔ قصیدے کا معیار اس کی زبان اور الفاظ کی شان و شوکت، اس کی تراکیب کی بلند آہنگی، ندرت خیال اور زورِ بیان ہے۔ یقیناً قصیدہ محض الفاظ کے مجموعہ کا نام نہیں لیکن سنگلاخ زمینیں، تشبیہات و استعارات کی جدت اور صنائع و بدائع کی فراوانی قصیدہ کی خوبیاں ہیں۔ زبان و بیان کی خوبیاں مومن کے قصائد میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ الفاظ و تراکیب کی شان و شوکت مومن کے قصائد میں ہر جگہ نمایاں ہے۔ تشبیہہ استعارہ کا استعمال مومن نے اپنے قصائد میں بڑی خوبصورتی سے کیا ہے مثلاً

غبارِ صحنِ چمن کیمیائے عیش و نشاط
بہارِ لالہ و گل سیمیائے عرضِ شموس (السنہ

خمیدہ شاخ ہے یوں رنگِ گل چمکتا ہے
کہ جس طرح سے بھڑک اٹھے مشعلِ منکوس (تشبیہ)

مومن کے قصائد میں صنائع و بدائع کا التزام بھی جگہ جگہ نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پہ ملاحظہ کریں:

یوسف سے عزیز کو کئی سال
زندانِ عزیز میں پھنسایا (تجنیس)

حسرت لعل سیم تن میں ہوئے
گوہرِ اشکِ چشم مرجانی (ایہام تناسب)

خزانہ خاک میں ہر تنگ دل ملاتا ہے
زبسکہ نقطۂ خزاں جانتے ہیں سب منحوس (حسنِ تعلیل)

جب تلک ذلت و عزت، طرب و غم سے ہو خلق
گوشہ گیر انجمن افروز، سلیمیں و معدوم (لف و نشر مرتب)

مومن نے قصیدے کے تمام اجزا کو باقاعدگی کے ساتھ برتا ہے اور اس میں جدت و ندرت کے ساتھ نازک خیالیوں اور بلند پروازیوں کے ایسے نمونے پیش کیے ہیں جو صرف انھیں کا حصہ ہیں۔

اگر ہم اردو کے پانچ عظیم قصیدہ گو شعراء کا نام لیں تو ان میں نصرتی، سودا، ذوق، انشا کے ساتھ مومن کا نام ضرور لیا جائے گا۔

★

شاعرِ انسانیت ۔ تلوک چند محروم (صفحہ ۱۲ کا بقیہ)

ایسی کسی جوگن کی بھی کٹیا نہیں ہوتی
ہوتی ہے مگر یوں سرِ صحرا نہیں ہوتی

حسرت ہے ٹپکتی در و دیوار سے کیا کیا
ہوتا ہے اثر دل پہ ان آثار کے کیا کیا
نالے ہیں نکلتے دلِ افگار سے کیا کیا
اٹھتے ہیں شرر آہِ شرربار سے کیا کیا

یہ عالمِ تنہائی یہ دریا کا کنارا
ہے تجھ سی حسینہ کے لیے ہو کا نظارا

محروم کی سیاسی و وطنی نظمیں جو کاروانِ وطن میں ہیں ان سے ہندستان کی جنگِ آزادی کی ایک تاریخ مرتب ہو سکتی ہے۔ ان نظموں کی خاص بات یہ ہے کہ سیاسی اور بیانیہ شاعری ہونے کے باوجود لطفِ سخن اور لطافتِ بیان کی کمی نہیں محسوس ہوتی۔

★

غزلیں

نجم الدین نقوی

خونِ دل سے جو نہیں آب ملا میرے بعد
چمنِ حسن نہ سرسبز رہا میرے بعد

بال کھولے ہوئے آئے جو مری میت پر
حشر میں حشر ہوا اور بپا میرے بعد

میں نہ کہتا تھا کہ مجھ تک ہے فقط ذوقِ سجود
کس نے پھر تیغ تلے سر کو رکھا میرے بعد

صرف مجھ تک تھی مگر نسبتِ عنبِ جلوہ طراز
موجِ مے پھر نہ ہوئی بال کشا میرے بعد

کون سلجھائے گا الجھے ہوئے گیسو تیرے
"کون کھولے گا ترے بندِ قبا میرے بعد"

کون پوچھے گا شمیمِ رُخ و گیسو کا مزاج
کس سے اٹھلائے گی پھر موجِ صبا میرے بعد

یک بہ یک جیسے ہوئی ختم حدیثِ غمِ جاں
دردِ دل کس نے کہا، کس نے سُنا میرے بعد

دیکھ صورت مری ہو جاتے ہیں پتھر پانی
مجھ سا آئینہ بھلا کون بنا میرے بعد

منفعل ایسی ہوئی قتل پہ میرے نقوی
پھر نہ بے پردہ ہوئی تیغِ نگہ میرے بعد

حیات وارثی

جب ترا روپ مرے فن سے سنور جائے ہے
حسنِ دوشیزۂ افکار نکھر جائے ہے

میری آنکھوں کے تکلم سے پریشاں کیوں ہو
چند لمحوں میں یہ طوفان گزر جائے ہے

درِ احساس پہ پہرے ہیں غرض مندی کے
محفلِ دہر میں جس سمت نظر جائے ہے

گل و شبنم سے حکایاتِ شبِ غم سُن کر
جو سحر آئے ہے با دیدۂ تر جائے ہے

اس طرح گزرے ہیں کترا کے بُرے وقت میں لوگ
جس طرح خواب اک آہٹ سے بکھر جائے ہے

ساقیِ بزم کی کوتاہ نگاہی کی قسم
خود چھلک جائے ہے پیمانہ جو بھر جائے ہے

میکدہ دل کا حیاتؔ آؤ پھر آباد کریں
نشۂ مے تو بہت جلد اتر جائے ہے

مجیب سہالوی

(مزاحیہ)

میری بچّی کا اللہ مالک

جمیل غسلخانہ میں نہا رہا ہے اور ساتھ ہی ساتھ گنگنا تا جا رہا ہے۔ ہم دو، ہمارے دو، ہم دو ہمارے دو۔ بی اماں ناک بھوں چڑھاتے ہوئے بولیں۔ نوج اب نہاتے وقت بھی یہی رٹ لگائی جاتی رہے گی۔ کیوں نہ ہو چودہ صدی ہے نا! نہ جانے نگوڑی کہاں جا ٹکی ہے کہ یہ سب سننے کو جی رہی ہوں۔ ہمارے زمانے میں تو بہو بیٹیوں کو گود بھری رہنے اور دودھوں نہاؤ، پوتوں پھلو کی دعائیں دی جاتی تھیں اور اگر شادی کے بعد دو تین سال تک بہو کی کوکھ خالی رہتی تو محلے والیوں کے علاوہ نادن اور دھوبن تک خیریت پوچھنے لگتی اساس منتیں، مرادیں ماننے لگتی، رات کو اٹھ اٹھ کر نمازیں پڑھتی اور سجدے کرتی۔ ناک رگڑتی اور جب تک بہو کی پیشانی سے یہ کلنک کا ٹیکا دور نہ ہو جاتا اور بچہ بہو کی گود میں کیہوں کیہوں نہ کرنے لگتا ساس انگاروں پر لوٹتی رہتی اور بہو شرمندگی سے کسی سے آنکھیں نہ ملا سکتی۔ اب اس کلجگ میں تو بچہ ہونے پر نہیں بچہ نہ ہونے پر فخر کیا جاتا ہے۔

بی اماں کی یہ تقریر دہلیز پر سنتے سنتے جب نسیمہ اوب گئی تو اس کے صبر کا جام لبریز ہو گیا اور وہ بول اٹھی۔ بی اماں! مائیں اپنی بہو بیٹیوں کو "دودھوں نہاؤ، پوتوں پھلو" کی دعا اس وقت دیا کرتی تھیں جب دودھ افراط اور آبادی کم تھی اب جبکہ دودھ پینے کے لیے ملنا مشکل ہے تو پھر آپ ہی بتلایئے کہ کون اپنی بہو کو دودھوں نہلائے گا کہ وہ پوتوں پھل کر اپنے گھر والوں ہی کی نہیں، دنیا بھر کے لوگوں کی زندگی اجیرن کر دے۔ بی اماں! اگر لوگ آنکھ بند کر کے بے سوچے سمجھے یوں ہی خرگوش اور چوہے کی طرح دم لیے بغیر درجنوں بچے پیدا کرتے رہے تو بیس برس میں آدمیوں کو ہماری اس لمبی چوڑی دنیا میں رہنے کی کیا کھڑے ہونے کی جگہ ملنا دو بھر ہو جائے گی۔ آبادی طوفان میل کی طرح بڑھ رہی ہے چاہے جو بھی جتن کیے جائیں اس دوڑ میں ملک کی غذائی اور صنعتی پیداوار کا بازی لے جانا تو بڑی بات ہے۔ شانہ بہ شانہ بھی چل سکنا محال ہے۔ کیونکہ زمین کی وسعت محدود اور بچوں کی پیداوار لامحدود ہے۔ ایسی صورت میں جب آبادی دنیا کی چادر سے آگے پاؤں پھیلانے لگے گی تو آدمی نہ سر چھپا سکیں گے اور نہ پاؤں اور غریبی، پسماندگی اور قلت پر قابو پانا ناممکن ہو جائے گا۔

بی اماں۔ اچھا بیٹی مجھے معاف کر دو، توبہ کرتی ہوں، کان پکڑتی ہوں کہ تمہارے سامنے زبان سے بات نہیں نکالوں گی۔ آج کل کی بہوویں تو ایسی دیدہ دلیر اور زبان دراز ہوتی ہیں کہ ان سے اگر کوئی بات کہہ دو تو پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے۔ اللہ کی بندی انصاف کر، آخر میں نے ایسی کون سی بات کہہ دی کہ تیرے بدن میں آگ لگ گئی اور اس وقت سے کترنی کی طرح جو زبان چلی ہے تو رکنے کا نام ہی نہیں لیتی۔ بی، اے، بی ٹی، اے کیا پاس کر لیا کہ بے چاری کسی کو خاطر ہی میں نہیں لاتیں اور سمجھتی ہیں کہ ہم سب نرے جاہل ہیں۔ آخر ہم لوگ بھی تھے۔ بوڑھے ہو گئے، لیکن ساس کے سامنے زبان چلانا تو بڑی بات ہے نہ منہ سے کبھی ایک لفظ نکالا اور نہ آنکھ اٹھا کر ان کی طرف دیکھا۔ رشتے کی ایک بہن کی

طرف مخاطب ہوتے ہوئے بی اماں نے پھر کہنا شروع کیا۔ اے بہن! تمھیں انصاف سے کہو کہ میں نے بہو صاحبہ کو کون سی گالی دے دی تھی کہ یہ بے چاری چراغ پا ہو گئیں۔ آٹھ سال میں اللہ آمین کر کے دو بچے پیدا کئے۔ میں چاہتی تھی کہ جیسے بھرا پرا گھر چھوڑ کر جا رہی ہوں میرے بعد بھی اسی طرح آباد رہے۔ ٹنڈ دل گوں دو بچے ہیں جن میں لڑکی پرائے گھر کی ہوتی ہے۔ بیاہ ہو جائے گا میاں کا گھر آباد کرے گی۔ پھر کون رہ جائے گا ایک اکیلا جاوید، اتنے بڑے گھر میں تو پھر ہو کا عالم ہوگا۔ معلوم نہیں کیا عقل پر پتھر پڑ گئے ہیں کہ سب "ہم دو، ہمارے دو" کی رٹ لگائے ہوئے ہیں۔

جمیل اب نہا کر غسل خانہ سے باہر آچکا تھا اور تولیہ سے سر پونچھ رہا تھا۔ اس نے جو بی اماں کو بپھرے ہوئے دیکھا تو اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ آخر یہ ہے کیا معاملہ۔ نسیمہ پر نظر پڑی تو وہ منھ پھلائے اس طرح بیٹھی تھی کہ جیسے کہہ رہی ہو کہ (اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے) وہ سمجھ گیا کہ ان سے بات کی تو برس پڑیں گی۔ چھوٹی بہن متینہ باورچی خانے میں بیٹھی تھی وہ سیدھا اس کے پاس گیا اور پوچھا کہ یہ معاملہ کیا ہے؟ کسی کی تیوریاں چڑھی ہیں کوئی منھ پھلائے بیٹھا ہے۔ متینہ نے شوخی سے کہا۔ بھائی جان! چشمہ کہاں رکھ دیا۔ لگا لیجئے ورنہ آپ کو سبھی کا منھ پھولا نظر آئے گا۔ کیا آپ کو میرا بھی منھ پھولا نظر آرہا ہے۔؟

جمیل نے کہا ارے بے وقت یہ کیسی اٹکھیلیاں سوجھی ہیں اور یہ سب بیزار بیٹھے ہیں۔ آخر یہ ہوا کیا؟ متینہ بولی یہ آگ آپ ہی کی لگائی ہوئی ہے۔ آپ نہاتے وقت غسل خانے میں کیا گنگنا رہے تھے۔ جمیل فوراً معاملہ کی تہہ تک پہونچ گیا اور اطمینان کا سانس لیتے ہوئے کہا کہ گنگنا کیا رہا تھا یہ تو اب ہمارا نعرہ اور وقت کی پکار ہے۔ متینہ بولی اس وقت کی پکار ہی نے تو آؤٹ آف ڈیٹ، اور پرانے دماغوں کو چکرا دیا ہے اور اس کی سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ ان کے زمانے میں جن بچوں کی ولادت پر شادیانے بجتے تھے خوشیاں منائی جاتی تھیں اور بڑی بوڑھیاں اسے ولادت نہیں۔ شادی ہونا کہتی تھیں اب انہی بچوں کی پیدائش پر بندش لگائی جا رہی اور چیخ پکار کی جا رہی ہے۔

جمیل۔ اچھا متینہ تم بتاؤ تمھارا اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟ متینہ مسکراتی ہوئی بولی۔ اچھا اب آپ یہ چاہتے ہیں آپ کی بیگم صاحبہ کی طرح میں بھی بی اماں کی ڈانٹ کھاؤں پہلے بی اماں کا غصہ ٹھنڈا کیجئے پھر مجھ سے میرا خیال پوچھئے ورنہ بھابھی کو تو صرف ڈانٹ پڑی ہے مجھ پر تو ڈنڈے پڑیں گے۔ خیر امی کے سامنے تو میں کچھ کہہ سکتی تھی لیکن بی اماں (دادی) کے سامنے کس کی مجال ہے کہ بچوں کے متعلق منھ کھولے۔ ان کے نزدیک یہ اللہ کی دین ہیں اور ان کی روک تھام کفرانِ نعمت ہے۔

جمیل۔ اللہ کی دین تو دنیا کی ہر چیز ہے۔ اللہ کی جہاں سب چیزیں دین ہیں وہاں اس نے انسان کو عقل بھی دی ہے تاکہ وہ ضرورت کے مطابق چیزیں کم یا زیادہ حاصل کرنے کی کوشش کرے اگر گھر میں دودھ کی دو سیر ضرورت ہے تو وہ خواہ مخواہ چار سیر فراہم نہ کرے۔ کیونکہ فاضل دودھ کے خراب ہو جانے کا بھی اندیشہ ہے اور اس کو محفوظ طریقہ پر رکھنے اور اس کی دیکھ بھال کرنے پر بھی بلاوجہ وقت اور توجہ صرف کرنی پڑے گی۔ یہی صورت بچوں کی ہے۔ جب ملک اور دنیا کی آبادی اس کی پیداوار اور آمدنی کے مقابلے میں اتنی تیزی سے بڑھ رہی ہے کہ چاہے جتنے کارخانے کھولے جائیں، اور چاہے جتنے کھیتوں کی پیداوار بڑھائی جائے بڑھتی ہوئی آبادی کا پیٹ نہیں بھرا جا سکتا تو کیا یہ سمجھداری ہوگی کہ اپنی وسعت سے زیادہ بچے پیدا کر کے انھیں بھوک، بیماری اور ناداری کا شکار بنایا جائے اور اپنے دل کے ٹکڑوں کو موت کے منھ میں دیدیا جائے یا یہ مناسب ہوگا کہ جتنی گنجائش ہو اتنے ہی بچے پیدا کئے جائیں۔ اور ان کی ٹھیک سے پرورش کی جائے۔

مگر بھائی جان وہ تو کہتی ہیں بچے پیدا کرنا یا نہ کرنا انسان کے بس میں نہیں یہ تو قدرت کی دین ہے جس کی چاہے بچوں سے گود بھر دے اور جس کی چاہے خالی رکھے۔ جمیل نے کہا اگر بچے پیدا کرنے میں انسان کو کوئی دخل نہیں تو پھر وہ پوری طرح بچوں کی پیداوار کا کام قدرت ہی پر کیوں نہیں چھوڑ دیتا۔ بلاوجہ شادی کے چکر میں

کیوں پڑتا ہے اور شادی کے بعد اگر دو چار سال سنا ٹا رہتا ہے تو پھر مرادیں منتیں مانگنے اور دوا اور دعا کرنے کے لیے دوڑ دھوپ کیوں شروع کر دیتا ہے۔ اب اگر بچے پیدا کرنے کے لیے دوڑ دھوپ اور دوا کی جا سکتی ہے تو پھر ان کے روکنے کے لیے کیوں نہیں کی جا سکتی۔ اگر وہ قدرت کے کام میں دخل نہیں تو یہ کیوں ہے۔

مبینہ نے ہنستے ہوئے کہا کہ آپ اپنی دلیلوں کا زور خواہ مخواہ میرے اوپر کیوں صرف کر رہے ہیں۔ بی اماں کو سمجھائیے۔

جمیل تو بڑی بے وقوف ہے۔ اری ان بیچاری بڑی بوڑھیوں کو جو قبر میں پیر لٹکائے بیٹھی ہیں سمجھانے سے کیا فائدہ۔ انھیں اب نہ شادی کرنا ہے نہ بچے پیدا کرنے ہیں اور نہ انھیں پالنا پوسنا ہے۔

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ڈاکیہ نے دروازے پر دستک دی۔ بی اماں بولیں۔ ارے کیا کانوں میں انگلی دے کر بیٹھی ہو ڈاکیہ خط خط پکار رہا ہے اور تم شش گھسیٹے اس طرح بیٹھی ہو جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ ہفتوں ہو گئے۔ رضیہ کا کوئی خط نہیں آیا میرا دل لگا ہے۔ اللہ رے اس کے بچوں کو اپنی اماں ہیں کہ یہ سب خیریت ہو۔

مبینہ دوڑ کر گئی اور خط لا کر بی اماں کے پاس ڈال دیا بی اماں بگڑ کر بولیں یہ چھوکری کیا باؤلی ہو گئی ہے۔ میرے منہ میں نہ دانت نہ پیٹ میں آنت مجھے سامنے کھڑے آدمی کا چہرہ تک نظر نہیں آتا میں خط پڑھوں گی کیا خاک!

جمیل نے لپک کر خط اٹھایا اور پڑھنا شروع کیا۔

امی جان تسلیم۔

یہاں سب خیریت ہے آپ لوگوں کی خیریت بارگاہ رب العزت سے نیک چاہتی ہوں۔ دیگر احوال یہ ہے کہ پپو کے اچانک ایک سو چار ڈگری بخار چڑھ گیا تھا۔ اول بالڈ بکنے لگا تھا لیکن اللہ نے بڑا کرم کیا کہ بخار جلد ہی کم ہو گیا مگر سخت کمزوری ہے۔ مجّا اسکول جاتے ہوئے بھیگ گیا اسے سخت نزلہ ہو گیا ہے۔ ناہید کی ناک چھیدوائی گئی تھی وہ ایسی پک گئی ہے کہ دیکھی نہیں جاتی۔ بجو کی آنکھ میں گیند کھیلتے میں چوٹ آ گئی ہے پڑھنا لکھنا بند ہے۔ چھوٹا میاں ماں کے اسپتال میں داخل ہونے کی وجہ سے رو رو کر جان ہلکان کیے ہوئے ہے۔ سب کام بے چاری نسرین سنبھالے ہوئے ہے۔ وقار بھی ٹھیک ہے۔ خدا کا شکر ہے اگر یہ دونوں ٹھیک نہ ہوتے تو کھانا کون پکاتا اور اسپتال لے کر کون جاتا۔ آپ جانتی ہیں مجھے دمے کی شکایت ہے بارش میں تو میرے لیے چار قدم چلنا دشوار ہو جاتا ہے۔ اللہ کی دین آپ کی بیٹی کے اس مرتبہ جڑواں بچے ہوئے تھے۔ لڑکا تو پیدا ہوتے ہی اللہ کو پیارا ہو گیا لڑکی کی سانس چل رہی ہے۔ دیکھیے ابھی وہ کتنے دنوں تک اسپتال میں رہیں۔ دعا کیجیے زچہ بچہ خیریت سے گھر واپس آ ئیں۔ آمین۔

خط سننا تھا کہ بی اماں سر پکڑ کر بولیں۔ ایک ساتھ دو دو وا! میری دھان پان سی بچی پر گیارہ گیارہ بچوں کا بار۔ اس کی جان کا اللہ ہی مالک ہے۔ یہ کہتے کہتے وہ دل پر ہاتھ رکھ کر بے ہوش ہو گئیں۔ نسیمہ نے انھیں گرتے دیکھ کر فوراً انھیں اپنی گود میں لے لیا اور گھر میں کہرام مچ گیا۔

عظیم امروہوی

دشمنی

یہ نونہال
یہ بچہ۔ یہ بے خطا تصویر
پھٹا لباس، اَٹی دھول زرد چہرے پر
ٹہل رہا ہے —
جو فٹ پاتھ پر کئی دن سے
تڑپ اسے لیے پھرتی ہے
چند سکّوں کی۔ کہ —
جن سے پیٹ کی بھٹی کا بن سکے ایندھن
اگر یہ ہوتا
کہیں باپ ماں کا اکلوتا
تو اس طرح سے نہ یوں بھیک مانگتا پھرتا
وہ اہل زر
جو اسے دے رہے ہیں کچھ سکّے
وہ اس کے دوست نہیں ہیں
وہ اس کے دشمن ہیں
یقیں کے دشمن ہیں
عمل کے دشمن ہیں
وطن کے دشمن ہیں

رشید قریشی

نیا سماج

وہ بھی تو ایک دور تھا لوگو!
تیرگی، روشنی پہ ہنستی تھی
بے بسی آدمی پہ ہنستی تھی
زندگانی تھی حادثات اپنی
زخم ہی زخم تھی حیات اپنی
اس طریقے سے پل رہے تھے ہم
آگ میں اپنی جل رہے تھے ہم
آنکھیں پُر نم تھیں دل پریشاں تھا
زندگی کیا تھی غم کا طوفاں تھا
ساغرِ صبر ہنس کے پیتے تھے
روز مرتے تھے روز جیتے تھے
دفعتاً وقت کی نظر بدلی!
اک کرن ابھری روشنی بن کر
اک خوشی چھائی سرخوشی بن کر
دے کے ترتیب بیش بہا نکتوں کو
اک نئی زندگی دی لوگوں کو
جس کے مدت سے تھے تمنائی
تیری جرأت وہاں پہ لے آئی
ہر طرف عشرتوں کا راج ہے آج
اک نئے موڑ پر سماج ہے آج

۱۔ وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی

محسن رضا جونپوری

غزل

دل کو رہینِ لذتِ حرماں بنا دیا
ترتیبِ عہد کے درد کو درماں بنا دیا
صحرا تجھے بھی آبلہ پایانِ شوق نے
شائستۂ مذاقِ گلستاں بنا دیا
یہ بھی شکستِ ناز ہے اے پیکرِ جمیل
صحرا نہ بن سکا تو گلستاں بنا دیا
اہلِ جنوں کا جذبۂ تعمیر الاماں
ذرّوں کو جمع کر کے بیاباں بنا دیا
ہم بے نیازِ دیر و حرم جب کبھی اٹھے
ایماں کو کفر، کفر کو ایماں بنا دیا
آسودۂ ازل تھا جو رازِ بسیطِ عشق
جب منکشف کیا اسے انساں بنا دیا
کوتاہیوں کا ذکر تھا، کچھ بال و پر کی بات
دونوں کے امتزاج نے زنداں بنا دیا
خود لغزشوں نے ڈال بنائے وقارِ غم
خود لغزشوں نے عالمِ امکاں بنا دیا
پابندِ رسم و راہ نہیں فطرتِ جنوں
یہ کیا کیا خرد کو نگہباں بنا دیا
پابندِ احتیاط نہیں ہوں میں عشق میں
سر رکھ دیا جہاں در جاناں بنا دیا
اک غم تھا لازوال جسے تو نے اے رضا
افسانۂ حیات کا عنواں بنا دیا

محمد اسحاق صدیقی

خاندانی منصوبہ بندی کیوں؟

بچے خدا کی دین ہیں اور بچے پیدا کرنا انسان کا فطری حق ہے۔ اس صداقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا۔ لیکن بچے کتنے ہوں اور کب ہوں، یہ دونوں باتیں انسان کے اختیار میں ہیں۔ ان کی اہمیت کو سمجھنا اور ان کے لیے مناسب تدبیر کرنا ہی خاندانی منصوبہ بندی ہے۔

خاندانی منصوبہ بندی کے بارے میں ایک عام غلط فہمی یہ ہے کہ لوگ اسے اپنا نجی معاملہ سمجھتے ہیں، جس میں سرکار کو دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔ اولاد کے معاملے میں "اللہ دے اور بندہ لے" کا اصول جاری ہے لیکن دراصل اس مسئلے کی حیثیت انفرادی نہیں بلکہ یہ ایک ملکی اور بین الاقوامی مسئلہ ہے جس کا تعلق دنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی اور گھٹتے ہوئے قدرتی وسائل سے ہے۔

بہت سی باتیں جب محدود پس منظر میں دیکھی جاتی ہیں تو غلط معلوم ہوتی ہیں لیکن جب انھیں وسیع پس منظر میں دیکھا جاتا ہے تو صحیح معلوم ہوتی ہیں۔ جب آپ اپنے گاؤں یا شہر کو سامنے رکھ کر آبادی روکنے کی بات سنتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ سرکار بڑا ظلم کر رہی ہے لیکن جب آپ ساری دنیا کی حالت سامنے رکھ کر سوچتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ سرکار بالکل صحیح کر رہی ہے۔

چونکہ دنیا کی اکثریت ان پڑھ ہے اور لوگوں کو اپنے محلے، گاؤں یا شہر سے باہر کا حال نہیں معلوم۔ اس لیے بہت کم لوگ یہ جانتے ہیں کہ ہماری زمین اور اس کے وسائل محدود ہیں۔ اس تلخ حقیقت کا پتہ تب لگا جب دنیا کے سائنس دانوں نے زمین کے قدرتی وسائل کا مفصل جائزہ لیا۔ انھیں یہ جان کر سخت مایوسی ہوئی کہ زمین کے معدنیات تیزی سے گھٹتے جا رہے ہیں جب کہ ان کی کھپت روز افزوں ہے اور اگر اس کھپت کو انسانی آبادی کو محدود کر کے روکا نہ گیا تو جلد ہی سارے معدنیات ختم ہو جائیں گے اور اس کے ساتھ ہی ہماری موجودہ تہذیب کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔

نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ وہی انسان جو چاند پر پہونچ گیا، جس نے زہرہ اور مریخ پر اپنے جھنڈے گاڑ دیے، اسے زمین پر زندگی بسر کرنے کا شعور نہیں۔ انسان کی ساری تاریخ باہمی خوں ریزی اور خود غرضی کی ایک دردناک داستان ہے۔ حالیہ انکشافات میں غور کرنے والوں کے لیے یہ ایک اہم دریافت ہے کہ زمین پر جو زندگی کی رونق ہے وہ اور کہیں نہیں۔ چنانچہ جب انسان چاند پر پہنچا تو اسے وہاں کسی قسم کے جاندار نہ ملے۔ امریکہ کی وائی کنگ خودکار تجربہ گاہوں نے مریخ پر جاکر یہ پتہ لگایا کہ وہاں خوردبینی جراثیم کے پائے جانے کا امکان ہے۔ برخلاف اس کے زمین پر انسان کی ایسی ذی فہم مخلوق ہی نہیں بلکہ لاکھوں قسم کے حیوانات و نباتات پائے جاتے ہیں لیکن ہماری خود غرضی کی وجہ سے تمام جانداروں کا وجود خطرے میں پڑ گیا ہے۔ انسان کی بڑھتی ہوئی آبادی کو بسانے، اس کے لیے اناج پیدا کرنے، عمارتی لکڑی اور کاغذ حاصل کرنے کے لیے جس تیزی سے جنگل کاٹے جاتے ہیں اس تیزی سے اگ نہیں پاتے۔ جنگلوں کے ساتھ جنگلی جانوروں کا بھی صفایا ہوتا جا رہا ہے گویا زمین پر انسان کے سوا قدرت کی

کسی دوسری مخلوق کو زندہ رہنے کا حق حاصل نہیں۔ کیا یہ انسان کی سراسر خودغرضی نہیں ہے؟

جنگلات میں کمی کے معنی ہیں ہوا میں آکسیجن گیس کی کمی، جس کے بغیر کوئی جاندار زندہ نہیں رہ سکتا، مٹی کا تیزی سے کٹاؤ اور سیلاب، کیونکہ درختوں کی جڑیں مٹی کو باندھے رکھتی ہیں۔ اس پر ستم یہ ہے کہ انسانی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کارخانے پر کارخانے کھلتے جا رہے ہیں، سفر کی سہولت کے لیے پٹرول سے چلنے والی گاڑیوں کی تعداد برابر بڑھ رہی ہے۔ کارخانوں کی چمنیوں سے نکلنے والے دھوئیں اور پٹرول سے چلنے والی گاڑیوں کے دھوئیں سے زمین کی فضا زہریلی ہوتی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ساری دنیا میں سانس کی بیماریاں بڑھ رہی ہیں۔ اگر انسانی آبادی کو بڑھنے سے نہ روکا گیا اور صنعت کاری کی تیز رفتاری اسی طرح جاری رہی تو بہت جلد زمین کی فضا اس حد تک زہریلی ہو جائے گی کہ اس میں کوئی جاندار زندہ نہ رہ سکے گا۔

زیادہ اناج پیدا کرنے کی کوشش میں زمین کی زرخیزی کم ہوتی جاتی ہے۔ اندیشہ ہے کہ بہت سے زرخیز خطے کچھ عرصے کے بعد بنجر میدانوں میں تبدیل ہو جائیں گے۔ کیڑے مار دواؤں کا استعمال روزافزوں ہے، جن کا زہر نہ صرف ہوا، پانی اور مٹی میں سرایت کر جاتا ہے بلکہ کھانے پینے کی چیزوں میں جذب ہو کر جاندار کے جسم میں داخل ہو کر انھیں طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا کر دیتا ہے اور چھوٹے جاندار مثلاً مچھلیاں اور پرندے تو جلد ہی ہلاک ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اُن میں سے بہتوں کی قسمیں ناپید ہو چکی ہیں۔

کارخانوں سے بہایا جانے والا فضلہ دریاؤں، جھیلوں اور سمندروں میں برابر ملتا رہتا ہے جس کی وجہ سے پانی کے تمام ذخیرے زہریلے ہو گئے ہیں۔ ہوا، پانی اور مٹی کی آلودگی کا تنہا ذمہ دار انسان ہے جو نفسانی خواہشات سے مغلوب ہو کر اپنی نسل بڑھاتا جاتا ہے اور کبھی نہیں سوچتا کہ اس کی وقتی تفریح کا انجام خود اُس کے لیے، اس کے اہل و عیال کے لیے، اُس کے ملک والوں کے لیے اور ساری دنیا کے لیے کس قدر تباہ کن ہو سکتا ہے۔

آپ سوچیں گے کہ آخر دنیا میں پہلے بھی لوگ آباد تھے، لیکن تاریخ میں کہیں اس بات کا حوالہ نہیں ملتا کہ آبادی نے کہیں ایک ایسے مسئلے کی صورت اختیار کر لی ہو کہ دنیا کے بڑے بڑے سائنس داں اور سیاست داں اس کا حل ڈھونڈنے میں لگ گئے ہوں۔ بات دراصل یہ ہے کہ پہلے نہ تو کسی کو یہ معلوم تھا کہ دنیا کتنی بڑی ہے اور نہ کسی کو یہ اندازہ تھا کہ ساری دنیا کی آبادی کتنی ہے۔ آبادی کس رفتار سے بڑھتی ہے، اگر آپ اس کا اندازہ کرنا چاہتے ہیں تو فرصت کے وقت میں اپنے خاندان والوں کا شجرہ بنا ڈالیے۔ زیادہ دور نہیں اپنے پردادا تک جائیے اور شمار کیجیے کہ ان سے جو نسل چلی وہ آج کہاں تک پہونچ گئی ہے۔ آبادی کے بڑھنے کا انداز کچھ ایسا ہے: ۱-۲-۴-۸-۱۶-۳۲...... جیسے جیسے وقت گزرتا جاتا ہے۔ آبادی کو دگنا ہونے میں کم وقت لگتا ہے۔ آئیے ہم یہاں اپنے ملک کی بڑھتی ہوئی آبادی پر ایک نظر ڈالیں۔

ہماری آبادی

سنہ ۱۹۲۱ء میں ۲۵ کروڑ ۱۰ لاکھ تھی۔
سنہ ۱۹۳۱ء میں ۲۷ کروڑ ۸۰ لاکھ ہو گئی۔
سنہ ۱۹۴۱ء میں ۳۱ کروڑ ۸۰ لاکھ تک پہنچ گئی۔
سنہ ۱۹۵۱ء میں ۳۶ کروڑ ۱۰ لاکھ سے آگے نکل گئی۔
سنہ ۱۹۶۱ء میں ۴۴ کروڑ ۹۰ لاکھ کے اوپر ہو گئی۔
سنہ ۱۹۷۱ء میں ۵۴ کروڑ ۸۰ لاکھ کے لگ بھگ ہو گئی۔

غور کیجیے کہ ہر دس سال میں آبادی کس رفتار سے بڑھ رہی ہے جیسے جیسے آبادی بڑھتی گئی ملک میں رہنے کے لیے جگہ تنگ ہوتی گئی۔ چنانچہ سنہ ۱۹۲۱ء میں فی مربع کلومیٹر ۷۹ افراد آباد تھے۔

سنہ ۱۹۳۱ء میں ۸۸
سنہ ۱۹۴۱ء میں ۱۰۰
سنہ ۱۹۶۱ء میں ۱۱۴
سنہ ۱۹۷۱ء میں ۱۲۸
سنہ ۱۹۷۶ء میں ۱۶۰
} ہو گئے

جولائی سنہ ۱۹۷۶ء تک ہماری آبادی ۶۱ کروڑ تک جا پہنچی اور اگر اسی رفتار سے بڑھتی رہی تو محض ۳۵ سال میں ایک ارب ہو جائے گی۔ اندازہ کیا جاتا ہے کہ سنہ ۲۰۰۰ء میں فی مربع کلومیٹر ۲۸۰ افراد آباد ہوں گے۔ اس وقت ہمارے ملک کی کیا حالت ہوگی۔ یہ سوچ کر سر جھکتا ہے۔ جبکہ اس وقت یہ عالم ہے کہ زیادہ تر لوگوں کو نہ تو پیٹ بھر کھانا ملتا ہے اور نہ تن ڈھانکنے کو کپڑا۔ نہ ان کے پاس سر چھپانے کی جگہ ہے، نہ آمدنی کا کوئی مستقل ذریعہ۔ لاکھوں نوجوان تعلیم پا کر مارے مارے پھرتے ہیں لیکن نوکری نہیں ملتی۔ اسپتال میں جاؤ تو مریض کو بستر پر کیا فرش پر جگہ نہیں ملتی۔ سڑکوں پر انسانوں اور گاڑیوں کا وہ ہجوم کہ راستہ چلنا مشکل۔ راشن کی دکان پر وہ بھیڑ کہ معلوم ہوتا ہے جیسے خیرات بٹ رہی ہے۔ آخر اس بھیڑ کو پیدا کرنے کا ذمہ دار کون ہے؟ ظاہر ہے کہ ہم سب لیکن کتنے لوگ ہیں جو اس بات کو محسوس کرتے ہیں اور کتنے لوگ ہیں جو اسے روکنے کی تدبیر کرتے ہیں۔

آبادی کے اضافے کی رفتار کا اندازہ اس سے کیجئے کہ ہمارے ملک میں ہر سال ۲ کروڑ ۱۰ لاکھ بچے پیدا ہوتے ہیں اور ۹۰ لاکھ انسان مرتے ہیں۔ گویا ہر سال ہماری آبادی میں ایک کروڑ ۲۰ لاکھ کا اضافہ ہوتا ہے، دوسرے لفظوں میں جتنی آبادی براعظم آسٹریلیا کی ہے، اتنی آبادی کا سالانہ ہندوستان میں اضافہ ہوتا ہے۔

۲ کروڑ ۱۰ لاکھ بچے سالانہ پیدا ہونے کا مطلب ہے ہر مہینے ۱۷ لاکھ ۵۰ ہزار بچے روزانہ ۶۰ ہزار بچے یا فی گھنٹہ ۲۵۰۰ بچے یا فی منٹ ۴۰ بچے۔ کیا یہ بچوں کا سیلاب نہیں ہے؟

اب دنیا کی آبادی پر نظر ڈالیے — اندازہ کیا جاتا ہے سنہ ۱۸۳۰ء میں دنیا کی آبادی صرف ایک ارب تھی اس کے ایک صدی بعد یعنی سنہ ۱۹۳۰ء میں دو ارب ہو گئی۔ اس کے تیس سال بعد یعنی سنہ ۱۹۶۰ء میں تین ارب ہو گئی۔ اور اس کے پندرہ سال بعد یعنی سنہ ۱۹۷۵ء میں چار ارب ہو گئی۔ اندازہ کیا جاتا ہے کہ اب سے دس سال بعد یعنی سنہ ۱۹۸۶ء میں دنیا کی آبادی پانچ ارب ہو جائے گی اور سنہ ۱۹۹۵ء میں چھ ارب تک پہنچ جائے گی۔

اس بڑھتی ہوئی آبادی کے خطرے کی بنا پر اقوام متحدہ نے سنہ ۱۹۷۴ء کو عالمی آبادی کا سال قرار دیا اور ایک بین الاقوامی جلسے میں جو بخارسٹ شہر میں ہوا تھا اپنے ممبر ملکوں سے اپیل کی کہ آبادی کی باڑھ کو ہر ممکن قیمت پر روکنے کی کوشش کریں۔ ورنہ اندیشہ ہے کہ آبادی کی کثرت اس دنیا کو لے ڈوبے گی انسان کے ساتھ اس کی لاکھوں سال پرانی تہذیب کا بھی خاتمہ ہو جائے گا اور ہو سکتا ہے کہ زمین اس قابل نہ رہے کہ اس پر کوئی جاندار زندہ رہ سکے۔

دنیا کی آبادی بڑھنے کے کئی اسباب ہیں مثلاً معیار زندگی کا اونچا ہونا، نئی دواؤں کی ایجاد، علاج کے نئے طریقے، حفظانِ صحت کے اصولوں پر عمل، اناج کی زیادہ پیداوار اور اس کی تقسیم کے بہتر طریقے، بار برداری کی آسانیاں وغیرہ۔ یہی وجہ ہے کہ ساری دنیا میں موت کی شرح گھٹ رہی ہے اور انسان کی اوسط عمر بڑھ رہی ہے۔ گویا انسان پیدا بھی زیادہ ہوتے ہیں اور زیادہ عرصے تک جیتے بھی ہیں۔ کھانے والے بھی زیادہ ہیں اور کھاتے بھی زیادہ ہیں۔ سنہ ۱۹۵۰ء تک زیادہ تر ملکوں میں انسان کی اوسط عمر ۳۰ سال تھی اور اب ۴۵ سال ہے۔ سنہ ۱۹۵۱ء تک ہندوستان میں موت کی شرح فی ہزار ۲۷ تھی اور اب ۱۷ ہے۔ سنہ ۱۹۵۰ء تک ہندوستانیوں کی اوسط عمر ۳۲ سال تھی اور اب ۵۲ سال ہے۔ انسان کی اوسط عمر کا بڑھنا اور موت کی شرح کا گھٹنا قدرت پر انسان کی فتح ہے۔ لیکن دنیا کی آبادی کو حد کے اندر رکھنے کے لیے مزاحمت بہت ضروری ہے۔ اب اگر ہم لوگوں کو مرنے نہیں دیتے تو ہمیں چاہیے کہ ضرورت سے زیادہ بچے نہ پیدا ہونے دیں۔ اسی لیے پیدائش کی شرح گھٹانے کی کوشش کی گئی لیکن ہم اسے گھٹا نہ سکے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم اپنے پنج سالہ منصوبوں سے ملک میں جو خوش حالی لانا چاہتے تھے اس میں ناکام رہے یا یوں کہیے کہ آبادی کے بے تحاشا

اضافے نے ہمارے منصوبوں کو چوپٹ کر دیا۔

چونکہ انسان کو سب سے زیادہ دلچسپی اپنے خاندان سے ہوتی ہے اسی لیے ہماری سرکار عوام میں یہ احساس پیدا کرنے کی مسلسل کوشش کرتی رہی ہے کہ سب کو خوش حال زندگی بسر کرنے کے لیے اپنے کنبے کو محدود کرنا چاہیے۔ مطلب یہ ہے کہ لوگ زیادہ اولاد پیدا نہ کریں تاکہ بچوں کی کثرت سے والدین کی صحت اور مالی حالت خراب نہ ہو اور وہ اپنے بچوں کو صحیح تعلیم و تربیت دے کر اچھا شہری بنا سکیں۔ خود سکھی زندگی بسر کریں اور دوسروں کو سکھی زندگی بسر کرنے کا موقع دیں۔ اس معاملے میں امیر غریب، تعلیم یافتہ، ان پڑھ، مذہب یا ذات پات کی کوئی تفریق نہیں ہے۔ "ہم دو ہمارے دو" کا نعرہ سب کے لیے ہے۔ کم سے کم اولاد پیدا کرنے کا مطالبہ ایک طرح سے انسان کی قوت تولید پر روک لگانا ہے لیکن اس تولیدی مساوات سے ہر گھر میں، اپنے ملک میں اور ساری دنیا میں جو خوش گوار انقلاب آ سکتا ہے اس کا صرف تصور ہی کیا جا سکتا ہے، جس کا اندازہ کرنے کے لیے ایسے دو گھرانوں کے رہن سہن کا مقابلہ کیجیے، جن میں کمانے والوں کی آمدنی برابر ہو لیکن ایک میں کم بچے ہوں اور دوسرے میں زیادہ۔ "چھوٹا پریوار سکھی پریوار" محض ایک نعرہ نہیں بلکہ حقیقت ہے۔

غالباً اب آپ کی سمجھ میں یہ بات اچھی طرح آ گئی ہوگی کہ سرکار خاندانی منصوبہ بندی پر اس قدر زور کیوں دے رہی ہے۔ اگر آپ اس کی اہمیت اور افادیت کے قائل ہو گئے ہوں تو آج ہی خاندانی منصوبہ بندی کو اپنائیے اور اگر آپ کے دو یا زائد اولادیں ہیں تو نس بندی سے مت کترائیے یہ چیز نہ تو مذہب کے خلاف ہے اور نہ صحت کے لیے مضر۔

مبارک ہیں وہ انسان جو اپنے کو، اپنے گھر والوں، اپنے ملک اور دنیا کی بھلائی کے لیے اس عظیم قربانی کے لیے پیش کرتے ہیں۔ اپنے نفس کی قربانی، دنیا کی خوش حالی کے لیے، موجودہ اور آنے والی نسلوں کے لیے۔

★

نغمۂ آتشیں

عفت بانو زیبا کاکوروی

نگاہ میں خروش ہے ادا جنوں بدوش ہے رگوں میں خوں کا جوش ہے
نہ فکرِ نا و نوش ہے نہ زندگی کا ہوش ہے
غرورِ کہکشاں ہیں یہ ہمارے نوجواں ہیں یہ وطن کے پاسباں ہیں یہ

جبیں جبیں پہ عظمتیں قدم قدم پہ ہمتیں نظر نظر میں جرأتیں
نفس نفس صداقتیں چھپی چھپی شجاعتیں
فتح کے نشاں ہیں یہ! ہمارے نوجواں ہیں یہ وطن کے پاسباں ہیں یہ

یہ خوں میں نہائیں گے ہزار زخم کھائیں گے ستم پہ مسکرائیں گے
قدم نہیں ہٹائیں گے وطن کو یہ بچائیں گے
سرورِ گلستاں ہیں یہ! ہمارے نوجواں ہیں یہ وطن کے پاسباں ہیں یہ

عصائے آتشیں لیے سنانِ احمریں لیے شکن بھری جبیں لیے
نگاہ خشمگیں لیے عزائم حسیں لیے
پیامِ گل فشاں ہیں یہ ہمارے نوجواں ہیں یہ وطن کے پاسباں ہیں یہ



جم کاربٹ

لطیف حسین ادیب

ہلدوانی (ضلع نینی تال) سے ۲۲ کلومیٹر کے فاصلے پر ہلدوانی رام نگر سڑک کے کنارے کالا دھونگی کی بستی ہے۔ کالا دھونگی میں جم کاربٹ کا مکان ہے جہاں وہ موسم سرما میں رہتا تھا۔ جم کاربٹ کے مکان کا شمالی دروازہ ٹھیک اس جگہ پر ہے جہاں نینی تال سے آنے والی سڑک ہلدوانی رام نگر سڑک سے ملتی ہے۔ کالا دھونگی میں جم کاربٹ کی املاک تھی اور وہیں سے اس نے جنگل کی زندگی کا مطالعہ کیا اور قوانین شکار سے واقف ہوا۔ کالا دھونگی ہی سے جم کاربٹ کی کہانیوں کا آغاز ہوتا ہے۔

جم کاربٹ ۲۵ر جولائی ۱۸۷۵ء کو نینی تال میں پیدا ہوا۔ اس کی عمر صرف چار برس کی تھی کہ اس کے باپ کا سایہ اس کے سر سے اٹھ گیا۔ اس کی پرورش کی ذمہ داری اس کے بڑے بھائی ٹام نے سنبھالی۔ ٹام نینی تال کے ڈاک خانہ میں ملازم تھا۔ جم کاربٹ نے اپنی کتابوں میں ٹام کا ذکر بڑے عقیدت و احترام کے ساتھ کیا ہے۔

جم کاربٹ اپنے بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ گھر میں ایک دوسرے خاندان کے افراد بھی رہتے تھے۔ جم کاربٹ اس خاندان کے بچوں سے بھی چھوٹا تھا۔ بچے جنگل میں تنہا نہیں جاتے تھے کیونکہ ان کے ذہنوں پر بھوتوں اور چڑیلوں کی کہانیاں مسلط تھیں جن سے وہ خوف کھاتے تھے۔ باورچی خانے کی ضرورت کے لیے جانور شکار کرنے کا کام بالغ مردوں کے سپرد تھا۔ اس زمانے میں جنگلات جانوروں سے بھرے ہوئے تھے۔ درندوں کی بھی کمی نہیں تھی۔ جم کاربٹ کو سب سے پہلے چار برس کی عمر میں بندوق چلانے کا موقع ملا۔ دانسے نام کے ایک صاحب کالا دھونگی میں مقیم تھے۔ وہ ایک دن شیر کا شکار کھیلنے کے ارادے سے جنگل گئے۔ انھوں نے جم کاربٹ کو اپنے ساتھ لے لیا۔ ان کی ملاقات شیر سے نہیں ہوئی البتہ انھوں نے جم کاربٹ کو اپنی مزل لوڈنگ گن دے کر ایک چڑیا پر فائر کرنے کی ہدایت کی۔ فائر ہوا۔ جم کاربٹ سر کے بل زمین پر اور بندوق پتھر پر گری۔ بندوق چلانے کا یہ پہلا تجربہ تھا جس کو جم کاربٹ نے تمام عمر یاد رکھا۔

ٹام نے جم کاربٹ کے لیے ایک غلیل کا انتظام کر دیا۔ وہ غلیل سے چڑیوں کا شکار کرنے لگا۔ وہ ٹام کی ہدایت کے بموجب کبوتر اور ہریل غلیل سے شکار کر کے گھر میں کھانے کے لیے دے دیتا اور دیگر چڑیوں کی کھال اتار کر محفوظ کر لیتا۔ اس طرح اس کے پاس پرندوں کے نمونے اس کثرت سے جمع ہو گئے کہ جب اس کے ایک عزیز اسٹیفنس ڈیر نے کمایوں کے پرندوں پر کتاب لکھی تو اس کتاب کی ۴۰ رنگین تصویریں جم کاربٹ کے محفوظ کیے ہوئے پرندوں پر مشتمل تھیں۔

جم کاربٹ نے تیر کمان اور کمانی غلیل کے ذریعہ بھی شکار کھیلنے کا شوق پورا کیا مگر کامیابی نہیں ہوئی۔ اس کے بعد وہ دن آہی گیا جب شام اس کو اپنے ہمراہ جنگل میں لے گیا اور اس کو بندوق دے کر ایک ریچھ پر فائر کرنے کی ہدایت کی۔ ریچھ دکھائی نہیں دیا۔ چونکہ وہ پہلی بار ایسے گھنے جنگل میں داخل ہوا تھا جس میں ریچھ پائے جاتے تھے لہٰذا وہ بہت خوف زدہ ہوا۔ دوسرے دن صبح کو شام پھر اس کو اپنے ہمراہ جنگل میں لے گیا اور ایک مور پر فائر کرنے کی ہدایت کی مگر وہ مور پر فائر نہیں کر سکا۔ تاہم اس میں خود اعتمادی کا جذبہ پیدا ہوا۔ اب وہ بندوق لے کر جنگل کے ان گھنے حصّوں میں جانے لگا جہاں داخل ہونے کا وہ پہلے تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس طرح اس پر یہ حقیقت روشن ہو گئی کہ جنگل میں درندوں سے خوف نہیں کھانا چاہیے کیونکہ درندوں کی جبلت میں انسانوں کو ستانا داخل نہیں ہے۔ اس وقت اس کی عمر آٹھ برس کی تھی۔ اس نے اپنی کتاب جنگل لور میں اسی زمانے کے دو واقعات بیان کیے ہیں جن میں سے پہلے واقعہ کو نقل کیا جاتا ہے:

"نیا گاؤں ہمارے کالادھونگی کے مکان سے تین میل کے فاصلے پر ہے۔ ایک دن میں اور میگاگ (کتّے کا نام) صبح تڑکے مور کا شکار کھیلنے کے لیے روانہ ہوئے۔ ہم دونوں چوڑی سڑک کے بیچ میں سے گزر رہے تھے کیونکہ روشنی کم تھی اور جنگل جس میں سے سڑک گزر رہی تھی شیروں و گلداروں کا مسکن تھا۔ سورج نکلتے وقت ہم اس جگہ پہنچ گئے جہاں سڑک میں وہ پگڈنڈی ملی تھی جس پر جانوروں کی آمد و رفت رہتی تھی۔ یہاں میں نے اپنی مزل لوڈنگ گن کو بھرا ..... اس کے بعد میں اور میگاگ پگڈنڈی پر روانہ ہوئے۔ ہمارے سامنے متعدد موروں اور جنگلی مرغوں نے پگڈنڈی کو پار کیا مگر میں ان میں سے کسی پر فائر نہیں کر سکا کیونکہ وہ پگڈنڈی پر ٹھہرے ہی نہیں۔ نصف میل چلنے کے بعد ہم دونوں ایک کھلی جگہ میں داخل ہوئے اور ہم نے وہاں جیسے ہی قدم رکھا سات موروں کی ایک قطار نے اس جگہ کے آخری کنارے کو پار کیا۔ چند ثانیہ توقف کر کے ہم بھی اس جگہ پہنچ گئے جہاں سے موروں نے کھلی جگہ کو پار کیا تھا۔ میں نے میگاگ کو اشارہ کیا کہ وہ موروں کو اڑا دے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ موروں نے کھلی جگہ کو پار کرنے کے بعد دوڑنا شروع کر دیا تھا۔ میگاگ گھنی جھاڑیوں اور پیڑوں کے جنگل میں مشکل سے سو گز گیا تھا کہ میں نے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ اور موروں کے چیخنے کی آواز سنی۔ اس کے بعد میگاگ مارے خوف کے چیخا جس کے ساتھ ہی شیر کی پرغضب دہاڑ بلند ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میگاگ موروں کا تعاقب کرتا ہوا کسی سوتے ہوئے شیر تک پہنچ گیا اور چونکہ واقعہ اچانک رونما ہوا مور، کتا اور شیر اپنے تعجب، خوف اور غصے کا اظہار اپنے اپنے مخصوص انداز میں کر رہے تھے۔ میگاگ چیخنے کے بعد دم دبا کر بھاگا اور بھاگتے میں زور زور سے بھونکتا جاتا تھا۔ شیر میگاگ کے تعاقب میں دوڑا اور دوڑتے میں دہاڑتا رہا۔ میں نے دیکھا کہ میگاگ اور اس کے پیچھے پیچھے شیر میری ہی طرف آ رہے ہیں ..... اس وقت میرے دل میں بس ایک ہی آرزو پیدا ہوئی یعنی میں کہیں ایسی دور جگہ چلا جاؤں جہاں شیر نہ ہوں ..... میں نے شرم کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اپنے وفادار رفیق کو اس کے حال پر چھوڑا اور بھاگ پڑا اور اتنا تیز بھاگا کہ اس سے پہلے کبھی اتنا تیز نہیں بھاگا تھا۔ میگاگ جلد ہی میرے پاس پہنچ گیا۔ ہمارے پیچھے شیر کی دہاڑیں بھی بند ہو گئیں ..... ایک چھوٹا بچہ اور ایک بڑا کتا جب اپنی اپنی جان بچانے کے لیے بھاگ رہے تھے، شیر کھلی جگہ میں پہنچنے کے بعد بیٹھا اور مسکرانے لگا۔ وہ مسکراہٹ جو صرف شیر کے ہونٹوں پر کھل سکتی ہے۔ اس نے تو یہ کارروائی ایک کتے کو بھگانے کے لیے کی تھی کیونکہ کتے نے اس کی نیند خراب کر دی تھی ....." (صفحہ ۲۳-۲۵)

اس واقعہ سے یہ قیاس کرنے میں دقت نہیں ہوگی کہ جم کاربٹ کو شیروں کی خصلت کا تجربہ کمسنی سے ہی تھا اور یہی وہ تجربات تھے جن کی بنیاد پر وہ اتنا بڑا شکاری بنا۔

جم کاربٹ کی تعلیم نینی تال کے انگریزی اسکول میں ہوئی۔ اس اسکول میں بچّوں کو فوجی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ وہ اپنے اسکول کا سب سے چھوٹا کیڈٹ تھا۔ اس کا نشانہ بہت اچھا تھا۔ اس وقت اس کی عمر صرف دس برس کی تھی۔ اسی سال موسم سرما کی تعطیل میں جب

کالا ڈھونگی کو واپسی کا وقت آیا تو اس کے انسٹرکٹر نے اس کو سروس رائفل اور کارتوس لے جانے کی اجازت دے دی۔ وہ رائفل اور کارتوس لے کر کالا ڈھونگی پہنچا اور رائفل سے شکار کھیلنے لگا۔ رائفل ملنے کے بعد اس کا حوصلہ پہلے سے زیادہ بلند ہو گیا۔ رائفل سے اس نے ایک گلدار کو شکار لیا۔ وہ اس موقع پر مرنے سے بال بال بچا کیونکہ گولی کے بعد گلدار نے چھلانگ ماری اور اس کے سر پر سے گزر گیا۔ بعد کو خون کافی مقدار میں جاری ہو جانے کی وجہ سے مر گیا۔ ہر چند کہ ایک غلط مقام سے گلدار کے سینہ کا نشانہ لے کر فائر کرنا ناسمجھی و ناتجربہ کاری کی بات تھی جس کے نتیجے میں خود اس کی موت ہو سکتی تھی مگر وہ ایسے تجربات سے دوچار نہ ہوتا تو اتنا بڑا شکاری کیسے بنتا۔ دس برس کی عمر میں بھاری بور کا رائفل چلانا اور گھنے جنگل میں تن تنہا پیدل گلدار کا شکار کرنا کسی ایسے بچے سے ہی ممکن تھا جس کی قسمت میں عظیم المرتبت شکاری بننا لکھا ہو۔

مبادیات شکار کے ضمن میں اعلیٰ نشانہ بازی و حوصلہ مندی کے باوصف، جانوروں کی جبلت، اطوار، انفرادی خصوصیات اور مجموعی طور پر جنگل کی زندگی سے واقف ہونا ضروری ہے۔ اس کو جنگل کی حکمت (JUNGLE LORE) کہتے ہیں جس کی آگاہی کے بغیر اعلیٰ پایہ کا شکاری بننا ممکن نہیں ہے۔ جم کاربٹ ماہر نشانہ باز تھا۔ اس میں غیر معمولی حوصلہ مندی تھی۔ اس کی جرأت و خود اعتمادی کا یہ عالم تھا کہ وہ آدم خور شیروں و گلداروں کا پیدل تعاقب کرتا تھا۔ اس نے دو ایک بار اپنے لباس پر پہاڑی عورتوں کی ساری باندھی، شاید آدم خور شیر اس کو عورت سمجھ کر حملہ کرنے کی غلطی کر بیٹھے اور اس طرح اس کو فائر کرنے کا موقع مل جائے۔ اس نے کئی بار آدم خور شیروں کو ان کی آواز کی نقل کر کے قریب بلایا اور ان کو ہلاک کر دیا۔ کئی بار اس کو تمام شب پیڑوں پر اس حال میں بیٹھا پڑا کہ فضا میں موت کا سناٹا تھا، کوئی متنفس میلوں تک نہیں تھا، پیڑ کے تنے کے پاس کسی مرد کی نعش بندھی ہوئی جس کو آدم خور شیر نے ہلاک کر کے تھوڑا بہت کھا بھی لیا تھا اور پورے علاقے پر آدم خور شیر کی حکومت تھی۔ ایسا بھی ہوا کہ اندھیری راتوں میں جب کہ وہ فائر کرنے سے قاصر تھا خود آدم خور شیروں اور گلداروں نے اس کا تعاقب کیا مگر وہ اپنی حکمت عملی سے ہر موقع پر موت سے بچ گیا۔ ایسی صورت میں جبکہ دن کے وقت جنگل کا سناٹا دل میں خوف پیدا کرتا ہے اس کا رات کے وقت ایسے پُرخطر اور پُرہیبت ماحول سے دوچار ہونا زبردست جرأت، حوصلہ مندی اور خود اعتمادی کا ثبوت ہے۔

جم کاربٹ ماہر اور نڈر نشانہ باز ہونے کے ساتھ ساتھ جانوروں کی خصلت اور جنگل کی حکمت سے کماحقہ واقف تھا۔ اس نے جنگل کی حکمت کو اپنی کم عمری کے زمانے میں کالا ڈھونگی میں سیکھا اور آئندہ زندگی میں بھی اس اکتساب کو جاری رکھا۔ کالا ڈھونگی کے چاروں طرف جنگل ہے۔ اس کے بچپن میں تو یہ جنگل بہت گھنا اور جانوروں سے بھرا ہوا تھا۔ اس کو ان جنگلوں سے واسطہ پڑا کیونکہ یہ جنگلات کالا ڈھونگی میں بسنے والوں کے لیے ناگزیر تھے۔ بستی کی اکثریت کے لیے وہ محض جنگل تھے جن سے ایندھن فراہم ہوتا اور ڈھور ڈنگر وہاں چرنے کے لیے جاتے تھے۔ ان جنگلوں میں سور، چیتل، مور، مرغ کا شکار کر کے کھانے کے لیے گوشت بھی مل جاتا اور وہ بہرصورت گزرگاہ بھی تھے۔ لیکن جم کاربٹ کے لیے جنگلات کی اہمیت اس سے زیادہ تھی۔ وہ جنگلات کو پُراز حکمت سمجھتا تھا اور اس نے بڑی لگن سے یہ حکمت حاصل کی تھی۔ اس کے مکان کے قریب ایک چھوٹے سے رقبہ میں ریتیلا راستہ تھا جس پر سے جانور گزرتے تھے۔ اس نے اپنی چھوٹی سی عمر میں ان کے پیروں کے نشانات کا مطالعہ کیا جو ریت پر بن جاتے تھے۔ اس مطالعہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ کھروں اور پنجوں کے نشانات کے ذریعہ جانوروں کی جنس، عمر، قد و قامت، رفتار اور ان کے جانے کی سمت کا پتہ لگا لیتا تھا۔ اس نے جانوروں کی بولیوں کا مطالعہ کیا۔ وہ بولیوں کے ذریعہ نہ صرف جانوروں کی شناخت کر لیتا بلکہ وہ یہ بھی سمجھ جاتا کہ بولی نر کی ہے یا مادہ کی۔ بولی سے جنسی اختلاط مقصود ہے یا خطرے کا اعلان کیا گیا ہے اور جانور کتنے فاصلہ پر ہے۔ اس نے گھاس، پیڑ کے سوکھے پتوں اور تنوں پر لگی ہوئی چھال کا مطالعہ کیا اور ان پر جانوروں کے چھوڑے ہوئے نشانات کے ذریعہ ان کی عمر اور رفتار وغیرہ کا اندازہ کرنے لگا۔ اس نے ذہنی نقشے

بنانے کی عادت ڈالی، جن کی مدد سے وہ جنگل میں دن ہو یا رات کبھی راستہ نہیں بھولتا تھا۔ وہ رات کے وقت جنگل میں آنے جانے سے نہیں گھبراتا تھا کیونکہ وہ تاروں کی روشنی میں تیز قدم چل سکتا تھا۔ اس نے ہوا کا رخ پہچاننے میں بھی مہارت حاصل کی۔ وہ جنگلی جانوروں کی طرح اپنے کانوں کے ذریعے ہوا چلنے کی سمت کا احساس کر لیا کرتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے یہ علم بھی حاصل کیا کہ خطرناک جانوروں کا تعاقب کرتے وقت کس موقع پر ہوا کے ساتھ چلنا چاہیے اور کس موقع پر ہوا کے خلاف اور کن مواقع پر حملہ کا خطرہ پشت کی طرف سے ہوتا ہے یا بازو سے۔ اس نے جنگل میں رہنے والے جانوروں کی طرح بے آواز قدموں سے چلنے کی مشق کی اور وہ اس میں اتنا ماہر ہو گیا کہ جب وہ موہان کے آدم خور شیر کے تعاقب میں آخری دن گیا تو شیر صاحب کا پتہ نہیں چلا حالانکہ جنگلی جانوروں کی قوت سماعت بمقابلہ انسانوں کے مقابلے میں تیز ہوتی ہے۔ وہ شیر ایک پیڑ کی چھاؤں میں سو گیا جس کو اس نے سوتے میں ہی ہلاک کیا۔ اس کی لگن کا یہ عالم تھا کہ جب وہ رات کے وقت سونے کے لیے لیٹتا تو جانوروں کی آوازیں سن کر ان کی قسم اور ان کی جگہ کا اندازہ کرتا چنانچہ جب وہ جوان ہوا اور خطرناک جانوروں کو پیدل یا پیڑ پر سے شکار کرنے لگا تو اس کے کمسنی کے تجربات اور اسی عمر میں کیا ہوا جنگل کی زندگی کا مطالعہ کام آیا۔ وہ تمام عمر خطرناک جانوروں کا شکار کھیلتا رہا مگر سوائے دو ایک بار کے کبھی کسی جانور کو اس پر حملہ کرنے کا موقع نہیں ملا۔ یہی سبب ہے کہ وہ اپنے بستر پر مرا، کسی شیر یا گلدار نے اس کو ہلاک نہیں کیا۔ اس سلسلے میں یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ وہ خطرہ کو خطرہ نہیں سمجھتا تھا یا اس کو ڈر نہیں لگتا تھا، وہ خطرناک حالات میں ڈرتا بھی تھا البتہ اس کے اوسان کبھی خطا نہیں ہوتے تھے۔ وہ موقع کی نزاکت کے مطابق اپنی حکمت عملی سے کام لیتا تھا اور کامیاب ہو جاتا۔ اس سلسلے میں اس کی شکاری زندگی کے دو واقعات کی تلخیص پیش کرنا خالی از دلچسپی نہیں ہوگا۔ وہ واقعات مندرجۂ ذیل ہیں۔ پہلے واقعہ کا تعلق پنار کے آدم خور گلدار سے ہے جس نے چار سو انسان ہلاک کیے اور جس کو ضلع الموڑہ کے شمالی تام کے دیہات میں ختم کیا گیا۔

"میں نے گاؤں کے لوگوں کو بتایا کہ میں نے گلدار کو زخمی کر دیا ہے مگر یہ طے کرنا دشوار ہے کہ زخم مہلک ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ اس وقت ہم سب گاؤں کو واپس جائیں گے اور میں زخمی گلدار کو صبح کے وقت تلاش کروں گا۔ اس بات پر گاؤں کے لوگوں نے مایوسی کا اظہار کیا۔ جب گلدار کو اسی وقت تلاش کرنے کے موضوع پر گاؤں والوں کی بحث ختم ہو گئی تو میں اپنے صحیح فیصلہ کے خلاف کھیت کے کنارے تک جانے کے لیے آمادہ ہو گیا جہاں سے ہم نشیب میں واقع سطح کھیت کو دیکھ سکتے تھے (جس میں گلدار زخمی ہونے کے بعد گیا تھا)۔ میں نے لوگوں سے کہا کہ وہ ایک صف کی شکل میں میرے پیچھے چلنے، شعلوں کو اونچا رکھنے اور اگر گلدار حملہ کرے تو مجھے اندھیرے میں چھوڑ کر نہ بھاگنے کا وعدہ کریں۔ ان سب نے خوشی خوشی وعدہ کر لیا۔ ہم بہت آہستہ آہستہ خاموشی سے آگے بڑھے۔ جب ہم بکری (جس کو گلدار نے مارا تھا) تک پہنچ گئے تو نشیبی کھیت کا سرا نظر آیا۔ اس وقت (زخمی گلدار کے) خون کے نشانات تلاش کرنے کا موقع نہیں تھا۔ جیسے جیسے ہم کھیت کے کنارے کے قریب ہوتے گئے، نشیبی کھیت کا زیادہ حصہ دکھائی دینے لگا اور جب کھیت کی ایک تنگ پٹی پر شعلوں کی روشنی پڑنا باقی رہ گئی تھی تو گلدار نے غصے میں لگاتار غرا کر کھیت کے کنارے پر سے جست لگائی اور سامنے آ گیا۔ ایک حملہ آور گلدار کی غصے میں بھری ہوئی غراہٹ میں ہولناکی ضرور ہوتی ہے کیونکہ میں نے ہاتھیوں کی ایک ایسی قطار کو جو شیر کا راستہ روکنے میں نڈر تھے۔ ایک حملہ آور گلدار کے مقابلے میں منھ موڑ کر ادھر ادھر بھاگتے ہوئے دیکھا ہے۔ لہٰذا جب میرے تمام ساتھی، جو غیر مسلح تھے پشت دکھا کر تیر کی طرح بھاگے تو مجھے تعجب نہیں ہوا۔ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ وہ بھاگتے میں ایک دوسرے سے ٹکرائے اور چیڑ کی مشعلوں کے ٹکڑے زمین پر گرے اور بدستور روشنی دیتے رہے اور مجھے گلدار کے سینہ پر فائر کرنے کا موقع مل گیا۔ آدم خور شیر یا گلدار کا خوف ہمت کو پست کر دیتا ہے اور اگر میں بھی گاؤں کے لوگوں کی طرح ایک مشعل بردار ہوتا تو بھاگ پڑتا[1]"

---

[1] دی ٹیمپل ٹائگر اینڈ مور مین ایٹرس آف کماؤں۔ (صفحہ ۹۱-۹۲)

دوسرے واقعہ کا تعلق رُدرپور کے آدم خور گلدار سے ہے۔

"شاید ہم تینوں گاؤں میں زندہ نہیں پہنچ پاتے اگر خوش قسمتی سے میرے پاس دیاسلائیوں کی بھری ہوئی ڈبیہ نہیں ہوتی۔ میں دیاسلائی جلا کر چاروں طرف پُرتشویش نظروں سے دیکھتا اور پھرتی سے چند قدم آگے بڑھ جاتا، اس کے بعد دوسری دیاسلائی جلاتا۔ بالآخر ہم ناہموار راستہ پر ٹھوکریں کھاتے ہوئے گاؤں کے اتنا قریب پہنچ گئے کہ جب ہم نے گاؤں کے لوگوں سے آواز دے کر فوراً آنے کے لیے کہا تب وہ لالٹین اور چیڑ کی مشعلیں لے کر ہمارے پاس آگئے۔ دوسرے دن جب میں صبح تڑکے واپس ہوا، میں نے آدم خور گلدار کے پنجوں کے نشانات اس جگہ دیکھے جہاں سے وہ ہمارے تعاقب میں گاؤں تک آیا تھا۱؎"

جم کاربٹ نے ایک موقع پر خوف اور خطرے کے سلسلے میں یوں لکھا ہے:

"ممکن ہے چند خوش قسمت افراد کو ڈر نہ لگتا ہو مگر میں ان میں سے نہیں ہوں۔ جنگل کی زندگی سے عمر بھر کی واقفیت رکھنے کے باوجود میں شیر کے دانتوں اور پنجوں سے آج بھی اتنا ہی ڈرتا ہوں جتنا کہ اس وقت ڈرا تھا جب شیر نے مجھے اور میگاگ کو اس جنگل سے بھگایا تھا جس میں وہ سو رہا تھا۔ البتہ خوف کا مقابلہ کرنے اور اس کو قابو میں رکھنے کے لیے اب میں نے وہ تجربہ حاصل کیا ہے جو بچپن میں میسّر نہیں تھا۔ پہلے مجھے اپنے چاروں طرف خطرہ ہی خطرہ دکھائی دیتا تھا اور ہر آواز سے ڈر لگتا تھا۔ اب میں جانتا ہوں کہ خطرہ کہاں ہوگا اور کن آوازوں پر خصوصی توجہ دینی ہے اور کن آوازوں کو نظرانداز کرنا ہے۔ پہلے مجھے اپنے نشانہ پر اطمینان نہیں تھا۔ اب مجھے نشانہ پر اس حد تک اعتماد ہے کہ میں جہاں چاہوں گا گولی مار دوں گا۔ دراصل تجربہ خود اعتمادی پیدا کرتا ہے۔ لہٰذا تجربہ اور خود اعتمادی کی دولت حاصل کیے بغیر آدم خور شیر کو پیدل اور تنہا شکار کرنا خودکشی کرنے کے نہایت ناخوشگوار ذریعہ سے عبارت ہوگا۲؎"

"خطرے سے نہ صرف ہر شکار کا لطف بڑھتا ہے بلکہ اس سے ہمارے حواس میں تیزی پیدا ہو جاتی ہے اور ہماری توجہ ہر اس چیز کی طرف مبذول ہو جاتی ہے جس کا دیکھنا اور سننا ضروری ہے۳؎"

ایسے صبر آزما حالات میں جب کہ جم کاربٹ کی معمولی غفلت اس کو موت کی دعوت دے سکتی تھی، اس کا ان باتوں میں عقیدہ رکھنا جن کا عقل سے تعلق نہیں ہے، دلچسپ ہے اور حیرت انگیز بھی۔ وہ انڈوں کا ملنا اور سانپ کا مارنا فال نیک سمجھتا تھا۔ مثلاً جب وہ چوگڑھ کی آدم خور شیرنی کا تعاقب کر رہا تھا تو اثنائے راہ اس کو ایک چٹان پر چپکا (N I G H T J A R) کے دو انڈے ملے۔ وہ اس نے اٹھا کر اپنی بائیں ہاتھ کی ہتھیلی میں رکھ لیے اور ان کو مع ہتھیلی کے ایک پتے دار بیل سے لپیٹ لیا اور اس کے بعد وہ شیرنی کے تعاقب میں حسب معمول روانہ ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کی شیرنی سے ملاقات بڑے نازک موقع پر ہوئی۔ وہ نشیب میں تھا اور اس کے پیچھے دائیں طرف پندرہ فٹ کی بلندی پر سے شیرنی اس کو گھور رہی تھی۔ اس کا بایاں ہاتھ انڈوں کی وجہ سے بیکار تھا نیز اس کے دوسرے ہاتھ میں رائفل تھی جس سے شیرنی آٹھ فٹ کے فاصلے پر تھی۔ شیرنی کا نشانہ لینے کے لیے رائفل کو بقدر تین چوتھائی گھمانا ضروری تھا۔ شیرنی اس کو گھورتی رہی، وہ شیرنی پر نظریں جمائے رہا اور ساتھ ہی ساتھ وہ رائفل کی نال کو شیرنی کا نشانہ لینے کے لیے گھماتا رہا۔ جب نال گھوم کر شیرنی کے جسم کی سیدھ میں آگئی تو اس نے فائر کر دیا۔ گولی نے شیرنی کے دل کا بالائی حصہ چھلنی کر دیا اور وہ مر گئی۔ اس واقعہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے اس نے لکھا ہے۔

"میں اس غلطی کا اعتراف کرتا ہوں کہ میں بھی اتنا ہی توہم پرست ہوں جتنا کہ میرے ساتھی شکاری۔ میں نے ایک سال کے اندر تین طویل المیعاد عرصوں میں شیرنی پر فائر کرنے کا موقع تلاش کیا جس کی خاطر میں نے سخت محنت کی، مگر کامیابی میسر نہیں ہوئی اور اب انڈے ملنے کے چند منٹ بعد میری تقدیر بدل گئی"

(مین ایٹرس آف کماؤں۔ ص ۱۹۲)

۱؎ دی مین ایٹنگ لیپرڈ آف رُدرپریاگ۔ ص ۸۹۔ ۲؎ دی ٹیمپل ٹائیگر اینڈ مور مین ایٹرس آف کماؤں ص ۱۳۲۔ ۳؎ دی ٹیمپل ٹائیگر اینڈ مور مین ایٹرس ص ۱۳۱

کانڈا کا آدم خور شیر مارنے سے پہلے اس نے ایک نیرہ چودہ فٹ زہریلے سانپ (HAMADRYAD) کو ہلاک کیا تھا۔ اس سلسلے میں اس نے لکھا ہے۔

"مجھے نہیں معلوم کہ شکاری دوسرے لوگوں کے مقابلے میں زیادہ توہم پرست ہوتے ہیں۔ میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ شکاری اپنے توہمات کے معاملے میں بہت سنجیدہ ہوتے ہیں۔ میرے ایک دوست جب بھی درندوں کا شکار کھیلنے کے لیے جاتے ہیں تو وہ ہمیشہ پانچ کارتوس اپنے ساتھ لے جاتے ہیں، نہ ایک کم نہ ایک زیادہ۔ میرے ایک دوسرے دوست سات کارتوس لے جاتے ہیں۔ میرے ایک اور دوست جو شمالی ہندستان کے سب سے زیادہ مشہور شکاری تھے، جاڑوں میں شکار کھیلنے کا اس وقت تک آغاز نہیں کرتے تھے جب تک وہ ایک جاشیر مچھلی کا شکار نہ کر لیتے۔ میری بھی توہم پرستی کا تعلق سانپوں سے ہے۔ یہ میرا پختہ عقیدہ ہے کہ میں آدم خور شیر یا گلدار کا تعاقب کرنے میں کتنی ہی جد و جہد کروں میں اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں ایک سانپ کو ہلاک نہ کر لوں۔"

(مین ایٹرس آف کماؤں۔ ص ۱۴۴)

توہم پرستی کے ضمن میں یہ بات بھی آتی ہے کہ وہ چھٹی حس یا "نگہبان فرشتہ" کے وجود کا قائل تھا جو اس کو بروقت خطرے سے آگاہ کر دیتا تھا۔ اس نے اپنی کتابوں میں ایسے کئی واقعوں کا ذکر کیا ہے جب اچانک اس کے دل میں خطرہ کا احساس پیدا ہوا اور وہ آدم خور شیر یا گلدار کی غیر متوقع موجودگی سے باخبر ہو گیا جس کے نتیجے میں اس نے مزید احتیاطی تدابیر اختیار کیں اور خود شکار ہونے سے بچ گیا۔ اس کا یہ وہم بھی اس حد تک حقیقت پر مبنی تھا کہ نتیجہ کبھی غلط برآمد نہیں ہوا یعنی اس کو جب بھی خطرہ کا احساس ہوا تو فی الواقع خطرہ موجود تھا جس کی تصدیق بعد کو ہو جاتی تھی۔ اس سلسلے میں وہ لکھتا ہے۔

"میں نے کسی دوسری جگہ بھی اس حس کا ذکر کیا ہے جو مجھے آنے والے خطرہ سے آگاہ کر دیتی ہے اور میں اس موضوع پر اس سے زیادہ لکھنے کی زحمت نہیں کروں گا کہ یہ حس بالکل حقیقی ہے اور چونکہ میں اس کیفیت سے ناواقف ہوں میں یہ نہیں بتا سکوں گا کہ اس کا محرک کیا ہے۔"

(مین ایٹرس آف کماؤں۔ ص ۸۸)

جم کاربٹ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ریلوے میں فیول انسپکٹری کی اسامی پر ملازم ہو گیا۔ اس نے ڈیڑھ برس تک یہ خدمت انجام دی۔ اس زمانے میں (۱۸۹۴ء) ریل کے انجنوں میں لکڑی جلائی جاتی تھی۔ اس عہدے سے سبکدوش ہونے کے بعد اس نے ایک سال تک ریل کے محکمے میں مختلف جگہوں پر کام کیا۔ اس نے ریلوے انجن چلائے، گارڈ بنا، نائب اسٹور کیپر رہا اور نائب اسٹیشن ماسٹر کی خدمات انجام دیں۔ اس کے بعد اس کا مکامہ گھاٹ میں ٹرانس شپمنٹ انسپکٹر نیز ہینڈ لنگ کنٹریکٹر کی ملازمت مل گئی۔ اس نے یہ خدمت ۲۱ برس تک انجام دی۔ اس نے پہلی جنگ عظیم میں شامل ہو کر وزیرستان اور فرانس میں فوجی خدمت انجام دی۔ اس نے دوسری جنگ عظیم میں بھی حصہ لیا۔ وہ بیرونجات کے فوجی افسران کو جنگل میں لڑنے کا فن سکھاتا تھا۔ اس کا عہدہ کرنل کا تھا۔ حکومت کی طرف سے اس کو "فریڈم آف فارسٹ" کا اعزاز حاصل تھا یعنی وہ سرکاری جنگلات میں بلا اجازت شکار کھیل سکتا تھا۔

جم کاربٹ کی دوامی شہرت کا باعث تین امور ہیں (۱) وہ ایک عظیم شکاری تھا (۲) وہ بہترین قصہ گو تھا (۳) وہ غریب پہاڑی عوام کا خادم تھا۔

اس میں شک نہیں کہ جم کاربٹ ایک عظیم المرتبت شکاری تھا اور اس کے کارنامے شکاریات کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے جس کا اندازہ گزشتہ اوراق کے مطالعہ سے بھی ہوا ہوگا۔ حقیقت میں کسی علاقے میں شیر یا گلدار کا آدم خور بن جانا قہر خداوندی سے کم نہیں ہے جس کا اندازہ مندرجہ ذیل واقعہ سے ہوگا جو جم کاربٹ کو چمپاوت میں سنایا گیا تھا:

"چمپاوت کی سڑک چند میل تک پہاڑی کے جنوبی رُخ کے متوازی وادی سے پچاس گز کی بلندی پر واقع ہے۔ لگ بھگ دو ماہ ہوئے بیس آدمیوں کی ایک جماعت چمپاوت کے بازار کی طرف دوپہر کے وقت اس سڑک پر آ رہی تھی۔ ہم نشیبی وادی میں

ایک انسان کی دردبھری چیخیں سن کر چونکے۔ جوں جوں پُردرد چیخیں قریب تر آتی گئیں ہم لوگ سڑک کے کنارے اکٹھا ہوکر کھڑے ہوگئے اور مارے خوف کے سکڑنے لگے۔ ٹھیک اسی وقت ایک شیر نمودار ہوا جو ایک ننگی عورت کو لیے جارہا تھا۔ شیر کی ایک جانب عورت کے بال زمین پر گھسٹ رہے تھے اور دوسری جانب اس کے پاؤں۔ شیر نے عورت کی پشت اپنے منھ میں جکڑلی تھی۔ عورت اپنا سینہ کوٹ رہی تھی۔ وہ کبھی خدا کو اور کبھی انسانوں کو مدد کے لیے پکار رہی تھی۔ ہماری جگہ سے پچاس گز کے فاصلے پر ہماری نظروں کے سامنے سے شیر اپنا بوجھ لے کر گزرا۔ جب بوجہ دوری آوازیں آنا بند ہوگئیں ہم اپنے سفر پر روانہ ہوگئے۔"

(مین ایٹرس آف کماؤں۔ ص ۱۲)

ایسے ہولناک واقعات سے متاثر ہوکر لوگ گھروں کے باہر نہیں نکلتے تھے اور کبھی کبھی علاقہ خالی کرکے دوسری جگہ چلے جاتے تھے۔ پہاڑی علاقہ میں لوگوں کا ذریعہ سفر ان کے پاؤں ہیں اور ان کی معاش کا بیشتر دار و مدار کھیتی پر ہے جانوروں کے لیے چارا اور گھروں میں جلانے کے لیے ایندھن جنگل سے فراہم کیا جاتا ہے۔ ضرورت کی دیگر اشیا گاؤں کے بازار میں ملتی ہیں۔ لہٰذا جب آدم خور شیر یا گلدار ان کے علاقے میں موت کی طرح منڈلاتا ہے ان کی زندگی مصیبت بن جاتی ہے جم کاربٹ نے رُدر پریاگ کے آدم خور گلدار کی تباہ کاری کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"رُدر پریاگ کے آدم خور گلدار نے جیسا کرفیو نافذ کیا تھا ویسا کرفیو نہ اتنی شدت کے ساتھ کبھی نافذ ہوا اور نہ ہی بے کم و کاست بجالایا گیا۔" (ص ۹)

اس نے تھاک کی آدم خور شیرنی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"تھاک اپنی سیکڑوں سال کی زندگی میں کتنے ہی نشیب و فراز سے گزرا لیکن اپنی طویل تاریخ میں کبھی اس کو خالی نہیں کیا گیا تھا جیسا کہ اب ہوا...... اس کے تو یا اس سے زیادہ باشندوں نے اپنے پالتو جانوروں سمیت راہِ فرار اختیار کی۔ میں نے گاؤں میں صرف ایک بلی کو دیکھا جس نے نہایت گرم جوشی سے میرا استقبال کیا۔ لوگوں نے اس قدر عجلت میں گاؤں کو خالی کیا تھا کہ بہت سے گھروں کے دروازے چوپٹ کھلے ہوئے تھے۔ میں نے گاؤں کی ہر پگڈنڈی پر گھروں کے آنگن میں اور دروازوں کے سامنے خاک دھول میں شیرنی کے پنجوں کے نشانات دیکھے۔"

(مین ایٹرس آف کماؤں۔ ص ۱۸۹)

ایسے الم ناک و اعصاب شکن پس منظر میں جم کاربٹ کا تن تنہا آدم خور شیر و گلدار کا تعاقب کرکے ہلاک کرنا غیر معمولی کارنامہ معلوم ہوتا ہے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاید وہ اس کارِ عظیم کے لیے ہی پیدا کیا گیا تھا۔ دوسروں کی زندگی بچانے کے لیے اپنی زندگی کو بار بار خطرے میں ڈالنا غیر معمولی انسانوں کا ہی کام ہے۔

جم کاربٹ کی شہرت کا دوسرا سبب اس کی تصنیفات ہیں۔ اس نے پانچ کتابیں لکھی ہیں:

(۱) مین ایٹرس آف کماؤں (۲) دی مین ایٹنگ لیپرڈ آف رُدر پریاگ (۳) دی ٹیمپل ٹائیگر اینڈ مور مین ایٹرس آف کماؤں (۴) جنگل لور (۵) مائی انڈیا۔

ان میں اول الذکر تین کتابیں اس کی ایسی مہموں پر مبنی ہیں جن کا تعلق آدم خور شیروں و گلداروں کے شکار سے ہے۔ ان میں پہلی کتاب اس کی شہرت کا سنگ بنیاد ہے۔ اس کتاب کے طبع ہوتے ہی وہ ساری دنیا میں مشہور ہوگیا۔ جنگل لور کو اس کی بالواسطہ سوانح عمری کہا جا سکتا ہے۔ مائی انڈیا کے بیشتر مضامین دوسرے کرداروں پر مبنی ہیں جیسے چماری، سلطانہ ڈاکو، کنور سنگھ وغیرہ۔ جم کاربٹ کی شکاریات پر مبنی کہانیوں کے ماحول میں یکسانی ملتی ہے۔ وہی جنگل ہے سال یا ہلدو کا، اونچی گھانس یا خاردار جھاڑیوں کا پہاڑ کے اوپر یا پہاڑ کے دامن میں، ایک ہی طرح کے جنگل ہیں جو خطرے کا اعلان کرتے ہیں۔ چیتل، بندر، مور وغیرہ۔ ایک ہی طرح کی مشکلات ہیں، کہیں نشیب تو کہیں فراز، راستہ کبھی ہموار تو کبھی ناہموار، خشک و ترنالے ندیاں، روشنی کی کمی، برق و باراں، موسم کی شدت وغیرہ ایک ہی طرح کا پس منظر ہے۔ ساکت و خاموش جس کے سناٹے میں موت و زندگی کا ڈراما کھیلا جاتا ہے۔ ایک ہی طرح کے افراد ہیں، مفلس و نادار مگر محنتی و ایماندار جن کو آدم خور شیر و گلدار بلا تخصیص

ہم جنس شکار کرتے ہیں۔ وہی آدم خور شیر و گلدار ہیں جو انسان کے ظلم کا شکار ہو کر بڑھاپے کی وجہ سے یا قدرتی غذا نہ ملنے کی وجہ سے آدم خور بن جاتے ہیں اور لوگوں کا جینا دوبھر کر دیتے ہیں اور وہی ایک شکاری ہے جو اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال کر بے آواز قدموں سے آدم خور شیر یا گلدار کا تعاقب کرتا ہے یا کسی پیڑ پر بیٹھ کر ان کا انتظار کرتا ہے۔ آدم خور شیر یا گلدار کی مکاریاں ایک سی ہیں اور شکاری کو درپیش آنے والے خطرات بھی ایک سے ہیں۔ کہانی کا انجام وہی ایک ہے، آدم خور شیر یا گلدار مارا جاتا ہے اور شکاری کی فتح ہوتی ہے۔ مگر ماحول، پس منظر اور انجام کی یکسانی کے باوجود اس کی کہانیوں میں غضب کا ڈرامہ ہے۔ کہانیوں کو پڑھتے وقت کبھی قلب کی رفتار تیز ہو جاتی ہے تو کبھی سانس رکتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اور جب کہانی اپنے انجام کو پہنچ جاتی ہے تو قلب کو سکون ملتا ہے، کچھ ایسا ہی سکون جو جم کاربٹ کو آدم خور شیر یا گلدار کو ہلاک کرنے کے بعد ملا ہوگا۔

جم کاربٹ کی کہانیوں میں جنگل کی زندگی کا عمیق مطالعہ بھی ملتا ہے۔ جس کو اس نے بالارادہ پیش نہیں کیا بلکہ وہ قصہ کے ضمن میں خود بخود آجاتا ہے کیونکہ اس کی کہانیوں کا پس منظر جنگلات ہیں جن سے وہ بخوبی واقف تھا۔ چنانچہ وہ تمام افراد جو جنگل کی زندگی کے مطالعہ میں دلچسپی رکھتے ہیں ان کے لیے جم کاربٹ کی کتابوں میں ایسا مواد بھی محفوظ ہے جو ان کے مذاق کے بموجب ثابت ہو سکتا ہے۔ ان خصوصیات کے علاوہ جم کاربٹ کی کہانیوں میں اس کا جذبۂ ہمدردی بھی پوشیدہ ہے جو قاتل اور مقتول دونوں کے لیے یکساں ہے۔ اس نے جہاں اس تباہی کا ذکر کیا ہے جو آدم خور شیر یا گلدار کی وجہ سے وسیع علاقوں میں گھر گھر وبا کی طرح آجاتی تھی وہاں اس نے ان سے اظہارِ ہمدردی بھی کیا ہے، وہ لکھتا ہے:

"ایک آدم خور شیر وہ شیر ہے جو ایسے حالات کے دباؤ میں اگرچہ اس کی قدرت کے باہر ہوں ایسی غذا کھانے لگتا ہو جو اس کے لیے اجنبی تھی۔ دس میں سے نو موقعوں پر اس کا باعث زخم ہوتے ہیں اور دسواں موقع بڑھاپا۔ لاپرواہی سے نشانہ لے کر گولی چلانا اور پھر زخمی شیر کا تعاقب کر کے اسے ہلاک نہ کرنا ہی اس کو آدم خور بنا دیتا ہے۔ شیر کو خارپشت کا شکار کرتے وقت بھی زخم لگتے ہیں اگر وہ اس وقت غصہ میں بھر جائے ...... زخمی شیر یا وہ شیر جو تازہ شکار کے پاس ہو یا وہ شیرنی جس کے چھوٹے بچے ہوں خلل اندازی کے موقع پر بھی آدمی کو مار ڈالتے ہیں ..... میں نے اپنی عمر کے کم و بیش ۳۲ برس آدم خور جانوروں کے مستقل تعاقب میں گزارے ہیں اور حالانکہ میں نے ایسے مناظر دیکھے ہیں کہ پتھر دل بھی رو پڑتے مگر میں نے ایک بھی ایسا واقعہ نہیں دیکھا جب کہ شیر نے جان بوجھ کر ظلم کیا ہو یا اس نے محض خون کی پیاس بجھانے کے لیے بدون اشتعال آدمی کو ہلاک کیا ہو یا اس نے اپنی اور اپنے بچوں کی بھوک مٹانے کی ضرورت سے زیادہ شکار کیا ہو ..... شیر میں وسیع القلب انسان کی سی شرافت اور اس کے ساتھ غیر معمولی جرأت مندی ہوتی ہے اور جب اس کی نسل ختم ہو جائے گی، جیسا کہ رائے عامہ ہموار نہ ہونے کی شکل میں خطرہ ہے، تو ہندوستان کو اپنا سب سے اعلیٰ جانور کھو کر پشیمانی ہوگی۔"

(مین ایٹرس آف کماؤں۔ مصنف کا افتتاحی نوٹ)

جم کاربٹ کی شہرت کا تیسرا راز ہندوستان کے غریب عوام سے محبت میں پوشیدہ ہے جس کا اظہار اس کی ہر کتاب میں بالعموم اور مائی انڈیا میں بالخصوص ملتا ہے۔ وہ مائی انڈیا کے مقدمے میں لکھتا ہے:

"میرا ہندوستان جس کی دیہی زندگی اور سرگرمی کے یہ خاکے پیش کیے گئے ہیں اس سے مراد ملک کے وہ وسیع خطے ہیں جن کو میں اپنی ابتدائی زندگی کے زمانے سے جانتا ہوں اور جہاں میں بھی سرگرم عمل رہا ہوں۔ وہ سادہ مزاج عوام جن کے کردار و اطوار کی تصاویر اس کتاب میں پیش کی گئی ہیں وہی لوگ ہیں جن کے ساتھ میں نے اپنی زندگی کے ستر برس سے زیادہ گزارے ہیں۔"

اس نے مائی انڈیا میں جن افراد کے خاکے پیش کیے ہیں وہ موتی، کنور سنگھ، سلطانہ، بدھو، لالاجی، اور چماری ہیں۔ وہ ان سب سے واقف تھا۔ وہ ان کو ویسا ہی پیش کرتا ہے جیسا کہ وہ سب تھے وہ ان کی اچھی خصوصیات کو بھی بیان کرتا ہے اور ان سے اظہار ہمدردی

کرتا ہے۔ وہ سلطانہ کے متعلق لکھتا ہے۔

" سوسائٹی کا تقاضہ ہے کہ اس کو مجرموں سے بچایا جائے اور سلطانہ ایک مجرم تھا۔ اس پر ملک کے قانون کے تحت مقدمہ چلا، وہ سزایاب ہوا اور اس کو پھانسی دے دی گئی۔ مگر میں اس چھوٹے سے آدمی کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا جس نے تین سال تک حکومت کی طاقت کو حقیر بنائے رکھا اور اپنے اچھے چلن سے جیل میں اپنے محافظوں کی تعریف کا سزاوار ہوا .... اس کو نرم سزا دی جاتی کیونکہ اس کو پیدائشی مجرم گردانا گیا اور سنبھلنے کا موقع نہیں دیا گیا اور جب طاقت اس کے ہاتھ میں تھی اس نے غریبوں پر ظلم نہیں کیا۔ جب میں اس کا تعاقب کرتا ہوا برگد کے پیڑ تک پہنچ گیا تھا اس نے میری اور میرے دوستوں کی جان بخش دی (سلطانہ اسی برگد کے پیڑ پر چھپا ہوا تھا) اور آخر میں جب وہ فریڈی ینگ سے ملاقات کرنے کے لیے گیا تو اس کے ہاتھ میں چاقو یا ریوالور نہیں تھا، تواضع کے لیے ایک تربوز تھا۔" (ص ۱۲۰ - ۱۲۱)

وہ چماری پر مضمون ختم کرتے ہوئے لکھتا ہے:

" ہمارے عیسائی عقیدے کے مطابق چماری لامذہب تھا اور اچھوت جاتیوں میں سب سے نیچی جات کا آدمی لیکن اگر مجھے وہاں جانے کا اختیار مل جائے جہاں چماری مرنے کے بعد گیا ہے تو میرا قلب مطمئن ہو جائے گا۔" (ص ۱۰۳)

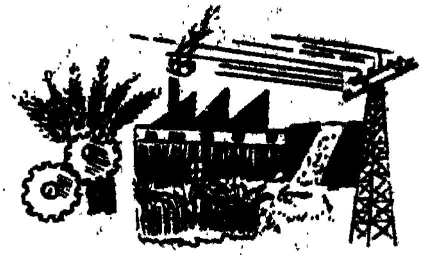
لہٰذا اس کو غریبوں سے بہت محبت ملی۔ خاص طور پر کمایوں و گڑھوال کا غریب طبقہ اس سے بہت محبت کرتا تھا۔ وہ اس کو سفید سادھو کہتے تھے۔ اس نے مائی انڈیا میں لکھا ہے۔

"..... کھیا کی بیوی نے میرے لیے کھانا تیار کیا جس کو اس کی لڑکیوں نے پیتل کی تھالیوں میں میرے سامنے لاکر رکھا۔ دافرادونیدہ کھانا کھانے کے بعد — میں نے اس دن کھانا بالکل نہیں کھایا تھا۔ میں نے تھالیوں کو قریب کے چشمے میں دھونے کے خیال سے اٹھایا۔ یہ دیکھتے ہی تینوں لڑکیاں دوڑی دوڑی آئیں اور تھالیاں چھین لیں اور انھوں نے سر کو جھکا کر ہنستے ہوئے کہا کہ ان تھالیوں کے دھونے سے جن میں سفید سادھو نے کھانا کھایا ہے ان کی جات ختم نہیں ہو جائے گی۔ لڑکیاں برہمن تھیں۔" (ص ۱۲)

دراصل یہی وہ اپنائیت کا جذبہ تھا جس کی وجہ سے وہ ہر دلعزیز ہوا۔ محبت و خدمت تو فاتح عالم ہے۔ اس نے غریبوں سے محبت کرکے، ان کے دکھ درد میں شریک ہو کر اور اپنی زندگی کو بار بار خطر میں ڈال کر ان کی خدمت کی۔ یہی سبب ہے کہ لوگوں نے اس کو فراموش نہیں کیا ہے۔ گذشتہ سال اس کی صد سالہ برسی منائی گئی ہے جس کے سلسلے میں کالا ڈھونگی کے باشندوں کو نینی تال کے اس بنگلہ میں آنے اور تقریب میں حصہ لینے کی دعوت دی گئی تھی جس میں ۱۰۰ برس قبل وہ پیدا ہوا تھا۔ کالا ڈھونگی کے مکان کو اس کی یادگار میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ کاربٹ نیشنل پارک تو بین الاقوامی شہرت کا مالک ہے۔ رُدرپریاگ میں جہاں اس نے ۲ مئی ۱۹۲۶ء کو آدم خور گلدار ہلاک کیا تھا، ایک سفاری لاج بنانے کا پروگرام ہے۔ نارتھ ایسٹرن ریلوے نے ترائی ویکلی ایکسپریس کو، جو لکھنؤ اور کاٹھ گودام کے درمیان چلتی ہے، اس کے نام سے معنون کیا ہے۔ مناسب ہوگا کہ اس کی کتابوں کا ہندوستان کی ہر زبان میں ترجمہ ہو تاکہ عوام اس کے خیالات اور کارناموں سے واقف ہوں۔ ہلدوانی سے رام نگر جانے والی نئی سڑک کا نام جم کاربٹ مارگ رکھ دیا جائے (اگر ہنوز اس سڑک کا کوئی نام نہ رکھا گیا ہو) کیونکہ یہ وہ سڑک ہے جس کے چپے چپے پر اس کے قدموں کے نشانات ہیں۔ ان جگہوں پر جہاں اس نے آدم خور شیر و گلدار ہلاک کیے ہیں یادگاری پتھر نصب کرا دیے جائیں۔ مختلف درجات کے انگریزی کے نصاب میں اس کے قصے یا ان کا خلاصہ شامل کیا جائے تاکہ ہمارے بچے نہ صرف اس سے واقف ہوں بلکہ ان کے دل میں جنگل کی زندگی کے تحفظ کا خیال پیدا ہو۔

جم کاربٹ نے مرنے سے پانچ چھ برس پہلے نیروبی (کینیا، مشرقی افریقہ) میں سکونت اختیار کر لی تھی جہاں وہ دمہ کے مرض میں مبتلا ہو کر بہ عمر ۸۰ سال بہ مقام نیئری ۱۹ اپریل ۱۹۵۵ء کو فوت ہوا۔

اُتر پردیش شاہراہِ ترقی پر



غریبی کے خاتمے کے لیے خاندانی منصوبہ بندی ضروری ••• انسان کی بقا کے لیے کنبہ بندی ناگزیر ••• خاندانی منصوبہ بندی کی ترغیب دینا ریاستی حکومت کے ملازمین کے فرائض میں شامل ••• خاندانی منصوبہ بندی پروگرام میں محکمۂ تعلیم کا سب سے بڑا حصہ ••• نس بندی آپریشنوں میں ریاست بھر میں ضلع مظفرنگر سرفہرست ••• خاندانی منصوبہ بندی پروگرام کے سلسلے میں گاؤں سبھاؤں کا تعاون حاصل کرنے کی ہدایت ••• کانپور کے دیہات میں دو دن کے اندر ۸۵۰ سے زیادہ نس بندی آپریشن ••• کمزور طبقوں کو گھریلو صنعتوں کے قیام کے لیے مالی امداد ••• اعظم گڈھ میں کمزور طبقوں کو دو کروڑ روپیہ کے بینک قرضے ••• اخباری نامہ نگاروں کو بسوں میں مفت سفر کی سہولتیں ••• اتر پردیش میں ۱۵۰۰ کیلومیٹر لمبی سڑکوں کی تعمیر کا تیز رفتار پروگرام ••• سرکاری ملازمین کے تبادلے کے سلسلے میں سیاسی دباؤ پر کابینہ کا اظہارِ برہمی

وزیر اعلا شری نرائن دت تیواری نے آگاہی دی کہ آبادی میں اضافہ کی موثر روک تھام کے بغیر غریبی دور نہیں کی جا سکتی ہے۔

وزیر اعلا نے پیلی بھیت میں آیورویدک کالج میں ایک خاندانی منصوبہ بندی کیمپ کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ اگرچہ پیداوار میں ڈھائی گنی اضافہ ہوا ہے، لیکن اس کے تناسب سے فی کس آمدنی نہیں بڑھ رہی ہے جس کا سبب آبادی میں تیز رفتار اضافہ ہے۔

شری تیواری نے بتایا کہ ریاست میں ڈیڑھ کروڑ "اہل افراد" ہیں اور اگر ہم چاہتے ہیں کہ سماج کے تمام طبقے منصوبہ بندی اور ترقی کے فائدے اٹھائیں تو آئندہ پانچ چھ برسوں میں ان اہل افراد کی نس بندی ضروری ہے۔ انھوں نے کہا کہ کسی مذہب میں خاندانی منصوبہ بندی کے طریقے اختیار کرنے کی ممانعت نہیں ہے۔ جو لوگ مذہب کے نام پر خاندانی منصوبہ بندی کے بارے میں افواہ پھیلاتے ہیں وہ دراصل غریبی دور کرنے کی ہماری کوششوں میں رکاوٹ ڈالتے ہیں۔

وزیر اعلا نے ان سات کارکنوں کو ٹرانسسٹر دئیے جنھوں نے ضلع میں خاندانی منصوبہ بندی کی ترویج کے سلسلہ میں قابل تعریف کام کیا ہے۔

پیلی بھیت کے ضلع مجسٹریٹ شری آر۔ کے ماتھر نے وزیر اعلا کا خیر مقدم کرتے ہوئے بتایا کہ ضلع میں اب تک ۲ نس بندی آپریشن کیے جا چکے ہیں۔

❖ ❖ ❖

وزیر اعلا شری نرائن دت تیواری نے علی گڈھ میں اعلان کیا کہ کنبہ بندی ملک کے لیے زندگی اور موت کا سوال ہے

ہے۔ انھوں نے کہا کہ کنبہ بندی پروگرام پر آج دنیا کے تمام ترقی پذیر ملکوں میں عمل کیا جا رہا ہے۔ شری تیواری نے آگاہی دی کہ اگر ہم اضافہ آبادی کی روک تھام نہیں کرتے تو غریبی اور زیادہ بڑھ جائے گی۔

شری تیواری نے واضح الفاظ میں کہا کہ کنبہ بندی کے معاملہ میں کسی قسم کا جبر نہیں کرنا چاہیے بلکہ اس ضرورت کو عوام کے ذہن نشین کرنا اور اس پروگرام میں تعاون دینے کے لیے انھیں آمادہ کرنا چاہیے۔ انھوں نے مشورہ دیا کہ نس بندی کے بجائے اسے "حد بندی" کہنا چاہیے کیونکہ اس کا مقصد کنبہ کو محدود کرنا ہے۔

شری تیواری ضلع علی گڈھ کے ملکھان سنگھ اسپتال میں خاندانی منصوبہ بندی کے دس بہترین کارکنوں کو انعامات تقسیم کرنے کے بعد تقریر کر رہے تھے۔ انعام پانے والوں میں ڈاکٹر این کے سکسینہ (سرجن)، ڈاکٹر آر۔ اے سنگھ (پیتھالاجسٹ)، شری واٸی ڈی شرما (ضلع اطلاعات افسر) شری گوری شنکر سنگھ چودھری (بی ڈی او) شری سراج الملک (نائب تحصیلدار)، شری نیک رام سنگھ (سنیٹری انسپکٹر)، شری نند لال سنگھ (سب ڈپٹی انسپکٹر آف اسکولس) شری امر سنگھ (گرام سیوک) شری کھیم چندر پال گوت (لیکھپال) اور شری کرن سنگھ سرنگی (سب ڈپٹی انسپکٹر آف اسکولس) شامل ہیں۔

❊ ❊ ❊

ریاستی حکومت نے ایک مقررہ تعداد میں لوگوں کو خاندانی منصوبہ بندی پروگرام اپنانے کے لیے راغب کرنا ریاستی حکومت کے ہر ملازم کے لیے فرائض کا ایک جز قرار دیا ہے جیسا کہ یو۔ پی سرکاری ملازمین (خاندانی منصوبہ بندی سے متعلق خصوصی ضوابط) قواعد ۱۹۷۶ء کے قاعدہ ۱۱ کے تحت بندوبست ہے۔

اس وضاحت کی ضرورت اس لیے پیش آئی ہے کہ ۲۸ اکتوبر ۱۹۷۶ء کو بعض اخبارات میں، جن میں پائنیر بھی شامل ہے یہ خبر شائع ہوئی ہے کہ "صرف محکمہ خاندانی منصوبہ بندی کے ملازمین کے لیے خواہ وہ اہل ہو یا نہ ہو، یہ ضروری ہے کہ وہ لوگوں کو خاندانی منصوبہ بندی کی ترغیب دیں، کیونکہ یہ ان کے فرائض میں شامل ہے۔" یہ خبر صحیح نہیں ہے اور نہ محکمۂ علاج وصحت کے سکریٹری نے یہ بات کہی ہے۔ اس سے ایک غیر ضروری الجھن اور غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے

❊ ❊ ❊

ریاست میں نس بندی آپریشنوں کی کل تعداد اب تک ۴۲۶۰۸۷ تک پہنچ گئی ہے جو ریاست کے لیے مقررہ قوٹہ کے ۱۰۶ فی صد سے زیادہ ہے۔

گذشتہ ۳۰ دنوں کا نس بندی کا یومیہ اوسط ۶۵۷۹ ہے۔

اس سلسلہ میں محکمۂ تعلیم کا فی صد سب سے زیادہ ہے جس نے ۱۰۰۸۳۶ نس بندی آپریشن کرائے۔ مقررہ نشانہ کے مقابلہ میں کارگزاری کے فی صد کے اعتبار سے محکمۂ مال دیگر تمام محکموں سے آگے ہے جس نے ۹۰ فی صد سے زیادہ کامیابی حاصل کی ہے۔

❊ ❊ ❊

ضلع مظفر نگر نے جہاں گذشتہ ۱۷ اکتوبر کو یعنی صرف ایک دن میں ۱۳۲۷ نس بندی آپریشن کیے گئے، ریاست کے دیگر اضلاع پر اپنی سبقت کو برقرار رکھا۔ اس ضلع میں نس بندی آپریشنوں کی تعداد ۲۳۶۳۵ تک پہنچ گئی ہے اور یہ اپنے قریب ترین حریف ضلع میرٹھ جہاں ۱۹۴۳۵ نس بندی آپریشن کیے جا چکے ہیں۔ ۴۲۰۰ نس بندی آپریشنوں سے سبقت لے گیا ہے۔ ریاست میں نس بندی آپریشنوں کی کل تعداد ۴۲۱۵۰۹ تک پہنچ گئی ہے جس میں مردوں کے ۴۰۲۷۴ نس بندی آپریشن شامل ہیں۔ یہ تعداد ۴ لاکھ نس بندی آپریشنوں کے قومی نشانہ کی

۱۴٫۱۲۳ فی صد اور ریاست کے ۱۵ لاکھ کے نشانہ کی ۸۴٫۳۲۲ فی صد ہے۔ مظفر نگر اور میرٹھ کے علاوہ دیگر پانچ اضلاع جو اس پروگرام میں پیش پیش ہیں یہ ہیں۔ گورکھپور (۱۹۲۰۶) (نس بندی آپریشن)، لکھنؤ (۱۴۹۲۰)، الہ آباد (۱۴۷۷۳)، کانپور (۱۴۴۳۸) اور آگرہ (۱۳۶۳۱)۔

ریاست میں نس بندی آپریشنوں کا یومیہ اوسط بدستور تقریباً ۶۰۰۰ ہے۔

⁂

اترپردیش کے زرعی پیداوار کمشنر شری کرپا نرائن سریواستو نے ریاستی محکمۂ پنچایت کو ہدایت کی ہے کہ وہ خاندانی منصوبہ بندی کے قومی پروگرام کے سلسلہ میں گاؤں سبھاؤں کے پردھانوں، سرپنچوں، بلاک پرمکھوں اور سماجی کارکنوں کا تعاون حاصل کرے۔

انھوں نے کہا ہے کہ مذکورہ افراد کا تعاون حاصل کرنے کے لیے بلاک کی سطح پر سمیلن منعقد کیے جانا چاہییں اور ان سمیلنوں میں خاندانی منصوبہ بندی نمائش اور خصوصی نس بندی کیمپوں کا اہتمام بھی کیا جانا چاہیے۔ ان کیمپوں میں صرف ان لوگوں کی نس بندی کی جانا چاہیے جنھیں غیر سرکاری کارکنوں نے ترغیب دی ہو۔

انھوں نے مزید ہدایت کی کہ محکمہ میں ایسے پردھانوں، سرپنچوں اور پرمکھوں کی ایک باقاعدہ ہفتہ وار فہرست تیار کی جانا چاہیے جو نس بندی کرائیں۔

⁂

وزیر برائے سماجی بہبود ڈاکٹر ترون سنگھ کے ۱۱ اور ۱۲ اکتوبر کے دو روزہ دورہ میں کانپور (دیہات) میں ۸۵۰ نس بندی آپریشن کیے گئے جو بجائے خود ایک ریکارڈ ہے۔

ڈاکٹر چرن سنگھ نے اپنے دورہ کے دوران بلہور، ڈیرہ پور، اکبر پور، بھوگنی پور (بکھرایاں)، گھاٹم پور اور بیٹھنو کے خاندانی منصوبہ بندی کیمپوں کا معائنہ کیا۔

انھوں نے متعدد عوامی جلسوں سے بھی خطاب کیا جن میں انھوں نے ملک کی معاشی ترقی کے لیے خاندانی منصوبہ بندی کی اہمیت واضح کی اور اسے اپنانے پر زور دیا۔ ڈاکٹر چرن سنگھ نے توہمات اور شرارت آمیز افواہیں پھیلانے والوں کے خلاف عوام کو خبردار کیا۔

بلہور میں نس بندی کرانے والوں کو قرعہ اندازی کے ذریعہ انعامات دیے گئے۔ ان انعامات میں گھاس کاٹنے کی ایک مشین۔ دو سلائی مشینیں، تین ٹرانزسٹر (دو کمبل) اور ایک سائیکل شامل ہے۔ اس کے علاوہ اکبر پور میں نس بندی کرانے والوں کو دیگر ترغیبی سہولتوں کے علاوہ ایک ایک دھوتی بھی دی گئی۔

⁂

ریاستی حکومت نے ٹی ٹوٹی فائڈ قبیلوں کو گھریلو صنعتیں قائم کرنے کے لیے مالی امداد دینے کی غرض سے ایک لاکھ روپے کی رقم منظور کی ہے۔ اس کے علاوہ تسلیم شدہ اداروں میں قبائل مندرجہ فہرست کے طلباء کو نویں اور دسویں درجوں میں مفت تعلیم حاصل کرنے کی سہولت دینے کے لیے ۱۰۰۰۰ روپے کی رقم بھی منظور کی گئی ہے۔

مزید برآں مذکورہ بالا قبائل اور خانہ بدوش قبیلہ کے افراد کی بھلائی کے لیے تین لاکھ روپیہ اور اقوام مندرجہ فہرست کی بھلائی اور ان کا معیار زندگی بلند کرنے کے لیے ۲۵۰۰۰ روپیہ کی رقم منظور کی گئی ہے۔

⁂

یونین بینک آف انڈیا نے ضلع اعظم گڑھ میں کمزور طبقوں کی امداد کے لیے دو کروڑ روپیہ کے قرضے دیے ہیں۔ ان میں سے اب تک تقریباً ۵۰ فی صد قرضے ترجیحی پروگراموں کے لیے اور پسماندہ علاقوں میں تقسیم کیے گئے ہیں۔

ان قرضوں سے مستفید ہونے والے ۲۸۷۶ افراد کو ۴ فی صد سالانہ کی تفریقی شرح سے سود ادا کرنا ہوگا۔ اس کے علاوہ ۳۲۱۶ چھوٹے کسانوں کو ٹریکٹر، ٹیوب ویلوں، پمپنگ سیٹوں، سور پالنے، ڈیری اور گوبر گیس کے چھوٹے پلانٹ لگانے

کے لیے بھی قرضے دیے گئے ہیں۔ مزید برآں ۱۰۹ چھوٹے دکانداروں نیز خود اپنا کاروبار کرنے والے ۱۴۶۲ افراد اور ۱۳۳۴ نئے زمین مالکوں کو بھی قرضے دیے گئے ہیں۔

❁ ❁ ❁

ریاستی کابینہ نے وزیر اعلا شری نرائن دت تیواری کی صدارت میں منعقدہ اپنے ایک جلسہ میں ریاستی حکومت کے صدر مقام پر تسلیم شدہ اخباری نامہ نگاروں کو ہر سال اترپردیش ریاستی روڈ ٹرانسپورٹ کارپوریشن کی بسوں کے ذریعہ ۵۰۰۰ کیلومیٹر تک کے مفت سفر کی سہولتیں فراہم کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

❁ ❁ ❁

حکومت اترپردیش نے ریاست میں ۲۰ کروڑ روپیہ کی تخمینی لاگت سے ۱۵۰۰ کیلومیٹر سے زیادہ لمبی کچی سڑکوں کی از سر نو تعمیر اور انھیں پختہ کرنے کے لیے ایک تیز رفتار پروگرام شروع کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

شری بلدیو سنگھ آریہ وزیر تعمیرات عامہ اور غذا و رسد نے یہ انکشاف کرتے ہوئے کہا کہ اس پروگرام کے تحت جن سڑکوں کی تعمیر کی جائے گی وہ سب کی سب اس سے قبل امدادی کاموں اور تیز رفتار پروگراموں کے تحت تعمیر کی گئی تھیں۔ انھوں نے کہا کہ ان سڑکوں کو پختہ کرنے کا کام آئندہ مارچ تک مکمل ہو جائے گا۔

شری آریہ نے کہا کہ ان میں سے ۱۸ کیلومیٹر سڑکوں کی تعمیر اور انھیں پختہ کرنے کا کام ریاست کے لوک سبھا کے ۸۵ انتخابی حلقوں میں سے ہر حلقہ میں کیا جائے گا۔ وزیر موصوف نے اس اثنا میں محکمۂ تعمیرات عامہ کے افسروں کو ہدایت کی ہے کہ وہ اس سلسلہ میں تمام لوازمات مکمل کر لیں اور پروگرام کو مقررہ مدت کے اندر پورا کرنے کے لیے سرگرم کار ہو جائیں۔

❁ ❁ ❁

اترپردیش کابینہ نے اپنے جلسہ میں فیصلہ کیا ہے کہ ایسے سرکاری ملازمین کے اعمالنامہ میں ناموافق اندراجات کیے جائیں گے جو اپنے تبادلے کے معاملہ میں سیاسی دباؤ کا استعمال کریں گے۔

کابینہ نے سرکاری ملازمین کے تبادلوں کے سلسلہ میں ڈالے جانے والے سیاسی دباؤ کو ایک سنگین معاملہ تصور کرتے ہوئے اس بات پر اظہار تشویش کیا کہ سرکاری احکام جاری ہونے کے باوجود سیاسی دباؤ کے ذریعہ تبادلے کرانے کا رجحان اب بھی برقرار ہے۔

کابینہ نے اس سلسلے میں یہ فیصلہ بھی کیا ہے کہ اگر کوئی سرکاری ملازم اپنے تبادلہ کے احکام مل جانے کے بعد حسب قاعدہ منظور شدہ وقفہ میں اپنے نئے منصب کی ذمہ داری نہیں سنبھالتا ہے تو اس کی غیر حاضری کو ناجائز تصور کیا جائے گا اور اسے اس مدت کی تنخواہ نہیں دی جائے گی۔

کابینہ نے یہ فیصلہ بھی کیا ہے کہ جو سرکاری ملازمین اپنی تعیناتی کے نئے مقامات پر نہیں پہنچیں گے انھیں کوئی پیشگی سفر بھتہ نہیں دیا جائے گا۔

★

نقد و تبصرہ

تبصرے کے لیے ہر کتاب کے دو نسخے آنا ضروری ہیں

تذکرۂ معاصرین : مالک رام ۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی ۔ اپریل ۱۹۷۲ء
جسامت : ۲۲×۱۴ سینٹی میٹر ۔ ضخامت : ۲۴۲ صفحات
قیمت : پندرہ روپے ۔

جناب مالک رام کی شخصیت اردو داں طبقے کے لیے محتاج تعارف نہیں۔ وہ ہمارے بلند پایہ محقق اور ادیب ہیں۔ "غالبیات" کے سلسلے میں ان کے تحقیقی کارنامے ہمیشہ قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جائیں گے۔ تذکرۂ معاصرین، مالک رام کی ان تعزیتی تحریروں کا مجموعہ ہے جو وفیات کے عنوان سے علمی مجلس، دلی کے سہ ماہی جریدے تحریر میں ۱۹۶۷ء سے ۱۹۷۱ء کے دوران وفات پانے والے چھ درجن سے زائد ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ محدود وقت میں بہ عجلت رسالے کے لیے سپرد قلم کی جانے والی تعزیتی تحریروں میں تحقیق کے اعلا معیار کو برقرار رکھنا ممکن نہیں۔ اسی لیے تذکرۂ معاصرین کو جو قارئین اپنی بے جا توقعات کے تحت تحقیقی کارنامہ سمجھ بیٹھے انھیں مایوسی سے دوچار ہونا پڑا۔ مرحومین کے بارے میں تعزیتی اور تاثراتی تحریروں میں تحقیق کے کسی بلند معیار کا مطالبہ کرنا فضول ہوگا۔

زیر تبصرہ کتاب کو ادیبوں اور شاعروں کے ہلکے پھلکے سوانحی خاکوں کا مجموعہ کہا جا سکتا ہے۔ اردو ادب میں خاکہ نگاری ابھی بہت زیادہ ترقی یافتہ صنف نہیں۔ ان حالات میں ہمیں ان چند گنے چنے صاحبانِ قلم کی حوصلہ افزائی کرنا چاہیے جو اردو خاکہ نگاری جیسی کمزور صنف کو توانائی بخش کر اسے اس کے تاریک ماضی اور دھندلے حال سے نکال کر ایک روشن مستقبل سے ہمکنار کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔

تذکرۂ معاصرین کے یہ خاکے کہیں مفصل ہیں اور کہیں مختصر۔ ظاہر ہے کہ محدود وقت میں ہر مرحوم شاعر یا ادیب کے حالات کی فراہمی میں یکساں طور پر کامیابی نہیں ہو سکتی۔ اس کے علاوہ کتاب میں شامل درجنوں ادیب یا شاعر ایک ہی درجے کے بھی نہیں ہیں۔ شخصیتوں کے حالات ان کے مدارج کے اعتبار سے بھی لکھے جاتے ہیں۔ مقدر اول کی کسی مرحوم ہستی کے بارے میں جتنا لکھا جائے گا معمولی درجے کا شاعر اس کا مستحق نہیں ہوگا۔

زیر تبصرہ کتاب میں ہمیں اپنے درجنوں شاعروں کے حالات کے ساتھ ساتھ ان کے کلام کا نمونہ بھی مل جاتا ہے۔ ان شاعروں میں ایسے بھی ہیں جن کا نمونۂ کلام ہم میں سے بہت سے لوگوں نے اسی کتاب میں پہلی بار دیکھا ہے لیکن ان میں ایسے شاعر بھی ملتے ہیں جن کے کلام کے مطبوعہ مجموعے آسانی سے مل جاتے ہیں۔ سوال یہ مسئلہ کہ جن شعراء کا کلام ہمیں آسانی سے دستیاب ہو سکتا ہے ان کی منظومات کو کتاب میں شامل کرنا درست ہے یا نہیں تو اس کا فیصلہ ہمیں زیر تبصرہ کتاب کے نام کو ملحوظ رکھ کر کرنا ہوگا۔ کتاب کا نام تذکرۂ معاصرین ہے اور ظاہر ہے کہ تذکرہ صرف حالات ہی کا مجموعہ نہیں ہوتا۔ تذکرہ دراصل حالات اور کلام کا نام ہوتا ہے۔ عہدِ قدیم سے اب تک لکھے جانے والے فارسی اور اردو تذکرے اس قول کی تائید کرتے ہیں۔

تذکرۂ معاصرین کے خاکوں میں کسی تحقیقی کتاب کی طرح شعرا کے حالات کے لیے ہر جگہ حوالوں کا مطالبہ کرنا یا ماخذ کو تلاش کرنا بھی بے سود معلوم ہوتا ہے۔ کتاب کے تعارف (صفحہ ۶) میں مولف نے اپنے مآخذ کی جانب ان الفاظ میں خود اشارہ کر دیا ہے کہ "... میں نے بالعموم مرحومین کے پسماندگان اور دوست احباب سے بھی استمداد کر کے اپنی معلومات میں اضافہ کیا ہے۔ بے عیب اور غلطی سے مبرا ذات تو صرف خدا کی ہے اس لیے کاملاً صحت کا دعوا غلط ہوگا ..." چناں چہ خود مولف کے اعتراف کے مطابق کتاب تسامحات سے بری نہیں تاہم اس کی افادیت اور اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کتاب کا آمد فہرستوں اور اشاریوں سے آراستہ ہے جن سے اس کی افادیت میں یقیناً اضافہ ہوا ہے۔ کاغذ، کتابت اور طباعت تسلی بخش ہے جس کے لیے مکتبہ جامعہ مبارکباد کا مستحق ہے۔ تذکرۂ معاصرین افادیت کے اعتبار سے یقیناً ایک ایسی کتاب ہے جو خریدنے اور پڑھنے کے ساتھ ساتھ محفوظ رکھنے کے قابل ہے۔ امید ہے کہ جناب مالک رام آئندہ بھی ادبی حلقوں کے لیے ایسی مفید کتابیں منظر عام پر لاتے رہیں گے جن کی مدد سے ہم عصر حاضر کے مرحوم شعرا کے حالات و کلام سے واقف و روشناس ہوتے رہیں گے۔

— کاظم علی خاں